فتاویٰ
ارکانِ اسلام

عقائد، عبادات اور دیگر احکام و مسائل پر تحقیقی فتاویٰ

تالیف

فضیلۃ الشیخ **محمد بن صالح العثیمین** رحمہ اللہ

ترجمہ

مولانا محمد خالد سیف حفظہ اللہ

(اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان)

دار السلام
DARUSSALAM

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

فتاویٰ
ارکانِ اسلام

جملہ حقوقِ اشاعت برائے دارالسلام محفوظ ہیں

ⓒ مكتبة دارالسلام، الرياض، ١٤٢٦ هـ
فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر
العثيمين، محمد بن صالح
فتاوى اركان الاسلام. / محمد بن صالح العثيمين. - الرياض، ١٤٢٦ هـ
ص: ٤٥٣ مقاس: ١٧×٢٤ سم
ردمك: ٣-٨٤-٧٣٢-٩٩٦٠
(النص باللغة الاردية)
١- العبادات (فقه الاسلامي)   ٢- الاسلام - مبادىء عامة
أ. العنوان
ديوي: ٢٥٢   ١٤٢٦/٤٧٨٢

رقم الإيداع: ١٤٢٦/٤٧٨٢
ردمك: ٣-٨٤-٧٣٢-٩٩٦٠

سعودی عرب (ہیڈآفس)

پوسٹ بکس: 22743 الریاض: 11416 سعودی عرب فون: 00966 1 4043432-4033962 فیکس: 4021659
E-mail: darussalam@awalnet.net.sa   Website: www.dar-us-salam.com

❶ طریق مکہ۔ العلیا۔ الریاض فون: 00966 1 4614483 فیکس: 4644945
❷ شارع اربعین۔ الملز۔ الریاض فون: 4735220 فیکس: 4735221
❸ جدہ فون: 00966 2 6879254 فیکس: 6336270
❹ الخبر فون: 00966 3 8692900 فیکس: 8691551

شارجہ فون: 00971 6 5632623
فیکس: 5632624
لندن فون: 0044 208 5202666
فیکس: 208 5217645

امریکہ ❶ ہوسٹن فون: 001 713 7220419
فیکس: 7220431
❷ نیویارک فون: 001 718 6255925
فیکس: 6251511

پاکستان (ہیڈآفس و مرکزی شوروم)

❶ 36- لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ، لاہور
فون: 0092 42 7240024-7232400-7111023-7110081 فیکس: 7354072
Website: www.darussalampk.com   E-mail: info@darussalampk.com
❷ غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 7120054 فیکس: 7320703

کراچی شوروم Z-110,111 (D.C.H.S) مین طارق روڈ (بالمقابل فری پورٹ شاپنگ مال) کراچی
فون: 0092-21-4393936 فیکس: 4393937 Email: darussalamkhi@darussalampk.com

اسلام آباد شوروم F-8 مرکز، اسلام آباد فون: 051-2500237

فتاویٰ

ارکانِ اسلام

عقائد، عبادات اور دیگر احکام و مسائل پر تحقیقی فتاویٰ

تالیف:

فضیلۃ الشیخ

محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ

ترجمہ

مولانا محمد خالد سیف حفظہ اللہ

(اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان)

دارالسلام
کتاب وسنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
ریاض ، جدہ ، شارجہ ، لاھور
کراچی ، لندن ، ھیوسٹن ، نیو یارک
DARUSSALAM

257.15
ع ش ی ف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

المکتبۃ [illegible]
[illegible] لاہور
نمبر .....17566.....

فہرست مضامین

عرض ناشر 17

مقدمہ 21

عقائد کے مسائل 23

توحید اور اس کی قسمیں 24

کفارِ عرب کس قسم کے شرک میں مبتلا تھے 31

اہل سنت والجماعت کا طریقہ کتاب اللہ، سنت رسول اور خلفائے راشدین کی پیروی ہے 33

اہل سنت والجماعت دراصل کون لوگ ہیں؟ 34

ایک فرقہ جنت میں جائے گا اور وہ ''الجماعت'' ہے 34

اسوۂ نبوی سے مکمل وابستگی فرقۂ ناجیہ کی شناخت ہے 35

سیرت طیبہ کا دامن مضبوطی سے تھامنا اعتدال اور اس سے تجاوز غلو ہے 38

ایمان دل سے تصدیق، زبان سے اظہار اور اعضا سے عمل کا نام ہے 40

حدیث جبریل اور حدیث عبدالقیس میں تطبیق کی صورت کیا ہے؟ 42

ایمان کی ستر سے زیادہ شاخیں ہیں 44

مسجد میں نمازی کی حاضری اس کے ایمان کی دلیل ہے 45

شیطانی وسوسوں سے ڈرنا ہی ایمانِ صریح ہے 45

غیر مسلم اسلام میں داخل ہوں یا احکام اسلام کے تابع ہو جائیں 48

علم غیب کا دعویٰ کرنے والا کافر ہے 49

آیت ﴿يَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ﴾ میں نر یا مادہ کے متعلق کوئی تصریح نہیں 50

اللہ کی وحدانیت اور نبی ﷺ کی رسالت کی گواہی اسلام کی کلید ہے 52

کلمۂ طیبہ میں توحید کی تین اقسام: عبادت، ربوبیت اور الوہیت 55

جن اور انسان کس حکمت کے تحت پیدا کیے گئے؟ 56

قبولیتِ دعا کے لیے ضروری شرائط 57

عبادت کا مقصود تقرب الٰہی اور جنت کا حصول ہونا چاہیے 61

اہل سنت والجماعت کے مسلک میں امید اور خوف کے پہلو 63

اسباب اختیار کریں مگر حقیقی بھروسا مسبب الاسباب پر ہو 65

آیات واذکار لکھ کر گلے میں لٹکانا یا ہاتھ پر باندھنا منع ہے 66

نبی ﷺ معوذات پڑھ کر خود کو دم کیا کرتے تھے 67

طلسماتی تعویذ اور گنڈے بدعت اور حرام ہیں 68

کھانے پینے کے برتنوں پر آیت الکرسی وغیرہ لکھنے کا مسئلہ 69

اللہ کے اسماء وصفات کی تاویل نہ کی جائے 69

کیا اسمائے الٰہی میں تحریف، تعطیل یا تمثیل کی گنجائش ہے؟ 75

اسمائے الٰہی ننانوے تک محدود نہیں 75

علوِ ذات، نبی کریم ﷺ کا سوال اور عورت کا جواب 77

اللہ تعالیٰ کے اپنے عرش پر مستوی ہونے کے معنی؟ 84

صرف مستقبل کے امور میں ان شاء اللہ کہا جا سکتا ہے 86

کونی اور شرعی ارادے میں فرق 87

اسمائے الٰہی میں کجی اختیار کرنے کے نتائج 88

اللہ کے ناموں یا صفات کا انکار کفر ہے 90

خالق کی صفات مخلوق کی صفات کی طرح نہیں ہیں 91

رات کے آخری حصے میں نزول باری تعالیٰ سے کیا مراد ہے؟ 92

دیدارِ الٰہی کے بارے میں سلف کا عقیدہ 93
جنات کے شر سے بچنے کا طریقہ 94
جنات بھی علم غیب نہیں جانتے 95
کیا نبیٔ کریم ﷺ کو حبیب اللہ کہا جا سکتا ہے؟ 96
نعت خوانی بطور پیشہ 96
نبیٔ اکرم ﷺ کے بارے میں "نُوْرٌ مِّنْ نُوْرِ اللّٰہِ" اور غیب دانی کا عقیدہ 97
آمدِ امام مہدی کے متعلق احادیث 99
یاجوج' ماجوج کون ہیں؟ 99
تمام امتوں کو دجال سے کیوں ڈرایا گیا؟ 101
آخرت کا منکر کافر ہے 102
عذابِ قبر اور اُس کی حقیقت 106
شفاعت اور اس کی اقسام 110
بچپن میں فوت ہونے والوں کا انجام 112
جنت میں مردوں کیلئے تو حُورِعین ہیں اور عورتوں کیلئے...؟ 113
کیا جہنمیوں کی اکثریت عورتوں پر مشتمل ہوگی؟ 113
عقیدے کا علم اور اس میں پختگی حاصل کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے 114
مسئلہ تقدیر کے بارے میں راہِ اعتدال 115
کیا دعا سے تقدیر بدل سکتی ہے؟ 120
مصیبت کی حالت میں لوگوں کے مختلف مراتب 122
کوئی بیماری متعدی ہے نہ بدشگونی لینا جائز ہے 123
نظر کی حقیقت اور اس کا علاج 126
کیا عقیدے کے مسائل میں جہالت انسانی معذوری سمجھی جائے گی؟ 128
جو شخص احکامِ الٰہی کے بغیر فیصلے کرے وہ کافر' ظالم اور فاسق ہے 137
غیر اللہ کے لیے ذبح کرنا شرک اکبر ہے 141
دینِ اسلام کا مذاق اُڑانے والا کافر اور منافق ہے 142
اصحابِ قبور سے دعا کرنا کیسا ہے؟ 142
ولایت کی علامات کیا ہیں؟ 144
جادو کیا ہے اور اسے سیکھنا کیسا ہے؟ 145
کیا میاں بیوی کے درمیان جادو کے ذریعے سے اتفاق کروانا جائز ہے؟ 146
کہانت کیا ہے اور کاہنوں کے پاس جانا کیسا ہے؟ 147
اُس عبادت کا کیا حکم ہے جس میں ریا کی آمیزش ہو؟ 148
قرآنِ مجید کی قسم اُٹھانا کیسا ہے؟ 149
غیر اللہ کی قسم کھانا جائز نہیں ہے 151
قبر والوں سے دعا اور ان کا طواف حرام ہے 152
قبر پر مسجد اور عمارت یا مسجد میں قبر بنانا حرام ہے 156
نبی ﷺ کی قبر کی زیارت کے لیے سفر کرنا جائز نہیں 158
قبروں سے تبرک اور ان کا طواف حرام ہے 158
دیواروں پر تصویریں لٹکانے اور تصویر والے کپڑے استعمال کرنے کا حکم 160
کیا کیمرے کے ساتھ بنائی گئی تصویر جائز ہے؟ 161
بدعت کی وضاحت اور عید میلاد کا حکم 161
عید الام اور سالگرہ منانے کا حکم 164
گھر سے بدشگونی لینے اور اسے منحوس خیال کرنے کا حکم 166
وسیلے کے احکام 166
وَلاء اور بَراء کا کیا مطلب ہے؟ 171
کفار کے ملک میں جانا' ان سے استفادہ کرنا یا ان کے ساتھ کام کرنا کیسا ہے؟ 173
غیر مسلموں کو جزیرۃ العرب میں بلانا کیسا ہے؟ 175
کیا دین ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے؟ 175

نیت صحیح ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ زبان سے جو چاہو کہو 178

"اَدَامَ اللّٰہُ اَیَّامَكَ" یا "اَطَالَ اللّٰہُ بَقَاءَ كَ" کے الفاظ کہنے کا حکم 178

اللہ کا واسطہ دے کر کسی معمولی چیز کا سوال نہیں کرنا چاہیے 179

کیا "اللہ" اور "رسول" کے الفاظ آمنے سامنے لکھ سکتے ہیں؟ 179

کیا ایسا کہنا جائز ہے کہ "اللہ آپ کا حال پوچھتا ہے؟" 179

کسی کو "مرحوم" کہنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ 179

کیا ایسا کہنا جائز ہے کہ "وطن کے نام سے" یہ کام کرتا ہوں؟ 180

کیا کسی آدمی کا آنا باعث برکت ہو سکتا ہے؟ 180

کسی بات کیلئے تقدیر کو کہاں تک بنیاد بنایا جا سکتا ہے؟ 181

حریت فکر کا نظریہ کہاں تک درست ہے؟ 181

کیا مفتی سے کہا جا سکتا ہے کہ "اسلام کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟" 182

"زمانے اور حالات نے چاہا" جیسے الفاظ کہنا جائز نہیں 182

کیا کسی شخص کو "شہید" کہنا جائز ہے؟ 183

کیا "اتفاق سے ایسے ہوا" کہنا جائز ہے؟ 184

"اسلامی فکر" یا "اسلامی مفکر" کی اصطلاح استعمال کرنا کیسا ہے؟ 185

دین کو چھلکے اور مغز میں تقسیم کرنا باطل تقسیم ہے 185

کیا ایسا کہنا کہ "وہ اپنی آخری جگہ دفن ہو گیا" جائز ہے؟ 187

نصرانی اور مسیحی میں فرق 187

"اللہ تعالیٰ معاف نہ کرے" کہنا جائز نہیں 188

کسی معین شخص کو "اے اطمینان پانے والی روح" نہیں کہنا چاہیے 189

نماز کے مسائل 191

ناپاکی اور نجاست سے طہارت کی بنیاد پانی ہے 192

بدلے ہوئے پانی کا حکم 192

مردوں کے لیے سونا حرام کیوں ہے؟ 193

سونے کے دانت لگوانے کا حکم 194

مقامات وضو میں پیشاب کرنے کا حکم جب کہ جسم بھی برہنہ ہو 195

کھڑے ہو کر پیشاب کرنا اور حمام میں مقدس اوراق لے جانا کیسا ہے؟ 195

حمام میں بسم اللہ کیسے پڑھے؟ 195

قضائے حاجت کے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پشت نہیں کرنی چاہیے 196

استنجا کرنا کب واجب ہے؟ 197

کیا خطبہ سننے کے دوران میں مسواک کی جا سکتی ہے؟ 197

وضو کرتے وقت بسم اللہ پڑھنے کا حکم 198

کیا مردوں کی طرح عورتوں پر ختنہ واجب ہے؟ 198

مصنوعی دانتوں کی صورت میں کلی کیسے کی جائے اور کیا کانوں کے مسح کے لیے نیا پانی لینا ضروری ہے؟ 199

وضو میں ترتیب اور موالات کا حکم 200

ناخنوں پر مصنوعی ناخن اور نیل پالش کی صورت میں وضو کا حکم 202

وضو کا مکمل طریقہ 203

مریض طہارت کس طرح حاصل کرے؟ 204

موزوں اور جرابوں پر مسح کا حکم اور مدت مسح کا بیان 206

باریک، پھٹی ہوئی جرابوں اور پٹی پر مسح کا کیا حکم ہے؟ 210

ایک پاؤں دھونے کے بعد جراب پہن لے اور پھر دوسرا دھوئے تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ 211

مقیم مسح کر کے سفر کا آغاز کرے تو کون سی مدت پوری کرے؟ 212

جرابوں پر مسح کی مختلف صورتیں اور ان کا تفصیلی جائزہ 212

نواقض وضو کا ذکر 213

کیا عورت کو محض ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ 215

کیا جنبی آدمی قرآن کو چھو سکتا ہے؟ 216

واجباتِ غسل کا بیان 217

کیا بوس وکنار یا سو کر اٹھنے کے بعد کپڑوں میں تری دیکھنے پر غسل واجب ہے؟ 219

جنابت اور غسل کے احکام 220

پانی نہ ہو یا موسم شدید ٹھنڈا ہو تو کیا جنبی تیمم کر سکتا ہے؟ 222

کیا تیمم کے لیے مٹی پر غبار ہونا شرط ہے اور کیا دیوار یا فرش پر تیمم جائز ہے؟ 223

چھوٹے بچے کا پیشاب اگر کپڑوں کو لگ جائے تو؟ 224

حائضہ عورت کے متعلق احکام 224

مانع حیض گولیوں اور نفاس کے خون کا کیا حکم ہے؟ 229

استحاضہ کے خون کے دوران میں عورت نماز کیسے پڑھے؟ 231

نماز کن لوگوں پر واجب ہے؟ 232

کیا بے ہوش اور دیوانے پر شرعی احکام لاگو ہوتے ہیں؟ 234

کیا شروطِ نماز کی تکمیل کی خاطر نماز مؤخر کی جا سکتی ہے؟ 235

کیا غلبۂ نیند کی وجہ سے نماز فجر کو مؤخر کرنے کی عادت بنا لینا جائز ہے؟ 236

کیا بے نماز کو بیٹی کا رشتہ دینا جائز ہے؟ 237

بے نماز اہل خانہ کے ساتھ رہنا کیسا ہے؟ 242

عورت کے لیے اپنے بے نماز شوہر کے گھر رہنا کیسا ہے؟ 245

جان بوجھ کر نماز ترک کرنے والے کی قضا کا حکم 245

تارکِ نماز اولاد اور والدین کے فرائض 246

مسافروں کے لیے اذان کا حکم 246

اکیلے شخص کے لیے اذان و اقامت کا حکم 247

دو نمازوں کو جمع کرتے وقت ہر نماز کے لیے اقامت کہے 247

"الصلاۃ خیر من النوم" پہلی اذان میں کہا جائے یا دوسری میں؟ 248

ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے سے اذان کہنا درست نہیں 249

دورانِ اذان میں مسجد میں آنے والا شخص کیا کرے؟ 249

مؤذن کی متابعت میں کلمات "رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا...... الخ" کب کہے جائیں؟ 250

اذان کے بعد کی دعا میں "اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ" کا اضافہ کرنا کیسا ہے؟ 250

کیا اقامت کا جواب دینا اور "اَقَامَهَا اللّٰهُ وَ اَدَامَهَا" کہنا درست ہے؟ 251

نماز کا اوّل وقت کون سا ہے؟ 251

قبل از وقت نماز پڑھ لینے والے کے متعلق حکم 253

قضا شدہ نمازوں کی ترتیب 253

بہت باریک کپڑوں میں نماز پڑھنے کے متعلق کیا حکم ہے؟ 255

کیا عورت ایسے لباس میں نماز پڑھ سکتی ہے جو دائیں بائیں سے کھلا ہو؟ 256

عورت کا نقاب اور دستانے پہن کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟ 256

لاعلمی کی وجہ سے ناپاک کپڑوں میں نماز پڑھ لی جائے تو؟ 257

کپڑا ٹخنوں سے نیچے لٹکانے کی سزا 258

واجب غسل کیے بغیر نماز پڑھنے والے کے متعلق حکم 260

اگر نماز میں نکسیر پھوٹ جائے تو کیا حکم ہے؟ 260

کیا قبر والی مسجد میں نماز ادا کرنا جائز ہے؟ 260

حمام اور بیت الخلا کی چھت پر نماز ادا کرنا کیسا ہے؟ 262

مسجد حرام میں جوتوں سمیت نہیں چلنا چاہیے 262

عین قبلہ سے تھوڑا ہٹ جانے سے نماز باطل نہیں ہوتی 263

غیر قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم 263

نیت دل کے ارادے کا نام ہے، زبان کا اس سے کوئی تعلق نہیں 264

نفل پڑھنے والے امام کے پیچھے فرض نماز پڑھنا جائز ہے 265

مسافر کا مقیم کے پیچھے نماز پڑھنا' نیز دوڑ کر جماعت میں شامل ہونا 265
مسجد میں بآواز بلند تلاوت جبکہ وہ نمازیوں کے لیے باعثِ تشویش ہو 266
تحیۃ المسجد کا حکم 267
مسجد حرام میں مردوں اور عورتوں کی صفوں کی ترتیب اور بچوں کی صف کا بیان 267
عورتوں کی بہترین صف اور دوستونوں کے درمیان نماز کا بیان 268
پاؤں سے پاؤں ملانے اور مسجد سے متصل راستوں میں نماز پڑھنے کے احکام 268
نماز میں رفع الیدین 269
مقتدی جب امام کو رکوع کی حالت میں پائے تو کیا کرے؟ 270
نماز میں ہاتھ کہاں باندھے جائیں؟ 271
نماز میں بسم اللہ جہری پڑھنے کا حکم 272
دعائے استفتاح سنت ہے فرض نہیں 272
آمین کہنا سنت مؤکدہ ہے 273
نماز میں سورۃ الفاتحہ پڑھنے اور بعض آیات کا جواب دینے کا حکم 273
مقتدی امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کس وقت پڑھے؟ 277
قراءت قرآن کے وقت خشوع کس طرح پیدا ہوسکتا ہے؟ 277
فاتحہ کے بعد دوسری سورت شروع کرنے سے پہلے سکوت کا کیا حکم ہے؟ 277
نماز فجر کی اگر ایک رکعت رہ جائے تو اسے جہراً مکمل کرنا چاہیے یا سراً؟ 278
رکوع کے بعد سینے پر ہاتھ باندھنے کے متعلق کیا حکم ہے؟ 278
"ربنا ولك الحمد" کے بعد "والشکر" کا اضافہ کیسا ہے؟ 279
سجدہ کو جاتے وقت کی کیفیت کیا ہونی چاہیے؟ 279
کیا حالتِ سجدہ میں بہت زیادہ پھیل جانا جائز ہے؟ 280
کیا پیشانی کی محراب نیک لوگوں کی نشانی ہے؟ 280
دوسجدوں کے درمیان شہادت کی انگلی کو حرکت دینے کا حکم 281
جلسۂ استراحت کے متعلق کیا حکم ہے؟ 281
تشہد میں شروع سے آخر تک شہادت کی انگلی کو حرکت دینا کیسا ہے؟ 283
کیا پہلے تشہد میں درود پڑھنا جائز ہے؟ 284
نماز میں تورّک کے متعلق کیا حکم ہے؟ 285
کیا ایک سلام پر اکتفا جائز ہے؟ 286
سلام پھیرنے کے بعد امام کو فوراً رخ نہیں بدلنا چاہیے 286
نماز کے فوراً بعد مصافحہ کیسا ہے؟ 286
نماز کے بعد اذکار مسنونہ اور تسبیح کا استعمال 287
نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا کیسا ہے؟ 289
فرض نماز کے بعد بلند آواز سے اجتماعی ذکر 289
قضائے حاجت کی وجہ سے نماز باجماعت کو چھوڑا جاسکتا ہے 290
نماز میں آنکھیں بند کر لینا 290
کیا دورانِ نماز میں انگلیاں چٹخانا جائز ہے؟ 290
نماز میں سترے کا بیان 291
نماز پڑھتے وقت بجلی کا ہیٹر وغیرہ سامنے ہوتو کوئی حرج نہیں 292
کیا نمازی قراءت میں جنت اور جہنم کے ذکر پر دعا اور پناہ طلب کرسکتا ہے؟ 292
سجدہ سہو کے اسباب کا بیان 293
نماز میں کمی بیشی کے احکام 294
کیا نماز وتر غیر رمضان میں بھی واجب ہے؟ 295
قنوتِ وتر اور قنوتِ نازلہ کے احکام 296

نماز تراویح کے احکام اور رکعات کی تعداد کا بیان 296

تراویح میں ختم قرآن کے وقت دعا 298

کیا لیلۃ القدر ہر سال ایک ہی رات میں آتی ہے؟ 298

تراویح میں امام کے پیچھے پڑھنے کی غرض سے قرآن اٹھانا جائز نہیں 300

قرآن مجید کو کس حد تک خوبصورت آواز بنا کر پڑھا جاسکتا ہے؟ 300

فرض نماز سے پہلے والی سنن مؤکدہ کا وقت 300

فجر کی سنتیں اگر رہ جائیں تو فرض نماز کے بعد ادا کی جاسکتی ہیں 301

کیا تحیۃ المسجد پڑھنے کے بعد نوافل پڑھے جاسکتے ہیں؟ 301

سنن مؤکدہ کی قضا اور فرض نماز کے بعد جگہ بدلنے کا حکم 301

کیا سجدہ تلاوت کے لیے طہارت شرط ہے؟ 302

سجدۂ شکر کب کریں اور اس کی کیفیت کیا ہونی چاہیے؟ 304

کیا تحیۃ المسجد یا سنتوں میں بھی دعائے استخارہ پڑھی جاسکتی ہے؟ 304

کیا تسبیح نماز پڑھنا ثابت ہے؟ 305

سہاگ رات دو رکعت نماز پڑھنے کا حکم 305

ممنوع اوقات جن میں نماز پڑھنا جائز نہیں 306

نماز با جماعت کے احکام 306

ملازم حقوق اللہ اور حقوق العباد کو کیسے نبھائے؟ 308

کیا پہلی ایک یا دو رکعتیں جماعت سے رہ جانے پر فاتحہ کے ساتھ اور سورت بھی ملائی جائے؟ 309

جب امام آخری تشہد میں ہو اور دوسری جماعت کی امید ہو تو انتظار جائز ہے 309

کیا فرض نماز کی اقامت کے بعد نوافل جائز ہیں؟ 310

امام اگر مقتدی کے فاتحہ مکمل کرنے سے پہلے رکوع میں چلا جائے تو مقتدی کو کیا کرنا چاہیے؟ 311

مقتدی امام کو جس حالت میں پائے ساتھ شامل ہو جائے 311

سری نمازوں میں فاتحہ کے بعد جتنی سورتیں چاہیں پڑھ لیں 311

امام سے سبقت کرنا حرام ہے 312

کیا گناہ گار کے پیچھے اور فرض پڑھنے والے کی نفل ادا کرنے والے کے پیچھے نماز جائز ہے؟ 312

مکمل صف سے آدمی پیچھے کھینچنے کا کیا حکم ہے؟ 313

دو منزلہ مسجد میں نماز پڑھنے کا حکم 314

ٹیلی وژن یا ریڈیو سے نشر کی جانے والی نماز کے ساتھ مل کر نماز ادا کرنا کیسا ہے؟ 314

مریض کی نماز کا طریقہ کیا ہے؟ 315

ہوائی جہاز میں نماز ادا کرنے کا طریقہ 316

کتنی مسافت پر نماز قصر کی جاسکتی ہے؟ 316

نماز عصر کو جمعہ کے ساتھ جمع کرنے کا مسئلہ 318

دو نمازوں کو جمع کرنے کی کہاں تک رخصت ہے؟ 319

سفر کی رخصتیں کیا کیا ہیں؟ 320

جمعہ کی پہلی گھڑی کب شروع ہوتی ہے؟ 321

کیا امام کی آواز سنائی دینے کی صورت میں نماز گھر پر ادا کرنا جائز ہے؟ 321

عورت جمعہ کی کتنی رکعتیں ادا کرے؟ 322

جمعہ پڑھ لیں تو پھر فرض نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں 322

مسافر کے لیے نماز جمعہ کا حکم 323

اگر ایک رکعت امام کے ساتھ پالیں تو پھر جمعہ ہی شمار ہوگا 323

دوران خطبہ میں امام کی دعا پر آمین کہنے کا حکم 324

غیر عربی زبان میں خطبہ اور خطیب کا خطبۂ جمعہ دیتے ہوئے دونوں ہاتھ بلند کرنا 324

کیا جمعہ کے دن غسل کا حکم صرف مردوں کے ساتھ خاص ہے؟ 325

خطبہ جمعہ سننا واجب اور اذان کا جواب دینا سنت ہے 325
جمعہ کے دن صفوں کو پھلانگنا جائز نہیں 325
جب امام خطبہ دے رہا ہو تو سلام کہنے اور جواب دینے کا کیا حکم ہے؟ 326
نماز عید اور اس کے مسائل 327
نمازِ کسوف وخسوف کے احکام کیا ہیں؟ 329
اگر نماز خسوف کی ایک رکعت رہ جائے تو .....؟ 330
نمازِ استسقا اور اس میں چادر بدلنے کا حکم 330
دعا سے بے اعتنائی نہیں کرنی چاہیے 330
کوئی شخص اپنے دفن ہونے کی جگہ کے متعلق وصیت کرے تو......؟ 331
"لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه" کی تلقین کب کی جائے؟ 332
کیا رشتہ داروں کے انتظار کی وجہ سے تدفین میں تاخیر جائز ہے؟ 332
نماز جنازہ میں شرکت کے لیے رشتہ داروں اور دوستوں کو اطلاع دینا جائز ہے 333
میت کو غسل دینے کا شرعی طریقہ 333
چار ماہ بعد ساقط ہونے والے بچے کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی 334
نماز جنازہ کا طریقہ 335
تارک نماز کی نماز جنازہ درست نہیں 337
کیا نماز جنازہ کی جگہ اور وقت کا تعین ضروری ہے؟ 338
غائبانہ نماز جنازہ کے بارے میں حکم 339
میت کو دفن کرنے کا صحیح طریقہ 339
قبروں پر قرآن مجید پڑھنا اور دعا کرنا کیسا ہے؟ 340
عورتوں کے لیے قبروں کی زیارت کرنا جائز ہے؟ 341
میت کے گھر قرآن خوانی کرنا کیسا ہے؟ 342

زکوٰۃ کے مسائل 345

وجوب زکوٰۃ کی شرطیں 346
ماہانہ تنخواہوں سے زکوٰۃ نکالنے کا طریقہ 347
کیا بچے اور مجنون کے مال پر زکوٰۃ واجب ہے؟ 348
قرض کی زکوٰۃ کا مسئلہ 348
کیا میت کا قرض زکوٰۃ سے ادا کیا جا سکتا ہے؟ 349
کیا مقروض سے صدقہ ساقط ہو جاتا ہے؟ 349
زکوٰۃ میں تاخیر کرنے والا گناہ گار ہے 351
نصف سال چرنے والے جانوروں پر زکوٰۃ کا مسئلہ 351
کیا گھر میں موجود پھل دار درختوں کے پھل پر بھی زکوٰۃ ہے؟ 351
سونے، چاندی کا نصاب اور صاع کی مقدار 352
اپنی ہی دی ہوئی زکوٰۃ بطور ہدیہ قبول کرنے کا حکم 352
کیا مال کی زکوٰۃ کپڑے وغیرہ سے دی جا سکتی ہے؟ 352
سونے اور ہیرے کا مجموعی نصاب اور اس کی زکوٰۃ 353
مسجدیں بنانے میں زکوٰۃ کا مال خرچ کرنا 353
گاڑیاں اور مکان کرائے پر دیے ہوں تو حاصل شدہ آمدنی پر زکوٰۃ 353
پلاٹ پر اس وقت تک زکوٰۃ نہیں جب تک ذاتی رہائش کی نیت ہو 354
صدقہ فطر کے مسائل 355
کیا فوت شدہ انسان کے مال پر زکوٰۃ ہے؟ 356
ذاتی استعمال کی گاڑیوں پر زکوٰۃ نہیں 357
کیا زکوٰۃ دیتے وقت بتانا واجب ہے کہ یہ زکوٰۃ ہے؟ 357
کیا زکوٰۃ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جا سکتی ہے؟ 357
دوسرے شہر میں رہنے والے اہل خانہ کے صدقۂ فطر کی ادائیگی 357

کیا مقروض کو زکوٰۃ دینا افضل ہے یا اس کے قرض خواہ کو؟ 358
ہر ہاتھ پھیلانے والا شخص زکوٰۃ کا مستحق نہیں 358
محض تقسیم کنندہ مستحق زکوٰۃ نہیں بن سکتا 359
تالیف قلب کے لیے زکوٰۃ دینا کیسا ہے؟ 360
کیا طالب علم کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے؟ 360
مجاہدین کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے 361
مسجدوں کی تعمیر ''فی سبیل اللہ'' میں داخل نہیں 362
قریبی رشتہ داروں کو زکوٰۃ دینا کیسا ہے؟ 362
صدقات و زکوٰۃ رمضان ہی کے ساتھ خاص نہیں 362
صدقہ جاریہ وہ ہے جسے انسان خود اپنی طرف سے دے 363
عورت کا اپنے شوہر کے مال سے بلا اجازت صدقہ کرنا جائز نہیں 364
فقیر آدمی کا تقسیم کے لیے زکوٰۃ لے کر اپنے پاس رکھ لینا کیسا ہے؟ 364
روزے کے مسائل 367
روزے کو واجب قرار دینے کی حکمت 368
تمام دنیا کے مطالع کو مکہ کے مطالع سے مربوط کرنا صحیح نہیں 368
انسان جس علاقے میں ہو اُسی کی رؤیت کے مطابق روزہ افطار کرے 370
پُر مشقت کام کی وجہ سے روزہ ترک کرنا جائز نہیں 371
ایام حیض کے روزوں کی قضا ادا کرنا ضروری ہے 371
کمائی کرنے کی وجہ سے روزے نہ رکھنے والے کے متعلق حکم 371
کس عذر کی وجہ سے روزہ چھوڑنا جائز ہے؟ 372
جسے طلوع فجر کے بعد معلوم ہو کہ آج روزہ ہے، وہ کچھ نہ کھائے پیے 373
روزہ نہ رکھنے کا عذر ختم ہونے پر کھانا پینا کیسا ہے؟ 373
دائمی مریض روزے کے بجائے ہر دن کے عوض مسکین کو کھانا کھلا دے 374
مسافر کے نماز روزے کا حکم 375
اگر سفر میں مشقت زیادہ ہو تو روزہ نہ رکھنا واجب ہے 376
اگر سفر میں آسانی اور سہولت ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے 377
مسافر مکہ پہنچنے پر روزہ چھوڑ دے تاکہ آسانی سے عمرہ کر سکے 378
دودھ پلانے والی عورت روزہ ترک کرنے پر قضا ادا کرے گی 379
آرام و سکون حاصل کرنے سے روزے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا 380
رمضان کے روزے کے لیے ایک ہی بار نیت کافی ہے 380
کیا بغیر کھائے پیے صرف توڑنے کی نیت سے روزہ باطل ہو جائے گا؟ 380
بھول کر کھانے پینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا 381
روزہ دار سرمہ استعمال کر سکتا ہے 381
روزہ دار کیلئے مسواک اور خوشبو استعمال کرنا جائز ہے 382
روزہ توڑنے والی چیزیں 382
دمے کے مریض کیلئے ''ان ہیلر'' کا استعمال جائز ہے 387
قے سے روزہ ٹوٹنے کے بارے میں حکم 387
دانتوں سے نکلنے والا خون روزے پر اثر انداز نہیں ہوتا 388
جسے طلوع فجر سے پہلے طہر کا یقین ہو جائے وہ روزہ رکھے اگرچہ غسل بعد میں کرے 388
خون ٹیسٹ کروانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا 388
مشت زنی سے اگر انزال ہو جائے تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے 389
محض خوشبو سونگھنے اور ناک میں دوائی ڈالنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا 389

احتلام ہو جانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا 390

روزہ دار ٹھنڈک حاصل کر سکتا ہے، غیر ارادی طور پر پانی حلق میں جانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا 390

روزہ دار کو بخور کے استعمال سے گریز کرنا چاہیے 391

احتیاط کے نام پر روزہ تاخیر سے افطار کرنا بدعت ہے اور نکسیر سے روزہ نہیں ٹوٹتا 391

سحری و افطاری زمین کے لحاظ سے ہو گی، فضا کا اعتبار نہیں ہو گا 392

کیا بلغم یا تھوک نگلنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟ 392

محض کھانے کا ذائقہ چکھنے سے روزہ باطل نہیں ہوتا 393

کیا جھوٹی گواہی اور حرام گفتگو سے روزہ باطل ہو جاتا ہے؟ 393

روزے کے آداب 394

افطار کے وقت مسنون دعا 395

جس کے ذمے روزوں کی قضا ہو، کیا وہ شوال کے چھ روزے رکھ سکتا ہے؟ 396

جس مریض کو قضا ادا کرنے کی مہلت نہ ملے اس کے بارے میں حکم 396

شوال کے روزے رکھنے کی افضل صورت 397

یوم عاشورہ کے روزے کا حکم 398

شعبان کے روزوں کے متعلق کیا حکم ہے؟ 399

ایک دن روزہ رکھنے اور ایک دن افطار کرنے والا جمعہ کا روزہ بھی رکھ سکتا ہے 399

روزے میں وصال سے کیا مراد ہے؟ 399

جمعہ کے دن روزے کی ممانعت کا سبب 400

نفلی روزہ بوقت ضرورت توڑنا جائز ہے 401

اعتکاف اور معتکف کے احکام 401

حج کے مسائل 405

بے نماز کے حج کے بارے میں حکم 406

وسائل کے بعد فریضۂ حج ادا کرنے میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے 407

مقروض کے لیے حج واجب نہیں 407

امانت دار اور احکام حج سے واقف شخص ہی کو وکیل بنایا جا سکتا ہے 408

حج یا عمرے کی ادائیگی سے قاصر شخص کیا کرے؟ 409

حج بدل اگر طے شدہ رقم سے کم خرچ پر ہو تو......؟ 409

کسی کی طرف سے عمرہ ادا کرتے ہوئے اپنے لیے دعا کرنا 409

حج یا عمرے میں کسی کو نائب بنانے کے متعلق حکم 410

عورت کا محرم کے بغیر حج کرنا 411

زمانے کے اعتبار سے حج کے اوقات 413

اوقات حج سے پہلے احرام باندھنے کے بارے میں حکم 414

جگہ کے اعتبار سے مواقیت حج 414

بغیر احرام کے میقات سے گزرنے والے کے متعلق حکم 415

حج یا عمرے کا تلبیہ کہتے وقت نیت کے الفاظ زبان سے کہنا غلط ہے 416

حج و عمرہ کرنے والا بغیر احرام کے میقات سے نہ گزرے 416

ہوائی جہاز میں نماز پڑھنے اور احرام باندھنے کا طریقہ 417

اگر کوئی میقات سے گزر کر عمرے کا ارادہ کرے تو احرام کہاں سے باندھے؟ 418

کیا مُحرم غسل کر سکتا ہے؟ 418

میت کی طرف سے حج بدل کیا جا سکتا ہے 419

احرام کی کوئی مخصوص نماز نہیں 419

حج تمتع کا بیان 419

تلبیہ کے مسنون الفاظ 420

مُحرم کا اپنے بالوں میں کنگھی کرنا صحیح نہیں 421

جہالت کی بنا پر بال کٹوا کر حلال ہونے والے کا حکم 422

سعودی حکومت کو دھوکہ میں رکھ کر حج کرنا 422
حج تمتع یا اِفراد؟ 423
مُحرم کے چھتری استعمال کرنے اور بیلٹ باندھنے میں کوئی حرج نہیں 423
معذور شخص کے متعلق حکم جو احرام نہ باندھ سکتا ہو 424
حالتِ احرام میں جماع کرنے والے کے متعلق کیا حکم ہے؟ 424
مُحرم عورت کیسے پردہ کرے؟ 427
طواف وداع سے پہلے حیض آنے پر عورت کیا کرے؟ 427
اگر حائضہ کو طہارت میں شک ہو تو دوبارہ عمرہ کرے 428
اگر طواف افاضہ سے پہلے عورت کو حیض آ جائے تو وہ کیا کرے؟ 428
حیض کی وجہ سے عمرہ کیے بغیر مکہ سے واپس جانے والی عورت کے متعلق حکم 429
عورت کے لیے احرام کا کوئی مخصوص لباس نہیں ہے 429
مُحرم عورت کے لیے جرابیں اور دستانے پہننا کیسا ہے؟ 430
حائضہ پاک ہونے تک عمرے کو مؤخر کرے 430
مُحرم عورت حیض کے بعد کپڑے تبدیل کر سکتی ہے 431
مُحرم عورت حج میں نقاب نہ پہنے 431
بھول کر ممنوعات احرام کا ارتکاب کرنے والے کے متعلق حکم 432
حج کی غلطیوں کا کفارہ کہاں ادا کیا جائے؟ 433
طواف سے پہلے سعی کرنا کیسا ہے؟ 434
ماہ رمضان میں بار بار عمرہ کرنا صحیح نہیں ہے 434
اگر دورانِ طواف میں جماعت کھڑی ہو جائے تو پہلے نماز پڑھے 434
کیا سعی، طواف سے پہلے کی جا سکتی ہے؟ 435
اضطباع کسے کہتے ہیں؟ 435
نفلی سعی جائز نہیں 435
طواف افاضہ کے بغیر حج مکمل نہیں ہوتا 436
دورانِ طواف میں حجر اسود کو بوسہ دینا ضروری نہیں 436
طواف مکمل کیے بغیر عمرہ صحیح نہیں 437
مناسک حج و عمرہ ادا کرتے وقت زبانی دعائیں پڑھنا زیادہ بہتر ہے 437
مناسک حج کے لیے کوئی مخصوص دعائیں نہیں ہیں 438
نجاست لگے کپڑوں میں عمرہ کرنے کا حکم 439
کیا مقام ابراہیم پر قدموں کا نشان صحیح ہے؟ 441
غلاف کعبہ کو تبرک کے لیے چھونا کیسا ہے؟ 441
عمرے میں بال کٹوانا افضل ہے یا منڈوانا؟ 441
حج تمتع کے متعلق مسائل 442
عمرہ کرنے والا کہاں بال کٹوائے؟ 443
تاخیر کی وجہ سے اذان فجر کے وقت مزدلفہ آنے کے متعلق حکم 443
رمی جمار کے متعلق مسائل 444
تقصیر میں سارے سر کے بال کٹوانا ضروری ہے 448
رمی جمار کا صحیح وقت 449
اس بیمار شخص کے متعلق کیا حکم ہے جو نہ رمی کر سکا نہ طواف؟ 449
مزدلفہ سے باہر رات گزارنے والے کے متعلق حکم 450
حج اِفراد کرنے والے پر طواف افاضہ کے بعد سعی لازم نہیں 450
قارن کے لیے ایک ہی طواف و سعی کافی ہے 450
رات کا زیادہ حصہ منیٰ میں بسر کیا جائے 451
حاجی بارہ ذوالحجہ کو غروب سے پہلے منیٰ سے نکل سکتا ہے 451
تیرہ ذوالحجہ کو زوال سے پہلے رمی کرنا جائز نہیں 451
فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ کا صحیح مفہوم 452
رات کے وقت منیٰ میں جگہ نہ ملنے پر انسان کیا کرے؟ 453

حج یا عمرہ کرنے والا کوچ سے پہلے آخری وقت بیت اللہ میں گزارے 454
عمرہ کرنے والے کے لیے طواف وداع کا حکم 455
محصور کے بارے میں کیا حکم ہے؟ 456
حج کا قصد کر کے جانے والے شخص کے متعلق حکم 456
گناہوں سے حج کا اجر و ثواب کم ہو جاتا ہے 457
جعلی پاسپورٹ پر حج کرنے والے کے متعلق کیا حکم ہے؟ 457

* * *

عرض ناشر

کتاب وسنت کی تشریح وتوضیح کے ضمن میں جو مختلف علوم وفنون وجود میں آئے' ان میں ایک نافع' مفید اور رہنمائی کا فرض ادا کرنے والا شعبۂ علم وتحقیق کا عنوان ''فتاویٰ'' ہے۔ عملی زندگی کے کارزار میں ایک بندۂ مسلم کو عقائد وعبادات اور مسائل ومعاملات میں مختلف نوعیت کے سوالات' اشکال اور الجھنیں پیش آتی ہیں۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ ایسے لوگ اگر صاحبانِ علم اور اربابِ بصیرت ہوں تو وہ براہ راست کتاب وسنت سے رہنمائی حاصل کریں گے' بصورت دیگر وہ اپنی ذہنی الجھنوں اور مسائل ومشکلات کو اہل علم اور ارباب تحقیق کے سامنے پیش کریں گے تو علمائے دین اور ارباب تحقیق ادلۂ شرعیہ کی روشنی میں اُنھیں جواب فراہم کریں گے۔ دینی اصطلاح میں ایسے جواب کو فتویٰ اور جواب دینے والے کو مفتی کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت سے مقامات پر خود سوال کیے ہیں اور پھر خود ہی ان کے حتمی اور قطعی جواب فراہم کیے ہیں۔ قرآن حکیم میں اس نوع کے جوابات کی نوعیت اگرچہ حدود ونصوص کے دائرے میں آتی ہے مگر ہم اُنھیں بڑی آسانی سے فتاویٰ بھی قرار دے سکتے ہیں۔ یوں قرآن مجید فتاویٰ کا بنیادی ماخذ ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات خود شارع کی حیثیت رکھتی ہے جس کے جواب اور فتوے کو نہ تو چیلنج کیا جاسکتا ہے اور نہ اس میں کوئی تبدیلی ہی کی جاسکتی ہے۔ قرآن مجید نے بندگان الٰہی کو اپنے مسائل ومشکلات رفع کرنے کے سلسلے میں نبیٔ کریم ﷺ سے رجوع کرنے کا مشورہ بھی دیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَإِن تَنَٰزَعۡتُمۡ فِي شَيۡءٖ فَرُدُّوهُ إِلَى ٱللَّهِ وَٱلرَّسُولِ إِن كُنتُمۡ تُؤۡمِنُونَ بِٱللَّهِ وَٱلۡيَوۡمِ ٱلۡأٓخِرِۚ ﴾ (النساء: ٤/ ٥٩)

''اور اگر کسی موضوع پر تمھارے درمیان اختلاف ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو' اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔''

مزید فرمایا:

﴿ وَمَآ ءَاتَىٰكُمُ ٱلرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَىٰكُمۡ عَنۡهُ فَٱنتَهُواْۚ ﴾ (الحشر: ٥٩/ ٧)

”اور جو کچھ رسول تمھیں دیں، اسے لے لو اور جس چیز سے منع کر دیں، اس سے رک جاؤ۔“

قرآن مجید نے نبی کریم ﷺ کی نبوت و رسالت کے جس تشریعی مقام و منصب کو پیش کیا ہے، اس لحاظ سے آپ کی تمام احادیث، فتاویٰ، جامع احکام اور فصل خطاب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یوں فتاویٰ اسلامیہ کی اولین کتاب قرآن مجید اور اس کا دوسرا قطعی اور حتمی ماخذ سنت رسول یا احادیث رسول ہیں جن کی روشنی میں خلافت راشدہ میں سیکڑوں موضوعات پر فتاویٰ دیے گئے۔ عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہمیں ایک سو تیس کے قریب ایسے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی ملتے ہیں جنھوں نے کتاب و سنت کے ادلۂ شرعیہ کی روشنی میں ہزاروں مسائل و مشکلات کے جواب فراہم کیے ہیں اور یہ سب ذخیرہ امتِ مسلمہ کے پاس محفوظ ہے جس کی روشنی اور رہنمائی میں ائمۂ محدثین اور مفتیانِ کرام نے ہر صدی میں فتاویٰ دیے ہیں اور فتاویٰ کا یہ عظیم الشان ذخیرہ فقہ اسلامی کا ایک روشن اور درخشاں باب ہے۔

اسلامی فتاویٰ کے ان ذخائر پر توجہ ڈالیں تو ان کے ذریعے سے قرآن مجید کے عمدہ تفسیری نکات کے علاوہ احادیث کی تشریح و توضیح میں تعبیر نصوص کا علم بھی حاصل ہوتا ہے۔ ان فتاویٰ کے مطالعے سے مختلف صدیوں میں اسلامی معاشرت اور تمدن میں پیدا ہونے والے تغیرات کا بھی علم ہوتا ہے جن کے تحت نئے نئے مسائل اور مشکلات پیدا ہوتی ہیں اور صاحب تقویٰ اہل علم ادلۂ شرعیہ کی روشنی میں ان کے جواب فراہم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی فتاویٰ کا یہ عظیم الشان ذخیرہ ملتِ اسلامیہ کی حیات مستقبلہ کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ اس مرحلے پر ہم اس نقد و انتقاد کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں جو ایسے فتاویٰ کے ضمن میں اختیار کیا گیا ہے جو کم علم، مفاد پرست علمائے سوء نے اپنے مخصوص مفادات اور اغراض کی خاطر دیے ہیں۔ اس موقع پر ہم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث بطور انتباہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ارشاد نبوی ہے:

«مَنْ قَالَ عَلَيَّ مَا لَمْ أَقُلْهُ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ وَمَنْ أَفْتٰى بِفُتْيَا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَانَ إِثْمُ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ أَفْتَاهُ»(مسند أحمد: ۲/ ۳٦٥)

”جس نے میری طرف ایسی بات منسوب کی جو میں نے نہیں کہی، وہ اپنا گھر جہنم میں بنا لے اور جس شخص نے علم کے بغیر فتویٰ دیا تو اس کا گناہ مفتی کے سر ہو گا۔“

اس لیے جہاں فتاویٰ کے منابع اور مراجع کا موزوں اور درست ہونا ضروری ہے، وہاں مفتی کیلئے صاحب علم و بصیرت، زاہد و عابد اور زمانی و مکانی تغیرات کے وجوہ سے باخبر ہونا بھی ناگزیر ہے۔ یہ اسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ بڑے بڑے عالم فتویٰ دینے سے گریز کا پہلو اختیار کرتے تھے یا اگر بعد میں انھیں اپنے فتویٰ کے برعکس کوئی دلیل مل جاتی، تو فوراً اس سے رجوع کر لیتے تھے۔

پیش نظر فتاوی کا مجموعہ جو ''فتاوی ارکان اسلام'' کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے، عالم اسلام کے مرکز حجاز کے ایک ممتاز عالم اور محقق الشیخ العلامہ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ کے ان فتاویٰ کا اردو زبان میں پہلا مستند ترجمہ ہے جو عقائد و عبادات کے ضمن میں پیدا ہونے والے ان جملہ سوالات۔ کے ایسے شافی اور کامل جوابات فراہم کرتا ہے جن کی اساس اور ماخذ خالص کتاب وسنت ہے اور جن میں موحد اور محقق اہل علم سے استفادے کا رنگ بھی شامل ہے۔ اس مجموعۂ فتاوی میں یوں تو پانچوں ابواب اور موضوعات علمی اور تحقیقی شان سے آراستہ ہیں مگر عقائد کے باب میں جن سوالات۔ کے جواب فراہم کیے گئے ہیں، ان کی مثال گزشتہ صدیوں کے فتاوی میں نہیں ملتی۔ اہل سنت والجماعت کو طائفۂ منصورہ یا فرقۂ ناجیہ کے دائرۂ اعزاز وفضیلت میں آنے کے لیے شیخ موصوف رحمہ اللہ کے فتاوی کے اس حصہ اول کا مطالعہ حقیقی ایمانی لطف اور شرعی رہنمائی فراہم کرے گا۔ جہاں تک نماز، زکوٰۃ، روزے اور حج کے شرعی احکام اور فقہی مسائل کا تعلق ہے، اس ضمن میں بھی شیخ موصوف کو اللہ تعالیٰ نے کتاب وسنت کی خصوصی بصیرت عطا کی ہے جس کا مشاہدہ صفحہ بہ صفحہ اور سطر بہ سطر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یوں ارکان اسلام کے جملہ پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر نوعیت کے سوالات اور اشکالات کے مختصر مگر جامع جوابات ان فتاوی میں پیش کیے گئے ہیں۔

قارئین کرام فتاوی کے اس مجموعے کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک کمال خوبی محسوس کریں گے کہ ان میں جہاں سوال کی نوعیت بہت واضح ہے وہاں جوابات کا اسلوب بھی دوٹوک اور مدلل ومحقق ہے۔ شیخ موصوف نے اپنی ذاتی آرا کو پیش کرنے میں حد درجہ احتیاط سے کام لیا ہے اور ہر جواب کی اساس صرف اور صرف ادلۂ شرعیہ کو بنایا ہے اور ان کی تائید میں مستند اہل علم وتحقیق کی آرا کو پیش کیا ہے۔ یوں یہ فتاوی کی کتاب محض سوال وجواب کا ایک موضوعاتی سلسلہ ہی نہیں بلکہ ان موضوعات پر اسلامی اور شرعی معلومات کا بیش قیمت خزینہ بھی ہے جس سے عقائد وعبادات کا ایک واضح، مسنون اور مشروع نقشہ نظروں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ ان فتاویٰ کے مطالعے سے، زمانی اور مکانی تغیرات کی وجہ سے عہد جدید نے جو نئے نئے سوالات اٹھائے ہیں، ان کا بھی مستند اور مسکت جواب ملتا ہے۔ عربی عبارتوں کے اردو ترجمے میں بسا اوقات ایک خاص طرح کی غرابت پیدا ہو جاتی ہے مگر اس ترجمے کی ایک خوبی اور وصف یہ ہے کہ اس میں تسلسل، روانی اور سلاست کا احساس ہوتا ہے اور مطالب کو سمجھنے میں کسی دشواری یا دقت کا احساس نہیں ہوتا جس کے باعث اہل علم اور جدید طبقے کے علاوہ کم علم مرد وخواتین بھی اس سے کما حقہ استفادہ کر سکتے ہیں۔ دارالسلام نے اپنی علمی، تحقیقی اور طباعتی روایات کے مطابق اس مجموعۂ فتاوی کو بھی خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کی ہے۔ دارالسلام نے اس سے قبل بھی بہت سے فتاوی شائع کیے ہیں اور یہ اس سلسلے کا ایک مفید، نافع، مستند اور معتبر کام ہے جو اردو خواں حضرات کے لیے عقائد وعبادات کی مشکلات اور الجھنوں میں خضر راہ کا کام دے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے عامۃ المسلمین کے لیے ہدایت ورہنمائی کا ذریعہ بنائے۔ آمین یا رب العالمین۔

فاضل مترجم مولانا خالد سیف ﷾، جو اسلامی نظریاتی کونسل اسلام آباد کے سینئر ریسرچ سکالر ہیں، انھوں نے ترجمے کا حق ادا کر دیا ہے اور اس پر ہم ان کے بے حد شکر گزار ہیں۔ اُردو ایڈیشن میں قرآن و حدیث کے عربی متن کی تصحیح اور ان کے حوالوں کی تخریج حافظ محمود صاحب نے کی اور اُردو پروف ریڈنگ کی ذمہ داری مولانا محمد عثمان منیب، محسن فارانی اور مولانا منیر احمد رسولپوری نے احسن طریقے سے نبھائی ہے۔ ان سب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر سے سرفراز فرمائے!

خادم کتاب وسنت

عبدالمالک مجاہد

مدیر دارالسلام لاہور۔ الریاض

جولائی 2005ء

* * *

مقدمہ

إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ، وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنَعُوذُ بِاللهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا مَنْ يَهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ ﷺ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمْ تَسْلِيمًا كَثِيرًا

أَمَّا بَعْدُ!

بعض احباب نے، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر سے نوازے، ترغیب دلائی کہ ہمارے شیخ علامہ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ کے فتاویٰ میں سے ارکانِ اسلام سے متعلق بعض مسائل کو کتابی صورت میں مرتب کر کے عربی زبان میں طبع کیا جائے اور پھر مختلف زبانوں میں ان کے تراجم کو بھی شائع کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ مستفید ہو سکیں، کیونکہ یہ فتاویٰ کتاب اللہ، سنت رسول (ﷺ) اور محقق اہل علم کے اقوال پر مبنی ہونے کی وجہ سے امتیازی مقام ومرتبہ کے حامل ہیں۔

اللہ تعالیٰ شیخ محترم کو اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے بہترین جزا سے سرفراز فرمائے، ان کی خدمت میں جب اس تجویز کو پیش کیا گیا تو انھوں نے اس کام کو نہ صرف مستحسن قرار دیا بلکہ حوصلہ افزائی بھی فرمائی کیونکہ یہ نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں تعاون اور علم شرعی کی اشاعت کا ذریعہ ہے۔

شیخ محترم کی تائید وحمایت اور راہنمائی کے بعد میں نے فتاویٰ کے مجموعے سے ارکان اسلام سے متعلق فتاویٰ کا انتخاب شروع کر دیا حتی کہ یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔

اللہ عزوجل کے حضور دعا ہے کہ وہ اس عمل کو نافع بنائے، اپنی ذات پاک کے لیے اسے خالص بنائے، شیخ محترم کو جزائے خیر عطا فرمائے اور آپ کے علم، عمل اور عمر میں برکت عطا فرما دے۔ ①

بقلم

فہد بن ناصر سلیمان

---

① فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ 2002ء میں اپنے رب سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ ان کے علمی کارناموں کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائے اور مسلمانوں کو ان سے مستفید ہونے کی توفیق دے۔

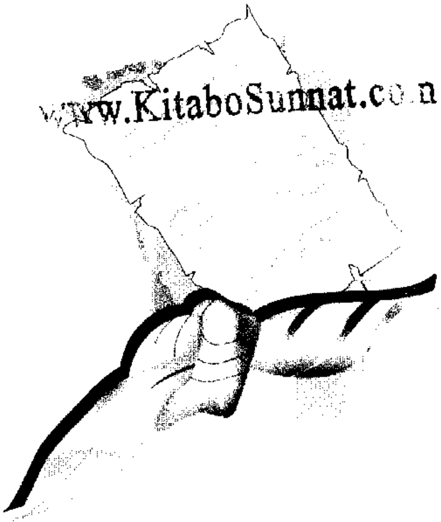

عقائد کے مسائل

توحید اور اس کی قسمیں

سوال توحید کی تعریف کیا ہے اور اس کی کتنی قسمیں ہیں؟

جواب ازروئے لغت توحید باب وَحَّدَ یُوَحِّدُ کا مصدر ہے، جس کے معنی کسی چیز کو ایک قرار دینے کے ہیں اور توحید نفی و اثبات ہی کی صورت میں وجود میں آسکتی ہے یعنی ذات واحد کے ماسوا سے حکم کی نفی کر دی جائے اور اس کی ذات کے لیے اس کا اثبات کر دیا جائے، مثلاً ہم کہتے ہیں کہ کسی انسان کے لیے اس وقت تک توحید مکمل نہیں ہو سکتی حتی کہ وہ اس بات کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو اس طرح اس نے اللہ عزوجل کی ذات پاک کے سوا ہر چیز کی الوہیت کی نفی کر دی اور صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی سے اس کا اثبات کر دیا کیونکہ محض نفی تو تعطیل محض ہے اور اثبات محض اس امر سے مانع نہیں کہ غیر بھی اس حکم میں شریک ہو۔ مثلاً اگر آپ یہ کہیں کہ فلاں شخص کھڑا ہے، تو آپ نے اس کے لیے تو یہ ثابت کر دیا کہ وہ کھڑا ہے لیکن آپ نے یہ ثابت نہیں کیا کہ صرف وہی شخص کھڑا ہے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ کھڑا ہونے میں اس کے ساتھ کوئی اور بھی شریک ہو۔ اگر آپ یہ کہیں کہ کوئی بھی کھڑا نہیں ہے تو آپ نے بالکل نفی کر دی اور کسی کے لیے بھی قیام کو ثابت نہ کیا اور اگر آپ یہ کہیں کہ زید کے سوا کوئی کھڑا نہیں ہے، تو اس صورت میں آپ نے اکیلے زید ہی کے لیے قیام کو ثابت کیا ہے کیونکہ آپ نے زید کے سوا ہر ایک کے قیام کی نفی کر دی ہے۔ پس امر واقع کے اعتبار سے توحید کی یہی حقیقت ہے، یعنی توحید اس وقت تک توحید ہو نہیں سکتی جب تک وہ نفی و اثبات پر مشتمل نہ ہو۔

اللہ عزوجل کی نسبت سے توحید کی تمام اقسام توحید کی اس تعریف میں داخل ہیں کہ ”اللہ تعالیٰ کو ان تمام امور میں واحد قرار دیا جائے جو اس کی ذات پاک کے ساتھ خاص ہیں۔“

جیسا کہ اہل علم نے ذکر کیا ہے، توحید کی درج ذیل تین اقسام ہیں: ① توحید ربوبیت ② توحید الوہیت ③ توحید اسماء و صفات

اہل علم نے تتبع و تحقیق اور آیات و احادیث کے مطالعے سے معلوم کیا ہے کہ توحید ان تین قسموں سے خارج نہیں ہے، لہٰذا انھوں نے توحید کی تین قسمیں ہی بیان کی ہیں:

توحید ربوبیت: یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو خَلق (پیدائش) مُلک (بادشاہت) اور تدبیر میں واحد قرار دینا۔ اسکی تفصیل حسب ذیل ہے:

① **خَـلْق:** خلق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو واحد قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ خالق ہے، اس کے سوا اور کوئی خالق نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هَلْ مِنْ خَٰلِقٍ غَيْرُ ٱللَّهِ يَرْزُقُكُم مِّنَ ٱلسَّمَآءِ وَٱلْأَرْضِ ۚ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ﴾ (الفاطر: ۳۵/ ۳)

”کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق (اور رزاق) ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہو؟ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔“

اللہ تعالیٰ نے کفار کے معبودوں کے باطل ہونے کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿أَفَمَن يَخْلُقُ كَمَن لَّا يَخْلُقُ ۗ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿١٧﴾﴾ (النحل: ۱۶/ ۱۷)

’’تو جو (اتنی مخلوقات) پیدا کرے‘ کیا وہ اس جیسا ہے جو کچھ بھی پیدا نہ کر سکے‘ پھر تم غور کیوں نہیں کرتے؟‘‘

پس اللہ وحدہ ہی خالق ہے‘ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر اس کا ایک اندازہ ٹھہرایا۔ اس کی صفت خلق ان چیزوں کو شامل ہے جن کو اس نے پیدا فرمایا اور ان تمام چیزوں کو بھی جنھیں اس کی مخلوق بناتی ہے‘ لہٰذا تقدیر کے ساتھ ایمان صرف اسی صورت میں مکمل ہو سکتا ہے کہ آپ اس بات پر بھی ایمان لائیں کہ اپنے بندوں کے افعال کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَٱللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ﴿٩٦﴾ ﴾ (الصافات: ٣٧/ ٩٦)

’’تم کو اور جو اعمال تم کرتے ہو‘ ان کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے۔‘‘

اس کی وجہ یہ ہے کہ بندے کا فعل اس کی صفت ہے اور بندہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور جو کسی چیز کا خالق ہو وہ اس کی صفات کا بھی خالق ہوتا ہے۔ اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ بندے کا فعل اس کے پختہ ارادے اور مکمل قدرت ہی کے ساتھ وجود میں آتا ہے اور ارادہ وقدرت کو اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا فرمایا ہے اور سبب تام کا خالق ہی مسبب کا خالق ہوتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ اس میں تطبیق کیسے ہوگی کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی خالق ہے جبکہ غیر اللہ کے لیے بھی تخلیق ثابت ہے‘ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَتَبَارَكَ ٱللَّهُ أَحْسَنُ ٱلْخَٰلِقِينَ ﴿١٤﴾ ﴾ (المومنون: ٢٣/ ١٤)

’’اللہ جو سب سے بہتر بنانے والا ہے‘ بڑا بابرکت ہے۔‘‘

اور نبی اکرم ﷺ نے مصوروں کے بارے میں فرمایا ہے:

«يُقَالُ لَهُمْ: أَحْيُوا مَا خَلَقْتُمْ» (صحيح البخاري، البيوع، باب التجارة فيما يكره لبسه للرجل والنساء، ح: ٢١٠٥ وصحيح مسلم، اللباس، باب تحريم تصوير صورة الحيوان . . . ح: ٢١٠٧)

’’ان سے کہا جائے گا کہ جو تم نے پیدا کیا ہے‘ اس میں جان ڈالو۔‘‘

اس کا جواب یہ ہے کہ غیر اللہ کا پیدا کرنا‘ اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے کی طرح نہیں ہے کیونکہ غیر اللہ کے لیے کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا یا کسی مردہ کو زندہ کر دینا ممکن نہیں ہے۔ غیر اللہ کا پیدا کرنا بس ایک چیز کی کسی حالت کو دوسری حالت میں بدل دینا ہے جب کہ وہ چیز تو اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کی ہوئی ہوتی ہے‘ مثلاً مصور جب کوئی تصویر بناتا ہے تو وہ کوئی چیز پیدا نہیں کرتا بلکہ وہ تو زیادہ سے زیادہ یہ کام کرتا ہے کہ ایک چیز کو دوسری چیز سے بدل دیتا ہے مثلاً وہ مٹی کو پرندے یا اونٹ کی صورت میں بدل دیتا ہے یا وہ رنگ کے ساتھ سفید چیز کو رنگین بنا دیتا ہے جب کہ رنگ یا سیاہی کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور سفید کاغذ کو بھی اللہ ہی نے پیدا فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف تخلیق کی نسبت اور مخلوق کی طرف تخلیق کی نسبت میں یہی بنیادی فرق ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہ ہی خالق ہے اور پیدا کرنا صرف اسی کی صفت ہے۔

② **مُلک:** ملک میں اللہ تعالیٰ کو واحد ماننے کے معنی یہ ہیں کہ اکیلا اللہ ہی ساری کائنات کا مالک ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ تَبَٰرَكَ ٱلَّذِى بِيَدِهِ ٱلْمُلْكُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ﴿١﴾ ﴾ (الملك: ٦٧/ ١)

’’وہ اللہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے‘ بڑی برکت والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔‘‘

اور فرمایا:

﴿ قُلْ مَنْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ ﴾ (المومنون: ۲۳/ ۸۸)

”کہہ دیجیے: وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہی ہے اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابل کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا۔“

مطلقاً مالک الملک صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی ہے جبکہ کسی غیر کی طرف ملکیت کی نسبت اضافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی غیر کی طرف ملکیت کی اضافت کی ہے جیسا کہ درج ذیل ارشاد باری تعالیٰ میں ہے:

﴿ أَوْ مَا مَلَكْتُم مَّفَاتِحَهُ ﴾ (النور: ۲۴/ ۶۱)

”یا ان (گھروں) سے جن کی چابیوں کے تم مالک ہو۔“

اور فرمایا:

﴿ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ ﴾ (المومنون: ۲۳/ ۶)

”مگر اپنی بیویوں سے یا (کنیزوں سے) جو ان کی ملکیت ہوتی ہیں۔“

علاوہ ازیں اور بھی بہت سی نصوص سے غیر اللہ کی طرف ملکیت کی اضافت ثابت ہے لیکن یہ ملکیت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ملکیت کی طرح نہیں ہے کیونکہ یہ تو قاصر اور مقید ملکیت ہے اور جو قاصر ملکیت ہو وہ جامع نہیں ہوتی۔ زید کے گھر کا عمرو مالک نہیں ہوسکتا اور عمرو کے گھر کا زید مالک نہیں ہوسکتا، پھر یہ ملکیت مقید بھی ہے یعنی انسان اپنی ملکیت میں صرف اسی طرح کا تصرف کرسکتا ہے، جس کی اللہ نے اسے اجازت دی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مال ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا ﴾ (النساء: ۴/ ۵)

”اور بے عقلوں کو ان کا مال، جسے اللہ نے تم لوگوں کے لیے سبب معیشت بنایا ہے، مت دو۔“

یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کی ملکیت ناقص اور مقید ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت تام، جامع اور مطلق ہے۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ جو چاہے کرے اسے کوئی پوچھ نہیں سکتا جب کہ مخلوق سے یقیناً باز پرس ہوگی۔

③ **تدبیر:** اللہ عزوجل تدبیر میں بھی منفرد ہے۔ وہی اپنی مخلوق کی تدبیر اور آسمانوں اور زمین کا انتظام کرتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٥٤﴾ ﴾ (الأعراف: ۷/ ۵۴)

”دیکھو! سب مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا ہے، اللہ رب العالمین بڑی برکت والا ہے۔“

اللہ تعالیٰ کا یہ انتظام بہت مضبوط اور مستحکم ہے کوئی چیز اس کے رستے میں حائل ہوسکتی نہ اس کی مخالفت کرسکتی ہے، جب کہ بعض مخلوقات کا انتظام، مثلاً انسان کا اپنے اموال، اولاد اور خدام وغیرہ کا انتظام کرنا تو یہ بہت معمولی، بہت محدود اور مقید انتظام ہے، مطلق نہیں۔ اس تفصیل سے ہماری یہ بات صحیح اور سچ ثابت ہوگئی کہ توحید ربوبیت یہ ہے کہ تخلیق، ملکیت اور تدبیر میں اللہ تعالیٰ کو واحد مانا جائے۔

توحید الوہیت: توحید الوہیت یہ ہے کہ عبادت کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہی کو مانا جائے' یعنی انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بنائے کہ اس کی اسی طرح عبادت کرے اور اس کا تقرب حاصل کرے جس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا اور اس کا تقرب حاصل کرتا ہے۔ توحید کی یہی وہ قسم ہے جس کے بارے میں وہ مشرک گمراہ ہو گئے تھے جن سے نبی اکرم ﷺ نے جنگ کی اور جن کے خونوں' مالوں' زمینوں اور گھروں کو مباح قرار دے دیا اور جن کی عورتوں اور اولادوں کو قیدی بنا لیا تھا۔ اس توحید اور اس کی باقی دو قسموں' توحید ربوبیت اور توحید اسماء وصفات' کے ساتھ رسولوں کو بھیجا گیا اور آسمانی کتابوں کو نازل کیا گیا تھا۔ رسولوں کو اپنی قوموں کے ساتھ زیادہ مشکل توحید کی اسی قسم' توحید الوہیت' کے بارے میں پیش آئی۔ انبیائے کرام نے اپنی قوموں کے سامنے اس بات کو پیش فرمایا کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی ذرہ بھر بھی عبادت نہ کرے نہ کسی مقرب فرشتے کی' نہ کسی نبی مرسل کی' نہ کسی ولی صالح کی اور نہ مخلوق میں سے کسی اور کی کیونکہ عبادت کی مستحق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی ہے۔ جس شخص کی توحید کی اس قسم میں خلل ہو وہ مشرک اور کافر ہے' خواہ وہ توحید ربوبیت اور توحید اسماء وصفات کا اقرار کرے۔ اگر کوئی شخص اس بات پر ایمان رکھتا ہو کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی خالق ومالک اور تمام امور کا منتظم ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے شایان شان اسماء وصفات کا بھی مستحق ہے۔ اور پھر اس کے ساتھ ساتھ وہ غیر اللہ کی عبادت بھی کرتا ہو تو توحید ربوبیت اور توحید اسماء وصفات کا اقرار اس کے لیے کچھ فائدہ مند نہ ہوگا' یعنی کوئی توحید ربوبیت وتوحید اسماء وصفات کا تو کامل اقرار کرے اور پھر کسی قبر کے پاس جا کر اس قبر والے کی عبادت کرے یا اس کا تقرب حاصل کرنے کے لیے کوئی نذر مانے تو وہ مشرک' کافر اور ابدی جہنمی ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّهُۥ مَن يُشْرِكْ بِٱللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ ٱللَّهُ عَلَيْهِ ٱلْجَنَّةَ وَمَأْوَىٰهُ ٱلنَّارُ ۖ وَمَا لِلظَّـٰلِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ ﴿٧٢﴾ ﴾

(المائدۃ: ٥/ ٧٢)

''جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرے گا' اللہ اس پر بہشت کو حرام کر دے گا اور اسکا ٹھکانا دوزخ ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔''

جو شخص بھی کتاب اللہ کا مطالعہ کرے گا اسے یہ بات خوب معلوم ہو جائے گی کہ جن مشرکین سے نبی اکرم ﷺ نے جنگ کی' ان کے خونوں اور مالوں کو حلال قرار دیا' ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنایا اور ان کی زمینوں کو مال غنیمت بنا لیا' وہ سب اس بات کا تو اقرار کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ وحدہ ہی رب اور خالق ہے' اس میں انھیں ذرہ بھر شک نہ تھا لیکن اللہ کی عبادت کے ساتھ ساتھ جب انہوں نے غیر اللہ کی بھی عبادت شروع کر دی' تو وہ مشرک بن گئے اور ان کا خون اور مال مباح قرار پایا۔

توحید اسماء وصفات: توحید اسماء وصفات یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو ان اسماء وصفات میں بھی واحد مانا جائے جن کے ساتھ اس نے اپنی ذات پاک کو موسوم کیا اور جن کے ساتھ اس نے اپنی ذات پاک کی اپنی کتاب میں اور اپنے رسول ﷺ کی زبان میں صفت بیان کی ہے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جن اسماء وصفات کو خود بیان فرمایا ہے' ان کو کسی تحریف' تعطیل' تکییف یا تمثیل کے بغیر اسی طرح مانا جائے جس طرح اس نے خود بیان فرمایا ہے۔ جن اسماء کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کو موسوم کیا اور جن صفات کے ساتھ اس نے اپنے آپ کو موصوف قرار دیا ہے ان کے حقیقی ہونے اور مجازی نہ ہونے پر ایمان لانا ضروری ہے' نیز کسی تکییف وتمثیل کے بغیر ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یاد رہے توحید کی اس قسم کے بارے میں اس امت میں سے

اہل قبلہ اور اسلام کی طرف اپنی نسبت کرنے والوں میں سے بھی بہت سے گروہ گمراہ ہوگئے ہیں اور یہ گمراہ فرقے مختلف قسم کے ہیں۔ ان میں سے بعض نے نفی وتنزیہ کے بارے میں اس قدر غلو سے کام لیا کہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہوگئے' بعض متوسط تھے اور بعض اہل سنت کے قریب رہے۔ توحید کی اس قسم کے بارے میں سلف کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو علی وجہ الحقیقت' تحریف' تعطیل' تکییف اور تمثیل کے بغیر ان اسماء وصفات کے ساتھ موسوم وموصوف قرار دیا جائے جو اس نے خود اپنی ذات کے لیے استعمال فرمائے ہیں' مثلاً اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کی "حیّ" اور "قیّوم" کے اسماء کے ساتھ موسوم کیا ہے تو جس طرح ہم پر واجب ہے کہ ہمارا یہ ایمان ہو کہ حیّ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے' اس طرح یہ بھی واجب ہے کہ جس صفت پر یہ اسم پاک مشتمل ہے' ہم اس پر بھی ایمان لائیں اور وہ صفت ہے حیات کاملہ کہ جس سے پہلے عدم تھا نہ اس کے بعد فنا ہوگا' اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنا نام "سمیع" بیان فرمایا ہے' لہٰذا ہم پر واجب ہے کہ ہم اس بات پر ایمان رکھیں کہ "سمیع" اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے اسم پاک ہے اور سمع اس کی صفات میں سے ایک صفت ہے اور وہ سنتا ہے۔ یہی وہ حکم ہے جو اس اسم وصفت کا تقاضا ہے' سمع کے بغیر "سمیع" ہونا یا مسموع کے ادراک کے بغیر سننا محال ہے' اسی طرح دیگر اسماء وصفات کو قیاس کریں۔

ایک اور مثال: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَقَالَتِ ٱلْيَهُودُ يَدُ ٱللَّهِ مَغْلُولَةٌ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا۟ بِمَا قَالُوا۟ بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ﴾

(المائدۃ: ٥/ ٦٤)

"اور یہود کہتے ہیں کہ اللہ کا ہاتھ (گردن سے) بندھا ہوا ہے (یعنی اللہ بخیل ہے) انھی کے ہاتھ باندھے جائیں اور ایسا کہنے کے سبب ان پر لعنت ہو بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔ وہ جس طرح (اور جتنا) چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔"

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ﴾ "بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں" پس اس نے اپنی ذات پاک کے لیے دو ہاتھوں کا اثبات فرمایا ہے اور انھیں صفت "بَسْط" کے ساتھ موصوف قرار دیا ہے' جس کے معنی بہت زیادہ عطا کرنے کے ہیں' لہٰذا ہم پر واجب ہے کہ ہم اس بات پر ایمان رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کے دو ہاتھ ہیں جو عطا فرمانے اور نعمتوں کے ساتھ نوازنے میں بہت کھلے ہیں۔ اسی طرح ہم پر یہ بھی واجب ہے کہ ہم اپنے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں کا تصور لائیں نہ زبان سے بول کر ان پاک ہاتھوں کی کیفیت کو بیان کریں اور نہ انہیں مخلوق کے ہاتھوں کے مماثل قرار دیں' کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِۦ شَىْءٌ ۖ وَهُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْبَصِيرُ ﴿١١﴾ ﴾ (الشوری: ٤٢/ ١١)

"اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ سنتا' دیکھتا ہے۔"

اور فرمایا:

﴿ قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّىَ ٱلْفَوَٰحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَٱلْإِثْمَ وَٱلْبَغْىَ بِغَيْرِ ٱلْحَقِّ وَأَن تُشْرِكُوا۟ بِٱللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِۦ سُلْطَـٰنًا وَأَن تَقُولُوا۟ عَلَى ٱللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٣﴾ ﴾ (الأعراف: ٧/ ٣٣)

"کہہ دو میرے پروردگار نے تو بے حیائی کی باتوں کو خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کرنے کو حرام کیا

ہے اور اس کو بھی کہ تم کسی کو اللہ کا شریک بناؤ جس کی اس نے کوئی سند نازل نہیں کی، نیز اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے کہ تم اس کے بارے میں ایسی باتیں کہو جن کا تمھیں کچھ علم نہیں۔''

اور مزید فرمایا:

﴿ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِۦ عِلْمٌ ۚ إِنَّ ٱلسَّمْعَ وَٱلْبَصَرَ وَٱلْفُؤَادَ كُلُّ أُو۟لَـٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔولًا ﴿٣٦﴾ ﴾ (الإسراء: ١٧/ ٣٦)

''اور (اے بندے!) جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ کہ کان اور آنکھ اور دل ان سب (جوارح) سے ضرور باز پرس ہوگی۔''

جو شخص اللہ تعالیٰ کے ان دونوں ہاتھوں کو مخلوق کے ہاتھوں کے مثل قرار دیتا ہے، وہ اس ارشاد باری تعالیٰ کی تکذیب کرتا ہے:

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِۦ شَىْءٌ ۖ ﴾ (الشورى: ٤٢/ ١١)

''اس جیسی کوئی چیز نہیں۔''

اور وہ اس فرمان باری تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے:

﴿ فَلَا تَضْرِبُوا۟ لِلَّهِ ٱلْأَمْثَالَ ۚ ﴾ (النحل: ١٦/ ٧٤)

''تو (اے لوگو) تم اللہ کے بارے میں مثالیں بیان نہ کرو۔''

اور جو ان دونوں ہاتھوں کی کیفیت بیان کرے اور کہے کہ ان کی ایک معین کیفیت ہے خواہ وہ کیسی ہی کیفیت بیان کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایک ایسی بات کہتا ہے جس کا اسے قطعاً کوئی علم نہیں ہے، نیز وہ ایک ایسی چیز کے پیچھے پڑتا ہے جسے وہ جانتا ہی نہیں ہے۔

صفات کے بارے میں ہم ایک اور مثال بیان کرتے ہیں اور وہ ہے اللہ کا اپنے عرش پر مستوی ہونا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں سات مقامات پر بیان فرمایا ہے کہ وہ عرش پر مستوی ہے اور ان تمام مقامات پر ﴿ اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ﴾ کے الفاظ بیان کیے گئے ہیں اور جب ہم استواء کے معنی معلوم کرنے کے لیے عربی زبان کی طرف رجوع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جب استواء کا لفظ علیٰ کے ساتھ استعمال ہو تو اس کے معنی صرف ارتفاع اور بلندی کے ہوتے ہیں لہٰذا ارشاد باری تعالیٰ: ﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی ﴾ (طٰہٰ: 5/20) اور اس طرح کی دیگر آیات کے معنی یہ ہوں گے کہ اس نے اپنے عرش پر ایک خاص انداز سے قرار پایا ہے جو دیگر تمام کائنات پر علو عام سے مختلف ہے اور یہ علو اللہ تعالیٰ کے لیے علی وجہ الحقیقت ثابت ہے اور وہ اپنے عرش پر اس طرح مستوی ہے جس طرح اس کی ذات پاک کے شایان شان ہے، یہ انسان کے چارپائی پر یا جانوروں پر یا کشتی پر بیٹھنے کی طرح نہیں ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ذکر فرمایا ہے:

﴿ وَجَعَلَ لَكُم مِّنَ ٱلْفُلْكِ وَٱلْأَنْعَـٰمِ مَا تَرْكَبُونَ ﴿١٢﴾ لِتَسْتَوُۥا۟ عَلَىٰ ظُهُورِهِۦ ثُمَّ تَذْكُرُوا۟ نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا ٱسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُولُوا۟ سُبْحَـٰنَ ٱلَّذِى سَخَّرَ لَنَا هَـٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُۥ مُقْرِنِينَ ﴿١٣﴾ وَإِنَّآ إِلَىٰ رَبِّنَا لَمُنقَلِبُونَ ﴿١٤﴾ ﴾ (الزخرف: ٤٣/ ١٢-١٤)

’’اور تمھارے لیے کشتیاں اور چار پائے بنائے‘ جن پر تم سوار ہوتے ہو تا کہ تم ان کی پیٹھ پر چڑھ بیٹھو اور جب اس پر بیٹھ جاؤ‘ پھر اپنے پروردگار کے احسان کو یاد کرو اور کہو کہ وہ (ذات) پاک ہے جس نے اس کو ہمارے زیر فرمان کر دیا جبکہ ہم میں طاقت نہ تھی کہ اس کو بس میں کر لیتے اور ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔‘‘

یہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کو مخلوق کے کسی چیز پر بیٹھنے کی طرح قرار دیا جا سکے کیونکہ اللہ تعالیٰ جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ شخص بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کرتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ ﴿ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ﴾ کے معنی (اِسْتَوْلٰی عَلَی الْعَرْشِ) یعنی عرش پر غالب ہونے (قبضہ پانے) کے ہیں‘ کیونکہ یہ تو کلمات کو ان کے مقامات سے بدل دینا ہے اور یہ اس موقف کے بھی خلاف ہے جس پر حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کا اجماع تھا‘ نیز یہ بہت سے باطل لوازم کو بھی مستلزم ہے‘ لہٰذا کسی مومن کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اللہ عزوجل کی نسبت ایسی بات منہ پر لائے۔ قرآن مجید بلا شک وشبہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّا جَعَلْنَٰهُ قُرْءَٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝٣ ﴾ (الزخرف: ۴۳/ ۳)

’’بلاشبہ ہم نے اس کو قرآن عربی بنایا ہے تا کہ تم سمجھو۔‘‘

عربی زبان میں (اِسْتَوٰی عَلٰی کَذَا) کے معنی علو واستقرار کے ہیں اور یہی معنی لفظ استویٰ کے موافق ہیں تو ﴿ اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ﴾ کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے عرش پر قرار پکڑا‘ جس طرح اس کی ذات پاک کے جلال وعظمت کے شایان شان ہے۔ اگر ’’استواء‘‘ کی تفسیر ’’استیلاء‘‘ (غالب ہونا‘ جگہ پکڑنا) کے ساتھ کی جائے‘ تو یہ کلمات کو ان کی جگہ سے بدل دینے کے مترادف ہوگی کیونکہ اس تفسیر کے ذریعے سے درحقیقت اس معنی کی نفی کر دی گئی جس پر قرآن کی زبان دلالت کرتی ہے اور وہ ہے علو واستقرار اور ایک دوسرے معنی کو اختیار کیا گیا جو بالکل باطل ہے۔

تمام سلف صالح حضرات صحابہ وتابعین کرام کا اس معنی پر اجماع ہے اور ان سے اس تفسیر کے خلاف ایک حرف بھی منقول نہیں اور اصول یہ ہے کہ جب کوئی لفظ قرآن وسنت میں آیا ہو اور سلف سے اس کی کوئی ایسی تفسیر وارد نہ ہو جو اس کے ظاہر کے خلاف ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے اس کے ظاہر پر اسے باقی رکھا ہے اور اس کا اعتقاد رکھا ہے جس پر یہ دلالت کرتا ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ کیا سلف سے ایسا کوئی صریح لفظ وارد ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ انہوں نے ’’اِسْتَوٰی‘‘ کی تفسیر ’’علا‘‘ سے کی ہے؟ ہم اس کے جواب میں عرض کریں گے کہ ہاں یہ سلف سے وارد ہے اور اگر بالفرض ان سے صراحت کے ساتھ یہ وارد نہ بھی ہو تو اصول یہ ہے کہ قرآن کریم وسنت نبویہ میں جو لفظ استعمال ہوا ہو‘ اس کے وہی معنی ہوں گے‘ جو عربی زبان کے تقاضے کے مطابق ہوں گے اور اس اصول کے مطابق سلف کے نزدیک بھی اس کے وہی معنی ہوں گے۔

’’استواء‘‘ کی ’’استیلاء‘‘ کے ساتھ تفسیر سے جو باطل باتیں لازم آتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

○ آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے قبل اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی نہیں تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ إِنَّ رَبَّكُمُ ٱللَّهُ ٱلَّذِى خَلَقَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ فِى سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ ٱسْتَوَىٰ عَلَى ٱلْعَرْشِ ﴾

(الأعراف: ۷/ ۵٤)

’’بے شک تمھارا پروردگار اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا‘ پھر وہ عرش پر مستوی ہو گیا۔‘‘

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے قبل عرش پر مستوی نہیں تھا اور اس وقت بھی مستوی نہیں تھا جب اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا تھا۔

○ اگر ہم ’’استواء‘‘ کی ’’استیلاء‘‘ کے ساتھ تفسیر کو صحیح مان لیں تو پھر اسے بھی صحیح ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ زمین پر مستوی ہے یا یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات میں سے کسی بھی چیز پر مستوی ہے حالانکہ یہ معنی بلا شک وشبہ باطل ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے شایان شان نہیں ہے۔

○ یہ کلمات کو ان کے مقامات سے بدل دینا ہے۔

○ یہ معنی اختیار کرنا سلف صالحین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اجماع کے خلاف ہے۔

توحید کی اس قسم یعنی توحید اسماء وصفات کے بارے میں خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ہم پر واجب یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے لیے صرف انہی اسماء وصفات کو ثابت کریں جن کا اس نے خود اپنی ذات پاک کے لیے اثبات فرمایا ہے یا جن کا اس کے رسول ﷺ نے اس کے لیے اثبات فرمایا ہے اور پھر ان تمام اسماء وصفات کو تحریف‘ تعطیل‘ تکییف اور تمثیل کے بغیر علی وجہ الحقیقت اس کی ذات پاک کے لیے ثابت کریں۔

کفارِ عرب کس قسم کے شرک میں مبتلا تھے

سوال جن مشرکین میں نبی ﷺ کو مبعوث فرمایا گیا تھا‘ وہ کس قسم کے شرک میں مبتلا تھے؟

جواب جن مشرکین میں نبی ﷺ کو مبعوث فرمایا گیا تھا‘ وہ شرک فی الربوبیت میں مبتلا نہ تھے کیونکہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف عبادت میں شرک کرتے تھے۔

جہاں تک ربوبیت کا تعلق ہے تو وہ اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ وحدہ ہی رب ہے‘ وہ مجبور ومضطر لوگوں کی دعا کو سنتا ہے اور وہی تکلیفوں کو دور کرتا ہے اور اس طرح کی اور بھی بہت سی باتوں کے قائل تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں ذکر فرمایا ہے کہ وہ اللہ عزوجل ہی کی ربوبیت کا اقرار کرتے تھے‘ البتہ وہ عبادت میں شرک کرتے تھے‘ یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ وہ غیر اللہ کی بھی عبادت کرتے تھے اور یہ ایک ایسا شرک ہے‘ جو انسان کو ملت اسلامیہ کے دائرے سے خارج کر دیتا ہے کیونکہ توحید اپنے لفظ کی دلالت کے اعتبار سے کسی چیز کو واحد قرار دینے سے عبارت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پاک کے کئی حقوق ہیں۔ ان حقوق کو صرف اسی کی ذات گرامی کے لیے خاص کرنا واجب ہے۔ ان حقوق کی درج ذیل تین اقسام ہیں:

① حقوقِ ملک ② حقوقِ عبادت ③ حقوقِ اسماء وصفات

یہی وجہ ہے کہ علماء نے توحید کو بھی تین قسموں میں تقسیم کیا ہے ① توحید ربوبیت ② توحید اسماء وصفات اور ③ توحید عبادت مشرکین نے اس آخری قسم توحیدِ عبادت میں شرک کیا تھا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ ساتھ غیر اللہ کی پوجا بھی

کرتے تھے جب کہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے:

﴿ ۞ وَٱعۡبُدُواْ ٱللَّهَ وَلَا تُشۡرِكُواْ بِهِۦ شَيۡـٔٗاۖ ﴾ (النساء: ٤/ ٣٦)

''اور اللہ ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ۔''

یعنی اس کی عبادت میں کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔ اور فرمایا:

﴿ إِنَّهُۥ مَن يُشۡرِكۡ بِٱللَّهِ فَقَدۡ حَرَّمَ ٱللَّهُ عَلَيۡهِ ٱلۡجَنَّةَ وَمَأۡوَىٰهُ ٱلنَّارُۖ وَمَا لِلظَّٰلِمِينَ مِنۡ أَنصَارٖ ﴿٧٢﴾ ﴾ (المائدۃ: ٥/ ٧٢)

''بلا شبہ جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرے گا اللہ اس پر بہشت کو حرام کر دے گا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔''

اور فرمایا:

﴿ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَغۡفِرُ أَن يُشۡرَكَ بِهِۦ وَيَغۡفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَآءُۚ ﴾ (النساء: ٤/ ٤٨)

''بلا شبہ اللہ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا دوسرے گناہوں کو جسے چاہے معاف کر دے گا۔''

مزید ارشاد ہے:

﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ٱدۡعُونِيٓ أَسۡتَجِبۡ لَكُمۡۚ إِنَّ ٱلَّذِينَ يَسۡتَكۡبِرُونَ عَنۡ عِبَادَتِي سَيَدۡخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ﴿٦٠﴾ ﴾ (الغافر: ٤٠/ ٦٠)

''اور تمھارے پروردگار نے فرمایا ہے کہ تم مجھ سے دعا کرو، میں تمھاری (دعا) قبول کروں گا۔ بلاشبہ جو لوگ میری عبادت سے سرکشی (تکبر) کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں ذلیل ہو کر داخل ہوں گے۔''

اور اللہ تعالیٰ نے سورۂ اخلاص میں فرمایا ہے:

﴿ قُلۡ يَٰٓأَيُّهَا ٱلۡكَٰفِرُونَ ﴿١﴾ لَآ أَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُونَ ﴿٢﴾ وَلَآ أَنتُمۡ عَٰبِدُونَ مَآ أَعۡبُدُ ﴿٣﴾ وَلَآ أَنَا۠ عَابِدٞ مَّا عَبَدتُّمۡ ﴿٤﴾ وَلَآ أَنتُمۡ عَٰبِدُونَ مَآ أَعۡبُدُ ﴿٥﴾ لَكُمۡ دِينُكُمۡ وَلِيَ دِينِ ﴿٦﴾ ﴾ (الکافرون: ١٠٩/ ١-٦)

''اے پیغمبر (ان منکرین اسلام سے) کہہ دو کہ اے کافرو! جن (بتوں) کو تم پوجتے ہو، ان کو میں نہیں پوجتا اور جس (اللہ) کی میں عبادت کرتا ہوں، اس کی تم عبادت نہیں کرتے اور (میں پھر کہتا ہوں کہ) جن کی تم پرستش کرتے ہو، ان کی میں پرستش کرنے والا نہیں ہوں اور نہ تم اس کی بندگی کرنے والے معلوم ہوتے ہو جس کی میں بندگی کرتا ہوں۔ تم اپنے دین پر، میں اپنے دین پر۔''

میں نے اس سورت کو جو ''سورۃ الاخلاص'' کہا ہے تو اس سے اخلاصِ عمل مراد ہے کیونکہ یہ سورت اخلاصِ عمل سے متعلق ہے اگرچہ اسے ''سورۃ الکافرون'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں یہ عملی اخلاص کی سورت ہے جیسے سورۂ ﴿قُلۡ هُوَ ٱللَّهُ أَحَدٌ﴾ علمی اخلاص اور عقیدہ کی سورت ہے۔ واللہ الموفق.

اہل سنت والجماعت کا طریقہ کتاب اللہ' سنت رسول اور خلفائے راشدین کی پیروی ہے

سوال عقیدہ اور امور دین وغیرہ کے بارے میں اہل سنت والجماعت کے کیا اصول ہیں؟

جواب عقائد اور دیگر امور دین وغیرہ کے بارے میں اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ کتاب اللہ' سنت رسول اللہ (ﷺ) اور خلفائے راشدین کے طریقے اور راستے کو مضبوطی سے تھام لیا جائے' کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ فَٱتَّبِعُونِى يُحْبِبْكُمُ ٱللَّهُ ﴾ (آل عمران: ٣/ ٣١)

''(اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمھیں دوست رکھے گا۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ مَّن يُطِعِ ٱلرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ ٱللَّهَ ۖ وَمَن تَوَلَّىٰ فَمَآ أَرْسَلْنَٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۝٨٠ ﴾ (النساء: ٤/ ٨٠)

''جو شخص رسول کی فرماں برداری کرے گا تو بے شک اس نے اللہ کی فرماں برداری کی اور جو نافرمانی کرے تو اے پیغمبر! آپ کو ہم نے ان کا نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔''

اور فرمایا:

﴿ وَمَآ ءَاتَىٰكُمُ ٱلرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَىٰكُمْ عَنْهُ فَٱنتَهُوا۟ ﴾ (الحشر: ٥٩/ ٧)

''اور جو چیز تم کو پیغمبر دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں اس سے باز رہو۔''

یہ حکم اگرچہ مال غنیمت کی تقسیم کے بارے میں ہے لیکن امور شرعیہ کے بارے میں بالاولی ہے' کیونکہ نبی اکرم ﷺ جمعہ کے دن لوگوں کو خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کرتے تھے:

«أَمَّا بَعْدُ: فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللهِ وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ(ﷺ) وَشَرَّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»(صحيح مسلم، الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة، ح:٨٦٧)

''حمد وثنا کے بعد! بے شک بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ محمد (ﷺ) کا طریقہ ہے اور بدترین امور نئے پیدا کردہ یعنی بدعات ہیں اور (دین میں ایجاد کی گئی) ہر بدعت یعنی نئی بات گمراہی ہے۔''

اور نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے:

«عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي، وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ تَمَسَّكُوا بِهَا وَعَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ، وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ، فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»(سنن أبي داود، السنة، باب في لزوم السنة، ح:٤٦٠٧)

''تم میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑو' اسے مضبوطی سے تھام لو اور دانتوں کے ساتھ سختی سے پکڑ لو اور (دین میں) نئے نئے کاموں سے بچو کیونکہ (دین میں ایجاد کیا گیا) ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''

اس مسئلے سے متعلق کتاب و سنت کی اور بھی بہت سی نصوص ہیں' چنانچہ اہل سنت والجماعت کا طریقہ اور دستور کتاب اللہ' سنت

رسول (ﷺ) اور آپ کے بعد ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو مکمل طور پر اختیار کرنا ہے، یہی وجہ ہے کہ اہل سنت حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ پر عمل کرتے ہوئے دین کو قائم رکھتے ہیں اور اس میں تفرقہ ① نہیں ڈالتے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ شَرَعَ لَكُم مِّنَ ٱلدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِۦ نُوحًا وَٱلَّذِىٓ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِۦٓ إِبْرَٰهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰٓ أَنْ أَقِيمُوا۟ ٱلدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا۟ فِيهِ ﴾ (الشوری: ٤٢/ ١٣)

”اس نے تمھارے دین کا وہی رستہ مقرر کیا جس کے اختیار کرنے کا نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی (اے محمد!) ہم نے تمھاری طرف وحی بھیجی ہے اور جس کا ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا (وہ یہ) کہ دین کو قائم رکھنا اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا۔“

اہل سنت میں اگر اجتہادی مسائل میں اختلاف ہے تو اس اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے اور یہ اختلاف دلوں کے اختلاف کا سبب نہیں بنتا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت اجتہادی مسائل میں اختلاف کے باوجود باہم دگر الفت و محبت کے رشتوں میں منسلک ہیں۔

اہل سنت والجماعت دراصل کون لوگ ہیں؟

سوال اہل سنت والجماعت کون ہیں؟

جواب اہل سنت والجماعت سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے سنت نبوی کو مضبوطی سے تھام لیا، اس پر جمع ہو گئے اور سنت کے سوا انھوں نے کسی اور چیز کی طرف التفات نہ کیا، نہ علم و عقیدہ کے امور میں اور نہ عمل کے احکام و مسائل میں۔ اسی وجہ سے انھیں اہل سنت کے نام سے موسوم کیا گیا کہ یہ سنت کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے والے ہیں اور اسی طرح انھیں اہل الجماعت کے نام سے بھی موسوم کیا گیا کہ یہ لوگ سنت ہی پر جمع ہوئے ہیں۔ اگر آپ اہل بدعت کے حالات کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ عقیدہ و عمل کے اختلاف میں مبتلا ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ انھوں نے دین میں جس قدر بدعات کو ایجاد کیا وہ اسی قدر سنت سے دور ہو گئے۔

ایک فرقہ جنت میں جائے گا اور وہ ”الجماعت“ ہے

سوال نبیٔ اکرم ﷺ نے اپنی وفات کے بعد اپنی امت کے اختلاف کے بارے میں جو فرمایا ہے، ازراہ کرم اس کے بارے میں رہنمائی فرمائیں؟

جواب صحیح حدیث کے مطابق نبیٔ اکرم ﷺ نے یہ خبر دی ہے:

«اِفْتَرَقَتِ الْيَهُودُ عَلٰى إِحْدٰى أَوْ ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِينَ فِرْقَةً وَتَفَرَّقَتِ النَّصَارٰى عَلٰى إِحْدٰى أَوْ ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِينَ فِرْقَةً، وَتَفْتَرِقُ أُمَّتِي عَلٰى ثَلَاثٍ وَسَبْعِينَ فِرْقَةً»(سنن أبي داود، السنة، باب شرح السنة، ح: ٤٥٩٦ وجامع الترمذي، الإيمان، باب افتراق هذه الأمة، ح: ٢٦٤٠ وسنن ابن ماجه، الفتن، باب افتراق الأمم، ح: ٣٩٩١)

”یہودی اکہتر یا بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے اور عیسائی بھی اکہتر یا بہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے اور میری امت تہتر فرقوں میں

---

① یہ امور دین کو نہایت شدت کے ساتھ تھام لینے کے بارے میں ایک مثال ہے۔ (مترجم)

تقسیم ہو جائے گی۔“

اور ایک روایت میں ہے:

«وَإِنَّ هٰذِهِ الْمِلَّةَ سَتَفْتَرِقُ عَلٰى ثَلَاثٍ وَّسَبْعِينَ ثِنْتَانِ وَسَبْعُونَ فِي النَّارِ وَوَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ وَهِيَ الْجَمَاعَةُ»(سنن أبي داود، السنة، باب شرح السنة، ح:٤٥٩٧)

”اور ہماری یہ ملت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی (ان میں سے) بہتر فرقے جہنم میں جائیں گے اور ایک فرقہ جنت میں جائے گا اور یہ فرقہ ”الجماعت“ ہے۔“

اور اس فرقے سے مراد وہ فرقہ ہے جو اس دین پر ہو جس پر نبی ﷺ اور آپ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور یہی فرقہ نجات یافتہ ہے جو دنیا میں بدعات سے نجات پا گیا اور آخرت میں دوزخ سے نجات پا جائے گا اور یہ وہ طائفہ منصورہ ہے جو قیامت برپا ہونے تک اللہ تعالیٰ کے حکم سے غالب اور قائم رہے گا۔ یہ تہتر فرقے، جن میں سے ایک حق اور باقی باطل ہیں، بعض لوگوں نے شمار کرنے کی بھی کوشش کی ہے اور انھوں نے اہل بدعت کو پانچ شاخوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر شاخ کی کچھ فروع بیان کی ہیں تاکہ اس عدد تک پہنچ جائیں جس کا نبی کریم ﷺ نے تعین فرمایا ہے۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ زیادہ بہتر بات یہ ہے کہ تعداد کے بارے میں توقف سے کام لیا جائے کیونکہ صرف یہی فرقے گمراہ نہیں ہوئے بلکہ لوگ پہلے کی نسبت کہیں بڑھ کر گمراہ ہو گئے ہیں اور وہ ان بہتر فرقوں کی تقسیم کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کی رائے میں یہ تعداد آخری نہیں ہے اور نہ آخری تعداد کا آخر زمانہ میں قیامت برپا ہونے کے وقت سے پہلے معلوم ہونا ممکن ہے، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جس بات کو مجمل بیان فرمایا ہے ہم بھی اسے مجمل ہی رہنے دیں اور یہ کہیں کہ یہ امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی اور صرف ایک فرقے کے سوا باقی سب جہنم رسید ہوں گے، پھر ہمیں یہ بھی کہنا چاہیے کہ ہر وہ شخص جو اس دین کی مخالفت کرے، جس پر نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم تھے، تو وہ ان فرقوں میں داخل ہے۔ ممکن ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ان فرقوں کے اصول کی طرف اشارہ فرمایا ہو۔ ہمیں اب تک ان میں سے صرف دس کا علم ہو سکا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کا اشارہ اصول کے ساتھ ساتھ فروع کی طرف بھی ہو جیسا کہ بعض لوگوں کا مذہب ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

اسوۂ نبوی سے مکمل وابستگی فرقۂ ناجیہ کی شناخت ہے

سوال فرقہ ناجیہ کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں؟ کیا ان خصوصیات میں کمی سے انسان فرقہ ناجیہ سے خارج ہو جاتا ہے؟

جواب فرقہ ناجیہ کی نمایاں خصوصات میں سب سے اہم چیز عقیدہ، عبادت، اخلاق اور معاملات میں نبی اکرم ﷺ کے طریقے کے ساتھ وابستگی اختیار کرنا ہے۔ ان چاروں امور میں فرقہ ناجیہ کا عمل دوسرے لوگوں سے نمایاں ہے۔ مثلاً: عقیدے کے حوالہ سے آپ دیکھیں گے کہ توحید خالص کے باب میں اللہ تعالیٰ کی الوہیت، ربوبیت اور اسماء وصفات کے اعتبار سے ان کا وہی عقیدہ ہے جو کتاب اللہ اور سنت رسول (ﷺ) سے ثابت ہے۔

عبادات کے اعتبار سے آپ دیکھیں گے کہ عبادات کی تمام اقسام' صفات' ان کی مقدار' اوقات' مقامات اور اسباب وغیرہ کے لحاظ سے ان کی مکمل وابستگی اور عمل اس طریقے کے مطابق ہے جو نبی ﷺ کا طریقہ تھا۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے دین میں بدعات کو ایجاد نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ حد درجہ ادب کو اختیار کر رکھا ہے اور عبادات میں کسی ایسی چیز کو داخل کر کے' جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم نہ دیا ہو' یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکام سے تجاوز نہیں کرتے۔

اخلاق کے اعتبار سے بھی آپ ملاحظہ کریں گے کہ حسن اخلاق میں یہ دوسرے لوگوں سے بہت ممتاز ہیں' مثلاً مسلمانوں کی ہمدردی و خیر خواہی' انبساط و انشراحِ قلب و صدر' خندہ پیشانی' شیریں کلامی' جود و سخا' شجاعت و بسالت اور اس نوع کے دیگر مکارم و محاسن خلاق میں ان کے قدم دوسرے لوگوں سے بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں۔

معاملات میں بھی آپ دیکھیں گے کہ یہ لوگوں کے ساتھ راست بازی کا معاملہ کرتے ہیں اور خرید و فروخت کے وقت ہر بات کو بیان کر دیتے ہیں جیسا کہ اس باب میں نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

«اَلْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا، فَإِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَا بُورِكَ لَهُمَا فِي بَيْعِهِمَا، وَإِنْ كَذَبَا وَكَتَمَا مُحِقَتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا»(صحيح البخاري، البيوع، باب إذا بين البيعان ولم يكتما ونصحا، ح:٢٠٧٩ وصحيح مسلم، البيوع، باب الصدق في البيع والبيان، ح:١٥٣٢)

''خرید و فروخت کرنے والوں دونوں کو اس وقت تک اختیار ہے' جب تک وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہو جائیں' اگر دونوں سچ بولیں اور (عیب کو) بیان کر دیں تو ان کی بیع میں برکت پیدا کر دی جائے گی اور اگر دونوں جھوٹ بولیں اور (عیب کو) چھپائیں تو ان کی بیع سے برکت کو ختم کر دیا جائے گا۔''

ان خصوصیات میں کمی انسان کو فرقہ ناجیہ سے خارج نہیں کرتی' البتہ لوگوں کے درجات ان کے اعمال کے مطابق ہوں گے۔ ہاں! توحید میں کمی' مثلاً اخلاص میں کوتاہی یا بدعت کا ارتکاب انسان کو بسا اوقات فرقہ ناجیہ سے خارج کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔

اخلاق و معاملات میں کمی سے انسان فرقہ ناجیہ سے خارج نہیں ہوتا' البتہ اس سے انسان کے مقام و مرتبہ میں ضرور کمی ہو جاتی ہے۔ اخلاق کے مسئلے میں کچھ تفصیل سے بیان کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اخلاقیات کے سلسلہ میں سب سے اہم بات اجتماعیت اور اس دین حق کو قائم کرنا ہے جس کے قائم کرنے کی اللہ تعالیٰ نے حسب ذیل آیت کریمہ میں ہمیں نصیحت فرمائی ہے:

﴿ ۞ شَرَعَ لَكُم مِّنَ ٱلدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِۦ نُوحًا وَٱلَّذِىٓ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِۦٓ إِبْرَٰهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰٓ أَنْ أَقِيمُوا۟ ٱلدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا۟ فِيهِ ﴾ (الشورى: ٤٢/ ١٣)

''اس نے تمھارے لیے دین کا وہی راستہ مقرر کیا جس (کے اختیار کرنے) کا نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی (اے محمد!) ہم نے تمھاری طرف وحی بھیجی ہے اور جس کا ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا (وہ یہ کہ) دین کو قائم رکھنا اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا۔''

اور اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ جن لوگوں نے دین میں پھوٹ ڈالی اور وہ فرقے فرقے ہو گئے حضرت محمد ﷺ ان

سے بری ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ ٱلَّذِينَ فَرَّقُواْ دِينَهُمْ وَكَانُواْ شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ﴾ (الأنعام: ٦/ ١٥٩)

’’جن لوگوں نے اپنے دین میں (بہت سے) رستے نکالے اور کئی کئی فرقے ہو گئے ان سے تم کو کچھ کام نہیں۔‘‘

اتفاق و اتحاد اور دلوں کی الفت و محبت فرقہ ناجیہ اہل سنت والجماعت کا نمایاں وصف ہے۔ اجتہاد کی وجہ سے اگر ان میں اجتہادی امور میں اختلاف ہو تو اس کی وجہ سے یہ آپس میں ایک دوسرے سے کینہ، عداوت یا بغض نہیں رکھتے بلکہ اجتہادی اختلاف کے باوجود وہ ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں حتی کہ وہ ایسے امام کے پیچھے بھی نماز پڑھ لیتے ہیں جسے اجتہادی صورت میں وہ بے وضو جانیں اور وہ امام اپنے آپ کو باوضو سمجھتا ہے، مثلاً ان میں سے اگر کوئی شخص کسی ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہو جس نے اونٹ کا گوشت کھایا ہوا اور اس امام کی رائے میں اونٹ کا گوشت کھانا ناقض وضو نہ ہو جبکہ مقتدی کے نزدیک اونٹ کا گوشت کھانا ناقض وضو ہو، تو اس امام کے پیچھے اس کی نماز صحیح ہوگی۔ البتہ انفرادی صورت میں ایسی حالت میں اس کی اپنی نماز صحیح نہیں ہوگی کیونکہ یہ اختلاف ایک ایسے امر میں ہے جس میں اجتہاد کی گنجائش ہے، لہٰذا درحقیقت یہ کوئی اختلاف ہی نہیں ہے کیونکہ ان دونوں اختلاف کرنے والوں نے اس دلیل کا اتباع کیا ہے جس کا اتباع کرنا واجب تھا اور اس سے اعراض کرنا جائز نہ تھا، اور ان کا خیال یہ ہے کہ ان کا کوئی بھائی اگر کسی عمل میں اتباع دلیل کی وجہ سے ان کی مخالفت کرے تو حقیقت میں وہ ان کی موافقت ہی کرتا ہے کیونکہ یہ تو خود اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ دلیل کا اتباع کیا جائے، خواہ وہ کہیں بھی ہو، لہٰذا اگر وہ کسی دلیل کی موافقت کی وجہ سے ان کی مخالفت کرتا ہے تو درحقیقت وہ ان کی موافقت ہی کرتا ہے کیونکہ وہ اس طرف جا رہا ہے جس کی طرف یہ دعوت دے رہے ہیں اور جس کی طرف یہ رہنمائی کر رہے ہیں اور وہ یہ کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (ﷺ) کے دامن سے وابستگی اختیار کی جائے۔ بہت سے اہل علم سے یہ بات مخفی نہیں کہ اس طرح کے امور میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی اختلاف رونما ہو گیا تھا حتی کہ خود نبیٔ اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں بھی مگر آپ نے ان میں سے کسی پر سختی نہ کی، مثلاً نبیٔ اکرم ﷺ جب غزوۂ احزاب سے لوٹے تو حضرت جبریل علیہ السلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے بنو قریظہ کی سرکوبی کے لیے نکلنے کو کہا تو نبیٔ اکرم ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اس مہم کے لیے روانہ کرتے ہوئے فرمایا:

«لاَ يُصَلِّيَنَّ أَحَدٌ الْعَصْرَ إِلاَّ فِي بَنِي قُرَيْظَةَ»(صحيح البخاري، صلاة الخوف، باب صلاة الطالب والمطلوب ... ح:٩٤٦ وصحيح مسلم، الجهاد والسير، باب المبادرة بالغزو ... ح:١٧٧٠ بلفظ: لاَ يُصَلِّيَنَّ أَحَدٌ الظُّهْرَ)

’’ہر شخص نماز عصر بنی قریظہ (کے محلے) ہی میں ادا کرے۔‘‘

حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ منورہ سے نکل کر بنو قریظہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے ہی میں تھے کہ نماز عصر کا وقت ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے نماز عصر کو مؤخر کر دیا اور انھوں نے اسے بنو قریظہ ہی میں وقت ختم ہو جانے کے بعد ادا کیا کیونکہ نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا تھا: ’’ہر شخص نماز عصر بنو قریظہ ہی میں ادا کرے۔‘‘ اور کچھ لوگوں نے نماز کو رستے میں وقت پر ادا کر لیا اور کہا کہ رسول اللہ

ﷺ کے فرمانے کا مقصد یہ تھا کہ ہم جلدی پہنچیں۔ آپ کے حکم دینے کا یہ مقصد نہیں تھا کہ ہم نماز میں اس قدر تاخیر کر دیں کہ وقت ختم ہو جائے ...... اور انہی کا موقف درست تھا...... لیکن اس کے باوجود نبیٔ اکرم ﷺ نے دونوں میں سے کسی گروہ پر بھی سختی نہ فرمائی اور نہ اس سے ان دونوں گروہوں میں کوئی باہمی عداوت یا اس نص کے فہم میں اختلاف کی وجہ سے کوئی بغض پیدا ہوا' اس لیے میری رائے میں سنت نبوی سے انتساب رکھنے والے تمام مسلمانوں کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ ایک امت بن جائیں' ان میں فرقہ پرستی نہیں ہونی چاہیے کہ کچھ لوگ ایک فرقے کی طرف نسبت اختیار کریں اور کچھ لوگ دوسرے اور تیسرے فرقے کی طرف اور پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا جائے حتی کہ زبانیں ایک دوسرے پر تیر برسانے لگ جائیں۔ ایک اجتہادی اختلاف کی وجہ سے نوبت بغض اور عداوت تک پہنچ جائے۔ یہاں اس طرح کے کسی خاص گروہ کا نام لینے کی ضرورت نہیں' ہر عقل مند انسان اسے خود سمجھ لے گا اور اس کے سامنے معاملہ بالکل واضح ہو جائے گا۔

میری رائے میں اہل سنت والجماعت کے لیے واجب ہے کہ وہ متحد ہو جائیں خواہ فہم نصوص کے اختلاف کی وجہ سے ان میں اختلاف ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اس معاملہ میں بحمد اللہ کافی گنجائش ہے اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ دلوں میں الفت ومحبت ہو اور آپس میں اتفاق واتحاد ہو۔ اس میں قطعاً کوئی شک وشبہ نہیں کہ مسلمانوں کے تمام دشمن یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان انتشار وخلفشار میں مبتلا ہو جائیں' کھلے دشمن بھی یہی چاہتے ہیں اور ان دشمنوں کی بھی یہی خواہش ہے جو بظاہر مسلمانوں یا اسلام کے ساتھ دوستی کا اظہار کرتے ہیں حالانکہ حقیقت میں وہ دوست نہیں ہیں' لہٰذا واجب ہے کہ ہم بھی اپنے آپ کو اس صفت کے ساتھ متصف کریں جو فرقہ ناجیہ کی نمایاں اور ممتاز صفت ہے' یعنی ہم سب ایک کلمہ پر متفق ومتحد ہو جائیں۔

سیرت طیبہ کا دامن مضبوطی سے تھامنا اعتدال اور اس سے تجاوز غلو ہے

سوال دین میں اعتدال سے کیا مراد ہے؟

جواب دین میں اعتدال سے مراد یہ ہے کہ انسان کو نہ تو اس قدر غلو سے کام لینا چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود سے بھی آگے بڑھ جائے اور نہ اس میں اس قدر کوتاہی ہونی چاہیے کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مقرر کردہ حدود میں کمی کر دے۔

دین میں راہ اعتدال یہ ہے کہ نبیٔ اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کے دامن کو مضبوطی سے تھام لیا جائے اور غلو یہ ہے کہ اس سے تجاوز کیا جائے اور کوتاہی یہ ہے کہ آپ کی سیرت تک پہنچا ہی نہ جائے۔ اس کی مثال یہ ہے جیسے ایک شخص کہے کہ میں رات کے قیام کا ارادہ رکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ساری زندگی نہ سوؤں کیونکہ نماز تمام عبادات سے افضل ہے' لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ ساری ساری رات بیدار رہوں تو یہ شخص اللہ تعالیٰ کے دین میں غلو کو اختیار کرنے والا ہے اور یہ حق پر نہیں ہے۔ نبیٔ اکرم ﷺ کے عہد میں یہ واقعہ پیش بھی آیا کہ کچھ لوگ جمع ہوئے اور ان میں سے ایک نے کہا کہ میں رات بھر قیام کروں گا اور کبھی نہیں سوؤں گا' دوسرے نے کہا میں ساری زندگی روزے رکھتا رہوں گا اور کبھی بھی روزہ نہیں چھوڑوں گا اور تیسرے نے کہا کہ میں عورتوں سے شادی نہیں کروں گا' نبیٔ اکرم ﷺ کو جب یہ بات پہنچی تو آپ نے فرمایا:

«مَا بَالُ أَقْوَامٍ قَالُوا كَذَا وَكَذَا؟ لٰكِنِّي أُصَلِّي وَأَنَامُ، وَأَصُومُ وَأُفْطِرُ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي» (صحيح مسلم، النكاح، باب استحباب النكاح لمن تاقت نفسه إليه . . . ح: ١٤٠١)

''ان لوگوں کو کیا ہوا ہے' جنھوں نے یہ یہ باتیں کی ہیں؟ میں تو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں' روزہ بھی رکھتا ہوں اور چھوڑ بھی دیتا ہوں اور عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں چنانچہ جس شخص نے میری سنت سے منہ موڑا وہ مجھ سے نہیں ہے۔''

اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

«أَنْتُمُ الَّذِينَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا؟ أَمَا وَاللهِ إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ، لٰكِنِّي أَصُومُ وَأُفْطِرُ، وأُصَلِّي وَأَرْقُدُ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي»(صحيح البخاري، النكاح، باب الترغيب في النكاح، ح: ٥٠٦٣)

''تمھی لوگوں نے یہ یہ باتیں کی ہیں' اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اس کا زیادہ تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں' لیکن میں روزہ رکھتا ہوں اور چھوڑ بھی دیتا ہوں' نماز پڑھتا ہوں اور سو بھی جاتا ہوں اور عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں' لہٰذا جس نے میری سنت سے منہ موڑا وہ مجھ سے نہیں ہے۔''

ان لوگوں نے دین میں غلو سے کام لیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے براءت کا اظہار فرما دیا' کیونکہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی سنت سے منہ موڑا تھا' جب کہ سنت یہ ہے کہ روزہ رکھا بھی جائے اور چھوڑ بھی دیا جائے' رات کو قیام بھی کیا جائے اور آرام بھی اور عورتوں سے نکاح بھی کیا جائے۔ کوتاہی وہ شخص کرتا ہے جو یہ کہے کہ مجھے نفل عبادت کی ضرورت نہیں' لہٰذا میں نفل ادا نہیں کروں گا' میں صرف فرض ہی ادا کیا کروں گا' ایسا شخص بسا اوقات فرائض میں بھی کوتاہی کرنے لگتا ہے۔ معتدل وہ ہے جو اس طریقے پر چلے جو رسول اکرم ﷺ اور آپ کے خلفائے راشدین کا طریقہ تھا۔

دوسری مثال ملاحظہ فرمائیں: تین اشخاص کے سامنے ایک فاسق آدمی ہے' تو ان میں سے ایک شخص کہتا ہے کہ میں اس فاسق آدمی کو سلام نہیں کہوں گا' اسے چھوڑ دوں گا' اس سے دور ہو جاؤں گا اور اس سے کلام نہیں کروں گا۔ دوسرا شخص کہتا ہے کہ میں اس فاسق کے ساتھ چلوں گا' اسے سلام کہوں گا' اس سے خندہ پیشانی سے پیش آؤں گا' اپنے ہاں اسے مدعو کروں گا اور خود بھی اس کی دعوت کو قبول کروں گا کیونکہ میرے نزدیک وہ ایک نیک آدمی ہی کی طرح ہے اور تیسرا شخص کہتا ہے کہ میں اس فاسق آدمی کو اس کے فسق کی وجہ سے ناپسند اور اس کے ایمان کی وجہ سے پسند کرتا ہوں اور اس سے کنارہ کشی اختیار نہیں کروں گا سوائے اس کے کہ کنارہ کشی اس کی اصلاح کا سبب ہو اور اگر کنارہ کشی اس کی اصلاح کا سبب نہ بنے بلکہ اس کے فسق میں اضافے کا سبب بن جائے تو میں اس سے کنارہ کشی نہیں کروں گا۔ ان تین اشخاص کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ ان میں سے پہلے شخص کا عمل افراط اور غلو پر مبنی ہے' دوسرے کا تفریط اور کمی پر جب کہ تیسرے کا عمل معتدل ہے۔ اسی طرح تمام عبادات و معاملات میں بھی لوگوں کا یہی حال ہے کہ ان میں سے بعض کوتاہ ہیں' بعض غالی اور بعض معتدل۔

تیسری مثال ملاحظہ فرمائیں: ایک شخص اپنی بیوی کا اسیر ''زن مرید'' ہے' وہ جس طرف چاہے اس کے منہ کو پھیر دیتی ہے اور وہ اسے گناہ سے روکتا ہے نہ کسی اچھے کام کی ترغیب دیتا ہے بلکہ عورت اس کی عقل پر سوار اور اس پر حاکم بن بیٹھی ہے۔ دوسرا شخص اپنی بیوی کے ساتھ تکبر و غرور کا معاملہ کرتا' اسے پرِ کاہ کی حیثیت نہیں دیتا بلکہ اسے اپنے گھریلو ملازم سے بھی کم تر سمجھتا ہے اور تیسرے شخص کا طرز عمل معتدل ہے' وہ اس کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ کرتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے:

﴿ وَلَهُنَّ مِثْلُ ٱلَّذِى عَلَيْهِنَّ بِٱلْمَعْرُوفِ ﴾ (البقرة: ٢/ ٢٢٨)

''اور عورتوں کا حق (مردوں پر) ویسا ہی ہے جیسے دستور کے مطابق (مردوں کا حق) عورتوں پر ہے۔''

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«لاَ يَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً إِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ» (صحيح مسلم، الرضاع، باب الوصية بالنساء، ح: ١٤٦٧)

''کوئی مومن مرد اپنی مومن بیوی سے بغض نہ رکھے' اگر اسکی کوئی عادت اسے ناپسند ہوگی تو کوئی دوسری عادت پسند بھی ہوگی۔''

ان تینوں میں سے یہ آخری شخص معتدل ہے' پہلا اپنی بیوی کے بارے میں غالی ہے اور دوسرا کوتاہ۔ دیگر تمام اعمال و عبادات کو بھی اس پر قیاس کر لیجیے۔

ایمان دل سے تصدیق' زبان سے اظہار اور اعضا سے عمل کا نام ہے

سوال اہل سنت والجماعت کے ہاں ایمان کی تعریف کیا ہے اور کیا ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے؟

جواب اہل سنت والجماعت کے نزدیک ایمان دل کے ساتھ تصدیق' زبان سے اظہار اور اعضا کے ساتھ عمل کرنے کا نام ہے' ایمان گویا تین امور پر مشتمل ہے: ❁ اقرار بالقلب ''دل کے ساتھ اعتراف'' ❁ نطق باللسان ''زبان سے شہادت'' ❁ عمل بالجوارح ''اعضا کے ساتھ عمل۔''

ایمان کی جب یہ تعریف ہے' تو اس میں کمی بیشی ہو سکتی ہے کیونکہ دل کے ساتھ اعتراف کے درجات مختلف ہو سکتے ہیں۔ کسی خبر کا اقرار اس چیز کے اقرار کی طرح نہیں ہو سکتا جس کا خود مشاہدہ کیا ہو' اسی طرح ایک آدمی کی خبر کا اقرار اس خبر کے اقرار کی طرح نہیں ہو سکتا جسے دو آدمیوں نے بیان کیا ہو' اسی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ رَبِّ أَرِنِى كَيْفَ تُحْىِ ٱلْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِى ﴾ (البقرة: ٢/ ٢٦٠)

''اے پروردگار! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیونکر زندہ کرے گا؟ اللہ نے فرمایا: کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتے؟ انھوں نے کہا: کیوں نہیں! لیکن (میں دیکھنا) اس لیے (چاہتا ہوں) کہ میرا دل اطمینان کامل حاصل کر لے۔''

دل کے اقرار' طمانیت اور سکون کی وجہ سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور اسے انسان خود بھی محسوس کرتا ہے' مثلاً جب وہ کسی مجلسِ ذکر میں ہو اور اس میں وعظ و نصیحت اور جہنم و جنت کا ذکر ہو تو ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے اور انسان یوں محسوس کرتا ہے گویا جہنم و جنت کا وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا ہے اور جب وہ اس مجلس سے اٹھ جائے اور اس پر غفلت طاری ہو جائے تو دل کے اس

یقین میں کمزوری آجاتی ہے۔

اسی طرح قول سے بھی ایمان میں اضافہ ہوتا ہے کہ جو شخص دس بار اللہ کا ذکر کرے وہ اس شخص کی طرح تو نہیں ہوسکتا جس نے سو بار اللہ کا ذکر کیا ہو' پہلے کی نسبت اس دوسرے شخص کے ایمان میں بدرجہا اضافہ ہوگا۔ اسی طرح جس شخص نے عبادت کو بہت کامل طریقے سے ادا کیا ہو اس کا ایمان اس شخص کے ایمان سے کہیں بڑھ کر ہوگا جس نے عبادت کو ناقص رہنے دیا ہو۔ اسی طرح جب کوئی انسان اپنے اعضاء و جوارح کے ساتھ دوسرے انسان کی نسبت زیادہ عمل سرانجام دے تو دوسرے کی نسبت اس کا ایمان بہرحال بہت زیادہ ہوگا' قرآن و سنت سے ایمان میں کمی بیشی ثابت ہے' مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَيَزْدَادَ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا ﴾

(المدثر: ٧٤/ ٣١)

''اور ان (جہنم کے فرشتوں) کا شمار کافروں کی آزمائش کے لیے مقرر کیا ہے اور اس لیے کہ اہل کتاب یقین کریں اور مومنوں کا ایمان اور زیادہ ہو۔''

اور مزید فرمایا:

﴿ وَإِذَا مَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُم مَّن يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَٰذِهِ إِيمَانًا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَزَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿١٢٤﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿١٢٥﴾ ﴾ (التوبة: ٩/ ١٢٤ـ١٢٥)

''اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو بعض منافق (استہزا کرتے اور) پوچھتے ہیں کہ اس سورت نے تم میں سے کس کا ایمان زیادہ کیا ہے' تو جو ایمان والے ہیں ان کا تو ایمان زیادہ کیا اور وہ خوش ہوتے ہیں اور جن کے دلوں میں مرض ہے ان کے حق میں خبث پر خبث زیادہ کیا اور وہ مرے بھی تو کافر کے کافر۔''

اور صحیح حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«مَا رَأَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَّدِيْنٍ أَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ إِحْدَاكُنَّ»(صحيح البخاري، الحيض، باب ترك الحائض الصوم، ح: ٣٠٤)

''میں نے دین اور عقل میں ناقص تم عورتوں سے زیادہ اچھے بھلے آدمی کی مت مارنے والا کسی کو نہیں پایا۔''

معلوم ہوا کہ ایمان میں اضافہ اور کمی ہوسکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایمان میں اضافے کا سبب کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایمان میں اضافے کے کئی اسباب ہیں' مثلاً:

- **اللہ تعالیٰ کی اس کے اسماء و صفات کے ساتھ معرفت:** انسان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے اسماء و صفات کے بارے میں جس قدر زیادہ معرفت حاصل ہوگی' اسی قدر بلاشک و شبہ اس کے ایمان میں اضافہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اہل علم جنھیں اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کا وہ علم ہے جو دوسروں کو نہیں ہے تو اس اعتبار سے دوسروں کی نسبت ان کا ایمان زیادہ قوی ہوتا ہے۔
- **اللہ تعالیٰ کی کونی و شرعی نشانیوں پر غور کرنا:** انسان اللہ تعالیٰ کی ان نشانیوں پر' جو اس کی مخلوقات ہیں' جب بھی غور کرتا ہے اس

کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَفِي ٱلْأَرْضِ ءَايَٰتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ﴿٢٠﴾ وَفِيٓ أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ﴿٢١﴾ ﴾ (الذاريات: ٥١/ ٢٠-٢١)

''اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں (بہت سی) نشانیاں ہیں اور خود تمھارے نفوس میں بھی' تو کیا تم دیکھتے نہیں؟''

اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیات کریمہ ہیں' جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات پر غور و فکر کرنے سے انسان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔

❀ **کثرت طاعات:** انسان جب کثرت سے اللہ تعالیٰ کی طاعات بجالاتا ہے تو اس سے اس کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے' خواہ یہ طاعات قولی ہوں یا فعلی' ذکر ایمان کی کمیت و کیفیت میں اضافہ کر دیتا ہے' اسی طرح نماز' روزہ اور حج سے بھی ایمان کی کمیت و کیفیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس ایمان کو نقصان پہنچانے والے اسباب حسب ذیل ہیں:

○ **جہالت:** اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے بارے میں جہالت ایمان میں کمی کا موجب ہے' کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے بارے میں انسان کی معرفت میں کمی ہوگی تو اس سے اس کے ایمان میں بھی کمی واقع ہو جائے گی۔

○ **غور و فکر نہ کرنا:** اللہ تعالیٰ کی کونی و شرعی نشانیوں میں غور و فکر نہ کرنا بھی ایمان میں کمی کا سبب بنتا ہے یا کم از کم اس سے ایمان جامد ہو جاتا ہے اور نشو و نما نہیں پاتا۔

○ **گناہ کا ارتکاب:** گناہ کے دل اور ایمان پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں' اسی لیے نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَاَ يَزْنِي الزَّانِي حِيْنَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ»(صحيح البخاري، الحدود، باب الزنا وشرب الخمر، ح: ٦٧٧٢ وصحيح مسلم، الإيمان، باب بيان نقصان الإيمان بالمعاصي ... ح: ٥٧)

''زانی جب زنا کرتا ہے تو وہ مومن نہیں رہتا۔''

○ **ترک طاعت:** ترک طاعت بھی ایمان میں کمی کا سبب ہے۔ اگر طاعت واجب ہو اور اس نے عذر کے بغیر اسے ترک کیا ہو تو یہ ایک ایسی کمی ہے جس پر اسے نہ صرف ملامت کی جائے گی بلکہ سزا بھی دی جائے گی اور اگر اطاعت واجب نہ تھی یا واجب تو تھی مگر اس نے اسے کسی شرعی عذر کی وجہ سے ترک کیا تو یہ ایک ایسی کمی ہے کہ اس پر اسے ملامت نہیں کی جائے گی۔ نبی ﷺ نے عورتوں کو عقل اور دین کے اعتبار سے ناقص قرار دیا اور دین کے اعتبار سے ناقص ہونے کا سبب یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ حالت حیض میں نماز نہیں پڑھتیں اور روزہ نہیں رکھتیں اور پھر اس حالت میں ترک صوم و صلوٰۃ کی وجہ سے وہ قابل ملامت بھی نہیں بلکہ انھیں حکم ہی یہی ہے کہ اس حالت میں وہ نماز اور روزے کو ترک کر دیں' چنانچہ جب وہ اپنے اس شرعی عذر کی وجہ سے ان کاموں کو سرانجام دینے سے قاصر ہیں جنھیں سرانجام دینے میں مردوں کو کوئی عذر نہیں ہے تو اس وجہ سے وہ مردوں کے مقابلے میں ناقص قرار پائیں۔

حدیث جبریل اور حدیث عبدالقیس میں تطبیق کی صورت کیا ہے؟

سوال حدیث جبریل میں نبی ﷺ نے ایمان کی تعریف یہ بیان فرمائی ہے:

«الإِيمَانُ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللهِ، وَمَلاَئِكَتِهِ، وَكُتُبِهِ، وَرُسُلِهِ، وَالْيَوْمِ الآخِرِ، وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ»(صحيح البخاري، الإيمان، باب سؤال جبريل النبي ﷺ عن الإيمان والإسلام والإحسان، ح: ٥٠ وصحيح مسلم، الإيمان، باب بيان الإيمان والإسلام والإحسان . . .، ح: ٨)

’’(ایمان یہ ہے) کہ تم اللہ تعالیٰ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان لاؤ اور اچھی اور بری تقدیر پر بھی ایمان لاؤ۔‘‘

اور حدیث وفد عبدالقیس میں نبی ﷺ نے ایمان کی تعریف یہ بیان فرمائی ہے:

«بِشَهَادَةِ أَنْ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ وَحْدَهُ لاَ شَرِيكَ لَهُ، وَإِقَامِ الصَّلاَةِ، وَإِيْتَاءِ الزَّكَاةِ، وَأَدَاءِ الْخُمُسِ مِنَ الْغَنِيمَةِ»(صحيح البخاري، الإيمان، باب أداء الخمس من الإيمان، ح: ٥٣ وصحيح مسلم، الإيمان، باب الأمر بالإيمان بالله تعالى ورسوله ﷺ . . . ح: ١٧)

’’ایمان یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور مال غنیمت میں سے خمس ادا کرو۔‘‘

ان دونوں حدیثوں میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی؟

جواب اس سوال کے جواب سے قبل میں یہ بات کہنا پسند کروں گا کہ کتاب وسنت میں قطعاً کوئی تعارض نہیں ہے، نہ تو قرآن مجید کا کوئی مقام کسی دوسرے مقام سے متعارض ہے اور نہ رسول اللہ ﷺ کی سنت صحیحہ ہی میں کوئی تعارض ہے۔ قرآن وسنت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو امر واقع کے خلاف ہے کیونکہ امر واقع حق ہے اور کتاب وسنت بھی حق ہے لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ حق میں تناقض ہو، اس قاعدے کو سمجھ لینے سے بہت سے اشکالات دور ہوجاتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ ٱلْقُرْءَانَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ ٱللَّهِ لَوَجَدُوا۟ فِيهِ ٱخْتِلَٰفًا كَثِيرًا ﴾ (النساء: ٤/ ٨٢)

’’بھلا یہ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کا (کلام) ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔‘‘

جب قرآن مجید میں کوئی اختلاف نہیں تو نبی ﷺ کی احادیث میں بھی کوئی اختلاف نہیں۔ نبیٔ اکرم ﷺ نے اگر ایک حدیث میں ایمان کی کوئی تعریف بیان فرمائی ہے اور دوسری حدیث میں کوئی دوسری تعریف بیان فرمائی ہے، جو آپ کی نظر میں پہلی تعریف کے خلاف ہے، لیکن اگر آپ ان دونوں تعریفوں پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حدیث جبریل میں نبی ﷺ نے دین کو درج ذیل تین اقسام میں تقسیم فرمایا ہے: ① اسلام ② ایمان ③ احسان۔

اور حدیث وفد عبدالقیس میں آپ نے صرف ایک ہی قسم یعنی اسلام کو بیان فرمایا ہے اور جب اسلام کا علی الاطلاق ذکر ہو تو اس میں ایمان بھی داخل ہوتا ہے کیونکہ شعائر اسلام کو ایک مومن ہی قائم کرسکتا ہے۔ جب اکیلے اسلام کا ذکر ہو تو اس میں ایمان بھی شامل ہوتا ہے اور جب تنہا ایمان کا ذکر ہو تو اس میں اسلام بھی داخل ہوتا ہے اور جب اسلام و ایمان دونوں کا ذکر ہو تو اس صورت میں ایمان کا تعلق دلوں سے اور اسلام کا تعلق جسمانی اعضا سے ہوتا ہے۔ ایک طالب علم کے لیے یہ بہت اہم نکتہ ہے، چنانچہ جب اکیلے اسلام کا ذکر ہو تو اس میں ایمان بھی داخل ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ ٱلدِّينَ عِندَ ٱللَّهِ ٱلْإِسْلَـٰمُ ﴾ (آل عمران: ۳/۱۹)

''دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔''

اور معلوم ہے کہ دین اسلام، عقیدہ، ایمان اور احکام شریعت کے مجموعے کا نام ہے اور جب اکیلے ایمان کا ذکر ہو تو اس میں اسلام بھی داخل ہوتا ہے اور جب دونوں اکٹھے مذکور ہوں تو ایمان کا تعلق دلوں سے اور اسلام کا تعلق جسمانی اعضاء سے ہوتا ہے، اسی لیے بعض سلف نے کہا ہے کہ ''اسلام علانیہ ہے اور ایمان مخفی'' کیونکہ وہ دل میں ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک منافق بظاہر نماز پڑھتا، صدقہ وخیرات کرتا اور روزے رکھتا ہے تو ایسا شخص ظاہری طور پر تو مسلمان ہے لیکن وہ مومن نہیں ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَقُولُ ءَامَنَّا بِٱللَّهِ وَبِٱلْيَوْمِ ٱلْـَٔاخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ ۝٨ ﴾ (البقرة: ۲/۸)

''اور بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، حالانکہ وہ ایمان نہیں رکھتے۔''

ایمان کی ستّر سے زیادہ شاخیں ہیں

سوال ایمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، یوم آخرت اور اچھی اور بری تقدیر کے ساتھ ایمان لایا جائے۔ اور ایک حدیث میں نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«اَلْإِيمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُونَ بَابًا» (جامع الترمذي، الإيمان، باب ماجاء في استكمال الإيمان والزيادة والنقصان، ح: ٢٦١٤ وسنن ابن ماجه، المقدمة، باب في الإيمان، ح: ٥٧)

''ایمان کے ستر سے زیادہ دروازے ہیں۔'' ان دونوں میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی؟

جواب ایمان یعنی عقیدے کے چھ اصول ہیں جو حدیث جبریل علیہ السلام میں مذکور ہیں۔ جبریل علیہ السلام نے جب نبی ﷺ سے ایمان کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

«اَلْإِيمَانُ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ، وَمَلَائِكَتِهِ، وَكُتُبِهِ، وَرُسُلِهِ، وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ» (صحيح البخاري، الإيمان، باب سؤال جبريل النبي ﷺ عن الإيمان والإسلام والإحسان، ح: ٥٠ وصحيح مسلم، الإيمان، باب بيان الإيمان والإسلام والإحسان ....، ح: ٨)

''ایمان یہ ہے کہ تم اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان لاؤ اور اچھی اور بری تقدیر پر بھی ایمان لاؤ۔''

اور وہ ایمان جو اعمال اور ان کے انواع واجناس پر مشتمل ہے، اس کی ستر سے زیادہ شاخیں ہیں، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت کریمہ میں نماز کو ایمان کے نام سے موسوم فرمایا ہے:

﴿ وَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَـٰنَكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ بِٱلنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝١٤٣ ﴾ (البقرة: ۲/۱۴۳)

''اور اللہ ایسا نہیں کہ تمھارے ایمان (نماز) کو یوں ہی ضائع کر دے۔ اللہ تو لوگوں پر بڑا مہربان (اور) صاحب رحمت ہے۔''

مفسرین نے بیان کیا ہے کہ اس آیت کریمہ میں ایمان سے مراد بیت المقدس کی طرف منہ کر کے ادا کی جانے والی نماز ہے

کیونکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کے حکم سے قبل مسجد اقصیٰ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کیا کرتے تھے۔

مسجد میں نمازی کی حاضری اس کے ایمان کی دلیل ہے

سوال کیا محض مساجد میں آنے جانے کی بنیاد پر کسی شخص کے ایمان کی گواہی دی جا سکتی ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے؟

جواب جی ہاں، اس میں کوئی شک نہیں کہ مساجد میں نمازوں کے لیے آنے والے شخص کی حاضری اس کے ایمان کی دلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے ساتھ ایمان ہی نے اسے گھر سے نکلنے اور چل کر مسجد میں جانے پر مجبور کیا ہے۔ سائل نے جو یہ کہا کہ ''جیسا کہ حدیث میں آیا ہے'' تو اس کا اشارہ نبی ﷺ سے مروی درج ذیل حدیث کی طرف ہے:

«إِذَا رَأَيْتُمُ الرَّجُلَ يَتَعَاهَدُ الْمَسْجِدَ فَاشْهَدُوا لَهُ بِالإِيمَانِ»(جامع الترمذي، الإيمان، باب ماجاء في حرمة الصلاة، ح:٢٦١٧)

''جب تم کسی شخص کو مسجد میں آتا جاتا دیکھو تو اس کے ایمان کی گواہی دو۔''

لیکن یہ حدیث ضعیف ہے، صحیح سند کے ساتھ نبی ﷺ سے یہ بات ثابت نہیں ہے۔

شیطانی وسوسوں سے ڈرنا ہی ایمانِ صریح ہے

سوال ایک شخص کے دل میں شیطان نے اللہ عزوجل کے بارے میں بہت زیادہ وسوسے پیدا کر دیے ہیں اور وہ اس سے بہت ڈرتا ہے تو اس سلسلہ میں آپ کیا رہنمائی فرمائیں گے؟

جواب سائل کے بارے میں جو یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ ان وسوسوں کے نتائج سے بہت ڈرتا ہے، تو اس کے لیے خوش خبری یہ ہے کہ ان کے نتائج اچھے ہی ہوں گے۔ ان وسوسوں کے ذریعے سے شیطان مومنوں پر حملہ آور ہوتا ہے تاکہ ان کے دلوں میں صحیح عقیدے کو خراب کر دے، انہیں نفسیاتی وفکری قلق واضطراب میں مبتلا کر دے تاکہ ان کا ایمان مکدر ہو جائے بلکہ اگر وہ سچے مومن ہیں تو ان کی زندگی ہی کو مکدر کر دے۔

اہل ایمان کو پیش آنے والی یہ کوئی پہلی یا آخری بات نہیں ہے بلکہ جب تک دنیا میں کوئی مومن ہے، اس طرح کی باتیں پیش آتی رہیں گی۔ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی اس طرح کی باتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کچھ لوگ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ سے پوچھا کہ ہم اپنے دلوں میں بعض ایسی باتیں پاتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی انھیں زبان پر لانا بھی بہت گراں سمجھتا ہے۔ آپ نے فرمایا:

«أَوَ قَدْ وَجَدْتُمُوهُ؟ قَالُوا: نَعَمْ، قَالَ: ذَاكَ صَرِيحُ الإِيمَانِ»(صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان الوسوسة في الإيمان ... ح:١٣٢)

''کیا تم اس چیز کو پاتے ہو؟'' انہوں نے کہا: ''جی ہاں!'' آپ نے فرمایا: ''یہی ایمان صریح ہے۔''

ایک دوسری روایت میں نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«يَأْتِي الشَّيْطَانُ أَحَدَكُمْ فَيَقُولُ مَنْ خَلَقَ كَذَا؟ مَنْ خَلَقَ كَذَا؟ حَتَّى يَقُولَ مَنْ خَلَقَ رَبَّكَ؟! فَإِذَا بَلَغَهُ فَلْيَسْتَعِذْ بِاللهِ وَلْيَنْتَهِ»(صحيح البخاري، بدء الخلق، باب صفة إبليس وجنوده، ح:٣٢٧٦ وصحيح مسلم، الإيمان، باب بيان الوسوسة في الإيمان، ح:١٣٤)

''تم میں سے کسی ایک کے پاس شیطان آ کر کہتا ہے کہ (مخلوق کو) اس طرح کس نے پیدا کیا ہے؟ اس طرح کس نے پیدا کیا؟ حتیٰ کہ وہ کہتا ہے کہ تیرے رب کو کس نے پیدا کیا؟ جب وہ یہاں تک پہنچ جائے تو اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگے اور رک جائے۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک شخص نے عرض کیا: میرے دل میں ایسے خیالات آتے ہیں کہ انھیں زبان پر لانے سے مجھے یہ بات زیادہ پسند ہے کہ میں جل کر کوئلہ ہو جاؤں۔ نبی ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا:

«اَلْحَمْدُ للهِ الَّذِي رَدَّ أَمْرَهُ إِلَى الْوَسْوَسَةِ»(سنن أبي داود، الأدب، باب في رد الوسوسة، ح:٥١١٢)

''سب تعریف اس اللہ ہی کے لیے ہے جس نے اس کے معاملے کو وسوسہ کی طرف لوٹا دیا ہے۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کتاب الایمان میں فرماتے ہیں کہ مومن شیطانی وسوسوں میں مبتلا ہو جاتا ہے جو کفر کے ایسے وسوسے ہوتے ہیں جن سے اس کا سینہ تنگ ہو جاتا ہے' جیسا کہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا تھا: یا رسول اللہ! ہم میں کسی ایک کے دل میں ایسا خیال بھی آ جاتا ہے کہ اسے زبان پر لانے کی نسبت یہ کہیں زیادہ پسند ہے کہ وہ آسمان سے زمین پر گر جائے۔ نبیٔ اکرم ﷺ نے یہ سن کر فرمایا:

«ذَاكَ صَرِيحُ الْإِيمَانِ»(صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان الوسوسة في الإيمان ... ح:١٣٢)

''یہ تو خالص ایمان ہے۔''

ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: (صحابی نے عرض کیا کہ) وہ اسے زبان پر لانا بہت گراں محسوس کرتا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«اَلْحَمْدُ للهِ الَّذِي رَدَّ كَيْدَهُ إِلَى الْوَسْوَسَةِ»(سنن أبي داود، الأدب، باب في رد الوسوسة، ح:٥١١٣)

''سب تعریف اس اللہ ہی کے لیے ہے جس نے اس کے مکر وفریب کو وسوسہ کی طرف لوٹا دیا ہے۔''

یعنی اس طرح کے وساوس کا پیدا ہونا' جب کہ مومن اسے سخت ناپسند کرتا اور اسے اپنے دل سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہو' خالص ایمان ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی مجاہد کے پاس کوئی دشمن آ جائے اور وہ اسے دور ہٹاتے ہوئے اس پر غالب آ جائے تو یہ عظیم جہاد ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے آگے فرمایا ہے: ''یہی وجہ ہے کہ طالب علم اور عبادت گزار لوگوں کو ایسے وسوسے اور شبہات پیش آتے ہیں' جو دوسرے لوگوں کو پیش نہیں آتے کیونکہ دوسرے لوگ تو اللہ تعالیٰ کی شریعت اور اس کے رستے پر چلتے ہی نہیں بلکہ وہ تو اپنے رب سے غافل ہو کر خواہشات نفس کے پجاری بن گئے ہوتے ہیں اور یہی شیطان کا مطلوب و مقصود ہے' لیکن اس کے برعکس جو لوگ علم و عبادت کے ساتھ اپنے رب تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں' شیطان ان کا دشمن ہے اور وہ

انھیں اللہ تعالیٰ سے دور لے جانا چاہتا ہے۔'' ①

میں اس سائل سے یہ بھی کہوں گا کہ جب تمھارے سامنے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ وسوسے شیطانی ہیں' تو انھیں دور ہٹادو یہ تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکیں گے بشرطیکہ تم ان کے خلاف جہاد کرتے رہو۔ جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّ اللهَ تَجَاوَزَ لِي عَنْ أُمَّتِي مَا وَسْوَسَتْ بِهِ صُدُورُهَا مَا لَمْ تَعْمَلْ أَوْ تَكَلَّمْ»(صحيح البخاري، العتق، باب الخطأ والنسيان في العتاقة والطلاق، ح:٢٥٢٨ وصحيح مسلم، ح:١٢٧)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے میرے لیے میری امت کے سینوں میں پیدا ہونے والے وسوسوں سے درگزر فرمایا ہے' جب تک وہ ان کے مطابق عمل نہ کرے یا ان کے مطابق بات نہ کرے۔''

اگر آپ سے یہ کہا جائے کیا آپ اپنے دل میں آنے والے ان وسوسوں پر اعتقاد رکھتے ہیں؟ یا کیا آپ انھیں حق سمجھتے ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی اس طرح صفت بیان کریں جس طرح آپ کے دل میں وسوسہ آتا ہے؟ تو آپ اس کا یہ جواب دیں کہ ہمیں اس طرح کی بات زبان پر لانا زیب نہیں دیتا' اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے اور یہ تو بہت بڑا بہتان ہے' آپ دل اور زبان سے اس کی تردید کریں' اس سے نفرت کرتے ہوئے سب سے زیادہ دور ہو جائیں تو تب دل میں آنے والے یہ خیالات محض وسوسے ہیں اور شیطان کے جال ہیں' جو انسان کے جسم میں خون کی گردش کی طرح چلتا ہے' تاکہ تمھیں دین سے دور لے جائے اور دین کو تم پر خلط ملط کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ معمولی اور حقیر باتوں کے بارے میں شیطان تمھارے دل میں شک وشبہ پیدا نہیں کرتا' مثلاً تم ہمیشہ دنیا کے ان بڑے بڑے شہروں کے بارے میں سنتے رہتے ہو جو مشرق ومغرب کے ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کی آبادی بھی بہت زیادہ ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ انسانوں سے بھرے ہوئے ہیں' مگر ان شہروں کے وجود کے بارے میں تمھارے دل میں کبھی کوئی شک پیدا نہیں ہوا اور نہ کبھی دل میں یہ خیال آیا ہے کہ یہ تو ویرانے اور اجڑے ہوئے دیار ہیں' رہنے سہنے کے قابل ہی نہیں اور نہ ان میں کوئی رہ رہا ہے کیونکہ اس طرح کے کاموں میں تشکیک پیدا کرنے سے شیطان کو کوئی غرض نہیں' البتہ شیطان کی بڑی غرض یہ ضرور ہے کہ وہ مومن کے ایمان کو خراب کر دے۔ وہ اپنے سواروں اور پیادوں کے ساتھ مل کر کوشش کرتا ہے کہ مومن کے دل سے علم وہدایت کی روشنی کو بجھا دے اور اسے شک اور حیرت کی تاریکی میں مبتلا کر دے۔

نبیٔ اکرم ﷺ نے ہمارے لیے ایک ایک مفید دوا کی نشان دہی فرما دی ہے جو موجب شفا ہے اور وہ یہ کہ آپ نے فرمایا ہے کہ وسوسے کی حالت میں انسان أعوذ باللّٰه پڑھ لے اور وسوسے کو ترک کر دے۔ جب انسان وسوسے کو ترک کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگا رہے تاکہ اس کی رضا اور اجر وثواب کو حاصل کر سکے تو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے وسوسہ ختم ہو جائے گا۔ ان تمام خیالات کو اپنے دل سے جھٹک دیا کرو جبکہ تم اللہ کی عبادت کر رہے ہو' اس سے دعا کر رہے ہو اور اس کی عظمت وبزرگی کے گن گا رہے ہو۔ اگر تم کسی کو سن لو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں وہ کچھ کہہ رہا ہے' جو تمھارے دل میں بصورت وسوسہ پیدا ہو رہا ہے' تو تمھارا بس چلے تو تم اسے قتل کر دو' تو اس سے بھی معلوم ہوا کہ تمھارے دل میں پیدا ہونے والی ان باتوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے' بلکہ

---

① كتاب الايمان' ص: 147 طبع هنديه

یہ محض خیالات اور وسوسے ہیں، جن کی کوئی اصل نہیں جیسے کسی شخص نے اپنے کپڑوں کو دھویا ہو اور اس کا لباس پاک صاف ہو مگر اس کے دل میں بار بار یہ خیال آئے کہ شاید اس کا کپڑا پاک نہیں، شاید ایسے کپڑے میں نماز نہیں ہوتی تو اس صورت میں اس طرح کے وسوسوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دینی چاہیے۔ میری نصیحت کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

- اس صورت میں أعـوذ باللّٰہ پڑھ لیا جائے اور دل میں آنے والے خیالات بالکل ترک کر دیے جائیں جیسا کہ نبی ﷺ نے حکم فرمایا ہے۔
- اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے اور دل پر ضبط کر کے ان وسوسوں کو جھٹک دیا جائے۔
- عبادت اور عمل کو انہماک اور استغراق کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت بجالاتے ہوئے اور اس کی رضا کے حصول کے لیے سرانجام دیا جائے۔
- انسان اگر مکمل توجہ، انہماک اور استغراق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے گا تو ان شاء اللہ تعالیٰ یہ سارے وسوسے کافور ہو جائیں گے۔
- اللہ تعالیٰ سے کثرت کے ساتھ دعا اور التجا بھی کی جائے کہ وہ اپنے فضل وکرم کے ساتھ ان وسوسوں سے محفوظ رکھے۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر برائی اور ہر ناپسندیدہ بات سے عافیت وسلامتی عطا فرمائے۔

غیر مسلم اسلام میں داخل ہوں یا احکام اسلام کے تابع ہو جائیں

سوال کیا کافر کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ اسلام قبول کر لے؟

جواب ہر کافر کے لیے، خواہ وہ عیسائی ہو یا یہودی، یہ واجب ہے کہ وہ دین اسلام قبول کر لے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں فرمایا ہے:

﴿ قُلْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنِّى رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ٱلَّذِى لَهُۥ مُلْكُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۖ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْىِۦ وَيُمِيتُ ۖ فَـَٔامِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِ ٱلنَّبِىِّ ٱلْأُمِّىِّ ٱلَّذِى يُؤْمِنُ بِٱللَّهِ وَكَلِمَٰتِهِۦ وَٱتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٨﴾ ﴾ (الأعراف: ۷/ ۱۵۸)

’’(اے محمد!) کہہ دو! اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا (رسول) ہوں، وہ جو آسمانوں اور زمین کا بادشاہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی زندگانی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ تو تم اللہ پر اور اس کے رسول، پیغمبر امی پر، جو خود بھی اللہ پر اور اس کے تمام کلام پر ایمان رکھتے ہیں، ایمان لاؤ اور ان کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ۔‘‘

لہٰذا تمام لوگوں پر یہ واجب ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائیں، البتہ دین اسلام نے اللہ تعالیٰ کی رحمت وحکمت کے پیش نظر غیر مسلموں کے لیے اس بات کو بھی جائز قرار دیا ہے کہ وہ اپنے دین پر باقی رہیں بشرطیکہ وہ مسلمانوں کے احکام کے تابع رہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قَٰتِلُوا۟ ٱلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ وَلَا بِٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥ وَلَا

يَدِينُونَ دِينَ ٱلْحَقِّ مِنَ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْكِتَٰبَ حَتَّىٰ يُعْطُوا۟ ٱلْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَٰغِرُونَ ﴿٢٩﴾﴾ (التوبة: ٩/ ٢٩)

''جولوگ اہل کتاب میں سے اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ روز آخرت پر (یقین رکھتے ہیں) اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں، ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ ذلیل ہوکر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔''

صحیح مسلم میں حضرت بُرَیدہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ جب کسی لشکر یا سریہ کا کسی کو امیر مقرر کرتے تو آپ اسے اللہ تعالیٰ کے تقویٰ اور اپنے ہم سفر مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی وخیر خواہی کا حکم دیتے اور فرماتے تھے:

«ادْعُهُمْ إِلَى ثَلَاثِ خِصَالٍ أَوْ خِلَالٍ فَأَيَّتُهُنَّ مَا أَجَابُوكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ وَكُفَّ عَنْهُمْ»

(صحيح مسلم، الجهاد والسير، باب تأمير الأمراء . . . ح: ١٧٣١)

''انہیں تین باتوں کی دعوت دو، وہ ان میں سے جس کو بھی قبول کرلیں تو ان کی طرف سے اسے قبول کرلو اور ان سے (جنگ کرنے سے) رک جاؤ۔''

ان تین باتوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ جزیہ ادا کریں، اس لیے اہل علم کے اقوال میں سے راجح قول یہ ہے کہ یہود ونصاریٰ کے علاوہ دیگر غیر مسلموں سے بھی جزیہ قبول کیا جائے گا۔ حاصل کلام یہ کہ غیر مسلموں کے لیے واجب ہے کہ وہ یا تو اسلام میں داخل ہو جائیں یا احکام اسلام کے تابع ہو جائیں۔ واللہ الموفق.

علم غیب کا دعویٰ کرنے والا کافر ہے

سوال جو شخص علم غیب کا دعویٰ کرے، اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جو شخص علم غیب کا دعویٰ کرے اس کے بارے میں حکم یہ ہے کہ وہ کافر ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی تکذیب کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُل لَّا يَعْلَمُ مَن فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ٱلْغَيْبَ إِلَّا ٱللَّهُ ۚ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ﴿٦٥﴾﴾ (النمل: ٢٧/ ٦٥)

''کہہ دو کہ جو لوگ آسمانوں اور زمین میں ہیں، اللہ کے سوا غیب کی باتیں نہیں جانتے اور نہ یہ جانتے ہیں کہ وہ کب (زندہ کرکے) اٹھائے جائیں گے۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ سب لوگوں کے سامنے یہ اعلان فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی آسمانوں اور زمین میں غیب نہیں جانتا، لہٰذا جو شخص علم غیب کا دعویٰ کرے، وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تکذیب کرتا ہے۔ ان لوگوں سے ہم یہ بھی کہیں گے کہ تمہارے لیے غیب جاننا کیسے ممکن ہے، جب کہ غیب تو نبی ﷺ بھی نہیں جانتے تھے؟ کیا تم افضل ہو یا رسول اللہ ﷺ؟ اگر یہ کہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ سے اشرف ہیں تو وہ اس بات کی وجہ سے بھی کافر ہو جائیں گے اور اگر وہ یہ کہیں کہ رسول اللہ ﷺ اشرف تھے تو پھر ہم ان سے پوچھیں گے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تو غیب نہ جانتے ہوں اور تم اسے

جانتے ہو؟ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿ عَـٰلِمُ ٱلْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِۦٓ أَحَدًا ۝٢٦ إِلَّا مَنِ ٱرْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ فَإِنَّهُۥ يَسْلُكُ مِنۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِۦ رَصَدًا ۝٢٧﴾ (الجن: ٧٢/ ١٦_٢٧)

''وہی غیب (کی بات) جاننے والا ہے اور کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا' ہاں جس پیغمبر کو پسند فرمائے تو اس (کو غیب کی باتیں بتا دیتا ہے اور اس) کے آگے اور پیچھے نگہبان مقرر کر دیتا ہے۔''

یہ دوسری آیت ہے' جو اس بات کی دلیل ہے کہ علم غیب کا دعویٰ کرنے والا کافر ہے' نیز اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے یہ اعلان فرما دیں:

﴿ قُل لَّآ أَقُولُ لَكُمْ عِندِى خَزَآئِنُ ٱللَّهِ وَلَآ أَعْلَمُ ٱلْغَيْبَ وَلَآ أَقُولُ لَكُمْ إِنِّى مَلَكٌ ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰٓ إِلَىَّ ۚ﴾ (الأنعام: ٦/ ٥٠)

''کہہ دو کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ (یہ کہ) میں غیب جانتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں' میں تو صرف اس حکم پر چلتا ہوں جو مجھے (اللہ کی طرف سے) آتا ہے۔''

آیت ﴿يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ﴾ میں نر یا مادہ کے متعلق کوئی تصریح نہیں

سوال آج کل ڈاکٹروں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ماں کے پیٹ میں بچہ لڑکا ہے یا لڑکی جب کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَيَعْلَمُ مَا فِى ٱلْأَرْحَامِ ۖ﴾ (لقمان: ٣١/ ٣٤)

''اور وہی (حاملہ کے) پیٹ کی چیزوں کو جانتا ہے (کہ نر ہے یا مادہ۔'')

اور تفسیر ابن جریر میں امام مجاہد سے روایت ہے کہ جب ایک شخص نے نبی ﷺ سے یہ پوچھا کہ اس کی بیوی کیا جنم دے گی تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی تھی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے؟ ان میں تطبیق کیسے ہوگی' نیز یہ فرمائیں کہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿مَا فِي الْاَرْحَامِ﴾ کے عموم کا مخصص کیا ہے؟

جواب اس مسئلے کے بارے میں گفتگو سے قبل میں اس بات کو بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ قرآن کریم کی صراحت امر واقع سے متعارض ہو اور اگر کوئی امر واقع بظاہر قرآن مجید کے خلاف ہو تو امر واقع محض دعویٰ ہوگا جس کی کوئی حقیقت نہیں یا قرآن مجید کا تعارض صریح نہیں ہوگا کیونکہ قرآن مجید کی صراحت اور حقیقت واقع دو قطعی امر ہیں اور دو قطعی چیزوں میں کبھی بھی تعارض نہیں ہو سکتا۔

اس وضاحت کے بعد ہم یہ کہیں گے کہ بیان کیا جاتا ہے کہ اطبا دقیق آلات کے استعمال سے حاملہ کے پیٹ کی چیزوں کو معلوم کرنے لگے ہیں کہ وہ نر ہے یا مادہ۔ اگر یہ بات باطل ہے تو پھر اس کے بارے میں گفتگو کی ضرورت ہی نہیں اور اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر بھی آیت قرآنی کے خلاف نہیں ہے کیونکہ آیت قرآنی ایک غیبی امر پر دلالت کرتی ہے' جو آیت میں مذکور پانچ باتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علم سے متعلق ہے اور جنین سے متعلق غیبی امور کہ ماں کے پیٹ میں اس کی مدت کی مقدار کتنی ہوگی' اس کی زندگی' اس

کے عمل اور رزق کی مقدار کتنی ہوگی‘ شقاوت اور سعادت کے اعتبار سے اس کی کیا کیفیت ہوگی اور یہ نر ہوگا یا مادہ۔ یہ تمام امور تخلیق سے قبل غیبی ہیں‘ جب کہ تخلیق کے بعد تو یہ علم حاضر ہوگیا البتہ یہ ضرور ہے کہ اس وقت جنین تین اندھیروں میں مستور ہوتا ہے اور اگر ان اندھیروں کو زائل کر دیا جائے تو اس کا معاملہ واضح ہو جاتا ہے اور یہ بات کوئی بعید نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایسی قوی شعاعیں پیدا کر رکھی ہیں جو ان اندھیروں کو پھاڑ دیتی ہیں اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جنین نر ہے یا مادہ اور آیت کریمہ میں نر یا مادہ کے علم کے بارے میں کوئی تصریح نہیں‘ اسی طرح سنت میں بھی ایسی کوئی تصریح موجود نہیں ہے کہ اس علم سے مراد نر یا مادہ کا علم ہے۔

سائل نے ابن جریر کے حوالے سے امام مجاہد رحمہ اللہ کی جو یہ روایت ذکر کی ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے یہ پوچھا کہ اس کی بیوی کیا جنم دے گی؟ تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تھی‘ یہ روایت منقطع ہے کیونکہ امام مجاہد رحمہ اللہ تابعین میں سے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے جو تفسیر بیان کی ہے تو ممکن ہے کہ اسے اس بات پر محمول کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے علم کے اختصاص کا تعلق تخلیق سے پہلے ہے اور تخلیق کے بعد اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں دوسروں کو بھی معلوم کرا دیتا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے سورۂ لقمان کی آیت کی تفسیر میں لکھا ہے: ’’اسی طرح اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ آئندہ ان ارحام سے کیا کچھ پیدا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے‘ لیکن جب جنین کے بارے میں وہ حکم دے دیتا ہے کہ یہ نر ہے یا مادہ‘ بد بخت ہے یا خوش بخت تو وہ یہ باتیں اس جنین کے ساتھ موکل فرشتوں کو اور اپنی مخلوق میں سے جسے چاہے معلوم کروا دیتا ہے۔‘‘

آپ نے جو یہ پوچھا ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿مَا فِي الْاَرْحَامِ﴾ میں عموم کا مخصص کیا ہے‘ تو ہم عرض کریں گے کہ اگر آیت تخلیق کے بعد نر یا مادہ کو بیان کرتی ہے‘ تو مخصص انسانی حس اور امر واقع ہیں۔ علمائے اصول نے بیان کیا ہے کہ کتاب وسنت کے عموم کے مخصصات نص یا اجماع یا قیاس یا عقل ہیں‘ علمائے اصول کا کلام اس بارے میں معروف ہے۔ اگر آیت کا تعلق تخلیق سے قبل کی حالت سے ہے‘ تو پھر یہ اس بات کے معارض نہیں ہے جو جنین کے نر یا مادہ کے معلوم ہو جانے کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے۔

بحمد اللہ امر واقع کے اعتبار سے نہ کوئی ایسی چیز موجود ہے اور نہ کبھی موجود ہوگی جو قرآن کریم کی صراحت کے خلاف ہو۔ دشمنان اسلام نے قرآن کریم پر طعن کرتے ہوئے‘ ایسے امور کی نشان دہی کی ہے جو قرآن کریم کے ساتھ ظاہراً متعارض ہیں‘ تو یہ اس وجہ سے کہ یا تو کتاب اللہ کے بارے میں ان کے فہم کا قصور ہے یا ان کی نیت میں خرابی ہے۔ جہاں تک اہل دین وعلم کا تعلق ہے تو وہ بحث و تحقیق کے بعد اس حقیقت تک پہنچ گئے ہیں‘ جس کے سامنے ان لوگوں کے تمام شکوک وشبہات ختم ہو جاتے ہیں۔ وللّٰه الحمد والمنّة.

اس مسئلے میں کچھ لوگ افراط اور تفریط میں مبتلا ہیں اور کچھ معتدل ہیں۔ کچھ لوگوں نے قرآن مجید کے ظاہر کو لے لیا ہے‘ جو صریح نہیں ہے اور پھر انہوں نے اس کے خلاف ہر واقعی اور یقینی امر کی مخالفت کی ہے اور اس طرح انھوں نے اپنے قصور فہم اور کوتاہی کی وجہ سے اپنے آپ کو مورد الزام قرار دے لیا ہے یا پھر قرآن کریم پر اعتراض کا باعث بنے ہیں کہ وہ ان کی نظر میں یقینی اور امر واقع کے خلاف ہے۔ کچھ لوگوں نے اس چیز سے اعراض کیا جس پر قرآن کریم کی دلالت ہے اور انہوں نے محض مادی امور کو اختیار کر لیا ہے اور اس طرح یہ لوگ ملحد بن گئے ہیں۔

معتدل وہ لوگ ہیں جنھوں نے قرآن کریم کی دلالت کو لے لیا اور امر واقع کے ساتھ اس کی تصدیق کی اور جان لیا کہ قرآن

کریم کی تصریح اور امر واقع دونوں ہی برحق ہیں اور یہ ممکن ہی نہیں کہ تصریح قرآن کریم اس امر معلوم کے مخالف ہو جسے آنکھوں سے مشاہدہ کیا جا رہا ہو گویا انھوں نے منقول اور معقول دونوں کے ساتھ عمل کیا اور اس طرح انھوں نے اپنے دین اور عقل کو بچا لیا اور اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی اس حق کی طرف رہنمائی فرما دی جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا اور اللہ تعالیٰ جسے چاہے صراط مستقیم کی طرف ہدایت عطا فرما دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اور ہمارے مومن بھائیوں کو ہدایت کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں ہدایت کرنے والے ہدایت یافتہ اور نیک قائد بنا دے۔ وَمَا تَوْفِيقِي اِلَّا بِاللّٰهِ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيبُ

اللہ کی وحدانیت اور نبی ﷺ کی رسالت کی گواہی اسلام کی کلید ہے

سوال محترم مفتی صاحب سے سوال کیا گیا کہ آپ شہادتین کی وضاحت فرما دیں؟

جواب شہادتین یعنی اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ یہ دونوں شہادتیں اسلام کی کنجی ہیں۔ ان کے بغیر اسلام میں داخل ہونا ممکن ہی نہیں، اسی لیے نبی ﷺ نے معاذ بن جبل ؓ کو اس وقت حکم دیا تھا جب آپ نے انھیں یمن بھیجا تھا کہ سب سے پہلے آپ انھیں اس بات کی دعوت دیں کہ وہ یہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، آپ نے ان سے فرمایا:

«فَإِذَا جِئْتَهُمْ فَادْعُهُمْ إِلٰى أَنْ يَشْهَدُوا أَنْ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ»(صحيح البخاري، المغازي، باب بعث أبي موسى ومعاذ إلى اليمن، ح:٤٣٤٧ وصحيح مسلم، الإيمان، باب الدعاء إلي الشهادتين وشرائع الإسلام، ح:١٩)

''پس جب آپ ان کے پاس جائیں تو انھیں اس بات کی دعوت دیں کہ وہ یہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بے شک محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔''

ان میں سے پہلا کلمہ یعنی اس بات کی گواہی کہ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں'' اس کے ساتھ انسان اپنی زبان اور اپنے دل کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ اللہ عزوجل کے ساتھ کوئی معبود حقیقی نہیں کیونکہ ''اِلٰـه'' مَالُوہٌ کے معنی میں ہے، اس لیے کہ تَـأَلَّهَ کے معنی عبادت کرنے کے ہیں گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ وحدہ کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں۔ یہ جملہ نفی و اثبات پر مشتمل ہے، نفی ''لَا اِلٰـهَ'' ہے یعنی کوئی الہ نہیں اور اثبات ہے الا اللّٰه، یعنی سوائے اللہ کے۔ اور ''اللّٰه'' لفظ جلالت ہے، جو ''لا'' کی خبر محذوف سے بدل ہے، گویا اصل عبارت اس طرح ہے: (لَا اِلٰـهَ حَقٌّ اِلَّا اللّٰهُ) ''اللہ کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں'' یہ دل کے ساتھ ایمان کے بعد زبان سے اقرار ہے اور یہ اللہ وحدہ کے لیے اخلاصِ عبادت اور اس کے سوا ہر چیز کی عبادت کی نفی پر مشتمل ہے۔

ہم نے جو یہ کہا کہ یہاں ''حَـقٌّ'' محذوف ہے، اس سے اس اشکال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے جو بہت سے لوگ پیش کیا کرتے ہیں اور وہ یہ کہ تم کیسے کہتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، جب کہ اللہ کے سوا بہت سے معبودوں کی پوجا کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا نام معبود رکھا ہے اور ان کی پوجا کرنے والے بھی انھیں معبود ہی کہتے ہیں جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ فَمَآ أَغْنَتْ عَنْهُمْ ءَالِهَتُهُمُ ٱلَّتِى يَدْعُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ مِن شَىْءٍ لَّمَّا جَآءَ أَمْرُ رَبِّكَ ﴾ (هود: ١١/ ١٠١)

''جب تمھارے پروردگار کا حکم آپہنچا تو جن معبودوں کو وہ اللہ کے سوا پکارا کرتے تھے وہ ان کے کچھ بھی کام نہ آئے۔''

اور فرمایا:

﴿ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ ٱللَّهِ إِلَٰهًا ءَاخَرَ ﴾ (الإسراء: ١٧/ ٣٩)

''اور اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود نہ بنانا۔''

اور فرمایا:

﴿ وَلَا تَدْعُ مَعَ ٱللَّهِ إِلَٰهًا ءَاخَرَ ﴾ (القصص: ٢٨/ ٨٨)

''اور اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود (سمجھ کر) نہ پکارنا۔''

اور مزید فرمایا:

﴿ لَن نَّدْعُوَا۟ مِن دُونِهِۦٓ إِلَٰهًا ﴾ (الكهف: ١٨/ ١٤)

''ہم اس کے سوا کسی کو معبود (سمجھ کر) نہ پکاریں گے۔''

چنانچہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم لا إله إلا اللّٰه بھی کہیں اور غیر اللہ کے لیے الوہیت بھی ثابت کریں؟ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم غیر اللہ کے لیے الوہیت ثابت کریں جب کہ رسولوں نے اپنی قوموں سے کہا تھا:

﴿ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُۥٓ ﴾ (الأعراف: ٧/ ٥٩)

''اللہ کی عبادت کرو‘ اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔''

اس اشکال کا جواب لَا إلٰه إلا اللّٰه کی خبر محذوف قرار دینے کی صورت میں واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ معبود‘ جن کی اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کی جاتی ہے‘ معبود تو ہیں مگر یہ معبودان باطلہ ہیں حقیقی معبود نہیں کیونکہ انھیں ذرہ بھر حق الوہیت حاصل نہیں ہے۔

اس کی دلیل حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ذَٰلِكَ بِأَنَّ ٱللَّهَ هُوَ ٱلْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِن دُونِهِ ٱلْبَٰطِلُ وَأَنَّ ٱللَّهَ هُوَ ٱلْعَلِىُّ ٱلْكَبِيرُ ۝٣٠ ﴾

(لقمان: ٣١/ ٣٠)

''یہ اس لیے کہ اللہ کی ذات برحق ہے اور جن کو یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ لغو ہیں اور یہ کہ اللہ ہی عالی رتبہ (اور) گرامی قدر ہے۔''

اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے:

﴿ أَفَرَءَيْتُمُ ٱللَّٰتَ وَٱلْعُزَّىٰ ۝١٩ وَمَنَوٰةَ ٱلثَّالِثَةَ ٱلْأُخْرَىٰٓ ۝٢٠ أَلَكُمُ ٱلذَّكَرُ وَلَهُ ٱلْأُنثَىٰ ۝٢١ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰٓ ۝٢٢ إِنْ هِىَ إِلَّآ أَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوهَآ أَنتُمْ وَءَابَآؤُكُم مَّآ أَنزَلَ ٱللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَٰنٍ ﴾ (النجم: ٥٣/ ١٩-٢٣)

''بھلا تم لوگوں نے لات اور عزّیٰ کو دیکھا اور تیسری دیوی منات کو جو گھٹیا ہے (کیا یہ الٰہ ہو سکتے ہیں؟ مشرکو!) کیا تمھارے لیے تو بیٹے اور اللہ کے لیے بیٹیاں؟ یہ تقسیم تو بہت بے انصافی کی ہے۔ وہ تو صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمھارے

باپ دادا نے گھڑ لیے ہیں، اللہ نے تو ان کی کوئی سند نازل نہیں کی۔“

اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿ مَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِهِۦٓ إِلَّآ أَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوهَآ أَنتُمْ وَءَابَآؤُكُم مَّآ أَنزَلَ ٱللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَٰنٍ ﴾
(یوسف: ۱۲/ ۴۰)

”تم اس کے سوا جن کی عبادت کرتے ہو وہ نام ہی نام ہیں جو خود تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کی کوئی سند نازل نہیں کی۔“

تو لا الہ الا اللہ کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں اور یہ معبود جو اس کے سوا ہیں اور ان کے پجاری ان کی الوہیت کے قائل ہیں، تو ان کی الوہیت حقیقی نہیں ہے بلکہ ان کی الوہیت باطل ہے اور حقیقی الوہیت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے شایان شان ہے۔ اور أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ ”حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں“ کے معنی یہ ہیں کہ یہ زبان کے ساتھ اقرار اور دل کے ساتھ تصدیق ہے کہ حضرت محمد بن عبداللہ قریشی ہاشمی (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ نے تمام جن وانس کی طرف مبعوث فرمایا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنِّى رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ٱلَّذِى لَهُۥ مُلْكُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۖ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْىِۦ وَيُمِيتُ ۖ فَـَٔامِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِ ٱلنَّبِىِّ ٱلْأُمِّىِّ ٱلَّذِى يُؤْمِنُ بِٱللَّهِ وَكَلِمَٰتِهِۦ وَٱتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٨﴾ ﴾ (الأعراف: ۷/ ۱۵۸)

”(اے محمد!) کہہ دو کہ اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا (رسول) ہوں۔ وہ جو آسمانوں اور زمین کا بادشاہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی زندگانی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، لہٰذا تم اللہ پر اور اس کے رسول، پیغمبر امی پر ایمان لاؤ جو (خود بھی) اللہ پر اور اس کے تمام کلام پر ایمان رکھتے ہیں، اور ان کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ۔“

اور فرمایا:

﴿ تَبَارَكَ ٱلَّذِى نَزَّلَ ٱلْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِۦ لِيَكُونَ لِلْعَٰلَمِينَ نَذِيرًا ﴿١﴾ ﴾ (الفرقان: ۲۵/ ۱)

”وہ (اللہ عزوجل) بہت ہی بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل فرمایا تاکہ وہ جہان والوں کو ہدایت کرے۔“

اس گواہی کا تقاضا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ہر اس بات کی تصدیق کی جائے جس کی آپ نے خبر دی ہے، ہر اس کام کو تسلیم کیا جائے جس کا آپ نے حکم دیا ہے اور ہر اس چیز سے اجتناب کیا جائے جس سے آپ نے منع فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اسی طرح کی جائے جس طرح آپ نے طریقہ سکھایا ہے۔ اس گواہی کا یہ تقاضا بھی ہے کہ یہ عقیدہ رکھا جائے کہ رسول اللہ ﷺ کا ربوبیت میں کوئی حق نہیں، کائنات میں آپ کو کوئی تصرف حاصل نہیں، اسی طرح عبادت میں بھی آپ کو کوئی حق حاصل نہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ تو خود اللہ کے بندے ہیں لہٰذا آپ کی عبادت نہیں کی جاسکتی اور آپ اللہ کے رسول ہیں کہ آپ کی تکذیب نہیں کی جاسکتی، آپ اپنے لیے یا کسی کے لیے نفع ونقصان کے مالک نہیں سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ چاہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ قُل لَّآ أَقُولُ لَكُمْ عِندِى خَزَآئِنُ ٱللَّهِ وَلَآ أَعْلَمُ ٱلْغَيْبَ وَلَآ أَقُولُ لَكُمْ إِنِّى مَلَكٌ ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰٓ

إِلَيَّۚ﴾ (الأنعام: ٦/ ٥٠)

’’کہہ دو کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ (یہ کہ) میں غیب جانتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس حکم پر چلتا ہوں جو مجھے (اللہ کی طرف سے) آتا ہے۔‘‘

آپ اللہ تعالیٰ کے عبد مامور ہیں اور اسی بات کا اتباع کرتے ہیں جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ إِنِّي لَآ أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا ﴿٢١﴾ قُلْ إِنِّي لَن يُجِيرَنِي مِنَ اللَّهِ أَحَدٌ وَلَنْ أَجِدَ مِن دُونِهِۦ مُلْتَحَدًا ﴿٢٢﴾﴾ (الجن: ٧٢/ ٢١-٢٢)

’’(یہ بھی) کہہ دو کہ میں تمھارے حق میں نقصان اور نفع کا کچھ اختیار نہیں رکھتا‘ (یہ بھی) کہہ دو کہ اللہ کے عذاب سے مجھے کوئی پناہ نہیں دے سکتا اور میں اس کے سوا کہیں جائے پناہ نہیں پاتا۔‘‘

اور فرمایا:

﴿قُل لَّآ أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَآءَ اللَّهُۚ وَلَوْ كُنتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوٓءُۚ إِنْ أَنَا۠ إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿١٨٨﴾﴾ (الأعراف: ٧/ ١٨٨)

’’کہہ دو کہ میں اپنے فائدے اور نقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا مگر جو اللہ چاہے‘ اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو بہت سے فائدے جمع کر لیتا اور مجھ کو کوئی تکلیف نہ پہنچتی‘ میں تو مومنوں کو ڈرانے اور خوش خبری سنانے والا ہوں۔‘‘

یہی معنی ہیں اس بات کی گواہی دینے کے کہ ’’اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔‘‘

اسی سے یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کا کوئی مستحق نہیں‘ نہ رسول اللہ ﷺ اور نہ مخلوقات میں کوئی اور کیونکہ عبادت کی مستحق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پاک ہے‘ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٦٢﴾ لَا شَرِيكَ لَهُۥۖ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا۠ أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٦٣﴾﴾ (الأنعام: ٦/ ١٦٢-١٦٣)

’’کہہ دو کہ میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العلمین ہی کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی بات کا حکم ملا ہے اور میں سب سے اول فرماں بردار ہوں۔‘‘

نبی ﷺ کا حق یہ ہے کہ آپ کو اسی مقام و مرتبہ پر فائز قرار دیا جائے جس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو فائز قرار دیا ہے اور وہ یہ کہ آپ اللہ تعالیٰ کے عبد اور اس کے رسول ہیں۔

کلمۂ طیبہ میں توحید کی تین اقسام: عبادت‘ ربوبیت اور الوہیت

سوال ’’لا إله إلا الله‘‘ توحید کی تمام اقسام پر کس طرح مشتمل ہے؟

جواب یہ کلمہ توحید کی تمام اقسام پر مشتمل ہے‘ تمام اقسام پر اس کی دلالت تضمنی ہے یا التزامی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ جب کوئی کہنے والا یہ کہتا ہے کہ ’’میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں‘‘ تو اس سے ذہن میں فوراً یہ خیال آتا ہے کہ اس

سے مراد توحید عبادت ہے جسے توحید الوہیت کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے اور توحید الوہیت توحید ربوبیت پر بھی مشتمل ہے کیونکہ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ وحدہ کی عبادت کرے تو وہ اس کی ربوبیت کے اقرار کے بغیر اس کی عبادت نہیں کرے گا۔ اسی طرح یہ توحید اسماء وصفات پر بھی مشتمل ہے کیونکہ انسان صرف اسی کی عبادت کرتا ہے جس کے بارے میں اسے معلوم ہو کہ وہ مستحق عبادت ہے کیونکہ اس کے اسماء وصفات کا یہی تقاضا ہے' اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے یہ کہا تھا:

﴿ يَٰٓأَبَتِ لِمَ تَعۡبُدُ مَا لَا يَسۡمَعُ وَلَا يُبۡصِرُ وَلَا يُغۡنِي عَنكَ شَيۡـٔٗا ﴿٤٢﴾ ﴾ (مریم: ١٩/ ٤٢)

''ابا جان! آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ دیکھیں اور نہ آپ کے کچھ کام آسکیں؟''

چنانچہ توحید عبادت' توحید ربوبیت اور توحید اسماء وصفات پر بھی مشتمل ہے۔

جن اور انسان کس حکمت کے تحت پیدا کیے گئے؟

سوال جنوں اور انسانوں کے پیدا کرنے میں کیا حکمت ہے؟

جواب اس سوال کا جواب دینے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خلقت اور شریعت کے بارے میں ایک عام قاعدے کی طرف توجہ مبذول کروادی جائے۔ اور یہ قاعدہ مندرجہ ذیل فرامین الٰہی سے ماخوذ ہے:

﴿ وَهُوَ ٱلۡعَلِيمُ ٱلۡحَكِيمُ ﴿٢﴾ ﴾ (التحریم: ٦٦/ ٢)

''اور وہ جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔''

اور ارشاد باری تعالیٰ:

﴿ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمٗا ﴿٢٤﴾ ﴾ (النساء: ٤/ ٢٤)

''بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔''

یہ قاعدہ اس مضمون کی ان بہت سی آیات کریمہ سے ماخوذ ہے جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خلقت وشریعت یعنی اس کے احکام کونیہ اور احکام شرعیہ میں حکمت کارفرما ہے' یعنی اللہ تعالیٰ جس چیز کو بھی پیدا فرماتا ہے اس میں اس کی حکمت کارفرما ہوتی ہے۔ اللہ کی حکمت دونوں صورتوں میں کارفرما ہے خواہ اس نے اس چیز کو ایجاد کیا ہو یا معدوم۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے شریعت کا جو حکم بھی دیا ہو' خواہ وہ ایجاب کی صورت میں ہو' تحریم کی صورت میں یا اباحت کی صورت میں (ان سب میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہوتی ہے)' لیکن یہ الگ بات ہے کہ ان کونی وشرعی احکام کی حکمت ہمیں معلوم ہے یا معلوم نہیں ہے یا بعض لوگوں کو اس علم وفہم کی وجہ سے معلوم ہے' جس سے اللہ تعالیٰ نے انھیں سرفراز فرمایا ہے۔ جب یہ قاعدہ معلوم ہو گیا تو ہم عرض کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کو عظیم حکمت اور قابل ستائش مقصود کی خاطر پیدا فرمایا ہے اور وہ حکمت ومقصود یہ ہے کہ جن وانس اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کی عبادت کریں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا خَلَقۡتُ ٱلۡجِنَّ وَٱلۡإِنسَ إِلَّا لِيَعۡبُدُونِ ﴿٥٦﴾ ﴾ (الذاریات: ٥١/ ٥٦)

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری ہی عبادت کریں۔''

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ﴿١١٥﴾ ﴾ (المومنون: ٢٣/ ١١٥)

''کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بے فائدہ پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے؟''

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى ﴿٣٦﴾ ﴾ (القیامۃ: ٧٥/ ٣٦)

''کیا انسان خیال کرتا ہے کہ اسے یونہی بے کار چھوڑ دیا جائے گا؟''

علاوہ ازیں اور بھی بہت سی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوں اور انسانوں کے پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی غالب حکمت کارفرما ہے اور وہ یہ ہے کہ جن و انس اس کی عبادت کریں۔ اور عبادت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے محبت اور تعظیم کے ساتھ عجز و انکسار کا اظہار کیا جائے اور وہ اس طرح کہ اس نے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے انھیں کیا جائے اور جن کاموں سے اس نے منع فرمایا ہے ان سے اجتناب کیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ ﴾ (البینۃ: ٩٨/ ٥)

''اور ان کو حکم تو یہی ہوا تھا کہ اخلاص عمل کے ساتھ یک سو ہو کر اللہ کی عبادت کریں۔''

اسی حکمت کی وجہ سے جن و انس کو پیدا کیا گیا ہے' پھر جو شخص اپنے رب تعالیٰ کے سامنے سرکشی کرے اور اس کی عبادت کرنے سے تکبر کرے' تو اس کا طرز عمل اس حکمت کے مخالف ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو پیدا فرمایا ہے اور اس کے اس فعل سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو گویا عبث پیدا فرمایا ہے' گو وہ صراحت نہ بھی کرے' لیکن اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے اس کے سرکشی اور تکبر کرنے کا یہی مفہوم ہے۔

قبولیتِ دعا کے لیے ضروری شرائط

سوال انسان کیونکر دعا کرے کہ اس کی دعا تو قبول ہی نہیں ہوتی جب کہ ارشاد باری تعالیٰ یہ ہے: ﴿ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ ''تم مجھ سے دعا کرو میں تمھاری دعا قبول کروں گا۔''

جواب میں اللہ تعالیٰ سے اپنے اور اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہم سب کو درست عقیدہ اور صحیح قول و عمل کے اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ﴿٦٠﴾ ﴾ (الغافر: ٤٠/ ٦٠)

''اور تمھارے پروردگار نے کہا ہے کہ تم مجھ سے دعا کرو میں تمھاری (دعا) قبول کروں گا' بلاشبہ جو لوگ میری عبادت سے سرکشی (تکبر) کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں ذلیل ہو کر داخل ہوں گے۔''

سائل کہتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے مگر اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو قبول نہیں فرماتا تو اسے اپنے حال اور اس آیت کریمہ

میں اشکال معلوم ہوتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ جو اس سے دعا کرے گا وہ اس کی دعا کو قبول فرمائے گا اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا' تو اس کا جواب یہ ہے کہ دعا کی قبولیت چند ضروری شرائط کے ساتھ مشروط ہے جو کہ حسب ذیل ہیں:

① اللہ عزوجل کی ذات پاک کے لیے اخلاص: یعنی انسان دعا میں اخلاص کا ثبوت دے' اللہ تعالیٰ کی طرف دل کو حاضر کرنے کے ساتھ متوجہ ہو' اس کی طرف صدق دل کے ساتھ رجوع کرے اور اس بات کو خوب جان لے کہ اللہ تعالیٰ دعا قبول فرمانے پر قادر ہے اور پھر قبولیت کی امید کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرے۔

② دعا کرتے وقت انسان یہ محسوس کرے کہ اسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے استعانت کی شدید ترین حاجت وضرورت ہے اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پاک ہے جو مجبور ومضطر کی دعا کو اس وقت شرف قبولیت سے نوازتا ہے جب وہ اس سے دعا کرے اور وہ ہر تکلیف کو دور فرمادیتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس طرح دعا کرے کہ وہ سمجھتا ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ سے بے نیاز ہے' اسے اس سے استعانت کی کوئی ضرورت وحاجت نہیں بلکہ وہ صرف عادت کے طور پر دعا کر رہا ہے تو ایسا شخص بھلا کب اس قابل ہے کہ اس کی دعا کو قبول کیا جائے۔

③ انسان حرام کھانے سے اجتناب کرے' حرام کھانا انسان اور اس کی دعا کی قبولیت میں حائل ہو جاتا ہے جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

> «إِنَّ اللهَ طَيِّبٌ لاَ يَقْبَلُ إِلاَّ طَيِّبًا وَإِنَّ اللهَ أَمَرَ الْمُؤْمِنِينَ بِمَا أَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِينَ فَقَالَ تَعَالَى: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلرُّسُلُ كُلُواْ مِنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ وَٱعْمَلُواْ صَٰلِحًاۖ إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٞ ۝٥١﴾ (المؤمنون۲۳/ ۵۱) وَقَالَ تَعَالَي: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُلُواْ مِن طَيِّبَٰتِ مَا رَزَقْنَٰكُمْ وَٱشْكُرُواْ لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ۝١٧٢﴾ (البقرة۲/ ۱۷۲) ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيلُ السَّفَرَ أَشْعَثَ أَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ إِلَي السَّمَاءِ: يَارَبِّ! يَارَبِّ! وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ، وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: فَأَنَّى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ؟»(صحيح مسلم، الزكاة، باب قبول الصدقة من الكسب الطيب وتربيتها، ح:۱۰۱۵)

"بے شک اللہ تعالیٰ پاک ہے اور وہ پاک چیز ہی کو قبول فرماتا ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو بھی وہی حکم دیا ہے' جو اس نے رسولوں کو حکم دیا تھا' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اے پیغمبرو! حلال چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو' بے شک میں تمہارے عملوں سے' جو تم کرتے ہو' خوب باخبر ہوں۔" اور فرمایا: "اے اہل ایمان! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو عطا فرمائی ہیں ان کو کھاؤ۔" پھر آپ نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جس نے لمبا سفر کیا ہے' پریشان بال اور غبار آلود ہے' آسمان کی طرف اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر کہتا ہے: اے رب! اے رب! اور اس کا کھانا حرام کا ہے اور اس کا پینا حرام کا ہے اور اس کا لباس حرام کا ہے اور حرام ہی کے ساتھ اس نے پرورش پائی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ "ایسے شخص کی دعا کیسے قبول ہو؟"

نبی ﷺ نے ایسے شخص کی دعا کی قبولیت کو بعید قرار دیا جس نے ان ظاہری اسباب کو اختیار کر رکھا تھا جن سے دعا قبولیت

حاصل کرتی ہے اور وہ یہ ہیں:

① آسمان کی طرف یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف دونوں ہاتھوں کا اٹھانا کیونکہ اللہ تعالیٰ آسمان پر اپنے عرش کے اوپر ہے اور اللہ کی طرف ہاتھ پھیلانا قبولیت کے اسباب میں سے ہے جیسا کہ اس حدیث میں ہے جسے امام احمد رحمہ اللہ نے ''مسند'' میں روایت کیا ہے:

«إِنَّ اللهَ حَيِيٌّ كَرِيمٌ يَسْتَحْيِي إِذَا رَفَعَ الرَّجُلُ إِلَيْهِ يَدَيْهِ أَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْرًا خَائِبَتَيْنِ»(مسند أحمد: ٥/٤٣٨ وجامع الترمذي، الدعوات، باب إن الله حيي كريم، ح:٣٥٥٦ وسنن ابن ماجه، الدعاء، باب رفع اليدين في الدعاء، ح: ٣٨٦٥)

''بے شک اللہ تعالیٰ صاحب حیا اور کرم فرمانے والا ہے، وہ اس بات سے عار محسوس کرتا ہے کہ جب کوئی شخص اپنے ہاتھوں کو اس کی طرف اٹھائے تو وہ انھیں خالی اور نامراد واپس لوٹا دے۔''

② اس شخص نے اللہ تعالیٰ کے اسم پاک ''رب'' کے ساتھ یارب! یارب! کہہ کر دعا کی تھی اور اس اسم پاک کے وسیلے کے ساتھ دعا کرنا بھی اسباب قبولیت میں سے ہے، کیونکہ رب کے معنی خالق، مالک اور تمام امور کی تدبیر کرنے والے کے ہیں، اس کے ہاتھ میں آسمانوں اور زمین کی کنجیاں ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں وارد اکثر دعائیں اللہ تعالیٰ کے اسی اسم پاک سے شروع ہوتی ہیں:

﴿ رَبَّنَآ إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَٰنِ أَنْ ءَامِنُوا۟ بِرَبِّكُمْ فَـَٔامَنَّا ۚ رَبَّنَا فَٱغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّـَٔاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ ٱلْأَبْرَارِ ﴿١٩٣﴾ رَبَّنَا وَءَاتِنَا مَا وَعَدتَّنَا عَلَىٰ رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ ۗ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ ٱلْمِيعَادَ ﴿١٩٤﴾ فَٱسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّى لَآ أُضِيعُ عَمَلَ عَٰمِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ ۖ بَعْضُكُم مِّنۢ بَعْضٍ ۚ﴾ (آل عمران: ٣/ ١٩٣-١٩٥)

''اے ہمارے پروردگار! ہم نے ایک ندا کرنے والے کو سنا جو ایمان کے لیے پکار رہا تھا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لے آئے، اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہ معاف فرما اور ہماری برائیوں کو ہم سے محو کر اور ہم کو دنیا سے نیک بندوں کے ساتھ اٹھا۔ اے ہمارے پروردگار! تو نے جن جن چیزوں کے ہم سے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے وعدے کیے ہیں وہ ہمیں عطا فرما اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کرنا، کچھ شک نہیں کہ تو خلاف وعدہ نہیں کرتا، تو ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کر لی (اور فرمایا) کہ میں کسی عمل کرنے والے کے عمل کو، خواہ مرد ہو یا عورت، ضائع نہیں کرتا، تم آپس میں ایک دوسرے کی جنس ہو۔''

اس اسم پاک کے ساتھ وسیلہ اختیار کرنا بھی اسباب قبولیت میں سے ہے۔

③ یہ شخص مسافر تھا اور سفر بھی اکثر و بیشتر حالتوں میں اسباب قبولیت میں سے ہے کیونکہ سفر میں انسان اپنے اہل خانہ میں مقیم ہونے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف زیادہ ضرورت و حاجت محسوس کرتا ہے اور پھر وہ پریشان بال اور غبار آلود بھی ہو، گویا اپنی طرف اس کی توجہ نہیں کیونکہ اس کے نزدیک زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے فریاد کرے اور وہ جس حال میں بھی ہو، اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کرے، خواہ اس کے بال پریشان اور اس کا لباس غبار آلود ہو یا وہ آسودہ حال ہو۔ پریشان حالی و غبار آلودگی کا بھی دعا کی قبولیت میں عمل دخل ہے جیسا کہ نبی ﷺ کی اس حدیث میں ہے:

«إِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ يُبَاهِي مَلاَئِكَتَهُ عَشِيَّةَ عَرَفَةَ بِأَهْلِ عَرَفَةَ فَيَقُولُ انْظُرُوا إِلَى عِبَادِي أَتَوْنِي شُعْثًا غُبْرًا»(مسند أحمد: ٢/ ٢٢٤)

’’بے شک اللہ تعالیٰ عرفہ کی شام عرفہ میں حاضر ہونے والے لوگوں پر فرشتوں کے سامنے فخر کا اظہار کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ دیکھو میرے بندے میرے پاس پریشان بال' غبار آلود آئے ہیں۔‘‘

قبولیت دعا کے یہ سارے اسباب اس شخص کے کچھ کام نہ آئے کیونکہ اس کا کھانا حرام کا' لباس حرام کا اور حرام ہی کے ساتھ اس کی پرورش ہوئی تھی' چنانچہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ ’’اس شخص کی دعا کیسے قبول ہو؟‘‘ اجابت دعا کی یہ شرائط جب پوری نہ ہوں تو قبولیت بعید ہو جاتی ہے۔ اگر شرائط پوری ہوں اور اللہ تعالیٰ دعا کرنے والے کی دعا کو قبول نہ فرمائے تو اس میں کوئی حکمت ہوگی' جسے اللہ ہی جانتا ہے اور دعا کرنے والا نہیں جانتا۔ ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرلو اور وہ تمھارے لیے بری ہو' جب قبولیتِ دعا کی ساری شرطیں تو موجود ہوں' مگر اللہ تعالیٰ دعا قبول نہ فرمائے تو وہ یا تو اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس سے کسی بڑی برائی کو اُس سے دور فرمانا چاہتا ہے یا اس دعا کو اس کے لیے قیامت کے دن کے لیے ذخیرہ کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کی وجہ سے وہ اسے زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب عطا فرما دے کیونکہ دعا کرنے والے نے جب دعا کی ساری شرطیں بھی پوری کر دیں' اللہ تعالیٰ نے اسے قبول نہ فرمایا اور کسی بڑی برائی کو بھی اس سے دور نہ فرمایا تو ممکن ہے کہ یہ عدم قبولیت کسی حکمت کی وجہ سے ہو' وہ حکمت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دوگنا اجر و ثواب عطا فرمانا چاہتا ہو' ایک دعا کرنے کا اجر و ثواب اور دوسرا عدم قبولیت کی مصیبت کا اجر و ثواب اور پھر اللہ تعالیٰ روز قیامت اسے عظیم ترین اور اکمل اجر و ثواب سے سرفراز فرما دے گا۔

پھر ایک اہم بات یہ ہے کہ انسان یہ نہ سمجھے کہ اس کی دعا قبول ہی نہیں ہوتی کیونکہ یہ بات بھی دعا کی عدم قبولیت کے اسباب میں سے ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«يُسْتَجَابُ لأَحَدِكُمْ مَا لَمْ يَعْجَلْ، يَقُولُ: دَعَوْتُ فَلَمْ يُسْتَجَبْ لِي»(صحيح البخاري، الدعوات، باب يستجاب للعبد ما لم يعجل، ح: ٦٣٤٠ وصحيح مسلم، الذكر والدعاء، باب بيان أنه يستجاب للداعي ما لم يعجل ... ح: ٢٧٣٥)

’’تم میں سے ایک کی دعا قبول کی جاتی ہے بشرطیکہ وہ جلدی کرتے ہوئے یہ نہ کہے کہ میں نے دعا کی تھی مگر میری دعا تو قبول ہی نہ ہوئی۔‘‘

لہٰذا انسان کو یہ نہیں چاہیے کہ وہ قبولیت میں تاخیر سمجھتے ہوئے دعا سے مایوس ہو جائے اور اسے ترک کر دے' بلکہ اسے چاہیے کہ اصرار و گریہ زاری کے ساتھ دعا کرتا رہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے کی جانے والی ہر دعا عبادت اور تقرب الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے۔ دعا سے اجر و ثواب میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے' لہٰذا اے بھائی! اپنے تمام عام اور خاص' مشکل اور آسان امور میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہا کرو۔ اگر دعا کا عبادت ہونے کے علاوہ اور کوئی فائدہ نہ بھی ہوتا' تو بھی آدمی کو چاہیے کہ وہ ہر وقت دعا کرتا رہے۔ واللہ الموفق.

عبادت کا مقصود تقرب الٰہی اور جنت کا حصول ہونا چاہیے

سوال اخلاص کے کیا معنی ہیں؟ اور اگر عبادت سے مقصود کوئی اور چیز ہو تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص کے معنی یہ ہیں کہ آدمی کا عبادت سے مقصود تقرب الٰہی اور جنت کا حصول ہو اور اگر عبادت سے مقصود کچھ اور ہو تو اس کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① عبادت سے مقصود غیر اللہ کا تقرب اور لوگوں کی طرف سے تعریف و توصیف کا حصول ہو تو اس سے عمل ضائع ہو جائے گا کیونکہ یہ شرک ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

«أَنَا أَغْـنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، مَنْ عَمِلَ عَمَلاً أَشْرَكَ فِيهِ مَعِيَ غَيْرِي تَرَكْتُهُ وَشِرْكَهُ»

(صحيح مسلم، الزهد والرقائق، باب تحريم الرياء، ح: ٢٩٨٥)

’’میں تمام شرکاء کی نسبت شرک سے سب سے زیادہ بے نیاز ہوں، جس شخص نے کوئی ایسا عمل کیا جس میں اس نے میرے ساتھ کسی غیر کو بھی شریک کر لیا تو میں اسے اور اس کے حصے کو چھوڑ دیتا ہوں۔‘‘

② عبادت سے مقصود اقتدار، منصب یا مال وغیرہ کی دنیوی غرض کا حصول ہو، تقرب الٰہی کا حصول مقصود نہ ہو تو یہ عمل بھی رائیگاں جاتا ہے اور انسان کو اللہ تعالیٰ کے قریب کرنے کا سبب نہیں بنتا، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَن كَانَ يُرِيدُ ٱلْحَيَوٰةَ ٱلدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَٰلَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ﴿١٥﴾ أُو۟لَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِى ٱلْـَٔاخِرَةِ إِلَّا ٱلنَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا۟ فِيهَا وَبَٰطِلٌ مَّا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ﴿١٦﴾ ﴾

(هود: ١١/ ١٥-١٦)

’’جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے طالب ہوں، ہم ان کے اعمال کا بدلہ انھیں دنیا ہی میں دے دیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی، یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آتش (جہنم) کے سوا اور کچھ نہیں اور جو عمل انھوں نے دنیا میں کیے سب برباد اور جو کچھ وہ کرتے رہے، سب ضائع ہوا۔‘‘

اس میں اور پہلی قسم میں فرق یہ ہے کہ پہلی قسم میں مقصود یہ تھا کہ اس کی تعریف کی جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا ہے جب کہ اس دوسرے کا مقصود یہ نہیں ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں، لوگوں کے تعریف کرنے یا نہ کرنے کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔

③ عبادت سے مقصود تقرب الٰہی کے حصول کے ساتھ ساتھ کوئی دنیوی غرض بھی ہو، مثلاً عبادت کے لیے طہارت کی نیت کے وقت جسمانی بشاشت اور نظافت کا ارادہ بھی کر لے، نماز ادا کرتے وقت جسمانی ورزش کا بھی ارادہ کر لے، روزے کے ساتھ جسمانی وزن کے کم کرنے اور فضلات کے دور کرنے کا بھی قصد کر لے اور حج کے ساتھ مشاعر اور حجاج کی زیارت کا ارادہ بھی کر لے تو اس سے اخلاص کے اجر میں کمی آجاتی ہے اور اگر غالب نیت عبادت ہی کی ہے تو اس سے کمال اجر و ثواب میں کمی آجاتی ہے لیکن وہ اسے گناہ یا جھوٹ کے ساتھ نقصان نہ پہنچائے کیونکہ حُجاج کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَبْتَغُوا۟ فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ ﴾ (البقرة: ٢/ ١٩٨)

’’اس کا تمھیں کچھ گناہ نہیں کہ (حج کے دنوں میں بذریعۂ تجارت) اپنے پروردگار سے روزی طلب کرو۔‘‘

اگر اغلب نیت غیر عبادت کی ہو تو اسے آخرت میں اس کا کوئی ثواب نہیں ملے گا‘ اسے اس کا بدلہ دنیا ہی میں مل جائے گا اور یہ بھی خدشہ ہے کہ وہ اس سے گناہ گار بھی ہوگا کیونکہ اس نے عبادت کو‘ جو اعلیٰ مقصود ہے‘ حقیر دنیا کے حصول کا وسیلہ بنالیا۔ وہ گویا ان لوگوں کی طرح ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَمِنْهُم مَّن يَلْمِزُكَ فِي ٱلصَّدَقَـٰتِ فَإِنْ أُعْطُوا۟ مِنْهَا رَضُوا۟ وَإِن لَّمْ يُعْطَوْا۟ مِنْهَآ إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ ﴿٥٨﴾ ﴾ (التوبة: ٩/ ٥٨)

’’اور ان میں بعض ایسے بھی ہیں کہ (تقسیم) صدقات میں تم پر طعنہ زنی کرتے ہیں اگر ان کو اس میں سے (خاطر خواہ) مل جائے تو خوش رہیں اور اگر (اس قدر) نہ ملے تو جھٹ خفا ہو جاتے ہیں۔‘‘

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! ایک آدمی جہاد کا ارادہ رکھتا ہے مگر جہاد سے اس کا مقصود دنیوی مال کا حصول ہے‘ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لاَ أَجْرَ لَهُ»(سنن أبي داود، الجهاد، باب فيمن يغزو ويلتمس الدنيا، ح: ٢٥١٦ وسنن النسائي، الجهاد، باب، من غزا يلتمس الأجر والذكر، ح: ٣١٤٢)

’’اسے کوئی اجر نہیں ملے گا‘‘

اس شخص نے اپنے سوال کو تین بار دوہرایا تو ہر بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا: ’’اسے کوئی اجر نہیں ملے گا۔‘‘ صحیحین میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ لِدُنْيَا يُصِيبُهَا، أَوِ امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا، فَهِجْرَتُهُ إِلٰى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ»(صحيح البخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدأ الوحي إلى رسول الله ﷺ، ح: ١ وصحيح مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ إنما الأعمال بالنية ... ح: ١٩٠٧ واللفظ لمسلم)

’’جس شخص کی ہجرت دنیا کے حصول یا کسی عورت سے شادی کرنے کے لیے ہو تو اس کی ہجرت اس طرف ہوگی جس طرف اس نے ہجرت کی۔‘‘

اگر اس کے نزدیک دونوں امر مساوی ہوں یعنی نہ تو عبادت کی نیت غالب ہو اور نہ غیر عبادت کی نیت تو اس کا معاملہ محل نظر ہے۔ زیادہ صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں اسے کوئی ثواب نہیں ملے گا‘ اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے‘ جو عمل اللہ کے لیے بھی کرتا ہے اور غیر اللہ کے لیے بھی۔

اس قسم اور اس سے پہلی قسم میں فرق یہ ہے کہ اس سے پہلی قسم میں غیر عبادت کی غرض بالضرورت حاصل ہے اور اس کا ارادہ اس کے عمل کے ساتھ بالضرورت حاصل ہے گویا اس نے اس دنیوی امر کا ارادہ کیا جو اس کے عمل کا قدرتی تقاضا ہے۔

اگر کہا جائے کہ اس قسم میں یہ جاننے کے لیے معیار کیا ہے کہ عبادت کا پہلو زیادہ غالب ہے یا غیر عبادت کا؟ اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ معیار یہ ہے‘ خواہ حاصل ہو یا نہ ہو‘ کہ عبادت کے سوا اس کا کوئی دوسرا مقصود ہے ہی نہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ

اس کے عمل میں عبادت کی نیت زیادہ غالب ہے اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو غالب نیت غیر عبادت کی ہوگی۔

بہر حال نیت‘ جو دل کے ارادے کا نام ہے‘ کا معاملہ بہت عظیم اور اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ نیت ہی انسان کو صدیقین کے درجے تک پہنچا دیتی ہے اور نیت ہی انسان کو پست سے پست درجے تک گرا دیتی ہے۔ بعض سلف کا قول ہے: ”اخلاص کی وجہ سے اپنے نفس کے خلاف جس طرح جہاد کرنا پڑا‘ کسی اور چیز کی وجہ سے ایسا جہاد نہیں کرنا پڑا۔“

ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو اخلاص نیت اور عمل صالح کی توفیق عطا فرمائے۔

اہل سنت والجماعت کے مسلک میں امید اور خوف کے پہلو

سوال امید اور خوف کے بارے میں اہل سنت والجماعت کا کیا مذہب ہے؟

جواب اس بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں کہ انسان امید کے پہلو کو مقدم قرار دے یا خوف کے پہلو کو۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”خوف اور امید کا پہلو ایک جیسا ہی ہونا چاہیے‘ خوف کا پہلو امید پر غالب ہو نہ امید کا پہلو خوف پر غالب ہو۔“ اور انہی سے منقول ہے: ”جس شخص نے ان میں سے جس پہلو کو غالب قرار دے دیا‘ وہ ہلاک ہو جائے گا۔“ کیونکہ اگر اس نے امید کے پہلو کو غالب کر دیا تو انسان اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بے خوف ہو جائے گا اور اگر اس نے خوف کے پہلو کو غالب کر دیا تو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو جائے گا۔

بعض علماء نے یہ کہا ہے: ”فعل طاعت کے وقت امید کا پہلو غالب ہونا چاہیے اور ارادۂ معصیت کے وقت خوف کا پہلو غالب ہونا چاہیے۔“ کیونکہ جب وہ طاعت کا کام کرے گا تو اس نے حسن ظن کے مطابق کام کیا‘ لہٰذا امید یعنی قبولیت کا پہلو غالب ہونا چاہیے لیکن معصیت کے ارادے کے وقت خوف کا پہلو غالب ہونا چاہیے تاکہ انسان معصیت کا ارتکاب نہ کر بیٹھے۔

کچھ دوسرے لوگوں نے یہ کہا ہے: ”تندرست آدمی کے لیے خوف کا پہلو اور مریض کے لیے امید کا پہلو غالب ہونا چاہیے۔“ کیونکہ تندرست آدمی پر جب خوف کا پہلو غالب ہوگا تو وہ اسے معصیت سے بچائے گا اور مریض پر جب امید کا پہلو غالب ہوگا تو وہ اللہ تعالیٰ سے حسن ظن کے ساتھ ملاقات کرے گا۔

میری رائے یہ ہے کہ اس مسئلے میں مختلف حالات میں صورت حال مختلف ہوتی ہے۔ غلبۂ خوف کے وقت جب اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونے کا اندیشہ ہو تو اس کے لیے اس اندیشے کو زائل کر دینا اور امید کے پہلو کو پیش نظر رکھنا واجب ہے اور امید کے پہلو کو غالب قرار دینے کی صورت میں جب اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بے خوف ہونے کا ڈر ہو تو اسے چاہیے کہ وہ خوف کے پہلو کو غالب کر دے۔ انسان درحقیقت اپنا خود طبیب ہے بشرطیکہ اس کا دل زندہ ہو اور جس کا دل مردہ ہو اور وہ اپنے دل کا علاج کر سکتا ہو نہ اپنے دل کے حالات کا جائزہ لے سکتا ہو تو اسے کسی چیز کی پروا نہیں ہوگی۔

سوال کیا اسباب کو اختیار کرنا توکل کے منافی ہے؟ جنگ خلیج کے دوران میں بعض لوگوں نے اسباب اختیار کیے تھے اور بعض نے انھیں ترک کر دیا اور کہا کہ وہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہیں؟

جواب مومن کے لیے واجب یہ ہے کہ وہ اپنے دل کو اللہ عزوجل کے ساتھ وابستہ کیے رکھے اور جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کے لیے اس پر سچا اعتماد کرے کیونکہ اللہ وحدہ کے ہاتھ میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے اور تمام معاملات اسی کی طرف لوٹتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلِلَّهِ غَيْبُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ ٱلْأَمْرُ كُلُّهُۥ فَٱعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٢٣﴾ ﴾ (هود: ١١/ ١٢٣)

''اور آسمانوں اور زمین کی چھپی چیزوں کا علم اللہ ہی کو ہے اور تمام امور اسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں، لہٰذا اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسا رکھو اور جو کچھ تم کر رہے ہو تمھارا پروردگار اس سے بے خبر نہیں۔''

موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا:

﴿ يَٰقَوْمِ إِن كُنتُمْ ءَامَنتُم بِٱللَّهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوٓا۟ إِن كُنتُم مُّسْلِمِينَ ﴿٨٤﴾ فَقَالُوا۟ عَلَى ٱللَّهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿٨٥﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ ٱلْقَوْمِ ٱلْكَٰفِرِينَ ﴿٨٦﴾ ﴾ (يونس: ١٠/ ٨٤-٨٦)

''اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اگر (دل سے) فرماں بردار ہو تو اسی پر بھروسا رکھو۔ تب وہ بولے کہ ہم اللہ ہی پر بھروسا رکھتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہم کو ظالم لوگوں کے ہاتھوں آزمائش میں نہ ڈال اور اپنی رحمت سے قوم کفار سے نجات بخش۔''

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَعَلَى ٱللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ ٱلْمُؤْمِنُونَ ﴿١٦٠﴾ ﴾ (آل عمران: ٣/ ١٦٠)

''اور مومنوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسا رکھیں۔''

اور فرمایا:

﴿ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى ٱللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُۥٓ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ بَٰلِغُ أَمْرِهِۦ ۚ قَدْ جَعَلَ ٱللَّهُ لِكُلِّ شَىْءٍ قَدْرًا ﴿٣﴾ ﴾

(الطلاق: ٦٥/ ٣)

''اور جو اللہ پر بھروسا رکھے گا تو وہ اس کو کفایت کرے گا۔ بلاشبہ اللہ اپنے کام کو (جو وہ کرنا چاہتا ہے) پورا کر دیتا ہے، اللہ نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔''

پس مومن پر واجب ہے کہ وہ اپنے رب پر، جو آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے، اعتماد کرے اور اس کے ساتھ حسن ظن رکھے اور ان شرعی، قدری اور حسی اسباب کو بھی اختیار کرے جنھیں اختیار کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کیونکہ خیر کو لانے والے اور شر کو دور کرنے والے اسباب اختیار کرنا بھی اللہ تعالیٰ اور اس کی حکمت پر ایمان لانا ہے اور یہ توکل کے منافی نہیں ہے، چنانچہ دیکھیے! سید المتوکلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی شرعی و قدری اسباب اختیار فرمایا کرتے تھے، سوتے وقت آپ سورۂ اخلاص اور معوذتین پڑھ کر اپنے آپ کو دم کیا کرتے تھے، جنگ میں زرہ پہنا کرتے تھے۔ جب مشرکوں کی جماعتوں نے جمع ہو کر مدینہ منورہ پر چڑھائی کی تو آپ نے مدینہ کی حفاظت کے لیے اس کے ارد گرد خندق کھودی تھی۔ جن اسباب کو انسان جنگوں کی تباہ کاریوں سے اپنے آپ کو بچانے

کیلئے استعمال کرتا ہے' اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی ان نعمتوں میں سے شمار کیا ہے جن پر وہ شکر کا مستحق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی داود علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ وَعَلَّمْنَٰهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُم مِّنۢ بَأْسِكُمْ ۖ فَهَلْ أَنتُمْ شَٰكِرُونَ ﴿٨٠﴾ ﴾

(الأنبياء: ٢١/ ٨٠)

''اور ہم نے تمھارے لیے ان کو ایک (طرح کا) لباس بنانا بھی سکھا دیا تا کہ تم کو لڑائی (کے ضرر) سے بچائے' پس تم کو شکر گزار ہونا چاہیے۔''

اللہ تعالیٰ نے حضرت داود علیہ السلام کو مکمل' عمدہ اور مضبوط زرہیں بنانے کا حکم دیا کہ اس سے دفاع خوب ہوتا ہے۔

ان علاقوں میں رہنے والے لوگوں کو' جو میدان جنگ سے قریب ہوں اور جنگ کی وجہ سے نقصان سے ڈرتے ہوں' احتیاط کے طور پر ایسے ماسک استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں' جو جسم کو نقصان پہچانے والی گیسوں سے مانع ہوں یا ایسے حفاظتی اقدامات اختیار کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں جو زہریلی گیسوں کو ان کے گھروں تک نہ پہنچنے دیں کیونکہ یہ ایسے اسباب ہیں جو خرابی سے بچاتے اور نقصان سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اسی طرح کھانے پینے کی ایسی اشیاء جمع کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں جن کے بارے میں انھیں اندیشہ ہو کہ جنگ کی وجہ سے انھیں شاید یہ چیزیں نہ ملیں۔ اندیشہ جس قدر زیادہ قوی ہو احتیاط اسی قدر زیادہ کرنی چاہیے' لیکن واجب ہے کہ اعتماد اور بھروسا صرف ذات باری تعالیٰ پر ہو۔ ان اسباب کو اللہ تعالیٰ کی شریعت و حکمت کے تقاضے کے مطابق استعمال کریں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے استعمال کی اجازت دی ہے۔ یہ عقیدہ نہیں ہونا چاہیے کہ جلب منفعت اور دفعِ مضرّت میں اسباب ہی اصل ہیں اور پھر مومنوں کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا کریں کہ اس نے یہ اسباب مہیا فرمائے اور ان کے استعمال کی بھی اجازت عطا فرمائی۔

میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہم سب کو فتنوں اور ہلاکتوں کے اسباب سے محفوظ رکھے اور ہمیں اور ہمارے تمام بھائیوں کو اپنی ذات پاک پر ایمان اور توکل کی قوت عطا فرمائے اور ان اسباب کے اختیار کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائے جن کی اس نے اجازت دی ہے اور پھر ان اسباب کو اسی طرح استعمال کرنے کی توفیق بخشے جس کی وجہ سے وہ ہم سے راضی ہو جائے۔

أسأل الله لی ولکم العافیه

اسباب اختیار کریں مگر حقیقی بھروسا مسبب الاسباب پر ہو

سوال اسباب اختیار کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اسباب اختیار کرنے کی کئی اقسام ہیں:

پہلی قسم: وہ ہے جو اپنے اصل کے اعتبار سے توحید کے منافی ہے' مثلاً یہ کہ انسان کسی ایسی چیز سے وابستہ ہو جائے' جس میں کسی تاثیر کا ہونا ممکن ہی نہ ہو مگر وہ اس پر کامل اعتماد کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے اعراض کر لے جیسا کہ قبروں کے پجاری مصیبتوں کے وقت قبروں میں مدفون لوگوں سے مدد مانگتے ہیں' تو یہ ایسا شرک اکبر ہے جس کی وجہ سے انسان ملت اسلامیہ سے خارج ہو جاتا ہے

اور اس طرح کے کسی سبب کو اختیار کرنے والے کے بارے میں یہ حکم ہے جو اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت کریمہ میں بیان فرمایا ہے:

﴿ إِنَّهُۥ مَن يُشْرِكْ بِٱللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ ٱللَّهُ عَلَيْهِ ٱلْجَنَّةَ وَمَأْوَىٰهُ ٱلنَّارُ ۖ وَمَا لِلظَّـٰلِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ ﴿٧٢﴾ ﴾

(المآئدة: ٥/ ٧٢)

’’جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرے گا‘ اللہ اس پر بہشت کو حرام کر دے گا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔‘‘

دوسری قسم: کسی صحیح شرعی سبب پر اعتماد کرے لیکن مُسَبِّب یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے غافل ہو۔ یہ بھی شرک ہی کی ایک قسم ہے لیکن اس کے ساتھ انسان ملت اسلامیہ سے خارج نہیں ہوتا کیونکہ اس نے سبب پر بھروسا کیا ہے اور مُسَبِّب یعنی اللہ تعالیٰ کو بھول گیا ہے۔

تیسری قسم: سبب پر صرف اتنا اعتماد کرے کہ وہ صرف سبب ہے اور حقیقی بھروسا اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہی پر کرے اور اعتقاد یہ رکھے کہ یہ سبب بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے‘ وہ چاہے تو اسے باقی رکھے اور اگر چاہے تو اسے ختم کر دے۔ اس سبب کا اللہ تعالیٰ کی مشیت میں کوئی اثر نہیں ہے۔ سبب کے استعمال کا یہ طریقہ اصل کے اعتبار سے توحید کے منافی نہیں ہے نہ کمال کے اعتبار سے۔

شرعی اور صحیح اسباب موجود ہونے کے باوجود انسان کو چاہیے کہ وہ اسباب ہی پر انحصار نہ کرے بلکہ انحصار صرف اللہ کی ذات گرامی پر کرے‘ چنانچہ وہ ملازم جس کا کامل اعتماد صرف اپنی تنخواہ پر ہے اور وہ مُسَبِّب یعنی ذات باری تعالیٰ سے غافل ہے‘ تو یہ بھی شرک کی ایک قسم ہے۔ اگر اس کا اعتقاد یہ ہو کہ تنخواہ تو ایک سبب ہے اور مُسَبِّب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات پاک ہے‘ تو یہ توکل کے منافی نہیں ہے کیونکہ اسباب تو رسول اللہ ﷺ بھی اختیار فرمایا کرتے تھے‘ جب کہ آپ کا حقیقی اعتماد اور بھروسا صرف مُسَبِّب یعنی اللہ عزوجل کی ذات بابرکات پر ہوتا تھا۔

آیات واذکار لکھ کر گلے میں لٹکانا یا ہاتھ پر باندھنا منع ہے

سوال دم کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور آیات لکھ کر مریض کے گلے میں لٹکا دینے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جادو یا دیگر بیماریوں میں مبتلا انسان کو قرآن کریم کی آیات یا مباح دعاؤں کے ساتھ دم کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ نبی اکرم ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو دم کیا کرتے تھے۔ آپ جو دم کیا کرتے اس کی ایک یہ دعا بھی ہوتی تھی:

«رَبُّنَا اللهُ الَّذِي فِي السَّمَاءِ تَقَدَّسَ اسْمُكَ، أَمْرُكَ فِي السَّمَاءِ وَالأَرْضِ، كَمَا رَحْمَتُكَ فِي السَّمَاءِ فَاجْعَلْ رَحْمَتَكَ فِي الأَرْضِ، اغْفِرْ لَنَا حُوبَنَا وَخَطَايَانَا أَنْتَ رَبُّ الطَّيِّبِينَ أَنْزِلْ رَحْمَةً مِّنْ رَّحْمَتِكَ وَشِفَاءً مِّنْ شِفَائِكَ عَلٰى هٰذَا الْوَجَعِ»(سنن أبي داود، الطب، باب كيف الرقى، ح: ٣٨٩٢)

’’ہمارا رب اللہ ہے جو آسمانوں میں ہے‘ تیرا نام پاک ہے‘ تیرا حکم آسمان اور زمین میں ہے‘ تیری رحمت جس طرح آسمان میں ہے اسی طرح زمین میں بھی عام کر دے‘ ہمارے گناہ اور خطائیں معاف کر دے۔ تو پاک لوگوں کا پروردگار ہے‘ پس تو اپنی شفا (کے خزانے) سے شفا اور اپنی رحمت (کے خزانے) سے اس درد پر رحمت نازل فرما دے۔‘‘

آپ جب یہ دم فرماتے تو مریض صحت یاب ہو جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں مسنون دعاؤں میں سے ایک یہ بھی ہے:

«بِسْمِ اللهِ أَرْقِيكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُؤْذِيكَ، مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ أَوْ عَيْنِ حَاسِدٍ، اللهُ يَشْفِيكَ، بِسْمِ اللهِ أَرْقِيكَ»(صحيح مسلم، السلام، باب الطب والمرض والرقي، ح:٢١٨٦)

''اللہ تعالیٰ کے پاک نام کے ساتھ میں تجھے ہر اس چیز سے دم کرتا ہوں جو تجھے تکلیف دے اور ہر انسان کے یا حسد کرنے والی آنکھوں کے شر سے اللہ تجھے شفا دے' میں اللہ کے نام کے ساتھ تجھے دم کرتا ہوں۔''

دم کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ انسان اپنے جسم میں درد کی جگہ پر ہاتھ رکھ کر یہ پڑھے:

«أَعُوذُ بِاللهِ وَقُدْرَتِهِ مِنْ شَرِّ مَا أَجِدُ وَأُحَاذِرُ»(صحيح مسلم، السلام، باب استحباب وضع يده علي موضع الألم مع الدعاء، ح:٢٢٠٢)

''میں اللہ تعالیٰ اور اس کی قدرت کی پناہ لیتا ہوں اس تکلیف کے شر سے جو مجھے ہو رہی ہے اور جس سے میں ڈرتا ہوں۔''

علاوہ ازیں اہل علم نے اس سلسلے میں وارد رسول اللہ ﷺ کی اور بھی کئی احادیث ذکر کی ہیں۔

جہاں تک آیات واذکار کے لکھ کر لٹکانے کا حکم ہے' تو اس بارے میں اہل علم میں اختلاف ہے۔ بعض نے اس کی اجازت دی ہے اور بعض نے اسے ممنوع قرار دیا ہے۔ زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ یہ ممنوع ہے کیونکہ یہ نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے اور ثابت یہ ہے کہ پڑھ کر مریض کو دم کیا جائے۔ آیات یا دعاؤں کا لکھ کر مریض کے گلے میں لٹکانا یا اس کے ہاتھ پر باندھنا یا اس کے تکیے کے نیچے رکھنا' راجح قول کے مطابق' یہ سب امور ممنوع ہیں کیونکہ یہ ثابت نہیں ہیں۔ شریعت کی اجازت کے بغیر اگر کوئی شخص کسی امر کو کسی دوسرے امر کا سبب قرار دیتا ہے تو اس کا یہ عمل بھی شرک ہی کی ایک صورت ہے' کیونکہ یہ کسی ایسی بات کو سبب قرار دینا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے سبب قرار نہیں دیا۔

نبی ﷺ معوذات پڑھ کر خود کو دم کیا کرتے تھے

سوال کیا دم کرنا توکل کے منافی ہے؟

جواب توکل کے معنی یہ ہیں کہ جلب منفعت اور دفع مضرت کے لیے اللہ تعالیٰ کی ذات پر سچا اعتماد کیا جائے اور ان اسباب کو بھی اختیار کیا جائے جن کے اختیار کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ توکل یہ نہیں کہ اسباب اختیار کیے بغیر اللہ تعالیٰ پر بھروسا کیا جائے۔ اسباب کے بغیر اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرنا' اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی حکمت پر طعن کرنا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مسبَّبات کو اسباب کے ساتھ مربوط قرار دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ لوگوں میں سے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک پر سب سے زیادہ توکل کرنے والا کون ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک پر سب سے زیادہ توکل کرنے والے رسول اللہ ﷺ ہیں' تو پھر سوال یہ ہے کہ کیا نقصان سے بچنے کے لیے آپ اسباب استعمال کرتے تھے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں آپ اسباب استعمال فرمایا کرتے تھے۔ جب جنگ کے لیے تشریف لے جاتے تو دشمن کے تیروں سے بچنے کے لیے زرہیں زیب تن فرمایا کرتے تھے۔ غزوۂ احد میں آپ نے دو زرہیں زیب تن فرمائیں تاکہ پیش آنے والے خطرات سے بچنے کی تیاری کی جا سکے' تو معلوم ہوا کہ اسباب اختیار کرنا

توکل کے منافی نہیں ہے بشرطیکہ انسان اعتقاد یہ رکھے کہ یہ محض اسباب ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر ان میں کوئی تاثیر نہیں، لہٰذا انسان کا پڑھ کر اپنے آپ کو یا اپنے بیمار بھائیوں کو دم کرنا توکل کے منافی نہیں ہے۔ حدیث سے ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ معوذات پڑھ کر اپنے آپ کو دم کرلیا کرتے تھے اور یہ بھی ثابت ہے کہ جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بیمار ہوتے تو آپ انھیں بھی پڑھ کر دم فرمادیا کرتے تھے۔ واللہ اعلم

طلسماتی تعویذ اور گنڈے بدعت اور حرام ہیں

سوال تعویذات وغیرہ لٹکانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب تعویذات وغیرہ کو لٹکانے کے مسئلے کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: یہ کہ تعویذ قرآن مجید کے الفاظ پر مشتمل ہو اس مسئلے میں سلف و خلف اہل علم کا اختلاف ہے، بعض نے اسے جائز قرار دیتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ یہ درج ذیل ارشاد باری تعالیٰ میں داخل ہے:

﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ ٱلْقُرْءَانِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴾ (الإسراء: ١٧/ ٨٢)

”اور ہم قرآن (کے ذریعے) سے وہ چیز نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے۔“

نیز اس ارشاد باری تعالیٰ میں داخل ہے:

﴿ كِتَٰبٌ أَنزَلْنَٰهُ إِلَيْكَ مُبَٰرَكٌ ﴾ (ص: ٣٨/ ٢٩)

”(یہ) کتاب جو ہم نے تم پر نازل کی ہے بابرکت ہے۔“

اور اس کی برکت کی وجہ سے اسے تعویذ بنا کر لٹکا دیا جائے تاکہ اس کے ساتھ تکلیف کو دور کیا جا سکے۔

بعض اہل علم نے اسے ممنوع قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے کہ یہ کوئی ایسا شرعی سبب ہو جس کے ساتھ تکلیف کو دور کیا جا سکتا ہو۔ اس طرح کی اشیا میں اصل توقیف ہے اور ان دونوں میں سے یہی قول راجح ہے کہ تعویذات لٹکانا جائز نہیں، خواہ ان میں قرآن کریم کے الفاظ ہی کیوں نہ لکھے گئے ہوں۔ اس طرح کے تعویذات کو مریض کے تکیے کے نیچے رکھنا بھی جائز نہیں ہے اور دیواروں وغیرہ پر لٹکانا بھی جائز نہیں، البتہ یہ ثابت ہے کہ مریض کے لیے دعا کی جائے اور آیات کریمہ کو پڑھ کر اسے دم کیا جائے جیسا کہ نبی ﷺ کیا کرتے تھے۔

دوسری قسم: اگر تعویذات کے الفاظ قرآن کریم سے تو نہ ہوں بلکہ وہ ایسے الفاظ ہوں، جن کا معنی و مفہوم واضح نہ ہو تو اس طرح کے تعویذات کو کسی صورت بھی استعمال کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ معلوم ہی نہیں کہ ان میں کیا لکھا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں بعض لوگ طلسمات، گرہ لگائی گئی اشیاء اور ایک دوسرے میں داخل کر کے اس طرح حروف لکھتے ہیں کہ نہ انھیں پڑھا جا سکتا اور نہ سمجھا جا سکتا ہے یہ عمل بدعت اور حرام ہے اور قطعاً کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ واللہ اعلم

کھانے پینے کے برتنوں پر آیت الکرسی وغیرہ لکھنے کا مسئلہ

سوال کیا قرآن کریم کی بعض آیات، مثلاً آیت الکرسی کو علاج کی غرض سے کھانے پینے کے برتنوں پر لکھنا جائز ہے؟

جواب سب سے پہلے اس بات کو جان لینا واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پاک کتاب اس بات سے بہت بلند و بالا اور ارفع و اعلیٰ ہے کہ ہم اس کی اس حد تک توہین و تذلیل کریں۔ ایک مومن کا دل اس بات کو کس طرح گوارا کر سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کتاب کی سب سے عظیم آیت، آیت الکرسی کو پانی پینے کے کسی برتن میں لکھ دے اور پھر اس کی توہین ہوتی رہے کہ اسے گھر میں پھینک دیا جائے اور بچے اس کے ساتھ کھیلتے رہیں؟ بلا شک وشبہ ایسا کرنا حرام ہے۔ جس شخص کے پاس ایسے برتن ہوں جن میں اس طرح کی آیات لکھی ہوں اس کے لیے واجب ہے کہ وہ آیات کو مٹا دے، برتن بنانے والے کے پاس انھیں لے جائے اور ان سے کہے کہ وہ انھیں مٹا دے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر واجب ہے کہ کسی پاک جگہ گڑھا کھود کر ان میں دفن کر دے۔ اگر ان برتنوں کو گھروں میں اس طرح باقی رکھا جائے کہ ان کی توہین ہوتی رہے، بچے ان برتنوں سے پانی پئیں اور ان کے ساتھ کھیلتے رہیں تو اصل بات یہ ہے کہ قرآن مجید کو شفا کے حصول کے لیے اس طرح استعمال کرنا سلف صالحین رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں ہے۔

اللہ کے اسماء وصفات کی تاویل نہ کی جائے

سوال بعض اسلامی ممالک میں دینی مدارس کے طلبہ یہ پڑھتے ہیں کہ اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات پر کسی تحریف، تعطیل، تکییف اور تمثیل کے بغیر ایمان لایا جائے۔ کیا اہل سنت کو ابن تیمیہ اور ان کے تلامذہ کے مکتب فکر اور اشاعرہ و ماتریدیہ کے مکتب فکر میں تقسیم کرنا صحیح ہے؟ جو علماء اسماء وصفات باری تعالیٰ کی تاویل کرتے ہیں ان کے بارے میں کیا موقف ہونا چاہیے؟

جواب اس میں کوئی شک نہیں کہ طلبہ مدارس میں جو یہ پڑھتے ہیں کہ اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے ساتھ تحریف، تعطیل، تکییف اور تمثیل کے بغیر ایمان لانا واجب ہے، تو یہ فی الواقع مسلکِ اہل سنت کے عین مطابق ہے جیسا کہ اہل سنت کے عقائد کے موضوع پر مطول اور مختصر کتب سے ثابت ہے کہ یہ بات حق اور کتاب وسنت اور اقوالِ سلف کے عین مطابق ہے۔ نظر صحیح اور عقل صریح کا بھی یہی تقاضا ہے۔ اس سلسلے میں اس وقت ہم دلائل بیان نہیں کریں گے کیونکہ دلائل کے بارے میں سوال میں مطالبہ نہیں کیا گیا، البتہ اہل سنت کی دو مکاتب فکر میں تقسیم کے بارے میں سوال میں جو پوچھا گیا ہے، اس کا جواب ہم ضرور دیں گے۔

- ان دونوں میں سے ایک مکتب فکر ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے تلامذہ کا ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ نصوص کو ان کے ظاہری معنی سے نہیں پھیرنا چاہیے۔
- دوسرا مکتب فکر اشاعرہ و ماتریدیہ کا ہے، جو اسماء وصفات باری تعالیٰ سے متعلق نصوص کے ظاہر سے پھیرنے کو واجب قرار دیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں مکاتب فکر میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے بارے میں واضح اختلاف ہے۔ پہلے مدرسۂ فکر کے

اساتذہ اس بات کو واجب قرار دیتے ہیں کہ اسماء وصفات سے متعلق نصوص کو ان کے ظاہر پر رکھنا اور تمثیل یا تکییف وغیرہ کی نفی کرنا واجب ہے جب کہ دوسرے مدرسۂ فکر کے اساتذہ اسماء وصفات باری تعالیٰ کی ظاہر کے خلاف تاویل کو واجب قرار دیتے ہیں۔

یہ دونوں مدرسۂ فکر مکمل طور پر ایک دوسرے سے جدا ہیں اور ان دونوں کا اختلاف درج ذیل مثال سے خوب واضح ہو جائے گا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ بَلۡ يَدَاهُ مَبۡسُوطَتَانِ يُنفِقُ كَيۡفَ يَشَآءُۚ ﴾ (المائدة: ٥/ ٦٤)

''بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں' وہ جس طرح (اور جتنا) چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔''

ابلیس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کرتے ہوئے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے جب انکار کر دیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اسے سرزنش کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ قَالَ يَٰٓإِبۡلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَن تَسۡجُدَ لِمَا خَلَقۡتُ بِيَدَيَّۖ ﴾ (ص: ٣٨/ ٧٥)

''اللہ نے فرمایا: اے ابلیس! جس شخص کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا اس کے آگے سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے منع کیا؟''

ان دونوں مدرسۂ فکر کے اساتذہ کا اس بات میں اختلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان دو ہاتھوں سے کیا مراد ہے' جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کے حوالے سے اثبات فرمایا ہے؟

پہلے مدرسۂ فکر کا کہنا ہے کہ واجب ہے کہ ان دونوں کے معنی کو ظاہر پر رکھا جائے اور اللہ تعالیٰ کے لیے دو حقیقی ہاتھوں کا اس طرح اثبات کیا جائے جس طرح اس کی ذات پاک کے شایان شان ہے۔

دوسرے مکتبۂ فکر کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ظاہر کے خلاف ان کی تاویل کرنا واجب ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے دو حقیقی ہاتھوں کا اثبات حرام ہے' پھر اس بات میں بھی ان میں آپس میں اختلاف ہے کہ تاویل کی صورت میں ہاتھوں سے مراد قوت ہے یا نعمت؟

اس مثال سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان دونوں مکاتب فکر میں بہت زیادہ اختلاف ہے' جس کی وجہ سے یہ دونوں اہل سنت کی ایک صف میں اکٹھے نہیں ہو سکتے' لہٰذا ضروری ہے کہ ان میں سے صرف ایک مدرسۂ فکر کو اہل سنت قرار دیا جائے۔ ہم دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کریں گے اور دونوں کو انصاف کے ترازو میں تولیں گے اور وہ انصاف کا ترازو کتاب اللہ' سنت رسول' کلام صحابۂ کرام اور نیکو کاری کے ساتھ ان کی پیروی کرنے والے تابعین ہیں جو اس امت کے سلف اور ائمہ کرام ہیں۔ اس میزان کے مطابق دلائل کی تمام صورتوں' مطابقت یا تضمن یا التزام' میں سے صریحاً یا اشارۃً کوئی ایک بھی ایسی دلیل نہیں ہے جس سے دوسرے مکتبۂ فکر کے موقف کی تائید ہوتی ہو۔ اس میزان کی ہر دلیل صریحاً' ظاہراً یا اشارۃً اس بات کی تائید کرتی ہے کہ پہلے مکتبۂ فکر کا مذہب ہی درست ہے' لہٰذا اہل سنت کا وصف صرف انھی کے لیے مخصوص ہے' دوسرا مکتب فکر اس وصف میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ اس مکتب فکر کو اس وصف میں پہلے مکتب فکر کے ساتھ شامل کر دینا ظلم اور دو متضاد چیزوں کو یکجا کر دینے کے مترادف ہوگا جب کہ ظلم شرعی طور پر اور دو متضاد چیزوں کو یکجا کر دینا عقلی طور پر ممنوع ہے۔

دوسرے مکتب فکر کے لوگوں یعنی تاویل کرنے والوں نے جو یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی تاویل کرنے سے کوئی امر مانع نہیں ہے، جبکہ یہ تاویل کسی شرعی نص سے متعارض نہ ہو، ہم اس کے جواب میں عرض کریں گے کہ کسی دلیل شرعی کے بغیر لفظ کی ظاہر کے خلاف تاویل کرنا ہی اصول دلیل کے خلاف اور علم کے بغیر اللہ تعالیٰ کی طرف بات کو منسوب کرنا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت کریمہ میں حرام قرار دیا ہے:

﴿ قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ ٱلْفَوَٰحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَٱلْإِثْمَ وَٱلْبَغْيَ بِغَيْرِ ٱلْحَقِّ وَأَن تُشْرِكُوا۟ بِٱللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِۦ سُلْطَٰنًا وَأَن تَقُولُوا۟ عَلَى ٱللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٣﴾ ﴾ (الأعراف: ۷/ ۳۳)

”کہہ دو: میرے پروردگار نے تو بے حیائی کی باتوں کو، جو ظاہر ہوں یا پوشیدہ اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کرنے کو حرام قرار دیا ہے اور اس کو بھی کہ تم کسی کو اللہ کا شریک بناؤ جس کی اس نے کوئی سند نازل نہیں کی اور اس کو بھی کہ تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہو جن کا تمھیں کچھ علم نہیں۔“

اور درج ذیل آیت میں بھی اس سے منع فرمایا ہے:

﴿ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِۦ عِلْمٌ ۚ إِنَّ ٱلسَّمْعَ وَٱلْبَصَرَ وَٱلْفُؤَادَ كُلُّ أُو۟لَٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔولًا ﴿٣٦﴾ ﴾ (الإسراء: ۱۷/ ۳٦)

”اور (اے بندے!) جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ کہ کان اور آنکھ اور دل ان سب (جوارح) سے ضرور باز پرس ہوگی۔“

اللہ تعالیٰ کے اسماء کی تاویل کرنے والوں کے پاس اپنی تاویل کی تائید میں نہ تو علم ماثور ہے اور نہ نظر معقول۔ ان کے پاس صرف چند شبہات ہیں اور ان میں بھی تناقض اور تعارض ہے اور ان سے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کی وحی میں اس سے کہیں زیادہ نقص لازم آتا ہے، جو ان کے زعم میں ظاہر کے مطابق اثبات سے لازم آتا ہے۔ یہاں تفصیل سے بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

مقصود یہ ہے کہ اہل سنت کے وصف سے ان دونوں گروہوں کو متصف قرار دینا ممکن نہیں، جن کے طریق وطرز عمل میں حد درجہ اختلاف ہے، لہٰذا ان میں اہل سنت کے وصف کا صرف وہی گروہ مستحق ہے، جس کا قول سنت کے موافق ہو، چنانچہ پہلا مکتب فکر جو اسماء و صفات باری تعالیٰ کی تاویل نہیں کرتا، تاویل سے کام لینے والے دوسرے مکتب فکر کی نسبت اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اسے اہل سنت قرار دیا جائے، لہٰذا اہل سنت کو دو گروہوں میں تقسیم کرنا صحیح نہیں ہے، صحیح بات یہ ہے کہ اہل سنت کا صرف ایک ہی گروہ ہے۔

انھوں نے اس سلسلہ میں ابن الجوزی رحمہ اللہ کے قول سے جو استدلال کیا ہے، تو اس کے جواب میں ہم عرض کریں گے کہ اہل علم کے اقوال کے لیے تو استدلال کیا جا سکتا ہے، ان کے ساتھ استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ اہل علم میں سے کسی کا قول دیگر اہل علم پر حجت نہیں ہے۔ انھوں نے جو یہ کہا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے حدیث:

«إِنَّ قُلُوبَ بَنِي آدَمَ كُلَّهَا بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ» (صحیح مسلم، القدر، باب تصريف الله تعالى القلوب كيف شاء، ح: ۲٦٥٤)

’’بے شک بنی آدم کے تمام دل، رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں۔‘‘

اور حدیث:

«اَلْحَجَرُ الأَسْوَدُ يَمِينُ اللهِ فِي الأَرْضِ»(ضعيف: مسند الفردوس للديلمي: ١٥٩/٢، حديث: ٢٨٠٧، ٢٨٠٨ وتاريخ بغداد: ٣٢٨/٦ الضعيفة: ٢٢٣)

’’حجر اسود زمین میں اللہ کا دایاں ہاتھ ہے۔‘‘

اور آیت کریمہ:

﴿ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ ﴾ (الحديد: ٥٧/ ٤)

’’اور تم جہاں کہیں ہو وہ تمھارے ساتھ ہے۔‘‘

کی تاویل کی ہے؟

اس کے جواب میں ہم عرض کریں گے کہ امام احمد رحمہ اللہ کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ انھوں نے مذکورہ دو حدیثوں کی تاویل کی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’ابو حامد غزالی رحمہ اللہ نے جو یہ بیان کیا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے تین چیزوں کی تاویل کی ہے۔ ○ حجر اسود زمین میں اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ ہے۔ ○ بندوں کے دل رحمان کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں اور ○ میں یمن کی طرف سے رحمان کی سانس کو محسوس کرتا ہوں۔ امام احمد رحمہ اللہ کی طرف یہ ایک جھوٹی بات منسوب ہے، کسی نے سند کے ساتھ اس بات کو امام احمد رحمہ اللہ سے نقل نہیں کیا اور امام احمد رحمہ اللہ کے اصحاب میں سے بھی کوئی نہیں جس نے اس بات کو ان سے نقل کیا ہو۔‘‘①

اور ارشاد باری تعالیٰ:

﴿ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ ﴾ (الحديد: ٥٧/ ٤)

’’اور تم جہاں کہیں ہو وہ تمھارے ساتھ ہے۔‘‘

اس کی امام احمد رحمہ اللہ نے تاویل نہیں کی، بلکہ اس کی اس کے بعض لوازم کے ساتھ تفسیر کی ہے اور وہ ان جہمیہ کی تردید میں نہایت ممتاز مقام کے حامل ہیں جنھوں نے اصلی مراد کے خلاف اس آیت کریمہ کی تفسیر کی ہے، کیونکہ ان کا گمان یہ ہے کہ اس آیت کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ بذاتہ ہر جگہ موجود ہے، اللہ تعالیٰ ان کی اس بات سے پاک ہے، تو امام احمد رحمہ اللہ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ معیت یہاں مخلوق کے احاطہ کے معنی میں ہے اور احاطہ جن چیزوں کے ساتھ کیا ہے ان میں ایک علم بھی ہے کیونکہ معیت کا تقاضا حلول و اختلاط نہیں ہے بلکہ اس کے معنی ہر جگہ اس کے حسب حال ہوں گے، اس لیے کہا جاتا ہے: [سَقَانِي لَبَناً مَعَهُ مَاءٌ] ’’اس نے مجھے دودھ پلایا جس کے ساتھ پانی بھی تھا۔‘‘ اور [صَلَّيْتُ مَعَ الْجَمَاعَةِ] ’’میں نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھی۔‘‘ اور [فُلَانٌ مَعَهُ زَوْجَتُهُ] ’’فلاں شخص کے ساتھ اس کی بیوی ہے۔‘‘

---

① فتاوی: 398/5 جمع و ترتیب ابن قاسم

ان میں سے پہلی مثال میں معیت امتزاج واختلاط کے معنی میں ہے' دوسری مثال میں کسی اختلاط کے بغیر جگہ اور عمل میں مشارکت کے معنی میں ہے اور تیسری مثال میں مصاحبت کے معنی ہیں' خواہ جگہ یا عمل میں اشتراک نہ بھی ہو۔ جب یہ بات واضح ہوگئی کہ معیت کے معنی مضاف الیہ کی مناسبت سے مختلف ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق کے ساتھ معیت اس سے مختلف ہوگی جو مخلوق کی اپنے جیسی مخلوق کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس معیت میں امتزاج واختلاط کا امکان نہیں ہے اور جگہ میں مشارکت کا امکان بھی نہیں ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے یہ بات ممتنع ہے۔ یہ امر ثابت شدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اپنی مخلوق سے جدا اور بلند وبالا ہے' لہٰذا وہ آسمانوں سے اوپر اپنے عرش پر ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے ساتھ ہے کیونکہ وہ اپنے علم وقدرت' سلطنت' سمع وبصر اور تدبیر وغیرہ کے ساتھ ہمارا احاطہ کیے ہوئے ہے جیسا کہ اس کی ربوبیت کا تقاضا ہے' لہٰذا اگر کوئی مفسر معیت کی علم کے ساتھ تفسیر کرتا ہے تو وہ نہ اس کے تقاضے سے خارج ہے اور نہ اس کی تاویل سے' البتہ وہ شخص اسے تاویل سمجھے گا جو معیت کے معنی ہر حال میں امتزاج واختلاط اور جگہ میں مشارکت سمجھتا ہے' اور یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ہر حال میں معیت کے یہ معنی نہیں ہوتے۔ یہ بات ہے ان تینوں نصوص کی اس تاویل کے حوالے سے جو امام احمد ؒ سے منقول ہے اور اگر ان نصوص کا ان کی اپنی حیثیت سے جائزہ لیا جائے تو ابھی بیان کیا جا چکا ہے کہ اگر کوئی مفسر معیت کی علم کے ساتھ تفسیر کرتا ہے تو وہ اس کے بعض مقتضیات ہی کے ساتھ تفسیر کرتا ہے' یہ اس معنی سے انحراف نہیں ہے' جو اس کا تقاضا ہے۔

جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے:

«إِنَّ قُلُوبَ بَنِي آدَمَ كُلَّهَا بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ كَقَلْبٍ وَاحِدٍ يُصَرِّفُهُ حَيْثُ يَشَاءُ»(صحيح مسلم، القدر، باب تصريف الله تعالى القلوب كيف شاء، ح:٢٦٥٤)

''بنی آدم کے تمام دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں' ایک دل کی طرح وہ انھیں جس طرف چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔''

اہل سنت والجماعت کے ہاں اس میں تاویل کی ضرورت نہیں کیونکہ اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کے لیے انگلیوں کا جو اثبات ہے' تو وہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی انگلیاں ہیں اور اس طرح ہیں جس طرح اس کی ذات پاک کے شایان شان ہیں۔ ہمارے دلوں کے اللہ تعالیٰ کی انگلیوں کے درمیان ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دلوں کو مس کر رہی ہیں۔ جس طرح بادل آسمان وزمین کے درمیان مسخر ہے اور وہ آسمان کو چھوتا ہے نہ زمین کو' اس طرح بنی آدم کے دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں اور اس سے ایک دوسرے کو چھونا لازم نہیں آتا۔ باقی رہی یہ حدیث:

«اَلْحَجَرُ الْأَسْوَدُ يَمِينُ اللهِ فِي الْأَرْضِ»(ضعيف: مسند الفردوس للديلمي:٢/١٥٩، حديث:٢٨٠٧، ٢٨٠٨ وتاريخ بغداد:٦/٣٢٨ الضعيفة:٢٢٣)

''حجر اسود زمین میں اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ ہے۔''

اس کے بارے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ ؒ فرماتے ہیں: '' یہ نبی ﷺ سے ایسی سند کے ساتھ مروی ہے جو ثابت

نہیں۔ ① مشہور بات یہ ہے کہ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ حجر اسود زمین میں اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ ہے' جس نے اس سے مصافحہ کیا اور بوسہ دیا گویا اس نے اللہ تعالیٰ سے مصافحہ کیا اور اس کے دائیں ہاتھ کو بوسہ دیا۔'' نیز فرمایا: ''یہ بات بالکل صریح ہے کہ حجر اسود اللہ کی صفت ہے نہ اس کا اپنا دایاں ہاتھ' کیونکہ اس میں یہ فرمایا ہے: ''زمین میں اللہ کا دایاں ہاتھ'' اسے زمین کے ساتھ مقید بیان کیا ہے' مطلق اللہ کا دایاں ہاتھ نہیں کہا۔ اور لفظ مقید کا حکم مطلق کے مخالف ہوتا ہے'' اور پھر یہ بھی کہا: ''جس نے اسے بوسہ دیا اور مصافحہ کیا تو اس نے گویا اللہ تعالیٰ سے مصافحہ کیا اور اس کے دائیں ہاتھ کو بوسہ دیا اور یہ حقیقت معلوم ہے کہ مشبہ اور مشبہ بہ الگ الگ ہوتے ہیں۔'' ②

میں عرض کرتا ہوں کہ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی کسی ایسی صفت کا ذکر نہیں ہے جس کی اس کے ظاہری معنی کے خلاف تاویل کی گئی ہو' اس میں قطعاً کوئی تاویل نہیں ہے۔

اور سائل نے جو یہ کہا تھا کہ دو مکاتب فکر ہیں' جن میں سے ایک ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا مکتب فکر ہے۔ تو اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ اس مدرسہ کی ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی طرف نسبت وہم ہے' اس سے پہلے کسی نے یہ بات نہیں کی' لہٰذا یہ بات غلط ہے کیونکہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے جو مذہب اختیار کیا تھا وہ وہی تھا جو سلف صالحین اور اس امت کے ائمہ کا مذہب تھا' لہٰذا انھوں نے اس مدرسۂ فکر کو ایجاد نہیں کیا تھا جیسا کہ سائل کی اس بات سے معلوم ہو رہا ہے جو ان کی شان میں کمی کرنا چاہتا ہے۔ واللہ المستعان!

تاویل کرنے والے علماء کے بارے میں ہمارا موقف یہ ہے کہ ان میں سے جو لوگ حُسن نیت کے ساتھ معروف ہیں اور دین اور اتباع سنت میں پختہ ہیں تو وہ تاویل کرنے میں معذور ہیں' لیکن اس معذوری کے یہ معنی نہیں کہ ان کا یہ طریقہ غلط نہیں ہے جو سلف صالحین کے اس عمل کے مخالف ہے کہ نصوص کو ان کے ظاہر ہی پر رہنے دیا جائے اور اسی عقیدے کو اختیار کیا جائے' جو تکییف وتمثیل کے بغیر ان نصوص کے ظاہر سے معلوم ہو رہا ہے' لہٰذا واجب ہے کہ قول اور قائل' فعل اور فاعل کے بارے میں حکم میں فرق کیا جائے۔ اگر بات اجتہاد اور حسن قصد پر مبنی ہو تو اس کے قائل کو قابل مذمت نہیں سمجھا جائے گا بلکہ اجتہاد کی وجہ سے اسے اجر ملے گا جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَإِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ»(صحيح البخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب أجر الحاكم إذا اجتهد فأصاب أو أخطأ، ح: ٧٣٥٢ وصحيح مسلم، الأقضية، باب بيان أجر الحاكم إذا اجتهد . . . ح: ١٧١٦)

''جب کوئی حاکم فیصلہ کرے اور اجتہاد سے کام لے اور اس کا اجتہاد درست بھی ہو تو اسے دو اجر ملیں گے اور اگر وہ فیصلہ کرتے ہوئے اجتہاد سے کام لے اور غلطی کر جائے تو اسے ایک اجر ملے گا۔''

جہاں تک تاویل کرنے والے ایسے شخص کو گمراہ قرار دینے کی بات ہے۔ اگر اس گمراہی سے مراد وہ مطلق گمراہی ہے جس کی وجہ سے کسی گمراہ کو قابل مذمت قرار دے کر اس سے ناراضی کا اظہار کیا جاتا ہے' تو اس طرح کی گمراہی کا اطلاق ایسے مجتہد پر نہیں کیا

---

① مجموع فتاوی: 397/6 جمع و ترتیب: ابن قاسم۔ ② مجموع فتاوی: 44/3

جاسکتا جس کے بارے میں معلوم ہو کہ اس کی نیت اچھی اور دین داری واتباع سنت میں اس کا قدم راسخ ہے اور اگر یہاں گمراہی سے مراد قائل کی مذمت کے بغیر صرف راہ راست کی مخالفت ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس طرح کی گمراہی مطلق ضلالت نہیں ہے کیونکہ اس نے طریقہ صحیح استعمال کیا ہے یعنی حق تک پہنچنے کے لیے اس نے اجتہاد سے کام لیا ہے، لیکن اس کا نتیجہ چونکہ حق کے خلاف ہے لہٰذا اسے گمراہ کہا جا سکتا ہے۔ اس تفصیل سے اشکال اور شک وشبہ دور ہو جاتا ہے۔ واللہ المستعان!

کیا اسمائے الٰہی میں تحریف، تعطیل یا تمثیل کی گنجائش ہے؟

سوال اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے بارے میں اہل سنت والجماعت کا کیا عقیدہ ہے؟ اسم اور صفت میں کیا فرق ہے؟ کیا اسم کے ثبوت سے صفت کا اور صفت کے ثبوت سے اسم کا ثبوت بھی لازم آتا ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے بارے میں اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ ان تمام اسماء وصفات کو کسی تحریف، تعطیل، تکییف یا تمثیل کے بغیر اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کیا جائے جن کا اس نے اپنی ذات پاک کے لیے خود اثبات فرمایا ہے۔

اسم اور صفت میں فرق یہ ہے کہ اسم تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنا نام رکھا ہے اور صفت وہ ہے جس کے ساتھ اس نے اپنی صفت بیان فرمائی ہے اور ان دونوں میں فرق بالکل ظاہر ہے۔

اسم اللہ تعالیٰ کے لیے اسم علم ہوتا ہے اور وہ صفت کو بھی متضمن ہوتا ہے، لہٰذا اسم کے اثبات سے صفت کا اثبات بھی لازم آتا ہے، اس کی مثال ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ اس میں اسم ''غفور'' مغفرت کو اور اسم ''رحیم'' رحمت کو مستلزم ہے، لیکن اثبات صفت سے اثبات اسم لازم نہیں آتا، مثلاً اللہ تعالیٰ کے لیے صفت کلام تو ثابت ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے لیے اسم ''متکلم'' بھی ثابت کریں، لہٰذا معلوم ہوا کہ صفات زیادہ وسیع ہیں کیونکہ ہر اسم صفت کو تو متضمن ہے لیکن ہر صفت اسم کو متضمن نہیں ہے۔

اسمائے الٰہی ننانوے تک محدود نہیں

سوال کیا اللہ تعالیٰ کے اسماء محصور (محدود) ہیں؟

جواب اللہ تعالیٰ کے اسماء کسی معین عدد میں محصور نہیں ہیں اور اس کی دلیل یہ صحیح حدیث ہے کہ نبی ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے:

«اَللَّهُمَّ إِنِّي عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ أَمَتِكَ، نَاصِيَتِي بِيَدِكَ، مَاضٍ فِيَّ حُكْمُكَ، عَدْلٌ فِيَّ قَضَاؤُكَ، أَسْأَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهِ نَفْسَكَ، أَوْ عَلَّمْتَهُ أَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ، أَوْ أَنْزَلْتَهُ فِي كِتَابِكَ أَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهِ فِي عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ»(مسند أحمد: ١/ ٣٩١)

''اے اللہ میں تیرا بندہ ہوں، تیرے بندے کا بیٹا ہوں، تیری باندی کا بیٹا ہوں، میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے، مجھ پر تیرا ہی حکم چلتا ہے، میرے بارے میں تیرا فیصلہ انصاف پر مبنی ہے، میں تیرے ہر اس نام کے وسیلے سے تجھ سے دعا کرتا ہوں جو تو نے اپنی ذات پاک کا نام رکھا ہے یا جو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو بھی سکھایا ہے یا جو تو نے اپنی کتاب میں نازل کیا ہے یا جسے تو نے علم غیب میں اپنے ہی پاس رکھنے کو ترجیح دی ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے ان اسمائے حسنیٰ کو معلوم کرنا ممکن ہی نہیں جنھیں اس نے اپنے پاس علم غیب میں رکھنے کو ترجیح دی ہے اور جو چیز معلوم نہ ہو وہ کسی عدد میں محصور بھی نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک نبیٔ کریم ﷺ کے اس ارشاد کا تعلق ہے:

«إِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَّتِسْعِينَ اسْمًا، مِائَةً إِلاَّ وَاحِدًا مَنْ اَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ»(صحيح البخاري، الشروط، باب ما يجوز من الاشراط ... ح:٢٧٣٦، ومسلم، الذكر والدعاء، باب في أسماء الله تعالى وفضل من أحصاها، ح:٢٦٧٧)

”اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں' ایک کم سو۔ جس نے انھیں شمار کیا (انھیں یاد کیا اور پڑھا) تو وہ جنت میں داخل ہو گا۔“

تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے صرف یہی اسماء ہیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے جو ان ننانوے اسماء کو شمار کرے گا تو وہ جنت میں داخل ہو گا: (مَنْ اَحْصَاهَا) ”جو انھیں شمار کرے گا“ یعنی انھیں یاد کرے گا اور پڑھے گا' یہ الگ نیا جملہ نہیں بلکہ پہلے جملے ہی کی تکمیل ہے۔ اس کی نظیر اہل عرب کا یہ قول ہے: ”میرے پاس سو گھوڑے ہیں جنھیں میں نے اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے تیار کر رکھا ہے۔“

اس جملے کے یہ معنی نہیں کہ اس شخص کے پاس بس صرف یہی سو گھوڑے ہیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ سو گھوڑے اس کام کے لیے تیار ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ اس بات پر ماہرین حدیث کا اتفاق ہے کہ ان (۹۹ ناموں) کو گننا اور مسلسل ورد کرنا نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے یہ سچ فرمایا ہے کیونکہ ان اسماء کے بارے میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ جنھوں نے اس حدیث کو صحیح قرار دینے کی کوشش کی ہے انھوں نے کہا ہے کہ یہ ایک بہت بڑی بات ہے کہ یہ جنت میں پہنچانے والے ہیں' لہٰذا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ نبی ﷺ سے ان اسماء کی تعیین کے بارے میں سوال نہ کرتے' لہٰذا معلوم ہوا کہ ان کی تعیین نبی ﷺ ہی کی طرف سے ہے لیکن اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کے بارے میں پوچھا ہو اور نبی ﷺ نے ان اسماء کی تعیین فرمائی ہو کیونکہ اگر معاملہ اسی طرح ہوتا تو ان ننانوے اسمائے حسنیٰ کا علم اظہر من الشمس ہوتا اور صحیحین وغیرہ میں یہ ضرور منقول ہوتے' کیونکہ ان کی شدید ضرورت تھی مگر اس کا کیا کیا جائے کہ یہ ضعیف سندوں کے ساتھ مختلف صورتوں میں منقول ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے ایک بلیغ حکمت کے پیش نظر انھیں بیان نہیں فرمایا اور وہ بلیغ حکمت یہ تھی کہ لوگ خود انھیں کتاب اللہ و سنت رسول ﷺ سے تلاش کریں تا کہ معلوم ہو کہ کس کو ان کا شوق ہے اور کس کو شوق نہیں ہے۔

انھیں شمار کرنے کے یہ معنی نہیں کہ انھیں کاغذ کے پرزوں پر لکھا جائے اور پھر بار بار پڑھا جائے تا کہ حفظ ہو جائیں' بلکہ اس کے معنی یہ ہیں: ○ان کے الفاظ کا احاطہ کیا جائے۔ ○ان کے معنی و مفہوم کو سمجھا جائے۔ ○ان کے تقاضے کے مطابق اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے اور اس کی دو صورتیں ہیں:

① ان کے ساتھ دعا کی جائے' کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَادْعُوهُ بِهَا﴾ (الأعراف: ٧/ ١٨٠)

’’تو تم اس کو اس کے ناموں سے پکارا کرو۔‘‘

ان اسماء کو حصول مطلوب کے لیے وسیلہ بنالیا جائے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اپنے مطلوب کے مناسب حال ان میں سے کسی اسم پاک کو منتخب کریں اور اس کے وسیلے سے دعا کریں، مثلاً مغفرت کی دعا کے لیے یہ کہیں: (یَا غَفُوْرُ اغْفِرْلِي) ’’اے بخشنے والے مجھے معاف فرمادے۔‘‘ یہ مناسب نہیں کہ آپ یوں کہیں: (یَا شَدِیْدَ الْعِقَابِ اغْفِرْلِي) ’’اے سخت عذاب والے مجھے معاف کردے۔‘‘ کیونکہ یہ صورت تو مذاق کی سی ہوگی، لہٰذا اس صورت میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ (أَجِرْنِي مِنْ عِقَابِكَ) ’’اے سخت عذاب والے مجھے اپنے عذاب سے بچالے۔‘‘

② اپنی عبادت میں ایسے امور پیش کرو جو ان اسماء کے تقاضے کے مطابق ہوں، مثلاً اسم پاک ’’رحیم‘‘ رحمت کا تقاضا کرتا ہے، تو آپ ایسا عمل صالح کریں جو اس کی رحمت کے حصول کا سبب بن جائے، انھیں شمار کرنے کے یہی معنی ہیں اور اس صورت میں ان کے مطابق عمل یقیناً جنت میں داخل ہونے کی قیمت بن جائے گا۔

عُلوِ ذات، نبی کریم ﷺ کا سوال اور عورت کا جواب

سوال اللہ تعالیٰ کے علو کے بارے میں سلف کا کیا مذہب ہے؟ جو شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ شش جہات سے خالی ہے اور وہ ہر مردِ مومن کے دل میں ہے، اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب سلف رضی اللہ عنہم کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات پاک کے ساتھ اپنے بندوں کے اوپر ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَإِن تَنَٰزَعْتُمْ فِى شَىْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى ٱللَّهِ وَٱلرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ﴿٥٩﴾ ﴾ (النساء: ٤/ ٥٩)

’’اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو، تو اگر اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو، تو اس میں اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی طرف رجوع کرو۔ یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا انجام بھی اچھا ہے۔‘‘

اور فرمایا:

﴿ وَمَا ٱخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَىْءٍ فَحُكْمُهُۥٓ إِلَى ٱللَّهِ ۚ ﴾ (الشوری: ٤٢/ ١٠)

’’اور تم جس بات میں اختلاف کرتے ہو، اس کا فیصلہ اللہ کی طرف سے ہوگا۔‘‘

اور فرمایا:

﴿ إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ ٱلْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا۟ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۚ وَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ ﴿٥١﴾ وَمَن يُطِعِ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَخْشَ ٱللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْفَآئِزُونَ ﴿٥٢﴾ ﴾

(النور: ٢٤/ ٥١۔٥٢)

’’مومنوں کی تو یہ بات ہے کہ جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں تا کہ وہ ان میں فیصلہ کریں تو کہیں کہ ہم نے (حکم) سن لیا اور مان لیا اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں، اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گا

اور اس سے ڈرے گا تو ایسے ہی لوگ مراد کو پہنچنے والے ہیں۔"

اور فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥٓ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ ٱلْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَن يَعْصِ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَٰلًا مُّبِينًا ﴿٣٦﴾ ﴾ (الأحزاب: ٣٣/ ٣٦)

"اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا فیصلہ کر دیں تو وہ اس میں اپنا بھی کچھ اختیار رکھیں اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہ ہو گیا۔"

اور فرمایا:

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا۟ فِىٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا۟ تَسْلِيمًا ﴿٦٥﴾ ﴾ (النساء: ٤/ ٦٥)

"تمہارے پروردگار کی قسم! یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمھیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کر دو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں، تب تک مومن نہیں ہوں گے۔"

ان آیات کریمہ سے یہ بات واضح ہو گئی کہ تنازع کے وقت مومنوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کی طرف رجوع کرتے اور ان کے سامنے سر اطاعت خم کر دیتے ہیں اور ان کے سوا ان کا کوئی اختیار نہیں۔ ایمان اسی سے مکمل ہو گا بشرطیکہ وہ اس سے تنگ دل بھی نہ ہوں بلکہ خوشی خوشی تسلیم کر لیں اور اس کے سوا اگر کوئی اور رستہ اختیار کیا گیا تو وہ اس آیت کریمہ کے موجب ہو گا:

﴿ وَمَن يُشَاقِقِ ٱلرَّسُولَ مِنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ ٱلْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ ٱلْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِۦ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِۦ جَهَنَّمَ ۖ وَسَآءَتْ مَصِيرًا ﴿١١٥﴾ ﴾ (النساء: ٤/ ١١٥)

"اور جو شخص سیدھا راستہ معلوم ہونے کے بعد پیغمبر کی مخالفت کرے اور مومنوں کے راستے کے سوا دوسرے راستے پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اسے ادھر ہی چلنے دیں گے اور (قیامت کے دن) اسے جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بری جگہ ہے۔"

اس تمہید کے بعد جو شخص بھی علو باری تعالیٰ کے بارے میں غور کرے گا اور اسے کتاب اللہ اور سنت رسول کی طرف لوٹائے گا، تو اس کے سامنے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ تمام وجوہ دلالت کے ساتھ کتاب و سنت کی صریح دلالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات پاک کے ساتھ اپنی تمام مخلوق سے اوپر ہے، قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ کی مختلف عبارتوں میں اسے اس طرح بیان کیا گیا ہے:

① اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے مثلاً۔

﴿ أَمْ أَمِنتُم مَّن فِى ٱلسَّمَآءِ أَن يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۖ فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرِ ﴿١٧﴾ ﴾ (الملك: ٦٧/ ١٧)

"کیا تم اس سے، جو آسمان میں ہے، نڈر ہو کہ تم پر مٹی اور کنکریاں اڑاتی آندھی چھوڑ دے، سو تم عنقریب جان لو گے کہ میرا ڈرانا کیسا ہے؟"

اور مریض کو دم کرنے والی دعا میں نبی ﷺ یہ بھی فرمایا کرتے تھے:

«رَبُّنَا اللهُ الَّذِيْ فِي السَّمَاءِ»(سنن أبي داود، الطب، باب كيف الرقى، ح:٣٨٩٢)

''ہمارا رب وہ اللہ ہے جو آسمان میں ہے۔''

اور آپ ﷺ نے فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ مَا مِنْ رَجُلٍ يَدْعُو امْرَأَتَهُ إِلَى فِرَاشِهَا فَتَأْبَى عَلَيْهِ إِلاَّ كَانَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ سَاخِطًا عَلَيْهَا حَتَّى يَرْضَىٰ عَنْهَا»(صحيح البخاري، بدء الخلق، باب إذا قال أحدكم آمين والملائكة في السماء آمين، ح:٣٢٣٧ ومسلم، النكاح، باب تحريم امتناعها عن فراش زوجها، ح:١٤٣٦ واللفظ له)

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جو شخص اپنی بیوی کو اپنے بستر کی طرف بلائے اور وہ انکار کر دے تو وہ ذات جو آسمان میں ہے، اس وقت تک اس سے ناراض رہتی ہے، جب تک کہ شوہر اپنی بیوی سے خوش نہ ہو جائے۔''

② اللہ تعالیٰ کی فوقیت کے بارے میں تصریح ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِۦ ﴾ (الأنعام:٦/١٨)

''اور وہ اپنے بندوں کے اوپر ہے۔''

اور فرمایا:

﴿ يَخَافُونَ رَبَّهُم مِّن فَوْقِهِمْ ﴾ (النحل:١٦/ ٥٠)

''وہ اپنے پروردگار سے، جو ان کے اوپر ہے، ڈرتے ہیں۔''

اور نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَمَّا قَضَى اللهُ الْخَلْقَ كَتَبَ فِي كِتَابِهِ فَهُوَ عِنْدَهُ فَوْقَ الْعَرْشِ إِنَّ رَحْمَتِي غَلَبَتْ غَضَبِي» (صحيح البخاري، بدء الخلق، باب ماجاء في قوله تعالي: ﴿وهو الذي يبدؤا الخلق ثم يعيده﴾، ح:٣١٩٤ وصحيح مسلم، التوبة، باب سعة رحمة الله تعالي وأنها تغلب غضبه، ح:٢٧٥١)

''جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو اس نے اپنی کتاب میں لکھا جو اس کے پاس عرش پر ہے کہ بے شک میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔''

③ اس بات کی تصریح ہے کہ چیزیں اس کی طرف چڑھتی اور اس کی طرف سے نازل ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ صعود اوپر ہی کی طرف ہوتا ہے اور نزول اوپر سے نیچے کی طرف۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُۥ ﴾ (الفاطر:٣٥/ ١٠)

''اس کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں اور نیک عمل انھیں بلند کرتے ہیں۔''

اور فرمایا:

﴿ تَعْرُجُ الْمَلَٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ ﴾ (المعارج:٧٠/ ٤)

''اس کی طرف روح (الامین) اور فرشتے چڑھتے ہیں۔''

اور فرمایا:

﴿ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ ﴾ (السجدة: ٣٢/ ٥)

''وہی آسمان سے زمین تک (کے) ہر کام کا انتظام کرتا ہے، پھر وہ (معاملہ) اس کی طرف چڑھ جاتا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے بارے میں فرمایا:

﴿ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ﴿٤٢﴾ ﴾ (فصلت: ٤١/ ٤٢)

''اس پر جھوٹ کا دخل آگے سے ہوتا ہے نہ پیچھے سے (اور یہ کتاب) دانا (اور) خوبیوں والے (اللہ) کی اتاری ہوئی ہے۔''

اور قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خود فرمایا ہے:

﴿ وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ﴾ (التوبة: ٩/ ٦)

''اور اگر کوئی مشرک پناہ کا طلب گار ہو تو اس کو پناہ دو یہاں تک کہ وہ کلام اللہ سن لے۔''

جب قرآن کریم اس کا کلام ہے اور اس کی طرف سے نازل ہوا ہے، تو یہ اللہ کی ذات کے علو کی دلیل ہے اور نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«يَنْزِلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَتَعَالَى كُلَّ لَيْلَةٍ إِلَى سَمَاءِ الدُّنْيَا حِينَ يَبْقَى ثُلُثُ اللَّيْلِ الْآخِرُ يَقُولُ مَنْ يَدْعُونِي . . . »(صحيح البخاري، التهجد، باب الدعاء والصلاة من آخر الليل، ح:١١٤٥ وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الترغيب في الدعاء والذكر في آخر الليل والاجابة فيه، ح:٧٥٨)

''جب رات کا آخری تہائی باقی رہ جاتا ہے تو ہمارا رب تبارک وتعالیٰ آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے (جس طرح اس کی ذات پاک کے شایان شان ہے) اور وہ فرماتا ہے کہ کون ہے جو مجھ سے دعا کرے......الخ''

حدیث براء بن عازب رضی اللہ عنہ میں ہے کہ نبی ﷺ نے انھیں اپنے بستر پر لیٹتے وقت کی جو دعا سکھائی تھی اس میں یہ کلمات بھی ہیں:

«آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِي أَنْزَلْتَ، وَنَبِيِّكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ»(صحيح البخاري، الدعوات، باب ما يقول إذا نام، ح:٦٣١٣ وصحيح مسلم، الذكر والدعاء، باب ما يقول عند النوم وأخذ المضجع، ح:٢٧١٠)

''میں تیری اس کتاب پر ایمان لایا جو تو نے نازل فرمائی اور تیرے اس نبی پر بھی ایمان لایا جسے تو نے مبعوث فرمایا۔''

④ اللہ تعالیٰ کے علو کے ساتھ موصوف ہونے کی تصریح، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ﴿١﴾ ﴾ (الأعلى: ٨٧/ ١)

''آپ اپنے سب سے بلند رب کے نام کی تسبیح کریں۔''

اور فرمایا:

﴿ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿٢٥٥﴾ ﴾ (البقرة: ٢/ ٢٥٥)

''اور اس کے لیے ان دونوں (آسمان وزمین) کی حفاظت کچھ دشوار نہیں اور وہ بڑا بلند، نہایت عظمت والا ہے۔''

اور نبی ﷺ کی دعا کے الفاظ ہیں:

«سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰي»(سنن أبي داود، الصلاة، باب مايقول الرجل في ركوعه وسجوده، ح:٨٧١ وجامع الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في التسبيح في الركوع والسجود، ح:٢٦٢ وسنن النسائي، الافتتاح، باب تعوذ القارىء . . . ح:١٠٠٩)

"پاک ہے میرا رب جو سب سے بلند و بالا ہے۔"

⑤ نبی ﷺ کا آسمان کی طرف اشارہ کرنا' جب عرفہ کے عظیم وقوف کے وقت اور اپنی زندگی میں اپنی امت کے سب سے عظیم اجتماع میں لوگوں سے پوچھا:

«أَلاَ هَلْ بَلَّغْتُ؟ قَالُوا: نَعَمْ فَقَالَ: اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ»(صحيح البخاري، الحج، باب الخطبة أيام مِنى، ح:١٧٤١ وصحيح مسلم، الحج، باب حجة النبي ﷺ، ح:١٢١٨)

"کیا میں نے تم تک پہنچا دیا ہے؟" لوگوں نے جواب دیا: ہاں تو آپ نے فرمایا: "اے اللہ! تو بھی گواہ ہو جا۔"

آپ یہ فرماتے ہوئے اپنی انگلی کو آسمان کی طرف اٹھا کر لوگوں کی طرف لے آتے تھے جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے' اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے' ورنہ آسمان کی طرف انگلی اٹھانے کے کوئی معنی نہ تھے۔

⑥ نبی ﷺ نے جب ایک باندی سے یہ پوچھا: "اللہ کہاں ہے؟" تو اس نے جواب دیا: آسمان میں۔ تب آپ نے فرمایا:

«أَعْتِقْهَا فَإِنَّهَا مُؤْمِنَةٌ»(صحيح مسلم، المساجد، باب تحريم الكلام في الصلاة . . . ح:٥٣٧)

"اسے آزاد کر دو' یہ مومنہ ہے۔"

امام مسلم رحمہ اللہ نے اسے معاویہ بن حکم سلمی رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں روایت کیا ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کا ذاتی علو نہایت صراحت کے ساتھ ثابت ہو رہا ہے' کیونکہ حرف استفہام اَیْـنَ کے ساتھ مکان کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے۔ نبی ﷺ نے جب اس عورت سے پوچھا کہ اللہ کہاں ہے اور اس نے اس کا یہ جواب دیا کہ وہ آسمان میں ہے' تو نبی ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے آسمان میں ہونے کی تائید فرمائی اور آپ نے جو یہ فرمایا: "اسے آزاد کر دو' یہ مومنہ ہے" تو اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک یہ اقرار نہ کرے اور یہ عقیدہ نہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے۔

کتاب اللہ اور سنت رسول سے یہ مختلف انواع واقسام کی ادلہ ہیں جن کا تعلق سماع اور خبر سے ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات پاک کے ساتھ اپنی ساری مخلوق کے اوپر ہے اور اس بارے میں دلائل اس قدر زیادہ ہیں کہ ان سب کو اس جگہ بیان کرنا ممکن نہیں۔ ان نصوص کے تقاضے کے مطابق سلف صالحین رحمہم اللہ نے بالاجماع اللہ کے لیے ذاتی علو کو ثابت کیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ اپنی ساری مخلوق سے اوپر اور بلند ہے جیسا کہ ان کا اس بات پر بھی اجماع ہے کہ معنوی طور پر بھی یعنی اپنی صفات کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی ذات بلند و بالا اور ارفع واعلیٰ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَهُ ٱلْمَثَلُ ٱلْأَعْلَىٰ فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِۚ وَهُوَ ٱلْعَزِيزُ ٱلْحَكِيمُ ﴿٢٧﴾ ﴾ (الروم: ٣٠/ ٢٧)

"اور آسمانوں اور زمین میں اس کی شان نہایت بلند ہے اور وہ غالب' حکمت والا ہے۔"

اور فرمایا:

﴿ وَلِلَّهِ ٱلْأَسْمَآءُ ٱلْحُسْنَىٰ فَٱدْعُوهُ بِهَا ﴾ (الأعراف: ٧/ ١٨٠)

’’اور اللہ کے سب نام ہی اچھے ہیں، سو تم اس کو اس کے ناموں سے پکارا کرو۔‘‘ اور فرمایا:

﴿ فَلَا تَضْرِبُوا۟ لِلَّهِ ٱلْأَمْثَالَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝٧٤ ﴾ (النحل: ١٦/ ٧٤)

’’پس (لوگو!) اللہ کے بارے میں (غلط) مثالیں نہ بناؤ بلاشبہ (صحیح مثالوں کا طریقہ) اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔‘‘

اور فرمایا:

﴿ فَلَا تَجْعَلُوا۟ لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝٢٢ ﴾ (البقرة: ٢/ ٢٢)

’’پس کسی کو اللہ کا ہمسر نہ بناؤ اس حال میں کہ تم جانتے ہو۔‘‘

علاوہ ازیں اور بھی بہت سی آیات کریمہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور افعال کے کمال پر دلالت کرتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ذاتی علو پر جس طرح نصوص کتاب و سنت اور اجماع سلف دلالت کرتے ہیں، اسی طرح عقل و فطرت بھی اسی بات پر دلالت کرتی ہے۔ جہاں تک عقل کی دلالت کا تعلق ہے تو کہا جائے گا کہ بے شک علو صفت کمال ہے اور اس کی ضِد صفت نقص ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے لیے صفات کمال ہی ثابت ہیں، لہٰذا واجب ہے کہ ’’علو‘‘ کو بھی اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت مانا جائے اور اس کے لیے کسی چیز کو ثابت کرنے سے نقص لازم نہیں آتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ’’علو‘‘ اس بات کو متضمن نہیں ہے کہ اس کی مخلوقات میں سے کوئی چیز اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اگر کوئی ایسا گمان کرتا ہے تو یہ اس کا وہم، گمراہی اور بے عقلی ہے۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے ذاتی علو پر فطرت کی دلالت کا تعلق ہے تو اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کو پکارے، خواہ اس کی یہ پکار عبادت کے طور پر ہو یا دعا کے طور پر تو اس کا دل اس پکار کے وقت آسمان کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور وہ تقاضائے فطرت کے مطابق آسمان کی طرف اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھا لیتا ہے، جیسا کہ ہمدانی نے ابو المعالی الجوینی سے کہا تھا: ’’جب بھی کوئی عارف کہتا ہے: یارب! تو وہ اپنے دل سے ضرورتاً طلب علو کو پاتا ہے۔‘‘ یہ سن کر امام جوینی نے اپنے سر پر طمانچہ مارنا اور یہ کہنا شروع کر دیا: ’’ہمدانی نے مجھے حیران کر دیا، ہمدانی نے مجھے حیران کر دیا۔‘‘ ان کے بارے میں اسی طرح منقول ہے خواہ صحیح ہو یا نہ ہو، بہر حال ہر ایک محسوس اسی طرح کرتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ایک شخص کا ذکر کیا جو آسمان کی طرف اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے: یارب! یارب!......الخ ① پھر آپ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ نمازی جب نماز پڑھتا ہے، تو اس کا دل آسمان کی طرف ہوتا ہے خصوصاً حالت سجدہ میں جب وہ یہ کہتا ہے:

«سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰي»(سنن أبي داود، الصلاة، باب مايقول الرجل في ركوعه وسجوده، ح:٨٧١ وجامع الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في التسبيح في الركوع والسجود، ح:٢٦٢ وسنن النسائي، الافتتاح، باب، تعوذ القارىء ... ح:١٠٠٩)

---

① صحیح مسلم، الزکاۃ، باب قبول الصدقة من الكسب الطيب ...... حديث: 1015

”پاک ہے میرا رب جو سب سے بلند و بالا ہے۔“

اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ اس کا معبود آسمان میں ہے جو پاک اور بلند ہے۔

ان لوگوں نے جو یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ شش جہات سے خالی ہے‘ تو یہ قول اپنے عموم کے اعتبار سے باطل ہے کیونکہ یہ اس چیز کے ابطال کا تقاضا کرتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کے لیے ثابت کیا ہے اور اسے اس شخص نے بھی اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کیا ہے جو ساری مخلوق میں سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں زیادہ جاننے والے اور اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ تعظیم بجالانے والے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے رسول حضرت محمد ﷺ ہیں۔ انھوں نے بیان فرمایا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ آسمان میں ہے اور آسمان جہت علو میں ہے۔ اگر ان لوگوں کی اس بات کو درست مان لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ شش جہات سے خالی ہے‘ تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو معدوم قرار دیا جائے‘ کیونکہ شش جہات سے مراد اوپر‘ نیچے‘ دائیں‘ بائیں‘ پیچھے اور آگے ہے اور ہر موجود چیز کے ساتھ ان چھ جہتوں میں سے کوئی نہ کوئی جہت متعلق ہوتی ہے اور یہ بات بدیہی طور پر معلوم ہے‘ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے ان شش جہات کی نفی کر دی جائے تو اس سے لازم آئے گا کہ وہ معدوم ہے۔ ذہن اگرچہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو موجود اور ان نسبتوں میں سے کسی نسبت کے ساتھ تعلق سے خالی فرض (خیال) کرتا ہے لیکن یہ ایک مفروضہ ہی ہے خارج (یعنی حقیقت) میں اس کا وجود نہیں ہے‘ کیونکہ ہم اس بات پر ایمان رکھتے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لانے والے ہر مومن کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ اس بات پر بھی ایمان لائے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے اوپر ہے جیسا کہ کتاب وسنت‘ اجماع سلف اور عقل وفطرت کی دلالت سے معلوم ہے‘ جیسا کہ ہم قبل ازیں بیان کر آئے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ ہمارا اس بات پر بھی ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور مخلوقات میں سے کوئی چیز اس کی ذات گرامی کا احاطہ نہیں کر سکتی اور وہ ذات پاک اپنی مخلوق سے بے نیاز ہے‘ وہ کسی مخلوق کا محتاج نہیں ہے۔ ہماری یہ بھی رائے ہے کہ کسی مومن کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ لوگوں میں سے کسی کے قول کی وجہ سے خواہ وہ کوئی بھی ہو‘ کتاب وسنت کے دائرے سے باہر نکلے جیسا کہ قبل ازیں اس سوال کے جواب کے آغاز میں ہم یہ بیان کر آئے ہیں۔

انھوں نے جو یہ کہا ہے: ”بے شک اللہ تعالیٰ مومن کے دل میں ہے“ تو اس بات کی کتاب اللہ‘ سنت رسول ﷺ اور ہمارے علم کی حد تک سلف صالحین میں سے کسی کے قول سے کوئی دلیل نہیں ہے اور پھر علی الاطلاق بھی یہ بات باطل ہے کیونکہ اگر اس بات سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کے دل میں حلول کیے ہوئے ہے تو یہ قطعی طور پر باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اس سے بہت عظیم القدر اور بے حد جلیل الشان ہے کہ وہ کسی بندے کے دل میں حلول کرے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ایک شخص کا دل اس بات سے تو بدکے جو کتاب وسنت سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے لیکن اس بات پر اس کا دل مطمئن ہو جائے جس کی کتاب وسنت سے کوئی دلیل نہیں کہ اللہ تعالیٰ مومن کے دل میں ہے۔ کتاب وسنت میں ایسا کوئی ایک حرف بھی نہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ اللہ تعالیٰ مومن کے دل میں ہے۔

اور اگر اس بات سے مراد یہ ہے کہ مومن اپنے دل میں ہمیشہ اپنے رب تعالیٰ کو یاد کرتا رہتا ہے تو یہ بات حق ہے‘ لیکن واجب یہ

ہے کہ اس کا اظہار ایسی عبارت سے ہو جو اس حقیقت کو بیان کرتی اور باطل مدلول کی نفی کرتی ہو‘ مثلاً یوں کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہمیشہ مرد مومن کے دل میں ہوتا ہے۔ ایسی بات کرنے والوں کے کلام سے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ارادہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے آسمان میں ہونے کے بجائے اس بات کو اختیار کریں کہ ’’وہ مومن کے دل میں ہے‘‘ اس معنی کے اعتبار سے یہ بات بالکل باطل ہے۔

مومن کو اس بات کے انکار سے ڈرنا چاہیے جس پر کتاب اللہ‘ سنت رسول اللہ اور اجماع سلف دلالت کرتے ہوں اور اسے ایسی مجمل اور مبہم باتیں اختیار نہیں کرنی چاہییں جن میں حق اور باطل دونوں معنوں کا احتمال ہو‘ بلکہ اسے چاہیے کہ سب سے پہلے ایمان لانے والے مہاجرین وانصار کے راستے کو اختیار کرے تا کہ وہ بھی اس آیت کریمہ کا مصداق بن جائے:

﴿وَٱلسَّٰبِقُونَ ٱلْأَوَّلُونَ مِنَ ٱلْمُهَٰجِرِينَ وَٱلْأَنصَارِ وَٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُم بِإِحْسَٰنٍ رَّضِيَ ٱللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا۟ عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا ٱلْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا ذَٰلِكَ ٱلْفَوْزُ ٱلْعَظِيمُ ۝١٠٠﴾ (التوبة: ٩/ ١٠٠)

’’جن لوگوں نے سبقت کی (یعنی سب سے) پہلے (ایمان لائے) مہاجرین میں سے بھی اور انصار میں سے بھی‘ اور جنہوں نے نیکوکاری کے ساتھ ان کی پیروی کی اللہ ان سے خوش ہے اور وہ اللہ سے خوش ہیں اور اس نے ان کے لیے باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (اور) وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے‘ یہ بڑی کامیابی ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو انہی بندوں میں سے بنا دے اور ہم سب کو اپنی رحمت سے سرفراز فرمائے‘ بے شک وہی عطا فرمانے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اپنے عرش پر مستوی ہونے کے معنی؟

سوال کیا یہ تفسیر سلف صالحین سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اپنے عرش پر مستوی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے عرش پر اس طرح ہے‘ جیسے اس کے جلال کے شایان شان ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ کے اپنے عرش پر استواء کی یہ تفسیر کہ وہ اپنے عرش پر اس طرح مستوی ہے جیسے اس کے جلال کے شایان شان ہے‘ یہ سلف صالحین کی تفسیر ہے۔ امام المفسرین ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ استواء کے معنی علو وارتفاع کے بھی ہیں جیسے کوئی کہتا ہے کہ (اِسْتَوٰی فُلَانٌ عَلٰی سَرِیْرِہٖ) ’’فلاں اپنے تخت پر مستوی ہے‘‘ تو اس سے علو مراد ہوتا ہے اور انہوں نے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی﴾ ’’رحمٰن نے عرش پر قرار پکڑا‘‘ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ رحمٰن اپنے عرش پر مرتفع اور بلند ہے‘ سلف سے اس کے مخالف تفسیر منقول نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لغت میں استواء کا لفظ کئی طرح استعمال ہوتا ہے‘ مثلاً:

- اگر یہ مطلق اور غیر مقید استعمال ہو تو اس کے معنی کمال کے ہوتے ہیں‘ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَاسْتَوٰی﴾ ’’اور جب موسیٰ اپنی جوانی کو پہنچے اور (عقل وشعور میں) کامل ہو گئے۔‘‘
- واو کے ساتھ مل کر استعمال ہو تو یہ برابری کے معنی میں ہوتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: (اِسْتَوَی الْمَاءُ وَ الْعَتَبَةَ) پانی اور دہلیز برابر ہو گئے۔‘‘

✿ اِلیٰ کے ساتھ مل کر استعمال ہو تو یہ قصد و ارادہ کے معنی میں ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ﴾ ''پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا۔''

✿ علیٰ کے ساتھ مل کر استعمال ہو تو یہ علو و ارتفاع کے معنی میں ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ ''رحمٰن نے عرش پر قرار پکڑا۔''

بعض سلف کا یہ مذہب بھی ہے کہ استواء کا لفظ اِلیٰ اور عَلٰی دونوں کے ساتھ استعمال ہونے کی صورت میں ارتفاع و علو کے معنی میں ہوتا ہے، جیسا کہ بعض کا مذہب یہ ہے کہ عَلٰی کے ساتھ استعمال کی صورت میں یہ صعود اور استقرار کے معنی میں ہوتا ہے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ کی تفسیر خارجہ بن مصعب سے یہ نقل کی ہے کہ یہاں استواء کا لفظ بیٹھنے کے معنی میں ہے۔① انھوں نے کہا ہے کہ استواء بیٹھنے ہی کو کہتے ہیں۔ بیٹھنے کا ذکر ایک حدیث میں بھی ہے، جسے امام احمد نے بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما مرفوعاً بیان کیا ہے۔ واللہ اعلم.

سوال فضیلۃ الشیخ! آپ نے اللہ تعالیٰ کے اپنے عرش پر مستوی ہونے کے بارے میں بیان فرمایا ہے کہ اس سے عرش پر وہ علو خاص مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کے جلال و عظمت کے شایان شان ہے۔ از راہ کرم اس کی کچھ اور مزید وضاحت فرما دیں؟

جواب ہم نے جو یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر مستوی ہے تو یہ عرش پر اس طرح کے علو خاص سے تعبیر ہے جو اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کے شایان شان ہے۔ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ یہ ایک ایسا علو ہے جو عرش ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ اس طرح کا علو عام نہیں ہے جو ساری مخلوقات کے لیے ہو، اس لیے ہمارا یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ وہ مخلوقات پر مستوی ہے یا وہ آسمان پر مستوی ہے یا وہ زمین پر مستوی ہے حالانکہ وہ اپنی ان ساری مخلوقات سے بلند و بالا ہے۔ ہم تو صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنی ساری مخلوقات سے، زمین سے بھی اور آسمان سے بھی بلند ہے، البتہ عرش کے حوالے سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ عرش سے بلند ہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ عرش پر مستوی ہے۔ استواء مطلق علو کی نسبت خاص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عرش پر استواء، اس کی ان فعلی صفات میں سے ہے جو اس کی مشیت کے ساتھ متعلق ہیں، جب کہ علو اس کی ان ذاتی صفات میں سے ہے جو اس سے الگ نہیں ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی حدیث نزول کی شرح میں اسی طرح صراحت فرمائی ہے، جس طرح ہم نے بیان کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: ''اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ چھ دنوں میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے بعد عرش پر مستوی ہوا، تو کیا اس سے پہلے وہ عرش پر مستوی نہ تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ استواء سے مراد علو خاص ہے۔ ہر وہ شخص جو کسی چیز پر مستوی ہو، وہ اس سے بلند بھی ہے لیکن ہر وہ شخص جو کسی چیز سے بلند ہو، وہ اس پر مستوی نہیں ہوتا، لہٰذا ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز سے عالی ہو اس کے لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس پر مستوی ہے یا اسے اس پر استواء حاصل ہو گیا ہے لیکن ہر وہ چیز جو کسی چیز پر مستوی ہو گی، اسے اس پر علو بھی حاصل ہو گا۔''② ہمارا بھی اس وقت بالکل یہی مقصود ہے۔

---

① الصواعق المرسلہ : 1303/4

② مجموع الفتاوٰی: 522/5 جمع و ترتیب، ابن قاسم

ہم نے جو یہ کہا کہ ''جس طرح اس کے جلال وعظمت کے شایانِ شان ہے'' تو اس سے مراد یہ ہے کہ جس طرح اس کی دیگر تمام صفات اس کی ذات پاک کے جلال وعظمت کے شایانِ شان ہیں' عرش پر اس کا استواء بھی اسی طرح ہے جس طرح اس کی ذات پاک کے لائق ہے۔ وہ مخلوقات کے استواء کی طرح نہیں ہے کیونکہ صفات اپنے موصوف کے تابع ہوتی ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات دیگر ذوات کی طرح نہیں ہے' بعینہ اس کی صفات بھی مخلوقات کی صفات کی طرح نہیں ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِۦ شَىْءٌ ۖ وَهُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْبَصِيرُ ﴿١١﴾ ﴾ (الشوریٰ: ٤٢/ ١١)

''اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ خوب سننے والا' خوب دیکھنے والا ہے۔''

اس جیسی کوئی چیز نہیں نہ ذات میں' نہ صفات میں۔ اسی وجہ سے امام مالک رحمہ اللہ سے جب استواء کی کیفیت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''استواء غیر مجہول ہے' لیکن عقل اس کی کیفیت کو سمجھنے سے قاصر ہے' اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔'' اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کے لیے یہی میزان ہے کہ وہ اس کے لیے اسی طرح ثابت ہیں جس طرح اس نے اپنی ذات پاک کے لیے ان کا اثبات فرمایا ہے اور کسی تحریف' تعطیل' تکییف یا تمثیل کے بغیر وہ اسی طرح ہیں جس طرح اس کی ذات پاک کے شایان شان ہیں۔

اس تفصیل سے ہماری اس بات کا فائدہ بھی معلوم ہو جاتا ہے جو ہم نے یہ کہی تھی کہ عرش پر استواء سے مراد ایک ایسا علو خاص ہے جو عرش ہی کے ساتھ مخصوص ہے' کیونکہ علو عام تو اللہ تعالیٰ کے لیے آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے قبل' تخلیق کے وقت اور تخلیق کے بعد بھی ثابت ہے کیونکہ وہ تو سمع وبصر اور قدرت وقوت جیسی ذاتی اور لازمی صفات کی طرح ہے' لیکن ان کے برعکس استواء سے مراد علو خاص ہے۔

صرف مستقبل کے امور میں ان شاء اللہ کہا جا سکتا ہے

سوال وہ کون سے امور ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ متعلق قرار دینا واجب ہے اور وہ کون سے امور ہیں جنھیں مشیت الٰہی کے ساتھ متعلق قرار نہیں دینا چاہیے؟

جواب ہر وہ چیز جو مستقبل میں پیش آنے والی ہے اس کے بارے میں افضل یہ ہے کہ اسے مشیت الٰہی کے ساتھ متعلق قرار دیا جائے' کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَقُولَنَّ لِشَاْىْءٍ إِنِّى فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا ﴿٢٣﴾ إِلَّآ أَن يَشَآءَ ٱللَّهُ ۚ ﴾ (الکہف: ١٨/ ٢٣-٢٤)

''اور آپ کسی شے کے متعلق نہ کہیں: بے شک میں اسے کل کرنے والا ہوں' مگر یہ کہ اللہ چاہے۔''

البتہ گزری ہوئی چیز کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ متعلق کر کے نہ بیان کیا جائے الا یہ کہ مقصود اس کی علت کو بیان کرنا ہو' مثلاً اگر کوئی شخص آپ سے یہ کہے کہ اس سال ماہ رمضان کا آغاز ان شاء اللہ اتوار کی رات سے ہوا تھا تو اس صورت میں ان شاء اللہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ بات تو گزر چکی اور معلوم ہو چکی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی یہ کہے کہ ان شاء اللہ میں نے اپنے کپڑے پہن لیے ہیں اور وہ کپڑوں کو پہنے ہوئے ہو تو ایسی صورت میں جو کام ہو چکا ہو اور ختم ہو چکا ہے اسے اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ متعلق قرار دینا

مستحسن نہیں ہے الا یہ کہ علت وسبب بیان کرنا مقصود ہو کہ یہ لباس پہننا اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ تھا' تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں۔

اگر کوئی شخص نماز پڑھنے کے بعد یہ کہے کہ ''میں نے ان شاء اللہ نماز پڑھ لی ہے'' اگر اس کا مقصود فعلِ نماز ہے' تو یہاں ان شاء اللہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ نماز پڑھ چکا ہے اور اگر اس کا مقصود یہ ہے کہ نماز مقبول ہوگی تو پھر ان شاء اللہ کہنا صحیح ہے کیونکہ اسے نہیں معلوم کہ نماز قبول ہوئی ہے یا نہیں۔

کونی اور شرعی ارادے میں فرق

سوال (اللہ تعالیٰ کے) ارادے کی کتنی قسمیں ہیں؟

جواب ارادے کی دو قسمیں ہیں: ① ارادہ کونیہ۔ ② ارادہ شرعیہ۔ جو مشیت کے معنی میں ہو وہ ارادہ کونیہ ہے اور جو محبت کے معنی میں ہو وہ ارادہ شرعیہ ہے۔ ارادہ شرعیہ کی مثال ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَٱللَّهُ يُرِيدُ أَن يَتُوبَ عَلَيۡكُمۡ ﴾ (النساء: ٤/ ٢٧)

''اور اللہ تو چاہتا ہے کہ تم پر توجہ دے۔''

یہاں ﴿يُرِيدُ﴾ ''وہ چاہتا ہے'' ﴿يُحِبُّ﴾ ''وہ پسند فرماتا ہے'' کے معنی میں ہے' یہاں مشیت کے معنی میں نہیں ہے' کیونکہ اگر اس کے معنی یہ ہوتے (وَاللّٰهُ يَشَاءُ أَنْ يَّتُوبَ عَلَيْكُمْ) ''اللہ چاہتا ہے کہ تم پر مہربانی کرے'' تو وہ تمام بندوں پر مہربانی فرما دیتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے کیونکہ اکثر انسان تو کافر ہیں' تب: ﴿يُرِيدُ أَنْ يَّتُوبَ عَلَيْكُمْ﴾ کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ تم پر مہربانی کرے' لیکن اللہ تعالیٰ کے کسی چیز کو پسند فرمانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ چیز وقوع پذیر بھی ہو جائے گی' کیونکہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ چیز وقوع پذیر نہ ہو۔

ارادہ کونیہ کی مثال حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِن كَانَ ٱللَّهُ يُرِيدُ أَن يُغۡوِيَكُمۡۚ ﴾ (هود: ١١/ ٣٤)

''اگر اللہ یہ چاہے کہ تمھیں گمراہ کر دے۔''

کیونکہ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ وہ بندوں کو گمراہ کرے' لہٰذا اس کے یہ معنی صحیح نہیں ہوں گے کہ [إِنْ كَانَ اللّٰهُ يُحِبُّ أن يُّغْوِيَكُمْ] ''اگر اللہ اس بات کو پسند فرمائے کہ تمھیں گمراہ کر دے'' بلکہ معنی یہ ہوں گے کہ ''اگر اللہ چاہے کہ تمھیں گمراہ کر دے۔''

اب رہی یہ بات کہ مراد کے وقوع پذیر ہونے کے اعتبار سے کونی اور شرعی ارادے میں کیا فرق ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ارادہ کونیہ فرماتا ہے' یعنی کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے' تو وہ چیز فوراً پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ إِنَّمَآ أَمۡرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيۡـًٔا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ﴿٨٢﴾ ﴾ (یس: ٣٦/ ٨٢)

''اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے فرماتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔''

جہاں تک شرعی ارادے کا تعلق ہے' تو اس کے مطابق کبھی مراد وقوع پذیر ہو جاتی ہے اور کبھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ایک چیز کا شرعاً ارادہ رکھتا اور اسے پسند فرماتا ہے' لیکن وہ وقوع پذیر نہیں ہوتی کیونکہ محبوب چیز کبھی وقوع پذیر ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ''اللہ تعالیٰ اس بات کا ارادہ رکھتا ہے کہ بندے گناہ کریں'' تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا کونی ارادہ تو ہے، مگر شرعی ارادہ نہیں کیونکہ شرعی ارادہ محبت اور پسندیدگی کے معنی میں ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں فرماتا کہ بندے گناہوں کا ارتکاب کریں لیکن اللہ تعالیٰ کے کونی ارادہ کا ان سے تعلق ضرور ہے کیونکہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ ہے۔

اسمائے الٰہی میں کجی اختیار کرنے کے نتائج

سوال اللہ تعالیٰ کے ناموں میں الحاد (کجی اختیار کرنے) کے کیا معنی ہیں اور اس کی کتنی قسمیں ہیں؟

جواب الحاد کے لغوی معنی تو میلان اور جھکاؤ کے ہیں، جیسا کہ حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ میں یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے:

﴿ لِسَانُ ٱلَّذِي يُلۡحِدُونَ إِلَيۡهِ أَعۡجَمِيّٞ وَهَٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيّٞ مُّبِينٞ ١٠٣ ﴾ (النحل: ١٦/ ١٠٣)

''جس کی طرف یہ (تعلیم کی غلط) نسبت کرتے ہیں، اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے۔''

قبر کی لحد بھی اسی سے ہے اور اسے لحد اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ایک طرف کو جھکی ہوتی ہے۔ الحاد کی معرفت استقامت کی معرفت کے بغیر نہیں ہوسکتی کیونکہ مَثَل مشہور ہے: ''اشیا کی معرفت ان کے اضداد سے ہوتی ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے بارے میں استقامت یہ ہے کہ ہم کسی تحریف، تعطیل، تکییف اور تمثیل کے بغیر اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے بارے میں ایمان رکھیں کہ ان کی حقیقت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی کے لائق ہے اور اس بات میں اہل سنت والجماعت کا یہی قاعدہ ہے اور اب جب ہمیں اس باب میں استقامت کا علم ہوگیا تو یہ بھی از خود معلوم ہوگیا کہ اس بات میں الحاد سے کیا مراد ہے۔ اہل علم نے اللہ تعالیٰ کے اسماء میں الحاد کی کئی قسمیں ذکر کی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اسماء و صفات کے بارے میں جو اعتقاد رکھنا واجب ہے اس سے گریز اختیار کرنا الحاد ہے اور اس کی کئی قسمیں ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

پہلی قسم: اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات میں سے کسی کا انکار کرنا، مثلاً جس طرح کوئی ''رحمٰن'' کے اللہ تعالیٰ کا نام ہونے سے انکار کردے جیسا کہ اہل جاہلیت نے اس کا انکار کردیا تھا، یا کوئی اسماء کو تو مانے مگر یہ اسماء جن صفات کو متضمن ہیں ان کا انکار کردے جیسے بعض اہل بدعت نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ''رحیم'' تو ہے مگر ''رحمت'' کے بغیر اور وہ ''سمیع'' تو ہے مگر ''سمع'' کے بغیر۔

دوسری قسم: اللہ تعالیٰ کا کوئی ایسا نام رکھا جائے جو خود اس نے اپنا نام نہیں رکھا۔ اس کے الحاد ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے تمام اسماء توقیفی ہیں، لہٰذا کسی کے لیے یہ حلال نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کوئی ایسا نام رکھے جس سے اس نے خود اپنی ذات پاک کو موسوم قرار نہیں دیا کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف علم کے بغیر بات منسوب کرنا ہوگا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں زیادتی ہوگی جیسا کہ فلاسفہ نے ''الٰہ'' کو علت فاعلہ کے نام سے موسوم قرار دیا ہے، اور جس طرح کہ عیسائیوں نے اللہ تعالیٰ کو ''اَبْ'' (باپ) کے نام سے موسوم قرار دیا ہے۔

تیسری قسم: یہ عقیدہ رکھا جائے کہ یہ اسماء مخلوق کی صفات پر دلالت کرتے ہیں، پھر وہ ان کی دلالت کو بطور تمثیل قرار دے دے۔ اس کے الحاد ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء مخلوق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تمثیل پر دلالت کرتے

ہیں، تو اس نے اسماء کو ان کے مدلول سے خارج کر دیا اور اس طرح وہ راہ استقامت سے بھٹک گیا اور اس نے اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کے رسول ﷺ کے کلام کو کفر پر دلالت کرنے والا قرار دے دیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ مثال بیان کرنا کفر ہے اس لیے کہ اس سے حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ کی تکذیب لازم آتی ہے:

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِۦ شَىْءٌ ۖ وَهُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْبَصِيرُ ۝١١ ﴾ (الشوریٰ: ٤٢/ ١١)

"اس جیسی کوئی شے نہیں، اور وہ خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے۔"

نیز اس سے درج ذیل ارشاد باری تعالیٰ کی تکذیب بھی لازم آتی ہے:

﴿ هَلْ تَعْلَمُ لَهُۥ سَمِيًّا ۝٦٥ ﴾ (مریم: ١٩/ ٦٥)

"بھلا تم کوئی اس کا ہم نام جانتے ہو؟"

امام بخاری رحمہ اللہ کے استاد نعیم بن حماد خزاعی رحمہ اللہ کا قول ہے: "جو شخص اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوق کے ساتھ تشبیہ دے وہ کافر ہے، جو شخص اللہ تعالیٰ کی کسی ایسی صفت کا انکار کرے، جو اس نے خود اپنی ذات کی صفت بیان فرمائی ہے، تو وہ بھی کافر ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کی جو صفات بیان فرمائی ہیں ان میں کوئی تشبیہ نہیں۔"

چوتھی قسم: اللہ تعالیٰ کے اسماء سے بتوں کے لیے نام تراش لیے جائیں جیسا کہ مشرکین نے اپنے بتوں کے لیے الٰہ سے لات، عزیز سے عُزّٰی اور منّان سے مناۃ کے نام تراش لیے تھے۔ اس کے الحاد ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء اس کے لیے مخصوص ہیں، لہٰذا یہ جائز نہیں کہ ان پر دلالت کرنے والے معانی کو مخلوق میں سے کسی کی طرف منتقل کر دیا جائے اور اسے عبادت کا حق دیا جائے، جس کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، تو یہ ہیں اللہ تعالیٰ کے اسماء میں الحاد کی مختلف صورتیں۔

سوال اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کی طرف چہرے، ہاتھ اور اس طرح کی دیگر چیزوں کی جو نسبت کی ہے، اس کی کتنی قسمیں ہیں؟

جواب اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کی طرف اس طرح کی جو نسبت کی ہے، اس کی حسب ذیل تین قسمیں ہیں:

پہلی قسم: وہ چیز جو بنفسہ قائم ہے، اس کی اضافت مخلوق کی اپنے خالق کی طرف اضافت کے باب سے ہے۔ یہ اضافت کبھی تو علیٰ سبیل العموم ہوتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ أَرْضِى وَٰسِعَةٌ ﴾ (العنکبوت: ٢٩/ ٥٦)

"بلاشبہ میری زمین فراخ ہے۔"

اور کبھی یہ اضافت چیز کے شرف کی وجہ سے علیٰ سبیل الخصوص ہوتی ہے۔ مثلاً:

﴿ وَطَهِّرْ بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِينَ وَٱلْقَآئِمِينَ وَٱلرُّكَّعِ ٱلسُّجُودِ ۝٢٦ ﴾ (الحج: ٢٢/ ٢٦)

"اور طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لیے میرے گھر کو صاف رکھا کرو۔"

اور فرمایا:

﴿ نَاقَةَ ٱللَّهِ وَسُقْيَٰهَا ۝١٣ ﴾ (الشمس: ٩١/ ١٣)

''اللہ کی اونٹنی (کی حفاظت کرو) اور اس کو پانی پلانے کی۔''

دوسری قسم: وہ چیز جس کے ساتھ کوئی دوسری چیز قائم ہو مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَرُوحٌ مِّنْهُ ﴾ (النساء: ٤/ ١٧١)

''اور اس کی طرف سے ایک روح۔''

اس روح کی اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت' مخلوق کی اس کے شرف کی وجہ سے خالق کی طرف اضافت کے قبیل سے ہے اور یہ روح بھی انھی ارواح میں سے ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کا جز نہیں ہے کیونکہ یہ روح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جسم میں تھی اور یہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے بالکل ایک الگ چیز ہے۔ یہ قسم بھی مخلوق ہے۔

تیسری قسم: محض وصف ہو اور مضاف اللہ تعالیٰ کی صفت ہو۔ یہ قسم غیر مخلوق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات غیر مخلوق ہیں' مثلاً اللہ تعالیٰ کی قدرت' اللہ تعالیٰ کی عزت اور اس طرح کی دیگر صفات باری تعالیٰ جو قرآن مجید میں کثرت کے ساتھ مذکور ہیں۔

اللہ کے ناموں یا صفات کا انکار کفر ہے

سوال اللہ تعالیٰ کے اسماء یا صفات میں سے کسی چیز کا انکار کر دیا جائے' تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اس انکار کی دو قسمیں ہیں:

انکار تکذیب: یہ بلا شک و شبہ کفر ہے۔ اگر کوئی شخص کتاب و سنت میں ثابت شدہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے کسی اسم یا صفات میں سے کسی صفت کا انکار کر دے' مثلاً وہ یہ کہے کہ اللہ کا ہاتھ نہیں ہے' تو تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ ایسا شخص کافر ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی کسی خبر کی تکذیب کرنا ایسا کفر ہے جو ملت اسلامیہ سے خارج کر دیتا ہے۔

انکار تاویل: یعنی انکار تو نہ کرے مگر تاویل سے کام لے۔ اس کی درج ذیل دو قسمیں ہیں:

○ اس تاویل کی عربی زبان میں گنجائش ہو تو یہ موجب کفر نہیں ہے۔

○ عربی زبان میں اس تاویل کی گنجائش نہ ہو تو یہ موجب کفر ہے۔

کیونکہ جب زبان میں اس کی گنجائش نہ تھی تو یہ تکذیب ہو گئی' جیسے کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کا نہ تو حقیقت میں کوئی ہاتھ ہے اور نہ یہ نعمت یا قوت کے معنی میں ہے تو یہ کافر ہے کیونکہ اس نے مطلق نفی کر دی ہے اور یہ حقیقتاً تکذیب کرنے والا ہے' اسی طرح اگر کوئی شخص ارشاد باری تعالیٰ:

﴿ بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ ﴾ (المائدة: ٥/ ٦٤)

''بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔''

کے بارے میں یہ کہے کہ دونوں ہاتھوں سے مراد آسمان اور زمین ہیں تو وہ بھی کافر ہے' کیونکہ از روئے لغت یہ معنی صحیح نہیں ہیں اور نہ شرعی حقیقت ہی کا یہ تقاضا ہے' لہٰذا یہ معنی بیان کرنے والا بھی منکر اور مکذب ہی قرار پائے گا۔

ہاں اگر وہ یہ کہے کہ یَــدٌ سے مراد نعمت یا قوت ہے' تو وہ کافر نہیں ہو گا کیونکہ یَــدٌ کا لفظ عربی زبان میں نعمت کے معنی میں بھی

استعمال ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

وَكَمْ لِظَلَامِ اللَّيْلِ عِنْدَكَ مِنْ يَدِ   تُحَدِّثُ أَنَّ الْمَانَوِيَةَ تَكْذِبُ

''رات کی تاریکی کے تم پر کتنے احسانات ہیں' جو یہ بیان کرتے ہیں کہ ''مانویہ'' جھوٹ بولتے ہیں۔''

اس شعر میں یَدٌ کا لفظ نعمت کے معنی میں استعمال ہوا ہے کیونکہ مانویہ فرقے کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ظلمت اور تاریکی سے خیر پیدا نہیں ہو سکتی بلکہ اس سے شر ہی جنم لیتا ہے۔

خالق کی صفات مخلوق کی صفات کی طرح نہیں ہیں

سوال جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ خالق کی صفات مخلوق کی صفات کی طرح ہیں' تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ خالق کی صفات مخلوق کی صفات کی طرح ہیں' وہ گمراہ ہے کیونکہ قرآن مجید کی نص سے ثابت ہے کہ خالق کی صفات مخلوق کی صفات جیسی نہیں ہیں' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِۦ شَىْءٌ ۖ وَهُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْبَصِيرُ ﴿١١﴾ ﴾ (الشورى: ٤٢/ ١١)

''اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ خوب سننے والا' خوب دیکھنے والا ہے۔''

اور اسم وصفت میں دو چیزوں کی مماثلت سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دونوں حقیقت میں بھی ایک جیسی ہیں اور یہ ایک معلوم ومعروف قاعدہ ہے۔ کیا آدمی اور اونٹ دونوں کا چہرہ نہیں ہے؟ دونوں چہرے نام میں متفق ہیں لیکن حقیقت میں متفق نہیں ہیں' اسی طرح اونٹ کا بھی ہاتھ ہے اور چیونٹی کا بھی' تو سوال یہ ہے' کیا یہ دونوں ہاتھ ایک جیسے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ نہیں ہرگز نہیں! تو پھر آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اللہ عزوجل کی ذات گرامی کا چہرہ ہے لیکن وہ مخلوقات کے چہروں کی طرح نہیں ہے' اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کا ہاتھ ہے لیکن وہ مخلوقات کے ہاتھوں کی طرح نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا قَدَرُوا۟ ٱللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِۦ وَٱلْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُۥ يَوْمَ ٱلْقِيَـٰمَةِ وَٱلسَّمَـٰوَٰتُ مَطْوِيَّـٰتٌۢ بِيَمِينِهِۦ ۚ ﴾ (الزمر: ٣٩/ ٦٧)

''اور انہوں نے اللہ کی قدر شناسی اس طرح نہیں کی جیسی کرنی چاہیے تھی اور قیامت کے دن تمام زمین اس کی مٹھی میں ہو گی۔''

اور فرمایا:

﴿ يَوْمَ نَطْوِى ٱلسَّمَآءَ كَطَىِّ ٱلسِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۚ ﴾ (الأنبياء: ٢١/ ١٠٤)

''جس دن ہم آسمان کو لکھے ہوئے کاغذ کی طرح لپیٹ لیں گے۔''

کیا مخلوقات کی ہاتھوں میں سے کوئی ہاتھ اللہ تعالیٰ کے اس مبارک ہاتھ کی طرح ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! لہٰذا اس حقیقت کو جاننا واجب ہے کہ خالق' مخلوق کی طرح نہیں ہے' نہ اپنی ذات میں' نہ صفات میں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِۦ شَىْءٌ ۖ وَهُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْبَصِيرُ ﴿١١﴾ ﴾ (الشورى: ٤٢/ ١١)

''اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ خوب سننے والا' خوب دیکھنے والا ہے۔''

17566

لہٰذا یہ ہرگز جائز نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی صفات کی کیفیت کا تصور کریں یا یہ گمان کریں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات بھی مخلوقات کی صفات کی طرح ہیں۔

رات کے آخری حصے میں نزول باری تعالیٰ سے کیا مراد ہے؟

سوال یہ معلوم ہے کہ رات کرۂ ارض پر گھومتی رہتی ہے اور اللہ عزوجل آسمانِ دنیا پر اس وقت نزول فرماتا ہے، جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے، تو اس کا مفہوم تو یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ ساری رات ہی آسمان دنیا میں ہوتا ہے، اس اشکال کا کیا جواب ہے؟

جواب ہم پر یہ واجب ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ان اسماء وصفات پر ایمان رکھیں جن کے ساتھ اس نے اپنی ذات پاک کو اپنی کتاب یا اپنے رسول ﷺ کی زبانی موسوم وموصوف قرار دیا ہے اور اس بارے میں قطعاً کسی تحریف یا تعطیل یا تکییف یا تمثیل سے کام نہ لیں۔ تحریف کا تعلق نصوص سے ہے، تعطیل کا اعتقاد سے، تکییف کا صفت سے اور تمثیل کا بھی صفت سے ہے، البتہ یہ تکییف کی نسبت زیادہ خاص ہے کیونکہ تکییف مماثلت کے ساتھ مقید ہوتی ہے، لہٰذا واجب ہے کہ ان چاروں ممنوعات سے ہمارا عقیدہ پاک ہو۔ اور یہ بھی واجب ہے کہ انسان اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اور اس کے اسماء وصفات کے بارے میں "کیوں" اور "کیسے"؟ سے روکے۔ اور اسی طرح کیفیت کے بارے میں سوچنے سے بھی اپنے آپ کو روکے کیونکہ اس راستے پر چلنے سے انسان بہت استراحت محسوس کرے گا۔ سلف ؒ کا اس بارے میں یہی طریقہ تھا۔ ایک شخص امام مالک بن انس ؒ کے پاس آیا اور اس نے کہا: اے ابوعبداللہ! (اللہ کا فرمان ہے:) ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ تو سوال یہ ہے کہ وہ عرش پر کیسے مستوی ہوا؟ آپ نے سر جھکا لیا، پسینے سے شرابور ہو گئے اور فرمانے لگے: (اَلْإِ سْتَوَاءُ غَيْرُ مَجْهُولٍ، وَالْكَيْفُ غَيْرُ مَعْقُولٍ، وَالْإِيمَانُ بِهِ وَاجِبٌ، وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ، وَمَا أَرَاكَ إِلَّا مُبْتَدِعاً) "استواء مجہول نہیں ہے لیکن اس کی کیفیت عقل میں نہیں آسکتی، اس کے ساتھ ایمان لانا واجب ہے اور اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ تم بدعتی ہو۔"

اس شخص نے جو یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر رات کو اس وقت نزول فرماتا ہے جب رات کا تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ ساری رات ہی آسمان دنیا پر رہتا ہے کیوں کہ رات تو ساری زمین پر گھومتی ہے، لہٰذا ثلث (رات کا تہائی حصہ) ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں ہم یہ عرض کریں گے کہ جب نبی ﷺ نے یہ بات بیان فرمائی تھی کہ اللہ تعالیٰ ہر رات کے آخری ثلث میں آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے تو صحابۂ کرام ؓ میں سے کسی نے آپ سے یہ سوال نہیں پوچھا تھا۔ اگر کسی فرماں بردار مومن کے دل میں یہ سوال آتا تو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ اسے ضرور بیان فرما دیتے۔ اس کے جواب میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب تک ہماری جہت میں رات کا ثلث اخیر باقی رہتا ہے تو اس میں نزول بھی باقی رہتا ہے اور جب رات بیت جاتی ہے تو نزول بھی ختم ہو جاتا ہے لیکن ہمیں نزول باری تعالیٰ کی کیفیت کا ادراک نہیں ہے اور نہ ہمارا علم اس کا احاطہ کر سکتا ہے البتہ ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جیسی کوئی چیز نہیں، لہٰذا ہم پر واجب ہے کہ ہم سر اطاعت خم کر دیں اور کہیں کہ ہم نے سن لیا اور ہم اس پر ایمان لے آئے اور ہم نے اتباع واطاعت کو اختیار کر لیا ہے، ہمارا فرض یہی ہے۔

دیدارِ الٰہی کے بارے میں سلف کا عقیدہ

سوال سلف کا اللہ تعالیٰ کے دیدار کے بارے میں کیا عقیدہ ہے؟ اور اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کو آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا' لہٰذا رویت کمال یقین سے عبارت ہے؟

جواب اللہ عزوجل نے قیامت کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝٢٢ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝٢٣ ﴾ (القيامة: ٧٥/ ٢٢-٢٣)

''اس روز بہت سے چہرے پر رونق ہوں گے (اور) اپنے پروردگار کے دیدار میں محو ہوں گے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان آیات میں دیکھنے کی اضافت چہروں کی طرف کی ہے اور چہروں کے لیے جس چیز سے دیکھنا ممکن ہے وہ آنکھ ہی ہے' لہٰذا یہ آیت کریمہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات پاک کو آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے' لیکن ہمارا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے احاطہ کرنے کا تقاضا نہیں کرتا' کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِۦ عِلْمًا ۝١١٠ ﴾ (طه: ٢٠/ ١١٠)

''اور وہ اپنے علم سے اللہ کا احاطہ نہیں کر سکتے۔''

جب ہم علم کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا احاطہ نہیں کر سکتے' حالانکہ علمی احاطہ بصری احاطے کی نسبت زیادہ وسیع اور زیادہ جامع ہوتا ہے' تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کا بصری احاطہ ممکن ہی نہیں۔ اس کی دلیل حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے:

﴿ لَّا تُدْرِكُهُ ٱلْأَبْصَٰرُ وَهُوَ يُدْرِكُ ٱلْأَبْصَٰرَ ﴾ (الأنعام: ٦/ ١٠٣)

''(وہ ایسا ہے کہ) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔''

آنکھیں اگر اسے دیکھیں تو ان کے لیے اس ذات پاک کا ادراک ممکن ہی نہیں۔ پس اللہ عزوجل کی ذات پاک کا آنکھ کے ساتھ حقیقی طور پر دیدار کیا جا سکتا ہے' لیکن اس دیدار کے ساتھ اس کی ذات پاک کا ادراک نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کی ذاتِ اقدس اس سے کہیں عظیم و برتر ہے کہ اس کا احاطہ کیا جا سکے۔ سلف کا یہی عقیدہ ہے کہ آخرت میں دیدار باری تعالیٰ کی سعادت حاصل ہوگی' ان کی رائے میں آخرت میں سب سے بڑی نعمت ہی یہ ہوگی کہ انسان کو دیدار باری تعالیٰ کی سعادت میسر آئے۔ اس لیے نبی ﷺ یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

«أَسْأَلُكَ لَذَّةَ النَّظَرِ إِلَى وَجْهِكَ» (سنن النسائي، السهو، باب نوع آخر من الدعاء، ح: ١٣٠٦ ومسند أحمد: ٥/ ١٩١)

''میں تجھ سے تیرے چہرۂ اقدس کی طرف دیکھنے کی لذت کا سوال کرتا ہوں۔''

لذتِ نظر کا سوال اس لیے کیا کہ دیدار باری تعالیٰ کی لذت ایسی عظیم الشان ہوگی کہ اس کا ادراک اس کے سوا اور کوئی کر ہی

نہیں سکتا جسے اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے اس نعمت سے سرفراز فرما دیا ہو۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو بھی اپنے ان بندوں میں شامل فرما دے گا۔ یہ ہے دیدار باری تعالیٰ کی حقیقت جس پر تمام سلف کا اجماع ہے۔

جو شخص یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کو آنکھ سے دیکھا نہیں جا سکتا‘ لہٰذا رؤیت کمال یقین سے عبارت ہے‘ تو اس کی یہ بات باطل ہے‘ دلائل کے خلاف ہے اور امر واقع اس کی تکذیب کرتا ہے‘ کیونکہ کمال یقین تو دنیا میں بھی موجود ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے احسان کی تفسیر میں فرمایا ہے:

«أَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ، فَإِنَّهُ يَرَاكَ»(صحيح البخاري، الإيمان، باب سوال جبريل النبي ﷺ عن الإيمان والإسلام والإحسان، ح:٥٠ وصحيح مسلم، الإيمان، باب بيان الإيمان والإسلام والإحسان . . . ح:٨)

”(احسان یہ ہے) کہ اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تمہیں ضرور دیکھ رہا ہے۔“

اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرنا گویا تم اسے دیکھ رہے ہو‘ یہی کمال یقین ہے‘ لہٰذا یہ دعویٰ کرنا کہ رؤیت کے بارے میں وارد نصوص سے مراد کمال یقین ہے کیونکہ جسے کمال یقین حاصل ہو وہ اس کی طرح ہے جو آنکھ سے مشاہدہ کر رہا ہو‘ تو یہ ایک باطل دعویٰ اور قرآن مجید اور سنت نبویہ کی نصوص کی تحریف ہے‘ یعنی یہ تفسیر نہیں بلکہ باطل تحریف ہے‘ لہٰذا اس کی تردید واجب ہے‘ خواہ اس کا قائل کوئی بھی ہو۔ واللہ المستعان!

جنات کے شر سے بچنے کا طریقہ

سوال کیا جن انسان پر اثر انداز ہو سکتا ہے؟ نیز جنوں سے بچنے کا طریقہ کیا ہے؟

جواب بے شک جن انسان پر اثر انداز ہو کر اسے ایذا پہنچا سکتے ہیں۔ ان کے ایذا پہنچانے کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں‘ وہ قتل کر سکتے ہیں‘ پتھر مار کر ایذا پہنچا سکتے ہیں اور انسان کو ڈرا بھی سکتے ہیں‘ اسی طرح وہ اور بھی کئی طرح ایذا پہنچا سکتے ہیں جیسا کہ سنت نبوی اور امر واقع سے ثابت ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک غزوہ میں‘ غالباً یہ غزوہ خندق تھا‘ ایک صحابی کو اپنے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ وہ جوان تھے اور ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ جب وہ اپنے گھر پہنچے تو دیکھا کہ ان کی بیوی دروازے پر کھڑی ہے‘ انہوں نے اسے برا سمجھا۔ وہ ان سے کہنے لگی کہ اندر آ جائیں‘ یہ گھر کے اندر داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ بستر پر ایک سانپ بل کھا رہا ہے۔ ان کے پاس نیزہ تھا‘ انہوں نے نیزہ مارا جس سے وہ مر گیا اور عین اسی لمحے‘ جس میں سانپ مرا‘ وہ صحابی بھی فوت ہو گیا حتی کہ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان میں سے پہلے کون فوت ہوا‘ سانپ یا صحابی؟ جب نبی ﷺ کو اس واقعے کی اطلاع ہوئی‘ تو آپ نے چھوٹی دم والے خبیث سانپ اور اس سانپ کے سوا جس کی پشت پر سفید اور سیاہ دو دھاریاں ہوں گھروں میں آنے والے سانپوں کے قتل سے منع فرما دیا۔①

---

① صحیح البخاری‘ بدء الخلق‘ حدیث : 3311

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جن انسانوں پر زیادتی کر سکتے ہیں اور انہیں ایذا پہنچا سکتے ہیں جیسا کہ امر واقع اس بات کا شاہد ہے اور تواتر کے ساتھ ایسے واقعات ثابت ہیں کہ انسان کسی ویران جگہ گیا تو اس پر پتھر گرنے لگے حالانکہ اس ویرانے میں کوئی انسان نہ تھا۔ اس طرح بسا اوقات وہ ویرانوں میں ڈراؤنی آوازیں یا پتوں کی کھڑکھڑاہٹ جیسی آوازیں سنتا ہے جن سے وہ ڈرتا اور ایذا محسوس کرتا ہے، اسی طرح جن انسان کے جسم کے اندر بھی اس سے عشق کی وجہ سے یا اسے ایذا پہنچانے کے ارادہ سے یا کسی اور سبب سے داخل ہو سکتا ہے جیسا کہ درج ذیل آیت کریمہ سے اشارہ ملتا ہے:

﴿ٱلَّذِينَ يَأۡكُلُونَ ٱلرِّبَوٰاْ لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ ٱلَّذِي يَتَخَبَّطُهُ ٱلشَّيۡطَٰنُ مِنَ ٱلۡمَسِّۚ﴾ (البقرة: ٢/ ٢٧٥)

”جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قبروں سے) اس طرح (حواس باختہ) اٹھیں گے جیسے کسی کو جن نے لپٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو۔“

اس صورت میں جن انسانوں کے اندر سے بات کر سکتا ہے بلکہ وہ اس شخص سے بھی باتیں کر سکتا ہے جو آسیب زدہ کو قرآن کریم کی آیات پڑھ کر دم کر رہا ہو۔ دم کرنے والا بسا اوقات اس سے یہ وعدہ بھی لے لیتا ہے کہ وہ آئندہ یہاں نہیں آئے گا، اس طرح کے بہت سے امور حد تواتر تک پہنچنے کی وجہ سے لوگوں میں بہت مشہور ہیں۔ جنوں کے شر سے بچنے کیلئے انسان کو وہ پڑھنا چاہیے جس کا اس بارے میں سنت میں ذکر ہے، مثلاً اس مقصد سے آیت الکرسی پڑھی جائے کیونکہ انسان جب رات کو آیت الکرسی پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ اس کی حفاظت پر مامور ہو جاتا ہے اور صبح تک شیطان اس کے قریب نہیں پھٹک سکتا۔ واللہ الحافظ

جنات بھی علم غیب نہیں جانتے

سوال کیا جن علم غیب جانتے ہیں؟

جواب جن علم غیب نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی بھی غیب نہیں جانتا۔ اس کی دلیل میں یہ ارشاد باری تعالیٰ پڑھ لیں:

﴿فَلَمَّا قَضَيۡنَا عَلَيۡهِ ٱلۡمَوۡتَ مَا دَلَّهُمۡ عَلَىٰ مَوۡتِهِۦٓ إِلَّا دَآبَّةُ ٱلۡأَرۡضِ تَأۡكُلُ مِنسَأَتَهُۥۖ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ ٱلۡجِنُّ أَن لَّوۡ كَانُواْ يَعۡلَمُونَ ٱلۡغَيۡبَ مَا لَبِثُواْ فِي ٱلۡعَذَابِ ٱلۡمُهِينِ ١٤﴾ (سبا: ٣٤/ ١٤)

”پھر جب ہم نے سلیمان کے لیے موت کا حکم صادر کیا تو کسی چیز سے ان کا مرنا معلوم نہ ہوا مگر گھن کے کیڑے سے جو ان کے عصا کو کھاتا رہا۔ جب سلیمان گر پڑے تب جنوں کو معلوم ہوا (اور کہنے لگے) کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو ذلت کی تکلیف میں نہ رہتے۔“

جو شخص علم غیب کا دعویٰ کرے وہ کافر ہے اور جو کسی مدعیٔ علم غیب کے دعویٰ کی تصدیق کرے وہ بھی کافر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُل لَّا يَعۡلَمُ مَن فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ ٱلۡغَيۡبَ إِلَّا ٱللَّهُۚ﴾ (النمل: ٢٧/ ٦٥)

”کہہ دو کہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، اللہ کے سوا غیب کی باتیں نہیں جانتے۔“

اللہ وحدہ کے سوا آسمانوں اور زمین کی غیب کی باتوں کو کوئی نہیں جانتا۔ یہ لوگ جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ مستقبل میں پیش آنے

والی غیب کی خبروں کو جانتے ہیں تو یہ کہانت ہے' اور کہانت کے بارے میں نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«أَنَّ مَنْ أَتٰى عَرَّافًا فَسَأَلَهُ عَنْ شَيْءٍ لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةٌ أَرْبَعِينَ يَوْمًا»(صحيح مسلم، السلام، باب تحريم الكهانة وإتيان الكهان، ح: ٢٢٣٠)

"بے شک جو شخص کسی کاہن کے پاس جا کر اس سے (غیب کی خبریں) پوچھے' اس کی چالیس دن تک نماز قبول نہ ہو گی۔"

اور اگر وہ کسی کاہن کی تصدیق کر دے تو وہ کافر ہو جائے گا' کیونکہ جب اس نے اس کے دعوائے علم غیب کی تصدیق کر دی' تو اس ارشاد باری تعالیٰ کی بھی تکذیب کر دی:

﴿قُل لَّا يَعْلَمُ مَن فِي السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ﴾ (النمل: ٢٧/ ٦٥)

"کہہ دو کہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں' اللہ کے سوا غیب کی باتیں نہیں جانتے۔"

کیا نبی کریم ﷺ کو حبیب اللہ کہا جا سکتا ہے؟

سوال نبی ﷺ کو حبیب اللہ کہنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب بلاشک وشبہ نبی اکرم ﷺ حبیب اللہ ہیں۔ آپ اللہ تعالیٰ کے محب بھی ہیں اور محبوب بھی بلکہ آپ کو تو اس سے بھی بلند وصف حاصل ہے اور وہ یہ کہ آپ خلیل اللہ بھی ہیں۔ ہاں نبی ﷺ خلیل اللہ بھی ہیں جیسا کہ آپ نے خود ارشاد فرمایا ہے:

«إِنَّ اللهَ اتَّخَذَنِي خَلِيلًا كَمَا اتَّخَذَ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا»(سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فضل العباس بن عبدالمطلب رضي الله عنه، ح: ١٤١)

"بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی اپنا خلیل بنا لیا ہے جس طرح اس نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا ہے۔"

لہٰذا جو شخص صرف حبیب اللہ کے ساتھ آپ کی شان بیان کرتا ہے' وہ گویا آپ کے مرتبے میں کمی کرتا ہے' کیونکہ خُلت کا درجہ محبت کے درجے سے زیادہ عظیم اور زیادہ بلند وبالا ہے۔ تمام مومن اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں لیکن نبی ﷺ کو اس سلسلے میں جو مقام و مرتبہ حاصل ہے وہ اس سے بدرجہا بلند وبالا اور ارفع واعلیٰ ہے اور وہ مقام خُلت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی اپنا خلیل بنا لیا ہے جس طرح اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل قرار دیا' اس لیے ہم یہ کہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ خلیل اللہ ہیں اور یہ وصف حبیب اللہ کی نسبت زیادہ بلند ہے کیونکہ اس میں محبت بھی ہے اور اس سے ایک زائد چیز بھی ہے اور وہ ہے آخری درجہ کی محبت۔

نعت خوانی بطور پیشہ

سوال نبی ﷺ کی مدح کو تجارت بنا لینے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ (یعنی نعت فروشی کے بارے میں کیا حکم ہے؟)

جواب اس کا حکم یہ ہے کہ یہ حرام ہے اور یہ جاننا واجب ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی مدح کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: درجہ غلو کو پہنچے بغیر ایسی مدح میں کوئی حرج نہیں' جس کے آپ ﷺ مستحق ہیں' یعنی ایسی مدح میں کوئی حرج نہیں کہ آپ کے اخلاق کریمانہ اور آپ کی سیرت طیبہ کو بیان کرتے ہوئے آپ کے کامل اوصاف حمیدہ کا تذکرہ کیا جائے۔

دوسری قسم: رسول اکرم ﷺ کی ایسی مدح جس میں مدح کرنے والا اس غلو تک پہنچ جائے جس سے منع کرتے ہوئے آپ ﷺ نے خود ارشاد فرمایا ہے:

«لَا تُطْرُونِي كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارَى ابْنَ مَرْيَمَ، فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُهُ، فَقُولُوا: عَبْدُاللهِ وَرَسُولُهُ»

(صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالي: ﴿واذكر في الكتاب مريم ...﴾، ح:٣٤٤٥)

''میری تعریف میں اس طرح غلو سے کام نہ لینا جس طرح عیسائیوں نے ابن مریم کی تعریف میں غلو سے کام لیا۔ میں تو اس کا بندہ ہوں لہٰذا مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔''

اگر کوئی نبیٔ اکرم ﷺ کی مدح کرتے ہوئے یہ کہے کہ آپ فریاد کرنے والوں کے فریاد رس ہیں، مجبور و مضطر لوگوں کی دعا قبول کرنے والے ہیں، آپ دنیا و آخرت کے مالک ہیں یا آپ غیب جانتے ہیں تو اس طرح کی مدح حرام ہے۔ اس طرح کی مدح سے بسا اوقات انسان شرک اکبر کا مرتکب ہو کر ملت اسلامیہ ہی سے خارج ہو جاتا ہے، لہٰذا رسول اللہ ﷺ کی مدح میں ایسا انداز اختیار نہیں کرنا چاہیے جو درجہ غلو تک پہنچ جائے کیونکہ اس سے تو آپ نے خود ہمیں منع فرما دیا ہے۔

اب رہا سوال جائز مدح کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنانے کا، تو یہ بھی حرام ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے مکارم اخلاق، صفات حمیدہ اور سیرت طیبہ کے ذکر پر مشتمل ایسی مدح جس کے آپ مستحق ہیں، ایسی عبادت ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کیا جاتا ہے اور جو عبادت ہو اسے دنیا کمانے کا ذریعہ بنانا جائز نہیں ہے، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَن كَانَ يُرِيدُ ٱلْحَيَوٰةَ ٱلدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَٰلَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ﴿١٥﴾ أُو۟لَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِى ٱلْءَاخِرَةِ إِلَّا ٱلنَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا۟ فِيهَا وَبَٰطِلٌ مَّا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ﴿١٦﴾ ﴾

(هود: ١١/ ١٥-١٦)

''جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے طالب ہوں ہم ان کے اعمال کا بدلہ انھیں دنیا ہی میں دے دیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آتشِ جہنم کے سوا اور کچھ نہیں اور جو عمل انہوں نے دنیا میں کیے سب برباد اور جو کچھ وہ کرتے رہے، سب ضائع ہوا۔''

اللہ تعالیٰ ہم سب کو راہ راست پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے!

نبیٔ اکرم ﷺ کے بارے میں ''نُورٌ مِّنْ نُورِ اللّٰهِ'' اور غیب دانی کا عقیدہ

سوال جو شخص نبی ﷺ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے کہ آپ بشر نہیں بلکہ '' نُورٌ مِّنْ نُورِ اللّٰهِ '' ہیں اور غیب جانتے ہیں۔ پھر وہ آپ سے فریاد بھی کرے اور یہ عقیدہ رکھے کہ آپ نفع و نقصان کے مالک ہیں، تو اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا اس طرح کے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے؟ رہنمائی فرمائیں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر سے نوازے۔

جواب جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ نبی ﷺ بشر نہیں بلکہ '' نُورٌ مِّنْ نُورِ اللّٰهِ '' ہیں اور آپ غیب جانتے ہیں، تو وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ کفر کرتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے دشمنوں میں سے ہے دوستوں میں سے نہیں، کیونکہ اس کا یہ

عقیدہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تکذیب پر مشتمل ہے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تکذیب کفر ہے۔ اس عقیدے کے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تکذیب پر مشتمل ہونے کے دلائل یہ ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ إِنَّمَآ أَنَا۠ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ (الكهف: ١٨/ ١١٠)

”کہہ دو کہ میں تمھاری طرح کا ایک بشر ہوں۔“

اور فرمایا:

﴿ قُل لَّا يَعْلَمُ مَن فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ٱلْغَيْبَ إِلَّا ٱللَّهُ ﴾ (النمل: ٢٧/ ٦٥)

”کہہ دو آسمانوں اور زمین میں اللہ کے سوا کوئی بھی غیب کی بات نہیں جانتا۔“

اور فرمایا:

﴿ قُل لَّآ أَقُولُ لَكُمْ عِندِى خَزَآئِنُ ٱللَّهِ وَلَآ أَعْلَمُ ٱلْغَيْبَ وَلَآ أَقُولُ لَكُمْ إِنِّى مَلَكٌ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰٓ إِلَىَّ ﴾ (الأنعام: ٦/ ٥٠)

”کہہ دو کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ (یہ کہ) میں غیب جانتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس حکم پر چلتا ہوں جو مجھے (اللہ کی طرف سے) آتا ہے۔“

اور فرمایا:

﴿ قُل لَّآ أَمْلِكُ لِنَفْسِى نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَآءَ ٱللَّهُ وَلَوْ كُنتُ أَعْلَمُ ٱلْغَيْبَ لَٱسْتَكْثَرْتُ مِنَ ٱلْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِىَ ٱلسُّوٓءُ إِنْ أَنَا۠ إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿١٨٨﴾ ﴾ (الأعراف: ٧/ ١٨٨)

”کہہ دو کہ میں اپنے فائدے اور نقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو بہت سے فائدے جمع کر لیتا اور مجھ کو کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔ میں تو مومنوں کو ڈرانے اور خوش خبری سنانے والا ہوں۔“

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ أَنْسٰى كَمَا تَنْسَوْنَ، فَإِذَا نَسِيتُ فَذَكِّرُونِي» (صحيح البخاري، الصلاة، باب التوجه نحو القبلة ... ح:٤٠١ وصحيح مسلم، المساجد، باب السهو في الصلاة والسجود له، ح: ٥٧٢)

”میں تمھاری طرح کا ایک بشر ہوں۔ میں بھی تمھاری طرح بھول جاتا ہوں، پس جب میں بھول جاؤں تو مجھے یاد دلا دیا کرو۔“

جو شخص رسول اللہ ﷺ کے ساتھ یہ عقیدہ رکھتے ہوئے استغاثہ کرے کہ آپ نفع و نقصان کے مالک ہیں، تو وہ بھی کافر و مشرک ہے اور اللہ تعالیٰ کی تکذیب کرتا ہے، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ٱدْعُونِىٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ ٱلَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِى سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ﴿٦٠﴾ ﴾ (الغافر: ٤٠/ ٦٠)

”اور تمھارے پروردگار نے کہا ہے کہ تم مجھ سے دعا کرو میں تمھاری دعا قبول کروں گا، بلاشبہ جو لوگ میری عبادت سے سرکشی

کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں ذلیل وخوار ہو کر داخل ہوں گے۔''

اور فرمایا:

﴿قُلْ إِنِّي لَآ أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا ﴿٢١﴾ قُلْ إِنِّي لَن يُجِيرَنِي مِنَ ٱللَّهِ أَحَدٌ وَلَنْ أَجِدَ مِن دُونِهِۦ مُلْتَحَدًا ﴿٢٢﴾﴾ (الجن: ٧٢/ ٢١_٢٢)

''(یہ بھی) کہہ دو کہ میں تمھارے حق میں نقصان اور نفع کا کچھ اختیار نہیں رکھتا' یہ بھی کہہ دو کہ اللہ (کے عذاب) سے مجھے کوئی پناہ نہیں دے سکتا اور میں اس کے سوا کہیں جائے پناہ نہیں دیکھتا۔''

ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے اپنے قریبی رشتہ داروں سے فرمایا:

«لَاَ أُغْنِي عَنْكُمْ مِّنَ اللهِ شَيْئًا»(صحيح البخاري، الوصايا، باب هل يدخل النساء والولد في الأقارب، ح:٢٧٥٣، وصحيح مسلم، الإيمان، باب قوله تعالي: ﴿وأنذر عشيرتك الأقربين﴾، ح:٢٠٦)

''میں اللہ تعالیٰ کے ہاں تمھارے کچھ کام نہ آسکوں گا۔''

آپ نے یہ بات اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ اور اپنی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے بھی فرمائی تھی۔

اس طرح کا عقیدہ رکھنے والے شخص کے پیچھے نماز جائز نہیں ہے' نہ نماز جائز ہے اور نہ مسلمانوں کے لیے اس طرح کے کسی شخص کو امام بنانا حلال ہے۔

آمدِ امام مہدی کے متعلق احادیث

سوال کیا امام مہدی کے آنے کے بارے میں احادیث صحیح ہیں یا نہیں؟

جواب مہدی کے بارے میں احادیث کی چار قسمیں ہیں: ① جھوٹی احادیث ② ضعیف احادیث ③ حسن احادیث' جو بحیثیت مجموعی درجہ صحت تک پہنچ جاتی ہیں کیونکہ یہ صحیح لغیرہ ہیں۔ ④ صحیح لذاتہ۔

لیکن ان احادیث میں جس مہدی کا ذکر ہے' اس سے مراد وہ فرضی مہدی نہیں ہے جس کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ عراق کی کسی غار میں چھپا ہوا ہے کیونکہ یہ بات بالکل بے اصل اور خرافات میں سے ہے اور حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ مہدی جن کا ذکر احادیث میں آیا ہے' یہ دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان ہوں گے' جو اپنے وقت پر پیدا ہوں گے اور اپنے وقت پر لوگوں میں آئیں گے۔ یہ ہے قصہ مہدی کا جس کا مطلقاً انکار بھی غلط ہے اور مطلقاً اثبات بھی غلط کیونکہ اس کا اس طرح اثبات کرنا کہ اس سے مہدی منتظر بھی مراد ہے' جو غار میں چھپا ہوا ہے' غلط ہے کیونکہ اس غائب اور چھپے ہوئے مہدی کا عقیدہ عقل کا خلل' شرعاً ضلالت اور بے اصل بات ہے۔ اور اس مہدی کا اثبات' جن کی نبی ﷺ نے خبر دی ہے' جن کے بارے میں کثرت سے احادیث ہیں جو اپنے وقت پر پیدا ہوں گے اور اپنے وقت پر آئیں گے' یہ عقیدہ برحق ہے۔

یاجوج' ماجوج کون ہیں؟

سوال یأجوج اور مأجوج کون ہیں؟

جواب یاجوج اور ماجوج انسانوں ہی میں سے دو امتیں ہیں، جواب بھی موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کے قصے کے ضمن میں فرمایا ہے:

﴿ حَتَّىٰٓ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ ٱلسَّدَّيْنِ وَجَدَ مِن دُونِهِمَا قَوْمًا لَّا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا ﴿٩٣﴾ قَالُوا۟ يَـٰذَا ٱلْقَرْنَيْنِ إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مُفْسِدُونَ فِى ٱلْأَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَىٰٓ أَن تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿٩٤﴾ قَالَ مَا مَكَّنِّى فِيهِ رَبِّى خَيْرٌ فَأَعِينُونِى بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿٩٥﴾ ءَاتُونِى زُبَرَ ٱلْحَدِيدِ ۖ حَتَّىٰٓ إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ ٱلصَّدَفَيْنِ قَالَ ٱنفُخُوا۟ ۖ حَتَّىٰٓ إِذَا جَعَلَهُۥ نَارًا قَالَ ءَاتُونِىٓ أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿٩٦﴾ فَمَا ٱسْطَـٰعُوٓا۟ أَن يَظْهَرُوهُ وَمَا ٱسْتَطَـٰعُوا۟ لَهُۥ نَقْبًا ﴿٩٧﴾ قَالَ هَـٰذَا رَحْمَةٌ مِّن رَّبِّى ۖ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّى جَعَلَهُۥ دَكَّآءَ ۖ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّى حَقًّا ﴿٩٨﴾ ﴾ (الکھف: ١٨/ ٩٣-٩٨)

”یہاں تک کہ جب وہ دو دیواروں کے درمیان پہنچا تو دیکھا کہ ان کے اس طرف کچھ لوگ ہیں کہ بات کو سمجھ نہیں سکتے۔ ان لوگوں نے کہا کہ ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج زمین میں فساد کرتے رہتے ہیں، بھلا ہم آپ کے لیے خرچ (کا انتظام) کر دیں کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار کھینچ دیں۔ اس (ذوالقرنین) نے کہا کہ خرچ کا جو مقدور اللہ نے مجھے بخشا ہے، وہ بہت اچھا ہے، تم مجھے قوت (بازو) سے مدد دو، میں تمھارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط اوٹ بنا دوں گا۔ تم مجھے لوہے کے (بڑے بڑے) تختے لا دو (چنانچہ کام جاری کر دیا گیا) یہاں تک کہ جب اس نے دونوں پہاڑوں کے درمیان (کا حصہ) برابر کر دیا تو کہا کہ (اب اس میں) دھونکو یہاں تک کہ جب اس کو (خوب دھونک کر) آگ کر دیا تو کہا کہ (اب) میرے پاس تانبہ لاؤ کہ اس پر پگھلا کر ڈال دوں، پھر ان میں یہ قدرت نہ رہی کہ اس پر چڑھ سکیں اور نہ یہ طاقت رہی کہ اس میں نقب لگا سکیں۔ ذوالقرنین نے کہا: یہ میرے پروردگار کی مہربانی ہے۔ جب میرے پروردگار کا وعدہ آ پہنچے گا تو اس کو (ڈھا کر) ہموار کر دے گا اور میرے پروردگار کا وعدہ سچا ہے۔“

اور نبی ﷺ نے فرمایا:

«يَقُولُ اللهُ تَعَالٰى: يَا آدَمُ، فَيَقُولُ: لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ! وَالْخَيْرُ فِي يَدَيْكَ فَيَقُولُ: أَخْرِجْ بَعْثَ النَّارِ، قَالَ: وَمَا بَعْثُ النَّارِ؟ قَالَ: مِنْ كُلِّ أَلْفٍ تِسْعَمِائَةٍ وَتِسْعَةً وَتِسْعِينَ . . . قَالَ: أَبْشِرُوا فَإِنَّ مِنْكُمْ رَجُلٌ وَمِنْ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ أَلْفٌ»(صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب قصة يأجوج ومأجوج، ح:٣٣٤٨ وصحيح مسلم، الإيمان، باب قوله: يقول الله لآدم: أخرج . . . ح: ٢٢٢)

”اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے آدم! تو وہ عرض کریں گے: میں حاضر ہوں اور تیری فرماں برداری کے لیے تیار ہوں اور ہر خیر و بھلائی تیرے ہی ہاتھوں میں ہے۔ تب اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: آتشِ جہنم کے حصے کو نکالو؟ آدم علیہ السلام عرض کریں گے: آتشِ جہنم کا حصہ کتنا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے.....“ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم خوش ہو جاؤ کہ تم میں سے ایک شخص اور یاجوج اور ماجوج میں سے ایک ہزار جہنم میں جائیں گے۔“

یاجوج اور ماجوج کا خروج اگرچہ قیامت کی نشانیوں میں سے ہے، تاہم اس کا خوف نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں بھی محسوس

کیا گیا۔ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ اس طرح گھبرائے ہوئے تشریف لائے کہ چہرۂ اقدس سرخ ہو رہا تھا اور آپ فرما رہے تھے:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَيْلٌ لِّلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ، فُتِحَ الْيَوْمَ مِنْ رَدْمِ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مِثْلُ هٰذِهِ وَحَلَّقَ بِإِصْبَعَيْهِ: الْإِبْهَامِ وَالَّتِي تَلِيهَا»(صحيح البخاري، الفتن، باب يأجوج ومأجوج، ح:٧١٣٥ وصحيح مسلم، الفتن، باب الفتن وفتح ردم يأجوج ومأجوج، ح:٢٨٨٠)

”اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، عربوں کے لیے اس شر کی وجہ سے خرابی ہے جو قریب آ گیا ہے اور وہ یہ کہ یأجوج اور مأجوج کی دیوار میں سے آج اتنا حصہ کھل گیا ہے، اور (یہ فرماتے ہوئے) آپ نے انگوٹھے اور اس کے ساتھ والی انگلی کا دائرہ بنایا۔“

تمام امتوں کو دجال سے کیوں ڈرایا گیا؟

سوال تمام انبیائے کرام علیہم السلام نے اپنی قوموں کو دجال سے کیوں ڈرایا ہے، حالانکہ وہ تو آخری زمانے میں خروج کرے گا؟

جواب آدم علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر قیامت برپا ہونے تک روئے زمین پر سب سے بڑا فتنہ دجال کا فتنہ ہے جیسا کہ نبی ﷺ نے بیان فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک ہر ایک نبی نے اپنی قوم کو اس سے ڈرایا ہے۔ کیونکہ یہ بہت بڑا ہولناک فتنہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ دجال آخری زمانے میں خروج کرے گا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی قوموں کو اس سے ڈرائیں تاکہ اس کا خطرہ اور ہولناکی واضح ہو جائے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«إِنْ يَخْرُجْ وَأَنَا فِيكُمْ فَأَنَا حَجِيجُهُ دُونَكُمْ وَإِنْ يَخْرُجْ وَلَسْتُ فِيكُمْ فَامْرُؤٌ حَجِيجُ نَفْسِهِ وَاللهُ خَلِيفَتِي عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ»(صحيح مسلم، الفتن، باب ذكر الدجال وصفته وما معه، ح:٢٩٣٧)

”اگر میری موجودگی میں وہ نکلا تو تمھاری بجائے میں خود اس سے نبٹ لوں گا اور اگر وہ میری عدم موجودگی میں نکلا تو پھر ہر آدمی اپنی طرف سے خود اس سے نبٹ لے گا اور ہر مسلمان پر اللہ تعالیٰ میری طرف سے نگہبان ہے۔“

دجال کا فتنہ بہت بڑا فتنہ ہے اور جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر قیامت برپا ہونے تک روئے زمین پر رونما ہونے والا یہ سب سے بڑا فتنہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے فتنوں میں سے یہی وہ فتنہ ہے جس سے خاص طور پر نماز میں اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگی جاتی ہے یعنی اس فتنے سے بچنے کے لیے نماز میں یہ دعا مانگی جائے:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَأَعُوذُبِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَأَعُوذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيحِ الدَّجَّالِ وَأَعُوذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ»(صحيح البخاري، الأذان، باب التعوذ من عذاب القبر، ح:١٣٧٧ وسنن أبي داود، الصلاة، باب مايقول بعد التشهد، ح:٩٨٤ وسنن ابن ماجه، الدعاء، باب ما تعوذ منه رسول الله ﷺ، ح:٣٨٤٠ واللفظ له)

”اے اللہ! میں تیری پناہ لیتا ہوں جہنم کے عذاب سے اور تیری پناہ لیتا ہوں قبر کے عذاب سے اور تیری پناہ لیتا ہوں کانے دجال کے فتنے سے اور تیری پناہ لیتا ہوں زندگی اور موت کے فتنے سے۔“

دجال: ''دجل'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی حقائق کو چھپانے اور دھوکہ دینے کے ہیں' کیونکہ اس سے بڑا دھوکہ باز کوئی نہیں اور یہ لوگوں کو سب سے زیادہ دھوکہ اور فریب دینے والا ہے۔

آخرت کا منکر کافر ہے

سوال جو شخص آخرت کی زندگی کا انکار کرے اور کہے کہ یہ قرونِ وسطیٰ کی خرافات میں سے ہے' اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آخرت کی زندگی کا انکار کرنے والے لوگوں کو کس طرح قائل کیا جا سکتا ہے؟

جواب جو شخص آخرت کی زندگی کا انکار کرے اور اسے قرونِ وسطیٰ کی خرافات میں سے سمجھے' وہ کافر ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَقَالُوٓا۟ إِنْ هِىَ إِلَّا حَيَاتُنَا ٱلدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ﴿٢٩﴾ وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذْ وُقِفُوا۟ عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۚ قَالَ أَلَيْسَ هَٰذَا بِٱلْحَقِّ ۚ قَالُوا۟ بَلَىٰ وَرَبِّنَا ۚ قَالَ فَذُوقُوا۟ ٱلْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٣٠﴾ ﴾ (الأنعام: ٦/ ٢٩۔٣٠)

''اور وہ کہتے ہیں کہ ہماری جو دنیا کی زندگی ہے بس یہی (زندگی) ہے اور ہم (مرنے کے بعد) پھر زندہ نہیں کیے جائیں گے اور کاش تم (ان کو اس وقت) دیکھو جب وہ اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے اور وہ فرمائے گا: کیا یہ (دوبارہ زندہ ہونا) برحق نہیں؟ تو وہ کہیں گے: کیوں نہیں! ہمارے پروردگار کی قسم! (بالکل برحق ہے) اللہ فرمائے گا: اب تم اس کفر کے بدلے (جو دنیا میں کرتے تھے) عذاب کے مزے چکھو۔''

اور فرمایا:

﴿ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿١٠﴾ ٱلَّذِينَ يُكَذِّبُونَ بِيَوْمِ ٱلدِّينِ ﴿١١﴾ وَمَا يُكَذِّبُ بِهِۦٓ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ﴿١٢﴾ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ ءَايَٰتُنَا قَالَ أَسَٰطِيرُ ٱلْأَوَّلِينَ ﴿١٣﴾ كَلَّا ۖ بَلْ ۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا۟ يَكْسِبُونَ ﴿١٤﴾ كَلَّآ إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ ﴿١٥﴾ ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا۟ ٱلْجَحِيمِ ﴿١٦﴾ ثُمَّ يُقَالُ هَٰذَا ٱلَّذِى كُنتُم بِهِۦ تُكَذِّبُونَ ﴿١٧﴾ ﴾ (المطففین: ٨٣/ ١٠۔١٧)

''اس دن جھٹلانے والوں کی تباہی ہے (یعنی) جو انصاف کے دن کو جھٹلاتے ہیں اور اس کو جھٹلاتا وہی ہے جو حد سے نکل جانے والا گناہ گار ہے' جب اس کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ تو اگلے لوگوں کے افسانے ہیں' دیکھو! یہ جو (اعمال بد) کرتے ہیں' ان کا ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔ بے شک یہ لوگ اس روز اپنے پروردگار (کے دیدار) سے اوٹ میں ہوں گے' پھر دوزخ میں جا داخل ہوں گے' پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے جس کو تم جھٹلاتے تھے۔''

اور فرمایا:

﴿ بَلْ كَذَّبُوا۟ بِٱلسَّاعَةِ ۖ وَأَعْتَدْنَا لِمَن كَذَّبَ بِٱلسَّاعَةِ سَعِيرًا ﴿١١﴾ ﴾ (الفرقان: ٢٥/ ١١)

''بلکہ یہ تو قیامت ہی کو جھٹلاتے ہیں اور ہم نے قیامت کو جھٹلانے والوں کے لیے دوزخ تیار کر رکھا ہے۔''

اور فرمایا:

﴿ وَٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ وَلِقَآئِهِۦٓ أُو۟لَٰٓئِكَ يَئِسُوا۟ مِن رَّحْمَتِى وَأُو۟لَٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٢٣﴾ ﴾ (العنکبوت: ٢٩/ ٢٣)

''اور جن لوگوں نے اللہ کی آیتوں سے اور اس کے ملنے سے انکار کیا وہ میری رحمت سے ناامید ہو گئے ہیں اور ان کو درد دینے والا عذاب ہوگا۔''

منکرین آخرت کو درج ذیل طریقوں سے قائل کیا جا سکتا ہے:

○ سابقہ تمام الٰہی کتابوں اور آسمانی شریعتوں میں تمام انبیائے کرام و مرسلین عظام سے بعث بعد الموت کا معاملہ تواتر سے منقول ہے، جسے تمام امتوں نے قبول کیا ہے، لہٰذا تم اس کا کیونکر انکار کرتے ہو؟ جبکہ تم کسی فلسفی، اصولی یا مفکر کے کلام کی تصدیق کرتے ہو، اگرچہ ان کی بات کسی بھی ذریعے سے پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی جس قدر بعث بعد الموت کی خبر پہنچتی ہے۔

○ بعث بعد الموت کے امکان کی تو عقل بھی شاہد ہے اور عقل کی شہادت کئی طرح سے ہے:

① کوئی بھی اس بات کا منکر نہیں ہے کہ وہ عدم کے بعد پیدا ہوا ہے اور پہلے کبھی اس کا ذکر تک نہ تھا اور پھر اسے وجود بخشا گیا ہے تو جس ذات گرامی نے اسے پیدا کیا اور عدم سے وجود بخشا، وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ اسے مرنے کے بعد دوبارہ پیدا فرما دے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَهُوَ ٱلَّذِى يَبْدَؤُا۟ ٱلْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُۥ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ ﴾ (الروم: ٣٠/ ٢٧)

''اور وہی تو ہے جو خلقت کو پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا اور یہ اس کے لیے بہت آسان ہے۔''

اور فرمایا:

﴿ كَمَا بَدَأْنَآ أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُۥ ۚ وَعْدًا عَلَيْنَآ ۚ إِنَّا كُنَّا فَٰعِلِينَ ﴿١٠٤﴾ ﴾ (الأنبياء: ٢١/ ١٠٤)

''جس طرح ہم نے (کائنات کو) پہلے پیدا کیا تھا، اسی طرح ہم دوبارہ پیدا کر دیں گے (یہ) ہمارے ذمے وعدہ ہے (جس کا پورا کرنا لازم ہے) بے شک ہم ایسا ضرور کرنے والے ہیں۔''

② کوئی شخص بھی اس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ آسمان اور زمین کتنی بڑی بڑی مخلوقات ہیں اور ان کا نظام کتنا محیّر العقول ہے، جس ذات پاک نے اتنی بڑی بڑی مخلوقات کو پیدا کیا، وہ انسانوں کو پیدا کرنے اور انہیں مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر بالاولیٰ قادر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَخَلْقُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ ٱلنَّاسِ ﴾ (الغافر: ٤٠/ ٥٧)

''آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے کی نسبت بڑا (کام) ہے۔''

اور فرمایا:

﴿ أَوَلَمْ يَرَوْا۟ أَنَّ ٱللَّهَ ٱلَّذِى خَلَقَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ وَلَمْ يَعْىَ بِخَلْقِهِنَّ بِقَٰدِرٍ عَلَىٰٓ أَن يُحْۦِىَ ٱلْمَوْتَىٰ ۚ بَلَىٰٓ إِنَّهُۥ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣٣﴾ ﴾ (الأحقاف: ٤٦/ ٣٣)

''کیا انہوں نے نہیں سمجھا کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے تھکا نہیں، وہ اس (بات) پر بھی قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کر دے؟ ہاں یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

اور فرمایا:

﴿ أَوَلَيْسَ ٱلَّذِى خَلَقَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ بِقَٰدِرٍ عَلَىٰٓ أَن يَخْلُقَ مِثْلَهُم ۚ بَلَىٰ وَهُوَ ٱلْخَلَّٰقُ ٱلْعَلِيمُ ۝٨١ إِنَّمَآ أَمْرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيْـًٔا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ۝٨٢ ﴾ (یس: ٣٦/ ٨١-٨٢)

’’بھلا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا‘ کیا وہ اس بات پر قادر نہیں کہ (ان کو پھر) ویسے ہی پیدا کر دے؟ کیوں نہیں! وہ تو بڑا پیدا کرنے والا (اور) علم والا ہے۔ اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔‘‘

③ آنکھوں والا ہر شخص یہ مشاہدہ کرتا ہے کہ زمین بنجر اور مردہ ہو چکی ہوتی ہے لیکن جب اس پر بارش برستی ہے‘ تو سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے اور بنجر اور مردہ زمین میں پھر سے نباتات اگنے لگتی ہیں۔ جو ذات مردہ زمین کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے وہ مردہ انسانوں کو بھی دوبارہ زندہ کر کے اٹھانے پر قادر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمِنْ ءَايَٰتِهِۦٓ أَنَّكَ تَرَى ٱلْأَرْضَ خَٰشِعَةً فَإِذَآ أَنزَلْنَا عَلَيْهَا ٱلْمَآءَ ٱهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ۚ إِنَّ ٱلَّذِىٓ أَحْيَاهَا لَمُحْىِ ٱلْمَوْتَىٰٓ ۚ إِنَّهُۥ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ۝٣٩ ﴾ (فصلت: ٤١/ ٣٩)

’’اور (اے بندے!) اس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے ہے کہ تو زمین کو دبی ہوئی (خشک اور بنجر) دیکھتا ہے‘ پھر جب ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں تو شاداب ہو جاتی ہے اور پھوٹنے لگتی ہے۔ بلاشبہ وہ اللہ جس نے زمین کو زندہ کیا وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔ بے شک وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔‘‘

○ بعث کے امکان کا حسی اور واقعاتی طور پر مشاہدہ بھی کیا جا چکا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مردوں کو دوبارہ زندہ کر دینے کے کئی واقعات بیان فرمائے ہیں۔ سورۃ البقرہ میں اس سلسلے میں پانچ واقعات بیان کیے گئے ہیں جن میں سے بطور مثال ایک واقعہ حسب ذیل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَوْ كَٱلَّذِى مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِىَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْىِۦ هَٰذِهِ ٱللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۖ فَأَمَاتَهُ ٱللَّهُ مِا۟ئَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُۥ ۖ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِا۟ئَةَ عَامٍ فَٱنظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ وَٱنظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ ءَايَةً لِّلنَّاسِ ۖ وَٱنظُرْ إِلَى ٱلْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُۥ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ۝٢٥٩ ﴾ (البقرة: ٢/ ٢٥٩)

’’یا اسی طرح اس شخص کو (نہیں دیکھا؟) جس کا ایک ایسے گاؤں سے گزر ہوا جو اپنی چھتوں پر گرا پڑا تھا‘ تو اس نے کہا کہ اللہ اس (کے باشندوں) کو مرنے کے بعد کیونکر زندہ کرے گا؟ تب اللہ نے اس کی روح قبض کر لی (اور) سو برس تک (اس کو مردہ رکھا) پھر اس کو جلا اٹھایا اور پوچھا تم کتنا عرصہ (مرے) رہے؟ اس نے جواب دیا کہ ایک دن یا اس سے بھی کم۔ اللہ نے فرمایا: (نہیں!) بلکہ تم سو برس (مرے) رہے ہو‘ اور اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ (اتنی مدت میں مطلق سڑی) بسی

نہیں اور اپنے گدھے کو بھی دیکھو (جو مرا پڑا ہے) غرض (ان باتوں سے) یہ ہے کہ ہم تم کو لوگوں کے لیے (اپنی قدرت کی) نشانی بنائیں اور (ہاں گدھے کی) ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم ان کو کیونکر جوڑ دیتے ہیں اور ان پر (کس طرح) گوشت پوست چڑھا دیتے ہیں۔ پھر جب یہ واقعات اس کے مشاہدے میں آئے تو بول اٹھا کہ میں یقین کرتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

○ حکمت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ موت کے بعد دوبارہ اٹھایا جائے تاکہ ہر انسان کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر انسانوں کو پیدا کرنا عبث اور بے فائدہ ہے‘ جس میں کوئی حکمت نہیں کیونکہ ایسی زندگی کے اعتبار سے تو انسانوں اور حیوانوں میں کوئی فرق ہی نہیں رہ جاتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ﴿١١٥﴾ فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ ﴿١١٦﴾ ﴾ (المؤمنون: ٢٣/ ١١٥-١١٦)

"کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بے فائدہ پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے؟ تو اللہ جو سچا بادشاہ ہے اس کی شان سب سے اونچی ہے‘ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی عرش بزرگ کا مالک ہے۔"

اور فرمایا:

﴿ إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا لِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ ﴿١٥﴾ ﴾ (طه: ٢٠/ ١٥)

"قیامت یقیناً آنے والی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس (کے وقت) کو پوشیدہ رکھوں تاکہ ہر شخص جو کوشش کرے اس کا بدلہ پائے۔"

اور فرمایا:

﴿ وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللَّهُ مَن يَمُوتُ ۚ بَلَىٰ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٨﴾ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يَخْتَلِفُونَ فِيهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ كَانُوا كَاذِبِينَ ﴿٣٩﴾ إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَن نَّقُولَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿٤٠﴾ ﴾ (النحل: ١٦/ ٣٨-٤٠)

"اور یہ اللہ کی سخت قسمیں کھاتے ہیں کہ جو مر جاتا ہے اللہ اسے (قیامت کے دن قبر سے) نہیں اٹھائے گا‘ کیوں نہیں! یہ اس کے ذمے سچا وعدہ ہے جو اسے ضرور پورا کرنا ہے‘ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے‘ تاکہ جن باتوں میں یہ اختلاف کرتے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دے اور اس لیے کہ کافر جان لیں کہ وہ جھوٹے تھے۔ جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے لیے ہمارا صرف یہی قول ہوتا ہے کہ ہم اس سے کہتے ہیں: ہو جا! تو وہ ہو جاتی ہے۔"

اور فرمایا:

﴿ زَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَن لَّن يُبْعَثُوا ۚ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۚ وَذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴿٧﴾ ﴾

(التغابن: ٦٤/ ٧)

"جو لوگ کافر ہیں ان کا اعتقاد ہے کہ وہ (دوبارہ) ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے (اے نبی!) کہہ دو کیوں نہیں! میرے پروردگار کی قسم! تم ضرور اٹھائے جاؤ گے‘ پھر جو کام تم کرتے رہے ہو وہ تمھیں بتائے جائیں گے اور یہ (بات) اللہ کے لیے نہایت آسان ہے۔"

اگر منکرین بعث بعد الموت کے سامنے یہ دلائل بیان کر دیے جائیں اور پھر بھی وہ اپنے انکار پر اصرار کریں تو وہ جھگڑالو، ضدی اور ہٹ دھرم ہیں اور یہ ظالم عنقریب جان لیں گے کہ وہ کون سی جگہ لوٹ کر جاتے ہیں۔

عذابِ قبر اور اُس کی حقیقت

سوال کیا عذابِ قبر ثابت ہے؟

جواب عذابِ قبر قرآن و سنت کی واضح اور ظاہر نصوص اور مسلمانوں کے اجماع سے ثابت ہے اور یہی تینوں ادلۂ شرعیہ ہیں۔

سنت سے اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«تَعَوَّذُوا بِاللهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، فَقَالُوا: نَعُوذُ بِاللهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ»(صحيح مسلم، الجنة، باب عرض مقعد الميت من الجنة والنار . . . ح:٢٨٦٧)

”تم عذابِ قبر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرو، صحابہ نے کہا: ہم عذابِ قبر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔“

مسلمانوں کے اجماع سے دلیل: تمام مسلمان اپنی نماز میں یہ دعا کرتے ہیں: [أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَمِنْ عَـذَابِ الْـقَبْـرِ] ”میں اللہ تعالیٰ کی عذاب جہنم اور عذاب قبر سے پناہ چاہتا ہوں۔“ حتیٰ کہ عام مسلمان بھی جو نہ علماء میں سے ہیں اور نہ اہل اجماع میں سے وہ بھی اپنی نماز میں یہ دعا کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی واضح نصوص میں سے دلیل: آل فرعون کے بارے میں حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ٱلنَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا ۖ وَيَوْمَ تَقُومُ ٱلسَّاعَةُ أَدْخِلُوٓا۟ ءَالَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ ٱلْعَذَابِ ﴿٤٦﴾﴾ (الغافر: ٤٠/ ٤٦)

”(وہ) آتش جہنم ہے جس پر صبح و شام انھیں پیش کیا جاتا ہے اور جس روز قیامت برپا ہوگی (حکم ہوگا کہ) فرعون والوں کو سخت عذاب میں داخل کرو۔“

بے شک آتش جہنم کے سامنے انھیں اس لیے تو پیش نہیں کیا جاتا کہ وہ تفریح کریں اور خوشیاں منائیں، بلکہ انھیں اس لیے پیش کیا جاتا ہے تاکہ انہیں آگ کا عذاب پہنچے۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذِ ٱلظَّـٰلِمُونَ فِى غَمَرَٰتِ ٱلْمَوْتِ وَٱلْمَلَـٰٓئِكَةُ بَاسِطُوٓا۟ أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوٓا۟ أَنفُسَكُمُ ۖ﴾ (الأنعام: ٦/ ٩٣)

”اور کاش تم ان ظالم (یعنی مشرک) لوگوں کو اس وقت دیکھو جب وہ موت کی سختیوں میں (مبتلا) ہوں گے اور فرشتے (ان کی طرف عذاب کے لیے) اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے کہ نکالو اپنی جانیں۔“

اللہ اکبر! وہ اپنی جانوں کے بارے میں بہت فکر مند ہوں گے اور اس بات کو قطعاً پسند نہیں کریں گے کہ ان کے جسموں سے ان کی جانیں نکلیں اور پھر ان سے کہا جائے گا:

﴿ٱلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ ٱلْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَقُولُونَ عَلَى ٱللَّهِ غَيْرَ ٱلْحَقِّ وَكُنتُمْ عَنْ ءَايَـٰتِهِۦ

تَسْتَكْبِرُونَ ﴿٩٣﴾ (الأنعام: ٦/ ٩٣)

’’آج تم کو ذلت کے عذابوں کی سزا دی جائے گی اس لیے کہ تم اللہ پر ناحق باتیں گھڑتے تھے اور اس کی آیتوں سے سرکشی کرتے تھے۔‘‘

اَلْيَوْمَ کا ’’ال‘‘ عہد حضوری کے لیے ہے، یعنی آج کا وہ دن جوان کی وفات کا دن ہے۔ آج تم کو ذلت کے عذاب کی سزا دی جائے گی، اس لیے کہ تم اللہ پر ناحق باتیں گھڑتے تھے اور اس کی آیتوں سے سرکشی کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صریح سنت اور قرآن کی ظاہر نصوص اور مسلمانوں کے اجماع سے عذاب قبر ثابت ہے۔ قرآن مجید کا یہ ظاہر صریح ہی کی طرح ہے، کیونکہ مذکورہ بالا دونوں آیتوں سے عذاب قبر صراحت ہی سے معلوم ہو رہا ہے۔

سوال جب میت کو دفن نہ کیا جائے اور اسے درندے کھا جائیں یا ہوائیں اڑا دیں تو کیا اسے بھی عذاب قبر ہوگا؟

جواب جی ہاں! کیونکہ عذاب روح کو ہوتا ہے اور جسم تو تلف ہو کر فنا ہو جاتا ہے لیکن یہ ایک غیبی امر ہے، لہٰذا میں پورے وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ جسم کو عذاب نہیں ہوتا۔ ممکن ہے جسم کو بھی عذاب ہوتا ہو، خواہ وہ فنا ہو جائے یا جل جائے، کیونکہ انسان اخروی معاملات کو دنیوی حالات پر قیاس نہیں کر سکتا۔

سوال جو شخص عذاب قبر کا انکار کرے اور دلیل یہ دے کہ اگر قبر کو کھول کر دیکھا جائے تو وہ تنگ ہوئی ہوتی ہے نہ کشادہ اور نہ اس میں کوئی اور تبدیلی واقع ہوئی ہوتی ہے، تو اسے ہم کیا جواب دیں؟

جواب جو شخص عذاب قبر کا انکار کرے اور دلیل یہ دے کہ قبر کو کھول کر دیکھا جائے تو اس میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہوتی، اسے کئی طرح سے جواب دیا جا سکتا ہے، مثلاً:

○ عذاب قبر شرعی دلائل سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ نے آل فرعون کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿ٱلنَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا ۖ وَيَوْمَ تَقُومُ ٱلسَّاعَةُ أَدْخِلُوٓا۟ ءَالَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ ٱلْعَذَابِ ﴿٤٦﴾﴾ (الغافر: ٤٠/ ٤٦)

’’وہ آتش جہنم ہے جس پر صبح و شام انھیں پیش کیا جاتا ہے اور جس روز قیامت برپا ہوگی (تو حکم ہوگا کہ) آل فرعون کو سخت عذاب میں داخل کرو۔‘‘

اور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«فَلَوْلاَ أَنْ لاَ تَدَافَنُوا لَدَعَوْتُ اللهَ أَنْ يُسْمِعَكُمْ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ الَّذِي أَسْمَعُ مِنْهُ، ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهِ، فَقَالَ: تَعَوَّذُوا بِاللهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ، قَالُوا نَعُوذُ بِاللهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ، فَقَالَ: تَعَوَّذُوا بِاللهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، فَقَالُوا: نَعُوذُ بِاللهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ»(صحيح مسلم، الجنة، باب عرض مقعد الميت من الجنة والنار . . . ح: ٢٨٦٧)

’’چنانچہ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تم میتوں کو دفن نہیں کرو گے، تو میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا کہ وہ تمھیں بھی وہ عذاب قبر سنا دے جو میں سنتا ہوں، پھر آپ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: آگ کے عذاب سے اللہ کی پناہ طلب کرو، انہوں

(حاضرین) نے کہا کہ ہم آگ کے عذاب سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔ آپ نے پھر فرمایا: قبر کے عذاب سے اللہ کی پناہ طلب کرو۔ انہوں نے پھر کہا کہ ہم قبر کے عذاب سے اللہ کی پناہ طلب کرتے ہیں۔"

اور نبی ﷺ نے مومن میت کے بارے میں فرمایا:

«يُفْسَحُ لَهُ فِي قَبْرِهِ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب ماجاء في عذاب القبر، ح:١٣٧٤ وصحيح مسلم، الجنة، باب عرض مقعد الميت من الجنة والنار . . . ح:٢٨٧٠)

"اس کی قبر کو کشادہ کر دیا جاتا ہے۔"

علاوہ ازیں عذاب قبر کے بارے میں اور بھی بہت سی نصوص ہیں کہ وہم وگمان کے ساتھ ان نصوص کی مخالفت کرنا جائز نہیں بلکہ واجب یہ ہے کہ ان نصوص کی تصدیق کی جائے اور انہیں صحیح تسلیم کیا جائے۔

○ دراصل عذاب قبر کا تعلق روح سے ہے' یہ بدن پر محسوس ہونے والا معاملہ نہیں ہے۔ اگر بدن پر محسوس ہونے والا معاملہ ہوتا تو یہ ایمان بالغیب میں سے نہ ہوتا اور نہ اس پر ایمان لانے کا کوئی فائدہ ہوتا لیکن یہ تو امور غیب میں سے ہے اور پھر برزخ کے حالات کو احوال دنیا پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

○ قبر کے عذاب اور اس کی نعمتوں کو اور قبر کی کشادگی اور تنگی کو قبر میں مدفون ہی محسوس کر سکتا ہے دوسرا نہیں۔ انسان بسا اوقات خواب دیکھتا ہے' جب کہ وہ اپنے بستر پر سو رہا ہوتا ہے' کہ وہ کھڑا ہے یا جا رہا ہے یا آ رہا ہے یا کسی کو مار رہا ہے یا کسی سے مار کھا رہا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ وہ کسی بہت تنگ اور خوفناک جگہ میں ہے یا وہ کسی بہت ہی کشادہ اور سرسبز و شاداب جگہ پر ہے اور اس سوئے ہوئے انسان کے پاس جو شخص ہو اسے اس طرح کی کوئی چیز نظر آتی ہے نہ محسوس ہوتی ہے۔

اس طرح کے تمام امور میں انسان کے لیے واجب یہ ہے کہ وہ کہے کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا' ہم ان پر ایمان لاتے اور ان کی تصدیق کرتے ہیں۔

سوال کیا گناہ گار مومن سے عذاب قبر میں تخفیف کر دی جاتی ہے؟

جواب ہاں! تخفیف کر دی جاتی ہے کیونکہ نبی ﷺ جب دو قبروں کے پاس سے گزرے' تو آپ نے فرمایا تھا:

«إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ، ثُمَّ قَالَ: بَلٰى، أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ يَسْعٰى بِالنَّمِيمَةِ، وَأَمَّا الآخَرُ فَكَانَ لاَ يَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِهِ ثُمَّ أَخَذَ عُودًا رَطْبًا فَكَسَرَهُ بِاثْنَتَيْنِ ثُمَّ غَرَزَ كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا عَلٰى قَبْرٍ، ثُمَّ قَالَ: لَعَلَّهُ يُخَفَّفُ عَنْهُمَا مَا لَمْ يَيْبَسَا»(صحيح البخاري، الجنائز، باب عذاب القبر من الغيبة والبول، ح:١٣٧٨ وصحيح مسلم، الطهارة، باب الدليل على نجاسة البول ووجوب الاستبراء منه، ح:٢٩٢)

"ان دونوں کو عذاب دیا جا رہا ہے اور ان دونوں کو کسی بڑے گناہ کی وجہ سے عذاب نہیں دیا جا رہا' پھر فرمایا: کیوں نہیں! ان میں سے ایک چغلی کیا کرتا تھا اور دوسرا پیشاب (کے چھینٹوں) سے نہیں بچتا تھا' پھر آپ نے ایک تازہ شاخ پکڑی اور توڑ کر اس کے دو حصے کر دیے اور پھر ان میں سے ہر ایک کو دونوں کی قبر پر گاڑ دیا اور فرمایا: شاید ان سے اس وقت تک عذاب میں

تخفیف کر دی جائے جب تک یہ دونوں شاخیں خشک نہ ہوں۔''

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عذاب میں تخفیف کر دی جاتی ہے' لیکن سوال یہ ہے کہ ان دو شاخوں کا عذاب دیے جانے والے ان دو شخصوں کے عذاب میں تخفیف سے کیا تعلق ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ دونوں شاخوں نے خشک ہونے تک اللہ کی تسبیح بیان کرنا تھی اور تسبیح میت کے عذاب میں تخفیف کا سبب ہے' پھر اس علت سے' جو بہت بعید ہے' لوگوں نے یہ فرع بھی نکالی ہے کہ انسان کے لیے یہ مسنون ہے کہ وہ قبرستان میں جا کر تسبیح پڑھے تاکہ مردوں کے عذاب میں تخفیف ہو جائے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ سبب ضعیف ہے کیونکہ شاخوں نے تو تسبیح بیان کرنا ہی تھی' خواہ یہ تر ہوں یا خشک' کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ تُسَبِّحُ لَهُ ٱلسَّمَٰوَٰتُ ٱلسَّبۡعُ وَٱلۡأَرۡضُ وَمَن فِيهِنَّۚ وَإِن مِّن شَيۡءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمۡدِهِۦ وَلَٰكِن لَّا تَفۡقَهُونَ تَسۡبِيحَهُمۡۚ ﴾

(الإسراء: ١٧/ ٤٤)

''ساتوں آسمان اور زمین اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور جو (مخلوق) ان میں ہے اور (مخلوقات میں سے) کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔''

اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے کنکریوں کی تسبیح سنی گئی ہے' حالانکہ کنکریاں خشک ہیں' تو سوال یہ ہے کہ پھر شاخوں کے گاڑنے کا سبب کیا ہے؟ سبب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے یہ امید کی کہ وہ ان دو شاخوں کے خشک ہونے تک ان سے عذاب میں تخفیف کر دے گا' یعنی یہ مدت کوئی زیادہ طویل نہیں ہے اور آپ نے یہ ان دونوں کے فعلوں سے ڈرانے کے لیے کیا کیونکہ ان دونوں کے فعل بہت برے فعل تھے جیسا کہ روایت میں آیا ہے: ''ہاں! یہ بڑا گناہ ہے'' کہ ان میں سے ایک شخص پیشاب کے چھینٹوں سے نہیں بچتا تھا اور جب وہ پیشاب کے چھینٹوں سے نہیں بچتا تھا تو گویا طہارت کے بغیر نماز پڑھتا تھا اور دوسرا چغلی کرتا اور بندگان الٰہی کے درمیان فساد ڈالتا تھا۔ والعیاذ باللہ. اور وہ ان میں عداوت اور بغض پیدا کرتا تھا' تو یہ بہت برا فعل ہے' لہٰذا زیادہ مناسب یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ ایک وقتی شفاعت تھی اور مقصود امت کو ان برے کاموں کے انجام سے ڈرانا تھا' یہ بات نہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں دائمی شفاعت میں بخل سے کام لیا۔

بعض علماء نے' اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرمائے' جو یہ کہا ہے کہ مسنون ہے کہ انسان قبر پر کوئی تر شاخ یا درخت وغیرہ لگا دے تاکہ صاحب قبر کے عذاب میں تخفیف ہو تو یہ استنباط بہت بعید ہے اور حسب ذیل اسباب کے باعث یہ جائز نہیں ہے:

○ ہمارے سامنے یہ بات منکشف نہیں ہوتی کہ اس شخص کو عذاب ہو رہا ہے جب کہ نبی اکرم ﷺ کو ان دونوں کے عذاب کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔

○ ہم اگر ایسا کریں گے تو میت سے برا سلوک کریں گے کیونکہ ہم نے اس کے بارے میں یہ سوءِ ظن قائم کر لیا کہ اسے عذاب ہو رہا ہے۔ ہمیں کیا معلوم شائد وہ جنت کی نعمتوں سے شادکام ہو رہا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ مغفرت کے کثیر اسباب میں سے کسی سبب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی موت سے پہلے ہی اس کی مغفرت فرما دی ہو اور جب وہ فوت ہوا ہو تو معاف کیا جا چکا ہو اور وہ مستحقِ عذاب ہی نہ ہو۔

○ یہ استنباط ان سلف صالحین کے مذہب کے بھی خلاف ہے جو لوگوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی شریعت کو جاننے والے تھے، یعنی جب حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے یہ کام نہیں کیا تو ہم اسے کیوں کریں؟

○ اللہ تعالیٰ نے اس سے بہتر بات کی طرف ہماری رہنمائی فرما دی ہے، چنانچہ نبی اکرم ﷺ جب کسی میت کی تدفین سے فارغ ہوتے تو آپ وہاں کھڑے ہوتے اور ارشاد فرماتے:

«اِسْتَغْفِرُوا لأَخِيكُمْ وَاسْأَلُوا لَهُ بِالتَّثْبِيتِ فَإِنَّهُ الآنَ يُسْأَلُ»(سنن أبي داود، الجنائز، باب الاستغفار عند القبر للميت في وقت الانصراف، ح:٣٢٢١)

''اپنے بھائی کے لیے استغفار کرو اور اس کی ثابت قدمی کے لیے دعا کرو، کیونکہ اس سے اب سوال کیا جا رہا ہے۔''

شفاعت اور اس کی اقسام

سوال شفاعت سے کیا مراد ہے؟ اور اس کی کتنی اقسام ہیں؟

جواب لغوی طور پر شفاعت: ''شفع'' سے ماخوذ ہے اور ''وتر'' کی ضد ہے اور اس کے معنی طاق کو جفت، یعنی ایک کو دو اور تین کو چار بنا دینے کے ہیں۔ اصطلاح میں اس کے معنی جلب منفعت یا دفع مضرت کے لیے کسی دوسرے کو واسطہ بنا لینے کے ہیں، یعنی شافع (سفارش کرنے والا) مشفوع الیہ (جس سے سفارش کی گئی ہو) اور مشفوع لہ (جس کے لیے سفارش کی گئی ہو) کے درمیان مشفوع لہ کی جلب منفعت یا اس کی دفع مضرت کے لیے واسطہ ہوتا ہے۔ شفاعت کی درج ذیل دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: صحیح اور ثابت شدہ شفاعت: اس سے مراد وہ شفاعت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یا اس کے رسول ﷺ نے اپنی سنت میں ثابت فرمایا ہے۔ یہ شفاعت اہل توحید و اخلاص ہی کو نصیب ہوگی، کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جب یہ عرض کیا: یا رسول اللہ! لوگوں میں آپ کی شفاعت کی سب سے زیادہ سعادت حاصل کرنے والا کون ہوگا؟ تو آپ نے فرمایا:

«مَنْ قَالَ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ خَالِصًا مِنْ قَلْبِهِ»(صحيح البخاري، العلم، باب الحرص على الحديث، ح:٩٩)

''جس شخص نے اپنے دل کے اخلاص کے ساتھ ''لا اله الا الله'' کہا۔''

اس شفاعت کے لیے حسب ذیل تین شرطیں ہیں: ① اللہ تعالیٰ شافع سے راضی ہو۔ ② اللہ تعالیٰ مشفوع لہ سے بھی راضی ہو۔ ③ اللہ تعالیٰ نے شافع کو شفاعت کی اجازت عطا فرما دی ہو۔ ان شرائط کا اجمال کے ساتھ حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ میں ذکر ہے:

﴿ وَكَم مِّن مَّلَكٍ فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ لَا تُغْنِي شَفَٰعَتُهُمْ شَيْـًٔا إِلَّا مِنۢ بَعْدِ أَن يَأْذَنَ ٱللَّهُ لِمَن يَشَآءُ وَيَرْضَىٰٓ ﴿٢٦﴾ ﴾

(النجم: ٥٣/ ٢٦)

''اور آسمانوں میں بہت سے فرشتے ہیں جن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں دیتی مگر بعد ازاں کہ اللہ جس کے لیے چاہے اجازت بخشے اور (سفارش) پسند کرے۔''

اور ان آیات میں انھیں مفصل بیان کیا گیا ہے:

﴿ مَن ذَا ٱلَّذِی یَشۡفَعُ عِندَهُۥۤ إِلَّا بِإِذۡنِهِۦۚ ﴾ (البقرۃ: ۲/ ۲۵۵)

''کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر (کسی کی) سفارش کر سکے؟''

﴿ یَوۡمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ ٱلشَّفَـٰعَةُ إِلَّا مَنۡ أَذِنَ لَهُ ٱلرَّحۡمَـٰنُ وَرَضِیَ لَهُۥ قَوۡلًا ﴿١٠٩﴾ ﴾ (طٰہٰ: ۲۰/ ۱۰۹)

''اس روز (کسی کی) سفارش کچھ فائدہ نہ دے گی مگر اس شخص کی جسے اللہ اجازت دے گا اور اس کی بات کو پسند فرمائے گا۔''

﴿ وَلَا یَشۡفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ٱرۡتَضَىٰ ﴾ (الأنبیاء: ۲۱/ ۲۸)

''اور وہ (اس کے پاس کسی کی) سفارش نہیں کر سکتے مگر اس شخص کی جس سے اللہ خوش ہو۔''

بہر حال شفاعت کے لیے ان تین شرائط کا پایا جانا ضروری ہے اور پھر علمائے کرام رحمہم اللہ نے یہ بھی ذکر فرمایا ہے کہ قرآن وحدیث سے ثابت شدہ شفاعت کی درج ذیل دو قسمیں ہیں:

① **شفاعت عامہ:** اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں میں سے جن کو چاہے گا اور جن کے لیے چاہے گا، شفاعت کی اجازت عطا فرمادے گا۔ یہ شفاعت نبی اکرم ﷺ، دیگر انبیائے کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین کے لیے ثابت ہے اور یہ جہنم میں جانے والے مومن گناہ گاروں کے لیے شفاعت کریں گے کہ انھیں جہنم سے نکال دیا جائے۔

② **شفاعت خاصہ:** اس سے مراد وہ شفاعت ہے جو نبی ﷺ ہی کے ساتھ خاص ہوگی۔ اور قیامت کے دن آپ کی طرف سے جو شفاعت ہوگی وہ شفاعت عظمیٰ ہے اور یہ اس وقت ہوگی جب لوگوں کو ناقابل برداشت غم اور تکلیف ہوگی اور وہ کسی ایسی شخصیت کی تلاش میں ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی شفاعت کرے تاکہ انھیں حشر کے دن کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے نجات ملے۔ اس مقصد کے لیے وہ حضرت آدم، پھر نوح، پھر ابراہیم، پھر موسیٰ اور پھر عیسیٰ علیہم السلام کے پاس جائیں گے، مگر یہ تمام انبیائے کرام شفاعت سے انکار فرمادیں گے حتی کہ یہ سب لوگ نبی اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوکر شفاعت کے لیے عرض کریں گے، تو آپ اللہ تعالیٰ کے پاس شفاعت فرمائیں گے کہ وہ اپنے بندوں کو اس دن کی حشر سامانیوں سے نجات عطا فرمادے۔ تب اللہ تعالیٰ آپ کی دعا اور آپ کی شفاعت کو شرف قبولیت سے سرفراز فرمادے گا اور یہی وہ مقام محمود ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے آپ سے درج ذیل آیت کریمہ میں وعدہ فرمایا ہے:

﴿ وَمِنَ ٱلَّیۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهِۦ نَافِلَةً لَّكَ عَسَىٰۤ أَن یَبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُودًا ﴿٧٩﴾ ﴾ (الإسراء: ۱۷/ ۷۹)

''اور بعض حصۂ شب میں بھی آپ اس (قرآن) کے ساتھ تہجد کی نماز پڑھا کریں یہ (شب خیزی) تمھارے لیے زیادہ اجر و ثواب کا باعث ہے۔ قریب ہے کہ اللہ آپ کو مقام محمود میں کھڑا کرے گا۔''

رسول اللہ ﷺ کو جو شفاعت خاصہ حاصل ہوگی، اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ اہل جنت کی جنت میں داخل ہونے کے لیے شفاعت فرمائیں گے۔ اہل جنت جب پل صراط کو عبور کریں گے تو انھیں جنت اور جہنم کے درمیان ایک پل پر کھڑا کر دیا جائے گا اور ان سب کے دلوں کو ایک دوسرے کے بارے میں منفی جذبات سے بالکل پاک صاف کر دیا جائے گا، پھر انھیں جنت میں داخلے کی اجازت ملے گی اور نبی اکرم ﷺ کی شفاعت سے جنت کے دروازوں کو کھولا جائے گا۔

دوسری قسم: شفاعت باطلہ ہے جو کسی کے کچھ کام نہ آئے گی۔ اس سے مراد مشرکین کی مزعومہ شفاعت ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے معبود اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی شفاعت کریں گے۔ یہ شفاعت ان کے کچھ کام نہ آئے گی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿٤٨﴾﴾ (المدثر: ٧٤/ ٤٨)

''تو (اس حال میں) سفارش کرنے والوں کی سفارش ان کے حق میں کچھ فائدہ نہ دے گی۔''

کیونکہ اللہ تعالیٰ ان مشرکین کے شرک سے خوش نہیں ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ مشرکین کے لیے شفاعت کی کسی کو اجازت دے' کیونکہ وہ تو اپنے پسندیدہ بندوں کے لیے شفاعت کی اجازت عطا فرمائے گا اور وہ اپنے بندوں کے لیے کفر اور فساد کو پسند ہی نہیں فرماتا' لہٰذا مشرکین کا اپنے معبودوں سے یہ تعلق قائم کرنا کہ:

﴿هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (یونس: ١٠/ ١٨)

''یہ اللہ کے پاس ہماری سفارش کرنے والے ہیں۔''

یہ ایک باطل اور غیر نفع بخش تعلق ہے۔ یہ تعلق انھیں اللہ تعالیٰ سے اور بھی دور کر دے گا کیونکہ مشرکین بتوں کی عبادت کے لیے باطل وسیلے کے ذریعے سے اپنے بتوں سے شفاعت کی امید رکھتے ہیں اور یہ ان کی بے وقوفی ہے کہ تقرب الٰہی کے حصول کے لیے ایک ایسا وسیلہ اختیار کرتے ہیں جو انھیں اللہ تعالیٰ سے مزید دور کر دے گا۔

بچپن میں فوت ہونے والوں کا انجام

سوال مومنوں اور مشرکوں کے فوت ہو جانے والے چھوٹے بچوں کا کیا انجام ہوگا؟

جواب مومنوں کے چھوٹے بچے جنت میں جائیں گے کیونکہ وہ اپنے باپوں کے تابع ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ كُلُّ امْرِیءٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ﴿٢١﴾﴾ (الطور: ٥٢/ ٢١)

''اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی (راہ) ایمان میں ان کے پیچھے چلی' ہم ان کی اولاد کو بھی (جنت میں) ان کے درجے تک پہنچا دیں گے اور ان کے اعمال میں سے کچھ کم نہ کریں گے۔ ہر شخص اپنے اعمال کے عوض' جو اس نے کمائے' گروی ہے۔''

جہاں تک مومنوں کے سوا دیگر لوگوں کے بچوں کا تعلق ہے' یعنی ان بچوں کا جو غیر مسلم والدین سے پیدا ہوئے' تو ان کے بارے میں سب سے زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ ہم یہ کہیں: ''اللہ تعالیٰ ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ انہیں کس طرح کے عمل کرنے تھے۔'' دنیا کے احکام کے اعتبار سے تو وہ اپنے باپوں ہی کی طرح ہیں اور آخرت کے احکام کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ انہیں کس طرح کے اعمال کرنے تھے جیسا کہ نبی ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے۔① لہٰذا ہم ان کے بارے میں یہ کہیں گے کہ ان کے انجام کو اللہ ہی جانتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے آخرت کے معاملے کا ہم سے کوئی زیادہ تعلق بھی نہیں ہے' البتہ دنیا کے احکام کے

---

① صحیح البخاری' الجنائز' باب ما قیل فی أولاد المشرکین' حدیث: 1384

اعتبار سے ہمارا ان سے تعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ احکام دنیا کے اعتبار سے ان کے لیے بھی وہی حکم ہے جو مشرکین کے لیے ہے کہ مرنے کے بعد انھیں غسل دیا جائے گا نہ کفن دیا جائے گا اور نہ ان کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور نہ انھیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔ واللہ اعلم

جنت میں مَردوں کے لیے تو حُور عِین ہیں اور عورتوں کے لیے......؟

سوال مردوں کو تو جنت میں حورعین ملیں گی۔ سوال یہ ہے کہ عورتوں کو کیا ملے گا؟

جواب اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے لیے نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ۝٣١ نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ ۝٣٢ ﴾

(فصلت: ٤١/ ٣١۔٣٢)

''اور وہاں جس (نعمت) کو تمھارا جی چاہے گا تم کو ملے گی اور جو چیز طلب کرو گے تمھارے لیے موجود ہوگی (یہ) بخشنے والی مہربان ذات کی طرف سے مہمانی ہے۔''

اور فرمایا:

﴿ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ ٱلْأَنفُسُ وَتَلَذُّ ٱلْأَعْيُنُ ۖ وَأَنتُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ ۝٧١ ﴾ (الزخرف: ٤٣/ ٧١)

''اور وہاں جو جی چاہے اور آنکھوں کو اچھا لگے (موجود ہوگا) اور (اے اہل جنت!) تم اس میں ہمیشہ رہو گے۔''

اور معلوم ہے کہ انسانی نفوس سب سے زیادہ جس چیز کی خواہش رکھتے ہیں، وہ شادی ہے، لہٰذا جنت میں مردوں اور عورتوں سب کی اس خواہش کا انتظام ہوگا۔ جنت میں عورت کی شادی اللہ تعالیٰ اس کے دنیا کے شوہر سے کر دے گا، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ رَبَّنَا وَأَدْخِلْهُمْ جَنَّٰتِ عَدْنٍ ٱلَّتِي وَعَدتَّهُمْ وَمَن صَلَحَ مِنْ ءَابَآئِهِمْ وَأَزْوَٰجِهِمْ وَذُرِّيَّٰتِهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ ٱلْعَزِيزُ ٱلْحَكِيمُ ۝٨ ﴾ (الغافر: ٤٠/ ٨)

''اے ہمارے پروردگار! ان کو ہمیشہ رہنے کی بہشتوں میں داخل کر جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور جو ان کے باپ دادا اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے نیک ہوں ان کو بھی۔ بے شک تو غالب وحکمت والا ہے۔''

اور اگر کسی عورت نے دنیا میں شادی نہ کی ہوگی تو اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی کسی ایسے مرد سے شادی کر دے گا جس سے اسے آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب ہوگی۔

کیا جہنمیوں کی اکثریت عورتوں پر مشتمل ہوگی؟

سوال یہ جو بیان کیا جاتا ہے کہ جہنمیوں کی اکثریت عورتوں پر مشتمل ہوگی، تو کیا یہ صحیح ہے؟ اور ایسا کیوں ہوگا؟

جواب یہ صحیح ہے۔ نبیٔ اکرم ﷺ نے عورتوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

«يَامَعْشَرَ النِّسَاءِ! تَصَدَّقْنَ فَإِنِّي أُرِيتُكُنَّ أَكْثَرَ أَهْلِ النَّارِ»

’’اے عورتوں کے گروہ! صدقہ کیا کرو مجھے تم جہنم میں اکثریت میں دکھائی گئی ہو۔‘‘

سائل نے جس اشکال کا ذکر کیا ہے‘ نبی ﷺ کی خدمت میں بھی عورتوں نے یہی اشکال پیش کرتے ہوئے عرض کیا تھا: یا رسول اللہ! یہ کیوں؟ تو آپ نے جواب میں فرمایا تھا:

«تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ، وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ»(صحيح البخاري، الحيض، باب ترك الحائض الصوم، ح:٣٠٤ وصحيح مسلم، الإيمان، باب بيان نقصان الإيمان بنقص الطاعات . . .، ح:٧٩)

’’تم کثرت سے لعنت کرتی ہو اور شوہر کی نافرمانی کرتی ہو۔‘‘

نبی اکرم ﷺ نے عورتوں کی اکثریت کے جہنم میں جانے کے اسباب بیان فرما دیے ہیں اور وہ یہ کہ وہ کثرت سے سب وشتم‘ گالی گلوچ اور لعن طعن کرتی ہیں اور اپنے شوہر کی نافرمانی کرتی ہیں‘ پس ان اسباب کی وجہ سے ان کی اکثریت جہنم میں جائے گی۔

عقیدے کا علم اور اس میں پختگی حاصل کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے

سوال جو شخص عقیدے کا خصوصاً مسئلہ تقدیر کا اس لیے مطالعہ نہیں کرنا چاہتا کہ وہ پھسل نہ جائے تو اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب یہ مسئلہ بھی ان اہم مسائل کی طرح ہے جن کی انسان کو دین و دنیا میں ضرورت پیش آتی ہے‘ لہٰذا اس میں بھی گہرے تدبر سے کام لینا چاہیے اور اس کی معرفت حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنی چاہیے تاکہ حقیقت حال واضح ہو جائے‘ کیونکہ ان اہم امور و مسائل کے بارے میں انسان کو شک میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ ہاں وہ مسائل جن کے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے دین میں کوئی خلل نہ آئے اور ان کا معلوم ہونا دینی انحراف کا سبب بن جائے تو ان کی طرف توجہ نہ دینے اور ان سے اہم مسائل پر غور کرنے میں کوئی حرج نہیں‘ لیکن مسئلہ تقدیر ان اہم مسائل میں سے ہے جنھیں مکمل طور پر سمجھنا بندے کے لیے واجب ہے تاکہ اسے یقین حاصل ہو جائے۔ حقیقت میں اس مسئلے میں بحمد اللہ کوئی اشکال بھی نہیں ہے۔ بعض لوگوں کو عقیدے کے اسباق جو مشکل معلوم ہوتے ہیں تو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے‘ وہ اس لیے کہ وہ (کَیْفَ) ’’کیسے‘‘ کے پہلو کو (لِـمَ) ’’کیوں‘‘ کے پہلو پر ترجیح دیتے ہیں۔ انسان سے اپنے عمل کے بارے میں دو حروف استفہام (لِـمَ) اور (کَیْفَ) ہی کے ساتھ سوال کیا جائے گا‘ یعنی اس سے یہ پوچھا جائے گا کہ تو نے یہ عمل کیوں کیا؟ یہ سوال اخلاص کے بارے میں ہے‘ اسی طرح اس سے یہ بھی پوچھا جائے گا کہ تو نے یہ عمل کیسے کیا؟ یہ سوال اتباع رسول ﷺ کے بارے میں ہے۔ آج کل اکثر لوگ (کَیْفَ) کے جواب کی تحقیق میں مشغول ہیں اور وہ (لِـمَ) کے جواب کی تحقیق سے غافل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اخلاص کی جانب زیادہ توجہ مبذول نہیں کرتے جب کہ اتباع کے حوالہ سے وہ دقیق امور کی طرف زیادہ توجہ دینے کے خواہش مند ہوتے ہیں‘ لیکن وہ زیادہ اہم پہلو یعنی عقیدہ و اخلاص اور توحید کے پہلو سے غافل ہیں۔ اس لیے آپ دیکھیں گے کہ بعض لوگ دنیا کے مسائل میں سے تو بہت چھوٹے چھوٹے مسئلے کے بارے میں بھی پوچھیں گے‘ مگر ان کا دل دنیا ہی کے ساتھ حد درجہ وابستہ ہوگا اور وہ خرید و فروخت‘ سواری‘ رہائش اور لباس وغیرہ کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ سے حد درجہ غافل ہوں گے اور بعض لوگ تو اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے پجاری ہیں اور انھیں اس

بات کا شعور ہی نہیں ہوتا۔ بعض لوگ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں اور انھیں بھی اس بات کا شعور نہیں ہوتا۔ افسوس کہ ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ توحید اور عقیدے کے بارے میں صرف عوام ہی کوتاہی میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ بعض طالب علم بھی اس مسئلے میں کوتاہی کا ثبوت دیتے ہیں، حالانکہ یہ بہت اہم مسئلہ ہے جیسا کہ عمل، جسے شریعت نے عقیدے کے لیے محافظ و پناہ گاہ بنایا ہے، اس کے بغیر محض عقیدے پر زور دینا بھی غلط ہے۔ (اسی طرح صرف عمل پر زور دینا بھی غلط ہے۔) ہم ریڈیو سے سنتے اور اخبارات میں یہ پڑھتے رہتے ہیں کہ دین صرف خالص عقیدے ہی کا نام ہے، اس طرح کی عبارتیں اکثر میڈیا میں سننے میں آتی رہتی ہیں۔ حقیقت میں اس طرح کی باتوں سے ڈر ہے کہ کہیں اس دلیل کے ساتھ کہ عقیدہ تو درست ہے، بعض محرمات کو حلال قرار دیے جانے کا دروازہ نہ کھل جائے۔ بلکہ ان دو باتوں کو ہمہ وقت پیش نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ ''کیوں'' اور ''کیسے'' کا صحیح جواب دیا جا سکے۔

اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کے لیے علم توحید وعقیدہ کو پڑھنا واجب ہے تاکہ اسے اپنے الٰہ و معبود جَلَّ وَعَلَا کے بارے میں بصیرت ہو، اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات اور افعال کے بارے میں بصیرت حاصل ہو، اس کے کونی و شرعی احکام کے بارے میں بصیرت حاصل ہو اور اس کی حکمت اور اس کی شرع وخلق کے اسرار کے بارے میں بصیرت حاصل ہو، تاکہ نہ خود گمراہ ہو اور نہ کسی دوسرے کو گمراہ کر سکے۔ علم توحید کا، جس ذات پاک سے تعلق ہے وہ اس تعلق کی وجہ سے تمام علوم سے اشرف و افضل علم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل علم نے اسے ''الفقہ الاکبر'' کے نام سے موسوم قرار دیا ہے۔ اور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ» (صحيح البخاري، العلم، باب من يرد الله به خيرا، ح:٧١ وصحيح مسلم، الزكاة، باب النهي عن المسألة، ح:١٠٣٧)

''جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ خیر و بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین میں سمجھ بوجھ عطا فرما دیتا ہے۔''

علم دین میں داخل ہونے والی سب سے پہلی چیز توحید وعقیدے کا علم ہے۔ آدمی کے لیے یہ بھی واجب ہے کہ وہ اس بات کی بھی کوشش کرے کہ وہ اس علم کو کس طرح حاصل کر رہا ہے؟ کس مصدر و مأخذ سے اسے لے؟ سب سے پہلے اس علم کو حاصل کرے جو شکوک وشبہات سے پاک صاف ہو اور پھر اس علم پر وارد کیے جانے والے شبہات و بدعات کی طرف منتقل ہو تاکہ ان کی تردید کر سکے اور انھیں بیان کر سکے اور اس کا مصدر و مأخذ کتاب اللہ اور سنت رسول ہو، پھر کلام صحابہ کلام تابعین و تبع تابعین اور پھر ان علماء کے اقوال ہونے چاہییں، جو علم و امانت کے اعتبار سے قابل اعتماد ہیں، خصوصاً شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور آپ کے شاگرد امام ابن قیم رحمہما اللہ، ان دونوں پر، تمام مسلمانوں پر اور ان کے تمام اماموں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت و رضوان کی برکھا برسے۔

مسئلہ تقدیر کے بارے میں راہِ اعتدال

سوال امید ہے آپ مسئلہ تقدیر پر روشنی ڈالیں گے؟ کیا یہ بات درست ہے کہ اصل فعل تو تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے اور کیفیت کے بارے میں انسان کو اختیار دے دیا گیا ہے؟ اس کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اگر کسی بندے کی تقدیر میں یہ لکھ دیا ہے کہ وہ مسجد بنائے گا تو وہ یقینی طور پر ضرور مسجد بنائے گا لیکن مسجد بنانے کی کیفیت کا اختیار اس کی عقل پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اسی طرح اگر گناہ کا کوئی

کام کسی بندے کے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے، تو وہ یقینی طور پر اسے کرے گا لیکن اس کے کرنے کی کیفیت کو اس کی عقل پر موقوف چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی تقدیر میں جس اچھے یا برے عمل کا کرنا لکھ دیا گیا ہے، اس کی کیفیت کے بارے میں اسے اختیار دے دیا گیا ہے، تو کیا یہ بات صحیح ہے؟

جواب تقدیر کا یہ مسئلہ زمانہ قدیم ہی سے انسانوں کے مابین ایک نزاعی مسئلہ چلا آ رہا ہے اور اس میں لوگ تین قسموں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ دو قسم کے لوگ تو افراط و تفریط میں مبتلا ہیں اور ایک گروہ اعتدال پر قائم ہے۔

پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے عموم کو دیکھا اور انہوں نے بندے کے اختیار سے آنکھیں بند کر لیں اور کہا کہ انسان اپنے افعال کے سرانجام دینے کے لیے مجبور ہیں اور اسے قطعاً کوئی اختیار حاصل نہیں، لہٰذا انسان کا تیز آندھی وغیرہ کی وجہ سے چھت سے گرنا بالکل اسی طرح ہے جیسے اپنے اختیار سے وہ سیڑھی سے اترتا ہے۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بندے کو اپنے افعال کے کرنے یا نہ کرنے میں مکمل اختیار حاصل ہے۔ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا ہے اور یہ کہتے ہیں کہ بندہ اپنے افعال کو سرانجام دینے میں خود مختار ہے، اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا اس سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔

راہ اعتدال پر قائم لوگوں نے دونوں اسباب کو دیکھا، چنانچہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے عموم کو بھی دیکھا اور بندے کے اختیار کو بھی دیکھا اور کہا کہ بندے کا فعل اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور بندے کے اختیار سے وجود میں آتا ہے۔ انسان کے چھت سے تیز آندھی وغیرہ کی وجہ سے گرنے اور اپنے اختیار سے سیڑھی سے اترنے میں نمایاں فرق کو بھی جانتے ہیں۔ انسان کا پہلا فعل اس کے اپنے اختیار کے بغیر ہے، جبکہ اس کا دوسرا فعل اس کے اپنے اختیار سے ہے اور یہ دونوں فعل اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر کے ساتھ وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مملکت میں کوئی ایسا کام نہیں ہو سکتا جو وہ نہ چاہے، لیکن جو فعل بندے کے اختیار سے واقع ہو اسی کا وہ مکلّف ہے، لہٰذا جن اوامر یا نواہی کا اسے مکلّف قرار دیا گیا ہے وہ یہ کہتے ہوئے ان کی مخالفت نہیں کر سکتا کہ میری تقدیر میں یہی لکھا ہوا تھا کیونکہ احکام الٰہی کی مخالفت کا اقدام تو وہ اس وقت کرتا ہے جب اسے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تقدیر میں کیا لکھا ہے اور احکام الٰہی کی مخالفت کے سلسلے میں اس کا یہ اختیاری اقدام ہی اس کی دنیوی یا اخروی سزا کا سبب بنتا ہے۔ اسی لیے اگر کوئی جابر اسے مخالفت پر مجبور کرے تو اس پر حکم مخالفت ثابت نہیں ہوتا اور عذر کے ثابت ہونے کی وجہ سے اس صورت میں اسے سزا بھی نہیں دی جاتی۔

انسان کو جب یہ معلوم ہے کہ آگ سے بھاگ کر ایسی جگہ چلے جانا جہاں وہ اس سے محفوظ رہے اس کے اختیار سے ہے، اسی طرح خوب صورت، کشادہ اور پاکیزہ مکان میں سکونت اختیار کرنا بھی اس کے اپنے اختیار سے ہے، حالانکہ آگ سے بھاگنا اور اچھے مکان میں سکونت اختیار کرنا، دونوں ہی اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر سے واقع ہوتے ہیں اور اس کا اپنی جگہ برقرار رہنا تاکہ آگ اسے اپنی لپیٹ میں لے لے اور اچھے مکان میں رہائش اختیار کرنے میں دیر کر دینا، اس کی طرف سے کوتاہی اور ایسے موقع کو ضائع کر دینا ہو گا جس پر وہ ملامت کا مستحق ہو گا، تو اسے یہ بات کیوں معلوم نہیں کہ آتش جہنم سے نجات دینے والے اور دخول جنت کو واجب قرار دینے

والے اسباب کو ترک کر دینا بھی اس کی طرف سے ایسی ہی کوتاہی ہے جو مستحق ملامت ہے؟

یہ مثال کہ اللہ تعالیٰ نے جب کسی بندے کی تقدیر میں یہ لکھ دیا ہو کہ وہ مسجد بنائے گا' تو وہ یہ مسجد تو ضرور بنائے گا لیکن اس کے بنانے کی کیفیت کے بارے میں اختیار اس کی عقل کو دے دیا گیا ہے' تو یہ مثال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس مثال سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسجد بنانے کی کیفیت کا مستقل اختیار عقل کے پاس ہے اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہے اور مسجد بنانے کی مستقل سوچ کا تعلق تقدیر سے ہے اور عقل کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہے' جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مسجد بنانے کی اصل سوچ میں بھی بندے کے اختیار کا عمل دخل ہے کیونکہ اسے اس کام پر مجبور نہیں کیا گیا' جس طرح کہ اسے اپنے خاص گھر کے بنانے یا اس میں ترمیم کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا' لیکن اس سوچ کو بھی تو اللہ تعالیٰ ہی نے بندے کی تقدیر میں لکھا ہے اور بندے کو اس کا شعور نہیں ہوتا۔ کیونکہ جب تک کوئی چیز وقوع پذیر نہ ہو جائے بندے کو اس کے بارے میں یہ علم ہی نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تقدیر میں اسے لکھ رکھا ہے کیونکہ تقدیر تو قدرت کا ایک ایسا مخفی راز ہے جس کے بارے میں علم صرف اسی وقت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے سے یا وقوع حسی کی صورت میں اس کے بارے میں مطلع فرما دے۔ اسی طرح کسی چیز کو بنانے کی کیفیت بھی اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں لکھی ہوتی ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام اشیا کی تقدیر اجمالی طور پر بھی لکھی ہے اور تفصیلی طور پر بھی اور یہ ممکن ہی نہیں کہ بندہ کسی ایسی چیز کو اختیار کرے جو اللہ تعالیٰ کے ارادہ وتقدیر کے خلاف ہو' بلکہ بات یہ ہے کہ بندہ جب کسی چیز کو اختیار کرتا اور اسے سرانجام دیتا ہے تو پھر اسے یقینی طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قضا وقدر کے مطابق ہے' چنانچہ بندہ ان حسی اور ظاہری اسباب کے مطابق مختار ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اس فعل کے وقوع کے اسباب کے طور پر مقدر فرما رکھا ہے اور بندہ جب اس فعل کو سرانجام دیتا ہے تو اسے اس بات کا شعور بھی نہیں ہوتا کہ کسی نے اسے اس کام پر مجبور کیا ہے' لیکن جب وہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اسباب کے مطابق اس فعل کو سرانجام دیتا ہے تو ہمیں یقینی طور پر یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کے اجمال اور تفصیل دونوں اس کے مقدر میں لکھ رکھے ہیں۔

انسان کے گناہ کے بارے میں تم نے جو یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے جس گناہ کو اس کے مقدر میں لکھ رکھا ہے وہ یقینی طور پر اسے کرے گا' لیکن اس کے کرنے کی کیفیت اور اس کے لیے سعی وکاوش کو اس کی عقل پر چھوڑ دیا گیا ہے' تو اس مثال کے بارے میں بھی ہم وہی کہیں گے جو ہم نے مسجد بنانے کی مثال کے بارے میں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فعلِ معصیت کو اس کے مقدر میں لکھ دینا اس کے اختیار کے منافی نہیں ہے' کیونکہ اس فعل کو سرانجام دیتے وقت اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے مقدر میں کیا لکھ رکھا ہے؟ لہٰذا وہ اپنے اختیار سے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور اسے اس بات کا شعور بھی نہیں ہوتا کہ کوئی اسے اس پر مجبور کر رہا ہے' لیکن جب وہ اس فعل کا ارتکاب کرتا اور اسے سرانجام دے دیتا ہے تو ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس فعل کو اللہ تعالیٰ نے اس کے مقدر میں لکھ رکھا تھا' اس طرح گناہ کے کام کا ارتکاب کرنا اور اس کے لیے سعی وکاوش کرنا بھی بندے کے اختیار میں ہے اور یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ تقدیر کے مطابق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی نے تمام اشیاء کو اجمال وتفصیل کے ساتھ مقدر فرما رکھا ہے۔ اسی نے ان اشیا تک پہنچانے والے تمام اسباب کو بھی مقدر فرما رکھا ہے۔ اس کے افعال میں سے کوئی چیز بھی ان اسباب سے

دور رہ سکتی ہے نہ بندے کے اختیاری یا اضطرابی افعال ہی سے دور رہ سکتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ ٱللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِى ٱلسَّمَآءِ وَٱلْأَرْضِ ۗ إِنَّ ذَٰلِكَ فِى كِتَٰبٍ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى ٱللَّهِ يَسِيرٌ ﴿٧٠﴾ ﴾ (الحج: ٢٢/ ٧٠)

"کیا تم نہیں جانتے کہ جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے، اللہ اس کو جانتا ہے، یہ (سب کچھ) کتاب میں (لکھا ہوا) ہے بے شک یہ سب کچھ اللہ پر آسان ہے۔"

اور فرمایا:

﴿ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِىٍّ عَدُوًّا شَيَٰطِينَ ٱلْإِنسِ وَٱلْجِنِّ يُوحِى بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ ٱلْقَوْلِ غُرُورًا ۚ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ ۖ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ﴿١١٢﴾ ﴾ (الأنعام: ٦/ ١١٢)

"اور اسی طرح ہم نے شیطان (صفت) انسانوں اور جنوں کو ہر پیغمبر کا دشمن بنا دیا تھا، وہ دھوکا دینے کے لیے ایک دوسرے کے دل میں ملمع کی ہوئی باتیں ڈالتے رہتے تھے اور (اے نبی!) اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے، لہٰذا آپ ان کو اور جو کچھ یہ افترا کرتے ہیں اسے چھوڑ دیں۔"

اور فرمایا:

﴿ وَكَذَٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ ٱلْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَٰدِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا۟ عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ ۖ وَلَوْ شَآءَ ٱللَّهُ مَا فَعَلُوهُ ۖ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ﴿١٣٧﴾ ﴾

(الأنعام: ٦/ ١٣٧)

"اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے ان کے دیوتاؤں نے ان کی اولاد کا قتل پسندیدہ بنا رکھا ہے تاکہ وہ انھیں ہلاکت میں ڈال دیں اور ان کے لیے ان کا دین مشکوک بنا دیں اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے، لہٰذا آپ ان کو اور جو کچھ وہ جھوٹ باندھتے ہیں اسے چھوڑ دیں۔"

اور فرمایا:

﴿ وَلَوْ شَآءَ ٱللَّهُ مَا ٱقْتَتَلَ ٱلَّذِينَ مِنۢ بَعْدِهِم مِّنۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ ٱلْبَيِّنَٰتُ وَلَٰكِنِ ٱخْتَلَفُوا۟ فَمِنْهُم مَّنْ ءَامَنَ وَمِنْهُم مَّن كَفَرَ ۚ وَلَوْ شَآءَ ٱللَّهُ مَا ٱقْتَتَلُوا۟ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ﴿٢٥٣﴾ ﴾ (البقرة: ٢/ ٢٥٣)

"اور اگر اللہ چاہتا تو ان سے پچھلے لوگ اپنے پاس کھلی نشانیاں آنے کے بعد آپس میں نہ لڑتے لیکن انہوں نے اختلاف کیا، تو ان میں سے بعض تو ایمان لے آئے اور بعض کافر ہی رہے اور اگر اللہ چاہتا تو یہ لوگ باہم جنگ وقتال نہ کرتے، لیکن اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔"

انسان کو چاہیے کہ وہ ان امور کے بارے میں، جو موجب تشویش ہوں اور ان سے تقدیر کے ساتھ شریعت کی مخالفت کا احتمال ہو ان کے متعلق نہ تو خود اپنے دل میں کچھ سوچے اور نہ کسی کے ساتھ بحث کرے۔ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ انداز نہ تھا، حالانکہ وہ حقائق کو معلوم کرنے کے سب لوگوں سے زیادہ حریص تھے اور وہ تشنگی کو تسکین بخشنے اور غم و فکر کو دور کرنے والے چشمے سے سب سے

زیادہ قریب تھے۔ صحیح بخاری میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلاَّ وَقَدْ كُتِبَ مَقْعَدُهُ مِنَ الْجَنَّةِ أَوْ مِنَ النَّارِ، قُلْنَا: يَارَسُولَ اللهِ؟ أَفَلاَ نَتَّكِلُ - وفي رواية: أَفَلاَ نَتَّكِلُ عَلَى كِتَابَتِنَا وَنَدَعُ الْعَمَلَ؟ - قَالَ: لاَ، اِعْمَلُوا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ»(صحيح البخاري، التفسير، باب وقوله:﴿وأما من بخل واستغنى﴾، ح:٤٩٤٧، ٤٩٤٨)

’’تم میں سے ہر ایک کا جنت یا جہنم میں ٹھکانا لکھ دیا گیا ہے۔‘‘ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم بھروسا نہ کریں؟ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ کیا ہم اپنے لکھے ہوئے پر بھروسا نہ کرلیں اور عمل چھوڑ دیں؟ آپ نے فرمایا: ’’نہیں، تم عمل کرو، ہر ایک کے لیے (اس کے عمل کو) آسان کر دیا گیا ہے۔‘‘

اور ایک دوسری روایت میں ہے:

«اِعْمَلُوا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ، أَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ السَّعَادَةِ فَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ أَهْلِ السَّعَادَةِ وَأَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الشَّقَاءِ فَيُيَسَّرُ بِعَمَلِ أَهْلِ الشَّقَاوَةِ»(صحيح البخاري، التفسير، باب: ﴿فسنيسره للعسرى﴾، ح:٤٩٤٩ وصحيح مسلم، القدر، باب كيفية خلق الآدمي في بطن أمه، ح:٢٦٤٧ ومسند أحمد:١/١٢٩)

’’تم عمل کرو، ہر ایک کو اس عمل کی توفیق ملتی رہتی ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے، چنانچہ جو شخص اہل سعادت میں سے ہو، اس کے لیے سعادت کے عمل کو آسان کر دیا جاتا ہے اور جو شخص اہل شقاوت میں سے ہو، اس کے لیے شقاوت و بدبختی کے عمل کو آسان کر دیا جاتا ہے۔‘‘ پھر آپ نے ان آیات کریمہ کی تلاوت فرمائی:

﴿ فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَٱتَّقَىٰ ﴿٥﴾ وَصَدَّقَ بِٱلْحُسْنَىٰ ﴿٦﴾ فَسَنُيَسِّرُهُۥ لِلْيُسْرَىٰ ﴿٧﴾ وَأَمَّا مَنۢ بَخِلَ وَٱسْتَغْنَىٰ ﴿٨﴾ وَكَذَّبَ بِٱلْحُسْنَىٰ ﴿٩﴾ فَسَنُيَسِّرُهُۥ لِلْعُسْرَىٰ ﴿١٠﴾ ﴾ (الليل: ٩٢/٥-١٠)

’’تو جس نے (اللہ کے راستے میں مال) دیا اور پرہیز گاری کی اور نیک بات کو سچ جانا، یقیناً ہم اسے آسان طریقے (نیکی) کی توفیق دیں گے اور جس نے بخل کیا اور بے پروا بنا رہا اور نیک بات کو جھوٹ سمجھا، تو یقیناً ہم اسے مشکل راہ (بدی) کے لیے سہولت دیں گے۔‘‘

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ نے کتابِ تقدیر پر بھروسا کرتے ہوئے عمل ترک کر دینے سے منع فرمادیا ہے کیونکہ اس بات کے معلوم کرنے کا کوئی راستہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کتابِ تقدیر میں کیا لکھ رکھا ہے، اس لیے آپ ﷺ نے اللہ کے بندوں کو اپنی استطاعت اور مقدور کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا ہے اور آپ نے اس آیت کریمہ سے استدلال فرمایا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص نیک عمل کرے۔ اور ایمان لے آئے تو اسے آسان طریقے کی توفیق دے دی جاتی ہے۔ یہی نافع اور ثمر بار دوا ہے، اسی سے انسان عافیت و سعادت حاصل کر سکتا ہے کہ وہ ایمان پر مبنی عمل صالح کے لیے سرگرم عمل ہو جائے اور جب اسے دنیا و آخرت کی بھلائیوں کی آسانی کی توفیق مل جائے تو وہ اس پر خوشی اور مسرت کا اظہار کرے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل صالح کی توفیق عطا فرمائے، آسان طریقے کی طرف رہنمائی فرمائے، مشکل اور سخت طریقے سے بچائے اور دنیا و آخرت میں

ہمیں معاف فرما دے۔ اِنَّهٗ جَوَّادٌ کَرِیْمٌ۔

کیا دعا سے تقدیر بدل سکتی ہے؟

سوال انسان کی تخلیق سے قبل اس کی تقدیر میں جو لکھ دیا گیا ہے' کیا دعا سے اس میں تبدیلی ہوسکتی ہے؟

جواب اس میں کچھ شک نہیں کہ دعا کی تاثیر سے لکھی ہوئی تقدیر میں تبدیلی ہوسکتی ہے لیکن اس تبدیلی کے بارے میں بھی لکھ دیا گیا ہوتا ہے کہ یہ دعا کے سبب سے ہوگی' لہٰذا آپ یہ گمان نہ کریں کہ آپ جب دعا کرتے ہیں تو وہ لکھی ہوئی نہیں ہے بلکہ دعا بھی لکھی ہوئی ہے اور دعا سے حاصل ہونے والی چیزیں بھی لکھی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں جب کوئی شخص مریض پر آیات پڑھ کر اسے دم کرتا ہے تو اسے شفا نصیب ہوجاتی ہے۔ اس سریے کا قصہ مشہور ہے جسے نبی ﷺ نے بھیجا تھا' وہ ایک قوم کے پاس مہمان کی حیثیت سے مقیم ہوئے مگر ان لوگوں نے ان کی مہمان نوازی نہ کی۔ تقدیر کی بات کہ ان کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا تو انھوں نے پوچھا کیا کوئی دم کرنے والا ہے؟ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ شرط عائد کی کہ وہ اجرت لے کر دم کریں گے' چنانچہ انھوں نے بطور اجرت بکریوں کا ایک ریوڑ دے دیا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ایک شخص نے جا کر اسے سورۃ الفاتحہ پڑھ کر دم کردیا۔ دم کی برکت سے سانپ گزیدہ اس طرح اٹھ بیٹھا گویا کہ وہ اونٹ ہو جس کی رسی کو کھول دیا گیا ہو۔ سورۂ فاتحہ کے دم نے مریض کی شفایابی میں اپنا اثر دکھا دیا تھا۔

دعا میں بلاشبہ تاثیر ہے لیکن یہ تقدیر میں تبدیلی نہیں ہے بلکہ یہ تبدیلی تو دعا کے سبب لکھی ہوئی ہوتی ہے۔ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے ہاں مقدر ہے' اسی طرح تمام اسباب کی ان کے مسببات میں اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے تاثیر ہے' پس اسباب بھی لکھے ہوئے ہیں اور مسببات بھی لکھے ہوئے ہیں۔

سوال کیا رزق اور شادی کے بارے میں بھی لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے؟

جواب جب سے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا فرمایا ہے' اس وقت سے لے کر قیامت تک ہونے والی ہر چیز لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وتَعَالٰى الْقَلَمَ ثُمَّ قَالَ لَهُ: اُكْتُبْ قَالَ: وَمَا أَكْتُبُ قَالَ: الْقَدَرَ، قَالَ فَكَتَبَ مَا يَكُونُ وَمَا هُوَ كَائِنٌ إِلَى أَنْ تَقُومَ السَّاعَةُ»(مسند أحمد: ٥/ ٣١٧ وسنن أبي داود، السنة، باب في القدر، ح: ٤٧٠٠ وجامع الترمذي، القدر، باب اعظام أمر الإيمان بالقدر، ح: ٢١٥٥)

''اللہ تبارک وتعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا' پھر اس سے فرمایا کہ لکھو۔ قلم نے کہا: میں کیا لکھوں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''تقدیر لکھو۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو قلم نے جو کچھ ہوگا اور جو قیامت تک ہونے والا ہے سب کچھ لکھ دیا۔''

اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

«فَجَرٰى فِي تِلْكَ السَّاعَةِ بِمَا هُوَ كَائِنٌ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ»(مسند أحمد: ٥/ ٣١٧)

''قیامت کے دن تک جو کچھ ہونے والا تھا' اسے لکھنے کے لیے قلم اسی وقت چل پڑی۔''

نبیٔ کریم ﷺ سے یہ بھی ثابت ہے کہ جنین پر شکم مادر میں جب چار ماہ گزر جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف ایک فرشتے کو بھیجتا ہے جو اس میں روح پھونکتا اور اس کا رزق، اجل، عمل اور اس کا بدبخت یا سعادت مند ہونا لکھ دیتا ہے۔① رزق بھی اسباب کے ساتھ مقدر ہے، اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ اس بات کا تعلق بھی اسباب ہی کے ساتھ ہے کہ انسان طلب رزق کے لیے کام کرے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ ٱلَّذِى جَعَلَ لَكُمُ ٱلْأَرْضَ ذَلُولًا فَٱمْشُوا۟ فِى مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا۟ مِن رِّزْقِهِۦ ۖ وَإِلَيْهِ ٱلنُّشُورُ ﴿١٥﴾﴾ (الملك: ٦٧/ ١٥)

''وہی تو ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو نرم کیا، پس اس کی راہوں میں چلو پھرو اور اللہ کا (دیا ہوا) رزق کھاؤ اور (تم کو) اسی کے پاس (قبروں سے) نکل کر جانا ہے۔''

اسباب رزق میں سے صلہ رحمی بھی ہے، یعنی والدین کے ساتھ نیکی اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی۔ کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُبْسَطَ لَهُ فِي رِزْقِهِ وَيُنْسَأَ لَهُ فِي أَثَرِهِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ» (صحيح البخاري، الأدب، باب من بسط له في الرّزق لصلة الرّحم، ح: ٥٩٨٦)

''جو شخص اس بات کو پسند کرے کہ اس کے رزق میں کشادگی اور اس کی عمر میں درازی ہو تو اسے صلہ رحمی سے کام لینا چاہیے۔''

اسی طرح اسباب رزق میں سے اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنا بھی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَن يَتَّقِ ٱللَّهَ يَجْعَل لَّهُۥ مَخْرَجًا ﴿٢﴾ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ (الطلاق: ٦٥/ ٢-٣)

''اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا تو وہ اس کے لیے (رنج و محن سے) نکلنے کی صورت پیدا کر دے گا اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا، جہاں سے (وہم و) گمان بھی نہ ہو۔''

لیکن تم یہ نہ کہو کہ رزق تو لکھا ہوا اور مقرر کیا ہوا ہے لہٰذا میں اسباب رزق اختیار نہیں کروں گا کیونکہ یہ عجز و درماندگی ہے، جب کہ عقل مندی اور احتیاط یہ ہے کہ آپ رزق حاصل کرنے کے لیے سعی و کاوش کریں اور ان باتوں کے حصول کے لیے کوشش کریں جو دین و دنیا میں آپ کے لیے نفع بخش ہوں۔ نبیٔ اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ، وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ، وَالْعَاجِزُ مَنْ أَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَنَّى عَلَى اللهِ» (جامع الترمذي، صفة القيامة، باب حديث: "الكيس من دان نفسه . . ."، ح: ٢٤٥٩ وسنن ابن ماجه، الزهد، باب ذكر الموت والاستعداد له، ح: ٤٢٦٠)

''عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور موت کے بعد کے لیے عمل کرے اور عاجز وہ ہے جو اپنے نفس کو خواہشات کے پیچھے لگا دے اور اللہ تعالیٰ سے امیدیں باندھ رکھے۔''

جس طرح رزق اسباب کے ساتھ مکتوب اور مقدر ہے، اسی طرح شادی بھی مکتوب اور مقدر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی میں سے ہر ایک کے لیے یہ لکھ دیا ہے کہ فلاں کی فلاں سے شادی ہوگی اور اللہ تعالیٰ سے تو زمین اور آسمان کی کوئی چیز بھی مخفی نہیں ہے۔

---

① صحیح البخاری، بدء الخلق، باب ذکر الملائکة صلوات الله علیهم، حدیث: 3208

مصیبت کی حالت میں لوگوں کے مختلف مراتب

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو کسی مصیبت کے نازل ہونے کی وجہ سے ناراضی کا اظہار کرے؟

جواب مصیبت کی حالت میں لوگ چار مراتب پر ہوتے ہیں:

پہلا مرتبہ: ناراضی کا ہے اور اس کی حسب ذیل اقسام ہیں:

- ○ انسان دل سے ناراضی کا اظہار کرے، یعنی اپنے رب تعالیٰ سے ناراض ہو اور اللہ تعالیٰ نے اس کے مقدر میں جو لکھ رکھا ہے، اس کی وجہ سے وہ اپنے رب تعالیٰ پر غصے ہو، تو یہ حرام ہے، اور بسا اوقات یہ ناراضی کفر تک بھی پہنچا دیتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَعْبُدُ ٱللَّهَ عَلَىٰ حَرْفٍۖ فَإِنْ أَصَابَهُۥ خَيْرٌ ٱطْمَأَنَّ بِهِۦۖ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ ٱنقَلَبَ عَلَىٰ وَجْهِهِۦ خَسِرَ ٱلدُّنْيَا وَٱلْـَٔاخِرَةَۚ ﴾ (الحج: ٢٢/ ١١)

''اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے کہ وہ کنارے (شک) پر اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ اگر اس کو کوئی (دنیاوی) فائدہ پہنچے تو اس کے سبب مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر کوئی آفت آ پڑے تو منہ کے بل لوٹ جاتا ہے (پھر کافر ہو جاتا ہے۔) اس نے دنیا میں بھی نقصان اٹھایا اور آخرت میں بھی، یہی تو نقصان صریح ہے۔''

- ○ ناراضی کا اظہار زبان سے ہو اور وہ زبان سے تباہی و بربادی کو پکارے اور اس طرح کی چیزیں اختیار کرے، تو یہ بھی حرام ہے۔
- ○ ناراضی کا اظہار اعضا سے کرے، مثلاً: یہ کہ رخساروں پر طمانچے مارے، گریبان پھاڑے اور بال نوچے۔ یہ تمام کام بھی حرام اور واجب صبر کے منافی ہیں۔

دوسرا مرتبہ: صبر ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

الصَّبْرُ مِثْلُ اسْمِهِ مُرٌّ مَذَاقَتُهُ   لٰكِنْ عَوَاقِبُهُ أَحْلٰى مِنَ الْعَسَلِ

''اگرچہ صبر کا ذائقہ اپنے نام کی طرح کڑوا ہے لیکن اس کے نتائج شہد سے بھی زیادہ شیریں ہیں۔''

انسان دیکھتا ہے کہ یہ چیز اس کے لیے بہت ثقیل ہے مگر وہ اسے برداشت کر لیتا ہے۔ گو وہ اس کے وقوع پذیر ہونے کو پسند نہیں کرتا، لیکن اس کا ایمان ناراض ہونے سے اسے بچا لیتا ہے۔ مصیبت کا وقوع اور عدم اس کے نزدیک برابر نہیں ہیں۔ صبر کرنا واجب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صبر کا حکم دیتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ وَٱصْبِرُوٓاْۚ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ ﴿٤٦﴾ ﴾ (الأنفال: ٨/ ٤٦)

''اور صبر سے کام لو کہ اللہ صبر کرنے والوں کا مددگار ہے۔''

تیسرا مرتبہ: رضا کا ہے کہ انسان مصیبت پر راضی ہو جائے حتیٰ کہ اس کے نزدیک اس کا وجود اور عدم برابر ہوں۔ مصیبت کا وجود اس پر گراں گزرے نہ وہ اس کے لیے بھاری بوجھ بنے۔ یہ بات مستحب ہے اور راجح قول کے مطابق یہ واجب نہیں ہے۔ اس مرتبے اور اس سے پہلے مرتبے میں فرق ظاہر ہے کیونکہ اس کے نزدیک مصیبت کا وجود اور عدم رضا کے اعتبار سے برابر ہیں جب کہ پہلے مرتبے میں مصیبت دشوار تھی مگر اس پر صبر کیا جا رہا تھا۔

چوتھا مرتبہ: شکر کا ہے، جو تمام مراتب سے اعلیٰ مرتبہ ہے، یعنی انسان مصیبت کے پہنچنے پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ یہ مصیبت اس کے گناہوں کا کفارہ اور اس کی نیکیوں میں اضافے کا موجب ہوگی۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَا مِنْ مُصِيبَةٍ تُصِيبُ الْمُسلِمَ إِلاَّ كَفَّرَ اللهُ بِهَا عَنْهُ حَتَّى الشَّوْكَةِ يُشَاكُهَا»(صحيح البخاري، المرض، باب ماجاء في كفارة المرض ... ح:٥٦٤٠، وصحيح مسلم، البر والصلة، باب ثواب المؤمن فيما يصيبه من مرض، ح:٢٥٧٢)

''مسلمان کو جو مصیبت بھی پہنچتی ہے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے حتی کہ اسے چبھنے والے کانٹے کو بھی (اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔'')

کوئی بیماری متعدی ہے نہ بدشگونی لینا جائز ہے

سوال شیخ محترم! امید ہے آپ نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان کی وضاحت فرمائیں گے:

«لاَ عَدْوٰى، وَلاَ طِيَرَةَ، وَلاَ هَامَّـةَ، وَلاَ صَفَرَ»(صحيح البخاري، الطب، باب الجذام، ح:٥٧٠٧ وصحيح مسلم، السلام، باب لا عدوى ولا طيرة ولا هامة، ح:٢٢٢٠)

''نہ کوئی بیماری متعدی ہے، نہ کوئی بدشگونی ہے، نہ الو کا بولنا ہے اور نہ ماہ صفر کی تبدیلی ہے۔''

اس حدیث میں کس قسم کی نفی کی گئی ہے؟ اس میں اور اس حدیث میں کس طرح تطبیق ہوگی:

«فِرَّ مِنَ الْمَجْذُومِ فِرَارَكَ مِنَ الأَسَدِ»(صحيح البخاري، الطب، باب الجذام، ح:٥٧٠٧ ومسند أحمد: ٢/ ٤٤٣ واللفظ له)

''جذام کے مریض سے اس طرح بھاگو جس طرح تم شیر سے بھاگتے ہو۔''

جواب ''عدویٰ'' مریض سے تندرست آدمی کی طرف مرض کے منتقل ہونے کو کہتے ہیں اور جس طرح حسی امراض متعدی ہوتے ہیں اسی طرح روحانی اور اخلاقی بیماریاں بھی متعدی ہو سکتی ہیں۔ اسی لیے نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''برا ساتھی بھٹی دھونکنے والے کی طرح ہے کہ یا تو وہ تمہارے کپڑے جلا دے گا یا تم اس سے بدبو محسوس کرو گے۔''① لہٰذا نبی ﷺ نے جو لفظ عدویٰ استعمال فرمایا ہے تو یہ حسی اور اخلاقی دونوں بیماریوں کو شامل ہے۔

طِیَرَہ کے معنی کسی دیکھی جانے والی یا سنی جانے والی یا معلوم ہونے والی چیز سے بدشگونی پکڑنا ہے۔

هَامّه کے درج ذیل دو معنی بیان کیے گئے ہیں:

① اس سے مراد ایسی بیماری ہے جو مریض کو لاحق ہوتی ہے اور اس سے دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ اس تفسیر کے مطابق اس کا عدویٰ پر عطف 'عَطفُ الْخَاصِ عَلَى الْعَامِ' کے قبیل سے ہوگا۔

② ھامّہ ایک مشہور پرندے (اُلو) کا نام ہے۔ عربوں کا گمان تھا کہ جب کوئی شخص قتل ہو جائے تو اس کا انتقام لینے تک یہ پرندہ اس

---

① صحیح البخاری، الذبائح، باب المسك، حدیث: 5534

کے گھر والوں کے پاس آ کر ان کے سر پر بولتا رہتا ہے۔ اور بعض عربوں کا عقیدہ یہ تھا کہ الو کی صورت میں یہ درحقیقت مقتول کی روح ہوتی ہے اور یہ پرندہ الو سے ملتا جلتا ہے یا الو ہی ہے اور جب تک انتقام نہ لیں یہ بول بول کر مقتول کے گھر والوں کو ایذا پہنچاتا رہتا ہے۔ عرب اس کے ساتھ بدشگونی پکڑتے تھے۔ جب یہ کسی کے گھر پر آ کر بیٹھتا اور بولتا تو وہ یہ کہتا کہ یہ اس لیے بولتا ہے کہ وہ مر جائے، اس کے بولنے کو لوگ موت کے قریب آنے کی علامت سمجھتے تھے، حالانکہ یہ ایک بالکل باطل بات ہے۔

صفر کے بھی درج ذیل کئی مفہوم بیان کیے گئے ہیں:

☐ اس سے مراد صفر کا مشہور مہینہ ہے۔ عرب اس مہینے سے بدشگونی پکڑا کرتے تھے۔

☐ یہ پیٹ کی ایک بیماری ہے جو اونٹ کو لاحق ہوتی ہے اور ایک اونٹ سے دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتی ہے لہٰذا عدوی پر اس کا عطف "عَطْفُ الْخَاصِ عَلَى الْعَامِ" کے قبیل سے ہے۔

☐ "صفر" ماہ صفر ہی ہے اور اس سے مراد امن کے کسی مہینے کو ہٹا کر آگے پیچھے کر دینا ہے، جس سے کافر گمراہی میں پڑے رہتے تھے۔ وہ ماہ محرم کی حرمت کو صفر تک مؤخر کر دیتے تھے اور ایک سال اسے حلال اور دوسرے سال حرام قرار دے دیا کرتے تھے۔

ان میں سب سے زیادہ راجح مفہوم یہی ہے کہ اس سے مراد ماہ صفر ہے کیونکہ لوگ زمانہ جاہلیت میں ماہ صفر سے بدشگونی لیا کرتے تھے، حالانکہ تاثیر میں زمانوں کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں صفر بھی دیگر زمانوں ہی کی طرح ہے کہ اس میں خیر بھی مقدر ہے اور شر بھی۔

بعض لوگوں کا معمول ہے کہ وہ جب کسی خاص عمل سے صفر کی پچیس تاریخ کو فارغ ہو جائیں تو وہ اس تاریخ کو اپنے پاس اس طرح لکھ لیتے ہیں: "یہ کام صفر خیر کی پچیس تاریخ کو مکمل ہوا تھا۔" یہ بدعت کے بدعت کے ساتھ اور جہالت کے جہالت کے ساتھ علاج کے باب سے ہے، ورنہ صفر نہ خیر کا مہینہ ہے اور نہ شر کا۔ اسی لیے بعض سلف نے اس بات کی بھی نفی کی ہے کہ الو کی آواز سن کر یہ کہا جائے: خَيْرًا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ "اللہ تعالیٰ نے چاہا تو خیر ہوگی" یعنی اس موقع پر کسی خیر و شر کا اظہار نہ کیا جائے، کیونکہ الو بھی اسی طرح بولتا ہے جس طرح دیگر پرندے اپنی اپنی بولیاں بولتے ہیں۔

یہ چار چیزیں جن کی رسول اللہ ﷺ نے نفی فرمائی ہے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک پر توکل اور صدقِ عزیمت کے وجوب پر دلالت کرتی ہیں اور اس بات کی طرف رہنمائی کرتی ہیں کہ اس طرح کے امور کے سامنے مسلمان کو کمزوری کا ثبوت نہیں دینا چاہیے۔

اگر کوئی مسلمان اپنے دل میں ان باتوں کا خیال لائے، تو وہ دو حالتوں سے خالی نہیں ہوگا:

① وہ ان باتوں پر لبیک کہتے ہوئے کام کرے گا یا نہیں کرے گا اور اس صورت میں اس نے اپنے افعال کو ایک ایسی چیز کے ساتھ معلق کر دیا جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

② وہ ان باتوں پر لبیک کہتے ہوئے کوئی اقدام کرے نہ ان کی پروا کرے، البتہ اس کے دل میں ان کی وجہ سے کچھ غم و فکر ضرور ہو، اگرچہ یہ صورت پہلی کی نسبت ہلکی ہے، لیکن مسلمان کو چاہیے کہ وہ ان امور کے کسی داعیہ پر مطلقاً کوئی توجہ نہ دے اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہی پر اعتماد اور بھروسا رکھے۔

کچھ لوگ فال نکالنے کے لیے قرآن مجید کھولتے ہیں اور وہ یہ دیکھتے ہیں کہ نظر اگر جہنم کے لفظ پر پڑے تو کہتے ہیں یہ فال اچھی نہیں ہے اور اگر جنت کے لفظ پر نظر پڑے تو کہتے ہیں کہ یہ فال اچھی ہے جب کہ حقیقت میں یہ عمل زمانہ جاہلیت کے تیروں کے ساتھ قسمت آزمائی کے عمل ہی کی طرح ہے۔

ان چاروں امور کی نفی سے مراد ان کے وجود کی نفی نہیں ہے' کیونکہ یہ تو موجود ہیں' لہٰذا اس سے مراد ان کی تاثیر کی نفی ہے' کیونکہ مؤثر تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ان میں سے جو سبب معلوم ہو وہ صحیح سبب ہے اور جو سبب موہوم ہو وہ باطل سبب ہے اور تاثیر کی جو نفی ہے وہ اس کی ذات اور سببیت کی تاثیر کی نفی ہے' البتہ عدویٰ (مرض کا متعدی ہونا) موجود ہے اور اس کی موجودگی کی دلیل نبی ﷺ کا یہ فرمان ہے:

«لَا يُورِدُ مُمْرِضٌ عَلٰى مُصِحٍّ»(صحيح البخاري، الطب، باب لا هامة، ح:٥٧٧١ وصحيح مسلم، السلام، باب لا عدوى ولا طيرة ... ح:٢٢٢١ واللفظ له)

"یعنی بیمار اونٹوں والا اپنے اونٹوں کو تندرست اونٹوں والے کے پاس نہ لے جائے۔" تاکہ متعدی بیماری ایک سے دوسرے اونٹوں کی طرف منتقل نہ ہو۔ نبی ﷺ نے جو یہ فرمایا ہے:

«فِرَّ مِنَ الْمَجْذُومِ فِرَارَكَ مِنَ الْأَسَدِ»(صحيح البخاري، الطب، باب الجذام، ح:٥٧٠٧ ومسند أحمد:٢/ ٤٤٣ واللفظ له)

"جذام کی بیماری میں مبتلا مریض سے اس طرح بھاگو جس طرح شیر سے بھاگتے ہو۔"

جذام ایک خبیث بیماری ہے جو تیزی سے پھیلتی ہے اور مریض کو ہلاک کر دیتی ہے حتی کہ کہا گیا ہے کہ یہ مرض بھی طاعون ہی ہے' لہٰذا فرار کا حکم اس لیے دیا گیا تا کہ بیماری آگے نہ پھیلے۔ اس حدیث میں بھی بیماری کے متعدی ہونے کا اثبات مؤثر ہونے کی وجہ سے ہے' لیکن اس کی تاثیر کوئی حتمی امر نہیں ہے کہ یہی علت فاعلہ ہے۔ لیکن نبی اکرم ﷺ نے مجذوم سے بھاگنے اور بیمار اونٹوں کو تندرست اونٹوں کے پاس نہ لانے کا جو حکم دیا ہے' یہ اسباب سے اجتناب کے باب سے ہے' اسباب کی ذاتی تاثیر کے قبیل سے نہیں ہے' جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ (البقرة:٢/ ١٩٥)

"اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔"

لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نبی ﷺ نے عدویٰ کی تاثیر کا انکار فرمایا ہے کیونکہ امر واقع اور دیگر احادیث سے یہ بات باطل قرار پاتی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا تھا: لَا عَدْوٰی "کوئی بیماری متعدی نہیں ہے" تو ایک شخص نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! اونٹ ریگستان میں ہرنوں کی طرح ہوتے ہیں' لیکن جب ان کے پاس کوئی خارش زدہ اونٹ آتا ہے' تو انھیں بھی خارش لاحق ہو جاتی ہے۔ تب نبی ﷺ نے فرمایا:

«فَمَنْ أَعْدَى الْأَوَّلَ»(صحيح البخاري، الطب، باب لا صفر، وهو داء يأخذ البطن، ح:٥٧١٧)

’’پہلے اونٹ کو خارش کس نے لگائی تھی؟‘‘

اس کا جواب یہ ہے کہ نبی ﷺ نے یہ فرما کر: [فَمَنْ أَعْدَى الْأَوَّلَ] ’’پہلے اونٹ کو خارش کس نے لگائی تھی؟‘‘ اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ مریض اونٹوں سے تندرست اونٹوں کی طرف مرض اللہ کی تدبیر کے ساتھ منتقل ہوا ہے۔ پہلے اونٹ پر بیماری متعدی صورت سے بغیر اللہ عزوجل کی طرف سے نازل ہوئی تھی اور ایک چیز کا کبھی کوئی سبب معلوم ہوتا ہے اور کبھی سبب معلوم نہیں ہوتا جیسا کہ پہلے اونٹ کی خارش کا سوائے تقدیر الٰہی کے اور کوئی سبب معلوم نہیں ہے جب کہ اس کے بعد والے اونٹ کی خارش کا سبب معلوم ہے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اس (دوسرے اونٹ) کو خارش لاحق نہ ہوتی۔ بسا اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اونٹوں کو خارش لاحق ہوتی ہے اور پھر وہ ختم بھی ہو جاتی ہے اور اس سے اونٹ مرتے نہیں۔ اسی طرح طاعون اور ہیضے جیسے بعض متعدی امراض ہیں جو ایک گھر میں داخل ہو جاتے ہیں، بعض کو تو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور وہ فوت ہو جاتے ہیں اور بعض دیگر افراد ان سے محفوظ رہتے ہیں انھیں کچھ نہیں ہوتا، چنانچہ انسان کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ ہی پر اعتماد اور بھروسا رکھنا چاہیے۔ حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک مجذوم شخص حاضر ہوا، آپ نے اس کے ہاتھ کو پکڑا اور فرمایا: ’’کھاؤ۔‘‘① یعنی اس کھانے کو کھاؤ جسے رسول اللہ ﷺ تناول فرما رہے تھے، اس لیے کہ نبی ﷺ کا اللہ تعالیٰ کی ذات پاک پر توکل بہت قوی تھا اور یہ توکل متعدی سبب کا مقابلہ کر رہا تھا۔

ان احادیث میں تطبیق کی سب سے بہتر صورت یہی ہے جو ہم نے بیان کی ہے۔ بعض نے اس سلسلہ میں نسخ کا بھی دعویٰ کیا ہے، لیکن یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے، کیونکہ نسخ کی شرائط میں سے ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ دونوں میں تطبیق مشکل ہو اور اگر تطبیق ممکن ہو تو پھر تطبیق دینا واجب ہے، کیونکہ اس طرح دونوں دلیلوں کے مطابق عمل ہو جاتا ہے جب کہ نسخ کی صورت میں ایک دلیل کا باطل ہونا لازم آتا ہے اور دونوں کے مطابق عمل ہو جانا ایک کو باطل قرار دینے سے زیادہ بہتر ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے دونوں دلیلوں کو قابل اعتبار اور حجت قرار دیا ہے۔ واللہ الموفق.

نظر کی حقیقت اور اس کا علاج

سوال کیا انسان کو نظر لگ جاتی ہے؟ اس کا علاج کیا ہے؟ کیا نظر سے بچنا توکل کے منافی ہے؟

جواب نظر لگنا برحق ہے اور یہ شرعی اور حسی طور پر ثابت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِن يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ ﴾ (القلم: ٦٨/ ٥١)

’’اور کافر (جب یہ نصیحت کی کتاب سنتے ہیں تو) یوں لگتا ہے کہ تم کو اپنی (بری) نگاہوں سے پھسلا دیں گے۔‘‘

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ وہ آپ کو نظر لگا دیں گے۔ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

«اَلْعَيْنُ حَقٌّ وَلَوْ كَانَ شَيْءٌ سَابَقَ الْقَدْرَ سَبَقَتْهُ الْعَيْنُ، وَإِذَا اسْتُغْسِلْتُمْ فَاغْسِلُوا»(صحيح مسلم، السلام، باب الطب والمرض والرقي، ح: ٢١٨٨)

---

① سنن أبي داود، الطب، باب في الطيرة، حديث:3925 وجامع الترمذي، الأطعمة، باب ماجاء في الأكل مع المجزوم، حديث :1817

''نظر لگنا برحق ہے' اگر کوئی چیز تقدیر سے سبقت کرنے والی ہوتی تو نظر سبقت کرتی اور جب تم سے دھونے کا مطالبہ کیا جائے تو تم دھو دیا کرو۔''

اسی طرح امام نسائی اور امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے جب کہ وہ غسل کر رہے تھے تو اس نے انھیں دیکھ کر کہا: ''میں نے آج تک کسی کنواری دوشیزہ کی بھی اس طرح کی جلد نہیں دیکھی۔'' تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ سہل بے ہوش ہو کر زمین پر گر گئے۔ انھیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے جایا گیا اور عرض کیا گیا: سہل بے ہوش ہو کر گر گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: [مَنْ تَتَّهِمُونَ بِهِ] ''تم ان کے بارے میں کس کو مورد الزام ٹھہراتے ہو؟'' صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: عامر بن ربیعہ کو۔ نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«عَلَامَ يَقْتُلُ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ، إِذَا رَأَى أَحَدُكُمْ مِنْ أَخِيهِ مَا يُعْجِبُهُ فَلْيَدْعُ لَهُ بِالْبَرَكَةِ، ثُمَّ دَعَا بِمَاءٍ، فَأَمَرَ عَامِرًا أَنْ يَتَوَضَّأَ، فَغَسَلَ وَجْهَهُ وَيَدَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ وَرُكْبَتَيْهِ وَدَاخِلَةَ إِزَارِهِ، وَأَمَرَ أَنْ يَصُبَّ عَلَيْهِ»(سنن ابن ماجه، الطب، باب العين، ح:٣٥٠٩ وسنن الكبرى للنسائي: ٤/ ٣٨١)

''تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو قتل کیوں کرتا ہے؟ تم میں سے کوئی جب اپنے بھائی کی کوئی خوش کن بات دیکھے' تو اس کے لیے برکت کی دعا کرے۔'' پھر آپ نے پانی منگوایا اور عامر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ وضو کرے' تو انہوں نے اپنے چہرے اور دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھویا' دونوں گھٹنوں اور ازار کے اندر کے حصے کو دھویا اور پھر آپ نے حکم دیا کہ وہ پانی اس پر بہا دے۔''

ایک روایت میں الفاظ ہیں: [وَأَمَرَهُ أَنْ يَكْفَأَ الْإِنَاءَ مِنْ خَلْفِهِ] ''اور آپ نے اسے حکم دیا کہ وہ پیچھے کی طرف سے اس پر پانی کے اس برتن کو انڈیل دے۔''

واقعات سے بھی نظر بد لگنے کی شہادت ملتی ہے' لہٰذا اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

نظر بد لگنے کی حالت میں درج ذیل شرعی علاج استعمال میں لائے جا سکتے ہیں:

① دم کرنا: نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَا رُقْيَةَ إِلَّا مِنْ عَيْنٍ أَوْ حُمَةٍ»(صحيح البخاري، الطب، باب من اكتوى أو كوى غيره ... ح:٥٧٠٥ وصحيح مسلم، الإيمان، باب الدليل على دخول طوائف من المسلمين الجنة بغير حساب ولا عذاب، ح: ٢٢٠)

''دم نظر لگنے یا بخار ہی کی وجہ سے ہے۔''

جبریل علیہ السلام نبی ﷺ کو دم کرتے ہوئے یہ کلمات پڑھا کرتے تھے:

«بِاسْمِ اللهِ أَرْقِيكَ، مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُؤْذِيكَ، مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ أَوْ عَيْنِ حَاسِدٍ، اللهُ يَشْفِيكَ، بِاسْمِ اللهِ أَرْقِيكَ»(صحيح مسلم، السلام، باب الطب والمرض والرقي، ح:٢١٨٦)

''اللہ کے نام کے ساتھ میں آپ کو دم کرتا ہوں' ہر اس چیز سے جو آپ کو تکلیف دے' اور ہر انسان کے یا حسد کرنے والی

آنکھ کے شر سے‘ اللہ آپ کو شفا دے‘ میں اللہ کے نام کے ساتھ آپ کو دم کرتا ہوں۔“

② **دھونا:** جیسا کہ سابقہ حدیث میں نبی ﷺ نے عامر بن ربیعہ ؓ کو حکم دیا تھا (کہ خود کو دھوئے) اور پھر اس پانی کو مریض پر انڈیل دیا جائے۔

نظر لگانے والے کے بول و براز کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنے کی کوئی اصل نہیں ہے۔ اسی طرح اس کے پاؤں کی مٹی کو استعمال کرنا بھی بے اصل ہے‘ ثابت وہی ہے جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اس کے اعضا اور ازار کے اندرون کو دھلانا ہے اور شاید اسی کی مثل اس کے رومال‘ ٹوپی اور قمیض وغیرہ کو بھی اندر سے دھلانا ہو۔ واللہ اعلم۔

نظر بد سے پیشگی حفاظتی تدبیر اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں اور یہ توکل کے منافی بھی نہیں بلکہ یہی توکل ہے‘ کیونکہ توکل اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر اعتماد کرنا اور ان اسباب کو اختیار کرنا ہے جن کو اس نے مباح قرار دیا یا جن کے استعمال کا اس نے حکم دیا ہے۔ نبی ﷺ حضرت حسن وحسین ؓ کو ان کلمات کے ساتھ دم کیا کرتے تھے:

> «أُعِيذُكُمَا بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّةِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَّهَامَّةٍ، وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لاَمَّةٍ»(صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب١٠، ح:٣٣٧١ وسنن ابن ماجه، الطب، باب ما عَوَّذَ به النبي ﷺ وما عوذ به، ح:٣٥٢٥ ولفظها: "أعوذ بكلمات الله ..." وسنن أبي داود، السنة، باب في القرآن، ح:٤٧٣٧ وجامع الترمذي، الطب، باب كيف يعوذ الصبيان، ح:٢٠٦٠)

”میں تم دونوں کو اللہ تعالیٰ کے کلماتِ تامہ کی پناہ میں دیتا ہوں‘ ہر شیطان اور زہریلی بلا کے ڈر سے اور ہر لگنے والی نظر بد کے شر سے۔“

آپ ﷺ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اسماعیل واسحاق علیہما السلام کو اسی طرح دم کیا کرتے تھے۔

کیا عقیدے کے مسائل میں جہالت انسانی معذوری سمجھی جائے گی؟

سوال کیا عقیدے سے متعلق مسائل میں جہالت کی وجہ سے انسان کو معذور سمجھا جائے گا؟

جواب جہالت کی وجہ سے معذوری کے مسئلے میں اختلاف بھی دیگر فقہی واجتہادی مسائل میں اختلاف کی طرح ہے۔ بعض اوقات تو ایک معین شخص پر حکم نافذ کرنے کے بارے میں یہ اختلاف محض لفظی ہوتا ہے‘ یعنی تمام فقہاء کا اس بات پر تو اتفاق ہوتا ہے کہ یہ قول کفر ہے یا یہ فعل کفر ہے یا اس کا ترک کفر ہے‘ لیکن کیا یہ حکم اس معین شخص پر بھی مقتضیات کے پورا ہونے اور موانع ختم ہو جانے کی وجہ سے صادق آتا ہے یا بعض مقتضیات کے ختم ہو جانے اور بعض موانع کے موجود ہونے کی وجہ سے یہ حکم اس پر صادق نہیں آتا‘ اس لیے کہ کفر کے بارے میں جہالت کی دو قسمیں ہیں:

① اس کا تعلق ایسے شخص سے ہو جس کا تعلق اسلام کے سوا کسی اور دین سے ہے یا اس کا تعلق کسی بھی دین سے نہیں ہے اور اس کے دل میں یہ خیال بھی نہیں کہ کوئی دین اس کے طرز عمل کے خلاف ہے۔ اس شخص کے بارے میں دنیا میں ظاہری احکام کے مطابق عمل کیا جائے گا اور آخرت میں اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے‘ اور اس سلسلے میں راجح قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں ایسے

لوگوں کا جس طرح چاہے گا امتحان لے گا اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ دنیا میں وہ کس طرح کے عمل کرنے والے تھے لیکن ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ وہ کسی کو گناہ کے بغیر جہنم میں داخل نہیں کرے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا ﴿٤٩﴾ ﴾ (الكهف: ١٨/ ٤٩)

''اور تمھارا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔''

ہم نے جو یہ کہا ہے کہ دنیا میں اس پر ظاہر کے مطابق احکام جاری ہوں گے تو ان سے مراد کفر کے احکام ہیں کیونکہ اس نے دین اسلام کو اختیار نہیں کیا' لہٰذا اس پر اسلام کے احکام جاری نہیں ہو سکتے اور ہم نے جو یہ کہا کہ آخرت میں اس کا امتحان لیا جائے گا تو یہ اس لیے کہ اس کے بارے میں بہت سے آثار مروی ہیں جنھیں امام ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''طریق الهجرتين'' میں چودھویں طبقے پر گفتگو کرتے ہوئے مشرکین کے چھوٹے بچوں کے بارے میں آٹھویں مذہب کے ضمن میں بیان فرمایا ہے۔

② اس کا تعلق ایسے شخص سے ہو جس کی وابستگی دین اسلام کے ساتھ ہے' لیکن زندگی میں اس نے اس کفریہ قول یا فعل کو اختیار کر لیا اور اس کے دل میں کبھی یہ خیال نہ آیا کہ یہ قول و فعل تو مخالف اسلام ہے اور نہ کسی نے اسے اس کے بارے میں کبھی بتایا تو اس شخص پر ظاہری طور پر احکام اسلام جاری ہوں گے اور آخرت میں اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ کتاب و سنت کے دلائل اور اہل علم کے اقوال سے اسی طرح ثابت ہے۔

کتاب اللہ سے اس کے دلائل حسب ذیل ہیں' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ﴿١٥﴾ ﴾ (الإسراء: ١٧/ ١٥)

''اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں عذاب نہیں دیا کرتے۔''

اور فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي أُمِّهَا رَسُولًا يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَىٰ إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُونَ ﴿٥٩﴾ ﴾ (القصص: ٢٨/ ٥٩)

''اور تمھارا پروردگار بستیوں کو ہلاک نہیں کیا کرتا جب تک ان کے بڑے شہر میں پیغمبر نہ بھیج لے جو ان کو ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنائے اور ہم بستیوں کو ہلاک نہیں کیا کرتے مگر اس حالت میں کہ وہاں کے باشندے ظالم ہوں۔''

اور فرمایا:

﴿ رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ ﴾ (النساء: ٤/ ١٦٥)

''(سب) پیغمبروں کو (اللہ نے) خوش خبری سنانے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا تھا' تاکہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے خلاف کوئی حجت نہ رہے۔''

اور فرمایا:

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۖ فَيُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ ﴾ (إبراهيم: ١٤/ ٤)

’’اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر وہ اپنی قوم کی زبان بولتا تھا تاکہ انہیں (اللہ کے احکام) کھول کھول کر بتا دے‘ پھر اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔‘‘

مزید ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ إِذْ هَدَىٰهُمْ حَتَّىٰ يُبَيِّنَ لَهُم مَّا يَتَّقُونَ ﴾ (التوبة: ۹/ ۱۱۵)

’’اور اللہ ایسا نہیں کہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد گمراہ کر دے جب تک ان کو وہ چیز نہ بتا دے جس سے وہ پرہیز کریں۔‘‘

اور فرمایا:

﴿ وَهَٰذَا كِتَٰبٌ أَنزَلْنَٰهُ مُبَارَكٌ فَٱتَّبِعُوهُ وَٱتَّقُوا۟ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝١٥٥ أَن تَقُولُوٓا۟ إِنَّمَآ أُنزِلَ ٱلْكِتَٰبُ عَلَىٰ طَآئِفَتَيْنِ مِن قَبْلِنَا وَإِن كُنَّا عَن دِرَاسَتِهِمْ لَغَٰفِلِينَ ۝١٥٦ أَوْ تَقُولُوا۟ لَوْ أَنَّآ أُنزِلَ عَلَيْنَا ٱلْكِتَٰبُ لَكُنَّآ أَهْدَىٰ مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ ﴾ (الأنعام: ٦/ ١٥٥ـ١٥٧)

’’اور (اے کفر کرنے والو!) یہ (قرآن) ایک عظیم کتاب ہے‘ ہم ہی نے اسے اتارا ہے‘ (یہ) برکت والی ہے‘ سو تم اس کی پیروی کرو اور (اللہ سے) ڈرو تاکہ تم پر مہربانی کی جائے (اور یہ اس لیے اتاری ہے) کہ (تم یوں نہ) کہو کہ ہم سے پہلے دو گروہوں پر کتابیں اتری ہیں اور ہم ان کے پڑھنے سے (معذور اور) بے خبر تھے یا (یہ نہ) کہو کہ اگر ہم پر بھی کتاب نازل ہوتی تو ہم ان لوگوں کی نسبت کہیں سیدھے راستے پر ہوتے‘ سو تمھارے پاس تمھارے پروردگار کی طرف سے دلیل اور ہدایت اور رحمت آ گئی ہے۔‘‘

علاوہ ازیں اور بھی بہت سی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حجت علم اور بیان کے بعد ہی قائم ہوتی ہے۔

سنت سے اس کی دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! لاَ يَسْمَعُ بِي أَحَدٌ مِّنْ هٰذِهِ الأُمَّةِ يَهُودِيٌ وَّلاَ نَصْرَانِيٌّ، ثُمَّ يَمُوتُ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ إِلاَّ كَانَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ»(صحيح مسلم، الايمان، باب وجوب الايمان برسالة نبينا محمد ﷺ ... ح:١٥٣)

’’اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! اس امت میں سے کوئی یہودی یا عیسائی میرے بارے میں سنے‘ پھر فوت ہو جائے اور اس دین پر ایمان نہ لائے جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا ہے‘ تو وہ جہنمیوں میں سے ہوگا۔‘‘

جہاں تک اہل علم کے کلام کا تعلق ہے تو المغنی: (۱۳۱/۸) میں ہے:

’’اگر وہ ایسے لوگوں میں سے ہے جو وجوب کو جانتا ہی نہیں‘ جیسے نومسلم یا اس نے دار الاسلام کے سوا کسی اور جگہ پرورش پائی ہو یا شہروں اور اہل علم سے دور دراز کسی جنگل میں زندگی گزاری ہو تو اس پر کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔‘‘

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

’’میرے ہم نشین میرے بارے میں اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ میں ہمیشہ سب لوگوں سے زیادہ اس بات سے منع کرتا ہوں کہ کسی معین شخص کی کفر‘ فسق یا معصیت کی طرف نسبت کی جائے الا یہ کہ معلوم ہو جائے کہ اس پر ایسی حجت قائم ہو گئی

ہے جس کی مخالفت کرنے والا کبھی کافر، کبھی فاسق اور کبھی نافرمان ہوتا ہے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کی خطا کو معاف کر دیا ہے، خطا کا تعلق خواہ خبری و قولی مسائل سے ہو یا عملی مسائل سے۔ سلف کا ان بہت سے مسائل میں اختلاف رہا ہے لیکن ان میں سے کسی نے کسی کو کافر یا فاسق یا نافرمان قرار نہیں دیا۔'' آپ نے آگے مزید لکھا ہے: ''میں یہ بھی بیان کرتا رہا ہوں کہ سلف اور ائمہ سے جو یہ منقول ہے کہ جو شخص یہ یہ کہے وہ کافر ہے تو یہ بھی حق ہے، لیکن اطلاق اور تعیین میں فرق کرنا واجب ہے۔'' آپ نے پھر یہ بھی لکھا ہے: ''تکفیر کا تعلق وعید سے ہے گو یہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی تکذیب ہے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ کبھی آدمی نیا نیا دائرہ اسلام میں داخل ہوا ہوتا ہے یا اس نے دور دراز کے کسی جنگل میں تربیت پائی ہوتی ہے، لہٰذا اس طرح کسی شخص کو انکار کی وجہ سے کافر قرار نہیں دیا جا سکتا حتی کہ اس پر حجت قائم نہ ہو جائے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس شخص نے ان نصوص کو سنا نہ ہو یا سنا تو ہو مگر وہ اس کے نزدیک ثابت نہ ہوں یا کوئی معارض ان کے مخالف ہو، جس کی وجہ سے ان کی تاویل واجب ہو گئی ہو خواہ وہ سمجھنے میں غلطی پر ہو۔''①

شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب ؒ نے ''الدرر السنیۃ: ۵۶/۱'' میں لکھا ہے:

> ''جہاں تک تکفیر کا تعلق ہے تو میں اس شخص کو کافر قرار دیتا ہوں جو رسول اللہ ﷺ کے دین کو پہچاننے کے بعد اسے گالی دے، لوگوں کو اس سے روکے اور دین کو اختیار کرنے والے سے دشمنی رکھے تو ایسے شخص کو میں کافر قرار دیتا ہوں۔'' آگے لکھتے ہیں: ''جہاں تک کذب و بہتان کا تعلق ہے، تو ان کا یہ کہنا ہے کہ ہم بالعموم کفر کا فتویٰ لگاتے ہیں اور جو شخص اپنے دین کے اظہار پر قادر ہو، اس کے لیے اپنی طرف ہجرت کو واجب قرار دیتے ہیں، یہ ساری باتیں محض کذب و بہتان ہیں، جن کے ساتھ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دین سے لوگوں کو روکتے ہیں۔ جب ہم اس صنم کی عبادت کرنے والوں کو بھی کافر نہیں سمجھتے، جو عبدالقادر یا علی احمد بدوی کی قبر پر ہیں کیونکہ یہ لوگ جاہل ہیں اور انہیں کوئی آگاہ کرنے والا بھی نہیں، تو اس شخص کو ہم کیسے کافر قرار دے سکتے ہیں جو اللہ کے ساتھ شرک نہ کرے، محض اس لیے کہ اس نے ہماری طرف ہجرت نہیں کی حالانکہ اس نے کفر کیا ہے نہ قتال۔''②

اگر کتاب و سنت کی نصوص اور کلام اہل علم کا یہ مقتضا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کے لطف و کرم کا بھی یہ تقاضا ہے کہ وہ اس وقت تک کسی کو عذاب نہ دے جب تک اس کے عذر کو ختم نہ کر دے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے جو حقوق واجب ہیں عقل انھیں مستقل طور پر نہیں پہچان سکتی۔ اگر عقل انھیں مستقل طور پر پہچان سکتی ہوتی تو حجت رسولوں کے ارسال کرنے پر موقوف نہ ہوتی۔

اصول یہ ہے کہ جو شخص اسلام کی طرف انتساب رکھے، اسے مسلمان ہی سمجھا جائے گا حتی کہ کسی دلیل شرعی سے ثابت ہو جائے کہ وہ اب مسلمان نہیں رہا، لیکن اس شخص کی تکفیر میں بے احتیاطی جائز نہیں کیونکہ اس میں دو بڑے خطرات ہیں:

① اس میں اللہ تعالیٰ کے حکم میں اور محکوم علیہ کے اس وصف میں کذب و افترا ہے جس کے ساتھ اسے موردِ الزام ٹھہرایا گیا

---

① مجموع الفتاوی: 229/3 جمع و ترتیب ابن قاسم

② الدار السنية: 56/1، 66

ہے۔ پہلی بات تو واضح ہے کہ اس نے اس شخص پر کفر کا حکم لگایا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے کافر قرار نہیں دیا۔ اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے، جو اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ کسی چیز کو حرام قرار دے دے کیونکہ تکفیر و عدم تکفیر کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، جس طرح حلال و حرام کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس نے مسلمان کا ایک ایسا وصف بیان کیا ہے جس سے وہ موصوف نہیں ہے گویا کہ اس نے کہا ہے کہ وہ کافر ہے، حالانکہ وہ اس سے بری ہے، لہٰذا ہو سکتا ہے کہ مسلمان کو کافر قرار دینے سے یہ خود کافر ہو جائے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا أَكْفَرَ الرَّجُلُ أَخَاهُ فَقَدْ بَاءَ بِهَا أَحَدُهُمَا»(صحيح البخاري، الأدب، باب من كفر أخاه من غير تأوين، ح: ٦١٠٤ وصحيح مسلم، الإيمان، باب بيان حال من قال لأخيه المسلم: ياكافر، ح: ٦٠، واللفظ له)

”جب کوئی شخص اپنے بھائی کو کافر قرار دے، تو ان میں سے ایک کافر ہوتا ہے۔“

دوسری حدیث میں ہے:

«إِنْ كَانَ كَمَا قَالَ وَإِلاَّ رَجَعَتْ عَلَيْهِ»(صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان حال من قال لأخيه المسلم: ياكافر!، ح: ٦٠)

”اگر وہ ایسا ہے جیسا اس نے کہا، (تو ٹھیک) ورنہ یہ بات اس پر پلٹ آئے گی۔“

اور صحیح مسلم ہی میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«وَمَنْ دَعَا رَجُلاً بِالْكُفْرِ، أَوْ قَالَ: عَدُوَّ اللهِ! وَلَيْسَ كَذٰلِكَ، إِلاَّ حَارَ عَلَيْهِ»(صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان حال إيمان من قال لأخيه المسلم: ياكافر! ح: ٦١)

”جس نے کسی شخص کو کافر کہہ کر بلایا یا اسے اللہ کا دشمن کہا اور وہ ایسا نہ ہو تو یہ بات اس پر لوٹ آئے گی۔“

حدیث ابن عمر میں جو یہ الفاظ ہیں: ”اگر وہ ایسا ہے جیسا اس نے کہا“ تو اس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے حکم میں (اسی طرح ہے) اسی طرح حدیث ابوذر کے یہ الفاظ: ”اور اگر وہ ایسا نہ ہو“ کے معنی بھی یہی ہیں، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے حکم میں ایسا نہ ہو۔

یہ دوسرا خطرہ یعنی وصف کفر کا اس پر لوٹ آنا جب کہ اس کا بھائی اس سے بری ہو، تو یہ بھی عظیم خطرہ ہے اور اس میں مبتلا ہونے کا ڈر ہے کیونکہ جو شخص مسلمان کو کافر قرار دیتا ہے تو اکثر و بیشتر ایسا شخص اپنے عمل پر فخر کرتا اور دوسرے کو حقیر سمجھتا ہے اور اس طرح وہ فخر اور تکبر کو جمع کر لیتا ہے، جب کہ فخر سے عمل رائیگاں ہو جاتا ہے اور تکبر موجب عذاب الٰہی ہے جیسا کہ اس حدیث میں ہے جسے امام احمد اور امام ابوداود رحمہما اللہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«قَالَ اللهُ تَعَالَى: اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِي، وَالْعَظَمَةُ إِزَارِي، فَمَنْ نَازَعَنِي وَاحِدًا مِّنْهُمَا قَذَفْتُهُ فِي النَّارِ»(سنن أبي دواد، اللباس، باب ماجاء في الكبر، ح: ٤٠٩٠ وسنن ابن ماجه، الزهد، باب البراءة من الكبر والتواضع، ح: ٤١٧٤)

’’اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کبریائی میری اوپر کی چادر اور عظمت میری نیچے کی چادر ہے، پھر جو شخص ان میں سے کوئی ایک مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے، تو میں اسے جہنم میں پھینک دوں گا۔‘‘

لہٰذا تکفیر کا حکم لگانے سے پہلے ان دو باتوں کو دیکھنا واجب ہے:

① کیا کتاب و سنت کی دلیل اس بات پر موجود ہے کہ یہ کفر ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف کذب و افترا کی نسبت نہ کی جا سکے۔

② کیا اس معین شخص پر یہ حکم نافذ ہوتا ہے کہ اس کے حق میں تکفیر کی شرائط پوری ہیں اور اسے کافر قرار دینے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔

ان شرائط میں سے ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ اسے اپنی اس مخالفت کا علم ہو جو اس کے لیے موجب کفر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَن يُشَاقِقِ ٱلرَّسُولَ مِنۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ ٱلۡهُدَىٰ وَيَتَّبِعۡ غَيۡرَ سَبِيلِ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ نُوَلِّهِۦ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصۡلِهِۦ جَهَنَّمَۖ وَسَآءَتۡ مَصِيرًا ﴿١١٥﴾ ﴾ (النساء: ٤/ ١١٥)

’’اور جو شخص سیدھا راستہ معلوم ہونے کے بعد پیغمبر کی مخالفت کرے اور مومنوں کے راستے کے سوا اور راستے پر چلے، تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اسے ادھر ہی چلنے دیں گے اور اسے (قیامت کے دن) جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔‘‘

جہنم کی سزا کے لیے یہ شرط قرار دی گئی ہے کہ ہدایت واضح ہونے کے بعد پیغمبر کی مخالفت کی جائے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ بھی شرط ہے کہ اسے یہ معلوم ہو کہ اس مخالفت کی وجہ سے کفر وغیرہ لازم آئے گا یا اتنا ہی کافی ہے کہ اسے یہ معلوم ہو کہ وہ مخالفت کر رہا ہے، خواہ اس کے نتائج کے بارے میں اسے معلوم نہ ہو؟

اس کا جواب یہ ہے کہ محض یہ معلوم ہونا ہی کافی ہے کہ وہ مخالفت کر رہا ہے، خواہ اس کے نتائج کے بارے میں اسے معلوم نہ بھی ہو، کیونکہ نبی ﷺ نے رمضان کے دن میں مجامعت کرنے والے پر کفارہ واجب قرار دیا ہے، خواہ حکم شریعت کی اس مخالفت کا اسے علم ہو اور کفارہ کے بارے میں علم نہ ہو۔ اسی طرح اس شادی شدہ زانی کو رجم کیا جائے گا جسے زنا کی حرمت کا تو علم ہو مگر زنا کے نتیجے میں ملنے والی سزا کا علم نہ ہو یا بسا اوقات اسے زنا ہی کا علم نہ ہو۔

کفر کا حکم لگانے سے جو امور مانع ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسے کفر پر مجبور کر دیا گیا ہو۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَن كَفَرَ بِٱللَّهِ مِنۢ بَعۡدِ إِيمَٰنِهِۦٓ إِلَّا مَنۡ أُكۡرِهَ وَقَلۡبُهُۥ مُطۡمَئِنُّۢ بِٱلۡإِيمَٰنِ وَلَٰكِن مَّن شَرَحَ بِٱلۡكُفۡرِ صَدۡرٗا فَعَلَيۡهِمۡ غَضَبٞ مِّنَ ٱللَّهِ وَلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيمٞ ﴿١٠٦﴾ ﴾ (النحل: ١٦/ ١٠٦)

’’جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے، سوائے اس کے جسے (کفر پر) مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو، بلکہ وہ جو دل کھول کر کفر کرے، تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔‘‘

اسی طرح ایک امر مانع یہ بھی ہے کہ اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب ہو گئی اور خوشی یا غمی یا غضب یا خوف وغیرہ کی شدت کی وجہ سے اسے یہ معلوم ہی نہ ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٞ فِيمَآ أَخۡطَأۡتُم بِهِۦ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتۡ قُلُوبُكُمۡۚ وَكَانَ ٱللَّهُ غَفُورٗا رَّحِيمًا ﴿٥﴾ ﴾ (الأحزاب: ٣٣/ ٥)

’’اور جو بات تم سے غلطی سے ہوگئی ہو اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں لیکن جو تم دل کے ارادے سے کرو (اس پر مؤاخذہ ہے۔) اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔‘‘

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«لَلّٰهُ أَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَةِ عَبْدِهِ حِينَ يَتُوبُ إِلَيْهِ مِنْ أَحَدِكُمْ، كَانَ عَلَى رَاحِلَتِهِ بِأَرْضِ فَلَاةٍ، فَانْفَلَتَتْ مِنْهُ، وَعَلَيْهَا طَعَامُهُ وَشَرَابُهُ، فَأَيِسَ مِنْهَا، فَأَتَى شَجَرَةً فَاضْطَجَعَ فِي ظِلِّهَا، قَدْ أَيِسَ مِنْ رَاحِلَتِهِ، فَبَيْنَا هُوَ كَذٰلِكَ إِذْ هُوَ بِهَا قَائِمَةً عِنْدَهُ، فَأَخَذَ بِخِطَامِهَا، ثُمَّ قَالَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ: اللّٰهُمَّ! أَنْتَ عَبْدِي وَأَنَا رَبُّكَ، أَخْطَأَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ» (صحيح مسلم، التوبة، باب في الحض على التوبة والفرح بها، ح:٢٧٤٧)

’’اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے، جب بندہ اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتا ہے، تمھارے اس شخص سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جو کسی جنگل میں اپنی سواری پر تھا اور اس کی سواری گم ہوگئی، جس پر اس کے کھانے پینے کا سامان بھی تھا۔ وہ اس سے مایوس ہو کر ایک درخت کے سائے میں آکر لیٹ گیا اور اپنی سواری سے بالکل مایوس ہو چکا تھا، لیکن اچانک وہ (دیکھتا ہے کہ) وہ اس کے پاس کھڑی ہے۔ اس نے اس کی مہار کو پکڑا اور انتہائی خوشی کی وجہ سے یہ کہہ دیا کہ اے اللہ! تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں، یعنی خوشی کی انتہا کی وجہ سے اس نے یہ غلطی کی۔‘‘

کفر کا حکم لگانے سے جو امور مانع ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ کسی شبہے کی وجہ سے تاویل سے کام لے رہا ہو اور وہ یہ سمجھتا ہو کہ وہ حق پر ہے کیونکہ ایسا شخص قصد و ارادے سے گناہ اور مخالفت کا ارتکاب نہیں کرتا بلکہ وہ حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ میں داخل ہے:

﴿ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ أَخْطَأْتُم بِهِۦ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ ﴾ (الأحزاب: ٣٣/ ٥)

’’اور جو بات تم سے غلطی سے ہوگئی ہو تو اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں لیکن تمھارے دل جس بات کا عزم کر لیں (اس پر مؤاخذہ ہے۔)‘‘

اور اس کی کوشش کی انتہا یہی ہے، لہٰذا وہ حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ میں بھی داخل ہے:

﴿ لَا يُكَلِّفُ ٱللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (البقرة: ٢/ ٢٨٦)

’’اللہ کسی کو اس کی برداشت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔‘‘

المغنی (۱۳۱/۸) میں ہے:

’’اگر کسی شخص نے بے گناہ لوگوں کے قتل یا ان کے اموال لوٹنے کو کسی شبہے یا تاویل کے بغیر حلال قرار دے لیا تو وہ بھی کافر ہو جائے گا اور اگر کسی تاویل کے ساتھ حلال قرار دیا جیسا کہ خوارج کرتے ہیں تو اکثر فقہاء نے انھیں کافر قرار نہیں دیا، حالانکہ وہ مسلمانوں کے خونوں اور مالوں کو حلال قرار دیتے ہیں اور اسے تقرب الٰہی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں……‘‘ انھوں نے آگے لکھا ہے: ’’خوارج کا یہ مذہب مشہور ہے کہ وہ بہت سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تکفیر کے قائل اور ان کے خونوں اور

مالوں کو حلال سمجھتے ہیں اور وہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے شہید کرنے کو تقرب الٰہی کے حصول کا ذریعہ قرار دیتے ہیں، اس کے باوجود تاویل کی وجہ سے فقہاء نے خوارج کو کافر قرار نہیں دیا۔ اسی طرح جو شخص بھی اس طرح کی تاویل کی وجہ سے حرام کو حلال قرار دے گا، اس کے بارے میں اسی طرح کا موقف اختیار کیا جائے گا۔"

ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"خوارج کی بدعت کا سبب قرآن مجید کے بارے میں ان کی غلط فہمی ہے۔ ان کا مقصد قرآن مجید کی مخالفت نہ تھا لیکن انھوں نے قرآن مجید کا مفہوم ایسا سمجھا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے گویا وہ قرآن مجید کی مخالفت کرنا چاہتے ہوں۔ اسی غلط فہمی کی وجہ سے انھوں نے یہ گمان کیا کہ گناہ گاروں کو کافر قرار دینا واجب ہے۔"①

مزید فرماتے ہیں:

"خوارج نے سنت کی مخالفت کی حالانکہ قرآن مجید نے اتباع سنت کا حکم دیا تھا۔ انھوں نے مومنوں کو کافر قرار دیا حالانکہ قرآن مجید نے ان سے دوستی کا حکم دیا تھا...... اور انھوں نے قرآن مجید کی متشابہ آیات کی ان کے معنی کو پہچانے بغیر، علم میں رسوخ کے بغیر، اتباع سنت کے بغیر اور قرآن مجید کو سمجھنے والے مسلمانوں کی جماعت کی طرف مراجعت کیے بغیر تاویل کرنا شروع کر دی تھی۔"②

نیز فرمایا:

"خوارج کی مذمت اور گمراہی پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے، البتہ انھیں کافر قرار دینے میں اختلاف ہے اور اس سلسلے میں ان کے دو قول مشہور ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ اور دیگر کئی ائمہ انہیں کافر قرار نہیں دیتے۔"③

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ یا حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے بھی ان کو کافر قرار نہیں دیا بلکہ انھیں مسلمان مگر ظالم اور سرکش قرار دیا۔ جیسا کہ اس سلسلے میں میں نے ان کے بہت سے واقعات کسی دوسری جگہ ذکر کیے ہیں۔"④

نیز فرمایا:

"دائرۂ دین سے نکل جانے والے خوارج جن کے خلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قتال کا حکم دیا تھا، خلفائے راشدین میں سے امیر المومنین علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف قتال کیا تھا۔ حضرات صحابہ وتابعین اور ان کے بعد کے تمام ائمہ دین کا بھی ان کے خلاف قتال پر اتفاق ہے۔ اس کے باوجود حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ نے انھیں کافر قرار نہیں

---

① مجموع الفتاوی: 30/13 جمع و ترتیب ابن قاسم

② مجموع الفتاوی: 210/13

③ مجموع الفتاوی: 518/28

④ مجموع الفتاوی: 217/7

دیا بلکہ ان کے خلاف قتال کے باوجود انھیں مسلمان قرار دیا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اس وقت تک ان سے قتال نہیں کیا تھا، جب تک انھوں نے حرام خون نہ بہایا اور مسلمانوں کے مالوں کو لوٹنا شروع نہیں کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے ظلم و بغاوت کو ختم کرنے کے لیے ان سے قتال کیا تھا اس لیے نہیں کہ وہ کافر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے حریم (قابل احترام اشیا) کو گالی دی نہ ان کے مالوں کو غنیمت قرار دیا۔ یہ لوگ جن کی ضلالت نص اور اجماع سے ثابت ہے، ان کو کافر قرار نہیں دیا گیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے ان سے قتال کا حکم دیا ہے، تو اختلاف کرنے والی ان جماعتوں کو کیونکر کافر قرار دیا جا سکتا ہے جو بہت سے ایسے مسائل میں حق پر نہ رہ سکے، جن کے بارے میں ان سے زیادہ علم والے لوگ بھی غلطی میں مبتلا ہو گئے تھے؟ لہٰذا ان جماعتوں کو چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کو کافر قرار دیں نہ ان کے خون کو حلال سمجھیں گو ان کے بارے میں بدعت ثابت ہو چکی ہو، خصوصاً کافر قرار دینے والا فرقہ جب خود بھی بدعتی ہو اور ہو سکتا ہے کہ اس کی بدعت کافر قرار دیے جانے والے فرقہ کی بدعت سے بھی زیادہ سخت ہو۔ اکثر و بیشتر یہ ہوتا ہے کہ یہ سب لوگ ان حقائق کے بارے میں جاہل ہوتے ہیں جن میں ان کا باہمی اختلاف ہوتا ہے۔"...... آگے لکھا ہے: "اگر مسلمان قتال یا تکفیر میں تاویل سے کام لے رہا ہو تو اس کی وجہ سے اسے کافر قرار نہیں دیا جائے گا۔" نیز فرمایا: "علماء کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے فرمان کے بارے میں اختلاف ہے کہ کیا ابلاغ سے پہلے بھی اس کا حکم بندوں کے بارے میں ثابت ہے یا نہیں؟ امام احمد رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ کے مذہب میں اس کے بارے میں تین اقوال ہیں اور صحیح مذہب یہی ہے، جس پر یہ ارشاد باری تعالیٰ دلالت کر رہا ہے: ①

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ﴿١٥﴾﴾ (الإسراء: ١٧/ ١٥)

"اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں عذاب نہیں دیا کرتے۔"

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (النساء: ٤/ ١٦٥)

"(سب) پیغمبروں کو (اللہ نے) خوش خبری سنانے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا تھا، تاکہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کے لیے اللہ پر الزام دھرنے کا موقع نہ رہے۔"

اور نبی ﷺ نے فرمایا:

«لَا أَحَدَ أَحَبُّ إِلَيْهِ الْعُذْرُ مِنَ اللهِ، وَمِنْ أَجْلِ ذٰلِكَ بَعَثَ الْمُنْذِرِينَ وَالْمُبَشِّرِينَ» (صحيح البخاري، التوحيد، باب قول النبي ﷺ: لا شخص أغير من الله، ح: ٧٤١٦ وصحيح مسلم، التوبة، باب غيرة الله تعالى، ح: ٢٧٦٠)

"اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی نہیں جسے عذر پسند ہو، اسی وجہ سے اس نے ڈرانے والوں اور خوش خبری سنانے والوں کو بھیجا ہے۔"

خلاصۂ کلام یہ کہ وہ شخص جو از راہ جہالت کوئی ایسی بات کہتا یا کوئی ایسا کام کرتا ہے جو کفر یا فسق ہو، تو وہ جہالت کی وجہ سے معذور ہے، جیسا کہ کتاب و سنت کے دلائل اور اہل علم کے اقوال سے ثابت ہے۔

---

① مجموع الفتاوٰی: 282/3، 288

جو شخص احکامِ الٰہی کے بغیر فیصلے کرے وہ کافر، ظالم اور فاسق ہے

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے بغیر فیصلے کرے؟

جواب میں اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ اور اس سے ہدایت و درستی کا سوال کرتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ توحید ربوبیت کے مطابق حکم دینا، اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی تنفیذ ہے جو اس کی ربوبیت، کمال ملکیت اور تصرف کا تقاضا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو، جن کا اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے بغیر اتباع کیا گیا، اتباع کرنے والوں کے ارباب (معبود) کے نام سے موسوم قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ٱتَّخَذُوٓا۟ أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَٰنَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِ وَٱلْمَسِيحَ ٱبْنَ مَرْيَمَ وَمَآ أُمِرُوٓا۟ إِلَّا لِيَعْبُدُوٓا۟ إِلَٰهًا وَٰحِدًا ۖ لَّآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ سُبْحَٰنَهُۥ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٣١﴾ ﴾

(التوبۃ: ٩/ ٣١)

''انہوں نے اپنے علماء، مشائخ اور مسیح ابن مریم کو اللہ کے سوا معبود بنا لیا، حالانکہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ صرف اللہ واحد کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ ان لوگوں کے شریک ٹھہرانے سے پاک ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ان متبوعین کو ارباب کے نام سے موسوم کیا کیونکہ انھیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شارع بنا لیا گیا تھا اور ان کا اتباع کرنے والوں کو ان کے پجاری قرار دیا گیا، کیونکہ وہ ان کے سامنے جھکتے تھے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم کی مخالفت میں انھوں نے ان کی اطاعت اختیار کر لی تھی۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ وہ ان کی عبادت تو نہیں کرتے تھے، تو آپ نے فرمایا:

«أَمَا إِنَّهُمْ لَمْ يَكُونُوا يَعْبُدُونَهُمْ، وَلٰكِنَّهُمْ كَانُوا إِذَا أَحَلُّوا لَهُمْ شَيْئًا اسْتَحَلُّوهُ وَإِذَا حَرَّمُوا عَلَيْهِمْ شَيْئًا حَرَّمُوهُ»(جامع الترمذي، تفسير القرآن، باب من سورة التوبة، ح:٣٠٩٥ وحسنه شيخ الإسلام ابن تيمية في كتاب الإيمان، ص:٦٧)

''ہاں وہ ان کی عبادت تو نہیں کرتے تھے لیکن جب وہ ان کے لیے کسی چیز کو حلال قرار دے دیتے تو وہ اسے حلال سمجھتے اور جب ان کے لیے کسی چیز کو حرام قرار دے دیتے تو وہ اسے حرام سمجھتے تھے۔''

جب آپ نے اس بات کو سمجھ لیا تو خوب جان لیجیے کہ جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے اور وہ اللہ اور اس کے رسول کے سوا کسی اور کو حاکم قرار دینے کا ارادہ کرے، تو اس کے ایمان کی نفی کے بارے میں بھی بہت سی آیات وارد ہیں اور ایسی آیات بھی وارد ہیں جو اس کے کفر، ظلم اور فسق پر دلالت کرتی ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَلَمْ تَرَ إِلَى ٱلَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ ءَامَنُوا۟ بِمَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوٓا۟ إِلَى ٱلطَّٰغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوٓا۟ أَن يَكْفُرُوا۟ بِهِۦ وَيُرِيدُ ٱلشَّيْطَٰنُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلَٰلًۢا بَعِيدًا ﴿٦٠﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا۟ إِلَىٰ مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ وَإِلَى ٱلرَّسُولِ رَأَيْتَ ٱلْمُنَٰفِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ

صُدُودًا ﴿٦١﴾ فَكَيْفَ إِذَآ أَصَٰبَتْهُم مُّصِيبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَآءُوكَ يَحْلِفُونَ بِٱللَّهِ إِنْ أَرَدْنَآ إِلَّآ إِحْسَٰنًا وَتَوْفِيقًا ﴿٦٢﴾ أُو۟لَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ يَعْلَمُ ٱللَّهُ مَا فِى قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِىٓ أَنفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيغًا ﴿٦٣﴾ وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ ٱللَّهِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوٓا۟ أَنفُسَهُمْ جَآءُوكَ فَٱسْتَغْفَرُوا۟ ٱللَّهَ وَٱسْتَغْفَرَ لَهُمُ ٱلرَّسُولُ لَوَجَدُوا۟ ٱللَّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ﴿٦٤﴾ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا۟ فِىٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا۟ تَسْلِيمًا ﴿٦٥﴾﴾ (النساء: ٤/ ٦٠_٦٥)

’’(اے نبی!) کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ جو (کتاب) تم پر نازل ہوئی اور جو (کتابیں) تم سے پہلے نازل ہوئیں ان سب پر ایمان رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنا مقدمہ سرکش (شیطانوں) کے پاس لے جا کر فیصلہ کرائیں، حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ ان (شیطانوں) سے کفر کریں اور شیطان (تو یہ) چاہتا ہے کہ ان کو بہکا کر راستے سے دور ڈال دے، اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو حکم اللہ نے نازل فرمایا ہے اس کی طرف (رجوع کرو) اور پیغمبر کی طرف آؤ تو تم منافقوں کو دیکھتے ہو کہ وہ تم سے اعراض کرتے اور رک جاتے ہیں، پھر ان کا کیا حال ہوتا ہے جب ان کے اعمال (کی شامت) سے ان پر کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے تو وہ تمھارے پاس بھاگے آتے ہیں اور قسمیں کھاتے ہیں کہ واللہ! ہمارا مقصود تو بھلائی اور موافقت تھا۔ ان لوگوں کے دلوں میں جو جو کچھ ہے اللہ اس کو (خوب) جانتا ہے، لہٰذا تم ان (کی باتوں) کا کچھ خیال نہ کرو اور انھیں نصیحت کرو اور ان سے ایسی باتیں کہو جو ان کے دلوں میں اثر کر جائیں۔ اور ہم نے جو پیغمبر بھیجا ہے وہ اس لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے فرمان کے مطابق اس کا حکم مانا جائے۔ اور یہ لوگ جب اپنے حق میں ظلم کر بیٹھے تھے، اگر تمھارے پاس آتے اور اللہ سے بخشش مانگتے اور رسول اللہ (ﷺ) بھی ان کے لیے بخشش طلب کرتے تو یقیناً اللہ کو معاف کرنے والا (اور) مہربان پاتے۔ تمھارے پروردگار کی قسم! یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمھیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کرد و اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں تو اس وقت تک مومن نہیں ہوں گے۔‘‘

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے دعوائے ایمان کرنے والے منافقین کی حسب ذیل نشانیاں بیان کی ہیں:

① وہ طاغوت کو اپنا حاکم بنانا چاہتے ہیں اور طاغوت سے مراد ہر وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی مخالفت کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی مخالفت، اس ذات سے سرکشی و بغاوت ہے جسے حکم کا اختیار حاصل ہے اور تمام امور جس کی طرف لوٹنے والے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پاک ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أَلَا لَهُ ٱلْخَلْقُ وَٱلْأَمْرُ ۗ تَبَارَكَ ٱللَّهُ رَبُّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿٥٤﴾﴾ (الأعراف: ٧/ ٥٤)

’’دیکھو! سب مخلوق بھی اس کی ہے اور حکم بھی (اسی کا ہے، یہ) اللہ رب العالمین بڑی برکت والا ہے۔‘‘

② ان کو جب اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام اور رسول اللہ ﷺ کی طرف بلایا جاتا ہے تو وہ اس سے رو کتے اور اعراض کرتے ہیں۔

③ جب انھیں اپنی ہی بداعمالیوں کی پاداش میں کوئی مصیبت پہنچتی ہے اور اس کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کے کرتوتوں کا

راز فاش ہو جائے تو وہ قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا مقصود تو بھلائی اور موافقت تھا جیسا کہ ان لوگوں کا حال ہے جو آج بھی اسلامی احکام کو ترک کر کے ان کے مخالف قوانین اختیار کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہی قوانین عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مذکورہ بالا نشانیوں والے ان مدعیان ایمان کو ڈرایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے جو ان کے دلوں میں ہے اور ان کے دلوں میں جو کچھ مخفی ہے وہ ان (کے منہ) کی باتوں کے خلاف ہے' اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ وہ انھیں نصیحت کریں اور ان سے ایسی باتیں کہیں جو ان کے دلوں پر اثر کریں۔ اس کے بعد اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ رسول کے بھیجنے میں حکمت یہ ہے کہ صرف اس کی اطاعت واتباع کی جائے اور دیگر لوگوں کا اتباع نہ کیا جائے' خواہ ان کے افکار کتنے ہی قوی اور ان کے علاقے کیسے ہی وسیع کیوں نہ ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے ربِ رسول ہونے کی قسم کھائی اور یہ اس کی ربوبیت کی سب سے خاص قسم ہے' جس میں رسول اللہ ﷺ کی صحت رسالت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت تاکیدی قسم کھا کر فرمایا ہے کہ تین امور کے بغیر ایمان درست ہو ہی نہیں سکتا۔

① تمام تنازعات میں رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کو منصف مان لیا جائے۔

② آپ کے حکم کو کسی کجی اور ٹیڑھ پن کے بغیر شرح صدر کے ساتھ قبول کر لیا جائے۔

③ آپ جو فیصلہ فرمائیں' اس کے سامنے مکمل طور پر سر تسلیم خم کر دیا جائے اور کسی سستی اور انحراف کے بغیر آپ کے فیصلے کو نافذ کر دیا جائے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْكَـٰفِرُونَ ﴿٤٤﴾ ﴾ (المائدة: ٥/ ٤٤)

''اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔''

اور فرمایا:

﴿ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّـٰلِمُونَ ﴿٤٥﴾ ﴾ (المائدة: ٥/ ٤٥)

''اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے ہی لوگ بے انصاف ہیں۔''

اور فرمایا:

﴿ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْفَـٰسِقُونَ ﴿٤٧﴾ ﴾ (المائدة: ٥/ ٤٧)

''اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں۔''

کیا یہ تینوں صفتیں ایک ہی موصوف کی ہیں' یعنی جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو وہ کافر' ظالم اور فاسق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کافر کو ظالم اور فاسق بھی قرار دیا ہے' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَٱلْكَـٰفِرُونَ هُمُ ٱلظَّـٰلِمُونَ ﴿٢٥٤﴾ ﴾ (البقرة: ٢/ ٢٥٤)

''اور کفر کرنے والے لوگ ہی ظالم ہیں۔''

اور فرمایا:

﴿ إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُوا وَهُمْ فَاسِقُونَ ﴿٨٤﴾ ﴾ (التوبة: ٩/ ٨٤)

’’یہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کرتے رہے اور مرے بھی تو نافرمان ہی (مرے)۔‘‘

یعنی ہر کافر ظالم اور فاسق بھی ہے یا یہ اوصاف مختلف موصوفین کے ہیں اور وہ ان کے مختلف حالات کی وجہ سے ہیں جن میں انھوں نے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے مطابق حکم نہ دیا؟ میرے نزدیک یہ دوسری بات ہی زیادہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم

ہم عرض کریں گے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کو حقیر سمجھتے ہوئے ان کے مطابق حکم نہ دے یا وہ یہ اعتقاد رکھے کہ ان احکام کے علاوہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین لوگوں کے لیے ان سے زیادہ موزوں اور مفید ہیں تو وہ کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ ان میں سے بعض افراد لوگوں کے سامنے انسانوں کے بنائے ہوئے ایسے قوانین پیش کرتے ہیں جو انسانی قوانین کے مخالف ہیں تاکہ لوگ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں اور انہوں نے مخالف اسلام قوانین اسی لیے وضع کیے ہیں کہ یہ انھیں لوگوں کے لیے زیادہ بہتر اور مفید سمجھتے ہیں، اس لیے کہ عقلی وفطری طور پر یہ بات معلوم ہے کہ انسان ایک طریقے کو چھوڑ کر دوسرے طریقے کو صرف اس لیے اختیار کرتا ہے کہ وہ پہلے طریقے کو ناقص اور دوسرے کو اس سے بہتر سمجھتا ہے۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے مطابق حکم نہ دے اور انھیں حقیر بھی نہ جانے اور یہ عقیدہ بھی نہ رکھے کہ وضعی قوانین لوگوں کے لیے زیادہ بہتر اور مفید ہیں، مگر وہ محکوم علیہ پر تسلط کے طور پر یا اس سے انتقام وغیرہ کی خاطر کسی وضعی حکم کے مطابق حکم دیتا ہے تو ایسا شخص ظالم ہے، کافر نہیں۔ وسائلِ حکم اور اس کے فیصلے (محکوم بہ) کے اعتبار سے ظلم کے مختلف مراتب و درجات ہیں۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے مطابق حکم نہ دے لیکن وہ احکام الٰہی کو حقیر بھی نہ سمجھے، دیگر وضعی قوانین کے بہتر اور مفید ہونے کا عقیدہ بھی نہ رکھے لیکن حکم الٰہی کو وہ محکوم لہٗ سے محبت کی خاطر یا اس سے رشوت لے کر یا کسی اور دنیوی غرض کی وجہ سے نافذ نہیں کرتا تو وہ فاسق ہے، کافر نہیں ہے اور محکوم بہ اور وسائل حکم کے مطابق اس کے فسق کے درجے بھی مختلف ہوں گے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ان لوگوں کے بارے میں لکھا ہے، جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ کو معبود بنالیا تھا، کہ وہ دو طرح کے ہو سکتے ہیں:

① وہ جانتے ہوں کہ ان کے علماء و مشائخ نے اللہ تعالیٰ کے دین کو بدل دیا ہے اور تبدیلی کے بارے میں اس علم کے باوجود انھوں نے ان کا اتباع کیا ہو اور ایسی چیز کو حلال و حرام سمجھا ہو جس کو اللہ تعالیٰ کی مرضی و مشیت کے خلاف ان علماء و مشائخ نے حلال و حرام قرار دیا ہو اور ان لوگوں کو معلوم ہو کہ وہ پیغمبروں کے دین کی مخالفت کر رہے ہیں تو یہ کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے اسے شرک قرار دیا ہے۔

② تحلیلِ حرام اور تحریم حلال کے بارے میں ان کا اعتقاد و ایمان ثابت ہو...... شیخ الاسلام سے منقول عبارت اسی طرح ہے...... لیکن انھوں نے اللہ تعالیٰ کی معصیت میں ان کی اطاعت کی ہو جیسا کہ مسلمان بسا اوقات گناہ کے کام کرتا ہوا انھیں گناہ ہی سمجھتا ہے تو ایسے لوگ کافر نہیں بلکہ گناہ گار ہوں گے۔

غیر اللہ کے لیے ذبح کرنا شرک اکبر ہے

سوال غیر اللہ کے تقرب کے طور پر ذبح کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا اس طرح کے ذبیحہ کو کھانا جائز ہے؟

جواب غیر اللہ کیلئے ذبح کرنا شرک اکبر ہے کیونکہ ذبح کرنا تو عبادت ہے جیسا کہ درج ذیل آیت کریمہ میں اس کا حکم دیا گیا ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَٱنْحَرْ ۝٢ ﴾ (الكوثر: ١٠٨/ ٢)

"تو آپ اپنے پروردگار کے لیے نماز پڑھا کرو اور قربانی کیا کرو۔"

اور فرمایا:

﴿ قُلْ إِنَّ صَلَاتِى وَنُسُكِى وَمَحْيَاىَ وَمَمَاتِى لِلَّهِ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ۝١٦٢ لَا شَرِيكَ لَهُۥ ۖ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا۠ أَوَّلُ ٱلْمُسْلِمِينَ ۝١٦٣ ﴾ (الأنعام: ٦/ ١٦٢-١٦٣)

"کہہ دو کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی بات کا حکم ملا ہے اور میں سب سے اول فرماں بردار ہوں۔"

پس جو شخص غیر اللہ کے لیے ذبح کرے وہ مشرک اور ملت اسلامیہ سے خارج ہے۔ العیاذ باللہ. خواہ وہ کسی فرشتے یا کسی رسول یا کسی نبی یا کسی خلیفہ یا کسی ولی یا کسی عالم کے لیے ذبح کرے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک ہے جس سے انسان دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے' لہٰذا ہر انسان کے لیے واجب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور اپنے آپ کو شرک میں مبتلا نہ کرے' جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ إِنَّهُۥ مَن يُشْرِكْ بِٱللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ ٱللَّهُ عَلَيْهِ ٱلْجَنَّةَ وَمَأْوَىٰهُ ٱلنَّارُ ۖ وَمَا لِلظَّٰلِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ ۝٧٢ ﴾
(المائدة: ٥/ ٧٢)

"بلاشبہ جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرے گا' تو اللہ اس پر بہشت کو حرام کر دے گا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔"

اس طرح کے ذبیحوں کے گوشت کو کھانا بھی حرام ہے کیونکہ ان پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہے اور ہر وہ چیز جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو یا جسے کسی آستانے (بت) پر ذبح کیا گیا ہو' وہ حرام ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حسب ذیل آیت کریمہ میں ذکر فرمایا ہے:

﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ ٱلْمَيْتَةُ وَٱلدَّمُ وَلَحْمُ ٱلْخِنزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ ٱللَّهِ بِهِۦ وَٱلْمُنْخَنِقَةُ وَٱلْمَوْقُوذَةُ وَٱلْمُتَرَدِّيَةُ وَٱلنَّطِيحَةُ وَمَآ أَكَلَ ٱلسَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى ٱلنُّصُبِ ﴾ (المائدة: ٥/ ٣)

"تم پر مرا ہوا جانور اور (بہتا) لہو اور سور کا گوشت اور جس چیز پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور جو جانور گلا گھٹ کر مر جائے یا چوٹ لگ کر مر جائے یا گر کر مر جائے یا جو سینگ لگ کر مر جائے' یہ سب حرام ہیں اور وہ جانور بھی جس کو درندے پھاڑ کھائیں' سوائے اس کے جس کو تم (مرنے سے پہلے) ذبح کر لو اور وہ جانور بھی (حرام ہے) جو تھان (آستانے) پر ذبح

کیا جائے۔"

یہ تمام ذبیحے، جنھیں غیر اللہ کے لیے ذبح کیا گیا ہو، حرام ہیں، انھیں کھانا حلال نہیں ہے۔

دین اسلام کا مذاق اُڑانے والا کافر اور منافق ہے

سوال جو شخص ایسی گفتگو کرے جس میں اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ ﷺ یا دین کا مذاق اڑایا گیا ہو، اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ یا اس کی کتاب یا اس کے دین کا مذاق اڑانا، خواہ یہ مزاح کے طور پر ہو یا لوگوں کو ہنسانے کے لیے ہو، کفر اور نفاق ہے اور یہ اسی طرح ہے جیسا کہ نبی ﷺ کے زمانے میں کچھ لوگوں نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہ کہا تھا: "ہم نے ایسے لوگ نہیں دیکھے جو ہمارے ان قراء سے بڑھ کر پیٹ کے پجاری، زبانوں کے جھوٹے اور جنگ میں بزدل ثابت ہونے والے ہوں۔" منافقین اس طرح کی باتیں رسول اللہ ﷺ اور حضرات صحابۂ کرام کے بارے میں کیا کرتے تھے، انہی کے بارے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تھی:

﴿ وَلَئِن سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ ﴾ (التوبة: ٩/ ٦٥)

"اور اگر تم ان سے (اس بارے میں) دریافت کرو تو کہیں گے کہ ہم تو یوں ہی بات چیت اور دل لگی کرتے تھے۔"

انھوں نے اس سلسلے میں نبی ﷺ کی خدمت میں عذر پیش کیا تھا کہ ہم تو محض راستہ طے کرنے کے لیے اس طرح کی باتیں کر رہے تھے، تو رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حکم دیا تھا:

﴿ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ ۝٦٥ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ ﴾

(التوبة: ٩/ ٦٥-٦٦)

"کیا تم اللہ اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول سے ہنسی کیا کرتے تھے؟ (اب) بہانے مت بناؤ، یقیناً تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو چکے ہو۔"

ربوبیت، رسالت، وحی اور دین کے پہلو بہت ہی محترم پہلو ہیں۔ کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ محض دل لگی یا ہنسنے ہنسانے کے طور پر ان کا مذاق اڑائے، ایسا کرنے والا کافر ہو جائے گا کیونکہ اس کا یہ عمل اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ، اس کے رسولوں، اس کی کتابوں اور اس کی شریعت کی توہین کر رہا ہے، لہٰذا جس سے اس طرح کی حرکت سرزد ہو گئی ہو اسے اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرنی چاہیے کیونکہ یہ نفاق ہے، لہٰذا واجب ہے کہ ایسا شخص توبہ و استغفار کرے، اپنے عمل کی اصلاح کرے اور اپنے دل میں اللہ عزوجل کی خشیت، اس کی تعظیم، اس کا خوف اور اس کی محبت پیدا کرے۔ والله ولی التوفيق.

اصحابِ قبور سے دعا کرنا کیسا ہے؟

سوال اصحاب قبور سے دعا کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب دعا کی درج ذیل دو قسمیں ہیں:

① دعائے عبادت: مثلاً نماز‘ روزہ اور دیگر عبادات۔ پس جب انسان نماز پڑھتا یا روزہ رکھتا ہے‘ تو وہ زبان حال سے اپنے رب تعالیٰ سے یہ دعا کرتا ہے کہ وہ اسے معاف فرما دے‘ اسے عذاب سے بچائے اور اپنے رزق سے نواز دے۔ اس کی دلیل حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ﴿٦٠﴾ ﴾ (الغافر: ٤٠/ ٦٠)

”اور تمھارے پروردگار نے کہا ہے کہ تم مجھ سے دعا کرو میں تمھاری (دعا) قبول کروں گا‘ بلاشبہ جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں ذلیل وخوار ہو کر داخل ہوں گے۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دعا کو عبادت قرار دیا ہے‘ لہٰذا جو شخص کسی بھی قسم کی عبادت غیر اللہ کے لیے سرانجام دے وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اگر انسان کسی چیز کے لیے رکوع یا سجدہ کرے اور رکوع وسجود میں اس کی اس طرح تعظیم بجا لائے جس طرح اللہ تعالیٰ کی تعظیم کی جاتی ہے تو وہ مشرک اور دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے‘ اسی لیے شرک کے سدباب کے طور پر نبی ﷺ نے بوقت ملاقات کسی کے آگے جھکنے سے منع فرمایا ہے‘ چنانچہ آپ سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو اپنے بھائی سے ملاقات کرتا ہے کہ کیا وہ اس کے آگے جھکے؟ آپ نے فرمایا: ”نہیں۔“①

اور بعض جاہل لوگ جو یہ کرتے ہیں کہ سلام کہتے ہوئے جھک جاتے ہیں‘ تو یہ غلطی ہے‘ واجب ہے کہ ایسا کرنے والے کو آپ بتائیں اور اسے اس سے منع کریں۔

② سوال کے لیے پکارنا: اس کی ساری صورتیں شرک نہیں‘ بلکہ اس میں تفصیل ہے:

➤ جس کو پکارا جا رہا ہو‘ اگر وہ زندہ اور اس کام کے کرنے پر قادر ہو تو یہ شرک نہیں ہے جیسا کہ جو شخص آپ کو پانی پلا سکتا ہو‘ اس سے یہ کہنا کہ مجھے پانی پلاؤ۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ دَعَاكُمْ فَأَجِيبُوهُ»(صحيح البخاري، بمعناه، النكاح، باب إجابة الوليمة والدعوة، ح:٥١٧٣ وصحيح مسلم، النكاح، باب الأمر بإجابة الداعي إلي الدعوة، ح:١٤٢٩ وسنن أبي داود، الزكاة، باب عطية من سأل بالله عزوجل، ح:١٦٧٢ واللفظ له، ولفظ البخاري ومسلم: "إذا دُعي أحدكم إلي الوليمة فلياتها")

”جو شخص تمھیں دعوت دے‘ اس کی دعوت قبول کرلو۔“

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ ﴾ (النساء: ٤/ ٨)

”اور جب میراث کی تقسیم کے وقت (غیر وارث) رشتہ دار‘ یتیم اور محتاج آجائیں ان کو بھی اس میں سے کچھ دے دیا کرو۔“

اگر فقیر اپنا ہاتھ پھیلائے اور کہے کہ مجھے بھی دو تو یہ جائز ہے‘ جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

---

① جامع الترمذی‘ الاستئذان‘ باب ماجاء في المصافحة‘ حديث: 2728

﴿فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ﴾ (النساء: ٤/ ٨)

''ان کو بھی اس میں سے کچھ دے دیا کرو۔''

➢ جس کو پکارا جا رہا ہو اگر وہ مردہ ہو تو اسے پکارنا شرک ہے، جس کی وجہ سے انسان ملت اسلامیہ سے خارج ہو جاتا ہے۔

افسوس کہ بعض اسلامی ممالک میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ فلاں قبر والا' جو اپنی قبر میں ایک بے جان لاش ہوتا ہے یا شاید اسے بھی زمین نے کھا لیا ہو' نفع و نقصان کا مالک ہے یا بے اولاد کو اولاد دے سکتا ہے۔ العیاذ باللّٰہ ۔ یہ شرک ہے جس سے انسان ملت اسلامیہ سے خارج ہو جاتا ہے اور اس کا اقرار شراب نوشی' زنا اور لواطت کے اقرار سے بھی زیادہ سخت ہے کیونکہ یہ محض فسق ہی نہیں بلکہ کفر کا اقرار ہے' ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اصلاح احوال کی توفیق عطا فرمائے۔

ولایت کی علامات کیا ہیں؟

سوال کسی غیر اللہ سے' جسے انسان ولی اللہ سمجھتا ہو' استغاثہ کے بارے میں کیا حکم ہے' نیز یہ فرمائیں کہ ولایت کی علامات کیا ہیں؟

جواب علامات ولایت کو اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت کریمہ میں بیان فرمایا ہے:

﴿أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ ٱللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَكَانُوا۟ يَتَّقُونَ ﴿٦٣﴾﴾ (یونس: ١٠/ ٦٢-٦٣)

''سن رکھو! بے شک جو اللہ کے دوست ہیں ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غم ناک ہوں گے (یعنی) وہ جو ایمان لائے اور پرہیزگار رہے۔''

یہ ہیں ولایت کی علامات: (۱) اللہ کے ساتھ ایمان اور (۲) تقویٰ' چنانچہ جو شخص مومن اور متقی ہوگا وہ اللہ کا ولی ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرے وہ اللہ تعالیٰ کا دوست نہیں بلکہ اس کا دشمن ہے' جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَن كَانَ عَدُوًّا لِّلَّهِ وَمَلَٰٓئِكَتِهِۦ وَرُسُلِهِۦ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَىٰلَ فَإِنَّ ٱللَّهَ عَدُوٌّ لِّلْكَٰفِرِينَ ﴿٩٨﴾﴾

(البقرۃ: ٢/ ٩٨)

''جو شخص اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے پیغمبروں کا اور جبرئیل اور میکائیل کا دشمن ہو تو ایسے کافروں کا اللہ دشمن ہے۔''

پس جو انسان بھی کسی غیر اللہ کو پکارے' یا غیر اللہ سے کسی ایسے کام کے لیے فریاد کرے جس کے کرنے کی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور میں قدرت نہ ہو' وہ مشرک اور کافر ہے' وہ اللہ کا ولی نہیں ہے خواہ کتنے ہی دعوے کیوں نہ کرے۔ توحید' ایمان اور تقویٰ کے بغیر اس کے ولی ہونے کے دعوے جھوٹے اور ولایت کے منافی ہیں۔

ان امور کے بارے میں مسلمان بھائیوں کو میری نصیحت یہ ہے کہ وہ ان لوگوں سے فریب خوردہ نہ ہوں بلکہ انھیں اس سلسلے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے تاکہ ان کی امید' ان کا توکل اور ان کا اعتماد اللہ وحدہ کی ذات پاک پر ہو۔ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات بابرکات پر ان کا ایمان ہو اور اسی سے انھیں استقرار و اطمینان حاصل ہو تاکہ ان لٹیروں کے ہاتھوں سے اپنے اموال کو بھی بچا سکیں کیونکہ ان امور میں کتاب و سنت کے ساتھ وابستگی ہی سے ان لوگوں کو فریب نفس میں مبتلا ہونے سے دور رکھا جا

سکتا ہے جو اپنے آپ کو کبھی سادات کہلاتے ہیں اور کبھی اولیاء۔ اگر آپ ان کا بغور جائزہ لیں تو انھیں سیادت وولایت سے کوسوں دور پائیں گے اور اس کے برعکس جو اللہ تعالیٰ کا سچا ولی ہوگا وہ کبھی اپنی ولایت کا دعویٰ کرے گا نہ تعظیم وتوقیر کا ہالہ اس کا احاطہ کیے ہوئے ہوگا۔ وہ مومن ومتقی ہوگا' مخفی رہے گا اور اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرے گا۔ شہرت کو پسند کرے گا نہ اس بات کو کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں' یا خوف اور امیدیں اس سے وابستہ ہوں۔ انسان کا یہ ارادہ وخواہش کہ لوگ اس کی تعظیم کریں' اس کا احترام بجالائیں' اس کی عظمت کے گن گائیں اور وہ لوگوں کا مرجع وماؤیٰ بن جائے' تو یہ تقویٰ اور ولایت کے منافی ہے' اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اس لیے علم حاصل کرے تاکہ وہ بے وقوفوں کے ساتھ جھگڑا کرے یا علماء کے ساتھ مناظرہ کرے یا لوگوں کے چہروں کو اپنی طرف متوجہ کرے تو وہ فلاں فلاں وعید کا مستحق ہوگا۔ ①اس حدیث میں ہمارا استدلال: [وَيَصْرِفَ وُجُوهَ النَّاسِ اِلَيْهِ] ''اور وہ لوگوں کے چہروں کو اپنی طرف متوجہ کرے۔'' کے جملے سے ہے۔ چنانچہ جو لوگ ولایت کا دعویٰ کرتے ہیں اور لوگوں کے چہروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں' وہ ولایت سے بہت دور ہیں۔

مسلمان بھائیوں سے میری نصیحت یہ ہے کہ وہ اس قسم کے لوگوں سے فریب نہ کھائیں بلکہ کتاب اللہ اور سنت رسول کی طرف رجوع کریں اور اپنی تمام تر امیدیں اللہ وحدہ لاشریک کی ذات پاک ہی سے وابستہ رکھیں۔

جادو کیا ہے اور اسے سیکھنا کیسا ہے؟

سوال جادو کیا ہے اور اس کے سیکھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب علماء نے لکھا ہے کہ لغت میں جادو ہر اس چیز سے عبارت ہے' جس کا سبب لطیف اور خفی ہو اور اس کی تاثیر بھی خفی ہو اور لوگوں کو اس کے بارے میں اطلاع نہ ہو۔ اس معنی کے اعتبار سے سحر کا لفظ نجوم اور کہانت پر بھی مشتمل ہے بلکہ یہ بیان اور فصاحت کی تاثیر کو بھی شامل ہے' جیسا کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا» (صحيح البخاري، النكاح، باب الخطبة، ح:٥١٤٦)

''بعض بیان سحر کی سی تاثیر لیے ہوتے ہیں۔''

پس ہر وہ چیز جو بطریق خفی مؤثر ہو' وہ جادو ہے۔

اصطلاحی طور پر بعض لوگوں نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے: ''اس سے مراد وہ تعویذات' دم اور جھاڑ پھونک ہیں جو دلوں' عقلوں اور جسموں پر اثر انداز ہوں' عقلوں کو سلب کریں' محبت ونفرت پیدا کریں' شوہر اور اس کی بیوی میں جدائی ڈال دیں' جسمانی طور پر بیمار کر دیں اور سوچ بچار کو سلب کریں۔''

جادو کا سیکھنا حرام ہے۔ بلکہ کفر ہے جب کہ اس میں شیاطین کے اشتراک کے وسیلے کو بھی اختیار کر لیا گیا ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ ۖ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا

---

① جامع الترمذی' العلم' باب ماجاء فیمن یطلب بعلمه الدنیا' حدیث: 2654

يُعَلِّمُونَ ٱلنَّاسَ ٱلسِّحۡرَ وَمَآ أُنزِلَ عَلَى ٱلۡمَلَكَيۡنِ بِبَابِلَ هَٰرُوتَ وَمَٰرُوتَۚ وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنۡ أَحَدٍ حَتَّىٰ يَقُولَآ إِنَّمَا نَحۡنُ فِتۡنَةٞ فَلَا تَكۡفُرۡۖ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنۡهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِۦ بَيۡنَ ٱلۡمَرۡءِ وَزَوۡجِهِۦۚ وَمَا هُم بِضَآرِّينَ بِهِۦ مِنۡ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذۡنِ ٱللَّهِۚ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمۡ وَلَا يَنفَعُهُمۡۚ وَلَقَدۡ عَلِمُواْ لَمَنِ ٱشۡتَرَىٰهُ مَا لَهُۥ فِي ٱلۡأٓخِرَةِ مِنۡ خَلَٰقٖۚ﴾ (البقرة: ۲/ ۱۰۲)

’’اور وہ ان (ہزلیات) کے پیچھے لگ گئے جو سلیمان کے عہد سلطنت میں شیاطین پڑھا کرتے تھے اور سلیمان نے مطلق کفر کی بات نہیں کی بلکہ شیطان ہی کفر کرتے تھے کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور ان باتوں کے بھی (پیچھے لگ گئے) جو شہر بابل میں دو فرشتوں (یعنی) ہاروت اور ماروت پر اتری تھیں اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو (ذریعۂ) آزمائش ہیں، تم کفر میں نہ پڑو، غرض لوگ ان سے ایسا (جادو) سیکھتے جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں اور اللہ کے حکم کے سوا وہ اس (جادو) سے کسی کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے تھے اور کچھ ایسے (منتر) سیکھتے جو ان کو نقصان ہی پہنچاتے اور فائدہ کچھ نہ دیتے اور وہ جانتے تھے کہ جو شخص ایسی چیزوں (یعنی سحر اور منتر وغیرہ) کا خریدار ہوگا اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔‘‘

اس قسم کے جادو کو سیکھنا جس میں شیاطین کے اشتراک کے واسطہ کو اختیار کیا گیا ہو کفر اور اس کا استعمال کفر، ظلم اور لوگوں سے دشمنی ہے، اسی لیے حکم شریعت یہ ہے کہ جادوگر کو ارتداد کی بنا پر یا حد کے طور پر قتل کر دیا جائے۔ اگر اس کے جادو کی نوعیت ایسی ہو جو موجب کفر ہو تو اسے ارتداد و کفر کی بنا پر قتل کر دیا جائے گا اور اگر اس کا جادو درجہ کفر تک نہ پہنچتا ہو تو اس کے شر کو دور کرنے اور مسلمانوں کو اس کی ایذا سے بچانے کے لیے اسے حد کے طور پر قتل کیا جائے گا۔

کیا میاں بیوی کے درمیان جادو کے ذریعے سے اتفاق کروانا جائز ہے؟

سوال میاں بیوی کے درمیان جادو کے ذریعے سے اتفاق پیدا کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب یہ بھی حرام ہے اور جائز نہیں۔ جادو کی اس قسم کو ’’عُطف‘‘ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جس جادو کے ساتھ میاں بیوی میں جدائی ڈال دی جائے، اسے ’’صَرف‘‘ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور وہ بھی حرام ہے اور کبھی یہ کفر اور شرک تک بھی جا پہنچتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنۡ أَحَدٍ حَتَّىٰ يَقُولَآ إِنَّمَا نَحۡنُ فِتۡنَةٞ فَلَا تَكۡفُرۡۖ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنۡهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِۦ بَيۡنَ ٱلۡمَرۡءِ وَزَوۡجِهِۦۚ وَمَا هُم بِضَآرِّينَ بِهِۦ مِنۡ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذۡنِ ٱللَّهِۚ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمۡ وَلَا يَنفَعُهُمۡۚ وَلَقَدۡ عَلِمُواْ لَمَنِ ٱشۡتَرَىٰهُ مَا لَهُۥ فِي ٱلۡأٓخِرَةِ مِنۡ خَلَٰقٖۚ﴾ (البقرة: ۲/ ۱۰۲)

’’اور وہ دونوں (ہاروت اور ماروت) کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو (ذریعۂ) آزمائش ہیں، تم کفر میں نہ پڑو، غرض لوگ ان سے ایسا (جادو) سیکھتے جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں اور اللہ کے حکم کے سوا وہ اس (جادو) سے کسی کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے تھے اور کچھ ایسے (منتر) سیکھتے جو ان کو نقصان ہی پہنچاتے اور فائدہ کچھ نہ دیتے اور

وہ جانتے تھے کہ جو شخص ایسی چیزوں (یعنی سحر اور منتر وغیرہ) کا خریدار ہوگا اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔‘‘

کہانت کیا ہے اور کاہنوں کے پاس جانا کیسا ہے؟

سوال ’’کہانت‘‘ کسے کہتے ہیں اور کاہنوں کے پاس جانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب کہانت (تَکَھَّنَ) فعل کا مصدر ہے‘ اس کے معنی اندازہ لگانے اور ایسے امور کے ذریعے سے حقیقت تلاش کرنے کے ہیں جن کی کوئی اساس نہ ہو۔ زمانہ جاہلیت میں کچھ لوگوں نے اسے کاروبار کے طور پر اختیار کرلیا تھا اور ان کا ان شیطانوں سے رابطہ تھا جو آسمان سے چوری چھپے باتیں سن کر ان لوگوں سے بیان کردیتے تھے اور وہ شیطانوں سے سنی ہوئی اس طرح کی باتوں میں اپنی طرف سے سوسو اضافے کردیتے اور پھر لوگوں سے بیان کرتے اور ان میں سے اگر کوئی ایک بات صحیح ثابت ہوجاتی تو لوگ ان کے بارے میں فریب میں مبتلا ہوجاتے اور اپنے باہمی فیصلوں کے لیے بھی انہی کی طرف رجوع کرتے اور مستقبل کے حالات وواقعات میں بھی ان سے رہنمائی طلب کرتے‘ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ کاہن وہ ہے جو مستقبل کی غیب کی باتوں کی خبردے۔ کاہنوں کے پاس جانے والے لوگوں کی حسب ذیل تین قسمیں ہیں:

پہلی قسم: کاہن کے پاس جاکر اس سے سوال تو کرے مگر اس کی بات کی تصدیق نہ کرے تو یہ بھی حرام ہے اور ایسا کرنے والے کی سزا یہ ہے کہ اس کی چالیس دن تک نماز قبول نہیں ہوتی‘ جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ أَتٰی عَرَّافًا فَسَأَ لَهُ عَنْ شَيْءٍ لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةُ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً»(صحيح مسلم، السلام، باب تحريم الكهانة وإتيان الكهان، ح: ٢٢٣٠)

’’جو شخص کسی کاہن کے پاس جاکر اس سے کسی چیز کے بارے میں سوال کرے‘ تو اس کی چالیس راتوں تک نماز قبول نہیں ہوتی۔‘‘

دوسری قسم: کاہن کے پاس جاکر اس سے سوال کرے اور پھر اس کی تصدیق بھی کرے‘ تو یہ اللہ عزوجل کی ذات پاک کے ساتھ کفر ہے کیونکہ اس نے کاہن کے دعوائے علم غیب کی تصدیق کی ہے اور جو شخص کسی کے دعوائے علم غیب کی تصدیق کرتا ہے‘ تو وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تکذیب کرتا ہے:

﴿ قُل لَّا يَعۡلَمُ مَن فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ ٱلۡغَيۡبَ إِلَّا ٱللَّهُۚ ﴾ (النمل: ٢٧/ ٦٥)

’’کہہ دو کہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں‘ اللہ کے سوا غیب کی باتیں نہیں جانتے۔‘‘

اسی لیے صحیح حدیث میں آیا ہے:

«مَنْ أَتٰی حَائِضًا أَوِ امْرَأَةً فِي دُبُرِهَا أَوْ كَاهِنًا، فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ»(جامع الترمذي، الطهارة، باب ماجاء في كراهية إتيان الحائض، ح: ١٣٥ وسنن ابن ماجه، الطهارة، باب النهي عن إتيان الحائض، ح: ٦٣٩ وصححه الألباني رحمه الله في الإرواء، ح: ٢٠٠٦)

’’جو شخص حائضہ عورت سے مقاربت (صحبت) کرے یا کسی عورت کی دبر میں جنسی عمل کرے یا کسی کاہن کے پاس جائے‘ تو اس نے اس دین کے ساتھ کفر کیا جسے محمد ﷺ پر نازل کیا گیا ہے۔‘‘

تیسری قسم: کاہن کے پاس جائے اور اس سے اس لیے سوال کرے تاکہ لوگوں کے سامنے اس کے حال کو بیان کر سکے اور انہیں بتائے کہ یہ کہانت، ملمع سازی اور سراسر گمراہی ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ کے پاس جب ابن صیاد آیا تو آپ نے اپنے دل میں ایک بات کو چھپایا اور پھر اس سے پوچھا کہ وہ یہ بتائے کہ آپ نے اپنے دل میں کس بات کو چھپایا ہے؟ اس نے جواب دیا: ''دُخ'' اور اس کا اس سے ارادہ سورۃ الدخان کا تھا۔ نبی ﷺ نے یہ سن کر اس سے فرمایا:

«اِخْسَأْ فَلَنْ تَعْدُوَ قَدْرَكَ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب إذا أسلم الصبي فمات، هل يصلى عليه؟ ... ح: ١٣٥٤ وصحيح مسلم، الفتن، باب ذكر ابن صياد، ح: ٢٩٢٤)

''تو ذلیل و رسوا ہو جا، تو اپنی حیثیت سے تجاوز نہیں کر سکے گا۔''

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کاہن کے پاس جانے والوں کے درج ذیل تین حالات ہیں:

① اس کے پاس جائے، اس سے سوال کرے لیکن اس کی تصدیق نہ کرے اور نہ اس کا مقصود اس کا حال بیان کرنا ہو تو یہ حرام ہے اور ایسا کرنے والے کی سزا یہ ہے کہ اس کی چالیس دنوں تک نماز قبول نہیں ہوتی۔

② اس سے سوال کرے اور اس کی تصدیق بھی کرے تو یہ اللہ عزوجل کے ساتھ کفر ہے، انسان کو اس سے توبہ کر کے اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے، ورنہ وہ کفر پر مرے گا۔

③ کاہن کے پاس جا کر اس لیے سوال کرے تاکہ اس کا امتحان کرے اور لوگوں سے اس کا حال بیان کرے، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

اُس عبادت کا کیا حکم ہے جس میں ریا کی آمیزش ہو؟

سوال ایسی عبادت کے بارے میں کیا حکم ہے، جس میں ریا کی آمیزش ہو؟

جواب عبادت میں جب ریا کی آمیزش ہو تو اس کی حسب ذیل تین صورتیں ہو سکتی ہیں:

{1} عبادت کے پیچھے کارفرما جذبہ نمود و نمائش ہو، جیسے کوئی لوگوں کے دکھاوے کے لیے اس لیے عبادت کرے کہ لوگ نماز کی وجہ سے اس کی تعریف کریں، تو ایسی ریاکاری سے عبادت باطل ہو جاتی ہے۔

{2} عبادت کے دوران میں ریا شروع کر دے، یعنی عبادت کو اس نے شروع تو اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص کے طور پر کیا ہو لیکن پھر عبادت کے دوران ہی میں ریا کا عنصر شروع ہو گیا ہو تو ایسی عبادت کی دو حالتیں ہوں گی:

(ا) عبادت کے پہلے حصے کو آخری حصے کے ساتھ نہ ملائے، تو اس صورت میں پہلا حصہ یقیناً صحیح مگر آخری باطل ہوگا۔ اس کی مثال اس طرح ہے جیسے ایک شخص کے پاس ایک سو ریال ہوں، وہ انھیں صدقہ کرنا چاہے، تو پچاس ریال اخلاص کے ساتھ صدقہ کر دے اور پھر باقی پچاس کے بارے میں وہ ریا میں مبتلا ہو جائے، تو پہلے پچاس کا صدقہ صحیح اور مقبول ہوگا اور باقی پچاس کا صدقہ اخلاص کے ساتھ ریا مل جانے کی وجہ باطل ہوگا۔

(ب) عبادت کے پہلے حصے کو آخری حصے کے ساتھ ملا دے تو اس صورت میں انسان دو باتوں سے خالی نہ ہوگا۔

- ریا کو دور کر دے، اس کی طرف مائل نہ ہو بلکہ اسے ناپسند کرتے ہوئے اس سے اعراض کر لے تو اس کا کوئی اثر نہ ہوگا، کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّ اللهَ تَجَاوَزَ عَنْ أُمَّتِي مَا حَدَّثَتْ بِهِ أَنْفُسُهَا مَا لَمْ تَعْمَلْ أَوْ تَتَكَلَّمْ»(صحيح البخاري، الطلاق، باب الطلاق في الإغلاق والمكره والسكران . . . ح:٥٢٦٩ وصحيح مسلم، الإيمان، باب تجاوز الله عن حديث النفس . . . ح:١٢٧)

"بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کے دل میں آنے والی باتوں کو نظر انداز فرمایا ہے، جب تک اس کے مطابق عمل نہ کر لے یا اس کے مطابق بات نہ کر لے۔"

- ریا کاری سے مطمئن ہو اور اسے دور کرنے کی کوشش نہ کرے، تو اس سے ساری عبادت باطل ہو جائے گی کیونکہ اس کا ابتدائی حصہ آخری حصے کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی اخلاص کے ساتھ نماز شروع کرے اور پھر دوسری رکعت میں ریا میں مبتلا ہو جائے تو ابتدائی حصے کے آخری حصے کے ساتھ ملے ہونے کی وجہ سے نماز باطل ہو جائے گی۔

③ عبادت کے ختم ہونے کے بعد ریا طاری ہو تو وہ ریا عبادت پر اثر انداز نہ ہوگی اور نہ ایسے ریا سے عبادت باطل ہوگی کیونکہ یہ عبادت صحیح حالت میں مکمل ہوئی ہے، لہٰذا مکمل ہونے کے بعد ریا کے پیدا ہونے سے یہ فاسد نہ ہوگی۔

ریا یہ نہیں ہے کہ انسان اس بات سے خوش ہو کہ لوگوں کو اس کی عبادت کے بارے میں معلوم ہے کیونکہ اس صورت میں یہ بات عبادت سے فراغت کے بعد طاری ہوئی ہے اور یہ بھی ریا نہیں ہے کہ انسان اپنے فعل طاعت سے خوش ہو کیونکہ یہ تو اس کے ایمان کی دلیل ہے، جیسا کہ نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ سَرَّتْهُ حَسَنَتُهُ وَسَاءَتْهُ سَيِّئَتُهُ فَذٰلِكُمُ الْمُؤْمِنُ»(جامع الترمذي، الفتن، باب ماجاء في لزوم الجماعة، ح:٢١٦٥)

"جس شخص کو اپنی نیکی اچھی لگے اور برائی بری معلوم ہو تو وہ مومن ہے۔"

اسی طرح نبی ﷺ سے جب اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

«تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ»(صحيح مسلم، البر والصلة، باب إذا أثني على الصالح، ح:٢٦٤٢)

"یہ مومن کو جلد نصیب ہو جانے والی بشارت ہے۔"

قرآنِ مجید کی قسم اُٹھانا کیسا ہے؟

سوال قرآن مجید کے ساتھ حلف اٹھانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اس سوال کا جواب قدرے تفصیل کے ساتھ دیا جائے گا۔ کسی چیز کی قسم کھانا اس بات کی دلیل ہے کہ قسم کھانے والے کے نزدیک اس چیز کی خاص عظمت ہے جس کی قسم کھائی جا رہی ہے، لہٰذا کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے کسی اسم یا صفات میں سے کسی صفت کے بغیر قسم کھائے، مثلاً یوں قسم کھانی چاہیے کہ "اللہ کی قسم! ایسا میں ضرور کروں گا" رب کعبہ کی قسم! میں یہ

کام ضرور کروں گا' اللہ کی عزت کی قسم! میں یہ بات ضرور کروں گا'' اسی طرح اللہ تعالیٰ کی دیگر صفات کے ساتھ قسم کھائی جا سکتی ہے۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور وہ یعنی کلام باری تعالیٰ' اللہ تعالیٰ کی ذاتی فعلی صفت ہے۔ اپنے اصل کے اعتبار سے کلام کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اس صفت سے ہمیشہ موصوف رہی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے موصوف رہے گی کیونکہ کلام تو کمال ہے اور اس اعتبار سے یہ اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفات میں سے ہے' کیونکہ وہ ہمیشہ سے متکلم رہا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے متکلم رہے گا اور جس کا وہ ارادہ فرمائے اسے کرتا رہے گا اور اپنی مستقل حیثیت کے اعتبار سے کلام اللہ تعالیٰ کی فعلی صفات میں سے ہے کیونکہ وہ اس وقت کلام فرماتا ہے جب وہ چاہتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَآ أَمْرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيْـًٔا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ﴿٨٢﴾﴾ (یٰس ٣٦/ ٨٢)

''اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے' تو اس سے فرما دیتا ہے: ہو جا' تو وہ ہو جاتی ہے۔''

اس آیت کریمہ میں قول کو ارادے کے ساتھ ملایا گیا ہے' تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام اس کے ارادہ و مشیت کے ساتھ متعلق ہے۔ اس کے بارے میں اور بھی بہت سی نصوص موجود ہیں۔ جہاں تک کلام باری تعالیٰ کے انفرادی طور پر وقوع کا تعلق ہے' تو وہ اس کی حکمت کے تقاضے کے مطابق ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس تفصیل سے ہمیں معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا قول باطل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ کا کلام ازلی ہے اور ممکن نہیں کہ وہ اس کی مشیت کے تابع ہو اور اس کے قائم بنفسہ ہونے کے بھی یہی معنی ہیں لہٰذا وہ کوئی ایسا کلام نہیں ہے جسے وہ سن لے جس سے اللہ تعالیٰ کلام فرما رہا ہو۔'' یہ قول باطل ہے کیونکہ درحقیقت ایسا کہنے والے نے اللہ تعالیٰ کے سنے جانے والے کلام کو مخلوق بنا دیا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی ایک کتاب میں جو [تِسْعِيْنِيَّة] کے نام سے معروف ہے' اس قول کو نوے (٩٠) وجہ سے باطل قرار دیا ہے۔

جب یہ مصحف کلام اللہ پر مشتمل ہے اور کلام اللہ' اللہ تعالیٰ کی صفت ہے تو پھر قرآن مجید کی قسم کھانا جائز ہے' مثلاً انسان یہ کہے کہ قرآن مجید کی قسم! اور اس سے اس کا مقصود کلام اللہ کی قسم کھانا ہو تو فقہائے حنابلہ رحمہم اللہ سے نص موجود ہے کہ ایسی قسم کھانا جائز ہے۔ تاہم افضل یہ ہے کہ انسان ایسی قسم کھائے جس سے سامعین تشویش میں مبتلا نہ ہوں مثلاً اس طرح قسم کھائے کہ اللہ کی قسم! رب کعبہ کی قسم! اس ذات پاک کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یا اس طرح کی دوسری قسمیں کھائے جن کے سننے سے عام لوگوں کو کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی اور وہ تشویش میں مبتلا نہیں ہوتے' لہٰذا لوگوں سے ایسے انداز میں گفتگو کرنا زیادہ بہتر ہے جو معروف ہو اور جس سے انھیں اطمینان قلب نصیب ہوتا ہو۔ جب قسم اللہ تعالیٰ اور اس کے اسماء وصفات ہی کی کھائی جاتی ہے تو پھر کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ غیر اللہ کی قسم کھائے۔ نبی یا جبریل یا کعبہ یا مخلوقات میں سے کسی چیز کی بھی قسم کھانا جائز نہیں ہے' کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ كَانَ حَالِفًا فَلْيَحْلِفْ بِاللهِ أَوْ لِيَصْمُتْ»(صحيح البخاري، الشهادات، باب كيف يُستحلف؟ ح:٢٦٧٩ وصحيح مسلم، الأيمان، باب النهي عن الحلف بغير الله، ح:١٦٤٦)

''جو شخص قسم کھانا چاہے' اسے چاہیے کہ وہ اللہ کی قسم کھائے یا خاموش رہے۔''

بلکہ نبی ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا ہے:

«مَنْ حَلَفَ بِغَيرِ اللهِ فَقَدْ كَفَرَ أَوْ أَشْرَكَ»(جامع الترمذي، النذور والأيمان، باب ماجاء في أن من حلف بغير الله فقد أشرك، ح:١٥٣٥)

''جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی، اس نے کفر یا شرک کیا۔''

لہٰذا اگر کوئی شخص کسی کو نبی کی یا نبی کی زندگی کی یا کسی اور انسان کی زندگی کی قسم کھاتے ہوئے سنے، تو اسے چاہیے کہ وہ اسے اس سے منع کرے اور اسے یہ بتائے کہ ایسی قسم کھانا حرام ہے، جائز نہیں، اسے حکمت اور نرمی و شفقت کے ساتھ یہ بات سمجھا دے۔ مقصود اس کی خیر خواہی اور اسے اس حرام کام سے دور رکھنا ہو۔ بعض لوگوں کی یہ عادت ہے کہ جب انھیں نیکی کے کسی کام کا حکم دیا جائے اور برائی سے منع کیا جائے تو وہ غیرت میں مبتلا اور ناراض ہو جاتے ہیں، ان کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور رگیں پھول جاتی ہیں۔ ایسا شخص بسا اوقات یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اسے محض انتقام کے طور پر منع کیا جا رہا ہے، لہٰذا اس کے دل میں شیطان غلط باتیں ڈال دیتا ہے۔ اگر لوگوں سے ان کے مراتب کے مطابق سلوک کیا جائے اور انہیں اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف حکمت اور محبت و شفقت سے دعوت دی جائے، تو اس بات کا بہت امکان ہوتا ہے کہ وہ آپ کی بات کو توجہ سے سن کر اسے قبول کر لیں گے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّ اللهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ وَيُعْطِي عَلَى الرِّفْقِ مَالاَ يُعْطِي عَلَى الْعُنْفِ»(صحيح مسلم، البر والصلة، باب فضل الرفق، ح:٢٥٩٣)

''بے شک اللہ تعالیٰ نرم ہے، نرمی کو پسند فرماتا ہے اور نرمی پر وہ کچھ عطا فرما دیتا ہے جو سختی پر عطا نہیں فرماتا۔''

بہت سے لوگوں کو اس بدّو کا واقعہ یقیناً معلوم ہوگا جس نے لوگوں کی موجودگی میں مسجد نبوی میں پیشاب کر دیا تھا۔ لوگوں نے یہ دیکھا تو چیخ پڑے اور اسے ڈانٹنے لگے، مگر نبی ﷺ نے انھیں اس سے منع فرما دیا۔ جب وہ بدّو پیشاب کرنے سے فارغ ہو گیا تو نبیٔ اکرم ﷺ نے اسے بلایا اور بے حد پیار اور شفقت سے فرمایا:

«إِنَّ هٰذِهِ الْمَسَاجِدَ لاَ تَصْلُحُ لِشَيْءٍ مِّنْ هٰذَا الْبَوْلِ وَالْقَذَرِ، إِنَّمَا هِيَ لِذِكْرِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ وَالصَّلاَةِ وَقِرَاءَةِ الْقُرْآنِ»(صحيح مسلم، الطهارة، باب وجوب غسل البول وغيره من النجاسات . . . ح:٢٨٥)

''ان مسجدوں میں بول و براز کرنا درست نہیں ہے، یہ تو صرف اللہ عزوجل کے ذکر، نماز اور قرآن مجید کی تلاوت کے لیے ہیں۔''

پھر آپ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ وہ پیشاب پر پانی کا ایک ڈول بہا دیں، اس سے خرابی کا ازالہ ہو گیا اور جگہ پاک ہو گئی اور جاہل بدّو کو سمجھانے کا مقصود حاصل ہو گیا۔ ہمیں بھی چاہیے کہ بندگانِ الٰہی کو اللہ کے دین کی دعوت دیتے وقت اسی اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھیں اور دعوت دین کے لیے ایسے اسلوب کو اختیار کریں جس سے حق بات لوگوں کے دلوں میں اثر کر جائے اور انہیں حق قبول کرنے اور اپنی اصلاح کرنے کی توفیق میسر آئے۔ والله الموفق.

غیر اللہ کی قسم کھانا جائز نہیں ہے

سوال نبی ﷺ اور کعبہ کی قسم کھانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ شرف اور ذمے کے بارے میں قسم کھانے کے بارے میں کیا حکم

ہے؟ اور انسان کے یہ کہنے کے بارے میں کیا حکم ہے کہ یہ میرے ذمے ہے؟

جواب نبی ﷺ کی قسم کھانا جائز نہیں ہے بلکہ یہ شرک کی ایک قسم ہے۔ اسی طرح کعبہ کی قسم کھانا بھی جائز نہیں بلکہ یہ بھی شرک کی ایک قسم ہے' کیونکہ نبی ﷺ اور کعبہ دونوں مخلوق ہیں اور کسی بھی مخلوق کی قسم کھانا شرک ہے۔ اسی طرح شرف یا ذمے کی قسم کھانا بھی جائز نہیں ہے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللهِ فَقَدْ كَفَرَ أَوْ أَشْرَكَ»(جامع الترمذي، النذور والأيمان، باب ماجاء في أن من حلف بغير الله فقد أشرك، ح: ١٥٣٥)

''جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی' اس نے کفر یا شرک کیا۔''

اور فرمایا:

«لَا تَحْلِفُوا بِآبَائِكُمْ وَمَنْ كَانَ حَالِفًا فَلْيَحْلِفْ بِاللهِ»(صحيح البخاري، التوحيد، باب السؤال باسماء الله تعالى، ح: ٧٤٠١)

''تم اپنے باپوں کی قسم نہ کھاؤ۔ جس نے قسم کھانی ہو اسے اللہ ہی کی قسم کھانی چاہیے۔''

لیکن یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ انسان کا یہ کہنا: ''یہ بات میرے ذمے ہے۔'' اس سے ذمے کے ساتھ حلف اور قسم مراد نہیں ہوتی' بلکہ اس سے عہد مراد ہوتا ہے' یعنی اس بات کے بارے میں میرا عہد ہے اور یہ میری ذمہ داری ہے (کہ میں اسے پورا کروں گا) اور اگر اس سے واقعی قسم مراد ہو تو پھر یہ بھی غیر اللہ کی قسم ہونے کی وجہ سے جائز نہ ہوگی' لیکن مجھے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے لوگوں کا ارادہ قسم کا نہیں ہوتا بلکہ ان کا ذمے سے ارادہ عہد کا ہوتا ہے اور ذمے کا لفظ عہد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

قبر والوں سے دعا اور ان کا طواف حرام ہے

سوال جو شخص قبروں کی پوجا کرے' ان کے گرد طواف کرے' قبر والوں سے دعا کرے' ان کے لیے نذر مانے یا اس قسم کی دیگر عبادات بجا لائے' اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب یہ ایک بہت عظیم سوال ہے' لہٰذا اللہ تعالیٰ کی توفیق و مدد کے ساتھ اس کا جواب قدرے تفصیل کے ساتھ دیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ اصحاب قبور کی درج ذیل دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: جس شخص کا اسلام پر خاتمہ ہوا ہو اور لوگ اس کی تعریف کرتے ہوں' ایسے شخص کے لیے خیر و بھلائی کی امید ہے' لیکن وہ اس بات کا بھی محتاج ہے کہ مسلمان بھائی اس کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اسے مغفرت و رحمت سے سرفراز فرمائے۔ ایسا شخص حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ کے عموم میں داخل ہے:

﴿وَالَّذِينَ جَاءُو مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿١٠﴾﴾ (الحشر: ٥٩/ ١٠)

''اور (مالِ فے ان کے لیے بھی ہے) جو ان (مہاجرین وانصار) کے بعد آئے (اور) وہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے

پروردگار! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو' جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں' معاف فرما اور مومنوں کے لیے ہمارے دل میں کینہ (وحسد) نہ پیدا ہونے دے۔ اے ہمارے پروردگار! تو بڑا شفقت کرنے والا' نہایت مہربان ہے۔''

وہ شخص جو فوت ہو گیا ہو' وہ خود کسی کو کوئی نفع نہیں دے سکتا' کیونکہ وہ خود ایک بے جان لاشہ ہے۔ وہ اپنی یا کسی کی تکلیف کو دور کرنے کی قطعاً کوئی استطاعت نہیں رکھتا اور نہ اپنے آپ کو یا کسی کو کوئی نفع پہنچا سکتا ہے' لہٰذا وہ اس بات کا محتاج ہے کہ اس کے مسلمان بھائی اسے نفع پہنچائیں جو اپنے مسلمان بھائیوں کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔

دوسری قسم: اصحاب قبور میں سے دوسری قسم ایسے لوگوں کی ہے جن کے افعال ایسے فسق و فجور تک پہنچ گئے ہوں جن کی وجہ سے انسان ملت اسلامیہ سے خارج ہو جاتا ہو' مثلاً وہ لوگ جو یہ دعویٰ کرتے ہوں کہ وہ اولیاء ہیں' غیب جانتے ہیں' بیماری سے شفا عطا کر سکتے ہیں اور وہ مختلف طریقوں سے نفع پہنچاتے ہیں' جو حسی اور شرعی طور پر معلوم نہیں' تو ایسے لوگوں کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے' ان کے لیے دعا کرنا یا رحمۃ اللہ علیہ کہنا جائز نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سے منع فرما دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ ءَامَنُوٓا أَن يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوٓا أُولِى قُرْبَىٰ مِنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَٰبُ ٱلْجَحِيمِ ﴿١١٣﴾ وَمَا كَانَ ٱسْتِغْفَارُ إِبْرَٰهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَن مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَآ إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُۥٓ أَنَّهُۥ عَدُوٌّ لِّلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ لَأَوَّٰهٌ حَلِيمٌ ﴿١١٤﴾ ﴾

(التوبة: ٩/ ١١٣-١١٤)

''پیغمبر اور مسلمانوں کو شایاں نہیں کہ جب ان پر ظاہر ہو گیا کہ مشرک اہل دوزخ ہیں' تو ان کے لیے بخشش مانگیں' گو وہ ان کے قرابت دار ہی ہوں۔ اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش مانگنا تو ایک وعدے کے سبب تھا' جو وہ اس سے کر چکے تھے' لیکن جب ان کو معلوم ہو گیا کہ وہ اللہ کا پکا دشمن ہے تو اس سے بیزار ہو گئے۔ کوئی شک نہیں کہ ابراہیم بڑے نرم دل اور متحمل تھے۔''

ایسے لوگ کسی کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع اور نہ ہی کسی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے امیدیں وابستہ کرے۔ اگر ایسا ہو کہ کسی کو ان کی کچھ کرامات نظر آتی ہوں مثلاً یہ کہ اس نے ان کی قبروں میں نور دیکھا ہو یا ان کی قبروں سے اچھی خوشبو وغیرہ محسوس کی ہو جب کہ ان کے بارے میں مشہور یہ ہو کہ ان کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے' تو یہ باتیں ابلیس کا دھوکا اور فریب ہوں گی تاکہ وہ لوگوں کو ان قبروں والوں کی وجہ سے فتنے میں مبتلا کر دے۔

میں اپنے مسلمان بھائیوں کو خبردار کرتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے وابستہ نہ ہوں' کیونکہ اللہ ہی کے ہاتھ میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے' تمام امور کا انجام اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی کسی مجبور و مضطر کی دعا سن سکتا ہے نہ اس کی تکلیف دور کر سکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ ٱللَّهِ ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ ٱلضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْـَٔرُونَ ﴿٥٣﴾ ﴾ (النحل: ١٦/ ٥٣)

''اور جو نعمتیں تم کو میسر ہیں' وہ سب اللہ کی طرف سے ہیں' پھر جب تمھیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اسی کے آگے تم چلاتے ہو۔''

مسلمان بھائیوں کو میری یہ بھی نصیحت ہے کہ دین کے بارے میں وہ رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی کی بھی تقلید یا اتباع نہ کریں' کیونکہ

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَّقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ﴿٢١﴾ ﴾ (الأحزاب: ٣٣/ ٢١)

’’یقیناً تمھارے لیے رسول اللہ (کی ذات) میں بہترین نمونہ ہے۔ ہر اس شخص کے لیے جو اللہ (سے ملاقات) اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہے اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرتا ہے۔‘‘

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ ﴾ (آل عمران: ٣/ ٣١)

’’(اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تمھیں دوست رکھے گا۔‘‘

تمام مسلمانوں کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ ولایت کا دعویٰ کرنے والے کے اعمال کا کتاب وسنت کی روشنی میں جائزہ لیں۔ اگر وہ کتاب وسنت کے مطابق ہوں تو امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اولیاء اللہ میں سے ہو اور اگر وہ کتاب وسنت کے مخالف ہوں تو پھر وہ اولیاء اللہ میں سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اولیاء اللہ کی پہچان کے لیے مبنی بر عدل وانصاف یہ میزان اور یہ کسوٹی بیان فرما دی ہے:

﴿ أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿٦٣﴾ ﴾ (یونس: ١٠/ ٦٢-٦٣)

’’سن رکھو! بے شک جو اللہ کے دوست ہیں، ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غم ناک ہوں گے (یعنی) وہ جو ایمان لائے اور پرہیز گار رہے۔‘‘

جو شخص مومن اور متقی ہو وہ اللہ کا ولی ہوگا اور جو مومن اور متقی نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کا ولی ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اگر اس میں ایمان وتقویٰ کا کچھ حصہ ہو تو اس میں ولایت کا بھی کچھ حصہ ہو سکتا ہے لیکن کسی شخص کے بارے میں پورے وثوق کے ساتھ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے بلکہ عمومی طور پر ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو مومن ومتقی ہو وہ اللہ کا ولی بھی ہوگا۔

معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ بسا اوقات ان جیسے امور کے ساتھ انسان کی آزمائش بھی کرتا ہے۔ انسان کسی قبر کے ساتھ وابستہ ہو کر صاحب قبر سے دعا کرتا یا اس کی مٹی کو تبرک کے طور پر لے لیتا ہے اور اس سے اس کا مطلوب حاصل ہو جاتا ہے، لیکن درحقیقت یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہوتی ہے کیونکہ یہ بات ہم جانتے ہیں کہ کوئی صاحب قبر دعا قبول نہیں کر سکتا اور کسی قبر کی مٹی کسی تکلیف کو دور نہیں کر سکتی اور نہ کوئی نفع پہنچا سکتی ہے۔ ہمیں یہ باتیں اس لیے معلوم ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُو مِن دُونِ اللَّهِ مَن لَّا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَن دُعَائِهِمْ غَافِلُونَ ﴿٥﴾ وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً وَكَانُوا بِعِبَادَتِهِمْ كَافِرِينَ ﴿٦﴾ ﴾ (الأحقاف: ٤٦/ ٥-٦)

’’اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو سکتا ہے جو ایسے کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہ دے سکے اور اس کو ان کے پکارنے ہی کی خبر نہ ہو۔ اور جب لوگ جمع کیے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہوں گے اور وہ ان کی پرستش سے انکار کریں گے۔‘‘

اور فرمایا:

﴿ وَٱلَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْـًٔا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ﴿٢٠﴾ أَمْوَٰتٌ غَيْرُ أَحْيَآءٍ ۖ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ﴿٢١﴾ ﴾ (النحل: ١٦/ ٢٠-٢١)

’’اور جن لوگوں کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کوئی چیز بھی تو تخلیق نہیں کر سکتے بلکہ وہ خود تخلیق ہوتے ہیں، (وہ) مردہ ہیں زندہ نہیں ہیں۔ انھیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ اٹھائے کب جائیں گے۔‘‘

اس مفہوم کی اور بھی بہت سی آیات کریمہ ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ کے سوا جس کسی کو بھی پکارا جائے وہ پکار کو قبول نہیں کر سکتا اور پکارنے والے کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا، البتہ غیر اللہ کو پکارنے کی صورت میں کبھی امتحان و آزمائش کے طور پر مطلوب حاصل ہو جاتا ہے۔ ہم یہاں یہ عرض کریں گے کہ یہ مطلوب دعا کرنے والے کی دعا کے وقت حاصل ہوا ہے جو غیر اللہ سے کی گئی تھی، اس شخص کی دعا کی وجہ سے نہیں جسے اللہ کے سوا پکارا جا رہا ہے اور کسی چیز کے ساتھ کسی چیز کے حصول اور کسی چیز کے وقت کسی چیز کے حصول میں فرق واضح ہے اور ہمیں علم الیقین کی حد تک یہ بات ان بہت سی آیات کریمہ کی روشنی میں معلوم ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے کہ غیر اللہ کو پکارنا نفع کے حاصل کرنے یا نقصان کے دور کرنے کا سبب نہیں ہو سکتا، لیکن امتحان و آزمائش کے طور پر کبھی کبھی مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کبھی اسباب معصیت کے ساتھ بھی انسان کی آزمائش کرتا ہے تاکہ معلوم کرے کہ اس کا سچا بندہ کون ہے اور اپنی خواہشات نفس کا پجاری کون؟

یہود کے ان اصحاب سبت کو دیکھیے جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہفتے کے دن میں مچھلیوں کے شکار کو حرام قرار دیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں اس طرح آزمائش میں مبتلا کر دیا کہ ہفتے کے دن مچھلیاں بہت کثرت کے ساتھ آتی تھیں اور باقی دنوں میں چھپ جاتی تھیں۔ جب یہ صورت حال خاصے طویل عرصے تک رہی تو وہ کہنے لگے کہ آخر ہم اپنے آپ کو ان مچھلیوں سے کیوں محروم رکھیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں حیلے بہانے اور تدبیریں سوچنی شروع کر دیں اور پھر کہنے لگے کہ ہم جال جمعے کے دن ڈال دیا کریں گے اور مچھلیوں کو اتوار کے روز پکڑ لیا کریں گے۔ انھوں نے ایسا کیا تو یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ ایک کام کو حلال قرار دینے کا ایک حیلہ تھا۔ اس لیے (مکافات عمل کے طور پر) اللہ تعالیٰ نے انھیں انسانوں سے ذلیل و خوار بندروں کی صورت میں تبدیل کر دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ ٱلْقَرْيَةِ ٱلَّتِى كَانَتْ حَاضِرَةَ ٱلْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ فِى ٱلسَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ ۙ لَا تَأْتِيهِمْ ۚ كَذَٰلِكَ نَبْلُوهُم بِمَا كَانُوا۟ يَفْسُقُونَ ﴿١٦٣﴾ ﴾ (الأعراف: ٧/ ١٦٣)

’’اور (اے نبی!) ان (یہود مدینہ) سے اس قصبے کا حال تو پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھا۔ جب یہ لوگ ہفتے کے دن کے بارے میں حد سے تجاوز کرنے لگے، جب ان کے ہفتے کے دن مچھلیاں ان کے سامنے پانی کے اوپر آتیں اور جب ہفتے کا دن نہ ہوتا تو نہ آتیں۔ اسی طرح ہم ان لوگوں کو ان کی نافرمانیوں کے سبب آزمائش میں ڈالنے لگے۔‘‘

اور فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ ٱلَّذِينَ ٱعْتَدَوْا۟ مِنكُمْ فِى ٱلسَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا۟ قِرَدَةً خَٰسِـِٔينَ ﴿٦٥﴾ فَجَعَلْنَٰهَا نَكَٰلًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٦٦﴾ ﴾ (البقرة: ٢/ ٦٥-٦٦)

’’اور تم ان لوگوں کو خوب جانتے ہو جو تم میں سے ہفتے کے دن (مچھلی کا شکار کرنے) میں حد سے تجاوز کر گئے تھے تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل وخوار بندر ہو جاؤ‘ پھر ہم نے اس قصے کو اس وقت کے لوگوں کے لیے اور ان کے بعد آنے والوں کے لیے عبرت اور پرہیز گاروں کے لیے نصیحت بنا دیا۔‘‘

دیکھیے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اس دن ان مچھلیوں تک رسائی کو کیسے آسان بنا دیا تھا جس دن ان کے لیے شکار کو ممنوع قرار دے دیا گیا تھا؟ لیکن۔ العیاذ باللہ. ان لوگوں نے صبر نہ کیا اور اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ کام کو حلال قرار دینے کے لیے حیلہ تراش لیا۔

پھر اس واقعہ کا حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اس واقعہ سے تقابل کیجیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی اس طرح آزمائش کی کہ حالت احرام میں ان کے لیے شکار کرنے کو حرام قرار دے دیا‘ حالانکہ شکار ان کی زد میں تھا‘ لیکن انھوں نے شکار کرنے کی جرات نہ کی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرما دیا تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَيَبْلُوَنَّكُمُ ٱللَّهُ بِشَىْءٍ مِّنَ ٱلصَّيْدِ تَنَالُهُۥٓ أَيْدِيكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ ٱللَّهُ مَن يَخَافُهُۥ بِٱلْغَيْبِ ۚ فَمَنِ ٱعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُۥ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٩٤﴾ ﴾ (المائدة: ٥/ ٩٤)

’’مومنو! اللہ اس چیز کے شکار سے‘ جن کو تم ہاتھوں اور نیزوں سے پکڑ سکو‘ ضرور تمھاری آزمائش کرے گا (یعنی حالت احرام میں شکار کی ممانعت سے) تاکہ معلوم کرے کہ اس سے غائبانہ کون ڈرتا ہے‘ تو جو اس کے بعد حد سے گزرے‘ اس کے لیے دکھ دینے والا عذاب (تیار) ہے۔‘‘

شکار حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں کی پہنچ میں تھا‘ وہ اسے بآسانی شکار کر سکتے تھے لیکن وہ اللہ سے ڈر گئے اور انھوں نے قطعاً کسی قسم کا کوئی شکار نہ کیا۔

اسی طرح ہر انسان کے لیے یہ واجب ہے کہ جب اس کے لیے کسی حرام فعل کے اسباب میسر ہوں تو وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور اس حرام فعل کا ارتکاب نہ کرے اور اس بات کو خوب جان لے کہ حرام فعل کے لیے اسباب و وسائل کا میسر آنا درحقیقت آزمائش اور امتحان ہے‘ لہٰذا حرام فعل کے ارتکاب سے باز رہے اور صبر کرے کہ اچھا انجام پرہیز گاروں ہی کو نصیب ہوگا۔

قبر پر مسجد اور عمارت یا مسجد میں قبر بنانا حرام ہے

سوال قبروں کے ان پجاریوں کو ہم کیا جواب دیں جو مسجد نبوی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دفن ہونے کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں؟

جواب اس کے کئی جواب دیے جا سکتے ہیں:

- مسجد نبوی قبر پر نہیں بنائی گئی تھی بلکہ یہ مسجد تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں تعمیر کی گئی تھی۔
- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد میں دفن نہیں کیا گیا تھا بلکہ آپ کو آپ کے گھر میں دفن کیا گیا تھا‘ لہٰذا اسے نیک لوگوں کو مسجد میں دفن کیے جانے

کے لیے دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔

- نبی ﷺ کے گھروں کو‘ جن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا گھر بھی تھا‘ مسجد میں داخل کرنا تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اتفاق سے نہیں تھا بلکہ یہ تو اکثر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے رخصت ہو جانے کے بعد تقریباً 94ھ میں ہوا تھا‘ لہٰذا اس کی صحابہ نے اجازت نہیں دی تھی بلکہ بعض نے مخالفت بھی کی تھی۔ مخالفت کرنے والوں میں جلیل القدر تابعی حضرت سعید بن مسیّب بھی تھے۔
- قبر مسجد میں نہیں ہے حتی کہ حجرے کو مسجد میں داخل کرنے کے بعد بھی نہیں ہے کیونکہ قبر شریف تو مسجد سے الگ ایک مستقل حجرے میں ہے اور مسجد قبر پر نہیں بنائی گئی تھی۔ اسی وجہ سے اس جگہ کو تین دیواروں کے ساتھ محفوظ کر دیا گیا تھا‘ جو اس کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور دیوار کو ایسا زاویہ دے دیا گیا ہے‘ جس نے اسے قبلہ سے الگ کر دیا ہے‘ یعنی یہ مثلث شکل میں ہے اور اس کا ایک کنارہ شمالی زاویے میں ہے کہ نماز پڑھتے ہوئے انسان کا منہ اس کی طرف نہیں ہوتا کیونکہ یہ قبلہ رخ سے ہٹا ہوا ہے‘ لہٰذا اہل قبور کا اس شبہ سے استدلال باطل ہے۔

سوال قبروں پر عمارت بنانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب قبروں پر عمارت بنانا حرام ہے‘ کیونکہ نبی ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے اور منع اس لیے فرمایا ہے کہ اس میں اہل قبور کی تعظیم ہے اور یہ قبروں کی پوجا کا وسیلہ اور ذریعہ بنتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ انھیں بھی معبود تسلیم کیا جانے لگتا ہے جیسا کہ ان بہت سے مزاروں پر ہو رہا ہے جنھیں قبروں پر تعمیر کیا گیا ہے۔ لوگ اصحاب قبور کو اللہ تعالیٰ کا شریک سمجھتے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ انھیں بھی پکارنے لگتے ہیں‘ جب کہ اصحاب قبور کو پکارنا اور تکلیفوں اور مصیبتوں کے دور کرنے کے لیے ان سے مدد مانگنا شرک اکبر اور اسلام سے مرتد ہونا ہے۔ واللہ المستعان.

سوال مسجدوں میں مردوں کے دفن کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب نبی ﷺ نے مسجدوں میں دفن کرنے اور قبروں پر مسجدیں بنانے سے منع کیا ہے۔ آپ نے اپنے مرض الموت میں ایسا کرنے والوں پر لعنت فرمائی‘ اپنی امت کو اس سے ڈرایا اور فرمایا کہ یہ یہود و نصاریٰ کا فعل ہے۔ ① یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کا وسیلہ ہے۔ قبروں پر مسجدوں کا بنانا اور ان میں مردوں کو دفن کرنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کا اس لیے وسیلہ بنتا ہے کہ لوگ یہ عقیدہ اختیار کر لیتے ہیں کہ مسجدوں میں مدفون یہ لوگ نفع و نقصان کا اختیار رکھتے ہیں یا انھیں یہ خاصیت حاصل ہے کہ اللہ کے سوا ان کی اطاعت کر کے ان کا تقرب حاصل کیا جائے‘ لہٰذا مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اس خطرناک کام سے اجتناب کریں‘ مسجدیں قبروں سے پاک ہوں اور انھیں توحید اور صحیح عقیدے پر بنایا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَأَنَّ ٱلْمَسَٰجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا۟ مَعَ ٱللَّهِ أَحَدًا ۝١٨ ﴾ (الجن: ۷۲/۱۸)

’’اور یہ کہ مسجدیں (خاص) اللہ کی ہیں‘ پس اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔‘‘

---

① صحیح البخاری‘ الجنائز‘ باب ما یکرہ من اتخاذ المساجد علی القبور‘ حدیث: 1330 و صحیح مسلم‘ المساجد‘ باب النھی عن بناء المساجد علی القبور...... حدیث: 529

لہٰذا واجب ہے کہ مسجدیں صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے ہوں' شرک کے تمام مظاہر سے پاک ہوں اور ان میں صرف اور صرف اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کی جائے۔ مسلمانوں پر یہی واجب ہے۔ واللہ الموفق.

نبی ﷺ کی قبر کی زیارت کے لیے سفر کرنا جائز نہیں

سوال نبی ﷺ کی قبر کی زیارت کے لیے سفر کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب قبروں کی زیارت کے لیے سامان سفر باندھنا' خواہ قبریں کوئی بھی ہوں' جائز نہیں ہے کیونکہ خود نبی ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے:

«لاَ تُشَدُّ الرِّحَالُ إلاَّ إلٰى ثَلاَثَةِ مَسَاجِدَ، مَسْجِدِي هٰذَا، وَمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَسْجِدِ الأَقْصٰى»(صحيح البخاري، كتاب وباب فضل الصلاة في مسجد مكة والمدينة، ح:١١٨٩ وصحيح مسلم، الحج، باب فضل المساجد الثلاثة، ح:١٣٩٧ واللفظ له)

''تین مسجدوں: میری یہ مسجد' مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سامان سفر نہ باندھا جائے۔''

مقصود یہ ہے کہ عبادت کے قصد وارادے سے کسی بھی جگہ جانے کے لیے سامان سفر نہ باندھا جائے کیونکہ صرف تین ہی ایسی مخصوص جگہیں ہیں جن کی طرف سامان سفر باندھا جاسکتا ہے اور یہ مذکورہ بالا تین مساجد ہیں لہٰذا ان کے سوا دیگر کسی بھی جگہ کی طرف سامان سفر نہ باندھا جائے۔ اسی طرح نبی ﷺ کی قبر کی طرف بھی سامان سفر نہ باندھا جائے' البتہ آپ کی مسجد کی طرف سامان سفر باندھا جاسکتا ہے اور مسجد میں پہنچنے کے بعد مردوں کے لیے نبی ﷺ کی قبر کی زیارت مسنون ہے جب کہ عورتوں کے لیے آپ ﷺ کی قبر کی زیارت مسنون نہیں ہے۔ واللہ الموفق.

قبروں سے تبرک اور ان کا طواف حرام ہے

سوال قبروں سے تبرک حاصل کرنے' طلب حاجت یا تقرب کے ارادے سے ان کے گرد طواف کرنے اور غیر اللہ کی قسم کھانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب قبروں سے تبرک حاصل کرنا حرام اور شرک کی ایک قسم ہے کیونکہ اس طرح ایک چیز سے ایسی تاثیر وابستہ کی جاتی ہے' جس کی اللہ نے کوئی سند نازل نہیں فرمائی۔ سلف صالحین بھی اس قسم کے کسی تبرک کے قائل نہ تھے' لہٰذا اس اعتبار سے یہ کام بدعت بھی ہے۔ تبرک حاصل کرنے والے کا اگر یہ عقیدہ ہو کہ نقصان سے بچانے اور نفع پہنچانے میں صاحب قبر کو کوئی تاثیر یا قدرت حاصل ہے تو یہ شرک اکبر ہوگا۔ جب وہ اسے جلب منفعت یا دفع مضرت کے لیے پکارے یا اس کی عبادت کرتے ہوئے اس کے سامنے رکوع یا سجدہ کرے یا حصول تقرب یا صاحب قبر کی تعظیم کے لیے وہاں جانور ذبح کرے تو یہ بھی شرک اکبر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَن يَدْعُ مَعَ ٱللَّهِ إِلَـٰهًا ءَاخَرَ لَا بُرْهَـٰنَ لَهُۥ بِهِۦ فَإِنَّمَا حِسَابُهُۥ عِندَ رَبِّهِۦٓ ۚ إِنَّهُۥ لَا يُفْلِحُ ٱلْكَـٰفِرُونَ ﴿١١٧﴾ ﴾ (المؤمنون: ٢٣/ ١١٧)

''اور جو شخص اللہ کے ساتھ اور معبود کو پکارتا ہے جس کی اس کے پاس کوئی سند نہیں تو اس کا حساب اللہ ہی کے پاس ہے۔ بے

شک کافر فلاح نہیں پائیں گے۔"

اور فرمایا:

﴿ فَمَن كَانَ يَرْجُواْ لِقَآءَ رَبِّهِۦ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَٰلِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِۦٓ أَحَدًۢا ﴿١١٠﴾ ﴾ (الكهف: ١٨/ ١١٠)

"پس جو شخص اپنے پروردگار سے ملنے کی امید رکھے تو اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔"

یاد رہے جو شخص شرک اکبر کا ارتکاب کرے وہ کافر اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنمی ہے اس پر جنت حرام ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّهُۥ مَن يُشْرِكْ بِٱللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ ٱللَّهُ عَلَيْهِ ٱلْجَنَّةَ وَمَأْوَىٰهُ ٱلنَّارُ ۖ وَمَا لِلظَّٰلِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ ﴿٧٢﴾ ﴾

(المائدة: ٥/ ٧٢)

"بلاشبہ جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرے اللہ اس پر بہشت کو حرام کر دے گا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔"

جہاں تک غیر اللہ کی قسم کھانے کا سوال ہے تو اگر قسم کھانے والے کا عقیدہ یہ ہو کہ جس کی وہ قسم کھا رہا ہے اس کا مقام و مرتبہ اس طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا مقام و مرتبہ ہے تو اس صورت میں غیر اللہ کی قسم کھانے والا شرک اکبر کا مرتکب ہوگا اور اگر اس کا یہ عقیدہ تو نہ ہو لیکن اس کے دل میں اس کی اس قدر تعظیم ہو جو اسے اس کی قسم کھانے پر مجبور کرتی ہو تو وہ شرک اصغر کا مرتکب ہوگا کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللهِ فَقَدْ كَفَرَ أَوْ أَشْرَكَ»(جامع الترمذي، النذور والأيمان، باب ماجاء في أن من حلف بغير الله فقد أشرك، ح:١٥٣٥)

"جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے کفر یا شرک کیا۔"

اس شخص کی تردید واجب ہے جو قبروں سے تبرک حاصل کرے یا قبروں والوں کو پکارے یا غیر اللہ کی قسم کھائے۔ اس کے سامنے یہ واضح کر دیا جائے کہ یہ بات اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ہرگز نہ بچا سکے گی کہ "ہم نے یہ چیز اپنے بزرگوں سے اسی طرح حاصل کی ہے۔" کیونکہ یہ دلیل تو حضرات انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کرنے والے مشرک بھی پیش کیا کرتے تھے۔ (جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے):

﴿ إِنَّا وَجَدْنَآ ءَابَآءَنَا عَلَىٰٓ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰٓ ءَاثَٰرِهِم مُّقْتَدُونَ ﴿٢٣﴾ ﴾ (الزخرف: ٤٣/ ٢٣)

"ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک راہ پر پایا ہے اور ہم قدم بقدم انھی کے پیچھے چلنے والے ہیں۔"

تو اس کے جواب میں ان کے رسول نے ان سے فرمایا:

﴿ أَوَلَوْ جِئْتُكُم بِأَهْدَىٰ مِمَّا وَجَدتُّمْ عَلَيْهِ ءَابَآءَكُمْ ۖ قَالُوٓاْ إِنَّا بِمَآ أُرْسِلْتُم بِهِۦ كَٰفِرُونَ ﴿٢٤﴾ ﴾

(الزخرف: ٤٣/ ٢٤)

"اگرچہ میں تمھارے پاس اس سے زیادہ راستی کا طریقہ لایا ہوں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا؟ وہ کہنے لگے: یقیناً تمھیں جس کے ساتھ بھیجا گیا ہے ہم تو اس کا انکار کرتے ہیں۔"

(اس کے جواب میں) اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَٱنتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۖ فَٱنظُرْ كَيْفَ كَانَ عَٰقِبَةُ ٱلْمُكَذِّبِينَ ﴿٢٥﴾ ﴾ (الزخرف: ٤٣/ ٢٥)

’’پس ہم نے ان سے انتقام لیا‘ سو دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا؟‘‘

کسی شخص کے لیے یہ بات حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے باطل موقف کے حق میں یہ دلیل دے کہ اس نے اپنے باپ دادا کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے یا یہ اس کی عادت ہے۔ اگر وہ کوئی ایسی دلیل دے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک بودی دلیل ہوگی‘ جو اس کے قطعاً کام نہ آئے گی۔ اس طرح کی باتوں میں مبتلا لوگوں کو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور انھیں حق کی پیروی کرنی چاہیے‘ خواہ وہ کہیں بھی ہو‘ کسی سے بھی ملے یا کسی وقت بھی ملے۔ حق قبول کرنے سے لوگوں کی عادتیں یا عوام کی ملامتیں رکاوٹ نہیں بننی چاہئیں کیونکہ سچا مومن وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے کسی ملامت گر کی ملامت کو خاطر میں نہ لائے اور کوئی رکاوٹ اسے دین سے دور نہ کر سکے۔

ہم سب کو اللہ تعالیٰ ہر وہ کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے جس میں اس کی رضا ہو اور ہر اس کام سے محفوظ رکھے جو اس کی ناراضی اور سزا کا سبب بنے۔

دیواروں پر تصویریں لٹکانے اور تصویر والے کپڑے استعمال کرنے کا حکم

سوال ایسے کپڑے پہننے کے بارے میں کیا حکم ہے جن پر حیوان یا انسان کی تصویر بنی ہو؟

جواب کسی بھی انسان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ایسے کپڑے پہنے جن پر کسی حیوان یا انسان کی تصویر بنی ہو۔ ایسے ہی سرخ یا سفید رومال وغیرہ اوڑھنا بھی جائز نہیں جس پر کسی انسان یا حیوان کی تصویر بنی ہو کیونکہ حدیث سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ الْمَلاَئِكَةَ لاَ تَدْخُلُ بَيْتًا فِيهِ صُورَةٌ»(صحيح البخاري، اللباس، باب من كره القعود على الصور، ح:٥٩٥٨ وصحيح مسلم، اللباس والزينة، باب تحريم تصوير صورة الحيوان، ح:٢١٠٦)

’’بے شک فرشتے ایسے کسی گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کوئی تصویر ہو۔‘‘

لہٰذا کسی کو بھی یادگار کے طور پر اپنے پاس تصویریں نہیں رکھنی چاہییں۔ جس کے پاس یادگار کے طور پر تصویریں ہوں اسے انھیں تلف کر دینا چاہیے‘ خواہ اس نے تصویروں کو دیوار پر لٹکایا ہو یا انھیں البم میں سجایا ہو یا کسی اور جگہ رکھا ہو کیونکہ تصویروں کی موجودگی گھر والوں کو فرشتوں کی آمد سے محروم کر دیتی ہے اور مذکورہ بالا حدیث‘ جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے‘ نبی ﷺ کی صحیح حدیث ہے۔ واللہ اعلم.

سوال دیواروں پر تصویریں لٹکانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب دیواروں پر تصویریں خصوصاً بڑی بڑی تصویریں لٹکانا حرام ہے‘ خواہ ان میں جسم کا کچھ حصہ اور سر ہی نظر آتا ہو اور اس سے تعظیم کا مقصد صاف ظاہر ہے۔ شرک کی جڑ یہی غلو ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انھوں نے ان بتوں کے بارے میں فرمایا جن کی نوح علیہ السلام کی قوم عبادت کرتی تھی کہ یہ نیک لوگوں کے نام تھے جن کی انھوں نے اس لیے تصویریں بنائی تھیں

تا کہ انھیں دیکھ کر ان کی عبادت یاد آجائے اور پھر جب عرصہ دراز گزر گیا تو انھوں نے انہی بتوں کی پوجا شروع کر دی تھی۔ ①

کیا کیمرے کے ساتھ بنائی گئی تصویر جائز ہے؟

سوال فوری فوٹو گرافی کے آلے (کیمرے) کے ساتھ تصویر کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب فوری فوٹو گرافی کے آلے (کیمرے) کے ساتھ تصویر بنانا' جس میں ہاتھ سے کام کی ضرورت نہ ہو' اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ تصویر میں داخل نہیں ہے'② لیکن دیکھا یہ جائے گا کہ اس فوٹو گرافی سے مقصود کیا ہے۔ اگر مقصود فوٹو گرافی کے ذریعے سے بنائی گئی تصویروں کو بطور یادگار محفوظ کرنا ہے تو پھر یہ فوٹو گرافی حرام ہوگی کیونکہ وسائل کے لیے وہی حکم ہوتا ہے جو مقاصد کا ہوتا ہے اور یادگار کے لیے تصویروں کو رکھنا حرام ہے کیونکہ نبی ﷺ نے ہمیں یہ خبر دی ہے:

«إِنَّ الْمَلاَئِكَةَ لاَ تَدْخُلُ بَيْتًا فِيهِ صُورَةٌ»(صحيح البخاري، اللباس، باب من كره القعود على الصور، ح:٥٩٥٨ وصحيح مسلم، اللباس والزينة، باب تحريم تصوير صورة الحيوان، ح:٢١٠٦)

"بلاشبہ فرشتے ایسے کسی گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کوئی تصویر ہو۔"

اس سے معلوم ہوا کہ گھروں میں تصویروں کو رکھنا حرام ہے اور انہیں دیواروں پر لٹکانا بھی حرام ہے جائز نہیں اور گھر میں فرشتے داخل ہی نہیں ہوتے جس میں کوئی تصویر ہو۔

بدعت کی وضاحت اور عید میلاد کا حکم

سوال ہم ان اہل بدعت کی کس طرح تردید کریں جو اپنی بدعات کے سلسلے میں اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ

«مَنْ سَنَّ فِي الإِسْلاَمِ سُنَّةً حَسَنَةً»(صحيح مسلم، الزكاة، باب الحث علي الصدقة ولو بشق تمرة، ح:١٠١٧)

"جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ شروع کیا۔"

جواب اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ جس نے یہ فرمایا ہے:

«مَنْ سَنَّ فِي الإِسْلاَمِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا بَعْدَهُ»(صحيح مسلم، الزكاة، باب الحث على الصدقة ولو بشق تمرة، ح:١٠١٧)

"جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ شروع کیا' اسے اس کا اور اس کے بعد اس کے مطابق عمل کرنے والوں کا اجرو ثواب ملے گا۔"

---

① صحیح البخاری' التفسیر' باب: ﴿وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ﴾ حدیث: 4920

② فاضل مفتی رحمہ اللہ کا یہ موقف دیگر علمائے اسلام کے موقف کے خلاف ہے۔ دوسرے تمام علماء کیمرے اور ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر میں کوئی فرق نہیں کرتے' وہ دونوں کو یکساں حرام قرار دیتے ہیں' اس لیے کہ نص شرعی کا عموم ہر قسم کی تصویر کو شامل ہے اور یہی موقف صحیح ہے۔ (ص' ی)

اسی ذات گرامی ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے:

«عَلَيْكُم بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الأُمُورِ، فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلاَلَةٌ»(سنن أبي داود، السنة، باب في لزوم السنة، ح:٤٦٠٧ وسنن ابن ماجه، المقدمة، باب اتباع سنة الخلفاء الراشدين المهديين، ح:٤٣)

’’تم میری اور میرے راشد اور ہدایت یافتہ خلفاء کی سنت کو لازم پکڑو...... اور نئے نئے امور سے بچو کیونکہ ہر نیا کام بدعت اور ہر بدعت گمراہی ہے۔‘‘

لہٰذا آپ کے فرمان:

«مَنْ سَنَّ فِي الإِسْلاَمِ سُنَّةً حَسَنَةً»(صحيح مسلم، الزكاة، باب الحث على الصدقة ولو بشق تمرة، ح:١٠١٧)

’’جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ شروع کیا۔‘‘

کو اس حدیث کے سبب کے تناظر میں لیا جائے گا اور وہ یہ کہ نبی ﷺ نے خاندان مضر کے ان لوگوں پر صدقہ کی ترغیب دی تھی جو انتہائی شدید ضرورت اور فاقے کی حالت میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ تب ایک شخص چاندی کی ایک تھیلی لے کر آیا اور اس نے اسے نبی ﷺ کے آگے رکھ دیا‘ تو آپ نے فرمایا:

«مَنْ سَنَّ فِي الإِسْلاَمِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا بَعْدَهُ»(صحيح مسلم، الزكاة، باب الحث على الصدقة ولو بشق تمرة، ح:١٠١٧)

’’جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ شروع کیا‘ اسے اس کا اور اس کے بعد اس کے مطابق عمل کرنے والوں کا اجرو ثواب ملے گا۔‘‘

جب ہم نے اس حدیث کا سبب اور اس کا مفہوم سمجھ لیا تو معلوم ہوا کہ طریقہ شروع کرنے سے مراد اس کے مطابق عمل شروع کرنا ہے‘ اسے ایجاد کرنا مقصود نہیں ہے کیونکہ کسی عمل کا حکم تو اللہ اور اس کے رسول ہی کی طرف سے ہو سکتا ہے‘ لہٰذا اس حدیث کے معنی یہ ہوئے کہ جو شخص کسی سنت کے مطابق عمل کا آغاز کرے اور لوگ اس میں اس کی اقتدا کریں تو اسے اس سنت کے مطابق عمل کرنے کا اجر ملے گا اور ان لوگوں کے اجرو ثواب کے برابر بھی اجرو ثواب ملے گا جو اس کے مطابق عمل کریں گے۔ اس حدیث کے متعین معنی یہی ہیں یا اس حدیث سے مراد اس فعل یا وسیلے کو اختیار کرنا ہے جس کے ساتھ عبادت ادا کی جا سکے اور پھر لوگ بھی اس فعل یا وسیلے کے اختیار کرنے میں اس کی اقتدا کریں‘ مثلاً دینی کتب تصنیف کرنا‘ علم کے ابواب قائم کرنا‘ دینی مدارس بنانا اور دیگر کام کرنا جو کسی ایسے کام کے لیے وسیلہ بنیں جو شرعاً مطلوب ہو۔ جب انسان مطلوب شرعی تک پہنچانے والے کسی ایسے وسیلے کو اختیار کرے جس سے شریعت میں منع نہ کیا گیا ہو تو وہ بھی اس حدیث میں داخل ہوگا۔

اگر اس حدیث کے یہ معنی مراد لیے جائیں کہ انسان جو چاہے شریعت میں ایجاد کر سکتا ہے‘ تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں گویا دین اسلام مکمل نہیں ہوا تھا‘ لہٰذا ہر جماعت کو اپنا اپنا الگ طریقہ اور راستہ اختیار کرنے کی اجازت ہے‘ اس

طرح کا گمان کرکے اگر کوئی شخص کوئی بدعت ایجاد کرتا اور اسے سنت حسنہ قرار دیتا ہے تو اس کا یہ گمان بے حد غلط ہے کیونکہ رسول اکرم ﷺ کا یہ فرمان اس کی تکذیب کرتا ہے:

«كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلاَلَةٌ»(صحيح مسلم، الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة، ح:٨٦٧)

''ہر بدعت گمراہی ہے۔''

سوال عید میلاد النبی منانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب پہلی بات تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت کا دن قطعی طور پر معلوم ہی نہیں ہے۔ بعض معاصر اہل علم کی تحقیق یہ ہے کہ آپ کی ولادت باسعادت کی رات نو ربیع الاول ہے' بارہ ربیع الاول نہیں' لہٰذا بارہ ربیع الاول کو عید میلاد النبی منانا تاریخی اعتبار سے بے اصل ہے۔

دوسری بات یہ کہ شرعی اعتبار سے عید میلاد منانا ہی بے اصل ہے کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہوتا تو نبی اکرم ﷺ ضرور عید میلاد مناتے اور اپنی امت کو بھی ایسا کرنے کا حکم فرماتے۔ اگر آپ نے یہ کام خود کیا ہوتا یا امت کو اس کے کرنے کا حکم دیا ہوتا تو یہ حکم ضرور محفوظ ہوتا' کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا ٱلذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُۥ لَحَٰفِظُونَ ﴿٩﴾ ﴾ (الحجر: ١٥/ ٩)

''بے شک یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔''

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ اللہ کے دین میں عید میلاد منانے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ تو ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اسے ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے تقرب کے حصول کا ذریعہ قرار دیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پاک تک رسائی کا ایک معین طریقہ مقرر فرما دیا ہے اور وہ معین طریقہ وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ لے کر دنیا میں تشریف لائے تھے' لہٰذا ہم بندے از خود کوئی ایسا طریقہ کیسے ایجاد کر سکتے ہیں جو ہمیں اللہ تعالیٰ تک پہنچا دے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کی جناب میں گستاخی ہے کہ اس کے دین میں ہم اپنی طرف سے کوئی ایسی چیز ایجاد کر دیں جس کا دین سے کوئی تعلق نہ ہو۔ ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تکذیب بھی لازم آتی ہے:

﴿ ٱلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي ﴾ (المائدۃ: ٥/ ٣)

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں۔''

ہم عرض کریں گے کہ اگر عید میلاد منانے کا تعلق اس کامل دین سے ہے' تو رسول اللہ ﷺ کی وفات سے پہلے اسے موجود ہونا چاہیے اور اگر اس دین کامل میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کا تعلق دین سے ہو کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾ ''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا ہے۔''

اگر کوئی شخص یہ گمان کرے کہ اس کا تعلق تو کمال دین سے ہے لیکن یہ چیز رسول اللہ ﷺ کے بعد پیدا ہوئی ہے تو اس کی یہ بات اس آیت کریمہ کی تکذیب پر مشتمل ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ عید میلاد منانے والے لوگ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم' آپ سے محبت کا اظہار اور عید میلاد کے ذریعے سے آپ سے دلی وابستگی کے جذبات کو بیدار کرنا چاہتے ہیں اور یہ تمام امور عبادات سے

تعلق رکھتے ہیں۔ نبی ﷺ سے محبت عبادت ہے بلکہ اس وقت تک ایمان مکمل ہی نہیں ہوتا جب تک نبی ﷺ کی ذات گرامی اپنی جان، اپنی اولاد، اپنے والدین اور دیگر سب لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو۔ نبی ﷺ کی تعظیم بھی عبادت ہے، اسی طرح نبیٔ اکرم ﷺ کی محبت کے لیے جذبات کو ابھارنے کا تعلق بھی دین سے ہے کیونکہ اس طرح آپ کی لائی ہوئی شریعت کی طرف میلان ہوتا ہے۔ یوں عید میلاد بھی تقرب الٰہی کے حصول اور رسول اللہ ﷺ کی تعظیم کی وجہ سے عبادت ہے، اور جب یہ عبادت ہے تو کسی کو ہرگز ایسی عبادت کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ اللہ کے دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کرے جس کا دین سے تعلق نہ ہو یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اس کا حکم نہ دیا ہو، جیسا کہ عید میلاد کا دین سے کوئی تعلق نہیں اور جب اس کا دین میں کوئی تصور نہیں، تو معلوم ہوا کہ یہ بدعت اور حرام ہے۔ پھر ہم یہ بھی سنتے رہتے ہیں کہ عید میلاد کی محفلوں میں ایسے بڑے بڑے منکرات کا ارتکاب کیا جاتا ہے جنھیں شرعی، حسی یا عقلی طور پر جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ان محفلوں میں گا گا کر ایسی نعتیں پڑھی جاتی ہیں جن میں نبی ﷺ کے بارے میں بہت غلو سے کام لیا گیا ہوتا ہے، حتی کہ...... نعوذ باللہ ......آپ کو اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے بھی بڑا ثابت کیا جاتا ہے۔ عید میلاد منانے والوں کی اس بے وقوفی کے بارے میں ہم سنتے رہتے ہیں کہ ان محفلوں میں ولادت کا قصہ بیان کرنے والے جب یہ کہتے ہیں کہ پھر مصطفیٰ ﷺ کی ولادت ہوگئی تو اس لمحے سب لوگ کھڑے ہوجاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس محفل میں رسول اللہ ﷺ کی روح بھی تشریف لے آتی ہے اور ہم اس کے احترام میں کھڑے ہوتے ہیں، حالانکہ یہ بے وقوفی کی بات ہے اور پھر یہ ادب نہیں ہے کہ اس لمحے سب لوگ کھڑے ہوں، آپ تو اپنے لیے لوگوں کے کھڑے ہونے کو سخت ناپسند فرمایا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جنھیں تمام لوگوں کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے شدید محبت تھی اور وہ ہم سے کہیں بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کی تعظیم بجالانے والے تھے، ان کا رسول اللہ ﷺ کو دیکھ کر کھڑے ہونے کا معمول نہ تھا کیونکہ انھیں یہ معلوم تھا کہ آپ اسے ناپسند فرماتے ہیں۔ ① اگر آپ اپنی حیات طیبہ میں اسے ناپسند فرماتے تھے تو آپ کی وفات کے بعد ان محفلوں میں کھڑا ہونا کس طرح پسندیدہ ہوسکتا ہے؟

عید میلاد منانے کی اس بدعت کا رواج پہلی تین افضل صدیوں کے بعد شروع ہوا ہے اور پھر ان محفلوں میں اس طرح کے منکر امور کا ارتکاب کیا جاتا ہے جس سے دین میں خلل پیدا ہوتا ہے۔ ان محفلوں میں مردوں اور عورتوں کا اختلاط بھی ہوتا ہے اور دیگر کئی غلط کاموں کا ارتکاب بھی کیا جاتا ہے، لہٰذا انھیں قطعاً جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔

عید الام اور سالگرہ منانے کا حکم

سوال ''عید الام'' کے نام سے منائی جانے والی عید کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب تمام عیدیں جو شرعی عیدوں کے مخالف ہیں وہ سب بدعی اور نو ایجاد ہیں، جو کہ سلف صالحین کے عہد میں معروف نہ تھیں۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ ان میں سے کچھ عیدیں غیر مسلموں کی ایجاد ہوں، پھر ان میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے دشمنوں کے ساتھ مشابہت

---

① جامع الترمذي، الأدب، باب ماجاء في كراهية قيام الرجل للرجل، حديث: 2754,2755

بھی موجود ہے جبکہ شرعی عیدیں اہل اسلام کی مشہور و معروف ہیں اور وہ ہیں ① عید الفطر ② عید الاضحیٰ اور ③ ہفت روزہ عید یعنی جمعۃ المبارک۔ ان تین عیدوں کے سوا اسلام میں کسی اور عید کا کوئی تصور نہیں' لہٰذا ان کے علاوہ جو عیدیں بھی ایجاد کی گئی ہیں وہ سب مردود اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی شریعت میں باطل ہیں کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح البخاري، الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود، ح:٢٦٩٧ وصحيح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة، ح:١٧١٨)

''جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کی جو اس میں سے نہ ہو تو وہ مردود ہے۔''

یعنی اسے اس کے منہ پر دے مارا جائے گا اور اللہ کے ہاں وہ مقبول نہ ہوگی۔ ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں:

«مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة، ح:١٧١٨)

''جس شخص نے کوئی ایسا عمل کیا جس کے بارے میں ہمارا امر نہ ہو تو وہ مردود ہے۔''

جب یہ بات واضح ہو گئی تو اس سے معلوم ہوا کہ سوال میں مذکور اور ''عید الام'' (ماں کی عید) کے نام سے موسوم عید جائز نہیں ہے' لہٰذا اس میں عید جیسے شعائر مثلاً خوشی و مسرت کا اظہار اور تحائف وغیرہ دینا جائز نہیں۔ مسلمان کے لیے واجب ہے کہ وہ اپنے دین کو عزت کا ذریعہ سمجھے' اسی کو باعث فخر جانے' اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے مقرر کردہ حدود کی پابندی کرے اور اس دین قیم سے وابستہ ہو جائے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے پسند فرمایا ہے' اس میں اپنی طرف سے کوئی کمی بیشی نہ کرے۔ مسلمان کو یہ بھی چاہیے کہ وہ اندھا مقلد بن کر ہر کس و ناکس کے پیچھے نہ چلے بلکہ اسے چاہیے کہ وہ اپنی شخصیت کو اللہ تعالیٰ کی شریعت کے تقاضے کے مطابق مضبوط بنائے تاکہ وہ لوگوں کا متبوع بنے ان کا تابع نہ بنے۔ لوگوں کے لیے نمونہ بنے' ان کو اپنے لیے نمونہ نہ بنائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی شریعت تمام اعتبار سے جامع ہے' جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ ٱلْإِسْلَٰمَ دِينًا ﴾ (المائدة: ٥/ ٣)

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمھارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کیا ہے۔''

ماں کا اس سے کہیں زیادہ حق ہے کہ سال میں صرف ایک دن اس کے نام کیا جائے' بلکہ ماں کا اپنی اولاد پر یہ حق ہے کہ وہ اس کا پورا پورا خیال رکھیں' اس کے ادب و احترام کو بجالائیں' اس کی ضروریات کو پورا کریں اور ہر جگہ اور ہر وقت اس کی اطاعت بجالائیں بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم نہ آتی ہو۔

سوال بچوں کی ولادت یا شادی کی مناسبت سے عید (سالگرہ) منانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اسلام میں ہفت روزہ عید' جمعۃ المبارک'' رمضان کے بعد شوال کی یکم تاریخ کو ''عید الفطر'' اور دس ذوالحجہ کو ''عید الاضحیٰ''

کے سوا اور کسی عید کا کوئی تصور نہیں ہے، البتہ ''یوم عرفہ'' کو اہل عرفہ کے لیے عید کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جب کہ ایام تشریق کو عید الاضحیٰ کی متابعت میں ایام عید قرار دیا جاتا ہے۔ کسی شخص کا اپنی یا اپنے بچوں کی ولادت یا شادی کی سالگرہ منانا غیر شرعی ہے اور یہ جواز کی نسبت بدعت کے زیادہ قریب ہے۔

گھر سے بدشگونی لینے اور اسے منحوس خیال کرنے کا حکم

سوال ایک شخص نے ایک گھر میں سکونت اختیار کی، جہاں وہ بہت سی بیماریوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہو گیا جس کی وجہ سے وہ اور اس کے گھر والے اس گھر کو منحوس سمجھتے ہیں، تو کیا اس وجہ سے اس کے لیے اس گھر کو چھوڑنا جائز ہے؟

جواب بسا اوقات بعض گھر یا بعض سواریاں یا بعض بیویاں منحوس ہو سکتی ہیں جن کی رفاقت اللہ تعالیٰ کی حکمت کے ساتھ نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے یا جن کی وجہ سے منفعت ختم ہو سکتی ہے، لہٰذا اس گھر کو بیچ کر کسی دوسرے گھر میں منتقل ہونے میں کوئی حرج نہیں۔ ہو سکتا ہے جس نئے گھر میں وہ منتقل ہوا سے اللہ تعالیٰ باعث خیر و برکت بنا دے۔ حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّمَا الشُّؤْمُ فِي ثَلَاثَةٍ فِي الْفَرَسِ وَالْمَرْأَةِ وَالدَّارِ»(صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب ما ذكر في شؤم الفرس، ح:٢٨٥٨ وصحيح مسلم، السلام، باب الطيرة والفأل وما يكون فيه الشؤم، ح:٢٢٢٥)

''بدشگونی صرف تین چیزوں: گھوڑے، عورت اور گھر میں ہے۔''

یعنی بعض سواریوں، بعض بیویوں اور بعض گھروں میں بدشگونی ہو سکتی ہے۔ اگر انسان اس طرح کی کوئی چیز دیکھے تو جان لے کہ یہ اللہ عزوجل کی تقدیر کے ساتھ ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی حکمت کے ساتھ اسے مقدر کیا ہے تاکہ انسان کسی دوسری جگہ منتقل ہو جائے۔ واللہ اعلم.

وسیلے کے احکام

سوال وسیلے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب یہ بہت اہم سوال ہے، لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ قدرے تفصیل کے ساتھ اس کا جواب دیں۔ ''تَوَسُّل'' تَوَسَّلَ يَتَوَسَّلُ کا مصدر ہے، جس کے معنی ایسا وسیلہ اختیار کرنے کے ہیں جو مقصود تک پہنچا دے۔ گویا اس کا اصل معنی منزل مقصود تک پہنچنے کو طلب کرنا ہے۔ توسّل کی دو قسمیں ہیں:

(ا) صحیح وسیلہ: ایسا صحیح وسیلہ اختیار کرنا جو مطلوب تک پہنچا دے، اس کی کئی صورتیں ہیں جن میں سے چند حسب ذیل ہیں:

① اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے ساتھ وسیلہ: اس کی دو صورتیں ہیں:

▪ عمومی طور پر، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں غم و فکر کے دور کرنے کی یہ دعا ہے:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّي عَبْدُكَ، وَابْنُ عَبْدِكَ، وَابْنُ أَمَتِكَ، نَاصِيَتِي بِيَدِكَ، مَاضٍ فِيَّ حُكْمُكَ، عَدْلٌ فِيَّ قَضَاؤُكَ، أَسْأَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهِ نَفْسَكَ، أَوْ عَلَّمْتَهُ أَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ، أَوْ أَنْزَلْتَهُ فِي كِتَابِكَ أَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهِ فِي عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ أَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ

رَبِيعَ قَلْبِي وَنُورَ صَدْرِي وَجِلاَءَ حُزْنِي وَذَهَابَ هَمِّي»(مسند أحمد: ١/ ٣٩١)

''اے اللہ! بے شک میں تیرا بندہ ہوں' تیرے بندے کا بندہ ہوں' تیری باندی کا بیٹا ہوں' میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے' میرے بارے میں تیرا حکم جاری ہے' میرے بارے میں تیرا فیصلہ مبنی بر عدل وانصاف ہے۔ اے اللہ! میں تجھ سے تیرے ہر اس پاک نام کے وسیلے سے سوال کرتا ہوں جو تیرا نام ہے اور جس سے تو نے اپنی ذات کو موسوم کیا ہے یا جو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو بھی سکھایا ہے' یا جو تو نے اپنی کتاب میں نازل فرمایا ہے یا جسے تو نے اپنے پاس علم غیب میں رکھنے کو ترجیح دی ہے کہ قرآن مجید کو میرے دل کی بہار' میرے سینے کا نور اور میرے غموں اور دکھوں کو دور کرنے والا بنا دے۔''

اس دعا میں عمومی طور پر اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے وسیلے کو اختیار کیا گیا ہے: (اَسْئَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهِ نَفْسَكَ) ''میں تجھ سے تیرے ہر اس اسم پاک کے وسیلے سے سوال کرتا ہوں جو تیرا نام ہے اور جس سے تو نے اپنی ذات گرامی کو موسوم کیا ہے۔''

- خصوصی طور پر' اور وہ اس طرح کہ انسان اپنی کسی خاص حاجت کے لیے اللہ تعالیٰ کے کسی ایسے خاص اسم پاک کے وسیلے کو اختیار کرے جو اس حاجت کے مناسب حال ہو جیسا کہ حضرت ابوبکر ؓ سے مروی حدیث میں ہے کہ جب انھوں نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ مجھے کوئی ایسی دعا سکھا دیں جسے میں نماز میں مانگا کروں تو آپ نے فرمایا یہ دعا مانگا کرو:

«اَللّٰهُمَّ! إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي ظُلْمًا كَثِيرًا وَّلاَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلاَّ أَنْتَ، فَاغْفِرْلِي مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ، وَارْحَمْنِي إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ»(صحيح البخاري، الأذان، باب الدعاء قبل السلام، ح: ٨٣٤ وصحيح مسلم، الذكر والدعاء، باب الدعوات والتعوذ، ح: ٢٧٠٥)

''اے اللہ! بے شک میں نے اپنی جان پر بہت بہت ظلم کیا اور تیرے سوا کوئی گناہ نہیں بخش سکتا' پس تو اپنی خاص مغفرت سے میرے سارے گناہ معاف فرما دے اور مجھ پر رحم فرما' بے شک تو ہی بہت مغفرت کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔''

اس دعا میں اللہ تعالیٰ کے دو ایسے پاک ناموں کے وسیلے کے ساتھ مغفرت و رحمت کو طلب کیا گیا ہے جو اس مطلوب کے مناسب حال ہیں اور وہ ہیں ''غفور'' اور ''رحیم۔''

وسیلہ کی یہ قسم حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ میں داخل ہے:

﴿ وَلِلَّهِ ٱلْأَسْمَآءُ ٱلْحُسْنَىٰ فَٱدْعُوهُ بِهَا ﴾ (الأعراف: ٧/ ١٨٠)

''اور اللہ کے سب نام اچھے ہی اچھے ہیں' سو اس کو اس کے ناموں سے پکارا کرو۔''

یہاں پکارنے کا لفظ دعا کرنے اور عبادت کرنے کے دونوں معنوں کو شامل ہے۔

② **اللہ تعالیٰ کی صفات کے ساتھ وسیلہ:** اسماء کے ساتھ وسیلے کی طرح اس کی بھی دو قسمیں ہیں:

- عمومی طور پر' مثلاً آپ یہ کہیں کہ ''اے اللہ! میں تیرے اسمائے حسنیٰ اور صفات علیا کے وسیلے سے تجھ سے یہ سوال کرتا ہوں' اور پھر اس کے بعد اپنے مطلوب کو ذکر کریں۔

- خصوصی طور پر، یہ کہ اپنے خاص مطلوب کے لیے کسی مخصوص اور معین صفت کے وسیلے سے دعا کریں، جیسا کہ حدیث میں یہ دعا آتی ہے:

«اَللّٰهُمَّ بِعِلْمِكَ الْغَيْبَ، وَقُدْرَتِكَ عَلَى الْخَلْقِ، أَحْيِنِي مَا عَلِمْتَ الْحَيَاةَ خَيْرًا لِّي، وَتَوَفَّنِي إِذَا عَلِمْتَ الْوَفَاةَ خَيْرًا لِّي»(سنن النسائي، السهو، باب نوع آخر من الدعاء، ح:١٣٠٦)

”اے اللہ میں تیرے علم غیب اور مخلوق پر قدرت کے وسیلے سے تجھ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ جب تک تیرے علم کے مطابق میرے لیے زندہ رہنا بہتر ہے، مجھے زندہ رکھ اور جب تیرے علم کے مطابق میرے لیے مرنا بہتر ہو تو مجھے فوت کر دے۔“

اس دعا میں اللہ تعالیٰ کی صفت علم و قدرت کے وسیلے سے دعا کی گئی ہے اور یہ دونوں صفات مطلوب کے مناسب حال ہیں۔

اسی قبیل میں سے یہ بھی ہے کہ کسی صفت فعل کا وسیلہ اختیار کیا جائے۔ مثلاً: [اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيمَ] ”اے اللہ! تو محمد ﷺ اور آل محمد پر رحمت نازل فرما جس طرح تو نے ابراہیم اور آل ابراہیم پر رحمت نازل فرمائی تھی۔“

③ اللہ عزوجل کی ذات گرامی پر ایمان اور اس کے رسول پر ایمان کا وسیلہ: مثلاً یوں کہے کہ ”اے اللہ! میں تجھ پر اور تیرے رسول پر ایمان لایا ہوں، تو مجھے بخش دے یا مجھے اس کام کی توفیق عطا فرما دے۔“ یا یہ کہے کہ ”اے اللہ! میں تجھ پر اور تیرے رسول پر ایمان لانے کے وسیلے سے تجھ سے یہ سوال کرتا ہوں۔“ حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ میں بھی وسیلے کی یہی صورت مذکور ہے:

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَٱخْتِلَٰفِ ٱلَّيْلِ وَٱلنَّهَارِ لَءَايَٰتٍ لِّأُو۟لِى ٱلْأَلْبَٰبِ ﴿١٩٠﴾ ٱلَّذِينَ يَذْكُرُونَ ٱللَّهَ قِيَٰمًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِى خَلْقِ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَٰطِلًا سُبْحَٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ ٱلنَّارِ ﴿١٩١﴾ رَبَّنَآ إِنَّكَ مَن تُدْخِلِ ٱلنَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُۥ ۖ وَمَا لِلظَّٰلِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ ﴿١٩٢﴾ رَّبَّنَآ إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِى لِلْإِيمَٰنِ أَنْ ءَامِنُوا۟ بِرَبِّكُمْ فَـَٔامَنَّا ۚ رَبَّنَا فَٱغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّـَٔاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ ٱلْأَبْرَارِ ﴿١٩٣﴾﴾ (آل عمران: ٣/ ١٩٠-١٩٣)

”بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں، جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں سوچ بچار کرتے ہیں (وہ کہتے ہیں:) اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ سب کچھ بے فائدہ پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے، پس تو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے پروردگار! بے شک جس کو تو نے دوزخ میں ڈال دیا تو تو نے اسے رسوا کر دیا اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہم نے ایک ندا کرنے والے کو سنا کہ ایمان کے لیے پکار رہا تھا (یعنی) اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لے آئے، اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہ معاف فرما اور ہماری برائیوں کو ہم سے محو کر اور ہم کو دنیا سے نیک بندوں کے ساتھ اٹھا۔“

اس آیت میں عقل والوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی پر اپنے ایمان کے وسیلے سے یہ دعا کی کہ وہ ان کے گناہوں کو معاف فرما دے، ان کی خطاؤں کو معاف فرما دے اور انہیں اپنے نیک بندوں کے ساتھ دنیا سے اٹھائے۔

④ **عمل صالح کا وسیلہ:** جیسا کہ ان تین لوگوں کا واقعہ ہے جو رات بسر کرنے کے لیے ایک غار میں آگئے تھے اور غار کے منہ پر ایک بھاری پتھر گر گیا تھا جسے وہ دور ہٹانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے' پھر ان میں سے ہر ایک نے اپنے عمل صالح کا وسیلہ پیش کیا تھا' ان میں سے ایک نے اپنے والدین کے ساتھ نیکی کے عمل صالح کا' دوسرے نے اپنی عفت و پاک دامنی کا اور تیسرے نے اپنے مزدور کو پوری پوری مزدوری دینے کا وسیلہ پیش کیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے عمل صالح کا وسیلہ پیش کرتے ہوئے کہا تھا: ''اے اللہ! اگر یہ کام میں نے تیری رضا کیلئے کیا تھا تو تو ہماری اس مشکل کو دور فرما دے جس میں ہم مبتلا ہیں۔ اس سے وہ بھاری پتھر غار کے منہ سے ہٹ گیا تھا۔ ① چنانچہ یہ ہے عمل صالح کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وسیلہ اختیار کرنے کی مثال۔

⑤ **اپنی عاجزی اور حالت کا وسیلہ:** اپنے حال کو ذکر کر کے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وسیلہ پیش کرے' یعنی اپنی حاجت وضرورت کو بیان کرے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی حالت کو ذکر کرتے ہوئے یہ دعا کی تھی:

﴿ رَبِّ إِنِّي لِمَآ أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ ﴿٢٤﴾ ﴾ (القصص: ٢٨/ ٢٤)

''اے میرے پروردگار! بے شک تو میری طرف جو بھی خیر نازل کرے' میں اس کا محتاج ہوں۔''

اپنے حال کا ذکر کر کے انھوں نے وسیلہ پیش کیا تا کہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی نعمت کو نازل فرما دے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی یہ دعا بھی اسی اسلوب میں ہے:

﴿ قَالَ رَبِّ إِنِّي وَهَنَ ٱلْعَظْمُ مِنِّي وَٱشْتَعَلَ ٱلرَّأْسُ شَيْبًا وَلَمْ أَكُنۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴿٤﴾ ﴾

(مریم: ١٩/ ٤)

''انہوں نے کہا: اے میرے پروردگار! میری ہڈیاں (بڑھاپے کے سبب) کمزور ہوگئی ہیں اور میرا سر بڑھاپے (کی سفیدی) سے شعلہ مارنے لگا ہے اور اے میرے پروردگار! میں تجھ سے مانگ کر کبھی محروم نہیں رہا۔''

وسیلے کی یہ تمام قسمیں جائز ہیں کیونکہ حصول مقصود کے لیے ان میں جن اسباب کو اختیار کیا گیا ہے وہ درست ہیں۔

⑥ **نیک آدمی کی دعا کا وسیلہ:** اللہ تعالیٰ کی طرف کسی ایسے نیک آدمی کی دعا کا وسیلہ اختیار کیا جائے جس کی دعا کی قبولیت کی امید ہو۔ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نبیٔ اکرم ﷺ سے عام اور خاص ہر قسم کی دعا کے لیے درخواست کیا کرتے تھے' جیسا کہ صحیحین میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے: ''ایک شخص جمعے کے دن اس وقت مسجد نبوی میں داخل ہوا جب نبی ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے اس نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مال ہلاک ہوگئے اور رستے منقطع ہوگئے ہیں' آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ وہ ہم پر بارش نازل فرمائے۔ یہ سن کر نبی ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیے اور یہ دعا کی: [اَللّٰهُمَّ أَغِثْنَا] ''اے اللہ! ہمیں بارش عطا فرما۔'' آپ نے یہ دعا تین بار فرمائی اور جب آپ خطبہ مکمل فرمانے کے بعد منبر سے اترے تو آپ کی داڑھی مبارک سے بارش کے قطرے گر رہے تھے اور پھر پورا ایک ہفتہ بارش ہوتی رہی اور پھر دوسرے جمعے میں بھی جب نبی ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے تو اس شخص نے یا کسی اور نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! پانی سے مال غرق ہوگئے اور گھر منہدم ہوگئے ہیں' آپ اللہ

---

① صحيح البخاري' البيوع' باب إذا اشترى شيئاً لغيره بغير إذنه فرضي حديث : 2215

تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ اب وہ ہم سے بارش کو روک دے۔ نبی ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور یہ دعا کی: [اَللّٰھُمَّ حَوَالَیْنَا وَلَا عَلَیْنَا] ’’اے اللہ! (بارش کو) ہمارے گردوپیش لے جا اور اب ہم پر نہ برسا۔‘‘ آپ یہ دعا فرماتے ہوئے آسمان کی جس طرف بھی اشارہ کرتے بادل چھٹ جاتا حتی کہ لوگ مسجد سے نکل کر دھوپ میں چلنے لگے۔‘‘①

اسی طرح بہت سے واقعات سے یہ ثابت ہے کہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے نبیٔ اکرم ﷺ کی خدمت میں یہ درخواست کی کہ آپ ان کے لیے بطور خاص دعا فرمائیں، مثلاً نبیٔ اکرم ﷺ نے جب یہ ذکر فرمایا کہ آپ کی امت کے ستر ہزار افراد جنت میں کسی حساب وعذاب کے بغیر داخل ہوں گے اور یہ وہ لوگ ہوں گے جو نہ دم کرواتے ہیں، نہ داغ لگواتے ہیں، نہ بدشگونی پکڑتے ہیں اور اپنے رب تعالیٰ ہی پر بھروسا رکھتے ہیں، تو عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا: ’’اے اللہ کے رسول! آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ وہ مجھے بھی انھی لوگوں میں سے بنا دے۔‘‘ آپ نے فرمایا: [أَنْتَ مِنْهُمْ] ’’تم انھی میں سے ہو۔‘‘② تو یہ بھی جائز وسیلے کی ایک صورت ہے کہ انسان اس شخص سے دعا کی درخواست کرے جس کی دعا کی قبولیت کی امید ہو اور سائل کو چاہیے کہ اس کا ارادہ اپنے آپ کو اور اپنے اس بھائی کو نفع پہنچانا ہو، جس سے اس نے دعا کا مطالبہ کیا ہو، یعنی وہ صرف اپنے ہی لیے دعا کا خواستگار نہ ہو کیونکہ جب آپ کا ارادہ یہ ہوگا کہ آپ کے بھائی کو فائدہ پہنچے اور آپ کو بھی تو یہ آپ کی طرف سے بھائی کے ساتھ احسان ہو جائے گا۔ اس لیے جب کوئی انسان غائبانہ طور پر اپنے بھائی کے لیے دعا کرے تو فرشتہ کہتا ہے: (آمِينَ وَلَكَ بِمِثْلٍ) ’’اللہ تعالیٰ آپ کی دعا کو قبول فرمائے اور آپ کو بھی اسی طرح عطا فرمائے۔‘‘③ اس طرح دعا کرکے وہ احسان کرنے والوں میں سے ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

(ب) غیر صحیح وسیلہ: اس کی صورت یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی طرف کسی ایسی چیز کا وسیلہ پیش کرے جو وسیلہ ہے ہی نہیں، یعنی جس کا وسیلہ ہونا شریعت میں ثابت ہی نہیں کیونکہ اس طرح کا وسیلہ لغو، باطل اور معقول ومنقول کے خلاف ہوتا ہے، مثلاً کوئی انسان اللہ تعالیٰ کی طرف کسی میت کی دعا کا وسیلہ پیش کرے، یعنی وہ اس میت سے یہ مطالبہ کرے کہ وہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے تو یہ صحیح اور شرعی وسیلہ نہیں ہے بلکہ یہ تو کسی انسان کی بے وقوفی کی دلیل ہے کہ وہ میت سے یہ مطالبہ کرے کہ وہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کیونکہ جب کوئی انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے، لہٰذا کسی انسان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنی وفات کے بعد کسی کے لیے دعا کرے حتی کہ نبی ﷺ کے لیے بھی یہ ممکن نہیں کہ آپ اپنی وفات کے بعد کسی کے لیے دعا فرمائیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کی وفات کے بعد آپ کی دعا کے وسیلے کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش نہیں کیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں جب قحط سالی پیدا ہوئی تو انھوں نے اس طرح دعا کی:

---

① صحیح البخاری، الاستسقاء، باب الاستسقاء في المسجد الجامع، حدیث:1014 و صحیح مسلم، صلاۃ الاستسقاء، باب الدعا في الاستسقاء، حدیث: 897

② صحیح البخاری، الطب، باب من اکتوی أو کوی غیرہ......حدیث:5705 و صحیح مسلم، الإیمان، باب الدلیل علی دخول طوائف من المسلمین الجنۃ بغیر حساب، حدیث: 220 واللفظ لہ۔

③ سنن أبي داود، الوتر، باب الدعا بظھر الغیب، حدیث: 1534

«اَللّٰھُمَّ إِنَّا کُنَّا نَتَوَسَّلُ إِلَیْکَ بِنَبِیِّنَا ﷺ فَتَسْقِینَا، وَإِنَّا نَتَوَسَّلُ إِلَیْکَ بِعَمِّ نَبِیِّنَا فَاسْقِنَا»(صحیح البخاري، الاستسقاء، باب سؤال الناس الإمام الاستسقاء إذا قحطوا، ح: ۱۰۱۰)

’’اے اللہ! پہلے ہم تیرے نبی ﷺ سے بارش کی دعا کرواتے (جب وہ زندہ ہم میں موجود تھے) تو تو ہمیں بارش عطا فرما دیتا تھا۔ اب (جبکہ نبی ﷺ ہم میں موجود نہیں ہیں) تیرے نبی کے چچا کو ہم (دعا کے لیے) بطور وسیلہ پیش کر کے دعا کر رہے ہیں پس تو ہمیں بارش عطا فرما دے۔‘‘

اس کے بعد حضرت عباس ؓ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے دعا فرمائی۔ اگر میت سے دعا کا مطالبہ کرنا صحیح ہوتا اور یہ صحیح وسیلہ ہوتا تو حضرت عمر ؓ اور آپ کے ساتھ دیگر صحابۂ کرام ؓ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد بھی آپ ہی سے دعا کا مطالبہ کرتے کیونکہ حضرت عباس ؓ کی دعا کی نسبت آپ کی دعا کی قبولیت کی بہر حال زیادہ امید تھی۔ خلاصۂ کلام یہ کہ کسی میت کی دعا کے وسیلے کو اللہ تعالیٰ کی طرف پیش کرنا ایک باطل وسیلہ ہے جو قطعاً حلال اور جائز نہیں۔

اس طرح غیر صحیح وسیلے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کوئی انسان نبی ﷺ کی جاہ (مرتبہ) کے وسیلے کو پیش کرے کیونکہ دعا کرنے والے کے لیے نبی ﷺ کی جاہ مفید نہیں ہے۔ جاہ کا فائدہ تو خود رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی کو ہے دعا کرنے والے کو اس کا فائدہ نہیں ہے کہ وہ اسے وسیلے کے طور پر پیش کرے اور یہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ توسل صحیح اور ثمر بار وسیلہ اختیار کرنے کو کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت عظیم الشان جاہ (مرتبہ) حاصل ہے' تو آپ کو اس سے کیا فائدہ؟

اگر آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں صحیح وسیلہ پیش کرنا چاہتے ہیں تو یوں کہیں کہ اے اللہ! میں آپ پر اور آپ کے رسول پر ایمان کے وسیلے سے یہ دعا کرتا ہوں' یا یوں کہے کہ اے اللہ! مجھے آپ کے رسول سے جو محبت ہے' میں اس کے واسطہ سے تجھ سے یہ دعا کرتا ہوں' تو اس طرح کا وسیلہ اختیار کرنا صحیح اور ثمر بار ہے۔

وَلاء اور بَراء کا کیا مطلب ہے؟

سوال ولاء اور براء سے کیا مراد ہے؟

جواب براء اور ولاء اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کے لیے ہونی چاہیے۔ براء کے معنی یہ ہیں کہ انسان ہر اس چیز سے براءت کا اظہار کر دے جس سے اللہ تعالیٰ نے اظہار براءت فرمایا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِىٓ إِبْرَٰهِيمَ وَٱلَّذِينَ مَعَهُۥٓ إِذْ قَالُوا۟ لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءَٰٓؤُا۟ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ٱلْعَدَٰوَةُ وَٱلْبَغْضَآءُ أَبَدًا﴾ (الممتحنة: ۶۰/ ۴)

’’یقیناً تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے ابراہیم اور ان لوگوں میں ہے جو اس کے ساتھ تھے جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا تھا: بے شک ہم تم سے اور ان سے بری ہیں جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو۔ ہم تم سے منکر ہوئے' ہمارے اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بغض ظاہر ہو گیا ہے۔‘‘

یعنی مشرک قوم سے براءت کا اظہار کیا گیا ہے جیسا کہ حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ میں ہے:

﴿ وَأَذَٰنٌ مِّنَ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦٓ إِلَى ٱلنَّاسِ يَوْمَ ٱلْحَجِّ ٱلْأَكْبَرِ أَنَّ ٱللَّهَ بَرِىٓءٌ مِّنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ۙ وَرَسُولُهُۥ ﴾

(التوبة: ٩/ ٣)

”اور حج اکبر کے دن اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لوگوں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ اللہ مشرکوں سے بیزار ہے اور اس کا رسول بھی (ان سے دست بردار ہے۔)“

پس ہر مومن پر یہ واجب ہے کہ وہ ہر مشرک و کافر سے اشخاص کے لحاظ سے براءت کا اظہار کرے۔ اسی طرح ہر مسلم کے لیے یہ بھی واجب ہے کہ وہ ہر اس عمل سے بیزار ہو جائے جسے اللہ اور اس کا رسول ﷺ پسند نہیں فرماتے ہیں، خواہ وہ کفر نہ ہو بلکہ فسق و عصیان ہو، جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ ٱلْإِيمَٰنَ وَزَيَّنَهُۥ فِى قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ ٱلْكُفْرَ وَٱلْفُسُوقَ وَٱلْعِصْيَانَ ۚ أُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلرَّٰشِدُونَ ⑦ ﴾ (الحجرات: ٤٩/ ٧)

”لیکن اللہ نے تمھارے لیے ایمان کو عزیز بنا دیا اور اس کو تمھارے دلوں میں سجا دیا اور کفر اور گناہ اور نافرمانی کو تمھارے لیے ناپسندیدہ بنا دیا، یہی لوگ راہ ہدایت والے ہیں۔“

اگر کسی مومن میں ایمان بھی ہو اور وہ گناہوں کا ارتکاب بھی کرتا ہو تو اس کے ایمان کی وجہ سے ہم اسے پسند کریں گے اور اس کے گناہوں کی وجہ سے اسے ناپسند کریں گے۔ ہماری زندگی میں بھی اس طرح کے کئی معاملات پیش آتے ہیں جن میں بیک وقت پسند اور ناپسند کے دونوں پہلو ہو سکتے ہیں، مثلاً ایسی دوا جس کا ذائقہ اچھا نہ ہو، بد ذائقہ ہونے کی وجہ سے آپ اسے ناپسند کرتے ہیں اور اس میں شفا ہونے کی وجہ سے اسے پسند کرتے ہیں۔

بعض لوگ گناہ گار مومن کو ایک کافر کی نسبت زیادہ ناپسند کرتے ہیں تو یہ بہت عجیب اور حقائق کو بدل دینے والی بات ہے۔ کافر تو اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور مومنوں کا دشمن ہوتا ہے، لہٰذا ہمارے لیے واجب ہے کہ ہم اسے دل کی گہرائیوں سے ناپسند کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ عَدُوِّى وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَآءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِٱلْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا۟ بِمَا جَآءَكُم مِّنَ ٱلْحَقِّ يُخْرِجُونَ ٱلرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ ۙ أَن تُؤْمِنُوا۟ بِٱللَّهِ رَبِّكُمْ إِن كُنتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَٰدًا فِى سَبِيلِى وَٱبْتِغَآءَ مَرْضَاتِى ۚ تُسِرُّونَ إِلَيْهِم بِٱلْمَوَدَّةِ وَأَنَا۠ أَعْلَمُ بِمَآ أَخْفَيْتُمْ وَمَآ أَعْلَنتُمْ ۚ وَمَن يَفْعَلْهُ مِنكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ ٱلسَّبِيلِ ① ﴾

(الممتحنة: ٦٠/ ١)

”اے مومنو! اگر تم میری راہ میں لڑنے اور میری خوشنودی طلب کرنے کے لیے (مکے سے) نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ تم تو ان کو دوستی کے پیغام بھیجتے ہو اور وہ (دین) حق سے، جو تمھارے پاس آیا ہے، منکر ہیں اور اس وجہ سے کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لائے ہو، پیغمبر کو اور تم کو جلا وطن کرتے ہیں۔ تم ان کی طرف پوشیدہ پوشیدہ دوستی کے پیغام بھیجتے ہو اور جو کچھ تم خفیہ طور پر اور جو کچھ تم علانیہ کرتے ہو، وہ مجھے معلوم ہے اور جو کوئی تم میں سے ایسا کرے گا وہ سیدھے رستے سے بھٹک گیا۔“

اور فرمایا:

﴿ ۞ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ ٱلْيَهُودَ وَٱلنَّصَـٰرَىٰٓ أَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُۥ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلظَّـٰلِمِينَ ﴿٥١﴾ فَتَرَى ٱلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يُسَـٰرِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَىٰٓ أَن تُصِيبَنَا دَآئِرَةٌ ۚ فَعَسَى ٱللَّهُ أَن يَأْتِىَ بِٱلْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِّنْ عِندِهِۦ فَيُصْبِحُوا۟ عَلَىٰ مَآ أَسَرُّوا۟ فِىٓ أَنفُسِهِمْ نَـٰدِمِينَ ﴿٥٢﴾ ﴾

(المائدۃ: ۵/ ۵۱_۵۲)

’’اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ‘ یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو شخص تم میں سے ان کو دوست بنائے گا وہ بھی انھیں میں سے ہوگا۔ بیشک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ سو جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) مرض ہے تم ان کو دیکھو گے کہ ان میں دوڑ دوڑ کر ملے جاتے ہیں‘ کہتے ہیں کہ ہمیں خوف ہے کہ کہیں ہم پر زمانے کی گردش نہ آجائے۔ سو قریب ہے کہ اللہ فتح بھیجے یا اپنے ہاں سے کوئی اور امر (نازل فرمائے) پھر یہ اپنے دل کی باتوں پر‘ جو وہ چھپایا کرتے تھے پشیمان ہو کر رہ جائیں گے۔‘‘

یہ کافر تو آپ سے کبھی خوش ہو ہی نہیں سکتے سوائے اس کے کہ آپ ان کی ملت کا اتباع کریں اور اپنے دین کو بیچ دیں۔ (جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے):

﴿ وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ ٱلْيَهُودُ وَلَا ٱلنَّصَـٰرَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۗ ﴾ (البقرۃ: ۲/ ۱۲۰)

’’اور تم سے نہ تو یہودی کبھی خوش ہوں گے اور نہ عیسائی یہاں تک کہ آپ ان کے مذہب کی پیروی اختیار کرلیں۔‘‘

اور فرمایا:

﴿ وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ ٱلْكِتَـٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنۢ بَعْدِ إِيمَـٰنِكُمْ كُفَّارًا ﴾ (البقرۃ: ۲/ ۱۰۹)

’’بہت سے اہل کتاب یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لا چکنے کے بعد تمہیں پھر کافر بنادیں۔‘‘

اور اس کا تعلق کفر کی تمام قسموں مثلاً جھگڑے‘ انکار‘ تکذیب‘ شرک اور الحاد سے ہے۔ جہاں تک اعمال کا تعلق ہے‘ تو ہم ہر حرام عمل سے براءت کا اظہار کریں گے۔ حرام اعمال سے محبت کرنا اور انھیں اختیار کرنا ہمارے لیے جائز نہیں ہے۔ گناہ گار مومن کے گناہ سے ہم بے زار ہوں گے لیکن اس کے ایمان کی وجہ سے ہم اس سے دوستی اور محبت کریں گے۔

کفار کے ملک میں جانا‘ ان سے استفادہ کرنا یا ان کے ساتھ کام کرنا کیسا ہے؟

سوال کفار کے ممالک کی طرف سفر کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ سفر اگر سیاحت کے لیے ہو تو پھر کیا حکم ہے؟

جواب کفار کے ممالک کی طرف تین شرطوں کے بغیر سفر جائز نہیں ہے اور وہ تین شرطیں حسب ذیل ہیں: ① انسان کو اس قدر علم ہو‘ جس سے وہ کفار کے شبہات کا جواب دے سکے۔ ② اس کے دین کا پہلو اس قدر غالب ہو‘ جو اسے شہوات سے روک سکے۔ ③ اسے سفر کی کوئی واقعی ضرورت ہو۔

اگر یہ شرطیں موجود نہ ہوں تو پھر کفار کے ممالک کی طرف سفر کرنا جائز نہیں کیونکہ اس میں فتنہ یا خوف فتنہ ہے‘ نیز اس میں مال

کا ضیاع بھی ہے کہ اس طرح کے سفروں پر بہت سا مال خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اگر علاج یا ایسی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ان ممالک میں جانے کی ضرورت ہو جو اپنے ملک میں حاصل کرنا ممکن نہ ہو تو پھر بھی جیسا کہ ہم نے ذکر کیا اس کے پاس علم اور دین ہو تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں۔ جہاں تک کفار کے ممالک میں سیر و سیاحت کیلئے جانے کا تعلق ہے تو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سیر و سیاحت کیلئے اسلامی ممالک میں جانا چاہیے جہاں کے باشندے شعائرِ اسلام کی پابندی کرتے ہوں۔ ہمارے شہر...... بحمداللہ ...... اب تفریحی مقامات بن چکے ہیں' لہٰذا چھٹیوں کے زمانے میں ان تفریحی مقامات کی طرف جاسکتے ہیں۔

سوال فضیلۃ الشیخ! ایک شخص کفار کے ساتھ کام کرتا ہے' آپ اسے کیا نصیحت فرمائیں گے؟

جواب کفار کے ساتھ کام کرنے والے اس بھائی کو ہم یہ نصیحت کریں گے کہ وہ کوئی ایسا کام تلاش کرلے جس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے دشمنوں اور غیر مسلموں میں سے کوئی نہ ہو۔ اگر ممکن ہو تو ایسا ہی کرنا چاہیے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ اپنے کام میں ہے اور وہ اپنے کام میں ہیں بشرطیکہ اس کے دل میں ان کی محبت' مودت اور دوستی نہ ہو۔ سلام کہنے' جواب دینے اور دیگر امور میں شریعت کی پابندی کرے۔ اسی طرح ان کے جنازوں میں شرکت نہ کرے' ان کی عیدوں میں شامل نہ ہو اور نہ انھیں ان کی مبارک باد دے اور اس کے ساتھ ساتھ مقدور بھر کوشش کر کے انھیں اسلام کی دعوت بھی دیتا رہے۔

سوال کفار کے پاس جو کچھ موجود ہے' کسی ممنوع چیز کا ارتکاب کیے بغیر ہم اس سے کس طرح استفادہ کر سکتے ہیں؟ کیا اس میں ''مَصَالِح مُرْسَلَہ'' کا بھی دخل ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ کے دشمن اور ہمارے دشمن' یعنی کفار جو کچھ کرتے ہیں' اس کی حسب ذیل تین اقسام ہیں: ① عبادات ② عادات ③ صنعت و حرفت کے اعمال۔ جہاں تک عبادات کا تعلق ہے' تو یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ کسی بھی مسلمان کے لیے ان کی عبادات کی مشابہت اختیار کرنا جائز نہیں کیونکہ جو شخص عبادات میں ان کی مشابہت اختیار کرے گا' وہ ایک ایسے عظیم خطرے میں مبتلا ہے جو اسے دائرۂ اسلام سے نکال کر کفر تک پہنچا سکتا ہے۔ اسی طرح عادات' مثلاً لباس وغیرہ میں ان کی مشابہت بھی حرام ہے۔ کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا:

> «مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ»(سنن أبي داود، اللباس، باب ماجاء في لبس الشهرة، ح:٤٠٣١)
>
> ''جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے' وہ بھی انہی میں سے ہے۔''

جہاں تک ایسی صنعت و حرفت کا تعلق ہے جس میں مصالح عامہ ہوں' تو اسے ان سے سیکھنے اور استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ مشابہت اختیار کرنے کے قبیل سے نہیں ہے بلکہ یہ اعمال نافعہ میں مشارکت کے باب سے ہے کہ ان میں شریک ہونے والا ان کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے والا قرار نہیں پاتا۔

جہاں تک سائل کی اس بات کا تعلق ہے کہ ''کیا اس میں مصالح مرسلہ کا بھی دخل ہے؟'' تو ہم عرض کریں گے کہ مصالح مرسلہ کو مستقل دلیل قرار نہیں دینا چاہیے کیونکہ مصالح مرسلہ کے بارے میں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ ''مصالح'' ہیں اور شریعت ان کی صحت و قبولیت کی شاہد ہے تو پھر ان کا تعلق شریعت ہی سے ہے اور اگر شریعت ان کے باطل ہونے کی گواہی دے تو پھر یہ مصالح

مرسلہ نہیں، خواہ ان کے مطابق عمل کرنے والا انھیں مصالح مرسلہ ہی کیوں نہ گمان کرے اور اگر ان مصالح کا ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک سے بھی تعلق نہ ہو تو پھر یہ اپنے اصل کی طرف راجع ہوں گی اور وہ یہ کہ اگر ان کا تعلق عبادات سے ہے تو عبادات میں اصل حرمت ہے اور اگر ان کا تعلق غیر عبادات سے ہے تو پھر ان میں اصل حلت ہے۔ اس تفصیل سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ ”مصالح مرسلہ“ کوئی مستقل دلیل نہیں ہیں۔

غیر مسلموں کو جزیرۃ العرب میں بلانا کیسا ہے؟

سوال غیر مسلموں کے جزیرۃ العرب میں بلانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب غیر مسلموں کے جزیرۃ العرب میں بلانے کی صورت میں مجھے یہ خدشہ ہے کہ اس سے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت لازم آئے گی کیونکہ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مرض الموت میں فرمایا تھا:

«أَخْرِجُوا الْمُشْرِكِينَ مِنْ جَزِيرَةِ الْعَرَبِ»(صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب هل يستشفع الى أهل الذمة؟ ... ح:٣٠٥٣)

”مشرکوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔“

اسی طرح صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا تھا:

«لَأُخْرِجَنَّ الْيَهُودَ وَالنَّصَارٰى مِنْ جَزِيرَةِ الْعَرَبِ حَتّٰى لَا أَدَعَ إِلَّا مُسْلِمًا»(صحيح مسلم، الجهاد والسير، باب إخراج اليهود والنصارى من جزيرة العرب، ح:١٧٦٧)

”میں یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکال دوں گا حتی کہ میں یہاں مسلمان کے سوا کسی کو نہ چھوڑوں گا۔“

لیکن بوقت ضرورت انھیں بلانا جب کوئی مسلمان اس ضرورت کو پورا نہ کر سکتا ہو جائز ہے بشرطیکہ انھیں مطلقاً اقامہ نہ دیا جائے۔ اگر انہیں بلانے کی صورت میں عقیدے یا اخلاق کے اعتبار سے دینی مفاسد پیدا ہوتے ہوں تو پھر انھیں بلانا حرام ہے کیونکہ ایک جائز کام کی صورت میں جب فساد لازم آتا ہو تو وہ حرام ہو جاتا ہے جیسا کہ یہ ایک مشہور و معروف اصول ہے۔ ان کے بلائے جانے کی صورت میں جو مفاسد پیدا ہو سکتے ہیں، ان میں ان کے کفر سے محبت و رضامندی بھی ہے، ان کے ساتھ اختلاط کی صورت میں دینی غیرت کا خاتمہ بھی ہے۔ مسلمانوں کا وجود ہی سراپا خیر ہے...... بحمد اللہ...... اور وہ ہمارے لیے کافی ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے ہدایت و توفیق کی دعا کرتے ہیں۔

کیا دین ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے؟

سوال فضیلۃ الشیخ! بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کی پسماندگی کا سبب ان کے اپنے دین سے وابستگی ہے اور وہ اس سلسلے میں شبہ یہ پیش کرتے ہیں کہ مغرب نے جب دین کو خیر باد کہہ کر آزادی حاصل کر لی تو انھوں نے بے پناہ مادی ترقی کی، اسی طرح اپنے شبہ کی تائید میں وہ یہ بات بھی پیش کرتے ہیں کہ مغرب میں بہت بارشیں اور بہت فصلیں ہوتی ہیں تو آنجناب کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

جواب ایسی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کا ایمان کمزور ہو یا جو ایمان سے محروم ہو' تاریخ کے بارے میں جاہل اور اسباب نصرت سے ناواقف ہو۔ اسلام کے ابتدائی دور میں امت اسلامیہ جب اپنے دین سے وابستہ تھی' تو اسے عزت و سربلندی' قوت اور زندگی کے تمام میدانوں میں غلبہ حاصل تھا' بلکہ بعض لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ مغرب نے تمام علوم وفنون میں مسلمانوں کی ابتدائے اسلام کی ترقی ہی سے استفادہ کیا ہے' لیکن مسلمانوں نے جب اپنے دین کے بہت سے حصے کو چھوڑ دیا' اللہ تعالیٰ کے دین میں عقیدے اور قول وفعل کے اعتبار سے بہت سی ایسی باتیں ایجاد کرلیں جن کا دین سے کوئی تعلق نہ تھا' تو اس کی وجہ سے وہ ترقی کے میدان میں بہت پیچھے رہ کر پسماندگی کا شکار ہوگئے۔ ہمیں یقینی طور پر علم ہے اور ہم اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہم اپنے اسلاف کی طرح اپنے دین سے وابستہ ہو جائیں تو ہمیں بھی عزت و سربلندی اور تمام لوگوں پر غلبہ حاصل ہوسکتا ہے۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے ہرقل شاہ روم سے' جس کی سلطنت اس وقت دنیا کی سب سے بڑی سلطنت تھی' گفتگو کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات بیان کیے تو ہرقل نے کہا تھا: ''تم جو کچھ کہہ رہے ہو' اگر وہ بات سچی ہے تو وہ میرے ان دونوں قدموں کے نیچے کی زمین کا عنقریب مالک بن جائے گا۔'' ابوسفیان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جب ہرقل کے دربار سے باہر نکلا تو کہنے لگا کہ ابن ابی کبشہ کا معاملہ بہت مضبوط ہوگیا ہے کہ رومیوں کا بادشاہ بھی ان سے ڈرنے لگا ہے۔ ①

مغرب کی کافر اور ملحد حکومتوں کو صنعتوں وغیرہ میں جو ترقی حاصل ہوئی ہے' تو ہمارا دین اس سے مانع نہیں ہے۔ اگر ہم اس کی طرف توجہ کریں تو ہم بھی ترقی کر سکتے ہیں لیکن افسوس کہ ہم نے دنیا کو بھی ضائع کر دیا اور دین کو بھی ورنہ دین اسلام دنیوی ترقی کا مخالف نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَأَعِدُّوا۟ لَهُم مَّا ٱسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ ٱلْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِۦ عَدُوَّ ٱللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ ﴾

(الأنفال: ٨/ ٦٠)

''اور ان (کافروں کے مقابلے) کے لیے تم مقدور بھر قوت اور جنگی گھوڑے تیار رکھو جن سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو ڈرائے رکھو۔''

اور فرمایا:

﴿ هُوَ ٱلَّذِى جَعَلَ لَكُمُ ٱلْأَرْضَ ذَلُولًا فَٱمْشُوا۟ فِى مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا۟ مِن رِّزْقِهِۦ ﴾ (الملك: ٦٧/ ١٥)

''وہی تو ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو نرم (تابع) کیا' لہٰذا تم اس کی راہوں میں چلو پھرو اور اللہ کا دیا ہوا رزق کھاؤ۔''

اور فرمایا:

﴿ هُوَ ٱلَّذِى خَلَقَ لَكُم مَّا فِى ٱلْأَرْضِ جَمِيعًا ﴾ (البقرة: ٢/ ٢٩)

''وہی تو ہے جس نے سب چیزیں' جو زمین میں ہیں' تمھارے لیے پیدا کیں۔''

علاوہ ازیں اور بھی بہت سی آیات کریمہ ہیں جو واشگاف انداز میں یہ اعلان کر رہی ہیں کہ انسان کو کمانا چاہیے' عمل کرنا چاہیے

---

① صحيح البخاري' بدء الوحي' باب كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله ﷺ ...... حديث: 7

اور فائدہ حاصل کرنا چاہیے لیکن دین کو ہاتھ سے چھوڑ کر نہیں۔ جہاں تک ان کافر امتوں کا تعلق ہے تو یہ اپنی اصل ہی کے اعتبار سے کافر ہیں۔ جس دین کے یہ دعوے دار ہیں وہ دین ہی باطل ہے۔ ان کا دین اور الحاد برابر ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَمَن يَبۡتَغِ غَيۡرَ ٱلۡإِسۡلَٰمِ دِينٗا فَلَن يُقۡبَلَ مِنۡهُ ﴾ (آل عمران: ۳/ ۸۵)

”اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا، وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔“

اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کو دیگر کفار کی نسبت اگرچہ کچھ امتیاز حاصل ہے، لیکن آخرت کے اعتبار سے ان میں اور دیگر کفار میں کوئی فرق نہیں، اسی لیے نبی ﷺ نے قسم کھا کر فرمایا تھا ”کہ اس امت کا جو یہودی یا عیسائی میرے بارے میں سنے اور پھر میرے لائے ہوئے دین کی پیروی نہ کرے تو وہ جہنمی ہوگا۔“① بہرحال یہ سب لوگ کافر ہیں، خواہ وہ یہودی ہوں یا عیسائی یا وہ ان کی طرف منسوب نہ ہوں یعنی کسی اور عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں۔

جہاں تک بارشوں وغیرہ کی کثرت کا تعلق ہے، تو یہ انھیں ابتلاء و آزمائش کی صورت میں حاصل ہوتی ہیں اور پھر ان کے حصے کی اچھی اچھی چیزیں انھیں دنیا ہی میں حاصل ہو جاتی ہیں جب کہ آخرت میں ان کے لیے کچھ نہ ہوگا جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس وقت فرمایا جب انھوں نے آپ کو دیکھا کہ چٹائی پر لیٹنے کی وجہ سے آپ کے جسم اطہر پر نشان پڑ چکے ہیں، یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ رونے لگے اور عرض کرنے لگے: اے اللہ کے رسول! ایرانی و رومی تو عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور آپ اس حال میں ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَوَ فِي شَكٍّ أَنْتَ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ؟ أُولَئِكَ قَوْمٌ عُجِّلَتْ لَهُمْ طَيِّبَاتُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا»
(صحيح البخاري، المظالم، باب الغرفة والعُلّية المشرفة ... ح:٢٤٦٨)

”ابن خطاب! تمھیں کوئی شک ہے؟ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ان کی اچھی چیزیں دنیا ہی میں جلدی سے دے دی گئی ہیں۔“

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں، آپ نے فرمایا:

«يَا ابْنَ الْخَطَّابِ! أَلاَ تَرْضَى أَنْ تَكُونَ لَنَا الآخِرَةُ وَلَهُمُ الدُّنْيَا» (صحيح مسلم، الطلاق، باب في الإيلاء واعتزال النساء ... ح:١٤٧٩)

”اے خطاب کے بیٹے! کیا تم اس بات سے خوش نہیں کہ ہمیں آخرت مل جائے اور انہیں دنیا۔“

پھر ان ملکوں میں قحط، آفتیں، زلزلے اور ہلاکت خیز آندھیاں بھی تو آتی رہتی ہیں جن کی خبریں ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے سے دنیا بھر میں نشر ہوتی رہتی ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سوال کرنے والا نابینا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بصیرت سے محروم کر دیا ہے اور وہ واقعہ اور حقیقت کو قطعاً نہیں جانتا۔ میری نصیحت یہ ہے کہ اسے فوراً ان تصورات سے توبہ کرنی چاہیے قبل اس کے اسے اچانک موت آجائے اور وہ اپنے رب کی طرف لوٹ جائے۔ اسے اس حقیقت کو اچھی طرح معلوم کر لینا چاہیے کہ ہمیں عزت،

---

① صحیح مسلم، الإیمان، باب وجوب الإیمان برسالة نبینا محمد ﷺ...... حدیث: 153

سربلندی، غلبہ اور قیادت دین اسلام کی طرف حقیقی طور پر رجوع کرنے ہی سے حاصل ہوسکتی ہے جس میں قول و فعل میں ہم آہنگی ہو اور ہمیں یہ حقیقت بھی اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ کفار جس بات پر ہیں وہ باطل ہے، حق نہیں ہے اور پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور اپنے رسول اللہ ﷺ کی زبانی ہمیں یہ بات بتائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں دنیا میں جو خوش حالی عطا فرمائی ہے، یہ آزمائش اور امتحان ہے اور ان کے حصے کی اچھی چیزیں انھیں دنیا ہی میں دے دی گئی ہیں حتی کہ جب وہ مرجائیں گے اور ان خوش حالیوں کو چھوڑ جائیں گے تو ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا، جس کی وجہ سے ان کی حسرت اور غم و حزن میں بے پناہ اضافہ ہوجائے گا۔ بہرحال یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ انھیں دنیا میں نعمتوں سے نواز دیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ زلزلوں، قحط سالیوں، آندھیوں، طوفانوں اور سیلابوں وغیرہ سے محفوظ نہیں ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس سوال کرنے والے کو ہدایت و توفیق عطا فرمائے، حق کی طرف لوٹائے اور ہم سب کو دین کی بصیرت سے سرفراز فرمائے۔ إنه جوّاد کریم.

نیت صحیح ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ زبان سے جو چاہو کہو

سوال بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر دل میں خلوص ہو تو الفاظ کی صحت کی خاص اہمیت نہیں ہے، آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

جواب صحت الفاظ سے مراد اگر ان کا عربی زبان کے مطابق استعمال ہے تو یہ بات صحیح ہے، سلامتی عقیدہ کے اعتبار سے اس کی زیادہ اہمیت نہیں ہے، اگر معنی و مفہوم صحیح ہو اور الفاظ عربی زبان کے مطابق نہ بھی ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

اگر تصحیح الفاظ سے مراد ایسے الفاظ کو ترک کرنا ہے جو کفر و شرک پر دلالت کرتے ہوں تو کہنے والے کی بات درست نہیں ہے۔ ایسے الفاظ کی تصحیح کی بہت اہمیت ہے، لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ ہم یہ کہیں کہ اگر نیت صحیح ہو تو زبان سے جو کچھ چاہو کہو (اجازت ہے) بلکہ کہنا یہ چاہیے کہ الفاظ بھی اسلامی شریعت کے مطابق ہونے چاہییں۔

"اَدَامَ اللّٰهُ أَيّامكَ" یا "اَطَالَ اللّٰهُ بَقَاءَ كَ" کے الفاظ کہنے کا حکم

سوال اس طرح کے الفاظ استعمال کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے: "اَدَامَ اللّٰهُ اَيَّا مَكَ"؟

جواب یہ بات کہنا: "اَدَامَ اللّٰهُ اَيَّا مَكَ" (اللہ تعالیٰ تمھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ رکھے۔) یہ دعا میں زیادتی ہے کیونکہ دنیا کی زندگی میں دوام اور ہمیشگی محال اور حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ کے منافی ہے:

﴿ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝٢٦ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو ٱلْجَلَٰلِ وَٱلْإِكْرَامِ ۝٢٧ ﴾ (الرحمن: ٥٥/ ٢٦-٢٧)

"جو (مخلوق) زمین پر ہے، سب کو فنا ہونا ہے اور تمھارے پروردگار، جو صاحب جلال و عظمت ہے، کا چہرہ باقی رہے گا۔"

اور فرمایا:

﴿ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّن قَبْلِكَ ٱلْخُلْدَ ۖ أَفَإِي۟ن مِّتَّ فَهُمُ ٱلْخَٰلِدُونَ ۝٣٤ ﴾ (الأنبياء: ٢١/ ٣٤)

"اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم سے پہلے کسی آدمی کو بقائے دوام نہیں بخشا۔ بھلا اگر تم مرجاؤ تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے؟"

سوال یہ کہنے کے بارے میں کیا حکم ہے: (اَطَالَ اللّٰهُ بَقَاءَ كَ) یا (طَالَ عُمْرُكَ) "اللہ تعالیٰ آپ کو طویل عمر عطا فرمائے۔"؟

جواب طول بقا کے مطلق دعا نہیں کرنی چاہیے کیونکہ طول بقا تو خیر بھی ہو سکتی ہے اور شر بھی۔ وہ آدمی سب سے برا ہے جس کی عمر طویل اور عمل برا ہو' لہٰذا اگر یہ کہہ دے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی اطاعت میں دراز عمر عطا فرمائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر کسی معمولی چیز کا سوال نہیں کرنا چاہیے

سوال بعض لوگ اللہ تعالیٰ کی ذات کے واسطے سے سوال کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں: ''میں تجھ سے اللہ کی ذات کے واسطے سے یہ سوال کرتا ہوں۔'' تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اللہ کی ذات اس سے کہیں عظیم ہے کہ انسان اس کے واسطے سے دنیا کا کوئی سوال کرے اور اسے حصول مقصود کے لیے وسیلہ بنائے' لہٰذا کسی کو اس طرح سوال نہیں کرنا چاہیے کہ تجھے اللہ کی ذات کا واسطہ یا اللہ کی ذات کے واسطے سے تجھ سے یہ سوال کرتا ہوں وغیرہ۔

کیا ''اللہ'' اور ''رسول'' کے الفاظ آمنے سامنے لکھ سکتے ہیں؟

سوال ہم اکثر یہ دیکھتے ہیں کہ دیواروں پر ایک طرف لفظ "اللّٰـه" لکھا ہوتا ہے اور دوسری طرف لفظ "محمد ﷺ" یا چارٹوں' کتابوں یا قرآن مجید کے بعض نسخوں پر اس طرح لکھا ہوتا ہے تو کیا اس طرح ان الفاظ کا لکھنا صحیح ہے؟

جواب ان الفاظ کا اس طرح لکھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس طرح تو نبی ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے شریک اور مساوی بنا دیا گیا ہے۔ اگر کوئی ان الفاظ کو اس طرح لکھا ہوا دیکھے اور اسے یہ معلوم نہ ہو کہ ان کا مسمّٰی کون ہے تو وہ ان دونوں کو مساوی اور مماثل سمجھے گا' لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے اسم گرامی کو حذف کر دینا واجب ہے اور اب رہ گیا اللہ کا اسم پاک تو اس کلمے کو صوفیاء ذکر کے طور پر استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں: اللہ' اللہ' لہٰذا اسے بھی حذف کر دیا جائے' چنانچہ اس طرح دیواروں اور چارٹوں وغیرہ پر '' اللّٰه'' اور ''محمد ﷺ'' کے الفاظ نہ لکھے جائیں۔

کیا ایسا کہنا جائز ہے کہ ''اللہ آپ کا حال پوچھتا ہے؟''

سوال ان الفاظ کے بارے میں کیا حکم ہے: ''اللہ آپ کے حال کے بارے میں پوچھتا ہے؟''

جواب یہ الفاظ استعمال کرنا جائز نہیں کہ ''اللہ آپ کے حال کے بارے میں پوچھتا ہے۔'' کیونکہ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ......نعوذ باللّٰه...... اللہ تعالیٰ کو معلوم نہیں' لہٰذا اسے پوچھنے کی ضرورت ہے اور یہ بہت غلط بات ہے' گو قائل کا یہ ارادہ نہ بھی ہو کہ اللہ سے کوئی چیز مخفی ہے اور وہ پوچھنے کا محتاج ہے' لیکن اس عبارت سے یہی معلوم ہوتا ہے' لہٰذا اسے ترک کرنا واجب ہے اور اس کے بجائے اس طرح کے الفاظ استعمال کرنے چاہئیں کہ ''میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کی حفاظت فرمائے'' اور ''میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے لطف وکرم سے تمھیں نوازے۔''

کسی کو ''مرحوم'' کہنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

سوال کسی کو ''مرحوم'' کہنا یا یہ کہنا کہ ''اللہ نے اسے اپنی رحمت سے ڈھانپ لیا ہے'' یا یہ کہنا کہ ''وہ اللہ کی رحمت کی طرف منتقل

ہو گیا ہے۔'' اس طرح کے الفاظ استعمال کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب کسی کو ''مرحوم'' کہنے یا یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ اللہ نے اسے اپنی رحمت سے ڈھانپ لیا ہے' کیونکہ یہ تفاؤل اور امید کے باب سے ہے' خبر کے باب سے نہیں ہے' لہٰذا تفاؤل اور امید کے طور پر اس طرح کے الفاظ استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح یہ الفاظ بھی کہ ''وہ اللہ کی رحمت کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔'' تفاؤل کے باب سے ہیں' خبر کے باب سے نہیں ہیں' کیونکہ اس طرح کی باتوں کا تعلق امور غیب سے ہے' لہٰذا وثوق کے ساتھ اس طرح کی بات کہنا ممکن نہیں' اسی طرح یہ بھی نہیں کہنا چاہیے کہ وہ رفیق اعلیٰ کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔

کیا ایسا کہنا جائز ہے کہ ''وطن کے نام سے'' یہ کام کرتا ہوں؟

سوال اس طرح کی عبارتیں استعمال کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے کہ ''وطن کے نام سے' قوم کے نام سے' عربیت کے نام سے''؟

جواب اگر اس طرح کی عبارتوں سے انسان کی مراد عرب یا اہل شہر ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں اور اگر مقصود تبرک و استعانت ہو تو یہ شرک کی ایک قسم ہے اور اگر کہنے والے کے دل میں ان چیزوں کی عظمت ہو تو اس طرح کے الفاظ کا استعمال شرک اکبر بھی ہو سکتا ہے۔

کیا کسی آدمی کا آنا باعث برکت ہو سکتا ہے؟

سوال عام لوگ جو یہ کہہ دیتے ہیں کہ آپ کا آنا ہمارے لیے باعث برکت ہے' یا یہ کہہ دیتے ہیں کہ برکت ہمارے پاس آگئی ہے' اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب عام لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ آپ کا آنا ہمارے لیے باعث برکت ہے' تو اس سے ان کا یہ ارادہ نہیں ہوتا جو اللہ تعالیٰ کے حوالے سے برکت کا لفظ استعمال کرنے میں ہے بلکہ ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ آپ کے آنے کی وجہ سے ہمیں برکت حاصل ہو گئی ہے۔ انسان کی طرف بھی برکت کی نسبت صحیح ہے۔ حضرت عائشہ ؓ کے ہار کے گم ہو جانے کے موقع پر جب تیمّم کی آیت نازل ہوئی' تو حضرت اُسید بن حضیر ؓ نے کہا تھا:

«مَا هِيَ بِأَوَّلِ بَرَكَتِكُمْ يَا آلَ أَبِي بَكْرٍ!»(صحيح البخاري، التيمم، باب:١، ح:٣٣٤ وصحيح مسلم، الحيض، باب التيمم، ح:٣٦٧)

''اے آل ابی بکر! یہ آپ کی پہلی برکت نہیں ہے۔''

طلب برکت دو باتوں سے خالی نہیں ہے: ① طلب برکت کسی معلوم شرعی امر' مثلاً قرآن کریم کے ساتھ ہو کیونکہ قرآن کریم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَهَٰذَا كِتَٰبٌ أَنزَلْنَٰهُ مُبَارَكٌ﴾ (الأنعام:٦/ ٩٢)

''اور یہ کتاب (قرآن مجید) جسے ہم نے نازل کیا ہے بابرکت ہے۔''

اور اس کی برکت یہ ہے کہ جو شخص اس کتاب کو لے لے اور اس کے ساتھ جہاد کرے تو اسے فتح حاصل ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے

اس کتاب کی برکت سے بہت سی امتوں کو شرک سے نجات بخشی اور اس کی ایک برکت یہ بھی ہے کہ ایک حرف کے بدلے دس نیکیاں ملتی ہیں' اس سے انسان کی کوشش اور وقت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

② طلب برکت کسی معلوم حسی امر کے ساتھ ہو' مثلاً یہ علم کہ فلاں انسان کے علم اور اس کی دعوت خیر کے ساتھ برکت حاصل کی جا سکتی ہے جیسا کہ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: ''اے آل ابی بکر! یہ آپ کی پہلی برکت نہیں ہے۔'' کیونکہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے ہاتھوں ایسے امور خیر کو جاری فرما دیتا ہے جو دوسروں کے ہاتھوں جاری نہیں ہوتے۔

برکت کی کچھ موہوم اور باطل صورتیں بھی ہیں جیسا کہ دجال (اور جھوٹے) قسم کے لوگ کہتے ہیں کہ فلاں میت' جسے وہ ولی سمجھتے ہیں' نے تم پر اپنی برکت نازل کی ہے' تو یہ باطل برکت ہے جس کا کوئی اثر نہیں۔ اس طرح کے کام میں شیطان کا اثر ہو سکتا ہے اور ان کے حسی آثار بھی ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ اس شیخ کی طرف سے شیطان خدمت سرانجام دے سکتا ہے اور اس طرح یہ بہت بڑا فتنہ ہو سکتا ہے۔ رہی اس بات کی پہچان کہ کیا یہ برکت باطل ہے یا صحیح' یہ اس شخص کے حال سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اگر اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے اولیاء' متقی اور پرہیزگار' سنت کے متبع اور بدعت سے اجتناب کرنے والوں میں سے ہو' تو اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں سے ایسی خیر و برکت کو ظاہر کر سکتا ہے جو دوسروں کے ہاتھوں جاری نہیں ہو سکتی اور اگر وہ شخص کتاب و سنت کے مخالف ہو یا باطل کی طرف دعوت دیتا ہو تو اس کی برکت موہوم ہو گی اور اس باطل کام میں شیطان بھی اس کی مدد کر سکتا ہے۔

کسی بات کے لیے تقدیر کو کہاں تک بنیاد بنایا جا سکتا ہے؟

سوال لوگوں کی اس طرح کی بات کے بارے میں کیا حکم ہے کہ ''اس بات میں تقدیر نے مداخلت کی ہے'' اور ''اس میں اللہ تعالیٰ کی عنایت نے مداخلت کی ہے؟''

جواب یہ بات کہ ''اس میں تقدیر نے مداخلت کی ہے'' درست نہیں ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تقدیر نے مداخلت کر کے زیادتی کی ہے' حالانکہ تقدیر ہی تو اصل ہے' لہٰذا یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ تقدیر نے مداخلت کی ہے؟ لہٰذا زیادہ صحیح یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ قضا و قدر نازل ہوئی ہے یا یہ کہ تقدیر غالب آ گئی۔ اسی طرح یہ کہنا کہ ''اللہ تعالیٰ کی عنایت نے مداخلت کی ہے'' اس سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت حاصل ہو گئی ہے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت کا تقاضا یہ ہے۔

حریت فکر کا نظریہ کہاں تک درست ہے؟

سوال ہم ''حریت فکر'' کے الفاظ سنتے اور پڑھتے ہیں اور یہ ''حریت اعتقاد'' کی طرف گویا دعوت ہے' اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب اس بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ جو شخص اس بات کو جائز سمجھتا ہے کہ انسان اعتقاد میں آزاد ہے وہ جو چاہے دین اختیار کرے تو وہ کافر ہے کیونکہ جو شخص بھی یہ عقیدہ رکھے کہ دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور دین کو اختیار کرنا بھی جائز ہے وہ اللہ عزوجل کے ساتھ کفر کرتا ہے' اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا۔ وہ توبہ کر لے تو درست ورنہ اسے قتل کرنا واجب ہو گا۔

ادیان افکار نہیں ہیں بلکہ یہ تو وحی الٰہی ہیں جسے اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں پر نازل فرماتا ہے تاکہ بندے اس کے مطابق زندگی بسر کریں اور یہ لفظ ''فکر'' جس سے مقصود دین ہوتا ہے' واجب ہے کہ اسے اسلامی لغت کی کتابوں سے حذف کر دیا جائے کیونکہ یہ اسی فاسد معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس کے اعتبار سے گویا اسلام ایک فکر ہے۔ نصرانیت' جسے لوگ مسیحیت کے نام سے پہچانتے ہیں' بھی ایک فکر ہے اور یہودیت بھی ایک فکر' گویا یہ شریعتیں محض زمینی افکار ہیں جنھیں جو لوگ چاہیں اختیار کر سکتے ہیں' حالانکہ امر واقع یہ ہے کہ ادیان سماوی تو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ دین ہیں' لہٰذا انسان کو ان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ یہ وحی الٰہی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اس لیے نازل فرمایا ہے تاکہ ان کے مطابق اس کے بندے اس کی عبادت کریں' لہٰذا انھیں ''فکر'' نہیں کہنا چاہیے۔ (یہ الگ بات ہے کہ یہودیت اور عیسائیت دونوں اپنی اصل یعنی اسلام پر قائم نہیں' لہٰذا حضرت محمد ﷺ کا دین اسلام ہی سچا دین اور بنی نوع انسان کے لیے واجب الاتباع ہے۔)

خلاصۂ جواب یہ ہے کہ جو شخص بھی یہ عقیدہ رکھے کہ ہر شخص کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ جو چاہے دین اختیار کرے اسے مکمل آزادی حاصل ہے' تو وہ کافر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ ٱلْإِسْلَٰمِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ ﴾ (آل عمران: ٦/ ٨٥)

''اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا' وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔''

اور فرمایا:

﴿ إِنَّ ٱلدِّينَ عِندَ ٱللَّهِ ٱلْإِسْلَٰمُ ﴾ (آل عمران: ٦/ ١٩)

''دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔''

لہٰذا کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ یہ عقیدہ رکھے کہ اسلام کے سوا کسی اور دین کو اختیار کرنا بھی جائز ہے کیونکہ اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے تو اہل علم کی صراحت کے مطابق وہ کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

کیا مفتی سے کہا جا سکتا ہے کہ ''اسلام کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟''

سوال کیا یہ جائز ہے کہ انسان مفتی سے یہ کہے کہ اس بارے میں اسلام کا کیا حکم ہے؟ یا اس کے بارے میں اسلام کی کیا رائے ہے؟

جواب یہ نہیں کہنا چاہیے کہ اس کے بارے میں اسلام کا کیا حکم ہے یا اس کے بارے میں اسلام کی کیا رائے ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ جواب دینے میں غلطی کرے' لہٰذا ممکن ہے کہ وہ جو جواب دے وہ اسلام کا حکم نہ ہو اور اگر حکم نص صریح ہو تو پھر کوئی حرج نہیں' مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ مردار کھانے کے بارے میں اسلام کا کیا حکم ہے؟ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مردار کھانے کے بارے میں اسلام کا یہ حکم ہے کہ وہ حرام ہے۔

''زمانے اور حالات نے چاہا'' جیسے الفاظ کہنا جائز نہیں

سوال (شَاءَتِ الظُّرُوفُ أَنْ يَحْصُلَ كَذَا) ''حالات نے چاہا تو اس طرح ہو گیا'' یا (شَاءَتِ الْأَقْدَارُ كَذَا وَكَذَا)

"تقدیر نے چاہا تو اس طرح ہو گیا" اس طرح کے الفاظ کہنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اس طرح کے الفاظ منکر ہیں کیونکہ ظروف' ظرف کی جمع ہے اور اس کے معنی زمانے کے ہیں اور زمانے کی اپنی کوئی مشیت نہیں ہوتی' اور اقدار' قدر کی جمع ہے اور تقدیر کی بھی کوئی مشیت نہیں ہوتی۔ مشیت تو صرف اللہ عزوجل ہی کی ہے۔ ہاں! اگر انسان یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا یہ تقاضا ہوا' تو اس میں کوئی حرج نہیں' لیکن یہ جائز نہیں کہ مشیت کی تقدیر کی طرف اضافت کی جائے کیونکہ مشیت کے معنی ارادہ کے ہیں اور ارادہ وصف کا نہیں بلکہ موصوف کا ہوتا ہے۔

کیا کسی شخص کو "شہید" کہنا جائز ہے؟

سوال کسی کو شہید کہنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب کسی کو شہید کہنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: ① اسے وصف کے ساتھ مقید کیا جائے' مثلاً یوں کہا جائے کہ ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کے رستے میں مارا جائے وہ شہید ہے' جو اپنے مال کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے وہ شہید ہے' جو طاعون کے مرض سے فوت ہو جائے وہ شہید ہے' تو اس طرح کہنا جائز ہے جیسا کہ نصوص میں آیا ہے کیونکہ آپ تو اس بات کی شہادت دے رہے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے۔ "یہ جائز ہے" کہنے کے معنی یہ ہیں کہ ایسا کہنا ممنوع نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی خبر کی تصدیق کرتے ہوئے ایسی شہادت دینا تو واجب ہے۔ ② شہادت کو کسی معین شخص کے ساتھ مقید کیا جائے' مثلاً آپ کسی معین شخص کے بارے میں یہ کہیں کہ وہ شہید ہے تو یہ جائز نہیں سوائے اس کے جس کے بارے میں نبی ﷺ نے یہ شہادت دی ہو یا جس کی شہادت پر امت کا اتفاق ہو۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس بات کا عنوان اس طرح قائم کیا ہے: (باب لايقال فلان شهيد) "یہ نہ کہا جائے کہ فلاں شہید ہے" اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس باب کے تحت لکھا ہے' یعنی کسی معین شخص کے بارے میں قطعی طور پر یہ نہ کہا جائے الا یہ کہ وحی کے ذریعے سے ایسا معلوم ہو۔ انھوں نے گویا اس حدیث عمر رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آپ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ تم اپنے غزوات میں کہتے ہو کہ فلاں شہید ہے' فلاں شہادت کی موت مرا ہے' ہو سکتا ہے کہ وہ سواری سے گر کر مرا ہو' لہٰذا تم اس طرح نہ کہا کرو بلکہ یہ کہا کرو جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: "جو شخص اللہ تعالیٰ کے رستے میں فوت ہو یا قتل ہو وہ شہید ہے۔" یہ حدیث حسن ہے۔ امام احمد اور سعید بن منصور وغیرہ نے بطریق محمد بن سیرین اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ①

کسی چیز کی شہادت اس کے بارے میں علم ہی کی بنیاد پر ہو سکتی ہے اور کسی انسان کے شہید ہونے کی شرط یہ ہے کہ اس نے اس لیے لڑائی کی ہو تا کہ اللہ تعالیٰ کے کلمے کو سربلندی حاصل ہو اور اس کا تعلق باطنی نیت سے ہے جسے معلوم کرنے کی کوئی کسوٹی نہیں۔

اسی لیے نبی ﷺ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

«مَثَلُ الْمُجَاهِدِ فِي سَبِيلِ اللهِ وَاللهُ أَعْلَمُ بِمَنْ يُجَاهِدُ فِي سَبِيلِهِ»(صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب أفضل الناس مؤمن مجاهد بنفسه وماله في سبيل الله، ح:٢٧٨٧)

---

① فتح الباری : 110/6

’’اللہ تعالیٰ کے رستے میں جہاد کرنے والے کی مثال یہ ہے...... اور یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کے رستے میں جہاد کرنے والا کون ہے؟‘‘

اور فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لاَ يُكْلَمُ أَحَدٌ فِي سَبِيلِ اللهِ، وَاللهُ أَعْلَمُ بِمَنْ يُكْلَمُ فِي سَبِيلِهِ إِلاَّ جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاللَّوْنُ لَوْنُ الدَّمِ، وَالرِّيحُ رِيحُ الْمِسْكِ»(صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب من يجرح في سبيل الله عزوجل، ح: ۲۸۰۳)

’’اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، جسے اللہ تعالیٰ کے رستے میں زخم لگے...... اور یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کے رستے میں کسے زخم لگتا ہے...... وہ روز قیامت اس طرح آئے گا کہ اس کا رنگ خون کا رنگ ہوگا اور خوشبو کستوری کی خوشبو ہوگی۔‘‘

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ان دونوں حدیثوں کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت فرمایا ہے۔ جو شخص بظاہر نیک ہو اس کے لیے ہم یہ امید کر سکتے ہیں، مگر اس کے بارے میں یہ گواہی دے سکتے ہیں نہ اس کے بارے میں کوئی بدگمانی کر سکتے ہیں۔ امید ان دونوں مرتبوں کے درمیان کا ایک مرتبہ ہے۔ ہاں! ایسے شخص کے بارے میں دنیا میں معاملہ احکام شہداء کے مطابق کیا جائے گا یعنی اگر وہ اللہ تعالیٰ کے رستے میں جہاد کرتے ہوئے قتل ہو تو اسے اس کے خون آلود کپڑوں میں دفن کیا جائے گا اور اس کی نماز جنازہ بھی نہیں پڑھی جائے گی اور اگر اس کا تعلق دوسرے شہداء سے ہو تو پھر اسے غسل دیا جائے گا، کفن دیا جائے گا اور اس کی نماز جنازہ بھی پڑھی جائے گی۔

اگر کسی معین شخص کے بارے میں ہم یہ شہادت دیں کہ وہ شہید ہے تو اس شہادت سے یہ لازم آتا ہے کہ ہم اس کے جنتی ہونے کی شہادت دے رہے ہیں اور یہ بات اہل سنت کے مذہب کے خلاف ہے کہ وہ کسی کے قطعی جنتی ہونے کی شہادت نہیں دیتے تھے سوائے اس کے جس کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصف بیان کر کے یا شخصی طور پر اس کا تعین فرما کر شہادت دی ہو۔ کچھ لوگوں نے ایسے شخص کے بارے میں شہادت دینے کو بھی جائز قرار دیا ہے جس کی تعریف پر امت کا اتفاق ہو۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ نص یا اتفاق امت کے بغیر کسی معین شخص کے شہید ہونے کی شہادت دینا جائز نہیں، البتہ جو شخص بظاہر نیک ہو تو اس کے لیے ایسی امید کی جا سکتی ہے جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا ہے اور اس کی منقبت کے لیے یہی کافی ہے اور اس کا علم تو اس کے خالق و مالک سبحانہ وتعالیٰ ہی کے پاس ہے۔

کیا ’’اتفاق سے ایسے ہوا‘‘ کہنا جائز ہے؟

سوال لفظ ’’اتفاق سے‘‘ استعمال کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب ہماری رائے میں اس لفظ کے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ میرے خیال میں کئی احادیث میں بھی اس طرح کی

تعبیر موجود ہے کہ ''ہم اتفاق سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے'' اور ''اتفاق سے رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لے آئے''، لیکن اس سلسلہ میں مجھے اب کوئی معین حدیث یاد نہیں آ رہی۔ ①

انسان کے حوالہ سے کسی چیز کا اتفاق سے پیش آ جانا امر واقع ہے کیونکہ انسان غیب نہیں جانتا۔ اسے غیر شعوری اور غیر متوقع طور پر اتفاق سے کوئی چیز پیش آ سکتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے حوالے سے ایسا نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو ہر چیز معلوم ہے، اس کے ہاں ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر ہے۔ اس کے ہاں کبھی کوئی چیز اتفاق سے پیش نہیں آتی، لیکن مجھے اور آپ کو کوئی چیز کسی وعدہ، کسی شعور اور کسی پیشگی اطلاع کے بغیر پیش آ سکتی ہے، ایسے موقع پر کہتے ہیں کہ یہ چیز اتفاق سے پیش آ گئی ہے، لہٰذا ایسا کہنے میں کوئی حرج نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی کے لیے اس طرح کے الفاظ کا استعمال ممنوع اور ناجائز ہے۔

''اسلامی فکر'' یا ''اسلامی مفکر'' کی اصطلاح استعمال کرنا کیسا ہے؟

سوال ''اسلامی فکر'' یا ''اسلامی مفکر'' کی اصطلاح کے استعمال کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ جزاكم الله خيراً!

جواب ''اسلامی فکر'' کے الفاظ کے استعمال سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ ان الفاظ کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کو ہم نے گویا ایسے افکار سے تعبیر قرار دیا ہے جنھیں قبول بھی کیا جا سکتا ہے اور رد بھی۔ یہ ایک بہت خطرناک بات ہے جسے دشمنان اسلام نے غیر شعوری طور پر ہم میں داخل کر دیا ہے، البتہ ''اسلامی مفکر'' کے الفاظ میں مجھے کوئی حرج نظر نہیں آتا کیونکہ یہ تو ایک مسلمان شخص کی صفت ہے اور ایک مسلمان شخص مفکر ہو سکتا ہے۔

دین کو چھلکے اور مغز میں تقسیم کرنا باطل تقسیم ہے

سوال ہم نے دین کو چھلکے اور مغز میں تقسیم کر رکھا ہے جیسا کہ داڑھی کے مسئلے پر بات کرتے ہوئے لوگ اس قسم کی تقسیم کا حوالہ دیا کرتے ہیں تو کیا یہ بات صحیح ہے؟

---

① اس بارے میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں روایات موجود ہیں، مثلاً صحیح بخاری کے الفاظ ہیں: [أَنَّ فَاطِمَةَ رضی اللہ عنہا أَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ تَشْكُو إِلَيْهِ مَا تَلْقَى فِي يَدِهَا مِنَ الرَّحَىٰ وَبَلَغَهَا أَنَّهُ جَاءَهُ فَلَمْ تُصَادِفْهُ فَذَكَرَتْ ذَلِكَ لِعَائِشَةَ......] ''حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں کہ آپ سے چکی کی مشقت کی شکایت کریں، کیونکہ انھیں خبر پہنچی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس غلام آئے ہیں، لیکن اتفاق سے ان کی رسول اللہ ﷺ سے ملاقات نہ ہوئی تو انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آنے کا مقصد بیان کیا...... (صحيح البخاري، النفقات، باب عمل المرأة في بيت زوجها، حديث: 5361) صحیح مسلم کے الفاظ اس طرح ہیں: [اِنْطَلَقَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِلَى أُمِّ أَيْمَنَ، فَانْطَلَقْتُ مَعَهُ فَنَاوَلَتْهُ إِنَاءً فِيهِ شَرَابٌ، قَالَ: فَلَا أَدْرِي أَصَادَفَتْهُ صَائِماً أَوْلَمْ يُرِدْهُ......] ''حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے، میں بھی آپ کے ساتھ گیا، تو ام ایمن رضی اللہ عنہا نے آپ کو پانی کا پیالہ پکڑایا۔ انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: مجھے نہیں معلوم کہ آپ اتفاق سے روزے سے تھے یا آپ نے پانی کو رد نہیں کیا......'' (صحيح مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل أم أيمن، حديث: 2453)

جواب دین کو چھلکے اور مغز میں تقسیم کرنا ایک غلط اور باطل تقسیم ہے کیونکہ دین تو سارے کا سارا ہی مغز' سارے کا سارا ہی انسانیت کے لیے نافع' سارے کا سارا ہی تقرب الٰہی اور حصول ثواب کا ذریعہ ہے۔ انسان میں جس قدر ایمان اور اپنے رب کی طرف رجوع زیادہ ہوگا وہ اسی قدر زیادہ فائدے میں رہے گا۔ انسان اگر اپنے رب کے تقرب کے حصول کے لیے اور اس کے رسول اللہ ﷺ کا اتباع کرتے ہوئے لباس اور وضع قطع سے متعلق مسائل کی پابندی کرے تو اس سے بھی اسے یقیناً اجر وثواب ملے گا' جب کہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ چھلکے میں تو کوئی فائدہ نہیں ہوتا' اسی لیے تو اسے پھینک دیا جاتا ہے۔ دین اسلام یا اسلامی شریعت کی کوئی بات بھی چھلکے کی طرح بے فائدہ نہیں کہ اسے پھینک دیا جائے بلکہ شریعت تو ساری کی ساری مغز اور انسانیت کے لیے منفعت بخش ہے' بشرطیکہ نیت اللہ کے لیے خالص ہو اور عمل رسول اللہ ﷺ کے اتباع میں احسن انداز سے کیا جائے۔ جو لوگ اس قسم کی باتیں پھیلاتے ہیں انھیں خوب غور وفکر سے کام لینا چاہیے تاکہ وہ حق وصواب کو پہچان لیں' پھر اس کا اتباع کریں اور اس طرح کی تعبیرات کو ترک کر دیں۔ یہ صحیح ہے کہ دین اسلام میں بہت سے امور اہم' بڑے اور عظیم ہیں' مثلاً اسلام کے ارکان خمسہ' جنھیں رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے:

«بُنِيَ الإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنْ لاَّ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللهِ، وَإِقَامِ الصَّلَاةِ، وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ، وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ»(صحيح البخاري، الإيمان، باب دعاؤكم إيمانكم، ح:٨ وصحيح مسلم، الإيمان، باب أركان الإسلام ودعائمه العظام، ح:١٦)

''اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں' نماز قائم کرنا' زکوٰۃ ادا کرنا' حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔''

اور اسلام کی کچھ باتیں ایسی ہیں جو ان سے کمتر اہمیت کی ہیں لیکن دین کی کوئی بات ایسی نہیں جو چھلکے کی طرح بے فائدہ ہو اور اسے پھینک دیا جائے۔

جہاں تک داڑھی کے مسئلے کا تعلق ہے تو لاریب داڑھی رکھنا عبادت ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے اور ہر وہ چیز جس کا نبی ﷺ نے حکم دیا ہے وہ عبادت ہے' اس سے انسان اپنے رب کا تقرب حاصل کر سکتا ہے کیونکہ اس سے وہ اپنے نبی ﷺ کی اطاعت بجالاتا ہے اور داڑھی رکھنا نبی ﷺ اور دیگر تمام انبیائے کرام ؑ کی سنت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ہارون ؑ کے بارے میں فرمایا ہے کہ انھوں نے موسیٰ ؑ سے کہا:

﴿ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِيٓ ﴾ (طه: ٢٠/ ٩٤)

''بھائی! میری داڑھی اور سر (کے بالوں) کو نہ پکڑیے۔''

حدیث سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ داڑھی کا بڑھانا اس فطرت میں سے ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا فرمایا ہے' لہٰذا داڑھی رکھنا عبادت ہے عادت نہیں اور نہ یہ چھلکا ہے جیسا کہ بعض لوگوں کا گمان ہے۔

کیا ایسا کہنا کہ ''وہ اپنی آخری جگہ دفن ہو گیا'' جائز ہے؟

سوال یہ الفاظ کہنے کے بارے میں کیا حکم ہے کہ ''وہ اپنی آخری جگہ میں دفن ہو گیا ہے۔''؟

جواب یہ کہنا کہ وہ اپنی آخری جگہ میں دفن ہو گیا ہے' حرام اور ناجائز ہے کیونکہ آخری جگہ کے الفاظ استعمال کرنے کے معنی یہ ہیں گویا قبر ہی آخری جگہ ہے' لہٰذا اس میں بعثت کا انکار ہے جب کہ یہ بات عام مسلمانوں کو بھی معلوم ہے کہ قبر آخری جگہ نہیں ہے البتہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ قبر ہی کو آخری ٹھکانا سمجھتے ہیں' جب کہ مسلمان قبر کو آخری ٹھکانا نہیں سمجھتا۔ جب ایک بدّو نے ایک آدمی کو ان آیات کی تلاوت کرتے ہوئے سنا:

﴿ أَلْهَىٰكُمُ ٱلتَّكَاثُرُ ۝١ حَتَّىٰ زُرْتُمُ ٱلْمَقَابِرَ ۝٢ ﴾ (التکاثر: ۱۰۲/ ۱۔۲)

''(لوگو!) تم کو زیادہ (مال) کی طلب نے غافل کر دیا' یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔''

تو وہ بے ساختہ کہنے لگا کہ اللہ کی قسم! جو دیکھنے والا ہو وہ مقیم نہیں ہوتا کیونکہ جو دیکھنے اور زیارت کرنے والا ہوتا ہے' وہ تو چلا جاتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ ایک دن قبروں سے اٹھایا جائے گا اور یہی بات صحیح ہے۔ لہٰذا اس قسم کے الفاظ سے اجتناب کرنا چاہیے اور قبر کو آخری ٹھکانا قرار نہیں دینا چاہیے کیونکہ آخری ٹھکانا تو روز قیامت جنت ہے یا جہنم۔

نصرانی اور مسیحی میں فرق

سوال کیا نصرانیت کو مسیحیت اور نصرانی کو مسیحی قرار دینا صحیح ہے؟

جواب اس میں کچھ شک نہیں کہ نبی ﷺ کی بعثت کے بعد نصاریٰ کا مسیح علیہ السلام کی طرف انتساب صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر ان کا یہ انتساب صحیح ہوتا یعنی وہ مسیح کے سچے پیروکار ہوتے تو یہ لوگ حضرت محمد ﷺ پر ایمان لے آتے' پھر ان کا حضرت محمد ﷺ پر ایمان لانا' حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام پر ایمان لانا ہوتا' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَإِذْ قَالَ عِيسَى ٱبْنُ مَرْيَمَ يَـٰبَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ إِنِّى رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَىَّ مِنَ ٱلتَّوْرَىٰةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُولٍ يَأْتِى مِنۢ بَعْدِى ٱسْمُهُۥٓ أَحْمَدُ ۖ فَلَمَّا جَآءَهُم بِٱلْبَيِّنَـٰتِ قَالُوا۟ هَـٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝٦ ﴾ (الصف: ۶۱/ ۶)

''اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب مریم کے بیٹے عیسیٰ نے کہا کہ اے بنی اسرائیل! میں تمھارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں (اور) جو (کتاب) تورات مجھ سے پہلے آچکی ہے اس کی تصدیق کرتا ہوں اور ایک پیغمبر جو میرے بعد آئیں گے جن کا نام احمد ہو گا' ان کی بشارت سناتا ہوں (پھر) جب وہ ان لوگوں کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تو کہنے لگے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔''

حضرت مسیح عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام نے انھیں حضرت محمد ﷺ کی آمد کی بشارت اسی لیے تو سنائی تھی کہ وہ آپ کے لائے ہوئے دین کو قبول کر لیں کیونکہ ایسی بشارت جو بے فائدہ اور لغو ہو وہ تو کوئی ادنیٰ درجے کی عقل والا انسان بھی نہیں دے سکتا' لہٰذا حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر ایسی بشارت کیسے دے سکتے تھے؟ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو جن کی آمد کی بشارت دی تھی' وہ حضرت محمد ﷺ ہیں۔ اور یہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿فَلَمَّا جَآءَهُم بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ ''پھر

جب وہ ان لوگوں کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تو کہنے لگے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔'' اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰ نے جن کی آمد کی بشارت سنائی تھی' وہ تشریف لا چکے ہیں لیکن عیسائیوں نے ان کا انکار کیا اور کہا کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ پس جب انھوں نے حضرت محمد ﷺ کا انکار کیا تو یہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کا بھی انکار ہے جنھوں نے انھیں حضرت محمد ﷺ کی آمد کی بشارت سنائی تھی' لہٰذا عیسائیوں کا حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف انتساب صحیح نہیں ہے اور انہیں مسیحی کہنا درست نہیں ہے کیونکہ اگر یہ سچے مسیحی ہوتے تو اس نبی آخر الزماں پر ضرور ایمان لاتے جن کی تشریف آوری کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بشارت سنائی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام اور دیگر انبیائے کرام علیہم السلام سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ حضرت محمد ﷺ کے ساتھ ایمان لائیں گے' جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِذْ أَخَذَ ٱللَّهُ مِيثَٰقَ ٱلنَّبِيِّۦنَ لَمَآ ءَاتَيْتُكُم مِّن كِتَٰبٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِۦ وَلَتَنصُرُنَّهُۥ ۚ قَالَ ءَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِى ۖ قَالُوٓا۟ أَقْرَرْنَا ۚ قَالَ فَٱشْهَدُوا۟ وَأَنَا۠ مَعَكُم مِّنَ ٱلشَّٰهِدِينَ ﴿٨١﴾ ﴾ (آل عمران: ۳/ ۸۱)

''اور جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور دانائی عطا کروں' پھر تمھارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو تمھاری کتاب کی تصدیق کرے تو تمھیں ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنی ہوگی۔ اور (عہد لینے کے بعد) پوچھا کہ بھلا تم نے اقرار کیا اور اس اقرار پر میرا ذمہ لیا (یعنی مجھے ضامن ٹھہرایا)؟ انھوں نے کہا: (ہاں) ہم نے اقرار کیا۔ اللہ نے فرمایا: تم (اس عہد و پیمان پر) گواہ رہو اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں۔''

اور وہ پیغمبر جو تشریف لائے اور جنھوں نے ان کی کتابوں کی تصدیق کی وہ حضرت محمد ﷺ ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَأَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ ٱلْكِتَٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ ۖ فَٱحْكُم بَيْنَهُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ ٱلْحَقِّ ۚ ﴾ (المائدة: ۵/ ۴۸)

''اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم پر سچی کتاب نازل کی ہے' جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان (سب) پر نگہبان ہے' تو جو حکم اللہ نے نازل فرمایا ہے اس کے مطابق ان کا فیصلہ کرنا اور جو حق تمھارے پاس آچکا ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا۔''

خلاصۂ کلام یہ کہ نصاریٰ کی مسیح عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کی طرف نسبت امر واقع کے خلاف ہے کیونکہ انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس بشارت کا انکار کیا ہے جو انھوں نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی آمد کے بارے میں دی تھی' لہٰذا ان کا حضرت محمد ﷺ کا انکار کرنا حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کا انکار کرنا ہے۔

''اللہ تعالیٰ معاف نہ کرے'' کہنا جائز نہیں

سوال اس عبارت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے کہ ''اللہ تعالیٰ معاف نہ کرے''؟

جواب میں اس کو مکروہ سمجھتا ہوں کہ کوئی یہ کہے کہ ''اللہ تعالیٰ معاف نہ کرے۔'' کیونکہ ان الفاظ سے یہ وہم ہوتا ہے گویا کوئی اللہ تعالیٰ کو کسی چیز پر مجبور کر سکتا ہے' جب کہ اللہ عزوجل کو کوئی مجبور نہیں کر سکتا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«لاَ مُكْرِهَ لَهُ»(صحيح مسلم، الذكر والدعاء باب العزم بالدعاء، ح:٢٦٧٩)

"اسے کوئی مجبور نہیں کرسکتا ہے۔" نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لاَ يَقُولَنَّ أَحَدُكُمْ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي إِنْ شِئْتَ، اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِي إِنْ شِئْتَ، لِيَعْزِمِ الْمَسْأَلَةَ فَإِنَّهُ لاَ مُسْتَكْرِهَ لَهُ»(صحيح البخاري، الدعوات، باب ليعزم المسألة فإنه لا مكره له، ح:٦٣٣٩)

"تم میں سے کوئی یہ نہ کہے اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے معاف فرمادے، اگر تو چاہے تو مجھ پر رحم فرما، بلکہ اسے پورے وثوق سے دعا کرنی چاہیے کیونکہ اسے کوئی مجبور نہیں کرسکتا۔" اور ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں:

«وَلٰكِنْ لِيَعْزِمِ الْمَسْأَلَةَ وَلْيُعَظِّمِ الرَّغْبَةَ فَإِنَّ اللّٰهَ لاَ يَتَعَاظَمُهُ شَيْءٌ أَعْطَاهُ»(صحيح مسلم، الذكر والدعاء، باب العزم بالدعاء ولا يقل أن شئت، ح:٢٦٧٩)

"اسے پورے وثوق اور بڑی رغبت سے دعا کرنی چاہیے کیونکہ اللہ کیلئے اسے کسی چیز کا عطا فرمانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"

لہٰذا "اللہ تعالیٰ معاف نہ کرے" جیسے الفاظ استعمال کرنے کے بجائے یہ زیادہ بہتر ہے کہ یوں کہے: "اللہ ایسا نہ کرے" کیونکہ یہ الفاظ اس وہم سے بہت دور ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حق میں جائز نہیں۔

کسی معین شخص کو "اے اطمینان پانے والی روح" نہیں کہنا چاہیے

سوال جب کوئی شخص فوت ہوجاتا ہے تو بعض لوگ یہ آیات پڑھتے ہیں: ﴿يٰٓأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِيٓ إِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾ "اے اطمینان پانے والی روح! اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل، تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔" اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب ان آیات کا کسی مخصوص شخص پر اطلاق جائز نہیں کیونکہ اس طرح یہ گویا اس بات کی شہادت ہوگی کہ وہ قطعی طور پر لوگوں کی اس صف میں شامل ہے جن سے بوقت وفات یہ کہا جاتا ہے۔

* * *

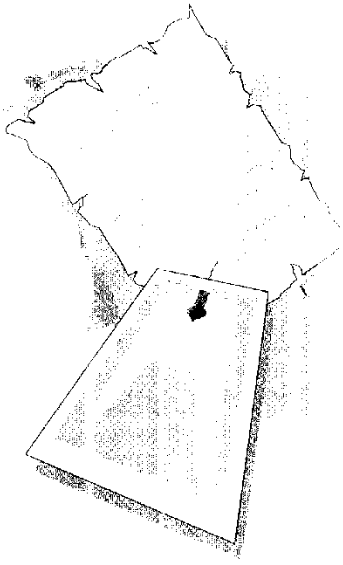

نماز کے مسائل

ناپاکی اور نجاست سے طہارت کی بنیاد پانی ہے

سوال ناپاکی اور نجاست سے طہارت حاصل کرنے میں اصل کیا ہے؟

جواب نجاست سے طہارت حاصل کرنے میں اصل پانی ہے کیونکہ طہارت پانی ہی سے حاصل ہوسکتی ہے خواہ پانی صاف ہو یا کوئی پاک چیز مل جانے کی وجہ سے بدل گیا ہو۔ راجح قول یہی ہے کہ پانی جب کسی پاک چیز کے ساتھ مل جانے کی وجہ سے بدل گیا ہو لیکن ابھی تک اسے پانی ہی کہا جاتا ہو تو اس سے طہوریت یعنی پاک کر دینے کی صلاحیت زائل نہیں ہوتی۔ وہ فی نفسہٖ طہور اور طاہر بھی ہے اور دوسری چیزوں کے لیے مطہر بھی۔ اگر پانی موجود نہ ہو یا اس کے استعمال سے نقصان ہوتا ہو تو پھر پانی سے طہارت حاصل کرنے کے بجائے تیمّم کیا جائے۔ تیمّم کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہتھیلیوں کو زمین پر مارا جائے، پھر ان دونوں کو چہرے پر پھیر لیا جائے اور ہتھیلیوں کو بھی ایک دوسرے پر پھیر لیا جائے۔ یہ حکم ناپاکی سے طہارت حاصل کرنے کے حوالے سے ہے۔

نجاست سے طہارت حاصل کرنے کے حوالہ سے حکم یہ ہے کہ پانی یا جو چیز بھی نجاست کو زائل کر دے، اس سے طہارت حاصل ہوجائے گی کیونکہ نجاست سے طہارت کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس نجاست کو کسی بھی چیز کے ساتھ زائل کر دیا جائے۔ جب عین نجاست پانی یا پٹرول یا کسی بھی دوسری تر یا خشک چیز سے مکمل طور پر زائل ہوجائے تو اس سے طہارت حاصل ہوجاتی ہے۔ اگر کوئی چیز کتے کے منہ ڈالنے کی وجہ سے نجس ہوگئی ہو تو اسے سات بار دھونا اور ایک بار مٹی سے مانجھنا فرض ہے۔ اس تفصیل سے یہ معلوم ہوگیا کہ ناپاکی سے طہارت حاصل کرنے اور نجاست سے طہارت حاصل کرنے میں کیا فرق ہے۔

سوال کیا پانی کے بغیر بھی نجاست سے طہارت حاصل ہوسکتی ہے؟ کیا ڈرائی کلین سے کوٹ وغیرہ پاک ہوجاتا ہے؟

جواب ازالۂ نجاست، عبادتِ مقصود نہیں ہے بلکہ ازالۂ نجاست سے مقصود یہ ہے کہ نجس اور ناپاک چیز کو دور کر دیا جائے لہٰذا اسے جس چیز کے ساتھ بھی دور کیا جائے، وہ دور ہوجائے اور اس کا نشان بھی ختم ہوجائے تو وہ چیز اس کیلئے مطہر ہوگی، خواہ وہ پانی ہو یا پٹرول یا کوئی بھی دوسری چیز جس سے عین نجاست زائل ہوجائے تو اس سے اسے طہارت حاصل ہوجائے گی، حتی کہ راجح قول کے مطابق جسے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی ترجیح دی ہے، اگر نجاست دھوپ یا ہوا سے زائل ہوجائے تو اس سے جگہ پاک ہوجائے گی کیونکہ جیسا کہ میں نے کہا کہ عین نجاست ناپاک ہے، جب یہ موجود ہوگی تو اس کی وجہ سے جگہ ناپاک ہوگی اور جب یہ نجس چیز زائل ہوجائے گی تو جگہ اپنی اصل طہارت کی طرف لوٹ آئے گی لہٰذا ہر وہ چیز جس سے عین نجاست اور اس کا نشان زائل ہوجائے، وہ اس کیلئے مطہر ہے البتہ اس کے رنگ کی وجہ سے ایسا نشان جسے زائل نہ کیا جاسکتا ہو، قابل معافی ہے لہٰذا اس تفصیل کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ڈرائی کلین جس سے کوٹ وغیرہ صاف کیے جاتے ہیں، اگر اس سے نجاست زائل ہوجائے تو اس سے بھی کپڑے پاک ہوجائیں گے۔

بدلے ہوئے پانی کا حکم

سوال زیادہ عرصہ ٹھہرے رہنے کی وجہ سے جو پانی بدل گیا ہو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب یہ پانی پاک ہے خواہ بدل گیا ہو کیونکہ یہ کسی خارجی چیز کے ملنے کی وجہ سے نہیں بدلا بلکہ یہ تو اس جگہ طویل عرصہ تک ٹھہرے رہنے کی وجہ سے تبدیل ہوا ہے لہٰذا اس سے وضو کرنے میں کوئی حرج نہیں، وضو صحیح ہے۔

مردوں کے لیے سونا حرام کیوں ہے؟

سوال مردوں کے لیے سونے کے حرام ہونے کی کیا حکمت ہے؟

جواب سوال کرنے والے کو اور اس شخص کو بھی جو اس جواب سے مطلع ہو، خوب معلوم ہونا چاہیے کہ ہر مومن کے لیے احکام شریعت میں علت یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا فرمان ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥٓ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ ٱلْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾

(الأحزاب: ٣٣/ ٣٦)

’’اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کوئی امر مقرر کر دیں تو وہ اس کام میں اپنا بھی کچھ اختیار سمجھیں۔‘‘

جو شخص بھی ہم سے کسی ایسی چیز کے وجوب یا حرمت کے بارے میں پوچھے گا، جس کے حکم کی دلیل کتاب و سنت میں موجود ہوگی، تو اس کی علت بس یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ کا فرمان ہے اور یہ علت ہر مومن کے لیے کافی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب یہ پوچھا گیا کہ اس کا سبب کیا ہے کہ حائضہ عورت روزے کی تو قضا دیتی ہے لیکن نماز کی قضا نہیں دیتی؟ انھوں نے جواب میں فرمایا:

«كَانَ يُصِيبُنَا ذٰلِكَ فَنُؤْمَرُ بِقَضَاءِ الصَّوْمِ وَلاَ نُؤْمَرُ بِقَضَاءِ الصَّلاَةِ»(صحيح البخاري، الحيض، باب لا تقضي الحائض الصلاة، ح:٣٢١ وصحيح مسلم، الحيض، باب وجوب قضاء الصوم ... ح:٣٣٥(٦٩) واللفظ له)

’’ہمیں جب یہ حالت پیش آتی تو ہمیں روزے کی قضا کا حکم دیا جاتا تھا لیکن نماز کی قضا کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔‘‘

کتاب اللہ یا سنت رسول سے نص کا مل جانا ہر مومن کے لیے علت موجبہ ہے لیکن اس کے باوجود اس بات میں بھی کوئی حرج نہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کے احکام میں علت و حکمت کو تلاش کرے کیونکہ اس سے اطمینان قلب میں اضافہ ہوگا اور جب احکام کو علل کے ساتھ ملایا جائے گا تو اس سے اسلامی شریعت کی سربلندی بھی واضح ہوگی اور جب اس منصوص حکم کی علت کسی دوسرے غیر منصوص امر میں بھی موجود ہوگی تو اسے اس پر قیاس کرنا ممکن ہوگا گویا کسی شرعی حکم کی علت و حکمت کے معلوم ہونے کے یہ تین فوائد ہیں۔

اس تمہید کے بعد ہم اس سوال کے جواب میں عرض کریں گے کہ یہ ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مردوں کے لیے سونے کے استعمال کو حرام قرار دیا ہے البتہ اس کا استعمال عورتوں کے لیے جائز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سونا سب سے مہنگی چیز ہے، جسے انسان زینت کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ سونا زینت بھی ہے اور زیور بھی اور یہ چیزیں مرد کے لیے مقصود نہیں ہیں۔ انسان سونے کے بغیر نہ کسی کے لیے مکمل ہو سکتا ہے اور نہ اس کے بغیر وہ کسی کو مکمل کر سکتا ہے لیکن مرد تو رجولیت کی وجہ سے فی نفسہ کامل ہے، اسے اس بات

کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی دوسرے فرد کے لیے مزین کرے، جس سے اس کی رغبت وابستہ ہو۔ اس کے برعکس عورت ناقص ہے، اسے اپنے حسن و جمال کی تکمیل کی ضرورت ہے۔ اسے ضرورت ہے کہ وہ سب سے قیمتی زیورات کے ساتھ زیب و زینت اور آرائش و زیبائش کا اہتمام کرے تاکہ اس طرح اس کے اور اس کے شوہر کے مابین تعلقات خوشگوار ہوں، لہٰذا عورت کے لیے اس بات کو جائز قرار دیا گیا کہ وہ سونے کے زیورات استعمال کرے جبکہ مرد کے لیے ان کا استعمال ناجائز قرار دے دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿ أَوَمَن يُنَشَّؤُا۟ فِى ٱلْحِلْيَةِ وَهُوَ فِى ٱلْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ ﴿١٨﴾ ﴾ (الزخرف: ۴۳/۱۸)

”کیا وہ جو زیور میں پرورش پائے اور جھگڑے کے وقت بات واضح نہ کر سکے (اللہ کی بیٹی ہو سکتی ہے؟)“

اس سے بھی شریعت کا یہ حکم واضح ہو جاتا ہے کہ مردوں کے لیے سونا حرام ہے۔ اس مناسبت سے یہاں میں ان مردوں کی خدمت میں بھی عرض کروں گا جو سونے کے زیور پہننے کی آزمائش میں مبتلا ہو چکے ہیں کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہوئے اپنے آپ کو عورتوں کی صف میں شامل کر لیا ہے اور اپنے ہاتھوں میں انھوں نے جو زیور پہن رکھا ہے، یہ زیور نہیں بلکہ درحقیقت جہنم کی آگ کا انگارا ہے جیسا کہ نبی ﷺ سے یہ ثابت ہے، لہٰذا انھیں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے آگے توبہ کرنی چاہیے۔ اگر وہ ضرور کوئی زیور استعمال کرنا چاہیں تو شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے چاندی کا زیور استعمال کر سکتے ہیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح سونے کے سوا دیگر دھاتوں سے بنی ہوئی انگوٹھیوں کے استعمال میں بھی کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ یہ معاملہ حد اسراف تک نہ پہنچے۔

سونے کے دانت لگوانے کا حکم

سوال سونے کے دانت لگوانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب مردوں کو ضرورت کے بغیر سونے کے دانت نہیں لگوانے چاہییں کیونکہ مرد کے لیے سونا پہننا اور اسے بطور زیور استعمال کرنا حرام ہے۔ عورتوں کے لیے حکم یہ ہے کہ اگر انھیں سونے کے دانت بطور زیور استعمال کرنے کی عادت ہو تو پھر زیب و زینت کے لیے سونے کے دانت استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں اور نہ یہ اسراف ہوگا کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«أُحِلَّ الذَّهَبُ وَالْحَرِيرُ لِإِنَاثِ أُمَّتِي»(جامع الترمذي، اللباس، باب ماجاء في الحرير والذهب، ح: ۱۷۲۰ وسنن النسائي، الزينة، باب تحريم الذهب على الرجال، ح: ۵۱۵۱ واللفظ له)

”میری امت کی عورتوں کے لیے سونے اور ریشم کو حلال قرار دے دیا گیا ہے“

جب کوئی عورت یا مرد اس حال میں فوت ہو جائے کہ اس نے ضرورت کی وجہ سے سونے کا دانت لگوایا ہو تو اسے اتار لیا جائے الا یہ کہ مثلے کا اندیشہ ہو یعنی یہ اندیشہ ہو کہ اسے نکالنے کی وجہ سے مسوڑا پھٹ جائے گا تو اس صورت میں اسے باقی رہنے دیا جائے، اور یہ اس لیے کہ سونا مال ہے اور وفات کے بعد مال وارثوں کا ہوتا ہے لہٰذا اس کے میت کے پاس باقی رہنے اور اس کے ساتھ دفن ہونے میں مال کا ضیاع ہے۔

مقامات وضو میں پیشاب کرنے کا حکم جب کہ جسم بھی برہنہ ہو

سوال وضو کے مقامات پر پیشاب کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے، جب کہ اس صورت میں انسان برہنہ ہو جاتا ہو؟

جواب انسان کے لیے اس طرح برہنہ ہونا جائز نہیں ہے کہ اسے کوئی ایسا شخص دیکھ سکے، جس کے لیے اسے دیکھنا حلال نہیں ہے۔ اگر انسان وضو کے لیے تیار کیے گئے مقامات پر برہنہ ہو کہ لوگ اسے دیکھ سکیں تو اس سے وہ گناہ گار ہوگا۔ اس صورت میں فقہاء رحمہم اللہ نے ذکر کیا ہے کہ آدمی کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ استنجا کے بجائے ڈھیلے استعمال کرلے یعنی لوگوں سے دور جا کر قضائے حاجت کرے اور پتھروں یا ٹشو پیپرز یا کسی ایسی چیز کے ساتھ صفائی کرے جس کے ساتھ صفائی کرنا جائز ہوحتی کہ تین بار یا اس سے زیادہ بار پونچھنے سے نجاست کے خارج ہونے کا مقام صاف ہو جائے۔ فقہاء نے اسے واجب اس لیے قرار دیا ہے کہ استنجا کے لیے ستر کا مقام کھولنے سے لوگوں کے سامنے برہنگی ہوگی اور یہ کام حرام ہے اور جس کے بغیر حرام کی تلافی ممکن نہ ہو وہ واجب ہوتا ہے، لہٰذا اس سوال کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ استنجا کے لیے وہ لوگوں کے سامنے ستر کے مقام کو برہنہ کرے بلکہ اسے کوشش کرنی چاہیے کہ اس مقصد کے لیے وہ کسی ایسی جگہ میں جائے، جہاں اسے کوئی نہ دیکھے۔

کھڑے ہو کر پیشاب کرنا اور حمام میں مقدس اوراق لے جانا کیسا ہے؟

سوال کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب کھڑے ہو کر پیشاب کرنا درج ذیل دو شرطوں کے ساتھ جائز ہے: ① انسان پیشاب کے چھینٹوں سے محفوظ رہے۔ ② اس بات سے محفوظ ہو کہ کوئی اس کے ستر کو دیکھے۔

سوال حمام میں قرآن مجید لے کر جانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اہل علم فرماتے ہیں کہ انسان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ حمام میں قرآن مجید لے کر جائے کیونکہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ قرآن مجید کے احترام اور تعظیم کا تقاضا یہ ہے کہ اسے ایسی جگہ نہیں لے جانا چاہیے۔ واللہ الموفق!

سوال حمام میں ایسے کاغذات لے کر جانے کے بارے میں کیا حکم ہے، جن پر اللہ کا نام لکھا ہو؟

جواب حمام میں ایسے کاغذات لے جانا جائز ہے، جن میں اللہ کا نام ہو، بشرطیکہ وہ کاغذات جیب میں ہوں اور ظاہر نہ ہوں بلکہ مخفی اور مستور ہوں۔ مسلمانوں کے اکثر و بیشتر نام اللہ عزوجل کے نام سے خالی نہیں ہوتے مثلاً: عبداللہ اور عبدالعزیز وغیرہ (اور یہ نام کاغذات پر لکھے ہوتے ہیں اور کاغذات جیب میں ہوتے ہیں۔)

حمام میں بسم اللہ کیسے پڑھے؟

سوال جب انسان حمام میں ہو تو وہ بسم اللہ کیسے پڑھے؟

جواب جب انسان حمام میں ہو تو وہ بسم اللہ اپنے دل میں پڑھے، زبان سے نہ پڑھے کیونکہ وضو اور غسل کرتے ہوئے بسم اللہ کے پڑھنے کے وجوب کا قول قوی نہیں ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کو وضو کے شروع میں بسم اللہ پڑھنے کے بارے میں نبی ﷺ کی

کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں ہے۔ اسی لیے علامہ موفق ؒ صاحب المغنی وغیرہ کا قول ہے کہ وضو کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا سنت ہے، واجب نہیں۔

قضائے حاجت کے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پشت نہیں کرنی چاہیے

سوال قضائے حاجت کے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پشت کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اس مسئلہ میں اہل علم کے کئی اقوال ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے: بعض اہل علم کا مذہب ہے کہ قضائے حاجت کے وقت غیر عمارت میں (کھلی جگہ) قبلہ کی طرف منہ اور پشت کرنا حرام ہے اور انھوں نے حضرت ابو ایوب ؓ کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا أَتَيْتُمُ الْغَائِطَ فَلاَ تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَلاَ تَسْتَدْبِرُوهَا بِبَوْلٍ وَلاَ غَائِطٍ وَلٰكِنْ شَرِّقُوا أَوْ غَرِّبُوا»(صحيح البخاري، الوضوء، باب لا تستقبل القبلة ببول ولا غائط ... ح:١٤٤ وصحيح مسلم، الطهارة، باب الاستطابة، ح:٢٦٤ واللفظ له)

”جب تم قضائے حاجت کے لیے جاؤ تو بول و براز کے وقت قبلہ کی طرف منہ اور پشت نہ کرو بلکہ مشرق یا مغرب کی طرف رخ کرو۔“①

حضرت ابو ایوب ؓ نے بیان کیا کہ جب ہم شام گئے تو دیکھا کہ بیت الخلا قبلہ رخ بنائے گئے تھے۔ ہم جب ان سے باہر نکلتے تو اللہ تعالیٰ سے استغفار کر لیتے تھے۔ اہل علم کے اس گروہ نے ابو ایوب ؓ کی اس روایت کو اسے غیر عمارت پر محمول کیا ہے البتہ عمارت کے اندر رخ اور پشت کرنا جائز ہے کیونکہ حدیث ابن عمر ؓ میں ہے:

«اِرْتَقَيْتُ فَوْقَ بَيْتِ حَفْصَةَ فَرَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقْضِي حَاجَتَهُ مُسْتَدْبِرَ الْقِبْلَةِ مُسْتَقْبِلَ الشَّامِ»(صحيح البخاري، فرض الخمس، باب ماجاء في بيوت أزواج النبي ﷺ، ح:٣١٠٢)

”میں حضرت حفصہ ؓ کے گھر کے اوپر چڑھا تو میں نے دیکھا کہ نبی ﷺ قبلہ کی طرف پشت کیے اور شام کی طرف منہ کیے قضائے حاجت کر رہے تھے۔“

بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ عمارت یا غیر عمارت کسی حال میں بھی قبلہ کی طرف منہ یا پشت کرنا جائز نہیں ہے، انھوں نے حضرت ابو ایوب ؓ کی مذکورہ بالا حدیث سے استدلال کیا ہے۔ اور حضرت ابن عمر ؓ سے مروی حدیث کے انھوں نے درج ذیل جوابات دیے ہیں: ① حدیث ابن عمر ؓ کو ممانعت سے پہلے کے زمانہ پر محمول کیا جائے گا۔ ② ممانعت راجح ہے کیونکہ ممانعت اصل کو بیان کر رہی ہے اور وہ ہے جواز اور اصل کے مطابق بیان زیادہ بہتر ہے۔ ③ حضرت ابو ایوب ؓ سے مروی حدیث قولی ہے اور حدیث ابن عمر ؓ فعلی ہے اور فعل کو قول کے خلاف پیش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ فعل میں خصوصیت، نسیان اور دیگر کئی احتمال ہو سکتے ہیں۔

---

① مشرق یا مغرب کی طرف رُخ کرنے کا یہ حکم مدینہ اور اس کے مضافات اور شام وغیرہ کیلئے مخصوص ہے جو مکہ مکرمہ کے شمال میں ہیں بلکہ مکہ مکرمہ کے جنوب میں واقع یمن وغیرہ کیلئے بھی یہی حکم ہے، لیکن مکہ مکرمہ کے مشرق یا مغرب میں واقع مقامات مثلاً پاکستان، بھارت، چین، شمالی افریقہ اور امریکہ وغیرہ کیلئے قبلے کا رُخ شرقاً یا غرباً ہونے کے باعث قضائے حاجت کے وقت شرقاً غرباً بیٹھنا ممنوع ہے۔

میرے نزدیک اس مسئلہ میں راجح قول یہ ہے کہ کھلی فضا میں قبلہ کی طرف منہ اور پشت کرنا حرام ہے اور عمارت کے اندر پشت کرنا جائز ہے‘ منہ کرنا جائز نہیں کیونکہ منہ نہ کرنے کے بارے میں ممانعت مطلق ہے اور اس میں کوئی تخصیص نہیں اور پشت کرنے کے بارے میں ممانعت فعل کے ساتھ مخصوص ہے۔ علاوہ ازیں منہ کرنے کی نسبت پشت کرنا زیادہ خفیف ہے‘ اسی لیے انسان جب کسی عمارت کے اندر ہو تو اس بارے میں تخفیف کر دی گئی ہے لیکن افضل یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو‘ قبلہ کی طرف پشت بھی نہ کی جائے۔

استنجا کرنا کب واجب ہے؟

سوال جب انسان کی ہوا خارج ہو تو کیا اس سے استنجا کرنا بھی واجب ہے؟

جواب دبر سے ہوا خارج ہونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«لاَ يَنْصَرِفْ حَتَّى يَسْمَعَ صَوْتًا أَوْ يَجِدَ رِيحًا»(صحيح البخاري، الوضوء، باب لا يتوضأ من الشك حتى يستيقن، ح:١٣٧ وصحيح مسلم، الحيض، باب الدليل على أن من تيقن الطهارة ثم شك في الحدث فله أن يصلي بطهارته تلك، ح:٣٦١)

’’اس وقت تک نماز نہ چھوڑے جب تک آواز نہ سن لے یا بدبو نہ محسوس کر لے۔‘‘

لیکن اس سے استنجا یعنی شرم گاہ کو دھونا واجب نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں کوئی ایسی چیز خارج نہیں ہوتی‘ جسے دھونا لازم ہو‘ البتہ ہوا خارج ہونے سے وضو ٹوٹ جائے گا لہٰذا انسان کے لیے وضو کرنا ہی کافی ہوگا یعنی کلی اور ناک صاف کرتے ہوئے منہ اور کہنیوں تک دونوں ہاتھوں کو دھولے‘ سر اور کانوں کا مسح کرے اور ٹخنوں تک دونوں پاؤں دھولے۔

میں یہاں ایک مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جو بہت سے لوگوں کو معلوم نہیں ہے اور وہ یہ کہ بعض لوگوں نے جب نماز کے وقت سے پہلے بول و براز کر کے استنجا کر لیا ہو اور پھر وہ نماز کے وقت وضو کرنے لگیں تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دوبارہ استنجا یعنی شرم گاہ کو دھونا ضروری ہے تو یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ انسان جب قضائے حاجت کے بعد شرم گاہ کو دھولے تو اس سے وہ مقام پاک ہو گیا اور جب وہ پاک ہو گیا تو پھر اسے دوبارہ دھونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اپنی معروف شرائط کے ساتھ استنجا یا ڈھیلے استعمال کرنے سے مقصود مقام کو پاک کرنا ہے لہٰذا جب وہ پاک ہو جائے تو دوبارہ اس وقت تک ناپاک نہیں ہوتا جب تک اس سے دوبارہ کوئی چیز خارج نہ ہو۔

کیا خطبہ سننے کے دوران میں مسواک کی جا سکتی ہے؟

سوال مسواک کے استعمال کی تاکید کس وقت ہے؟ نماز کا انتظار کرنے والے اور خطبہ سننے والے کے لیے مسواک کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب سو کر اٹھنے کے وقت مسواک کی بہت زیادہ تاکید ہے‘ نیز گھر میں داخل ہوتے وقت‘ وضو میں کلی کرتے وقت اور نماز کے لیے کھڑے ہونے کے وقت بھی مسواک کی بہت زیادہ تاکید ہے۔ نماز کا انتظار کرنے والے کے لیے مسواک کرنے میں کوئی حرج نہیں‘ البتہ خطبہ سننے کے دوران میں مسواک نہیں کرنی چاہیے کیونکہ یہ خطبہ سننے سے توجہ ہٹا دے گی۔ اگر اونگھ وغیرہ طاری ہو تو اونگھ دور

کرنے کے لیے مسواک کرسکتا ہے۔ ①

وضو کرتے وقت بسم اللہ پڑھنے کا حکم

سوال کیا وضو کرتے وقت بسم اللہ پڑھنا واجب ہے؟

جواب وضو کرتے وقت بسم اللہ پڑھنا واجب نہیں بلکہ سنت ہے کیونکہ اس کے بارے میں حدیث کا ثبوت محل نظر ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس باب میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے اور جیسا کہ سب لوگوں کو معلوم ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ حدیث کے جلیل القدر ائمہ وحفاظ میں سے ہیں لہٰذا جب وہ فرمائیں کہ اس باب میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے تو بلاشبہ اس حدیث کے بارے میں دل میں خلش رہتی ہے، اور جب اس کا ثبوت محل نظر ہے تو کسی انسان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ بندگان الٰہی کے لیے کسی ایسی چیز کو لازم قرار دے جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہ ہو، اس لیے میری رائے یہ ہے کہ وضو کرتے وقت بسم اللہ پڑھنا سنت ہے لیکن جس کے نزدیک یہ حدیث ثابت ہو تو اس کے لیے اس کے مطابق عمل کرنا واجب ہوگا کیونکہ [لَا وُضُوءَ] میں "لَا" صحیح قول کے مطابق نفی صحت کے لیے ہے نفی کمال کے لیے نہیں۔

کیا مردوں کی طرح عورتوں پر ختنہ واجب ہے؟

سوال مردوں اور عورتوں کے ختنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب ختنے کے حکم کے بارے میں اختلاف ہے۔ صحیح ترین قول یہ ہے کہ ختنہ مردوں کے حق میں واجب اور عورتوں کے حق میں سنت ہے اور دونوں میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ مردوں کے حق میں ختنہ میں ایک ایسی مصلحت ہے جس کا نماز کی شرطوں میں سے ایک شرط یعنی طہارت سے تعلق ہے کیونکہ قلفہ باقی رہنے کی صورت میں حشفہ کے سوراخ سے نکلنے والا پیشاب قلفہ میں باقی رہ جاتا ہے اور وہ جلن یا سوزش کا سبب بن جاتا ہے یا بے ختنہ انسان جب بھی حرکت کرتا ہے تو اس سے پیشاب خارج ہوکر نجاست کا سبب بنتا رہتا ہے۔ عورت کے ختنہ کا زیادہ سے زیادہ فائدہ یہ ہے کہ یہ عورت کی شہوت کم کردیتا ہے۔ یہ طلب کمال ہے، اور ایسی چیز نہیں جس کے نہ

---

① فضیلۃ الشیخ المفتی رحمہ اللہ نے اونگھ دور کرنے کے لیے مسواک کرنے کی کوئی دلیل بیان نہیں کی۔ ہمارے محدود علم کے مطابق غالباً کسی حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہے، البتہ جمعہ کے دن حالت خطبہ میں اگر کسی شخص کو ایک جگہ اونگھ آجائے تو اس کے لیے مستحب یہ ہے کہ وہ جگہ تبدیل کرلے اور اس کی دلیل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی یہ حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: [إِذَا نَعِسَ أَحَدُكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَلْيَتَحَوَّلْ عَنْ مَجْلِسِهِ ذَلِكَ] (جامع الترمذی، ابواب الجمعة، باب فيمن ينعس يوم الجمعة أنه يتحول من مجلسه، حدیث: 526 مسند احمد: 135/2) "جب تم میں سے کوئی شخص جمعہ کے دن اونگھنے لگے تو وہ اپنی اس جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوجائے۔" امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پسند ہے کہ جب جمعہ کے دن کوئی شخص مسجد میں اونگھنے لگے تو جگہ تبدیل کرلے بشرطیکہ جگہ موجود ہو اور کسی کو پھلانگنے کی نوبت بھی نہ آئے۔ جگہ تبدیل کرنے میں یہ حکمت ہے کہ اس سے نیند اڑ جاتی ہے اور اونگھ نہیں آتی۔ (الکتاب الام: 340/1 نیز ملاحظہ فرمائیں، المغنی لابن قدامہ: 3/235-236)

کرنے سے نقصان ہو۔ علماء نے وجوب ختنہ کے لیے یہ شرط عائد کی ہے کہ اس سے ہلاکت یا بیماری کا اندیشہ نہ ہو اگر اس طرح کا کوئی اندیشہ ہو تو پھر ختنہ واجب نہیں ہے کیونکہ واجبات عجز، یا خوف ہلاکت یا نقصان کی صورت میں واجب نہیں رہتے۔ مردوں کے حق میں وجوب ختنہ کے دلائل حسب ذیل ہیں:

- متعدد احادیث میں یہ آیا ہے کہ نبی ﷺ نے اسلام لانے والوں کو ختنہ کا حکم دیا، ① اور اصول یہ ہے کہ امر وجوب کیلئے ہوتا ہے۔
- ختنہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین امتیازی بات ہے حتی کہ مسلمان معرکوں میں اپنے شہداء کو ختنوں ہی سے پہچانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ختنہ ہی ایک امتیازی علامت ہے اور جب یہ امتیازی علامت ہے تو کافر اور مسلمان میں امتیاز کے وجوب کے پیش نظر واجب ہے۔ اسی لیے کفار کے ساتھ مشابہت کو حرام قرار دے دیا گیا ہے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ»(سنن أبي داود، اللباس، باب في لبس الشهرة، ح:٤٠٣١)

”جو کسی قوم کے ساتھ مشابہت اختیار کرے، وہ انہی میں سے ہے۔“

- ختنہ بدن کے کچھ حصے کو کاٹنے کا نام ہے اور بدن کے کسی حصے کو کاٹنا حرام ہے اور حرام کو کسی واجب شے ہی کے لیے مباح قرار دیا جا سکتا ہے لہٰذا ختنہ واجب ہے۔
- (اگر کوئی بچہ یتیم ہے تو اس کے) ختنے کا اہتمام اس کا وارث کرتا ہے اور وہ اس پر اور اس کے مال پر زیادتی ہے کیونکہ وہ ختنہ کرنے والے کو اجرت دے گا اور اگر ختنہ واجب نہ ہوتا تو اس کے مال اور بدن پر یہ زیادتی جائز نہ ہوتی۔ ان نقلی اور نظری دلائل سے معلوم ہوا کہ مردوں کے حق میں ختنہ واجب ہے۔

عورتوں کے ختنہ کے بارے میں اقوال مختلف ہیں، جن میں صحیح ترین قول یہ ہے کہ ختنہ صرف مردوں کے لیے واجب ہے۔ عورتوں کے لیے نہیں اور اس کے بارے میں ایک ضعیف حدیث ہے:

«اَلْخِتَانُ سُنَّةٌ لِلرِّجَالِ، مَكْرُمَةٌ لِلنِّسَاءِ»(مسند أحمد: ٥/ ٧٥)

”ختنہ مردوں کے لیے سنت اور عورتوں کے لیے فضیلت ہے۔“ اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو اس باب میں فیصلہ کن ہوتی۔

مصنوعی دانتوں کی صورت میں کلی کیسے کی جائے اور کیا کانوں کے مسح کے لیے نیا پانی لینا ضروری ہے؟

سوال اگر انسان نے مصنوعی دانت لگوائے ہوں تو کیا کلی کرتے ہوئے انھیں اتارنا واجب ہے؟

جواب جب انسان نے مصنوعی دانت لگوائے ہوں تو بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اتارنا واجب نہیں ہے۔ اس صورت میں یہ دانت انگوٹھی کے مشابہ ہوں گے اور بوقت وضو انگوٹھی کو اتارنا واجب نہیں ہے بلکہ افضل یہ ہے کہ اسے حرکت دے دی جائے اور حرکت دینا بھی واجب نہیں ہے کیونکہ نبی ﷺ انگوٹھی پہنتے تھے مگر یہ منقول نہیں کہ آپ وضو کرتے وقت اسے اتار دیتے ہوں اور ظاہر

---

① مسند الإمام احمد:415/3

ہے کہ ان دانتوں کی نسبت انگوٹھی پانی کے پہنچنے میں زیادہ رکاوٹ ہے اور پھر بعض لوگوں کے لیے ان لگائے ہوئے دانتوں کا اپنی جگہ سے اتارنا اور پھر انھیں دوبارہ لگانا بہت مشکل بھی ہے' اس لیے انھیں وضو کرتے وقت اتارنا واجب نہیں ہے۔

سوال کیا وضو کرنے والے کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ کانوں کے مسح کے لیے نیا پانی لے؟

جواب کانوں کے لیے نیا پانی لینا لازم نہیں ہے بلکہ صحیح قول کے مطابق یہ مستحب بھی نہیں ہے کیونکہ نبی ﷺ کے وضو کی کیفیت بیان کرنے والے صحابۂ کرام ؓ نے اس بات کو بیان نہیں کیا کہ آپ کانوں کے لیے نیا پانی لیتے ہوں' لہٰذا افضل یہ ہے کہ سر کے مسح کے بعد باقی بچی ہوئی تری سے کانوں کا مسح کیا جائے۔

وضو میں ترتیب اور موالات کا حکم

سوال وضو میں ترتیب کے کیا معنی ہیں؟ وضو میں موالات سے کیا مراد ہے؟ اور اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب وضو میں ترتیب کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس طرح شروع کریں جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے شروع فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے چہرے کے دھونے کا ذکر فرمایا' پھر دونوں ہاتھوں کے دھونے کا' پھر سر کے مسح کا اور پھر دونوں پاؤں کے دھونے کا۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں ہتھیلیوں کے دھونے کا چہرہ دھونے سے پہلے ذکر نہیں فرمایا کیونکہ دونوں ہتھیلیوں کا چہرے سے پہلے دھونا واجب نہیں بلکہ سنت ہے' لہٰذا اعضاء وضو میں اسی ترتیب کو ملحوظ رکھیں جس ترتیب کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ نبی ﷺ نے جب فریضۂ حج ادا فرمایا اور آپ سعی کے لیے تشریف لے گئے تو آپ نے کوہ صفا سے آغاز فرمایا۔ جب کوہ صفا کی طرف متوجہ ہوئے' تو آپ نے اس آیت کریمہ کی تلاوت فرمائی:

﴿ إِنَّ ٱلصَّفَا وَٱلْمَرْوَةَ مِن شَعَآئِرِ ٱللَّهِ ۖ ﴾ (البقرة: ٢/ ١٥٨)

''بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔''

اور پھر فرمایا:

«أَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللهُ بِهِ»(صحيح مسلم، الحج، باب صفة حجة النبي ﷺ، ح:١٢١٨)

''میں بھی اسی سے شروع کرتا ہوں' جس سے اللہ تعالیٰ نے شروع فرمایا ہے۔''

اسی طرح آپ نے واضح فرما دیا کہ مروہ سے پہلے آپ صفا پر اس لیے تشریف لائے ہیں تا کہ اس سے شروع کریں جس کا اللہ تعالیٰ نے پہلے ذکر فرمایا ہے۔ موالات کے معنی یہ ہیں کہ اعضائے وضو میں زمانہ کے اعتبار سے فرق نہ کیا جائے یعنی بعض اعضا کو ایک وقت میں دھویا جائے اور بعض کو دوسرے وقت میں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر اس نے اپنے چہرے کو دھویا اور پھر دونوں ہاتھوں کو اس کے بعد بہت تاخیر سے دھویا تو اس صورت میں موالات باقی نہ رہی لہٰذا اس صورت میں واجب ہے کہ دوبارہ از سر نو وضو کرے کیونکہ نبی ﷺ نے جب ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے وضو کیا ہے اور اس کے پاؤں میں ناخن کے بقدر جگہ ہے جس کو پانی نہیں لگا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«اِرْجِعْ فَأَحْسِنْ وُضُوءَكَ»(صحيح مسلم، الطهارة، باب وجوب استيعاب جميع أجزاء محل الطهارة،

ح: ۲۴۳)

”واپس جاؤ اور اچھی طرح وضو کرو۔“

اور سنن ابی داؤد کی روایت میں ہے کہ آپ نے اسے دوبارہ وضو کرنے کا حکم دیا۔ یہ حدیث بھی اس بات کی دلیل ہے کہ موالات شرط ہے اور اس لیے بھی کہ وضو ایک عبادت ہے اور ایک عبادت کے مختلف اجزاء کی ادائیگی میں فرق نہیں ہونا چاہیے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ترتیب اور موالات وضو کے فرائض میں سے دو فرض ہیں۔

سوال جب انسان وضو کرتے ہوئے کسی ایک عضو کو دھونا بھول جائے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جب انسان وضو کرے اور وہ کسی ایک عضو کو بھول جائے پھر اگر اسے جلد یاد آ جائے تو وہ اسے اور اس کے بعد والے تمام اعضا کو دھوئے۔ مثلاً: ایک شخص نے وضو کیا اور اس نے دائیں ہاتھ کو دھولیا مگر بائیں ہاتھ کو دھونا بھول گیا' پھر اس نے سر اور کانوں کا مسح کر لیا اور پھر دونوں پاؤں کو بھی دھولیا اور وہ جب اپنے دونوں پاؤں کے دھونے سے فارغ ہوا تو اسے یاد آیا کہ اس نے بائیں ہاتھ کو نہیں دھویا تو اسے ہم یہ کہیں گے کہ وہ اپنے بائیں ہاتھ کو دھوئے' سر اور دونوں کانوں کا مسح کرے اور پھر دونوں پاؤں کو دھوئے تو سر اور کانوں کے مسح اور پاؤں کے دوبارہ دھونے کو ہم نے ترتیب ہی کی وجہ سے واجب قرار دیا ہے۔ وضو میں واجب ہے کہ اس ترتیب کو ملحوظ رکھا جائے۔ جس ترتیب کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اسے درج ذیل آیت کریمہ میں بیان فرمایا ہے:

﴿فَاغْسِلُوا۟ وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى ٱلْمَرَافِقِ وَٱمْسَحُوا۟ بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى ٱلْكَعْبَيْنِ﴾

(المائدۃ: ۵/ ۶)

”تو اپنے منہ اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھولیا کرو' اور سر کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں دھولیا کرو۔“

اور اگر اسے طویل مدت کے بعد یاد آئے تو وہ از سرنو سارا وضو دوبارہ کرے' مثلاً: ایک شخص وضو کرے اور وہ اپنا بایاں ہاتھ دھونا بھول جائے' وضو سے فارغ ہو کر چلا جائے اور پھر طویل مدت کے بعد اسے یاد آئے کہ اس نے بایاں ہاتھ نہیں دھویا تو اس کے لیے واجب ہے کہ از سرنو سارا وضو دوبارہ کرے کیونکہ پہلے وضو میں موالات باقی نہیں رہی تھی اور اعضائے وضو میں موالات وضو کے صحیح ہونے کے لیے شرط ہے۔ اور اگر اسے صرف یہ شک ہو کہ معلوم نہیں اس نے اپنا بایاں ہاتھ دھویا ہے یا نہیں یا یہ شک ہو کہ اس نے کلی کی اور ناک صاف کی ہے یا نہیں تو اس شک کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا اور وہ اپنی نماز کو جاری رکھے گا' اس صورت میں کوئی حرج نہیں کیونکہ عبادات سے فراغت کے بعد شک کا اعتبار نہیں کیا جاتا کیونکہ اگر ہم یہ کہیں کہ فراغت کے بعد بھی شک کا اعتبار ہے تو اس سے لوگوں کے لیے وسوسے کا ایک دروازہ کھل جائے گا اور ہر انسان اپنی عبادت میں شک کرنے لگے گا' اس لیے اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر یہ رحمت ہے کہ عبادت سے فراغت کے بعد پیدا ہونے والے شک کو ناقابل التفات قرار دے دیا گیا ہے لہٰذا انسان اس کی طرف توجہ نہ دے' البتہ اگر کسی خلل کے بارے میں واقعی یقین ہو تو پھر اس کی تلافی واجب ہے۔ واللہ اعلم۔

سوال جب وضو کرتے ہوئے پانی ختم ہو جائے اور پھر پانی اس وقت آئے جب اعضا خشک ہو گئے ہوں' تو اس صورت میں کیا وہاں سے وضو کرے گا' جہاں پانی ختم ہو گیا تھا یا سارا وضو دوبارہ کرے گا؟

جواب اس سوال کا جواب موالات (تسلسل) کے معنی اور اس کے صحت نماز کے لیے شرط ہونے پر مبنی ہے اور اس مسئلہ میں علماء کے دو قول ہیں۔ ان میں سے ایک قول یہ ہے کہ موالات شرط ہے اور وضو اگر تسلسل ہی کے ساتھ کیا جائے تو صحیح ہوگا اور اگر بعض اعضاء کو ایک دفعہ دھویا' بعض کو دوسری دفعہ دھویا اور درمیان میں وقفہ آ گیا تو اس طرح وضو صحیح نہ ہوگا اور اس مسئلہ میں یہی قول راجح ہے کیونکہ وضو ایک عبادت ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس عبادت کے بعض اجزا بعض دیگر کے ساتھ متصل ہوں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ موالات واجب اور صحت وضو کے لیے شرط ہے تو سوال یہ ہے کہ موالات کیسے ہوگی؟

بعض علماء تو کہتے ہیں کہ موالات یہ ہے کہ اس عضو کے دھونے کو آپ اس قدر مؤخر نہ کریں کہ اس سے پہلے دھویا ہوا عضو خشک ہو جائے الا یہ کہ کسی ایسی وجہ سے تاخیر ہوگئی ہو جس کا طہارت ہی سے تعلق ہو۔ مثلاً: یہ کہ کسی ایک عضو پر پینٹ وغیرہ لگا ہوا تھا' اس نے اسے دور کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش کی وجہ سے تاخیر ہوگئی اور پہلے دھوئے ہوئے اعضاء خشک ہوگئے' اس صورت میں وہ اپنے وضو کے پہلے تسلسل ہی کو برقرار رکھے گا' خواہ اس میں خاصی دیر ہو جائے کیونکہ اسے ایسے کام کی وجہ سے دیر ہوئی ہے جس کا طہارت کے ساتھ تعلق ہے۔ اور اگر تاخیر پانی کے حصول کی وجہ سے ہوئی ہو جیسا کہ اس سوال میں ہے تو بعض اہل علم کے بقول اس صورت میں موالات باقی نہیں رہتی لہٰذا وضو از سر نو دوبارہ شروع کرنا ہوگا اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں بھی موالات باقی ہے کیونکہ یہ امر غیر اختیاری ہے' وضو کرنے والا تو تکمیل وضو کے لیے انتظار کرتا رہا ہے لہٰذا جب پانی آ جائے تو اسے صرف باقی ماندہ وضو کرنا چاہیے خواہ اس کے اعضا خشک ہوگئے ہوں۔

بعض دوسرے علماء جو موالات کے وجوب اور شرط کے قائل ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ موالات کا تعلق عضو کے خشک ہونے سے نہیں بلکہ عرف سے ہے۔ عرف کے مطابق جسے وقفہ سمجھا جائے' وہ وقفہ ہوگا اور اس سے موالات قطع ہو جائے گی یعنی تسلسل ٹوٹ جائے گا اور جسے عرف وقفہ نہ سمجھے وہ وقفہ نہ ہوگا اور اس سے موالات ختم نہ ہوگی مثلاً: پانی ختم ہونے کی صورت میں جو لوگ پانی کے انتظار میں ہیں یا اسے لانے کی کوشش میں مشغول ہیں تو اس صورت کو وضو کے اول و آخر میں انقطاع شمار نہیں کیا جاتا لہٰذا انھیں پہلے وضو کو صحیح شمار کرتے ہوئے صرف باقی ماندہ وضو کرنا ہوگا اور یہی قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ جب پانی آ جائے تو صرف باقی ماندہ وضو کو مکمل کریں الا یہ کہ درمیان میں وقفہ بہت زیادہ طویل ہو جائے جو اسے عرف سے خارج کر دے تو وضو از سر نو کرنا ہوگا۔ اس مسئلہ میں دونوں صورتوں کے لیے گنجائش ہے۔

ناخنوں پر مصنوعی ناخن اور نیل پالش کی صورت میں وضو کا حکم

سوال اس عورت کے وضو کے بارے میں کیا حکم ہے' جس نے اپنے ناخنوں پر مصنوعی ناخن یا نیل پالش لگا رکھی ہو؟

جواب یہ مصنوعی ناخن اور نیل پالش جنھیں عورت نے اپنے ناخنوں کے اوپر لگا رکھا ہو' ان کا عورت کے لیے استعمال جائز نہیں' جبکہ وہ نماز پڑھ رہی ہو کیونکہ طہارت کرتے ہوئے یہ پانی کے اعضا تک پہنچنے میں مانع ہیں اور ہر وہ چیز جو اعضائے وضو تک پانی کے پہنچنے میں رکاوٹ بنے' وضو یا غسل کرنے والے کے لیے اس کا استعمال جائز نہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَٱغْسِلُوا۟ وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ ﴾ (المائدة: ٥/ ٦)

’’تو منہ اور ہاتھ دھو لیا کرو۔‘‘

عورت نے اپنے ناخنوں پر جب نیل پالش یا مصنوعی ناخن لگا رکھے ہوں جو پانی کے پہنچنے میں رکاوٹ ہوں تو ایسی صورت میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس عورت نے اپنے ہاتھوں کو دھویا ہے اور جب اس نے اپنے ہاتھوں کو نہیں دھویا تو اس نے وضو یا غسل کے فرائض میں سے ایک فرض کو ترک کر دیا۔ اور اگر عورت ایسی ہو جو نماز نہ پڑھتی ہو مثلاً: حائضہ عورت‘ تو اس کے لیے ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں الاّ یہ کہ یہ فعل کافر عورتوں کے خصائص میں سے ہو تو پھر ان کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے یہ جائز نہ ہو گا۔

میں نے سنا ہے کہ بعض لوگوں نے یہ فتوی دیا ہے کہ مصنوعی ناخنوں اور نیل پالش کا استعمال موزوں کے پہننے کی طرح ہے لہٰذا عورت کے لیے ایک دن رات کی مدت تک ان کا استعمال کرنا جائز ہے‘ جب کہ وہ مقیم ہو اور اگر مسافر ہو تو پھر تین دن کی مدت تک ان کا استعمال جائز ہے لیکن یہ فتویٰ بالکل غلط ہے کیونکہ تمام وہ چیزیں جن سے لوگ اپنے بدنوں کو چھپائیں‘ وہ موزوں کی طرح نہیں ہیں کیونکہ شریعت نے غالباً ضرورت کے پیش نظر ان پر مسح کو جائز قرار دیا ہے۔ پاؤں کو سردی سے بچنے اور انہیں دیگر چیزوں سے چھپانے کے لیے موزوں کی ضرورت ہے کیونکہ پاؤں براہ راست زمین اور کنکریوں پر لگتے اور سردی سے دوچار ہوتے ہیں‘ لہٰذا شریعت نے بطور خاص انہی پر مسح کی اجازت دی ہے۔ بعض لوگوں نے مصنوعی ناخنوں اور نیل پالش کے استعمال کو عمامہ پر بھی قیاس کیا ہے لیکن ان کا یہ قیاس بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ عمامہ کا مقام سر ہے اور اس کے لیے فرض مسح ہی ہے جب کہ اس کے برعکس ہاتھوں کو دھونا فرض ہے‘ اس لیے نبی ﷺ نے عورت کے لیے دستانوں پر مسح کو جائز قرار نہیں دیا حالانکہ یہ بھی ہاتھوں کو چھپا لیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ پانی کے پہنچنے میں رکاوٹ بننے والی کسی بھی چیز کو عمامہ یا موزوں پر قیاس کرے۔ بلکہ ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ حق معلوم کرنے کے لیے مقدور بھر کوشش کرے اور فتویٰ دینے کی کوشش نہ کرے الاّ یہ کہ اسے معلوم ہو کہ اس کے لیے فتویٰ دینا ضروری ہے اور اگر اس نے فتویٰ نہ دیا تو اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں اس سے سوال کرے گا کیونکہ فتویٰ اللہ تعالیٰ کی شریعت سے تعبیر ہے۔ واللّٰہ الموفق والهادی إلی الصّراط المستقیم.

وضو کا مکمل طریقہ

سوال شریعت میں مطلوب وضو کا کیا طریقہ ہے؟

جواب شرعی وضو کے دو پہلو ہیں: ① وہ فرائض و واجبات جن کے بغیر وضو صحیح نہیں ہوتا اور وضو کے یہ فرائض و واجبات حسب ذیل آیت کریمہ میں مذکور ہیں:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِذَا قُمْتُمْ إِلَى ٱلصَّلَوٰةِ فَٱغْسِلُوا۟ وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى ٱلْمَرَافِقِ وَٱمْسَحُوا۟ بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى ٱلْكَعْبَيْنِ ﴾ (المائدة: ٥/ ٦)

’’مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کرو تو منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لیا کرو اور سر کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں دھو لیا کرو۔‘‘

گویا فرائض و واجبات یہ ہیں: چہرے کا ایک بار دھونا‘ اور کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈال کر اسے صاف کرنا بھی اسی میں شامل

ہے' پھر دونوں ہاتھوں کو انگلیوں کے کناروں سے لے کر کہنیوں تک ایک بار دھونا۔ ضروری ہے کہ وضو کرنے والا اپنے دونوں بازوؤں کو دھوتے ہوئے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو بھی بازوؤں کے ساتھ دھوئے' بعض لوگ اس بات سے غافل ہیں اور وہ صرف اپنے دونوں بازوؤں ہی کو دھوتے ہیں اور یہ غلط ہے' پھر ایک بار سر کا مسح کرے اور دونوں کان بھی سر میں شامل ہیں اور دونوں پاؤں کو ٹخنوں تک ایک بار دھونا۔ تو یہ ہیں وضو کے فرائض و واجبات جن کے بغیر چارہ نہیں۔

② وضو کے مستحبات: وضو شروع کرتے ہوئے انسان بسم اللہ پڑھے' دونوں ہتھیلیوں کو تین بار دھوئے' پھر تین چلوؤں کے ساتھ تین تین بار کلی کرے اور ناک میں پانی ڈال کر اسے صاف کرے' پھر چہرے کو تین بار دھوئے' پھر دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک تین تین بار دھوئے' پہلے دائیں اور پھر بائیں ہاتھ کو دھوئے' پھر ایک بار سر کا مسح کرے اور وہ اس طرح کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو تر کر لے اور پھر انھیں سر کے ابتدائی حصے سے آخر تک لے جائے' پھر آخر سے ابتدائی حصے تک لے آئے' پھر دونوں کانوں کا مسح کرے' دونوں انگشت شہادت کو اپنے دونوں کانوں کے سوراخوں میں داخل کرے اور دونوں انگوٹھوں کے ساتھ دونوں کانوں کے باہر کی طرف مسح کرے' پھر دونوں پاؤں کو دونوں ٹخنوں تک تین تین بار دھوئے' پہلے دائیں اور پھر بائیں پاؤں کو دھوئے اور پھر اس کے بعد یہ دعا پڑھے:

«أَشْهَدُ أَنْ لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللهُ وَحْدَهُ لاَ شَرِيكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ»(صحيح مسلم، الطهارة، باب الذكر المستحب عقب الوضوء، ح: ٢٣٤(٥٥٤)

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ اکیلا ہے' کوئی اس کا شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔''

اور ایک روایت میں ہے پھر پڑھے:

«اَللَّهُمَّ اجْعَلْنِي مِنَ التَّوَّابِينَ وَاجْعَلْنِي مِنَ الْمُتَطَهِّرِينَ»(جامع الترمذي، الطهارة، باب في ما يقال بعد الوضوء، ح: ٥٥)

''اے اللہ! تو مجھے کثرت سے توبہ کرنے والوں میں شامل کر لے اور مجھے خوب پاک صاف رہنے والوں میں سے بنا دے۔''

جب کوئی شخص اس طرح وضو کرے گا' تو اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جائیں گے۔ وہ ان میں سے جس سے چاہے' جنت میں داخل ہو جائے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی نبی ﷺ کی صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ ①

مریض طہارت کس طرح حاصل کرے؟

یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ مریضوں پر طہارت اور نماز کے بارے میں کیا واجب ہے۔ مریض کے لیے مخصوص احکام ہیں کیونکہ وہ ایسی حالت میں ہوتا ہے' جس میں اسلامی شریعت نے خاص رعایتیں دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کو ایسے دین حنیف کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے جو بے حد آسان دین ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

① صحیح مسلم' الطھارۃ' باب الذکر المستحب عقب الوضوء' حدیث : 234

﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ (الحج: ٢٢/٧٨)

"اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی۔"

اور فرمایا:

﴿ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ (البقرة٢/ ١٨٥)

"اللہ تمھارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا۔"

اور فرمایا:

﴿ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا ﴾ (التغابن: ٦٤/ ١٦)

"سو جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو اور اس کے احکام کو سنو اور (اس کے) فرماں بردار رہو۔"

اور نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ»(صحيح البخاري، الإيمان، باب الدين يسر، ح:٣٩)

"بے شک دین آسان ہے۔"

اور فرمایا:

«إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ»(صحيح البخاري، الاعتصام، باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ، ح:٧٢٨٨ وصحيح مسلم، الحج، باب فرض الحج مرة في العمر، ح:١٣٣٧)

"جب میں تمھیں کسی چیز کا حکم دوں تو اس کی مقدور بھر اطاعت بجا لاؤ۔"

اسی اساسی قاعدے کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے عذر والے لوگوں سے ان کے عذر کے بقدر ان کی عبادت میں تخفیف کر دی ہے تا کہ وہ کسی حرج و مشقت کے بغیر اللہ تعالیٰ کی عبادت کر سکیں۔ درج ذیل میں مریض کے لیے ضروری ہدایات ذکر کی جاتی ہیں:

☞ مریض کے لیے واجب ہے کہ وہ پانی کے ساتھ طہارت حاصل کرے اور حدث اصغر کی صورت میں وضو اور حدث اکبر کی صورت میں غسل کرے۔

☞ اگر وہ پانی کے ساتھ طہارت حاصل کرنے سے عاجز ہو یا پانی کے استعمال کی صورت میں مرض میں اضافے کا خوف ہو یا صحت یابی کے حصول میں تاخیر کا اندیشہ ہو تو وہ تیمم کر لے۔

☞ تیمم کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک بار پاک زمین پر مارے اور ان دونوں ہاتھوں کو اپنے سارے چہرے پر پھیرے اور پھر ایک دوسری ہتھیلی کے ساتھ اِن دونوں پر مسح کرے۔

☞ مریض اگر از خود طہارت حاصل نہ کر سکتا ہو، تو اسے وضو یا تیمم کوئی دوسرا شخص کروا دے۔ تیمم کے لیے وہ شخص اپنے دونوں ہاتھوں کو پاک مٹی پر مارے اور پھر ان دونوں کو مریض کے چہرے اور دونوں ہاتھوں پر پھیر دے۔ اسی طرح اگر وہ از خود وضو نہ کر سکتا ہو تو کوئی دوسرا شخص اسے وضو کرا دے۔

- اگر اس کے کسی عضو طہارت میں زخم ہو تو وہ اسے پانی کے ساتھ دھوئے، اگر پانی کے ساتھ دھونے سے تکلیف یا مرض میں اضافہ ہو تو وہ اس پر مسح کر لے اور وہ اس طرح کہ اپنے ہاتھ کو پانی سے تر کر لے اور اسے زخم پر پھیر دے اور اگر مسح کرنا نقصان دہ ہو تو وہ اس زخم پر بھی تیمّم کر لے۔
- اگر کوئی عضو ٹوٹا ہوا اور اس پر پٹی بندھی ہو یا پلستر لگا ہو تو وہ اسے دھونے کے بجائے، پانی کے ساتھ مسح کر لے، اسے تیمّم کی ضرورت نہیں کیونکہ دھونے کے بجائے مسح کیا جا سکتا ہے۔
- یہ بھی جائز ہے کہ وہ دیوار کے ساتھ تیمّم کر لے یا کسی دوسری پاک چیز کے ساتھ تیمّم کر لے جس پر غبار ہو، دیوار پر اگر کسی ایسی چیز کی تہہ ہو جو زمین کی جنس میں سے نہ ہو مثلاً: اس پر پلستر وغیرہ کیا گیا ہو تو اس کے ساتھ تیمّم نہ کرے الا یہ کہ اس پر غبار ہو۔
- اگر زمین، دیوار یا کسی ایسی چیز کے ساتھ تیمّم کرنا ممکن نہ ہو، جس پر غبار ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ مٹی کو کسی برتن یا رومال میں رکھ لیا جائے اور اس کے ساتھ تیمّم کیا جائے۔
- اگر وہ ایک نماز کے لیے تیمّم کرے اور دوسری نماز کے وقت تک اس کی طہارت باقی ہو تو وہ اس نماز کو بھی پہلے تیمّم ہی کے ساتھ پڑھ لے، دوسری نماز کے لیے دوبارہ تیمّم نہ کرے کیونکہ اس کی طہارت برقرار ہے اور وہ (طہارت ختم کرنے والی) کسی چیز کے ساتھ ختم نہیں ہوئی۔
- مریض کے لیے واجب ہے کہ وہ اپنے بدن کو تمام نجاستوں سے پاک رکھے اور اگر اسے اس کی طاقت نہ ہو تو وہ حسب حال نماز پڑھ لے، اس کی نماز صحیح ہوگی اور اسے اس کے اعادہ کی بھی ضرورت نہیں۔
- مریض کے لیے واجب ہے کہ وہ پاک کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھے۔ اس کے کپڑے اگر ناپاک ہو جائیں تو دھونا یا انھیں پاک کپڑوں کے ساتھ تبدیل کر لینا واجب ہے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو وہ حسب حال نماز پڑھ لے، اس کی نماز صحیح ہوگی اور اس کے اعادہ کی بھی ضرورت نہیں۔
- مریض کے لیے واجب ہے کہ وہ کسی پاک چیز پر نماز پڑھے۔ اگر اس کی جگہ ناپاک ہوگئی ہو تو اسے دھونا یا کسی پاک چیز سے بدلنا یا اس پر کوئی پاک چیز ڈال دینا واجب ہے۔ اور اگر ممکن نہ ہو تو وہ حسب حال نماز پڑھ لے اس کی نماز صحیح ہوگی اور اس کے اعادہ کی بھی ضرورت نہیں۔
- مریض کے لیے یہ جائز نہیں کہ طہارت سے معذوری کی وجہ سے وہ نماز کو وقت سے موخر کرے بلکہ اسے چاہیے کہ مقدور بھر طہارت حاصل کر کے نماز کو اس کے وقت پر ادا کرے، خواہ اس کے بدن، کپڑے یا اس کی جگہ پر کوئی ایسی ناپاکی ہو، جسے دور کرنے سے وہ عاجز ہو۔

موزوں اور جرابوں پر مسح کا حکم اور مدت مسح کا بیان

سوال طہارت میں احتیاط کے پیش نظر ہر وضو کے لیے جرابیں اتارنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب یہ خلاف سنت ہے اور اس میں ان روافض کے ساتھ مشابہت بھی ہے جو موزوں پر مسح کرنے کو جائز نہیں سمجھتے، حالانکہ نبی ﷺ

نے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا، جب انھوں نے آپ کے موزے اتارنے کا ارادہ کیا:

«دَعْهُمَا فَإِنِّي أَدْخَلْتُهُمَا طَاهِرَتَيْنِ»(صحيح البخاري، الوضوء، باب إذا أدخل رجليه وهما طاهرتان، ح:٢٠٦ وصحيح مسلم، الطهارة، باب المسح على الخفين، ح:٢٧٤(٧٩)

"انہیں چھوڑ دیں کیونکہ میں نے انھیں پاک (وضو کی) حالت میں پہنا ہے۔" اور آپ نے ان پر مسح کیا۔

سوال موزوں پر مسح کا وقت کب شروع ہوتا ہے؟

جواب یہ مسئلہ ان اہم مسائل میں سے ہے جن کی لوگوں کو ضرورت ہے کہ ان کے سامنے اسے بیان کیا جائے، لہٰذا ہم سوال کی نسبت جواب ان شاء اللہ زیادہ تفصیل کے ساتھ دیں گے۔ موزوں پر مسح کتاب وسنت سے ثابت ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا قُمْتُمْ إِلَى ٱلصَّلَوٰةِ فَٱغْسِلُواْ وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى ٱلْمَرَافِقِ وَٱمْسَحُواْ بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى ٱلْكَعْبَيْنِ﴾ (المائدة: ٦/٥)

"مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کیا کرو تو منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لیا کرو اور سر کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں دھو لیا کرو۔"

"أَرْجُلَكُمْ" کو اگر لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا "بِرُءُوسِكُمْ" پر عطف ہوگا اور پاؤں بھی ان اعضا میں سے ہوں گے، جن پر مسح کرنا ہے لیکن قرآن مجید میں اس کی قراءت لام کے فتحہ کے ساتھ ہے اور اس صورت میں اس کا عطف "وُجُوهَكُمْ" پر ہوگا اور یہ ان اعضا میں سے ہوں گے، جن کو دھونا ہے، لہٰذا ان دونوں قراءتوں کے مطابق پاؤں کو دھویا جائے گا یا ان پر مسح کیا جائے گا اور سنت نے اس بات کو بیان کر دیا ہے کہ ان کو دھونا کب ہے اور ان پر مسح کرنا کب ہے؟ اور وہ یہ کہ انھیں دھویا اس وقت جائے گا جب یہ ننگے ہوں گے اور مسح اس وقت کیا جائے گا جب یہ موزے وغیر کے ساتھ چھپے ہوں گے۔

جہاں تک سنت سے اس کے ثبوت کا تعلق ہے تو موزوں پر مسح نبی ﷺ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے، اہل علم نے اس باب میں وارد روایات کو متواتر احادیث میں شمار کیا ہے جیسا کہ کسی نے اسے نظم میں اس طرح بیان کیا ہے:

مِمَّا تَوَاتَرَ حَدِيثُ مَنْ كَذَبْ وَمَنْ بَنَى لِلّٰهِ وَاحْتَسَبْ
وَرُؤْيَةٍ، شَفَاعَةٍ وَالْحَوْضِ وَمَسْحِ خُفَّيْنِ وَهٰذِي بَعْضُ

"متواتر احادیث میں سے وہ ہے، جس میں نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے جان بوجھ کر میری طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کی، وہ اپنا ٹھکانا جہنم سمجھے اور وہ حدیث جس میں ہے کہ جس نے حصول ثواب کی نیت سے اللہ تعالیٰ کا گھر بنایا، اللہ تعالیٰ اس کا گھر جنت میں بنائے گا نیز رؤیت باری تعالیٰ، شفاعت، حوض کوثر اور موزوں پر مسح کرنے کی احادیث بھی متواتر ہیں اور یہ چند متواتر احادیث ہیں، جنھیں بطور مثال پیش کیا گیا ہے۔"

گویا موزوں پر مسح نبی ﷺ کی متواتر احادیث سے ثابت ہے اور جب انسان نے حالت طہارت میں انھیں پہنا ہو تو انھیں اتارنے اور پاؤں کے دھونے سے، ان پر مسح کرنا افضل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے جب وضو کے وقت نبی

ﷺ کے موزے اتارنے کا ارادہ کیا تو آپ نے فرمایا:

«دَعْهُمَا فَإِنِّي أَدْخَلْتُهُمَا طَاهِرَتَيْنِ»(صحيح البخاري، الوضوء، باب إذا أدخل رجليه وهما طاهرتان، ح:٢٠٦ وصحيح مسلم، الطهارة، باب المسح على الخفين، ح:٢٧٤(٧٩)

''انہیں چھوڑ دیں کیونکہ میں نے انھیں پاک (وضو کی) حالت میں پہنا ہے۔''

پھر آپ نے ان پر مسح فرمایا۔ موزوں پر مسح کے لیے درج ذیل شرطیں ہیں: ① انہیں حدث اصغر اور حدث اکبر دونوں سے کامل طہارت کی صورت میں پہنا ہو۔ اگر انھیں حالت غیر طہارت میں پہنا گیا تو ان پر مسح کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ ② مسح، مدت مسح کے اندر ہو، مدت کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گا۔ ③ مسح طہارت صغریٰ یعنی وضو میں ہے۔ اگر انسان پر غسل واجب ہو تو پھر موزوں کو اتارنا واجب ہوگا تا کہ انسان سارے بدن کا غسل کر سکے، لہٰذا حالت جنابت میں موزوں پر مسح نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ حضرت صفوان بن عسال ؓ سے مروی حدیث میں ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَأْمُرُنَا إِذَا كُنَّا سَفْرًا أَنْ لاَ نَنْزِعَ خِفَافَنَا ثَلاَثَةَ أَيَّامٍ وَلَيَالِيَهُنَّ إِلاَّ مِنْ جَنَابَةٍ»(سنن النسائي، الطهارة، باب التوقيت في المسح، ح:١٢٦، ١٢٧ وجامع الترمذي، الطهارة، باب المسح على الخفين للمسافر والمقيم، ح:٩٦)

''رسول اللہ ﷺ ہمیں یہ حکم دیا کرتے تھے کہ ہم حالت سفر میں اپنے موزوں کو تین دن رات تک نہ اتاریں الا یہ کہ جنابت کی حالت ہو۔''

یہ موزوں پر مسح کرنے کے جواز کی تین شرطیں ہیں۔

○ **مدت مسح:** مسح کی مدت مقیم کے لیے ایک دن رات اور مسافر کے لیے تین دن رات ہے۔ اس سلسلے میں نمازوں کی تعداد کا نہیں بلکہ وقت کا اعتبار ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مقیم کے لیے ایک دن رات اور مسافر کے لیے تین دن رات کا تعین فرمایا ہے۔ دن رات کے چوبیس اور تین دن رات کے بہتر گھنٹے بنتے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ اس مدت کی ابتدا کب سے ہوگی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس مدت کی ابتدا اس وقت ہوگی، جب پہلی بار مسح کیا جائے گا۔ اس کی ابتدا نہ تو موزے پہننے کے وقت سے ہوگی اور نہ پہننے کے بعد بے وضو ہونے کے وقت سے کیونکہ شریعت میں مسح کا لفظ استعمال ہوا ہے اور مسح کا وجود اسی وقت ثابت ہوگا جب عملی طور پر مسح کا وجود ہوگا۔ حدیث کے الفاظ میں ہے کہ مقیم ایک دن رات اور مسافر تین دن رات مسح کرے، لہٰذا مدت کے لیے مسح کا وجود ضروری ہے اور وجود اسی وقت ہوگا جب پہلی بار مسح شروع کیا جائے گا جب مسح کی ابتدا کے بعد چوبیس گھنٹے پورے ہو جائیں تو مقیم کے لیے مسح کی مدت ختم ہو جائے گی اور جب بہتر گھنٹے پورے ہو جائیں تو مسافر کے لیے مسح کی مدت ختم ہو جائے گی۔ مزید وضاحت کے لیے درج ذیل مثال ملاحظہ فرمائیں:

ایک شخص نے نماز فجر کے لیے وضو کیا، پھر اس نے موزے پہن لیے، اس کا وضو ظہر کے وقت تک قائم رہا اور اس نے اسی وضو کے ساتھ نماز ظہر ادا کی اور نماز عصر بھی اس نے اسی وضو کے ساتھ ادا کی اور پھر نماز عصر کے بعد پانچ بجے اس نے نماز مغرب کے لیے

وضو کیا اور مسح کیا تو یہ شخص اگلے دن پانچ بجے تک مسح کر سکتا ہے اور اگر اس نے دوسرے دن پونے پانچ بجے مسح کیا اور پھر اسی وضو کے ساتھ اس نے مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا کیں تو اس نے اس مدت میں پہلے دن نماز ظہر' عصر' مغرب اور عشاء اور دوسرے دن کی فجر' ظہر' عصر' مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا کیں اور اس طرح اس نے گویا نو نمازیں مسح کے ساتھ ادا کر لیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نمازوں کی تعداد کا اعتبار نہیں جیسا کہ بہت سے عام لوگ سمجھتے ہیں کہ مسح کے ساتھ پانچ فرض نمازیں ادا کی جا سکتی ہیں۔ یہ بات بے اصل ہے کیونکہ شریعت نے مقیم کے لیے ایک دن رات کا وقت مقرر کیا ہے اور اس وقت کی ابتدا پہلے مسح سے ہوتی ہے اور مذکورہ مثال سے آپ نے معلوم کر لیا کہ اس شخص نے کتنی نمازیں مسح کے ساتھ ادا کی ہیں۔ اس مثال سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ مدت پوری ہونے کے بعد مسح نہیں کر سکتا کیونکہ اگر اس نے مدت پوری ہونے کے بعد مسح کیا تو وہ باطل ہوگا' اس سے اسے طہارت حاصل نہیں ہوگی اور اگر اس نے مدت تمام ہونے سے پہلے مسح کیا اور پھر مدت تمام ہونے کے بعد تک اس کی طہارت باقی رہی تو اس کا وضو نہیں ٹوٹے گا بلکہ اس کی طہارت باقی رہے گی حتی کہ وضو ٹوٹ جائے کیونکہ اس قول کی کوئی دلیل نہیں کہ مدت پوری ہونے کے ساتھ ہی اس کا وضو ٹوٹ جائے گا۔ مدت پوری ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے پورا ہونے کے بعد اب مسح نہیں کیا جا سکتا' اس کے یہ معنی نہیں کہ مدت پوری ہونے کے بعد اس کی طہارت بھی باقی نہیں رہی کیونکہ وقت کا تعین مسح کے لیے ہے' طہارت کے لیے نہیں' لہٰذا مدت پوری ہونے کے ساتھ طہارت ختم ہو جانے کی کوئی دلیل نہیں۔ ہم نے جو موقف اختیار کیا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ اس شخص نے صحیح شرعی دلیل کے مطابق صحیح وضو کیا تھا لہٰذا کسی شرعی دلیل کے بغیر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کا وضو ٹوٹ گیا ہے اور اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ مدت پوری ہونے کے ساتھ وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی طہارت باقی رہے گی حتی کہ کتاب وسنت یا اجماع کی روشنی میں وضو ٹوٹ جانے کے اسباب میں سے کوئی سبب پایا جائے۔

مسافر تین دن راتیں یعنی بہتر گھنٹے تک مسح کر سکتا ہے' اس مدت کا آغاز پہلی بار مسح سے ہوگا' اسی لیے فقہائے حنابلہ رحمہم اللہ نے ذکر کیا ہے کہ اگر کوئی شخص اس وقت موزے پہنے جب وہ اپنے شہر میں مقیم ہو اور پھر اس شہر میں وہ بے وضو ہو جائے اور پھر وہ سفر شروع کر دے اور سفر شروع کرنے کے بعد مسح کرے تو اس حالت میں وہ مسافر کی مدتِ مسح کو پورا کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ قول ضعیف ہے کہ مدت کی ابتدا اس وقت ہوگی' جب موزے پہننے کے بعد وہ پہلی دفعہ بے وضو ہوا۔ موزے پر مسح کو باطل کرنے والی چیز مدت کا ختم ہونا اور موزے کا اتار دینا ہے' جب موزے اتار دیے جائیں تو مسح باطل ہو جاتا ہے لیکن طہارت باقی رہتی ہے۔ اس بات کی دلیل کہ موزہ اتارنے سے مسح باطل ہو جاتا ہے' حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَأْمُرُنَا إِذَا كُنَّا سَفْرًا أَنْ لاَ نَنْزِعَ خِفَافَنَا»(سنن النسائي، الطهارة، باب التوقيت في المسح، ح:١٢٦، ١٢٧ وجامع الترمذي، الطهارة، باب المسح على الخفين للمسافر والمقيم، ح:٩٦)

"رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کرتے تھے ہم حالت سفر میں اپنے موزے نہ اتاریں۔"

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ موزہ اتارنے سے مسح باطل ہو جاتا ہے یعنی جب انسان مسح کرنے کے بعد اپنے موزے کو

اتار دے تو اس کا مسح باطل ہو جائے گا یعنی اب وہ دوبارہ اس وقت تک انھیں نہ پہنے اور ان پر مسح نہ کرے، جب تک وہ ایسا کامل وضو نہ کرے، جس میں اس نے پاؤں کو بھی دھویا ہو۔

موزے اتار دینے کی صورت میں اس کی طہارت باقی رہے گی کیونکہ مسح کی ہوئی چیز کے اتار دینے سے طہارت ختم نہیں ہوتی اس لیے کہ مسح کرنے والا جب مسح کرتا ہے، تو شرعی دلیل کے مطابق اس کی طہارت مکمل ہو جاتی ہے اور یہ مکمل طہارت اسی وقت ختم ہوگی، جب اس کے ختم ہونے کی کوئی شرعی دلیل ہو۔ اور اس بات کی کوئی شرعی دلیل نہیں کہ مسح کی ہوئی چیز کے اتار دینے سے وضو باطل ہو جاتا ہے البتہ اس بات کی دلیل موجود ہے کہ مسح کی ہوئی چیز کے اتار دینے سے مسح باطل ہو جائے گا یعنی اس وقت تک دوبارہ مسح نہیں کیا جا سکتا جب تک پاؤں دھو کر مکمل وضو نہیں کر لیا جاتا، لہٰذا ہم عرض کریں گے کہ اصل یہ ہے کہ اس صورت میں شرعی دلیل سے ثابت ہو جائے کہ اس صورت میں طہارت باقی نہیں ہے اور جب ایسی کوئی دلیل موجود نہیں ہے تو وضو باقی رہے گا اور ختم نہیں ہوگا۔ ہمارے نزدیک یہی قول راجح ہے۔ واللہ الموفق۔

باریک، پھٹی ہوئی جرابوں اور پٹی پر مسح کا کیا حکم ہے؟

سوال پھٹی ہوئی اور باریک جراب پر مسح کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب راجح قول یہ ہے کہ ایسی جراب پر مسح کرنا بھی جائز ہے، جو پھٹی ہو یا اس قدر باریک ہو کہ اس سے جسم نظر آتا ہو کیونکہ جراب وغیرہ پر مسح کے جواز سے یہ مقصود نہیں ہے کہ اس نے پاؤں کو چھپایا ہو کیونکہ پاؤں پردہ کا مقام نہیں ہے کہ جسے چھپانا واجب ہو، مسح سے مقصود تو مکلّف کے لیے رخصت اور سہولت ہے، لہٰذا اس کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ وضو کرتے وقت جراب یا موزے کو اتارے بلکہ اس کے لیے مسح کر لینا ہی کافی ہے۔ رخصت اور سہولت کی وجہ سے موزوں پر مسح کو جائز قرار دیا گیا ہے اور اس علت کی وجہ سے موزہ اور جراب پھٹا ہو یا صحیح سالم، ہلکا ہو یا بھاری سب برابر ہیں۔

سوال پٹی پر مسح کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ جبیرہ (پٹی) کسے کہتے ہیں؟ جبیرہ اصل میں اس چیز کو کہتے ہیں، جس کے ساتھ ٹوٹی ہوئی چیز کو باندھا جائے۔ اور فقہاء کے نزدیک اس سے مراد وہ چیز ہے جسے بوقت ضرورت طہارت کی جگہ پر رکھا گیا ہو مثلاً: وہ پلستر جسے ٹوٹی ہوئی ہڈی پر باندھا گیا ہو یا وہ پٹی جسے زخم یا درد وغیرہ کے مقام پر باندھا گیا ہو تو دھونے کے بجائے اس پر مسح کرنا جائز ہے، مثلاً: اگر وضو کرنے والے نے بوقت ضرورت زخم پر پٹی باندھی ہو تو وہ اسے دھونے کے بجائے اس پر مسح کرے گا اور یہ طہارت کامل ہوگی، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ شخص اگر بالفرض اس پلستر یا پٹی کو اتار دے، تو اس کی طہارت باقی رہے گی اور ختم نہیں ہوگی کیونکہ طہارت شرعی طریقے سے مکمل ہوئی تھی اور اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ پٹی اتارنے سے وضو یا طہارت ختم ہو جائے گی۔ یاد رہے پٹی پر مسح کرنے کے بارے میں کوئی دلیل بھی معارضہ سے خالی نہیں ہے۔ اس کے بارے میں تمام احادیث ضعیف ہیں، تاہم بعض اہل علم نے کہا ہے کہ مجموعی طور پر یہ احادیث اس قابل ہیں کہ ان سے استدلال کیا جا سکے۔

بعض اہل علم نے کہا ہے کہ ضعیف ہونے کی وجہ سے ان احادیث سے استدلال نہیں کیا جا سکتا اور پھر ان حضرات کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ پٹی کی جگہ سے طہارت ساقط ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اس جگہ کو دھونے سے عاجز ہے اور بعض نے کہا ہے کہ وہ تیمّم کرے لیکن اس پر مسح نہ کرے۔ اس بارے میں احادیث سے قطع نظر یہ قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسح کرلے اور یہ مسح اسے تیمّم سے بے نیاز کر دے گا' اس کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی' لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اعضائے طہارت میں سے کسی عضو میں زخم ہو تو اس کی کئی صورتیں ہوں گی:

- زخم ننگا ہو اور دھونا اس کے لیے نقصان دہ نہ ہو تو اس صورت میں اسے دھونا واجب ہوگا' بشرطیکہ زخم ایسی جگہ ہو جسے دھونا واجب ہو۔
- زخم ننگا ہو' اسے دھونا اس کیلئے نقصان دہ ہو مگر مسح کرنا نقصان دہ نہ ہو تو اس صورت میں مسح کرنا واجب ہے' دھونا واجب نہیں ہے۔
- زخم ننگا ہو اور دھونا اور مسح کرنا دونوں اس کے لیے نقصان دہ ہوں تو اس صورت میں تیمّم کیا جائے گا۔
- زخم چھپا ہوا ہو اور اس پر پٹی وغیرہ بندھی ہو تو اس صورت میں اس پر مسح کیا جائے گا اور یہ مسح کرنا اسے دھونے یا تیمّم کرنے سے بے نیاز کر دے گا۔

سوال کیا پٹی پر تیمّم اور مسح دونوں واجب ہیں یا نہیں؟

جواب مسح اور تیمّم دونوں بیک وقت واجب نہیں ہیں کیونکہ ایک عضو پر طہارت کے دو طریقوں کو واجب قرار دینا' قواعد شریعت کے خلاف ہے کیونکہ ایک وقت میں عضو کی طہارت' مسح کی صورت میں واجب ہے یا تیمّم کی صورت میں۔ بیک وقت طہارت کے دو طریقوں کو واجب قرار دینے کی شریعت میں کوئی نظیر نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ بندے کو ایسی دو عبادتوں کا مکلف قرار نہیں دیتا جن کا سبب ایک ہو۔

ایک پاؤں دھونے کے بعد جراب پہن لے اور پھر دوسرا دھوئے تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے' جس نے وضو کرتے ہوئے دائیں پاؤں کو دھویا تو اس پر موزہ یا جراب پہن لی اور پھر اس نے بائیں پاؤں کو دھویا تو اس پر جراب یا موزہ پہن لیا؟

جواب اس مسئلہ میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ موزہ یا جراب پہننے سے پہلے مکمل وضو کرنا ضروری ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ جائز ہے کہ دائیں پاؤں کو دھو کر اس میں موزہ یا جراب پہن لے' پھر بائیں پاؤں کو دھوئے اور اس میں موزہ یا جراب پہن لے کیونکہ اس صورت میں اس نے دائیں اور بائیں پاؤں کو پاک کرنے کے بعد موزے یا جراب کو پہنا ہے اور اس پر یہ بات صادق آتی ہے کہ اس نے انھیں پاک حالت میں داخل کیا ہے لیکن ایک حدیث ہے جسے امام حاکم نے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا تَوَضَّأَ أَحَدُكُمْ وَلَبِسَ خُفَّيْهِ»(المستدرك للحاكم: ١/ ١٨١)

''جب تم میں سے کوئی وضو کرلے اور اپنے موزے پہن لے۔''

اس حدیث میں [إِذَا تَوَضَّأَ] 'جب وضو کرلے' کے الفاظ پہلے قول کو راجح قرار دیتے ہیں کیونکہ جس شخص نے ابھی تک بایاں

پاؤں نہ دھویا ہو تو اس پر یہ بات صادق نہیں آتی کہ اس نے وضو کر لیا ہے لہٰذا اس کے مطابق پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

مقیم مسح کر کے سفر کا آغاز کرے تو کون سی مدت پوری کرے؟

سوال جب کوئی مقیم انسان مسح کرے اور پھر وہ سفر شروع کر دے، تو کیا وہ مسافر کی مدت تک مسح کرے گا؟

جواب جب کوئی مقیم مسح کرے، پھر سفر شروع کر دے تو راجح قول کے مطابق وہ مسافر کی مدت تک مسح کرے گا۔ بعض اہل علم نے ذکر کیا ہے کہ جب وہ حضر میں مسح کرے اور پھر سفر شروع کر دے تو وہ مقیم کی مدت تک مسح کرے لیکن راجح وہی بات ہے جو ہم نے پہلے ذکر کی ہے کیونکہ اس شخص کی مدت مسح ابھی کچھ باقی تھی کہ اس نے سفر شروع کر دیا، تو اس پر یہ بات صادق آتی ہے کہ یہ ان مسافروں میں سے ہے جو تین دن مسح کرتے ہیں۔ امام احمد ؒ کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے کہ وہ پہلے تو اس بات کے قائل تھے کہ اس صورت میں وہ مقیم والی مدت تک مسح کرے گا لیکن پھر انھوں نے رجوع کر کے اسی قول کو اختیار فرما لیا تھا کہ وہ مسافر کی مدت تک مسح کرے گا۔

جرابوں پر مسح کی مختلف صورتیں اور ان کا تفصیلی جائزہ

سوال جب انسان کو مسح کی ابتدا اور وقت کے بارے میں شک ہو تو وہ کیا کرے؟

جواب اس حال میں وہ یقین پر اعتماد کرے، پس جب یہ شک ہو کہ اس نے نماز ظہر کے وقت مسح شروع کیا تھا یا نماز عصر کے وقت تو وہ مسح کی ابتدا نماز عصر سے شمار کرے کیونکہ اصل عدم مسح ہے۔ اس قاعدہ کی دلیل یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کی اصل پر باقی رکھا جائے گا اور اس میں اصل عدم مسح ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک ایسے شخص کی صورتحال بیان کی گئی، جسے یہ خیال آتا ہے کہ وہ اپنی نماز میں کچھ محسوس کرتا ہے، تو آپ نے فرمایا:

«لاَ يَنْصَرِفْ حَتَّى يَسْمَعَ صَوتًا أَوْ يَجِدَ رِيحًا»(صحيح البخاري، الوضوء، باب لا يتوضأ من الشك حتى يستيقن، ح:١٣٧ وصحيح مسلم، الحيض، باب الدليل على أن من تيقن الطهارة ثم شك في الحدث فله أن يصلي بطهارته تلك، ح:٣٦١)

”وہ اس وقت تک نماز نہ چھوڑے جب تک آواز نہ سن لے یا بو محسوس نہ کرے۔“

سوال جب انسان موزوں پر مسح کرے، پھر انھیں اتار دے اور جراب پر مسح کر لے، تو کیا اس کا مسح کرنا صحیح ہو گا؟

جواب اہل علم کے ہاں یہ بات معروف ہے کہ جب انسان اوپر یا نیچے کے ایک موزے پر مسح کرے تو حکم اسی کے ساتھ متعلق ہو گا، دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہو گا اور بعض اہل علم کی رائے یہ ہے کہ ایک موزے سے دوسرے کی طرف حکم منتقل ہو جائے گا جب کہ مسح نیچے والے پر کیا گیا ہو اور مدت باقی ہو اور یہی قول راجح ہے۔ لہٰذا اگر اس نے وضو کیا، جرابوں پر مسح کیا اور ان کے اوپر اور جرابیں پہن لیں یا موزے پہن لیے اور اوپر والوں پر مسح کر لیا تو راجح قول کے مطابق اس میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ مدت باقی ہو اور مدت پہلے مسح سے شمار کی جائے گی، دوسرے مسح سے نہیں۔

سوال جب انسان جراب کو اتار دے اور وہ باوضو ہو اور پھر وضو ٹوٹنے سے پہلے دوبارہ پہن لے تو کیا اس صورت میں اس پر مسح جائز ہو گا؟

جواب جب جراب کو اتار کر دوبارہ پہن لے اور وہ باوضو ہو تو یہ معاملہ دو حالتوں سے خالی نہ ہوگا:

① یہ وضو پہلا ہی ہو یعنی جراب پہننے کے بعد وضو ٹوٹا نہ ہو تو انہیں دوبارہ پہننے اور وضو کرتے وقت مسح کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

② جب یہ وہ وضو ہو جس میں اس نے اپنی جراب پر مسح کیا ہو تو یہ جائز نہیں کہ اسے اتارنے کے بعد دوبارہ پہن لے اور اس پر مسح کرے کیونکہ یہ ضروری ہے کہ اس نے اسے پانی کے ساتھ وضو کر کے پہنا ہو اور یہ وضو مسح کے ساتھ ہے۔ اہل علم کے کلام سے یہ بات اسی طرح معلوم ہوئی ہے لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ جب وہ حالت طہارت میں دوبارہ پہن لے' خواہ اس نے یہ طہارت مسح ہی کے ساتھ حاصل کی ہو تو وہ مسح کرسکتا ہے بشرطیکہ مدت باقی ہو تو یہ قوی قول ہے لیکن مجھے نہیں معلوم کہ کسی نے یہ بات کہی ہو اور یہی بات مجھے مانع ہے کہ میں اس کا فتوی دوں۔ اہل علم میں سے کسی نے اگر یہ بات کہی ہو تو میرے نزدیک یہ بات صحیح ہے کیونکہ مسح کے ساتھ حاصل کی گئی طہارت کامل ہے۔ لہٰذا یہ کہنا چاہیے کہ جب پانی کے ساتھ وضو کی صورت میں پہنی ہوئی جرابوں پر مسح کیا جاسکتا ہے تو مسح کی صورت میں کیے ہوئے وضو کی صورت میں بھی مسح کیا جاسکتا ہے لیکن میرا خیال نہیں کہ کسی نے یہ بات کہی ہو۔ واللہ اعلم۔

سوال جو شخص مدت ختم ہونے کے بعد موزوں پر مسح کر کے نماز پڑھ لے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جب موزوں پر مسح کی مدت ختم ہو جائے اور کسی نے مدت ختم ہونے کے بعد مسح کر کے نماز پڑھ لی ہو (تو اس کی دو صورتیں ہوں گی:) اگر مدت ختم ہو جانے کے بعد وہ بے وضو ہو گیا اور اس نے مسح کر لیا تو اس کے لیے پاؤں دھونے سمیت دوبارہ مکمل وضو کرنا اور دوبارہ نماز پڑھنا واجب ہے کیونکہ اس نے اپنے پاؤں نہیں دھوئے اور اس طرح نامکمل وضو کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔ اور اگر مسح کی مدت ختم گئی ہو اور انسان کا وضو باقی ہے اور اس نے مدت ختم ہونے کے بعد نماز پڑھی ہو تو اس کی نماز صحیح ہو گی کیونکہ مسح کی مدت ختم ہونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اگرچہ بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ مسح کی مدت ختم ہونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے لیکن یہ قول بلا دلیل ہے' لہٰذا جب مدت مسح مکمل ہو جائے لیکن انسان کا وضو باقی ہو' خواہ وضو سارا دن باقی رہے تو وہ اس وضو کے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہے کیونکہ اس کا وضو شرعی دلیل کے ساتھ ثابت ہے اور اس کے ٹوٹنے کے لیے بھی شرعی دلیل کی ضرورت ہو گی اور نبی ﷺ سے ایسی کوئی دلیل ثابت نہیں' جس سے معلوم ہو کہ مدتِ مسح کا ختم ہو جانا موجب وضو ہے۔ واللہ اعلم۔

نواقض وضو کا ذکر

سوال وضو کن کن چیزوں سے ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب جن چیزوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے' ان کے بارے میں اہل علم میں اختلاف ہے' ہم ان میں سے صرف ایسی چیزوں کو بیان کریں گے جو دلیل کے ساتھ ثابت ہیں۔

① ہر وہ چیز جو قبل یا دبر سے خارج ہو' اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے' خواہ یہ بول ہو یا براز' مذی ہو یا منی یا ہوا۔ جو چیز بھی قبل یا دبر سے خارج ہو وہ ناقض وضو ہے اور یہ ایسی پکی بات ہے کہ اس کے متعلق پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ خارج ہونے والی چیز اگر منی ہو

اور وہ شہوت کے ساتھ خارج ہو تو اس سے غسل واجب ہو جاتا ہے اور اگر خارج ہونے والی چیز مذی ہو تو اس سے آلۂ تناسل اور خصیتین کو دھونا اور وضو کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

② ایسی گہری نیند سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے جس میں سوئے ہوئے انسان کو اپنا بے وضو ہونا معلوم نہ ہو سکے البتہ اتنی ہلکی نیند سے وضو نہیں ٹوٹتا جس میں سویا ہوا شخص اگر بے وضو ہو جائے تو اسے معلوم ہو جائے کہ اس کا وضو ٹوٹ گیا ہے۔ اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں کہ وہ لیٹ کر سویا ہوا ہے یا بیٹھ کر' ٹیک لگا کر سویا ہوا ہے یا بغیر ٹیک کے کیونکہ اہمیت حضور قلب کی حالت کی ہے۔ اگر نیند ایسی ہو کہ اگر وہ بے وضو ہو جائے تو اسے معلوم ہو جائے تو اس سے وضو نہیں ٹوٹتا اور اگر نیند ایسی گہری ہو کہ اسے اپنے بے وضو ہونے کے بارے میں معلوم نہ ہو سکے تو اس سے وضو کرنا واجب ہو گا کیونکہ نیند خود ناقض وضو نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے اسے ناقض وضو قرار دیا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے وضو ٹوٹ جانے کا گمان ہوتا ہے۔ اگر نیند ہلکی ہو کہ اس میں بے وضو ہونے کی صورت میں معلوم ہو جائے تو اس سے وضو نہیں ٹوٹے گا۔ اس بات کی دلیل کہ نیند بذات خود ناقض وضو نہیں' یہ ہے کہ ہلکی نیند سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ نیند اگر بذات خود ناقض وضو ہوتی تو ہلکی یا گہری ہر قسم کی نیند سے وضو ٹوٹ جاتا جیسا کہ پیشاب بذات خود ناقض وضو ہے اور وہ تھوڑا خارج ہو یا زیادہ اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

③ جب انسان اونٹ یا اونٹنی کا گوشت کھائے تو اس سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے' خواہ وہ کچا گوشت کھائے یا پکا ہوا کیونکہ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«أَنَّ رَجُلاً سَأَلَ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَأَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُومِ الْغَنَمِ؟ قَالَ: إِنْ شِئْتَ فَتَوَضَّأْ وَإِنْ شِئْتَ فَلاَ تَوَضَّأْ قَالَ: أَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُومِ الإِبِلِ؟ قَالَ: نَعَمْ، فَتَوَضَّأْ مِنْ لُحُومِ الإِبِلِ»(صحيح مسلم، الحيض، باب الوضوء من لحوم الإبل، ح: ٣٦٠)

''ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال پوچھا: کیا میں بکری کے گوشت سے وضو کروں؟ آپ نے فرمایا کہ اگر چاہو تو وضو کر لو اور اگر چاہو تو نہ کرو' اس نے عرض کیا: کیا میں اونٹ کے گوشت سے وضو کروں؟ آپ نے فرمایا: ہاں اونٹ کے گوشت سے وضو کرو۔''

رسول اللہ ﷺ کا بکری کے گوشت کھانے سے وضو کو انسان کی اپنی مرضی پر موقوف قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ اونٹ کے گوشت کھانے سے وضو کرنا انسان کی اپنی مشیت پر موقوف نہیں ہے بلکہ اس سے وضو کرنا واجب ہے خواہ انسان کچا گوشت کھائے یا پکا ہوا۔ سرخ اور غیر سرخ گوشت کے اعتبار سے بھی کوئی فرق نہیں' اونٹ کے جسم کے کسی بھی عضو یا حصے کا گوشت کھایا جائے' اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ نبی ﷺ نے اس اعتبار سے کوئی فرق بیان نہیں فرمایا' حالانکہ آپ کو معلوم تھا کہ لوگ یہ یہ کھاتے ہیں۔ اگر مختلف اعضا کے گوشت کھانے کے بارے میں حکم مختلف ہوتا تو آپ اسے لوگوں کے سامنے بیان فرما دیتے تاکہ لوگوں کو اس معاملہ میں بصیرت حاصل ہو جاتی' پھر شریعت اسلامیہ میں ہمیں کسی ایسے حیوان کے بارے میں علم نہیں ہے کہ جس کے اجزا کے اعتبار سے اس کی حلت وحرمت کا حکم مختلف ہو کیونکہ حیوان یا حلال ہے یا حرام یا اس کا گوشت کھانا موجب وضو ہے یا موجب وضو نہیں

ہے۔ کسی حیوان کے بعض حصے کا حکم کچھ ہو اور بعض کا کچھ' شریعت اسلامیہ میں ایسا نہیں ہے۔ البتہ یہودیوں کی شریعت میں ایسا حکم ضرور تھا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَلَى ٱلَّذِينَ هَادُواْ حَرَّمۡنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٖۖ وَمِنَ ٱلۡبَقَرِ وَٱلۡغَنَمِ حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ شُحُومَهُمَآ إِلَّا مَا حَمَلَتۡ ظُهُورُهُمَآ أَوِ ٱلۡحَوَايَآ أَوۡ مَا ٱخۡتَلَطَ بِعَظۡمٖۚ﴾ (الأنعام: ٦/ ١٤٦)

''اور یہودیوں پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیے تھے اور گایوں اور بکریوں کی چربی ان پر حرام کر دی تھی' سوائے اس کے جو ان کی پیٹھ پر لگی ہو یا اوجھڑی میں ہو یا ہڈی میں ملی ہو۔''

اس لیے علماء کا اجماع ہے کہ خنزیر کی چربی بھی حرام ہے' حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کے صرف گوشت کا ذکر کیا ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمُ ٱلۡمَيۡتَةُ وَٱلدَّمُ وَلَحۡمُ ٱلۡخِنزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيۡرِ ٱللَّهِ بِهِۦ﴾ (المائدة: ٥/ ٣)

''تم پر مرا ہوا جانور' (بہتا) لہو' سور کا گوشت اور جس چیز پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے' سب حرام ہیں۔''

اہل علم کے درمیان خنزیر کی چربی کی حرمت کے بارے میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے' لہٰذا اس اصول کی بنیاد پر ہم یہ کہتے ہیں کہ اونٹ کا گوشت کھا کر وضو کرنے کے بارے میں حدیث سے اونٹ کی چربی' گوشت' انتڑیاں اور دیگر تمام اعضا مراد ہیں۔

کیا عورت کو محض ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

سوال کیا عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب صحیح بات یہ ہے کہ عورت کو محض چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا الا یہ کہ اسے چھونے کی وجہ سے کوئی چیز خارج ہو۔ اس کی دلیل وہ صحیح حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے اپنی بعض بیویوں کو بوسہ دیا' نماز کے لیے تشریف لے گئے اور وضو نہ کیا اور پھر اس لیے بھی کہ اصل عدم نقض ہے الا یہ کہ کسی صحیح اور صریح دلیل سے نقض ثابت ہو جائے۔ اور پھر آدمی نے اپنی طہارت کو دلیل شرعی کے مطابق مکمل کیا تھا اور جو چیز دلیل شرعی کے تقاضے کے مطابق ثابت ہو' وہ ختم بھی دلیل شرعی ہی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:

﴿أَوۡ لَٰمَسۡتُمُ ٱلنِّسَآءَ﴾ (المائدة: ٥/ ٦)

''یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو۔''

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت مبارکہ میں چھونے سے مراد ہم بستری ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور پھر اس کی ایک اور دلیل بھی ہے کہ اس آیت میں طہارت کو اصلی اور بدلی دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے' پھر اسی طرح ان میں سے ہر ایک کو طہارت صغریٰ اور کبریٰ دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور طہارت صغریٰ و کبریٰ کے اسباب کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا قُمۡتُمۡ إِلَى ٱلصَّلَوٰةِ فَٱغۡسِلُواْ وُجُوهَكُمۡ وَأَيۡدِيَكُمۡ إِلَى ٱلۡمَرَافِقِ

وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ (المائدة: ٥/ ٦)

’’مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کرو تو منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھولیا کرو اور سر کا مسح کرلیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں (دھو لیا کرو۔‘‘)

یہ پانی کے ساتھ اصلی صغریٰ طہارت ہے‘ پھر فرمایا: ﴿وَإِنْ كُنتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا﴾ ’’اور اگر تمھیں نہانے کی حاجت ہو تو (نہا کر) پاک ہو جایا کرو۔‘‘ یہ پانی کے ساتھ اصلی کبریٰ طہارت ہے۔ پھر فرمایا: ﴿وَإِنْ كُنتُمْ مَّرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا﴾ ’’اور اگر بیمار ہو یا سفر میں ہو یا کوئی تم میں سے بیت الخلا سے ہو کر آیا ہو یا تم عورتوں سے ہم بستر ہوئے ہو اور تمھیں پانی نہ مل سکے تو تیمّم کرلو۔‘‘ چنانچہ یہاں تیمّم بدل ہے اور ﴿أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ﴾ ’’یا کوئی تم میں سے بیت الخلا سے ہو کر آیا ہو۔‘‘ یہ سببِ صغریٰ کا بیان ہے اور ﴿أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ﴾ ’’یا تم عورتوں سے ہم بستر ہوئے ہو۔‘‘ یہ سبب کبریٰ کا بیان ہے۔ اور اگر اسے ہاتھ سے چھونے پر محمول کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے طہارت صغریٰ کے دو سبب ذکر کیے ہیں اور طہارت کبریٰ کے سبب سے سکوت فرمایا ہے‘ حالانکہ اس نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ﴿وَإِنْ كُنتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا﴾ ’’اور اگر تمھیں نہانے کی حاجت ہو تو (نہا کر) پاک ہو جایا کرو۔‘‘ تو یہ قرآنی بلاغت کے خلاف ہے‘ لہٰذا اس آیت میں عورتوں کو چھونے سے مراد ہم بستر ہونا ہے تاکہ آیت طہارت کے موجب دو اسباب‘ سبب اکبر اور سبب اصغر پر مشتمل ہو اور دو ہی طہارتوں پر مشتمل ہو‘ جن میں سے طہارت صغریٰ کا تعلق جسم کے چار اعضا سے ہے جب کہ طہارت کبریٰ کا تعلق سارے بدن سے ہے اور اس کے بدل یعنی تیمّم کے ساتھ طہارت کا تعلق صرف دو اعضا سے ہے کیونکہ اس میں طہارت صغریٰ و کبریٰ مساوی ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ راجح قول یہ ہے کہ عورت کو محض چھونے سے خواہ وہ شہوت کے ساتھ ہو یا بغیر شہوت کے وضو نہیں ٹوٹتا اِلّا یہ کہ اس (انسان) سے کچھ خارج ہو۔ اگر منی خارج ہو تو غسل واجب ہے‘ جب کہ مذی کے خارج ہونے کی صورت میں آلۂ تناسل اور خصیتین کو دھو کر وضو کرنا واجب ہے۔

کیا جنبی آدمی قرآن کو چھو سکتا ہے؟

سوال ایک مدرس جو شاگردوں کو قرآن کریم پڑھاتا ہے‘ اُسے مدرسہ یا کسی قریبی جگہ سے پانی نہیں ملتا تو وہ کیا کرے‘ جب کہ قرآن مجید کو پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں؟

جواب جب مدرسہ میں یا اس کے قرب و جوار میں پانی نہ ہو تو مدرس طلبہ کو متنبہ کردے کہ وہ وضو کر کے آیا کریں کیونکہ قرآن مجید کو پاک آدمی ہی چھو سکتا ہے۔ حدیث حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں لکھا تھا:

«أَنْ لاَ يَمَسَّ الْقُرْآنَ إِلاَّ طَاهِرٌ»(سنن الدارمي، الطلاق، باب لا طلاق قبل النكاح، ح:٢٢٦٦)

’’قرآن کو پاک آدمی ہی ہاتھ لگائے۔‘‘

طاہر سے یہاں مراد وہ آدمی ہے جس کی ناپاکی دور ہوگئی ہو۔ اس کی دلیل وضو‘ غسل اور تیمّم والی آیت کے آخر میں حسب ذیل ارشاد

باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُم مِّنْ حَرَجٍ وَلٰكِن يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝٦﴾ (المائدة: ٥/٦)

"اللہ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنا چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کرے تاکہ تم شکر کرو۔"

اس آیت کریمہ کے یہ الفاظ "کہ تمھیں پاک کرے" اس بات کی دلیل ہیں کہ طہارت حاصل کرنے سے پہلے انسان طاہر نہیں ہے لہٰذا کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وضو کے ساتھ طہارت حاصل کیے بغیر وہ قرآن مجید کو ہاتھ لگائے البتہ بعض اہل علم نے چھوٹے بچوں کو رخصت دی ہے کہ وہ قرآن مجید کو ہاتھ لگا سکتے ہیں، اس لیے کہ انھیں اس کی بار بار ضرورت پیش آتی ہے اور انھیں وضو کا ادراک بھی نہیں ہوتا لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ طلبہ کو بھی وضو کا حکم دیا جائے تاکہ وہ بھی طہارت کے ساتھ قرآن مجید کو ہاتھ لگائیں۔ سائل نے جو یہ کہا ہے کہ قرآن مجید کو پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس بارے میں گویا قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کیا ہے:

«أَنْ لاَ يَمَسَّ الْقُرْآنَ إِلاَّ طَاهِرٌ»(سنن الدارمي، الطلاق، باب لا طلاق قبل النكاح، ح:٢٢٦٦)

"اس کو وہی ہاتھ لگاتے ہیں جو پاک ہیں۔"

حالانکہ یہ آیت اس کی دلیل نہیں ہے کیونکہ کتاب مکنون سے مراد لوح محفوظ ہے اور پاک سے مراد فرشتے ہیں اور اگر اس سے مراد طہارت حاصل کرنے والے لوگ ہوتے تو "مُطَهَّرُون" کی بجائے "مُطَّهِّرُون" یا "مُتَطَهِّرُون" کے الفاظ ہوتے۔ بہر حال اس آیت میں یہ بیان نہیں کیا گیا کہ طہارت کے بغیر قرآن مجید کو ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے، البتہ وہ حدیث جس کی طرف ابھی ہم نے اشارہ کیا ہے، وہ اس بات کی ضرور دلیل ہے کہ وضو کے بغیر قرآن مجید کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔

واجباتِ غسل کا بیان

سوال غسل کن کن چیزوں سے واجب ہوتا ہے؟

جواب غسل درج ذیل چیزوں سے واجب ہوتا ہے: ① شہوت کے ساتھ منی کے انزال سے خواہ حالت بیداری میں انزال ہو یا نیند میں، حالت نیند میں انزال منی سے غسل واجب ہے، خواہ شہوت محسوس نہ بھی ہو کیونکہ سوئے ہوئے شخص کو احتلام ہو جاتا ہے مگر اسے شہوت محسوس نہیں ہوتی، منی جب شہوت کے ساتھ خارج ہو تو غسل ہر حال میں واجب ہے۔ ② جماع یعنی مرد اپنی بیوی سے ہم بستری کرے اور اپنے آلۂ تناسل کو اس کی اندام نہانی میں داخل کر دے خواہ حشفہ ہی کو داخل کرے یا زیادہ حصے کو تو اس سے بھی غسل واجب ہو جاتا ہے کیونکہ پہلی صورت کے بارے میں تو نبی ﷺ کا یہ فرمان ہے:

«إِنَّمَا الْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ»(صحيح مسلم، الحيض، باب إنما الماء من الماء، ح:٣٤٣)

"پانی کا استعمال پانی نکلنے سے ہے۔"

یعنی غسل اس صورت میں واجب ہوگا جب انزال ہو اور دوسری صورت کے بارے میں نبی ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

«إِذَا جَلَسَ بَيْنَ شُعَبِهَا الأَرْبَعِ ثُمَّ جَهَدَهَا فَقَدْ وَجَبَ الْغُسْلُ ۔ وَإِنْ لَمْ يُنْزِلْ»(صحيح البخاري، الغسل، باب إذا التقى الختانان، ح:٢٩١ وصحيح مسلم، الحيض، باب نسخ الماء من الماء، ح:٣٤٨ واللفظ له)

”جب وہ اس کی چاروں شاخوں کے درمیان بیٹھے اور اس کے ساتھ جماع کے لیے کوشش کرے تو غسل واجب ہو جاتا ہے خواہ انزال نہ بھی ہو۔“

یہ مسئلہ بہت سے لوگوں کو معلوم نہیں کہ انزال کے بغیر جماع کے بارے میں کیا حکم ہے حتی کہ بعض لوگ انزال کے بغیر اپنی بیوی سے ہم بستر ہوتے رہتے ہیں اور کئی ہفتے اور مہینے گزر جاتے ہیں اور وہ ازراہ جہالت غسل نہیں کرتے' حالانکہ یہ بہت سنگین بات ہے۔ واجب ہے کہ انسان کو ان تمام حدود کے بارے میں علم ہو' جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل فرمایا ہے بہر حال مذکورہ بالا حدیث کے پیش نظر انسان جب اپنی بیوی سے مباشرت کرے اور انزال نہ بھی ہو تو اس پر اور اس کی بیوی پر غسل واجب ہے۔

③ حیض اور نفاس کا خون نکلنے سے بھی غسل واجب ہو جاتا ہے۔ عورت کو جب حیض آئے اور پھر ختم ہو جائے تو اس پر غسل واجب ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَٱعْتَزِلُوا۟ ٱلنِّسَآءَ فِى ٱلْمَحِيضِ ۖ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ۖ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ ٱللَّهُ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلتَّوَّٰبِينَ وَيُحِبُّ ٱلْمُتَطَهِّرِينَ ٢٢٢ ﴾
(البقرة: ٢/ ٢٢٢)

”اور تم سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دو وہ تو نجاست ہے' سو ایام حیض میں عورتوں سے کنارہ کش رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان سے مقاربت نہ کرو۔ ہاں جب پاک ہو جائیں تو جس طریق سے اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے' ان کے پاس جاؤ۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ توبہ قبول کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔“

اس لیے کہ نبی ﷺ نے مستحاضہ کو حکم دیا تھا کہ جب وہ بقدر حیض بیٹھ جائے تو غسل کرلے' نفاس والی عورت کے لیے بھی واجب ہے کہ جب نفاس ختم ہو جائے تو وہ غسل کرے۔ حیض و نفاس سے غسل کا طریقہ وہی ہے جو جنابت کی وجہ سے غسل کا طریقہ ہے۔ بعض اہل علم نے حائضہ کے لیے اس بات کو مستحب قرار دیا ہے کہ وہ غسل کرتے ہوئے پانی میں بیری کے پتے ڈال لے کیونکہ یہ نظافت و طہارت کے لیے بہت بہتر ہے۔ بعض علماء نے موجبات غسل میں موت کا بھی ذکر کیا ہے۔ انھوں نے استدلال نبی ﷺ کے اس فرمان سے کیا ہے کہ جو خواتین آپ کی بیٹی کو غسل دے رہی تھیں' ان سے آپ نے فرمایا:

«اِغْسِلْنَهَا ثَلَاثًا، أَوْ خَمْسًا، أَوْ أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ إِنْ رَأَيْتُنَّ ذٰلِكَ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب غسل الميت ووضوئه بالماء والسدر، ح:١٢٥٣ وصحيح مسلم، الجنائز، باب في غسل الميت، ح:٩٣٩)

”انہیں تین دفعہ یا پانچ دفعہ یا ضرورت محسوس کرو تو اس سے بھی زیادہ دفعہ غسل دو۔“

نیز جس شخص کو عرفہ کے میدان میں حالت احرام میں اس کی سواری نے نیچے گرا دیا تھا (جس کی وجہ سے وہ فوت ہو گیا تھا) اس

کے بارے میں نبی ﷺ نے فرمایا تھا:

«اِغْسِلُوهُ بِمَاءٍ وَسِدْرٍ وَكَفِّنُوهُ فِي ثَوْبَيْهِ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب كيف يكفن المحرم، ح:١٢٦٧ وصحيح مسلم، الحج، باب ما يفعل بالمحرم إذا مات، ح:١٢٠٦ واللفظ له)

''اسے پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ غسل دو اور اس کے دو کپڑوں ہی میں اسے کفن دے دو۔''

ان احادیث کے پیش نظر ان علماء نے کہا ہے کہ موت بھی موجب غسل ہے' لیکن اس وجوب کا تعلق زندہ لوگوں سے ہے کیونکہ موت کی وجہ سے مردہ انسان مکلّف نہیں رہتا البتہ زندہ لوگوں کے لیے یہ واجب ہے کہ نبی ﷺ کے حکم کی وجہ سے وہ اپنے مردوں کو غسل دیں۔

کیا بوس وکنار یا سو کر اٹھنے کے بعد کپڑوں میں تری دیکھنے پر غسل واجب ہے؟

سوال کیا دل لگی اور بوس وکنار سے غسل واجب ہو جاتا ہے؟

جواب مرد اور عورت پر محض دل لگی اور بوس وکنار کے ساتھ لطف اندوز ہونے کی صورت میں غسل واجب نہیں ہوتا البتہ' منی کے انزال کی صورت میں غسل واجب ہو جائے گا۔ دونوں کو انزال ہو جائے تو دونوں پر اور اگر دونوں میں سے کسی ایک کو انزال ہو تو پھر ایک پر غسل واجب ہوگا۔ یہ حکم اس صورت میں ہے جب صرف دل لگی کی باتیں' یا بوسہ یا گلے لگانا ہو اور اگر صورت جماع کی ہو تو اس میں مرد وعورت ہر دو کے لیے ہر حال میں غسل واجب ہے خواہ انزال نہ بھی ہو کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا جَلَسَ بَيْنَ شُعَبِهَا الأَرْبَعِ ثُمَّ جَهَدَهَا فَقَدْ وَجَبَ الْغُسْلُ - وَإِنْ لَمْ يُنْزِلْ»(صحيح البخاري، الغسل، باب إذا التقى الختانان، ح:٢٩١ وصحيح مسلم، الحيض، باب نسخ الماء من الماء، ح:٣٤٨ واللفظ له)

''جب وہ اس کی چار شاخوں (یعنی دونوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں) کے درمیان بیٹھ جائے' اور اس کے ساتھ جماع کے لیے کوشش کرے تو اس سے غسل واجب ہو جاتا ہے۔ خواہ اسے انزال نہ بھی ہو۔''

یہ مسئلہ بہت سے مردوں اور عورتوں کو معلوم نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جماع میں اگر انزال نہ ہو تو غسل واجب نہیں ہے' یہ بہت بڑی جہالت کی بات ہے کیونکہ جماع میں ہر حال میں غسل واجب ہے' البتہ جماع کے علاوہ لطف اندوزی کی دیگر تمام صورتوں میں اگر انزال نہ ہو تو غسل واجب نہیں ہے۔

سوال جب انسان بیدار ہو اور وہ اپنے کپڑوں میں تری دیکھے تو کیا اس صورت میں اس پر غسل واجب ہوگا؟

جواب جب انسان بیدار ہونے کے بعد اپنے کپڑوں میں تری دیکھے تو اس کی تین حالتیں ہو سکتی ہیں:

○ اسے یقین ہو کہ یہ منی ہے تو اس صورت میں غسل واجب ہے' خواہ اسے احتلام یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔

○ اسے یقین ہو کہ یہ منی نہیں ہے' تو اس حالت میں غسل واجب نہیں ہے' البتہ گیلی جگہ کو دھونا واجب ہے کیونکہ اس کے لیے

پیشاب کا حکم ہوگا۔

○ اسے معلوم نہ ہو کہ یہ منی ہے یا نہیں؟ تو اس میں حسب ذیل تفصیل ہے:

- اگر اسے یاد آئے کہ نیند میں اسے احتلام ہوا تھا تو اسے منی قرار دے اور غسل کر لے کیونکہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ انھوں نے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھا کہ جب عورت نیند میں اس طرح دیکھے جس طرح مرد دیکھتا ہے تو کیا اس پر غسل واجب ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

«نَعَمْ إِذَا رَأَتِ الْمَاءَ» (صحیح مسلم، الحیض، باب وجوب الغسل علی المرأة بخروج المنی منها، ح: ٣١٣)

''ہاں جب وہ پانی دیکھے۔''

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جسے احتلام ہو اور وہ پانی دیکھے تو اس پر غسل واجب ہے۔

- جب وہ خواب میں کچھ نہ دیکھے اور سونے سے پہلے اگر وہ جماع کے بارے میں سوچتا رہا ہو تو اسے مذی قرار دے دے۔ اگر سونے سے پہلے اس نے ایسا سوچا نہ ہو تو اس صورت میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس پر از راہ احتیاط غسل واجب ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ غسل واجب نہیں ہے اور یہی قول صحیح ہے کیونکہ اصل براءت ذمہ (کچھ نہیں) ہے۔

جنابت اور غسل کے احکام

سوال جنابت کے بارے میں کیا احکام ہیں؟

جواب جنابت کے بارے میں درج ذیل احکام ہیں: ① جنبی پر فرض، نفل اور ہر طرح کی نماز حتی کہ نماز جنازہ بھی حرام ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِذَا قُمْتُمْ إِلَى ٱلصَّلَوٰةِ فَٱغْسِلُوا۟ وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى ٱلْمَرَافِقِ وَٱمْسَحُوا۟ بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى ٱلْكَعْبَيْنِ ۚ وَإِن كُنتُمْ جُنُبًا فَٱطَّهَّرُوا۟﴾ (المائدة: ٥/ ٦)

''مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کیا کرو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھولیا کرو اور اپنے سر کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں دھولیا کرو اور اگر نہانے کی حاجت ہو تو (نہا کر) پاک ہو جایا کرو۔''

② جنبی کے لیے بیت اللہ کا طواف بھی حرام ہے کیونکہ بیت اللہ کا طواف گویا مسجد میں ٹھہرنا ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَقْرَبُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَأَنتُمْ سُكَـٰرَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا۟ مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِى سَبِيلٍ حَتَّىٰ تَغْتَسِلُوا۟﴾ (النساء: ٤/ ٤٣)

''مومنو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو جب تک (ان الفاظ کو) جو منہ سے کہو سمجھنے (نہ) لگو نماز کے پاس نہ جاؤ اور جنابت کی حالت میں بھی (نماز کے پاس نہ جاؤ) جب تک کہ غسل (نہ) کر لو ہاں اگر بحالت سفر راستے پر چلے جا رہے ہو (تو اور بات ہے۔'')

③ جنبی کے لیے قرآن مجید کو ہاتھ لگانا بھی حرام ہے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«لاَ يَمَسَّ الْقُرْآنَ إِلاَّ طَاهِرٌ»(سنن الدارمي، الطلاق، باب لا طلاق قبل النكاح، ح:٢٢٦٦)

’’قرآن مجید کو پاک انسان ہی ہاتھ لگائے۔‘‘

④ اس کے لیے مسجد میں ٹھہرنا بھی حرام ہے مگر وضو کے ساتھ کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَقۡرَبُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَأَنتُمۡ سُكَٰرَىٰ حَتَّىٰ تَعۡلَمُواْ مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتَّىٰ تَغۡتَسِلُواْۚ﴾ (النساء: ٤/ ٤٣)

’’مومنو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو جب تک (ان الفاظ کو) جو منہ سے کہو سمجھنے (نہ) لگو، نماز کے پاس نہ جاؤ اور جنابت کی حالت میں بھی (نماز کے پاس نہ جاؤ) جب تک کہ غسل (نہ) کرلو، ہاں اگر بحالت سفر راستے پر چلے جارہے ہو (تو اور بات ہے۔‘‘)

⑤ جب تک وہ غسل نہ کرلے، اس کے لیے قرآن مجید پڑھنا بھی حرام ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن مجید پڑھایا کرتے تھے، بشرطیکہ وہ جنبی نہ ہوتے۔ یہ ہیں پانچ احکام اس شخص سے متعلق، جو حالت جنابت میں ہو۔

سوال غسل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

جواب غسل کے طریقے کی دو صورتیں ہیں: ○ جس سے غسل واجب ادا ہوجائے، یہ ہے کہ سارے بدن پر پانی بہادے، کلی کرلے اور ناک میں پانی ڈال کر اسے بھی صاف کرلے، تو جو شخص جس طرح بھی سارے جسم پر پانی بہادے، اس کی بڑی ناپاکی دور ہوجائے گی اور اسے طہارت حاصل ہوجائے گی کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِن كُنتُمۡ جُنُبًا فَٱطَّهَّرُواْۚ﴾ (المائدة: ٥/ ٦)

’’اور اگر نہانے کی حاجت ہو تو (نہا کر) پاک ہوجایا کرو۔‘‘

○ غسل کرنے کا کامل طریقہ یہ ہے کہ اس طرح غسل کرے، جس طرح نبی ﷺ غسل فرمایا کرتے تھے اور وہ اس طرح کہ جب غسل جنابت کا ارادہ ہو تو اپنے ہاتھوں کو دھوئے، پھر شرم گاہ اور اس کے گرد وپیش کی آلودگی کو دھوئے، پھر مکمل وضو کرے جیسا کہ قبل ازیں ہم نے وضو کا طریقہ بیان کیا ہے، پھر اپنے سر کو پانی کے ساتھ تین بار اس طرح دھوئے کہ بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچ جائے اور پھر سارے جسم پر پانی بہائے تو یہ ہے کامل غسل کا طریقہ۔

سوال جب انسان غسل کرے اور کلی نہ کرے اور ناک صاف نہ کرے تو کیا اس کا غسل صحیح ہوگا؟

جواب کلی اور ناک میں پانی داخل کرکے اسے صاف کیے بغیر غسل صحیح نہیں ہوگا کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِن كُنتُمۡ جُنُبًا فَٱطَّهَّرُواْۚ﴾ (المائدة: ٥/ ٦)

’’اور اگر تم جنبی ہو تو (نہا کر) پاک ہوجایا کرو۔‘‘

یہ حکم سارے بدن کو شامل ہے اور منہ کے اندر اور ناک کے اندر کا حصہ بھی بدن کے وہ حصے ہیں جنہیں پاک کرنا واجب ہے۔

نبی ﷺ نے وضو میں بھی ان کا حکم اس لیے دیا ہے کہ وہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ ﴾ (المائدة: ٥/ ٦)

"پس اپنے چہروں کو دھویا کرو۔"

یہ دونوں بھی چہرے کے دھونے میں داخل ہیں، اور طہارت کبریٰ میں بھی چہرے کو دھونا اور پاک کرنا واجب ہے، تو غسل جنابت میں بھی کلی کرنا اور ناک میں پانی داخل کر کے اسے صاف کرنا واجب ہے۔

پانی نہ ہو یا موسم شدید ٹھنڈا ہو تو کیا جنبی تیمّم کر سکتا ہے؟

سوال جب پانی کا استعمال مشکل ہو تو طہارت کس طرح حاصل کی جائے؟

جواب جب پانی کا استعمال مشکل ہو کہ پانی موجود ہی نہ ہو یا اس کا استعمال نقصان دہ ہو تو پانی استعمال کرنے کے بجائے تیمّم کر لیا جائے۔ تیمّم کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے دونوں ہاتھوں کو زمین پر مارے اور انہیں اپنے چہرے پر پھیرے اور انہیں ایک دوسرے پر بھی پھیرے لیکن یہ حدث سے طہارت حاصل کرنے کے ساتھ خاص ہے۔

جہاں تک ناپاک اشیا سے طہارت حاصل کرنے کا تعلق ہے تو اس میں تیمّم نہیں ہے۔ خواہ ناپاک چیز بدن پر ہو یا کپڑے پر یا جگہ پر کیونکہ ناپاک چیز سے طہارت سے مقصود یہ ہے کہ اس ناپاک چیز کا ازالہ کر دیا جائے، اس میں تعبد شرط نہیں ہے کیونکہ یہ ناپاک چیز اگر انسان کے ارادہ کے بغیر بھی ختم ہو جائے تو جگہ پاک ہو جائے گی۔ اگر ناپاک جگہ یا کپڑے پر بارش نازل ہو اور بارش کی وجہ سے ناپاک چیز زائل ہو جائے تو اس سے طہارت حاصل ہو جائے گی، خواہ انسان کو اس کا علم نہ بھی ہو، البتہ ناپاکی سے طہارت حاصل کرنا عبادت ہے جس سے انسان تقرب الٰہی حاصل کرتا ہے لہٰذا اس میں نیت وقصد ضروری ہے۔

سوال جو شخص ٹھنڈے موسم میں جنبی ہو، کیا وہ تیمّم کر سکتا ہے؟

جواب جب انسان جنبی ہو تو اس کے لیے غسل کرنا واجب ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِن كُنتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا ﴾ (المائدة: ٥/ ٦)

"اگر تمھیں نہانے کی حاجت ہو تو (نہا کر) پاک ہو جایا کرو۔"

اگر رات سخت سرد ہو اور وہ ٹھنڈے پانی کے ساتھ غسل نہ کر سکتا ہو تو اس کے لیے واجب ہے کہ اگر ممکن ہو تو پانی گرم کر لے اور اگر پانی گرم کرنے کے لیے کسی چیز کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے پانی گرم کرنا ممکن نہ ہو تو اس حالت میں تیمم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے:

﴿ وَإِن كُنتُم مَّرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ أَوْ لَٰمَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُم مِّنْهُ ۚ مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُم مِّنْ حَرَجٍ وَلَٰكِن يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٦﴾ ﴾

(المائدة: ٥/ ٦)

"اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا کوئی تم میں سے بیت الخلاء سے باہر آیا ہو یا عورتوں سے ہم بستر ہوئے ہو اور تمھیں پانی نہ مل

سکے تو پاک مٹی لو اور اس سے منہ اور ہاتھوں کا مسح یعنی تیمم کر لو' اللہ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنا چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کرے تا کہ تم شکر کرو۔''

جب وہ جنابت سے تیمم کر لے تو اس سے وہ پاک ہو جائے گا اور اس وقت تک پاک رہے گا جب تک اسے پانی نہیں ملتا اور جب اسے پانی مل جائے تو پھر اس کے لیے غسل کرنا واجب ہو جائے گا کیونکہ صحیح بخاری میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ایک طویل حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے جب ایک شخص کو الگ تھلگ دیکھا جس نے لوگوں کے ساتھ مل کر نماز ادا نہیں کی تھی تو آپ نے اس سے پوچھا کہ تم نے نماز ادا نہیں کی؟ اس نے عرض کیا کہ میں حالت جنابت میں ہوں اور یہاں پانی موجود نہیں ہے' تو نبی ﷺ نے فرمایا:

«عَلَيْكَ بِالصَّعِيدِ فَإِنَّهُ يَكْفِيكَ . . .»(صحيح البخاري، التيمم، باب الصعيد الطيب وضوء المسلم يكفيه من الماء، ح: ٣٤٤)

''مٹی کو استعمال کر لو تمھارے لیے کافی ہے۔''

پھر اس کے بعد پانی آ گیا تو نبی ﷺ نے اسے پانی دیا اور فرمایا:

«اِذْهَبْ فَأَفْرِغْهُ عَلَيْكَ»(صحيح البخاري، التيمم، باب الصعيد الطيب وضوء المسلم يكفيه من الماء، ح: ٣٤٤)

''جاؤ اسے اپنے اوپر ڈال لو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ تیمم کرنے والے کو جب پانی مل جائے تو اس کے لیے پانی کے ساتھ طہارت حاصل کرنا واجب ہے خواہ اس نے جنابت کی وجہ سے تیمم کیا ہو یا کسی چھوٹی ناپاکی کی وجہ سے۔ جنابت سے تیمم کرنے والا اس وقت تک پاک ہے جب تک وہ دوبارہ جنبی نہیں ہوتا یا اسے پانی نہیں ملتا' لہٰذا اسے ہر وقت تیمم جنابت کا اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ تیمم جنابت کے بعد اسے چھوٹی ناپاکی کے لیے تیمم کرنا ہوگا اور اگر دوبارہ جنبی ہو جائے تو پھر دوبارہ جنابت کے لیے تیمم کرنا ہوگا۔

کیا تیمم کے لیے مٹی پر غبار ہونا شرط ہے اور کیا دیوار یا فرش پر تیمم جائز ہے؟

سوال جس مٹی کے ساتھ تیمم کرنا ہو' کیا اس کے لیے غبار کا ہونا شرط ہے اور کیا ارشاد باری تعالیٰ: ﴿فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُم مِّنْهُ﴾ میں لفظ ﴿مِنْهُ﴾ غبار کی شرط کی دلیل ہے؟

جواب راجح قول کے مطابق تیمم کے لیے یہ شرط نہیں کہ مٹی میں غبار بھی ہو بلکہ جب زمین پر تیمم کر لیا جائے تو یہ کافی ہے خواہ اس میں غبار ہو یا نہ ہو' لہٰذا جب زمین پر بارش نازل ہو تو انسان زمین پر اپنے دونوں ہاتھ مارے اور چہرے اور دونوں ہاتھوں پر مسح کر لے اور اس صورت میں تیمم صحیح ہوگا خواہ زمین پر غبار نہ بھی ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُم مِّنْهُ﴾ (المائدة: ٥/ ٦)

''تو پاک مٹی لو اور اس سے منہ اور ہاتھوں کا مسح (تیمم) کر لو۔''

نبی ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ایسے علاقوں کی طرف بھی سفر کیا کرتے تھے جن میں ریت ہی تھی اور بارشیں بھی نازل ہوتیں اور وہ حسب فرمان باری تعالیٰ تیمّم بھی کیا کرتے تھے‘ لہٰذا راجح قول یہ ہے کہ انسان جب زمین پر تیمّم کرے تو اس کا تیمّم صحیح ہے خواہ زمین پر غبار ہو یا نہ ہو۔ آیت کریمہ ﴿فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُم مِّنْهُ﴾ میں ﴿مِنْ﴾ ابتدائے غایت کے لیے ہے تبعیض کے لیے نہیں ہے اور نبی ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس وقت پھونک ماری‘ جب انھیں (تیمّم کے لیے) زمین پر مارا تھا۔ ①

سوال جب مریض کو مٹی نہ ملے تو کیا وہ دیوار یا فرش پر تیمّم کرسکتا ہے؟

جواب دیوار بھی پاک مٹی ہی سے بنی ہوتی ہے لہٰذا جب دیوار مٹی سے بنی ہوئی یہ مٹی خواہ پتھر کی صورت میں ہو یا اینٹ کی صورت میں‘ اس کے ساتھ تیمّم جائز ہے۔ دیوار پر اگر لکڑی کا کام کیا گیا ہو یا اس پر ٹائلیں لگی ہوں اور اس پر غبار ہو تو اس کے ساتھ تیمّم کرنے میں کوئی حرج نہیں‘ وہ ایسے ہی ہے جیسے زمین پر تیمّم کر رہا ہو کیونکہ غبار مٹی کے مادے سے ہے اور اگر اس پر غبار نہ ہو تو وہ مٹی نہیں ہے‘ اس کے ساتھ تیمّم نہ کیا جائے۔ اسی طرح اگر فرش پر غبار ہو تو وہ اس کے ساتھ تیمّم کرسکتا ہے اور اگر اس پر غبار نہ ہو تو وہ تیمّم نہ کرے کیونکہ وہ مٹی نہیں ہے۔

چھوٹے بچے کا پیشاب اگر کپڑوں کو لگ جائے تو؟

سوال چھوٹے بچے کا پیشاب اگر کپڑے کو لگ جائے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اس مسئلہ میں صحیح قول یہ ہے کہ اس بچے کا پیشاب خفیف النجاست ہے‘ جس کی غذا دودھ ہو لہٰذا اسے پاک کرنے کے لیے چھینٹے مارنا ہی کافی ہے‘ پیشاب کی جگہ پر پانی ڈال دے حتی کہ اس ساری جگہ پر پانی گر جائے جہاں پیشاب لگا ہے۔ اور پھر اسے مَلنے یا نچوڑنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ نبی ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ کے پاس ایک چھوٹے بچے کو لایا گیا‘ آپ نے اسے گود میں بٹھا لیا مگر اس نے پیشاب کر دیا تو آپ نے پانی منگوا کر اس جگہ بہا دیا اور اسے دھویا نہیں۔ ② البتہ بچی کے پیشاب کی صورت میں کپڑے کو دھونا ضروری ہے کیونکہ اصل بات تو یہی ہے کہ پیشاب ناپاک ہے‘ اسے دھونا واجب ہے لیکن چھوٹا بچہ مستثنیٰ ہے جیسا کہ سنت سے ثابت ہے۔

حائضہ عورت کے متعلق احکام

سوال ایک عورت کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہے اور اسے معروف طریقے کے مطابق خون آتا ہے اور دوسری کی عمر بھی پچاس سال سے زیادہ ہے لیکن اسے معروف طریقے کے مطابق خون نہیں آتا بلکہ پیلے یا مٹیالے رنگ کا آتا ہے؟

جواب جب عورت کو معروف طریقے کے مطابق خون آتا ہے تو اس کا خون راجح قول کے مطابق حیض کا صحیح خون ہے کیونکہ حیض

---

① صحیح البخاری‘ التیمم‘ باب المتیمم هل ینفخ فیهما‘ حدیث : 338

② صحیح البخاری‘ الوضوء: باب بول الصبیان‘ حدیث : 223 و صحیح مسلم‘ الطهارہ‘ باب حکم بول الطفل الرضیع حدیث : 286

آنے کی زیادہ سے زیادہ عمر کا کوئی تعین نہیں لہٰذا اس کے خون کی وجہ سے اس کے لیے حیض کے تمام معروف احکام ثابت ہوں گے کہ وہ نماز' روزے اور جماع سے اجتناب کرے گی' حیض ختم ہونے کے بعد غسل لازم ہوگا اور روزوں کی قضا دینا ہوگی وغیرہ۔

وہ عورت جسے پیلے یا مٹیالے رنگ کا خون آتا ہے' اگر یہ خون اس کے ایام حیض کے دنوں میں آتا ہے تو یہ حیض کا خون ہے اور اگر یہ اس کے ایام حیض کے علاوہ دیگر دنوں میں آتا ہے تو یہ حیض نہیں ہے اور اگر یہ حیض ہی کا معروف خون ہے تو پھر دنوں کے آگے پیچھے ہونے سے کوئی اثر نہیں پڑتا' جب بھی حیض آئے تو بیٹھ جائے (یعنی نماز روزہ ادا نہ کرے) اور جب ختم ہو جائے تو غسل کرے۔ یہ سب کچھ اس بنیاد پر کہا جا رہا ہے کہ صحیح قول کے مطابق حیض کی عمر کی کوئی حد نہیں ہے۔ جہاں تک اس مذہب کا تعلق ہے کہ پچاس سال کی عمر کے بعد حیض نہیں ہے خواہ سیاہ رنگ کا معمول کے مطابق خون ہو اور اس صورت میں وہ نماز' روزے کی پابندی کرے گی' اس خون کے ختم ہونے پر اسے غسل کرنے کی بھی ضرورت نہیں تو یہ قول صحیح نہیں ہے۔

سوال کیا حاملہ عورت کو آنے والا خون بھی حیض کا خون ہے؟

جواب حاملہ عورت کو حیض نہیں آتا جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ عورتیں حیض منقطع ہو جانے سے حمل معلوم کر لیتی ہیں اور حیض' جیسا کہ اہل علم نے کہا ہے' کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے شکم مادر میں جنین کی غذا کے لیے پیدا کیا ہے' لہٰذا جب حمل قرار پا جاتا ہے تو حیض منقطع ہو جاتا ہے لیکن بعض عورتوں کو حسب عادت حیض جاری بھی رہتا ہے لہٰذا کہا جائے گا کہ اس عورت کا حیض صحیح ہے کیونکہ اس کا حیض جاری رہا ہے اور وہ حمل سے متاثرہ نہیں ہوا' لہٰذا یہ حیض بھی ان تمام امور سے مانع ہوگا' جن سے غیر حاملہ عورت کا حیض مانع ہوتا ہے اور ان تمام امور کو واجب کرنے والا ہوگا جن کے لیے غیر حاملہ عورت کا حیض موجب اور مسقط ہوتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ حاملہ عورت سے خارج ہونے والے خون کی دو قسمیں ہیں:

○ جس کے بارے میں یہ حکم ہوگا کہ یہ حیض ہے۔ یہ وہ خون ہے جو اسی طرح جاری رہا جیسا کہ حمل سے قبل جاری تھا' گویا کہ حمل اس پر اثر انداز نہیں ہوا لہٰذا یہ حیض ہوگا۔

○ وہ خون جو حاملہ عورت کو اچانک جاری ہو جائے اور اس کا سبب کوئی حادثہ یا کسی بھاری چیز کا اٹھالینا یا کسی چیز سے گر جانا وغیرہ ہو تو یہ حیض کا خون نہیں بلکہ کسی رگ سے جاری ہونے والا خون ہوگا' لہٰذا وہ نماز اور روزے سے رکاوٹ نہیں بنے گا اور یہ عورت پاک عورتوں کے حکم میں ہوگی۔

سوال کیا حیض کے کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ ایام کی حد معلوم ہے؟

جواب صحیح قول کے مطابق حیض کے کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ ایام کی حد معلوم نہیں ہے اور اس کی دلیل حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى فَٱعْتَزِلُوا۟ ٱلنِّسَآءَ فِى ٱلْمَحِيضِ ۖ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ۖ ﴾

(البقرة: ٢/ ٢٢٢)

''اور وہ تم سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ تو نجاست ہے' سو ایام حیض میں عورتوں سے کنارہ کش

رہو اور جب تک پاک نہ ہو جائیں ان سے ہم بستری نہ کرو۔"

اللہ تعالیٰ نے کنارہ کشی کی حد معلوم دنوں کی صورت میں قرار نہیں دی بلکہ اس کی حد پاک ہونے کو قرار دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وجود اور عدم کی صورت میں حکم کی علت حیض ہے۔ جب حیض موجود ہوگا تو حکم ثابت ہوگا اور جب عورت پاک ہو جائے گی تو حیض کے احکام زائل ہو جائیں گے۔ اور پھر دنوں کی تحدید کی کوئی دلیل نہیں ہے حالانکہ اس کی ضرورت بھی تھی۔ اگر عمر یا زمانے کے اعتبار سے شرعی طور پر تحدید ثابت ہوتی تو اسے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں بیان کر دیا گیا ہوتا۔ پس ہر وہ خون جسے عورت دیکھے اور جس کے بارے میں عورتوں میں معروف ہو کہ یہ خونِ حیض ہے، تو وہ حیض کا خون ہے اور اس کے لیے وقت کا تعین نہیں ہے اور اگر خون ہمیشہ جاری رہے اور کبھی بھی منقطع نہ ہو یا مہینے میں صرف ایک دو دن منقطع ہو جائے تو وہ استحاضہ کا خون ہے۔

سوال علاج سے ایک عورت کا خون جاری ہو گیا اور اس نے نماز چھوڑ دی تو کیا وہ ان نمازوں کی قضا ادا کرے گی یا نہیں؟

جواب جب خون حیض جاری کرنے کے لیے علاج کیا جائے اور اس علاج سے خون جاری ہو جائے تو اس کی وجہ سے ترک کی ہوئی نمازوں کی قضا نہیں ہوگی۔ حیض کا خون جب بھی موجود ہوگا، اس کا حکم بھی موجود ہوگا جیسا کہ وہ اگر کوئی مانع حیض چیز استعمال کرے اور اس کی وجہ سے حیض نہ آئے تو وہ نماز پڑھے گی اور روزے بھی رکھے گی، روزے قضا نہیں کرے گی کیونکہ وہ حائضہ نہیں ہے اور حکم اپنی علت کے ساتھ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى ﴾ (البقرة: ٢/ ٢٢٢)

"اور تم سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ تو نجاست ہے۔"

پس جب یہ نجاست موجود ہوگی تو اس کا حکم بھی ثابت ہوگا اور جب موجود نہ ہوگی تو اس کا حکم بھی ثابت نہیں ہوگا۔

سوال کیا حائضہ کے لیے قرآن مجید پڑھنا جائز ہے؟

جواب حائضہ کے لیے کسی ضرورت کی وجہ سے قرآن مجید پڑھنا جائز ہے، مثلاً: اگر وہ معلّمہ ہو تو تعلیم دینے کی خاطر اس کے لیے قرآن مجید پڑھنا جائز ہے یا وہ طالبہ ہو تو تعلیم حاصل کرنے کے لیے قرآن مجید پڑھ سکتی ہے یا اگر وہ اپنے چھوٹے یا بڑے بچوں کو قرآن پڑھاتی ہو تو انھیں سکھانے کے لیے ان سے پہلے قرآن مجید کی آیت پڑھ سکتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ حائضہ عورت کو اگر قرآن مجید پڑھنے کی ضرورت ہو تو اس کے لیے پڑھنا جائز ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح اگر اسے یہ اندیشہ ہو کہ وہ قرآن بھول جائے گی تو اسے یاد رکھنے کی غرض سے پڑھنا بھی جائز ہے خواہ وہ حالت حیض میں ہو۔ بعض اہل علم نے یہ کہا ہے کہ حائضہ کے لیے قرآن پڑھنا حرام ہے، خواہ وہ ضرورت کی وجہ سے ہو۔ گویا اس مسئلہ میں تین اقوال ہیں، جن میں سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ جب اسے تعلیم و تعلم یا بھول جانے کے خوف کی وجہ سے قرآن مجید پڑھنے کی ضرورت ہو تو وہ پڑھ سکتی ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

سوال جب عورت تمیز نہ کر سکے کہ یہ حیض کا خون ہے یا استحاضہ کا تو وہ اسے کون سا خون شمار کرے؟

جواب عورت سے خارج ہونے والا خون حیض ہی کا خون ہوتا ہے حتی کہ یہ متعین ہو جائے کہ وہ استحاضہ کا خون ہے، لہٰذا جب تک یہ واضح نہ ہو کہ یہ استحاضہ کا خون ہے، اسے حیض کا خون شمار کیا جائے گا۔

سوال نماز کا وقت شروع ہو جانے کے بعد عورت اگر حائضہ ہو جائے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا وہ اس نماز کی قضا ادا کرے گی؟

جواب اگر نماز کا وقت شروع ہونے کے بعد حیض جاری ہو مثلاً: زوال کے آدھا گھنٹہ بعد حیض شروع ہو گیا تو وہ حیض سے پاک ہونے کے بعد اس نماز کی بھی قضا ادا کرے گی، جس کا وقت شروع ہو گیا تھا، جب کہ وہ ابھی پاک تھی کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ ٱلصَّلَوٰةَ كَانَتْ عَلَى ٱلْمُؤْمِنِينَ كِتَٰبًا مَّوْقُوتًا ﴿١٠٣﴾ ﴾ (النساء: ٤/ ١٠٣)

''بے شک نماز کا مومنوں پر اوقات (مقررہ) میں ادا کرنا فرض ہے۔''

حیض کے وقت ترک کی جانے والی نماز کی وہ قضا ادا نہیں کرے گی کیونکہ ایک طویل حدیث میں نبی ﷺ کا یہ فرمان بھی ہے:

«أَلَيْسَ إِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ»(صحيح البخاري، الحيض، باب ترك الحائض الصوم، ح: ٣٠٤)

''کیا یہ بات نہیں کہ حالت حیض میں وہ نماز پڑھتی ہے نہ روزہ رکھتی ہے؟''

اہل علم کا اجماع ہے کہ وہ اس نماز کی قضا ادا نہیں کرے گی، جو مدت حیض کے اثنا میں فوت ہوئی۔

اگر عورت اس وقت پاک ہو جب نماز کی ایک رکعت یا اس سے زیادہ کی مقدار کے مطابق وقت باقی ہو تو وہ اس وقت کی یہ نماز بھی (بعد میں) پڑھے گی جس میں وہ طاہر ہوئی کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ مِنَ الْعَصْرِ رَكْعَةً قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ»(صحيح مسلم، المساجد، باب من أدرك ركعة من الصلاة فقد أدرك تلك الصلاة، ح: ٦٠٨)

''جس نے غروب آفتاب سے پہلے عصر کی ایک رکعت پالی، اس نے عصر کو پالیا۔''

جب وہ عصر کے وقت یا طلوع آفتاب سے پہلے پاک ہو اور سورج کے غروب یا طلوع ہونے میں اتنا وقت باقی ہو کہ وہ ایک رکعت پڑھ سکتی ہو تو اسے پہلی صورت میں نماز عصر اور دوسری صورت میں نماز فجر پڑھنا ہوگی۔

سوال ایک عورت کے حیض کا معمول چھ دن کا ہے لیکن پھر اس کے معمول کے ایام میں اضافہ ہو گیا؟

جواب اگر عورت کی عادت چھ دنوں کی ہو اور پھر اس مدت میں اضافہ ہو کر دن نو، دس یا گیارہ ہو گئے ہوں تو وہ پاک ہونے تک نماز نہیں پڑھے گی کیونکہ نبی ﷺ نے حیض کے لیے کوئی حد مقرر نہیں فرمائی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى ﴾ (البقرة: ٢/ ٢٢٢)

''اور تم سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ تو نجاست ہے۔''

پس جب تک یہ خون باقی ہوگا عورت حالت حیض میں ہوگی حتی کہ پاک ہو جائے اور غسل کر لے تو پھر نماز پڑھے گی۔ اور اگر دوسرے مہینے میں اس سے کم دن حیض آئے تو حیض ختم ہو جانے پر وہ غسل کرے گی، خواہ یہ اس کی سابقہ مدت کے مطابق نہ بھی ہو۔ اور بنیادی بات یہ ہے کہ جب عورت کا حیض موجود ہوگا تو وہ نماز نہیں پڑھے گی، خواہ حیض اس کی سابقہ عادت کے مطابق ہو یا اس

سے زیادہ ہو یا اس سے کم ہو۔ بہرحال جب وہ پاک ہوگی تب نماز پڑھے گی۔

سوال ایک عورت نے اپنے مخصوص ایام سے پاک ہوکر غسل کرلیا اور نو دن نماز پڑھنے کے بعد اسے پھر خون آگیا اور تین دن اس نے نماز نہ پڑھی پھر پاک ہوکر اس نے گیارہ دن نماز پڑھی اور پھر اس کے معمول کے ایام شروع ہوگئے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ ان تین دنوں کی نماز کی قضا ادا کرے یا وہ انھیں حیض میں سے شمار کرے؟

جواب حیض جب بھی آئے وہ حیض ہے، خواہ اس کے اور سابقہ حیض کے مابین مدت زیادہ ہو یا کم۔ پس اسے جب حیض آئے اور وہ پانچ یا چھ یا دس دن بعد پاک ہوجائے اور پھر حیض دوبارہ شروع ہوجائے تو وہ نماز نہیں پڑھے گی کیونکہ یہ حیض ہے اور ہمیشہ اسے اسی طرح کرنا چاہیے کہ جب بھی پاک ہونے کے بعد دوبارہ حیض آجائے تو وہ نماز نہ پڑھے اور جب خون ہمیشہ جاری ہی رہے یا وہ تھوڑی مدت کے لیے منقطع ہوتا ہو تو پھر یہ استحاضہ ہوگا اور اس صورت میں اسے صرف اپنے معمول کے ایام کے بقدر بیٹھنا ہوگا۔

سوال اس پیلے رنگ کے پانی کے بارے میں کیا حکم ہے جو حیض سے دو دن پہلے آنا شروع ہوجائے؟

جواب حیض آنے سے پہلے جاری ہونے والا یہ پانی اگر پیلے رنگ کا ہو تو یہ کچھ حقیقت نہیں کیونکہ صحیح بخاری میں حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے:

«كُنَّا لاَ نَعُدُّ الْكُدْرَةَ وَالصُّفْرَةَ شَيْئًا»(صحيح البخاري، الحيض، باب الصفرة والكدرة في غير أيام الحيض، ح:٣٢٦)

”ہم مٹیالے اور پیلے رنگ کے پانی کو کچھ شمار نہیں کرتی تھیں۔“

اور سنن ابی داود کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«كُنَّا لاَ نَعُدُّ الْكُدْرَةَ وَالصُّفْرَةَ بَعْدَ الطُّهْرِ شَيْئًا»(سنن أبي داود، الطهارة، باب في المرأة ترى الكدرة والصفرة بعد الطهر، ح:٣٠٧)

”طہر کے بعد مٹیالے اور پیلے رنگ کے پانی کو ہم کچھ شمار نہیں کرتی تھیں۔“

جب یہ پیلا مادہ حیض سے پہلے خارج ہو اور پھر حیض آنے پر بند ہوجائے تو یہ کچھ نہیں اور اگر عورت کو معلوم ہو کہ یہ پیلا مادہ حیض کا پیش خیمہ ہے تو پھر وہ بیٹھ جائے (اسے حیض شمار کرے) حتی کہ پاک ہوجائے۔

سوال طہر کے بعد پیلے اور مٹیالے مادے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب حیض کے بارے میں عورتوں کی مشکلات ایک ایسے سمندر کی طرح ہیں، جس کا کوئی ساحل نہ ہو، اور ان کا ایک سبب مانع حمل اور مانع حیض گولیوں کا استعمال بھی ہے۔ اس طرح کی بہت سی مشکلات سے لوگ پہلے آگاہ نہ تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ایسی مشکلات روز اول ہی سے عورتوں میں موجود رہی ہیں لیکن اس طرح کی مشکلات کی کثرت کہ انسان ان کے حل میں پریشان ہوجائے افسوسناک امر ہے۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ جب عورت پاک ہوجائے اور حیض میں وہ یقینی طہر کو دیکھ لے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ حیض کا خون ختم ہونے کے بعد وہ سفید پانی کا خروج دیکھ لے اس سفید پانی کو سب عورتیں جانتی ہیں، تو اس کے احکام پاک عورتوں کے

ہوں گے۔ الغرض طہر کے بعد مٹیالا یا پیلا پانی یا داغ یا رطوبت حیض نہیں ہے، لہٰذا وہ نماز سے مانع ہے، نہ روزے سے اور نہ مرد کو اپنی بیوی سے ہم بستری کرنے سے کیونکہ وہ حیض نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے:

«كُنَّا لاَ نَعُدُّ الْكُدْرَةَ وَالصُّفْرَةَ شَيْئًا»(صحيح البخاري، الحيض، باب الصفرة والكدرة في غير أيام الحيض، ح: ٣٢٦)

''ہم مٹیالے اور پیلے پانی کو کچھ بھی شمار نہیں کرتی تھیں۔''

اور سنن ابی داود کی روایت میں ان الفاظ کا اضافہ ہے ''طہر کے بعد'' مٹیالے اور پیلے پانی کو ہم کچھ شمار نہیں کرتی تھیں، اور اس کی سند بھی صحیح ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یقینی طہر کے بعد اس طرح کی چیزیں عورت کے لیے نقصان دہ نہیں ہیں اور نہ نماز، روزہ اور اس کے شوہر کے اس سے ہم بستر ہونے میں مانع ہیں لیکن واجب ہے کہ عورت جلد بازی سے کام نہ لے حتی کہ وہ طہر کو دیکھ لے کیونکہ بعض عورتیں خون کے ہلکا ہونے، اور طہر دیکھنے سے قبل جلدی سے غسل کر لیتی ہیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بیویاں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس روئی بھیجا کرتی تھیں، جسے مٹیالے رنگ کا مادہ لگا ہوتا تو آپ ان سے فرماتیں:

«لاَ تَعْجَلْنَ حَتَّى تَرَيْنَ الْقَصَّةَ الْبَيْضَاءَ»(صحيح البخاري، معلقًا، الحيض، باب: ١٩ إقبال المحيض وإدباره)

''جلدی نہ کرو حتی کہ چاندی کی طرح سفید پانی دیکھ لو۔''

مانع حیض گولیوں اور نفاس کے خون کا کیا حکم ہے؟

سوال مانع حیض گولیوں کے استعمال کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب مانع حیض گولیوں کے استعمال میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ صحت کے پہلو سے یہ عورت کے لیے نقصان دہ نہ ہوں اور اس کا شوہر ان کے استعمال کی اجازت دے دے لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے ان گولیوں کا استعمال عورت کے لیے نقصان دہ ہے کیونکہ خونِ حیض کا خروج طبعی خروج ہے اور طبعی چیز کو جب اس کے وقت میں خارج ہونے سے روک دیا جائے تو اس سے یقینی طور پر جسم پر نقصان دہ اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ان گولیوں کے استعمال سے نقصان کا ایک یہ پہلو بھی ہے کہ اس سے اس کی ماہانہ عادت میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ شک میں مبتلا رہتی ہے کہ اسے نماز پڑھنی اور اپنے شوہر سے مقاربت کرنی چاہیے یا نہیں، لہٰذا میں یہ تو نہیں کہتا کہ ان گولیوں کا استعمال حرام ہے البتہ میں پسند نہیں کرتا کہ عورت ان گولیوں کو استعمال کرے، مبادا اسے کوئی نقصان پہنچے۔ عورت کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے سال جب ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے تو وہ رو رہی تھیں اور انہوں نے عمرہ کا احرام باندھ رکھا تھا۔ آپ نے فرمایا:

«مَالَكِ؟ لَعَلَّكِ نَفِسْتِ، قُلْتُ: نَعَمْ، قَالَ: هٰذَا شَيْءٌ كَتَبَهُ اللهُ عَلٰى بَنَاتِ آدَمَ»(صحيح البخاري، الحيض، باب الأمر بالنُّفَساء إذا نفسن، ح: ٢٩٤ وصحيح مسلم، الحج، باب بيان وجوه الإحرام، ح: ١٢١١(١٢٠) واللفظ له)

''کیا بات ہے' شاید تمھارے ایام شروع ہو گئے ہیں؟ میں نے کہا: ہاں! تو آپ نے فرمایا کہ یہ تو وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بنات آدم کے لیے لکھ دیا ہے۔''

عورت کو چاہیے کہ وہ صبر کرے اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھے۔ اگر حیض کی وجہ سے اس کے لیے نماز' روزہ ممکن نہیں' تو ذکر الٰہی کا دروازہ کھلا ہوا ہے' وہ ان ایام میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ذکر کرے' تسبیح بیان کرے' صدقہ کرے اور قول وفعل کی صورت میں لوگوں کے ساتھ احسان کرے' یہ بہت افضل اعمال ہیں۔

سوال نفاس والی عورت کا خون اگر چالیس دن کے بعد بھی جاری رہے تو کیا وہ نماز اور روزہ شروع کر دے؟

جواب نفاس والی عورت کا خون اگر چالیس دنوں کے بعد بھی باقی ہو اور اس میں کوئی تبدیلی بھی نہ آتی ہو تو اگر چالیس دنوں کے بعد اس کی سابقہ عادت کے مطابق ماہانہ ایام شروع ہو گئے ہوں تو وہ بیٹھ جائے یعنی نماز' روزہ شروع نہ کرے اور اگر خون جاری ہو اور اس کی سابقہ عادت کے ماہانہ ایام بھی شروع نہ ہوتے ہوں تو اس صورت میں علماء میں درج ذیل اختلاف ہے:

- بعض نے کہا ہے کہ وہ غسل کر کے نماز روزہ شروع کر دے' خواہ خون جاری ہو کیونکہ اس صورت میں یہ استحاضہ کا خون ہوگا۔
- بعض نے کہا ہے کہ عورت کو اپنی حالت ہی پر باقی رہنا چاہیے حتی کہ ساٹھ دن پورے ہو جائیں کیونکہ بعض عورتیں ایسی بھی پائی گئی ہیں جن کا نفاس ساٹھ دن تک جاری رہا اور یہ امر واقع ہے کہ بعض عورتوں کا نفاس ساٹھ دن تک رہتا ہے' لہٰذا اسے انتظار کر کے ساٹھ دن پورے کرنے چاہییں' اس کے بعد وہ اپنے معمول کے حیض کی طرف رجوع کرے گی اور اپنی عادت کے مطابق بیٹھے گی' پھر غسل کر کے نماز شروع کر دے گی کیونکہ اس وقت یہ مستحاضہ شمار ہوگی۔

سوال جب نفاس والی عورت چالیس دنوں سے پہلے پاک ہو جائے تو کیا اس کا شوہر اس سے مجامعت کر سکتا ہے؟ اور اگر خون چالیس دنوں کے بعد دوبارہ جاری ہو جائے تو پھر کیا حکم ہے؟

جواب نفاس والی عورت سے اس کے شوہر کے لیے جماع کرنا جائز نہیں' اگر وہ چالیس دنوں سے پہلے پاک ہو جائے تو پھر اس کے لیے نماز پڑھنا واجب ہے' اس کی نماز صحیح ہوگی اور اس حالت میں اس کے شوہر کے لیے اس سے جماع کرنا بھی جائز ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حیض کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَٱعْتَزِلُوا۟ ٱلنِّسَآءَ فِى ٱلْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ ٱللَّهُ ﴾ (البقرة: ۲/ ۲۲۲)

''اور تم سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دو وہ تو نجاست ہے' سو ایام حیض میں عورتوں سے کنارہ کش رہو اور جب تک پاک نہ ہو جائیں' ان سے ہم بستری نہ کرو' ہاں جب پاک ہو جائیں تو جس طریق سے اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے ان کے پاس جاؤ۔''

جب تک نجاست یعنی خون موجود ہو تو جماع جائز نہیں ہے اور جب عورت پاک ہو جائے تو پھر جائز ہے۔ نماز پڑھنا واجب ہے' اسی طرح نفاس میں بھی اگر وہ چالیس دنوں سے پہلے پاک ہو جائے تو اس کے لیے وہ سارے کام جائز ہو جاتے ہیں جو نفاس کی

وجہ سے ناجائز تھے، لہٰذا اس کے شوہر کے لیے اس صورت میں ہم بستری بھی جائز ہے البتہ اسے صبر کرنا چاہیے تاکہ جماع کی وجہ سے دوبارہ خون جاری نہ ہو جائے حتی کہ وہ اپنے چالیس دن پورے کر لے لیکن اگر وہ چالیس دن پورے ہونے سے پہلے جماع کر لے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

اگر وہ چالیس دنوں کے بعد اور پاک ہونے کے بعد خون دیکھے تو اسے خون حیض قرار دیا جائے گا، خون نفاس نہیں۔ خون حیض کے بارے میں عورتوں کو خوب معلوم ہوتا ہے لہٰذا جب وہ محسوس کرے تو یہ خون حیض ہوگا اور اگر خون جاری ہی رہے اور بہت قلیل مدت کیلئے بند ہو تو یہ استحاضہ کا خون ہوگا۔ اس صورت میں اسے اپنی ماہانہ عادت کے مطابق بیٹھنا ہوگا اور پھر غسل کر کے نماز پڑھنا ہوگی۔

سوال اگر تیسرے مہینے عورت کا حمل ساقط ہو جائے تو کیا وہ نماز پڑھے گی یا (اسے نفاس شمار کر کے) نہیں (پڑھے گی)

جواب اہل علم کے ہاں یہ بات معروف ہے کہ عورت جب جنین کو اس وقت ساقط کرے، جب اس میں تخلیق واضح ہو گئی تو اس سے خارج ہونے والا خون نفاس کا خون ہوگا، لہٰذا وہ نماز نہیں پڑھے گی۔ علماء نے کہا ہے کہ جنین کی تخلیق کا واضح ہونا اس وقت بھی ممکن ہے، جب اس کے اکیاسی دن پورے ہو گئے ہوں اور یہ مدت تین ماہ سے کم ہے، لہٰذا جب عورت کو یہ یقین ہو کہ تین ماہ کا جنین ساقط ہوا ہے، تو اس صورت میں اسے آنے والا خون نفاس کا خون ہوگا جب کہ اس دن سے پہلے آنے والا خون فاسد خون ہوگا، اس کی وجہ سے وہ نماز ترک نہ کرے۔ اس سائل عورت کو اپنے بارے میں یاد کرنا چاہیے، اگر جنین اس دن سے پہلے ساقط ہوا ہے تو یہ نماز ادا کرے گی اور اگر اسے مدت یاد نہ ہو تو یہ خوب سوچ بچار سے کام لے اور اپنے ظن غالب کے مطابق فیصلہ کر لے۔

استحاضہ کے خون کے دوران میں عورت نماز کیسے پڑھے؟

سوال جس عورت کو استحاضہ کا خون جاری ہو، وہ نماز کیسے پڑھے؟ اور روزہ کب رکھے؟

جواب جب عورت کو استحاضہ کا خون جاری ہو تو اس کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ اس عارضہ سے قبل اپنی سابقہ عادت کی مدت میں نماز اور روزہ ادا نہ کرے مثلاً: اگر اس کی عادت یہ تھی کہ ہر ماہ کے ابتدائی چھ دن اسے حیض آتا تھا تو وہ ہر ماہ چھ دن بیٹھی رہے گی۔ ان دنوں میں نہ نماز پڑھے گی اور نہ روزہ رکھے گی۔ جب چھ دن گزر جائیں گے تو وہ غسل کر کے نماز روزہ شروع کر دے گی۔

اس طرح کی عورت کے لیے نماز کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی شرم گاہ کو خوب اچھی طرح دھو لے، پھر لنگوٹ باندھ لے اور وضو کر لے اور وہ ایسا فرض نماز کا وقت شروع ہونے کے بعد کرے، وقت شروع ہونے سے پہلے ایسا نہ کرے، اور پھر نماز پڑھ لے۔ اگر فرض نمازوں کے اوقات کے علاوہ دیگر اوقات میں وہ نفل پڑھنا چاہے، تو پھر بھی اسی طرح کرے۔ مشقت کی وجہ سے اس حالت میں اسکے لیے یہ بھی جائز ہے کہ ظہر کو عصر کے ساتھ یا عصر کو ظہر کے ساتھ اور مغرب کو عشاء کے ساتھ یا عشاء کو مغرب کے ساتھ جمع کر کے پڑھ لے تاکہ اسے ظہر وعصر کی دو نمازوں اور مغرب وعشاء کی دو نمازوں کے لیے ایک بار عمل کرنا پڑے اور ایک بار اسے نماز فجر کے لیے ایسا کرنا پڑے گا یعنی پانچ بار کی بجائے، وہ تین بار ایسا کرے، واللہ الموفق

نماز کن لوگوں پر واجب ہے؟

سوال نماز کے بارے میں کیا حکم ہے اور یہ کس پر واجب ہے؟

جواب نماز ارکان اسلام میں سے ایک ایسا رکن ہے‘ جس کے بارے میں سب سے زیادہ تاکید آئی ہے بلکہ شہادتین کے بعد یہ دوسرا بڑا اہم رکن ہے۔ اعضا کے ساتھ انجام دیے جانے والے اعمال میں سے اس کی سب سے زیادہ تاکید ہے۔ یہ اسلام کا ستون ہے جیسا کہ نبی ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

«عَمُودُهُ الصَّلاَةُ»(مسند أحمد: ٥/٢٣١ وجامع الترمذي، الإيمان، باب ماجاء في حرمة الصلاة، ح: ٢٦١٦ وقال: حديث حسن صحيح)

’’اس کا ستون نماز ہے۔‘‘

یعنی نماز اسلام کا ستون ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے نبی پر اس سب سے بلند جگہ پر فرض قرار دیا جس تک بشر پہنچ سکا ہے اور پھر اسے ایک اشرف (عظیم) رات میں بغیر کسی کے واسطہ کے فرض قرار دیا۔ اللہ عزوجل نے پہلے اپنے رسول محمد ﷺ پر دن رات میں پچاس بار نماز پڑھنا فرض قرار دیا تھا لیکن پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس میں تخفیف کر دی حتی کہ بالفعل پانچ مگر میزان میں (اجر وثواب کے اعتبار سے) پچاس ہوں گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کس قدر اہمیت ہے اور اسے اس سے کس قدر محبت ہے۔ یہ عبادت اس لائق ہے کہ انسان اس میں اپنا بہت سا وقت صرف کرے‘ اس کی فرضیت کتاب وسنت اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَإِذَا ٱطۡمَأۡنَنتُمۡ فَأَقِيمُواْ ٱلصَّلَوٰةَۚ إِنَّ ٱلصَّلَوٰةَ كَانَتۡ عَلَى ٱلۡمُؤۡمِنِينَ كِتَٰبٗا مَّوۡقُوتٗا ﴿١٠٣﴾ ﴾

(النساء: ٤/١٠٣)

’’پھر جب اطمینان نصیب ہو جائے تو (اس طرح سے) نماز پڑھو (جس طرح امن کی حالت میں پڑھتے ہو۔) بے شک نماز مومنوں پر اوقات (مقررہ) میں ادا کرنا فرض ہے۔‘‘

’’کتاباً‘ مکتوباً‘‘ یعنی فرض کے معنی میں ہے۔

اور نبی ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل ؓ کو یمن بھیجتے ہوئے ان سے فرمایا تھا:

«فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِي كُلِّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ»(صحيح البخاري، الزكاة، باب وجوب الزكاة، ح: ١٣٩٥ وصحيح مسلم، الإيمان، باب الدّعاء إلى الشهادتين وشرائع الإسلام، ح: ١٩)

’’لہٰذا انہیں آگاہ کر دو کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ہر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔‘‘

تمام مسلمانوں کا بھی نماز کی فرضیت پر اجماع ہے‘ اس لیے علماء ؒ نے فرمایا ہے کہ جب انسان پانچ فرض نمازوں یا ان میں سے کسی ایک کا انکار کر دے تو وہ کافر مرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہے‘ اس کا خون اور مال مباح ہے الا یہ کہ وہ اللہ عزوجل کے

آگے توبہ کر لے۔ ہاں! اگر وہ ایسا نیا نیا مسلمان ہو جسے ابھی تک شعائر اسلام کے بارے میں کچھ بھی علم نہ ہو تو اس حالت میں جہالت کی وجہ سے وہ معذور ہوگا' پھر اسے بتایا جائے گا۔ اگر اس کے وجوب کے بارے میں علم ہو جانے کے بعد بھی وہ اس کی فرضیت کا انکار کرے تو وہ کافر ہوگا۔

نماز ہر مسلمان بالغ' عاقل' مرد اور عورت پر فرض ہے۔ مسلمان کی ضد کافر ہے' اور کافر پر نماز واجب نہیں ہے یعنی حالت کفر میں اس کے لیے نماز ادا کرنا اور مسلمان ہونے کے بعد اس کی قضا ادا کرنا لازم نہیں ہے۔ البتہ قیامت کے دن اسے (کافر کو) اس کی سزا ملے گی جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِلَّآ أَصۡحَٰبَ ٱلۡيَمِينِ ۝٣٩ فِي جَنَّٰتٖ يَتَسَآءَلُونَ ۝٤٠ عَنِ ٱلۡمُجۡرِمِينَ ۝٤١ مَا سَلَكَكُمۡ فِي سَقَرَ ۝٤٢ قَالُواْ لَمۡ نَكُ مِنَ ٱلۡمُصَلِّينَ ۝٤٣ وَلَمۡ نَكُ نُطۡعِمُ ٱلۡمِسۡكِينَ ۝٤٤ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ ٱلۡخَآئِضِينَ ۝٤٥ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوۡمِ ٱلدِّينِ ۝٤٦ ﴾

(المدثر: ٧٤/ ٣٩-٤٦)

''مگر داہنی طرف والے (نیک لوگ کہ) وہ بہشت کے باغوں میں (ہوں گے اور) پوچھتے ہوں گے (آگ میں جلنے والے) گنہگاروں سے کہ تم دوزخ میں کیوں پڑے؟ وہ جواب دیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور نہ فقیروں کو کھانا کھلاتے تھے اور ہم اہل باطل کے ساتھ مل کر (حق سے) انکار کرتے تھے اور ہم روز جزا کو جھٹلاتے تھے۔''

ان کا یہ کہنا کہ: [لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ] ''ہم نماز نہیں پڑھتے تھے'' اس بات کی دلیل ہے کہ انھیں کفر اور قیامت کے دن کی تکذیب کے ساتھ ساتھ ترک نماز کی وجہ سے بھی سزا دی جائے گی۔

اور بالغ وہ ہے جس میں علامات بلوغ میں سے کوئی علامت پائی جائے۔ علامات بلوغ مرد کی نسبت سے تین اور عورت کی نسبت سے چار ہیں: ① عمر پوری پندرہ سال ہو جائے ② بیداری یا نیند میں لذت کے ساتھ منی کا انزال ③ زیر ناف بالوں کا اگنا یعنی قُبل کے ارد گرد کھردرے بالوں کا اگنا۔ یہ تینوں علامتیں مردوں اور عورتوں میں مشترک ہیں جب کہ عورتوں میں ایک چوتھی علامت حیض بھی علامات بلوغ میں شمار ہوتی ہے۔

عاقل کی ضد مجنون ہے یعنی جس میں عقل نہ ہو' بہت بڑی عمر کا مرد اور عورت جس کا بڑھاپا اس حد تک پہنچ جائے کہ اسے ہوش نہ رہے تو وہ بھی اسی قبیل میں شمار ہوگا۔ اس قسم کے آدمی کو ہمارے ہاں مہذری (سٹھیایا ہوا) کہا جاتا ہے۔ عقل باقی نہ رہنے کی وجہ سے ایسے شخص پر بھی نماز واجب نہ رہے گی۔ حیض و نفاس بھی وجوب نماز سے مانع ہیں۔ جب حیض یا نفاس ہو تو نماز واجب نہ ہوگی کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«أَلَيْسَ إِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ، وَلَمْ تَصُمْ» (صحيح البخاري، الحيض، باب ترك الحائض الصوم، ح: ٣٠٤)

''کیا یہ بات نہیں کہ عورت جب حائضہ ہوتی ہے تو نماز پڑھتی ہے نہ روزہ رکھتی ہے۔''

کیا بے ہوش اور دیوانے پر شرعی احکام لاگو ہوتے ہیں؟

سوال جس شخص کی یادداشت ختم ہو جائے اور جو بے ہوش ہو' کیا ان کے لیے بھی شرعی احکام لازم ہیں؟

جواب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسان پر عبادات کو اسی صورت میں واجب قرار دیا ہے جب وہ وجوب کا اہل ہو یعنی وہ صاحب عقل ہو اور اسے اشیا کا ادراک ہو، لہٰذا جو شخص بے عقل ہو اس کے لیے احکام شریعت لازم نہیں ہیں۔ اسی طرح وہ چھوٹا بچہ جسے برے بھلے کی تمیز نہ ہو اس پر بھی لازم نہیں ہے بلکہ وہ بچہ جو ابھی بالغ نہ ہو وہ بھی مکلف نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر رحمت ہے' اسی طرح وہ پاگل جو ابھی حد جنون کو نہ پہنچا ہو اور بڑی عمر کا وہ شخص جس کی یادداشت ختم ہوگئی ہو ان پر بھی نہ نماز واجب ہے اور نہ روزہ کیونکہ جس شخص کی یادداشت ختم ہوگئی ہو وہ اس بچے کی طرح ہے جسے اچھی بری بات میں تمیز نہ ہو' اُس سے احکام شریعت کی پابندی ساقط ہوگی اور لازم نہیں ہوگی۔

جہاں تک مالی واجبات کا تعلق ہے تو وہ اس کے مال میں واجب ہوں گے خواہ اس کی یادداشت ختم ہوگئی ہو مثلاً: زکوٰۃ اس کے مال میں واجب ہوگی۔ اس کے ولی کے لیے واجب ہوگا کہ وہ اس کے مال میں سے زکوٰۃ ادا کرے کیونکہ وجوب زکوٰۃ کا تعلق مال سے ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم﴾ (التوبة: ٩/ ١٠٣)

''ان کے مال میں سے زکوٰۃ قبول کرلو کہ اس سے تم ان کو (ظاہر میں بھی) پاک اور (باطن میں بھی) پاکیزہ کرتے ہو۔''

تو یہاں یہ فرمایا ہے کہ ﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ﴾ ''ان کے مال میں سے قبول کرلو'' اور یہ نہیں فرمایا کہ ان سے قبول کرلو اور نبی ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے ہوئے فرمایا تھا:

«فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِي أَمْوَالِهِمْ تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلَى فُقَرَائِهِمْ»(صحيح البخاري، الزكاة، باب وجوب الزكاة، ح: ١٣٩٥ وصحيح مسلم، الإيمان، باب الدعاء إلى الشهادتين وشرائع الاسلام، ح: ١٩)

''لہٰذا انہیں آگاہ کردو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں میں صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے فقیروں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔''

لہٰذا مالی واجبات اس شخص سے بھی ساقط نہیں ہوتے جس کی یادداشت ختم ہوگئی ہو۔ لیکن بدنی عبادتیں مثلاً: نماز' طہارت اور روزہ اس جیسے شخص سے ساقط ہو جائیں گی کیونکہ وہ بے عقل ہے۔ اور جس شخص کی عقل بے ہوشی اور مرض وغیرہ کی وجہ سے زائل ہو جائے' تو اکثر اہل علم کے قول کے مطابق اس پر نماز واجب نہیں ہے لہٰذا اگر مریض ایک یا دو دن بے ہوش رہے تو اس پر قضا لازم نہیں ہے کیونکہ اس میں عقل نہیں ہے اور اسے سوئے ہوئے انسان کی طرح بھی قرار نہیں دیا جا سکتا' جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ نَسِيَ صَلَاةً أَوْ نَامَ عَنْهَا فَكَفَّارَتُهَا أَنْ يُصَلِّيَهَا إِذَا ذَكَرَهَا»(صحيح البخاري، المواقيت،

باب من نسي صلاة فليصل إذا ذكر، ح:٥٩٧ وصحيح مسلم، المساجد، باب قضاء الصلاة الفائتة، ح:٦٨٤(٣١٥) واللفظ له)

’’جو شخص کوئی نماز بھول جائے یا اس سے سویا رہے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے جب یاد آئے، اسے پڑھ لے۔‘‘

کیونکہ سوئے ہوئے شخص میں ادراک ہے کہ اسے اگر بیدار کیا جائے تو وہ بیدار ہو سکتا ہے لیکن بے ہوشی میں مبتلا انسان کو اگر بیدار کیا جائے تو وہ بیدار نہیں ہو سکتا، یہ اس صورت میں ہے جب بے ہوشی بغیر سبب کے ہو اور اگر اس کا کوئی سبب ہو مثلاً بھنگ وغیرہ کے استعمال کی وجہ سے بے ہوش ہوا ہو تو اسے بے ہوشی میں گزری ہوئی نمازوں کی قضا ادا کرنی ہوگی۔ واللہ اعلم۔

سوال ایک شخص کو دو مہینے کسی بھی چیز کا شعور نہ رہا، جس کی وجہ سے اس نے نماز پڑھی اور نہ رمضان کے روزے رکھے، تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب شعور گم ہونے کی وجہ سے اس پر کچھ بھی واجب نہیں لیکن اللہ کرے کہ اگر اسے افاقہ ہو جائے تو رمضان کی قضا اس پر لازم ہوگی اور اگر وہ قضائے الٰہی سے فوت ہو جائے تو اس کے ذمہ کچھ نہ ہوگا اور اگر وہ دائمی طور پر معذور لوگوں میں سے ہو جیسے بہت بوڑھا تو اس پر فرض یہ ہے کہ اس کا ولی اس کی طرف سے ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ نماز کی قضا کے بارے میں علماء کے دو قول ہیں:

① جمہور کا قول ہے کہ اس کے ذمہ قضا نہیں ہے کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما پر ایک دن رات بے ہوشی طاری رہی تو انھوں نے اس دوران میں فوت ہو جانے والی نمازوں کی قضا نہیں دی تھی۔ ①

② اس پر قضا لازم ہے، یہ متاخرین حنابلہ کا مذہب ہے۔ ’’الانصاف‘‘ میں لکھا ہے کہ یہ تفردات مذہب میں سے ہے اور اس کی دلیل حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کے بارے میں مروی یہ قول ہے کہ ان پر ایک دن رات بے ہوشی طاری رہی تو انھوں نے اس عرصہ میں فوت ہو جانے والی نمازوں کی قضا دی تھی۔ ②

کیا شروطِ نماز کی تکمیل کی خاطر نماز مؤخر کی جا سکتی ہے؟

سوال کیا انسان کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ نماز کی شروط میں سے کسی شرط کے حاصل کرنے کی وجہ سے نماز کو مؤخر کرے مثلاً وہ پانی نکالنے میں مشغول ہو؟

جواب صحیح بات یہ ہے کہ نماز کو اپنے وقت سے مؤخر کرنا بالکل جائز نہیں ہے، جب انسان کو وقت ختم ہو جانے کا اندیشہ ہو تو وہ اپنے حال کے مطابق نماز پڑھ لے خواہ حصول شرط عنقریب ممکن ہو کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ ٱلصَّلَوٰةَ كَانَتْ عَلَى ٱلْمُؤْمِنِينَ كِتَٰبًا مَّوْقُوتًا ﴿١٠٣﴾﴾ (النساء: ٤/ ١٠٣)

’’بے شک نماز مومنوں پر اوقات (مقررہ) میں ادا کرنا فرض ہے۔‘‘

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اوقات مقررہ کا تعین فرما دیا ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ نماز کو اس کے وقت میں ادا کرنا واجب ہے۔ اگر شرطوں کے حصول کے لیے انتظار کرنا جائز ہوتا تو پھر تیمم کو مشروع قرار دینا صحیح نہ ہوتا کیونکہ ممکن ہے کہ وقت کے بعد پانی حاصل

---

① ’’المصنف‘‘ لعبد الرزاق:479/2 ② ’’المصنف‘‘ لعبد الرزاق:479/2

ہو جائے اور اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں کہ نماز کو طویل عرصے تک مؤخر کیا جائے یا قلیل عرصے تک کیونکہ دونوں صورتوں میں نماز اپنے وقت سے خارج ہو جاتی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اسی بات کو اختیار کیا ہے کہ نماز کو مؤخر نہ کیا جائے۔

کیا غلبۂ نیند کی وجہ سے نماز فجر کو مؤخر کرنے کی عادت بنا لینا جائز ہے؟

سوال جو شخص رات کو بیدار رہتا ہے اور نماز فجر وقت ختم ہو جانے کے بعد پڑھتا ہے تو کیا اس کی نماز قبول ہو جاتی ہے؟ دیگر نمازیں، جنہیں وہ وقت پر ادا کرتا ہے ان کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب نماز فجر جسے وہ وقت سے مؤخر کر کے ادا کرتا ہے، جب کہ اسے وقت پر ادا کرنا اس کے لیے ممکن ہے کیونکہ اگر وہ چاہے تو رات کو جلد سو سکتا ہے، اس کی یہ نماز قبول نہیں ہو گی کیونکہ آدمی جب نماز کو بغیر عذر کے وقت سے مؤخر کر کے پڑھے تو اس کی نماز قبول نہیں ہوتی جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة ورد محدثات الأمور، ح:١٧١٨(١٨))

’’جس نے کوئی ایسا عمل کیا، جس کے بارے میں ہمارا امر نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔‘‘

جو شخص جان بوجھ کر بلا عذر نماز کو وقت سے مؤخر کرتا ہے تو وہ ایک ایسا عمل کرتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم نہیں دیا لہٰذا وہ مردود ہے۔ اگر وہ یہ کہے کہ میں سویا ہوتا ہوں اور سوئے ہوئے شخص کے بارے میں نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ نَسِيَ صَلاَةً أَوْ نَامَ عَنْهَا فَكَفَّارَتُهَا أَنْ يُصَلِّيَهَا إِذَا ذَكَرَهَا - وفي رواية: "لاَ كَفَّارَةَ لَهَا إِلاَّ ذٰلِكَ"»(صحيح مسلم، المساجد، باب قضاء الصلاة الفائتة، ح:٦٨٤(٣١٤))

’’جو شخص کوئی نماز بھول جائے یا وہ اس سے سویا رہے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے جب یاد آئے پڑھ لے۔‘‘

اور ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ ’’اس کا بس یہی کفارہ ہے۔‘‘

تو ہم کہیں گے اس کے لیے ممکن تھا کہ جلد سو جاتا تاکہ جلد بیدار ہوتا یا اپنے پاس الارم لگا کر گھڑی رکھ لیتا یا کسی کو کہہ دیتا کہ وہ اسے بیدار کر دے لہٰذا اس کا نماز کو مؤخر کرنا اور وقت پر ادا نہ کرنا، نماز کو عملاً مؤخر کرنا قرار پائے گا، لہٰذا یہ نماز قبول نہ ہو گی۔ باقی نمازیں جنہیں وہ وقت پر ادا کرتا ہے وہ قبول ہوں گی۔ اس مناسبت سے یہاں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمان کے لیے واجب ہے کہ وہ عبادت اس طرح کرے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے کیونکہ دنیا کی اس زندگی میں وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اسے کب موت آ جائے اور وہ عالم آخرت اور دار جزا کی طرف سدھار جائے جہاں کوئی عمل نہیں ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِذَا مَاتَ الإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلاَّ مِنْ ثَلاَثَةٍ: إِلاَّ مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ»(صحيح مسلم، الوصية، باب ما يلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته، ح:١٦٣١(١٤))

”جب انسان فوت ہو جائے تو تین صورتوں کے سوا اس کے دیگر اعمال منقطع ہو جاتے ہیں: صدقہ جاریہ، علم، جس کے ساتھ نفع حاصل کیا جا رہا ہو یا نیک اولاد، جو اس کے لیے دعا کرتی ہو۔“

سوال جو شخص نماز فجر کو اس قدر مؤخر کرتا ہو کہ اس کا وقت ہی نکل جاتا ہو تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب یہ لوگ جو نماز فجر کو اس قدر تاخیر سے ادا کریں کہ اس کا وقت ہی ختم ہو جائے، اگر وہ یہ عقیدہ رکھیں کہ یہ حلال ہے تو یہ اللہ عزوجل کے ساتھ کفر ہے کیونکہ جو شخص بلا عذر نماز کو اس کے وقت سے مؤخر کرنے کو حلال سمجھے تو وہ کتاب وسنت اور اجماع امت کی مخالفت کی وجہ سے کافر ہے۔ اگر وہ اسے حلال نہ سمجھے اور تاخیر کی وجہ سے اپنے آپ کو گناہ گار تصور کرے لیکن اس پر نفس کا اور نیند کا غلبہ ہو تو اسے اللہ تعالیٰ کے آگے توبہ کرنی چاہیے اور اس فعل کو ترک کر دینا چاہیے۔ توبہ کا دروازہ کھلا ہے حتی کہ سب سے بڑے کافر کے لیے بھی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ۞ قُلۡ يَٰعِبَادِيَ ٱلَّذِينَ أَسۡرَفُواْ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمۡ لَا تَقۡنَطُواْ مِن رَّحۡمَةِ ٱللَّهِۚ إِنَّ ٱللَّهَ يَغۡفِرُ ٱلذُّنُوبَ جَمِيعًاۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلۡغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ ۝٥٣ ﴾ (الزمر: ۳۹/ ۵۳)

”اے پیغمبر (میری طرف سے) لوگوں سے کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا، بے شک اللہ سب گناہوں کو بخش دیتا ہے بلاشبہ وہی تو بخشنے والا مہربان ہے۔“

جس شخص کو ایسے کاموں کا علم ہو وہ انھیں نصیحت کرے اور نیکی کی طرف توجہ دلائے۔ اگر وہ توبہ کر لیں تو بہت بہتر ورنہ وہ اس سلسلہ میں متعلق اداروں سے اس کی شکایت کرے تاکہ وہ خود بری الذمہ ہو جائے اور تاکہ ذمہ دار ادارے اس طرح کے لوگوں کو ادب سکھا سکیں۔ واللہ الموفق.

کیا بے نماز کو بیٹی کا رشتہ دینا جائز ہے؟

سوال جب کوئی شخص کسی سے اس کی بیٹی کا رشتہ طلب کرے اور اس کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ نماز نہیں پڑھتا اور جس سے اس کے بارے میں پوچھا گیا ہو وہ یہ کہے کہ اللہ اسے ہدایت دے دے گا تو کیا ایسی صورت میں وہ اسے رشتہ دے دے؟

جواب اگر رشتہ طلب کرنے والا باجماعت نماز ادا نہیں کرتا تو وہ فاسق، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا نافرمان اور مسلمانوں کے اس اجماع کا مخالف ہے کہ نماز باجماعت ادا کرنا سب سے افضل عبادت ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ ؒ مجموع الفتاویٰ (222/23) میں فرماتے ہیں کہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نماز باجماعت ایک ایسی عبادت ہے جس کی سب سے زیادہ تاکید آئی ہے۔ یہ سب سے بڑی اطاعت اور شعائر اسلام میں سب سے عظیم شعار ہے، تاہم اس فسق کی وجہ سے وہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوگا، لہٰذا اس کے لیے کسی مسلمان عورت سے شادی کرنا جائز ہے لیکن دوسرے لوگ جنہیں دین واخلاق پر استقامت ہو، اس سے بہتر ہوں گے، خواہ وہ مال ودولت اور حسب ونسب کے اعتبار سے اس سے کم مرتبہ ہوں جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

«إِذَا جَاءَ كُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِينَهُ وَخُلُقَهُ فَأَنْكِحُوهُ إِلاَّ تَفْعَلُوا تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الأَرْضِ وَفَسَادٌ إِلاَّ تَفْعَلُوا تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الأَرْضِ وَفَسَادٌ، قَالُوا: يَارَسُولَ اللهِ وَإِنْ كَانَ فِيهِ؟ قَالَ: إِذَا جَاءَ كُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِيْنَهُ وَخُلُقَهُ فَأَنْكِحُوهُ ـ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ»(جامع الترمذي، النكاح، باب ماجاء

فیمن ترضون دینه وخلقه فزوجوه، ح:١٠٨٥ وقال الترمذي: هذا حديث حسن غريب وسنن ابن ماجه، النكاح، باب الأكفاء، ح:١٩٦٧)

”جب تمھارے پاس کوئی ایسا شخص آئے‘ جس کے دین واخلاق کو تم پسند کرتے ہو تو اسے نکاح دے دو‘ اگر ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ وفساد پیدا ہو جائے گا۔“ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! اگر اس میں کوئی بات موجود ہو؟ آپ نے فرمایا: جب تمھارے پاس کوئی ایسا شخص آئے‘ جس کے دین واخلاق کو تم پسند کرتے ہو تو اسے نکاح دے دو‘ آپ نے تین بار یہ فرمایا۔“

نیز صحیحین اور دیگر کتب میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لأَرْبَعٍ: لِمَالِهَا، وَلِحَسَبِهَا، وَلِجَمَالِهَا، وَلِدِينِهَا، فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّينِ تَرِبَتْ يَدَاكَ»(صحيح البخاري، النكاح، باب الأكفاء في الدين، ح:٥٠٩٠ وصحيح مسلم، الرضاع، باب استحباب نكاح ذات الدين، ح:١٤٦٦ واللفظ له)

”عورت سے چار چیزوں کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے: اس کے مال کی وجہ سے‘ اس کے حسب کی وجہ سے‘ اس کے جمال کی وجہ سے اور اس کے دین کی وجہ سے۔ تم دین والی عورت سے نکاح میں کامیابی حاصل کرو‘ تمھارے دونوں ہاتھ خاک آلودہ ہوں۔“

یہ دونوں حدیثیں اس بات کی دلیل ہیں کہ مرد اور عورت کے سلسلہ میں دین اور خلق کے پہلو کو سب سے زیادہ ترجیح دی جائے‘ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور اپنی ذمہ داری کا احساس کرنے والے کو چاہیے کہ وہ سب سے زیادہ اہمیت اس بات کو دے جس کی طرف نبی ﷺ نے رہنمائی فرمائی ہے کیونکہ روز قیامت اس سے اس بارے میں پوچھا جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَآ أَجَبْتُمُ ٱلْمُرْسَلِينَ ۝٦٥﴾ (القصص:٢٨/ ٦٥)

”اور جس روز وہ (اللہ) ان کو بلائے گا اور کہے گا کہ تم نے پیغمبروں کو کیا جواب دیا۔“

اور فرمایا:

﴿ فَلَنَسْـَٔلَنَّ ٱلَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ ٱلْمُرْسَلِينَ ۝٦ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِم بِعِلْمٍ ۖ وَمَا كُنَّا غَآئِبِينَ ۝٧﴾ (الأعراف:٧/ ٦-٧)

”تو جن لوگوں کی طرف پیغمبر بھیجے گئے ہم ان سے بھی پرسش کریں گے اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے‘ پھر اپنے علم سے ان کے حالات بیان کریں گے اور ہم کہیں غائب تو نہیں تھے۔“

اگر رشتہ طلب کرنے والا بالکل نماز نہ پڑھتا ہو‘ نہ جماعت کے ساتھ اور نہ انفرادی طور پر تو یہ کافر اور خارج از اسلام ہے۔ ضروری ہے کہ اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے۔ اگر وہ توبہ کر کے نماز پڑھنا شروع کر دے‘ تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالے گا بشرطیکہ توبہ پکی اور سچی ہو اور خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کی گئی ہو ورنہ کافر اور مرتد ہونے کی وجہ سے اسے قتل کر دیا جائے گا اور غسل‘ کفن اور نماز جنازہ کے بغیر اسے غیر مسلموں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔ اس شخص کے کفر پر کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ سے بہت سے دلائل موجود ہیں۔ کتاب اللہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ۞ فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ أَضَاعُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَٱتَّبَعُواْ ٱلشَّهَوَٰتِۖ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ﴿٥٩﴾ إِلَّا مَن تَابَ وَءَامَنَ﴾ (مریم: ۱۹/ ۵۹۔۶۰)

’’پھر ان کے بعد چند ناخلف ان کے جانشین ہوئے، جنھوں نے نماز کو چھوڑ دیا (گویا اسے کھو دیا) اور خواہشات نفسانی کے پیچھے لگ گئے، سو عنقریب ان کو گمراہی (کی سزا) ملے گی، ہاں جس نے توبہ کی اور ایمان لایا۔‘‘

﴿إِلَّا مَنۡ تَابَ وَءَامَنَ﴾ کے الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ جب اس نے نماز ضائع کی اور خواہشات نفسانی کی پیروی کی تو اس وقت وہ مومن نہیں رہا۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَإِن تَابُواْ وَأَقَامُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُاْ ٱلزَّكَوٰةَ فَإِخۡوَٰنُكُمۡ فِي ٱلدِّينِۗ﴾ (التوبة: ۹/ ۱۱)

’’اگر یہ توبہ کر لیں اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے لگیں تو وہ دین میں تمھارے بھائی ہیں۔‘‘

یہ آیت کریمہ اس بات کی دلیل ہے کہ دینی اخوت اقامت صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ ہی کے ساتھ ہو سکتی ہے، البتہ سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ تارک زکوٰۃ کو کافر قرار نہیں دیا جائے گا جب کہ وہ اس کے وجوب کا تو اقرار کرے مگر محض بخل کی وجہ سے زکوٰۃ ادا نہ کرے لہٰذا اب ایمانی اخوت کے ثبوت کے لیے اقامت نماز ہی کی شرط باقی رہ گئی ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ ترک نماز کفر ہو اور اس کی وجہ سے ایمانی اخوت کی نفی ہو جائے۔ یاد رہے ترک نماز فسق یا کفر دون کفر نہیں ہے کیونکہ فسق یا کفر دون کفر، فاعل کو ایمانی اخوت کے دائرے سے خارج نہیں کرتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آپس میں لڑائی کرنے والی مومنوں کی دو جماعتوں کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿ إِنَّمَا ٱلۡمُؤۡمِنُونَ إِخۡوَةٞ فَأَصۡلِحُواْ بَيۡنَ أَخَوَيۡكُمۡۚ﴾ (الحجرات: ۴۹/ ۱۰)

’’مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں، لہٰذا تم اپنے دو بھائیوں میں صلح کرا دیا کرو۔‘‘

آپس میں لڑائی کرنے والی یہ دونوں جماعتیں اخوت ایمانی کے دائرے سے خارج نہیں ہوئیں، حالانکہ مومن سے قتال کرنا کفر ہے جیسا کہ اس صحیح حدیث میں ہے، جسے امام بخاری ؒ اور کئی دیگر محدثین نے بروایت حضرت ابن مسعود ؓ بیان کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ، وَقِتَالُهُ كُفْرٌ»(صحيح البخاري، الإيمان، باب خوف المؤمن من أن يحبط عمله وهو لا يشعر، ح:٤٨ وصحيح مسلم، الإيمان، باب بيان قول النبي ﷺ: "سباب المسلم فسوق ..."، ح:٦٤)

’’مسلمان کو گالی دینا فسق اور اسے قتل کرنا کفر ہے۔‘‘

تارک نماز کے کفر کے سنت سے دلائل میں سے چند حسب ذیل ہیں:

حضرت جابر بن عبداللہ ؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

«إِنَّ بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكَ الصَّلَاةِ»(صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان إطلاق الكفر على من ترك الصلاة، ح:٨٢)

’’بے شک آدمی اور شرک و کفر کے درمیان فرق، نماز کا چھوڑنا ہے۔‘‘

نیز حضرت بریدہ بن حصیب ؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«اَلْعَهْدُ الَّذِی بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمُ الصَّلاَةُ، فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ»(جامع الترمذی، الإيمان، باب ماجاء في ترك الصلاة، ح:٢٦٢١ وسنن النسائي، الصلاة، باب الحكم في تارك الصلاة، ح:٤٦٤، وسنن ابن ماجه، إقامة الصلاة، باب ماجاء فيمن ترك الصلاة، ح:١٠٧٩، ومسند أحمد:٥/٣٤٦)

”ہمارے اوران کے درمیان عہد نماز کا ہے۔ جس نے اسے ترک کر دیا اس نے کفر کیا۔“

حضرت عبادہ بن صامت ؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ سے اس بات پر بیعت کی کہ وہ اہل حکومت سے حکومت کے بارے میں نہیں جھگڑیں گے الآیہ کہ تم ان کے ہاں کھلم کھلا کفر دیکھو جس میں تمھارے پاس اللہ کی طرف سے برہان موجود ہو۔ ①

اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ وہ حکمرانوں سے اس بارے میں جھگڑا نہیں کریں گے' جس کا اللہ تعالیٰ نے انھیں حاکم بنادیا ہے الآیہ کہ وہ ان کی طرف سے کسی صریح کفر کا ارتکاب دیکھیں' جس کے کفر ہونے کے بارے میں ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلیل موجود ہو۔ اس حدیث کے مفہوم کو سمجھنے کے بعد اس حدیث کو بھی دیکھیں جسے امام مسلم ؒ نے بروایت حضرت ام سلمہ ؓ بیان کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«سَتَكُونُ أُمَرَاءُ فَتَعْرِفُونَ وَتُنْكِرُونَ فَمَنْ عَرَفَ بَرِيءَ - وفي لفظ - فَمَنْ كَرِهَ فَقَدْ بَرِيءَ وَمَنْ أَنْكَرَ سَلِمَ وَلَكِنْ مَنْ رَضِيَ وَتَابَعَ - قالوا: أَفَلَا نُقَاتِلُهُمْ؟ قال: "لاَ، مَا صَلُّوا"» (صحيح مسلم، الإيمان، باب وجوب الإنكار على الأمراء فيما يخالف الشرع وترك قتالهم ما صلوا، ونحو ذلك، ح:١٨٥٤)

”عنقریب ایسے حکمران ہوں گے جن کو تم پہچان لو گے اور ان کا انکار کرو گے۔ جس نے پہچان لیا وہ بری ہوگیا۔“ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ”جس نے ان کو ناپسند کیا' وہ بری ہوگیا۔ جس نے انکار کیا وہ سلامت رہا لیکن جو خوش ہوگیا اور جس نے ان کا اتباع کیا (تو وہ ہلاک ہوگیا)“ صحابۂ کرام ؓ نے عرض کیا: کیا ہم ان کے خلاف لڑائی نہ کریں؟ فرمایا: ”نہیں جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں (لڑائی نہ کرو۔“)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب وہ نماز پڑھیں تو پھر ان سے لڑائی نہیں کی جائے گی اور اس سے پہلے مذکور حدیثِ عبادہ ؓ سے معلوم ہوا کہ ان سے جھگڑا نہیں کیا جائے گا' جب جھگڑا نہیں کیا جائے گا تو لڑائی بالاولیٰ نہیں کی جائے گی الآیہ کہ وہ کفر صریح کا ارتکاب کریں جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے برہان موجود ہو۔ ان دو حدیثوں سے معلوم ہوا کہ ترک نماز کفر صریح ہے اور اس کے (کفر ہونے کے) بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے برہان موجود ہے۔ یہ ہیں کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے دلائل کہ تارک نماز کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے جیسا کہ صراحت کے ساتھ اس حدیث میں بھی آیا ہے' جسے ابن ابی حاتم نے اپنی سنن میں حضرت عبادہ بن صامت ؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہ وصیت فرمائی:

---

① صحيح البخارى' الفتن' باب قول النبى ﷺ سترون بعدى أموراً...... حديث : 7056

«لاَ تُشْرِكُوا بِاللهِ شَيْئًا وَإِنْ قُطِّعْتُمْ أَوْ حُرِّقْتُمْ أَوْصُلِّبْتُمْ وَلاَ تَتْرُكُوا الصَّلاَةَ مُتَعَمِّدًا فَمَنْ تَرَكَهَا مُتَعَمِّدًا فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْمِلَّةِ»(مجمع الزوائد للهيثمي: ٤/ ٢١٦)

’’اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ‘ خواہ تمھیں کاٹ دیا جائے یا جلا دیا جائے یا سولی پر لٹکا دیا جائے‘ اور نماز جان بوجھ کر ترک نہ کرو کیونکہ جو شخص جان بوجھ کر اسے ترک کرے‘ وہ ملت سے خارج ہو جاتا ہے۔‘‘

اس بارے میں حضرات صحابۂ کرام ؓ سے آثار بھی موجود ہیں مثلاً: حضرت عمر بن خطاب ؓ نے فرمایا ہے:

«لاَ إِيمَانَ لِمَنْ لاَ صَلاَةَ لَهُ»(الترغيب والترهيب: ١/ ٣٨١ صحيح موقوفًا)

’’جس کی نماز نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں۔‘‘

عبداللہ بن شقیق ؒ نے کہا ہے کہ:

«كَانَ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ ﷺ لاَ يَرَوْنَ شَيْئًا مِّنَ الأَعْمَالِ تَرْكُهُ كُفْرٌ غَيْرَ الصَّلاَةِ»(جامع الترمذي، الإيمان، باب ماجاء في ترك الصلاة، ح: ٢٦٢٢)

’’اصحاب محمد ﷺ نماز کے سوا اور کسی عمل کے ترک کو کفر قرار نہیں دیتے تھے۔‘‘

جہاں نقلی دلیل تارک نماز کو کافر قرار دیتی ہے‘ وہاں نظری دلیل سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ امام احمد ؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص نماز کو حقیر جانے اور اس کی توہین کرے‘ تو وہ اسلام کو حقیر جانتا اور اس کی توہین کرتا ہے۔ اسلام میں ان کا حصہ اتنا ہوگا‘ جتنا نماز میں ان کا حصہ ہے‘ اسلام میں ان کی رغبت اتنی ہوگی‘ جتنی نماز میں ان کی رغبت ہے۔

امام ابن قیم ؒ فرماتے ہیں کہ وہ شخص ترک نماز پر ہمیشہ اصرار نہیں کرسکتا‘ جو اس بات کی تصدیق کرتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے کیونکہ عادت اور طبیعت کے اعتبار سے یہ بات محال ہے کہ آدمی اس بات کی پکی سچی تصدیق بھی کرتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دن رات میں اس پر پانچ نمازوں کو فرض قرار دیا ہے اور وہ ان کے ترک کر دینے کی وجہ سے سخت ترین سزا دے گا اور اس کے باوجود وہ ترک نماز پر اصرار کرے۔ یہ بات قطعی طور پر محال ہے کیونکہ جو شخص اس کی فرضیت کی تصدیق کرتا ہو وہ کبھی اسے ترک نہیں کرسکتا کیونکہ ایمان اسے نماز پڑھنے کا حکم دے گا۔ اگر اس کے دل میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اسے نماز کا حکم دے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا دل ایمان سے خالی ہے‘ اس شخص کی بات کو نہ سنو‘ جسے دلوں کے احکام اور اعمال کی خبر ہے نہ علم۔ ①

امام ابن قیم ؒ نے یہ بالکل سچ بیان فرمایا ہے کہ انسان کے دل میں ایمان ہو تو یہ محال ہے کہ وہ نماز کو ترک کرے کیونکہ اسے بہت آسانی سے ادا کیا جاسکتا ہے‘ اسے ادا کرنے سے بہت زیادہ ثواب ملے گا‘ ترک کرنے کی صورت میں عذاب بھی بہت زیادہ ہوگا۔ جب کتاب وسنت کے دلائل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ تارک نماز کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے تو پھر یہ حلال نہیں کہ وہ کسی مسلمان عورت سے شادی کرے کیونکہ نص اور اجماع سے اس کی حرمت ثابت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَنكِحُوا۟ ٱلْمُشْرِكَٰتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ ۚ وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ ﴾

(البقرة: ٢/ ٢٢١)

---

① مجموعة الحديث‘ الصلاة ص: 400

''اور (مومنو) مشرک عورتوں سے، جب تک وہ ایمان نہ لائیں، نکاح نہ کرنا کیونکہ مشرک عورت خواہ تم کو کیسی ہی بھلی لگے اس سے مومن لونڈی بہتر ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے مہاجر عورتوں کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى ٱلْكُفَّارِ ۖ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ۖ ﴾ (الممتحنة: ٦٠/ ١٠)

''سو اگر تم کو معلوم ہو کہ وہ مومن ہیں تو ان کو کفار کے پاس واپس نہ بھیجو کیونکہ نہ یہ ان کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ ان کو جائز۔''

یہ دو آیتیں جس بات پر دلالت کرتی ہیں، اس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے اور وہ یہ کہ مسلمان عورت کافر کے لیے حرام ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص اپنی بیٹی یا کسی دوسری عورت، جس پر اسے ولایت حاصل ہے، کا رشتہ کسی ایسے شخص کو دیتا ہے جو نماز نہیں پڑھتا تو یہ نکاح صحیح نہیں ہوگا۔ اس عقد کے ذریعے سے وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں ہوگی کیونکہ یہ ایک ایسا عقد ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق نہیں ہے۔ بروایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

«مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة ورد محدثات الأمور، ح:١٧١٨(١٨)

''جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس کے بارے میں ہمارا امر نہ ہو تو وہ مردود ہے۔''

جب شوہر کے نماز ترک کرنے کی وجہ سے نکاح فسخ ہو جاتا ہے، الا یہ کہ وہ توبہ کرے اور نماز ادا کر کے اسلام کی طرف لوٹ آئے تو اس بے نمازی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے، جو نکاح ہی نیا کر رہا ہو؟ خلاصہ جواب یہ ہے کہ اگر رشتہ طلب کرنے والا یہ شخص نماز باجماعت ادا نہیں کرتا تو وہ فاسق ہے، کافر نہیں، اس حالت میں اسے رشتہ دینا جائز ہے لیکن دین و خلق والا کوئی دوسرا شخص اس سے بہر حال افضل ہے۔ اور اگر وہ مطلقاً نماز نہیں پڑھتا، نہ جماعت کے ساتھ اور نہ انفرادی طور پر تو وہ کافر، مرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہے، اس کے لیے کسی حال میں بھی کسی مسلمان عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں الا یہ کہ وہ سچی توبہ کرے، نماز پڑھنے اور دین اسلام پر استقامت کا ثبوت دے۔

سائل نے جو یہ ذکر کیا ہے کہ منگیتر (لڑکی) کے والد نے جب کسی سے اس کے بارے میں پوچھا اور اس نے یہ جواب دیا کہ اللہ اسے ہدایت دے گا، تو مستقبل کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے اور اس کی تدبیر اس کے ہاتھ میں ہے، ہم تو اس بات کے مخاطب ہیں جسے ہم حال میں جانتے ہیں اور رشتہ طلب کرنے والے کا حال کفر پر مبنی ہے، اس حال میں اس کے لیے کسی مسلمان عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے اس کے لیے ہدایت اور اسلام کی طرف رجوع کی امید رکھتے ہیں تاکہ اس کے لیے مسلمان عورتوں سے نکاح کرنا ممکن ہو جائے، اور اسے ہدایت دینا اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

بے نماز اہل خانہ کے ساتھ رہنا کیسا ہے؟

سوال وہ شخص کیا کرے جو اپنے اہل خانہ کو نماز کا حکم دے مگر وہ اس کی بات کو نہ سنیں، کیا وہ ان کے ساتھ رہے یا گھر سے نکل جائے؟

جواب اگر اہل خانہ بالکل نماز نہیں پڑھتے تو وہ کافر مرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں، ان کے ساتھ رہنا سہنا جائز نہیں۔ لیکن

واجب ہے کہ وہ انھیں اصرار کے ساتھ بار بار دعوت دیتا رہے' شاید اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت دے دے کیونکہ تارک نماز کتاب وسنت' اقوال صحابہ اور عقلی دلائل کی روشنی میں کافر ہے۔ والعیاذ باللّٰہ.

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بے نماز کافر نہیں' میں نے ان کے دلائل پر غور کیا ہے' وہ درج ذیل چار حالتوں سے خالی نہیں ہیں: ○ ان میں اصلاً کوئی دلیل ہی نہیں ہے۔ ○ یا یہ کسی ایسے وصف کے ساتھ مقید ہیں' جس کے ساتھ ترک نماز ممنوع ہے۔ ○ یا یہ کسی ایسی حالت کے ساتھ مقید ہیں' جس میں تارک نماز معذور ہے۔ ○ یا یہ دلائل عام ہیں' جب کہ تارک نماز کے کفر کی احادیث خاص ہیں۔

کتاب وسنت سے یہ قطعاً ثابت نہیں کہ تارک نماز مومن ہے یا یہ کہ وہ جنت میں داخل ہوگا یا یہ کہ وہ دوزخ سے نجات پا جائے گا تاکہ ہم تارک نماز کے بارے میں وارد کفر کی یہ تاویل کرسکیں کہ اس سے مراد کفران نعمت یا کفر دون کفر ہے۔ جب یہ بات واضح ہوگئی کہ تارک نماز کافر اور مرتد ہے تو اس کے کفر پر مرتدین کے احکام مرتب ہوں گے' جو حسب ذیل ہیں:

① اسے رشتہ دینا صحیح نہیں۔ اگر اس کے نماز نہ پڑھنے کے باوجود عقد نکاح ہوگیا تو یہ نکاح باطل ہوگا اور اس کی وجہ سے بیوی اس کے لیے حلال نہ ہوگی کیونکہ مہاجر عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے:

﴿ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى ٱلْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ﴾ (الممتحنة: ٦٠/ ١٠)

''سو اگر تم کو معلوم ہو کہ وہ مومن ہیں' تو ان کو کفار کے پاس واپس نہ بھیجو کہ نہ یہ ان کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ ان کو جائز ہیں۔''

② اگر اس نے عقد نکاح کے بعد نماز کو ترک کیا ہے تو اس کا نکاح فسخ ہو جائے گا اور بیوی اس کے لیے حلال نہ ہوگی جیسا کہ اس آیت کریمہ سے معلوم ہو رہا ہے جسے ہم نے قبل ازیں ذکر کیا ہے اور قبل از دخول اور بعد از دخول کے اعتبار سے اس کی تفصیل اہل علم کے ہاں معروف ہے۔

③ یہ شخص جو نماز نہیں پڑھتا اگر وہ کسی جانور کو ذبح کرے تو اس کے ذبیحہ کو نہیں کھایا جائے گا' کیوں؟ اس لیے کہ وہ حرام ہے۔ اگر کوئی یہودی یا عیسائی جانور ذبح کرے تو اس کے ذبیحہ کو ہمارے لیے کھانا حلال ہے' گویا بے نماز کا ذبیحہ یہود و نصاریٰ کے ذبیحہ سے زیادہ خبیث ہے۔

④ بے نماز کے لیے مکہ مکرمہ یا حدود حرم میں داخل ہونا حلال نہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِنَّمَا ٱلْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا۟ ٱلْمَسْجِدَ ٱلْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا ﴾ (التوبة: ٩/ ٢٨)

''اے مومنو! مشرک تو پلید ہیں' لہٰذا اس برس کے بعد وہ خانہ کعبہ کے پاس نہ جانے پائیں۔''

⑤ اس کے قرابت داروں میں سے اگر کوئی فوت ہو جائے تو اس کی میراث میں اس کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ فرض کریں کہ اگر ایک شخص فوت ہو جائے اور اس کا بیٹا نماز نہ پڑھتا ہو یعنی وہ شخص تو مسلمان ہے اور نماز پڑھتا ہے اور اس کا بیٹا نماز نہیں پڑھتا اور ایک اس کے چچا کا بیٹا (عصبہ) ہے تو اس کے چچا کا بیٹا جو قرابت میں اس سے دور ہے' وہ تو اس کا وارث ہوگا مگر اس کا اپنا حقیقی بیٹا

اس کا وارث نہیں ہوگا کیونکہ حدیث حضرت اسامہ ؓ میں نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ»(صحيح البخاري، الفرائض، باب لا يرث المسلم الكافر ولا الكافر المسلم، ح:٦٧٦٤ وصحيح مسلم، الفرائض، باب لا يرث المسلم الكافر ولا يرث الكافر المسلم، ح:١٦١٤)

”مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا“

اور نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے:

«أَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِأَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِأَوْلَى رَجُلٍ ذَكَرٍ»(صحيح البخاري، الفرائض، باب ميراث الولد من أبيه وأمه، ح:٦٧٣٢ وصحيح مسلم، الفرائض، ألحقوا الفرائض بأهلها، ح:١٦١٥)

”میراث کے حصے ان کے حق داروں کو دے دو اور جو باقی بچ جائے وہ قریب ترین مرد کے لیے ہے۔“

یہ مثال تمام وارثوں پر منطبق ہوتی ہے۔

⑥ بے نماز جب مرجائے تو اسے غسل نہیں دیا جائے گا' کفن نہیں دیا جائے گا' نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی اور اسے مسلمانوں کے ساتھ دفن بھی نہیں کیا جائیگا' تو پھر اس کے ساتھ ہم کیا کریں؟ اسے صحرا میں لے جائیں گے اور ایک گڑھا کھود کر' اس کے اپنے کپڑوں سمیت اسے دفن کر دیں گے کیونکہ اس کی کوئی حرمت نہیں۔ لہٰذا کسی کے لیے یہ حلال نہیں کہ اس کے پاس کوئی ایسا شخص فوت ہو جائے جس کے بارے میں اسے معلوم ہو کہ یہ نماز نہیں پڑھتا' مگر وہ اسے مسلمانوں کے سامنے لائے تاکہ وہ اس کی نماز جنازہ پڑھیں۔

⑦ یہ قیامت کے دن فرعون' ہامان' قارون اور ابی بن خلف جیسے ائمہ کفر کے ساتھ اٹھایا جائے گا' (والعیاذ باللہ) یہ جنت میں بھی داخل نہیں ہوگا' اس کے گھر والوں میں سے کسی کے لیے یہ حلال نہیں کہ اس کے لیے رحمت و مغفرت کی دعا کرے کیونکہ وہ کافر ہے اور اس کا مستحق نہیں ہے' اس لیے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ ءَامَنُوٓا أَن يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوٓا أُولِي قُرْبَىٰ مِنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَٰبُ ٱلْجَحِيمِ ﴿١١٣﴾ ﴾ (التوبة: ٩/ ١١٣)

”پیغمبر اور مسلمانوں کو شایان نہیں کہ جب ان پر ظاہر ہو گیا کہ مشرک اہل دوزخ ہیں تو ان کے لیے بخشش مانگیں گو وہ ان کے قرابت دار ہی ہوں۔“

یہ مسئلہ بے حد اہم ہے مگر افسوس کہ بعض لوگ اس معاملہ میں بہت سستی کرتے ہیں اور وہ اپنے گھر میں ایسے لوگوں کو برداشت کر لیتے ہیں جو نماز نہیں پڑھتے حالانکہ یہ جائز نہیں۔ ① واللہ اعلم.

---

① تارکِ نماز کے بارے ایک یہ موقف ہے جو شیخ عثیمین ؒ نے اس فتویٰ میں پیش فرمایا ہے اور علماء کا ایک دوسرا موقف یہ ہے کہ تارکِ نماز کا یہ عمل' جس پر حدیث میں [فقد کفر] کا اطلاق کیا گیا ہے' یہ کفر عملی ہے جس کا مرتکب ملتِ اسلامیہ سے خارج نہیں ہوتا' اس لیے کہ بعض اور اعمال پر بھی کفر کا لفظ بولا گیا ہے' جیسے سباب المسلم فسوق و قتاله كفر۔ گویا مسلمانوں کا باہم لڑنا بھی کفر ہے لیکن اس ⇦

عورت کے لیے اپنے بے نماز شوہر کے گھر رہنا کیسا ہے؟

سوال شادی شدہ عورت کے اپنے اس شوہر کے گھر میں رہنے کے بارے میں کیا حکم ہے، جو نماز نہیں پڑھتا اور اس کی اس عورت سے اولاد بھی ہے؟ نیز بے نماز کو رشتہ دینے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جب عورت کسی ایسے شوہر سے نکاح کرے جو نہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہے اور نہ گھر میں تو یہ نکاح صحیح نہیں ہے کیونکہ تارک نماز کافر ہے جیسا کہ کتاب اللہ، سنت مطہرہ اور اقوال صحابہ سے معلوم ہوتا ہے، اور عبداللہ بن شقیق رحمہ اللہ نے کہا ہے:

«كَانَ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ ﷺ لاَ يَرَوْنَ شَيْئًا مِنَ الأَعْمَالِ تَرْكُهُ كُفْرٌ إِلاَّ الصَّلاَةَ»(جامع الترمذي، الإيمان، باب ماجاء في ترك الصلاة، ح: ٢٦٢٢)

''اصحاب محمد ﷺ اعمال میں سے نماز کے سوا اور کسی چیز کے ترک کو کفر نہیں سمجھتے تھے۔''

اور کافر کے لیے مسلمان عورت حلال نہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى ٱلْكُفَّارِ ۖ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ۖ ﴾ (الممتحنة: ٦٠/ ١٠)

''سو اگر تم کو معلوم ہو کہ وہ مومن ہیں تو انھیں کفار کے پاس واپس نہ بھیجو کہ نہ یہ ان کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ ان کو جائز۔''

اگر عقد نکاح کے بعد اس نے نماز کو ترک کیا ہو تو نکاح فسخ ہو جائے گا الا یہ کہ وہ توبہ کر کے اسلام کی طرف رجوع کر لے۔ بعض علماء نے اسے عدت کے ساتھ بھی مقید کیا ہے یعنی اگر عدت ختم ہو جائے تو پھر اس کیلئے مسلمان ہونے پر رجوع حلال نہ ہوگا الا یہ کہ نیا نکاح کرے۔ عورت کے لیے بھی واجب ہے کہ وہ اس سے جدائی اختیار کر لے اور اسے اپنے قریب نہ آنے دے الا یہ کہ وہ توبہ کر کے نماز شروع کر دے، خواہ اس کی اس سے اولاد بھی ہو کیونکہ اس صورت حال میں باپ کو اپنی اولاد کا حق حضانت حاصل نہیں ہے۔ مسئلہ کی اس سنگینی کے پیش نظر میں اپنے مسلمان بھائیوں کو تنبیہ کرتا ہوں کہ وہ اپنی بیٹیاں اور وہ عورتیں جن کے وہ ولی ہیں ایسے لوگوں کے نکاح میں نہ دیں جو نماز نہیں پڑھتے، کیونکہ یہ بہت خطرناک صورت حال ہے۔ اس مسئلہ میں وہ کسی قریبی رشتہ دار یا دوست کا لحاظ نہ کریں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے۔ واللہ اعلم۔ (یہ فتویٰ 1412/10/9ھ کو تحریر کیا گیا۔)

جان بوجھ کر نماز ترک کرنے والے کی قضا کا حکم

سوال جس شخص نے جان بوجھ کر نماز ترک کی اور پھر توبہ کر لی تو کیا وہ ان ترک کی ہوئی نمازوں کی قضا ادا کرے گا؟

جواب جس شخص نے جان بوجھ کر نماز ترک کی اور پھر اللہ تعالیٰ کے آگے توبہ کر کے رجوع کر لیا، تو اہل علم کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ ترک کی ہوئی نمازوں کی اس پر قضا واجب ہے یا نہیں؟ اہل علم کے اس بارے میں دو قول ہیں۔

⇦ کے باوجود اللہ نے دونوں لڑنے والے گروہوں کو مومنین ہی سے تعبیر فرمایا ہے۔ (سورۂ حجرات) وعلیٰ هذا القياس اور بھی متعدد دلائل ہیں۔ اس لیے جب تک اعتقادی وجودی کفر کا ارتکاب نہیں ہوتا، کسی بھی مسلمان کو کفر عملی اور ارتکاب کبیرہ کی وجہ سے خارج عن الملة اور مرتد قرار نہیں دیا جا سکتا، نہ مرتد والے احکام ہی ان پر جاری کیے جا سکتے ہیں۔ (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو: ''الصحيحة'' ج: ۷، ص: ۱۲۷)

میرے نزدیک راجح قول وہ ہے جسے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے کہ جو شخص جان بوجھ کر نماز ترک کر دے حتی کہ اس کا وقت ختم ہو جائے تو اسے اس کی قضا کوئی فائدہ نہ دے گی کیونکہ جس عبادت کا وقت مقرر ہو، تو اسے اسی وقت میں ادا کرنا ضروری ہے۔ جس طرح وہ قبل از وقت صحیح نہیں، اسی طرح بعد از وقت بھی صحیح نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ نماز کو شارع نے ہم پر فرض قرار دیا ہے اور اس کے لیے یہ بھی فرض کیا ہے کہ اسے فلاں وقت سے لے کر فلاں وقت تک ادا کرنا ہے۔ جیسے اس جگہ نماز ادا کرنا صحیح نہیں، جسے نماز کے لیے جگہ مقرر نہیں کیا گیا، اسی طرح اس وقت بھی نماز ادا کرنا صحیح نہیں، جو اس کے لیے وقت مقرر نہیں کیا گیا لہٰذا جو شخص نماز ترک کر دے اسے کثرت سے توبہ و استغفار اور دیگر نیک عمل کرنے چاہییں۔ امید ہے اس سے اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دے گا۔ واللہ الموفق.

تارکِ نماز اولاد اور والدین کے فرائض

سوال تارک نماز خاندان مثلاً بیٹوں کے بارے میں والدین کے کیا فرائض ہیں؟

جواب جب بیٹے نماز نہ پڑھتے ہوں تو والدین کا فرض ہے کہ انھیں نماز کا پابند بنائیں یا تو زبانی سمجھا کر یا حکم دے کر یا جسمانی سزا دے کر کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«وَاضْرِبُوهُمْ عَلَيْهَا لِعَشْرِ سِنِينَ»(مسند أحمد: ١٧٨/٢ وسنن أبي داود، الصلاة، باب متى يؤمر الغلام بالصلاة، ح: ٤٩٥ وهو في صحيح الجامع، ح: ٥٨٦٨)

''اور نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے انھیں مارو جب وہ دس سال کے ہوں۔''

اگر مارنا بھی فائدہ نہ دے تو وہ حکومت کے ذمہ داروں سے ان کی شکایت کریں تاکہ وہ انھیں نماز کا پابند بنا سکیں۔ اس معاملہ میں سکوت اختیار کرنا حلال نہیں کیونکہ یہ برائی پر رضامندی کے باب سے ہوگا اور پھر اس لیے بھی کہ ترک نماز سے انسان کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، تارک نماز کافر اور ابدی جہنمی ہے، ایسا شخص جب فوت ہو جائے تو یہ جائز نہیں کہ اسے غسل دیا جائے یا اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے یا اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کو محفوظ رکھے۔

مسافروں کے لیے اذان کا حکم

سوال مسافروں کے لیے اذان کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اس مسئلہ میں گو اختلاف ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ مسافروں کے لیے بھی اذان واجب ہے کیونکہ نبی ﷺ نے حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں سے فرمایا تھا:

«فَإِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ فَلْيُؤَذِّنْ لَكُمْ أَحَدُكُمْ»(صحيح البخاري، الأذان، باب الأذان للمسافرين إذا كانوا جماعةً والإقامة . . .، ح: ٦٣١ وصحيح مسلم، المساجد، باب من أحق بالإمامة، ح: ٦٧٤)

''جب نماز کا وقت ہو جائے، تو تم میں سے ایک تمہارے لیے اذان دے۔''

آپ نے انھیں یہ بات اس وقت فرمائی جب وہ آپ کی خدمت میں حاضری کے بعد اپنے وطن کی طرف سفر کرنے لگے تھے۔ نبی ﷺ نے کبھی بھی سفر یا حضر میں اذان اور اقامت ترک نہیں فرمائی تھی آپ کے سفر میں بھی اذان دی جاتی اور آپ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دینے کا حکم دیا کرتے تھے۔

اکیلے شخص کے لیے اذان واقامت کا حکم

سوال اکیلے شخص کے لیے اذان واقامت کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب منفرد کے لیے اذان واقامت سنت ہیں واجب نہیں' کیونکہ اس کے پاس ایسے لوگ نہیں ہوتے جن کی خاطر اذان دی جائے لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ اذان اللہ تعالیٰ کا ذکر' اس کی تعظیم اور اپنے لیے نماز اور فلاح کی دعوت ہے اذان دینا مستحب ہے' اور اسی طرح اقامت بھی سنت ہے۔ اذان کے استحباب کی دلیل حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

«يَعْجَبُ رَبُّكَ عَزَّوَجَلَّ مِنْ رَاعِي غَنَمٍ فِي رَأْسِ شَظِيَّةٍ بِجَبَلٍ يُؤَذِّنُ لِلصَّلَاةِ وَيُصَلِّي فَيَقُولُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ: اُنْظُرُوا إِلٰى عَبْدِي هٰذَا يُؤَذِّنُ وَيُقِيمُ لِلصَّلَاةِ يَخَافُ مِنِّي قَدْ غَفَرْتُ لِعَبْدِي وَأَدْخَلْتُهُ الْجَنَّةَ» (مسند أحمد: ٤/ ١٤٥، ١٥٧ وسنن أبي داود، الصلاة، باب الأذان في السفر، ح: ١٢٠٣ واللفظ له)

''تمہارا رب عزوجل بکریوں کے اس چرواہے پر خوش ہوتا ہے جو کسی پہاڑ کی بلند چوٹی پر ہو اور نماز کے لیے اذان دے اور نماز پڑھے۔ اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے اس بندے کو دیکھو کہ وہ نماز کے لیے اذان واقامت کہتا ہے' وہ مجھ سے ڈرتا ہے' میں نے اپنے بندے کو بخش دیا اور اسے جنت میں داخل کر دیا۔''

دو نمازوں کو جمع کرتے وقت ہر نماز کے لیے اقامت کہے

سوال جب انسان نماز ظہر اور عصر کو جمع کر کے ادا کرے تو کیا وہ ہر نماز کے لیے اقامت کہے؟ کیا نوافل کے لیے بھی اقامت ہے؟

جواب ہر نماز کے لیے اقامت ہے جیسا کہ نبی ﷺ کے حج کی کیفیت کے بارے میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ انھوں نے مزدلفہ میں آپ کی نمازوں کو جمع کر کے ادا کرنے کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا:

«جَمَعَ النَّبِيُّ ﷺ الْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ بِجَمْعٍ كُلُّ وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا بِإِقَامَةٍ وَلَمْ يُسَبِّحْ بَيْنَهُمَا» (صحيح البخاري، الحج، باب من جمع بينهما ولم يتطوع، ح: ١٦٧٣ وصحيح مسلم، الحج، باب الإفاضة من عرفات، ح: ١٢٨٥، ٢٨١)

''نبی ﷺ نے مزدلفہ میں مغرب وعشا کی نمازیں جمع کر کے ادا فرمائیں' ان میں سے ہر نماز کے لیے اقامت کہی گئی اور دونوں کے درمیان آپ نے نوافل ادا نہیں فرمائے۔''

نوافل کے لیے اقامت نہیں ہے۔

”الصلاۃ خیر من النوم“ پہلی اذان میں کہا جائے یا دوسری میں؟

سوال ”الصلاۃ خیر من النوم“ کے الفاظ پہلی اذان میں کہے جائیں یا دوسری میں؟

جواب ”الصلاۃ خیر من النوم“ کے الفاظ پہلی اذان میں کہے جائیں جیسا کہ حدیث میں ہے:

«وَإِذَا أَذَّنْتَ بِالْأَوَّلِ مِنَ الصُّبْحِ فَقُلْ: "الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ"» (مسند أحمد: ٣/٤٠٨)

”جب تم صبح کی پہلی اذان دو تو یہ کہو: ”الصلاۃ خیر من النوم۔“

اس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ الفاظ پہلی اذان میں ہیں، دوسری میں نہیں، لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ اس حدیث میں اذان اول سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد وہ اذان ہے جو وقت شروع ہونے کے بعد ہوتی ہے۔ اور دوسری اذان سے مراد اقامت ہے، اس لیے کہ اذان کو بھی اقامت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«بَيْنَ كُلِّ أَذَانَيْنِ صَلَاةٌ» (صحيح البخاري، الأذان، باب بين كل أذانين صلاة لمن شاء، ح: ٦٢٧ وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب بين كل أذانين صلاة، ح: ٨٣٨)

”ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے۔“

اس حدیث میں دو اذانوں سے مراد اذان اور اقامت ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ: ”امیر المومنین عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے دن تیسری اذان کا اضافہ کیا۔“ اس سے معلوم ہوا کہ اذان اوّل جس میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ”الصلاۃ خیر من النوم“ کہنے کا حکم دیا، اس سے مراد نماز فجر کے لیے اذان ہے۔ وہ اذان جو طلوع فجر سے قبل ہوتی ہے، وہ فجر کے لیے نہیں ہوتی، گو لوگ رات کے آخری حصے کی اس اذان کو فجر کی پہلی اذان کے نام سے موسوم کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ اذان نماز فجر کے لیے نہیں ہوتی کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّ بِلَالًا يُؤَذِّنُ بِلَيْلٍ - وفي رواية - لَا يَمْنَعَنَّ أَحَدَكُمْ - أَوْ أَحَدًا مِنْكُمْ - أَذَانُ بِلَالٍ مِنْ سُحُورِهِ فَإِنَّهُ يُؤَذِّنُ أَوْ يُنَادِي بِلَيْلٍ لِيَرْجِعَ قَائِمَكُمْ وَلِيُنَبِّهَ نَائِمَكُمْ» (صحيح البخاري، الأذان، باب الأذان قبل الفجر، ح: ٦٢١، ٦٢٢ وصحيح مسلم، الصيام، باب بيان أن الدخول في الصوم يحصل ... ح: ١٠٩٢، ١٠٩٣)

”بے شک بلال رات کو اذان کہتے ہیں“ اور ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ ”تم میں سے کسی کو بلال کی اذان سحری کھانے سے نہ روکے کیونکہ وہ رات کو اس لیے اذان کہتے ہیں تاکہ تمھارا قیام کرنے والا لوٹ آئے اور تمھارا سویا ہوا خبردار ہو جائے۔“

یعنی وہ تو اس لیے اذان کہتے ہیں تاکہ سویا ہوا اٹھ کھڑا ہو اور وہ سحری کھا لے اور قیام کرنے والا بھی لوٹ آئے اور سحری کھا لے۔ نبی ﷺ نے حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے بھی فرمایا تھا:

«إِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ فَلْيُؤَذِّنْ لَكُمْ أَحَدُكُمْ» (صحيح البخاري، الأذان، باب الأذان للمسافرين إذا

كانوا جماعةً والاقامة، ح: ٦٣١ وصحيح مسلم، المساجد، باب من أحق بالإمامة، ح: ٦٧٤)

’’جب نماز کا وقت ہو جائے تو تم میں سے ایک شخص تمھارے لیے اذان کہے۔‘‘

اور معلوم ہے کہ نماز کا وقت طلوعِ فجر کے بعد ہوتا ہے لہٰذا طلوع فجر سے پہلے کی اذان، فجر کی اذان نہیں ہے، چنانچہ آج لوگوں کا یہ عمل اور فعل ہی صحیح ہے کہ ’’ الصلاة خير من النوم‘‘ کے الفاظ اذان فجر کے لیے ہیں۔ جس شخص نے یہ وہم کیا ہے کہ حدیث میں اذان اول سے مراد وہ اذان ہے جو طلوع فجر سے پہلے ہوتی ہے، صحیح نہیں ہے۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس بات کی دلیل، کہ اس سے مراد وہ اذان ہے جو رات کے آخری حصے میں ہوتی ہے، یہ ہے کہ اس وقت ادا کی جانے والی نفل نماز کی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ ’’الصلاة خير من النوم‘‘ اور خیر کا لفظ افضل ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ ہم عرض کریں گے کہ خیر کا لفظ اس واجب کے لیے استعمال ہوتا ہے جو واجبات میں سے بے حد اہمیت کا حامل ہو، مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَٰرَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿١٠﴾ تُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَتُجَٰهِدُونَ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ بِأَمْوَٰلِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١١﴾ ﴾ (الصف: ٦١/ ١٠-١١)

’’مومنو! میں تمھیں ایسی تجارت بتاؤں جو تمھیں دردناک عذاب سے نجات دے؟ (وہ یہ کہ) تم اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو۔ اگر سمجھو تو یہ تمھارے حق میں بہتر ہے۔‘‘

حالانکہ سب سے بہتر تو ایمان ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے نماز جمعہ کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا نُودِىَ لِلصَّلَوٰةِ مِن يَوْمِ ٱلْجُمُعَةِ فَٱسْعَوْاْ إِلَىٰ ذِكْرِ ٱللَّهِ وَذَرُواْ ٱلْبَيْعَ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾ (الجمعة: ٦٢/ ٩)

’’مومنو! جب جمعے کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کی یاد (نماز) کے لیے جلدی کرو اور (خرید و) فروخت ترک کردو۔ یہ تمھارے حق میں بہتر ہے۔‘‘

لہٰذا خیر واجب میں بھی ہو سکتی ہے اور مستحب میں بھی۔

ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے سے اذان کہنا درست نہیں

سوال کیا ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے سے بھی اذان صحیح ہے؟

جواب ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے سے اذان صحیح نہیں ہے کیونکہ اذان عبادت ہے اور عبادت کے لیے نیت ضروری ہے۔

دورانِ اذان میں مسجد میں آنے والا شخص کیا کرے؟

سوال کوئی شخص مسجد میں اس وقت آئے جب مؤذن اذان دے رہا ہو تو افضل کیا ہے؟

جواب افضل یہ ہے کہ وہ مؤذن کی اذان کا جواب دے، پھر اذان کے بعد والی مسنون دعا پڑھے اور پھر تحیۃ المسجد پڑھے، البتہ بعض

علماء نے اس سے اس صورت کو مستثنیٰ قرار دیا ہے کہ جب کوئی مسجد میں جمعہ کے دن اس وقت داخل ہو جب مؤذن دوسری اذان دے رہا ہو تو وہ تحیۃ المسجد پڑھے کیونکہ اسے خطبہ سننا ہے۔ انھوں نے اس کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ خطبہ سننا واجب ہے اور مؤذن کی اذان کا جواب دینا واجب نہیں ہے اور غیر واجب کی نسبت واجب کی حفاظت کرنا زیادہ بہتر ہے۔

مؤذن کی متابعت میں کلمات ”رَضِيتُ بِاللّٰه رَبًّا......الخ“ کب کہے جائیں؟

سوال حدیث میں آیا ہے کہ انسان مؤذن کی متابعت میں یہ کلمات کہے: [رَضِيتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِالإِسْلَامِ دِيناً وَّبِمُحَمَّدٍ رَّسُولًا] سوال یہ ہے کہ یہ کلمات کس وقت کہے جائیں؟

جواب حدیث سے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ مؤذن جب یہ کہے: [أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً رَّسُولُ اللّٰهِ] اور آپ ان کلمات کا جواب دے دیں تو پھر یہ کہیں: [رَضِيتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِالإِسْلَامِ دِيناً وَّبِمُحَمَّدٍ رَّسُولًا] کیونکہ اس بارے میں حدیث نبوی ہے:

«مَنْ قَالَ حِينَ يَسْمَعُ الْمُؤَذِّنَ: أَشْهَدُ أَنْ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ وَحْدَهُ لاَ شَرِيكَ لَهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ رَضِيتُ بِاللهِ رَبًّا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُولاً وَبِالإِسْلاَمِ دِينًا» (صحيح مسلم، الصلاة، باب استحباب القول مثل قول المؤذن . . . ح: ٣٨٦(١٣)

”جو شخص مؤذن کو سنتے ہوئے یہ کہے: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور بے شک محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ میں اللہ کے رب ہونے پر، محمد ﷺ کے رسول ہونے پر اور اسلام کے دین ہونے پر راضی ہوں۔“

ایک روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں: [مَنْ قَالَ وَأَنَا أَشْهَدُ] ”جو کہے کہ میں یہ گواہی دیتا ہوں“ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مؤذن کے [أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ] کہنے کے بعد یہ الفاظ کہے جائیں کیونکہ واو حرف عطف ہے لٰہذا اسے مؤذن کے قول کے بعد یہ کلمات کہنے چاہییں۔

اذان کے بعد کی دعا میں ”إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ“ کا اضافہ کرنا کیسا ہے؟

سوال *کیا اذان کے بعد کی دعا میں: [إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ] کے الفاظ کا اضافہ صحیح ہے؟*

جواب اس اضافے کے بارے میں علما حدیث میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ شاذ ہونے کی وجہ سے یہ الفاظ ثابت نہیں ہیں کیونکہ اس حدیث کے اکثر راویوں نے یہ کلمات روایت نہیں کیے جب کہ اس مقام کا تقاضا یہ تھا کہ ان کلمات کو حذف نہ کیا جاتا کیونکہ یہ مقام دعا اور ثنا کا ہے لٰہذا اس طرح کے الفاظ کو حذف کرنا جائز نہیں کیونکہ انھیں بطور عبادت کہا جاتا ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ ان کی سند صحیح ہے، یہ الفاظ بھی کہنے چاہییں اور یہ دیگر روایات کے منافی نہیں ہیں۔ جن علماء نے ان کلمات کو صحیح قرار دیا ہے، ان میں شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ بھی ہیں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے کیونکہ امام بیہقی نے

اسے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ①

کیا اقامت کا جواب دینا اور ”اَقَامَهَا اللّٰهُ وَ اَدَامَهَا“ کہنا درست ہے؟

سوال کیا انسان اقامت میں بھی جواب دے؟

جواب اقامت میں جواب دینے کے بارے میں ایک حدیث ہے، جسے امام ابوداود رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے، مگر یہ روایت ضعیف اور ناقابل استدلال ہے لہٰذا راجح بات یہ ہے کہ اقامت میں جواب نہ دیا جائے۔

سوال ہم بعض لوگوں سے سنتے ہیں کہ وہ اقامت کے بعد یہ الفاظ کہتے ہیں: [أقَا مَهَا اللّٰهُ و أدَامَهَا] تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اس بارے میں ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب مؤذن: [قَدْقَامَتِ الصَّلاَ ةُ] کہتا تو نبی ﷺ یہ فرماتے:

«أَقَامَهَا اللّٰهُ وَأَدَامَهَا»(سنن أبي داود، الصلاة، باب ما يقول إذا سمع الإقامة، ح:٥٢٨ والسنن الكبرى للبيهقي: ١/ ٤١١ وقال الحافظ في التلخيص: ١/ ٢١١ ضعيف، وضعفه الألباني في الإرواء: ١/ ٢٥٨)

”اللہ تعالیٰ اسے قائم ودائم رکھے۔“

لیکن یہ حدیث ضعیف اور ناقابل استدلال ہے۔

نماز کا اوّل وقت کون سا ہے؟

سوال نماز ادا کرنے کے لیے افضل وقت کون سا ہے؟ کیا اوّل وقت افضل ہے؟

جواب زیادہ کامل نماز وہ ہے جسے اس وقت ادا کیا جائے جو اس کے لیے شرعاً مطلوب ہے، اسی لیے نبی ﷺ نے اس شخص کے جواب میں کہ جس نے آپ سے یہ پوچھا تھا کہ اللہ عزوجل کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ عمل کون سا ہے، فرمایا تھا:

«اَلصَّلاَةُ عَلٰى وَقْتِهَا»(صحيح البخاري، المواقيت، باب فضل الصلاة لوقتها، ح:٥٢٧ وصحيح مسلم، الإيمان، باب بيان كون الإيمان بالله تعالى أفضل الأعمال، ح:٨٥(١٣٩)

”اپنے وقت پر نماز۔“

آپ نے یہاں یہ نہیں فرمایا کہ اول وقت میں نماز کیونکہ کچھ نمازیں ایسی ہیں جنھیں جلدی پڑھنا مسنون ہے اور بعض ایسی ہیں، جن میں تاخیر مسنون ہے، مثلاً نماز عشا کو رات کے تہائی حصہ تک مؤخر کرنا مسنون ہے۔ ایک خاتون خانہ اگر یہ پوچھے کہ اس کے لیے افضل کیا ہے، اذان عشا کے وقت عشا کی نماز کو ادا کرنا یا اسے رات کے تہائی حصے تک مؤخر کرنا؟ تو ہم عرض کریں گے کہ اس کے لیے افضل یہ ہے کہ نماز کو رات کے تہائی حصے تک مؤخر کرے کیونکہ نبی ﷺ نے ایک رات نماز کو اس قدر مؤخر کیا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! عورتیں اور بچے سو گئے ہیں تو رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، نماز پڑھائی اور فرمایا:

«إِنَّهُ لَوَقْتُهَا لَوْلاَ أَنْ أَشُقَّ عَلٰى أُمَّتِي»(صحيح مسلم، المساجد، باب وقت العشاء وتأخيرها،

---

① فتاوی اللجنة: 88/6

ح:٦٣٨(٢١٩)

”اگر مجھے امت کے مشقت میں پڑ جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو نماز عشا کا یہی وقت ہے۔“

لہٰذا عورت کے لیے افضل یہی ہے کہ اگر وہ اپنے گھر میں نماز پڑھے تو اسے مؤخر کر کے پڑھے۔ اسی طرح بالفرض اگر کچھ لوگ سفر میں ہوں اور وہ یہ پوچھیں کہ ہم نماز کو جلد پڑھیں یا دیر سے؟ تو ہم عرض کریں گے کہ افضل یہی ہے کہ تم تاخیر سے نماز ادا کرو۔

اسی طرح اگر کچھ لوگ سیر و سیاحت کے لیے نکلے ہوں اور عشا کا وقت ہو جائے تو کیا ان کے لیے نماز عشا کو جلد پڑھنا افضل ہے یا تاخیر سے پڑھنا؟ تو ہم عرض کریں گے کہ اگر مشقت نہ ہو تو ان کے لیے نماز کو تاخیر کے ساتھ پڑھنا افضل ہے؟

باقی نمازوں میں افضل یہ ہے کہ انھیں جلدی پڑھا جائے الا یہ کہ تاخیر کا کوئی سبب ہو، فجر، ظہر، عصر اور مغرب کی نمازوں کو جلد ادا کیا جائے گا الا یہ کہ تاخیر کا کوئی سبب ہو۔

اسباب میں سے یہ بھی ہے کہ اگر گرمی شدید ہو تو نماز ظہر کو وقت کے ٹھنڈا ہونے تک مؤخر کیا جا سکتا ہے یعنی اسے نماز عصر کے قریب تک ٹھنڈا کیا جا سکتا ہے کیونکہ وقت نماز عصر کے قریب ٹھنڈا ہوتا ہے ① لہٰذا گری سخت ہو تو افضل یہ ہے کہ اسے وقت ٹھنڈا ہونے پر ادا کیا جائے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ فَأَبْرِدُوا بِالصَّلَاةِ فَإِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ»(صحيح البخاري، المواقيت، باب الإبراد بالظهر في شدة الحر، ح:٥٣٣، ٥٣٤ وصحيح مسلم، المساجد، باب استحباب الإبراد بالظهر . . . ح:٦١٥)

”جب گرمی سخت ہو تو نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھو کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی تیزی میں سے ہے۔“

ایک بار نبی ﷺ سفر میں تھے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان کے لیے کھڑے ہوئے تو آپ نے فرمایا: [أَبْـرِدْ] ”ٹھنڈا کرو“ وہ پھر اذان کے لیے کھڑے ہوئے تو آپ نے فرمایا: [أَبْـرِدْ] ”ٹھنڈا کرو۔“ وہ پھر اذان کے لیے کھڑے ہوئے تو آپ نے انھیں اذان دینے کی اجازت عطا فرما دی۔ ②

تاخیر کے اسباب میں سے یہ بھی ہے کہ آخر وقت میں جماعت مل جائے اور اول وقت میں جماعت نہ مل سکتی ہو تو اس صورت میں تاخیر کے ساتھ نماز ادا کرنا افضل ہے مثلاً: ایک شخص جنگل میں ہو، نماز کا وقت ہو جائے اور اسے معلوم ہو کہ شہر پہنچ کر وہ آخری

---

① فاضل مفتی رحمہ اللہ کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اِبْراد (ٹھنڈا کرنے) کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ظہر کا سارا وقت نکال دیا جائے، حتیٰ کہ عصر کا وقت بالکل قریب ہو جائے۔ بلکہ اس کا مطلب وقتِ معتاد سے قدرے مؤخر کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِبْراد کی انتہا میں علماء کے درمیان اختلاف ہے، لیکن اس میں یہ شرط ہے کہ انتظار اور تاخیر کی مدت آخر وقت تک نہ پہنچے۔ (فتح الباری، مواقیت الصلاۃ، باب الابراد بالظهر فی السفر، حدیث: 539) اور مفتی صاحب کی رائے اس شرط کے خلاف ہے۔ (ص، ی)

② صحیح البخاری، مواقیت الصلاۃ، باب الإبراد بالظهر فی السفر، حدیث: 539 صحیح مسلم، المساجد، باب استحباب الإبراد بالظهر...... حدیث: 616

وقت میں باجماعت نماز ادا کرسکتا ہے تو کیا اس کے لیے یہ افضل ہے کہ وہ وقت پر نماز ادا کرے یا باجماعت ادا کرنے کے لیے مؤخر کر کے پڑھے؟ ہم اس شخص سے یہی کہیں گے کہ نماز مؤخر کردو تاکہ اسے باجماعت ادا کرسکو بلکہ اس صورت میں باجماعت ادا کرنے کے لیے اسے مؤخر کرنا واجب ہوگا۔

قبل از وقت نماز پڑھ لینے والے کے متعلق حکم

سوال اگر انسان لاعلمی کی وجہ سے قبل از وقت نماز پڑھ لے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب قبل از وقت نماز پڑھنے سے فرض ادا نہ ہوگا کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ ٱلصَّلَوٰةَ كَانَتۡ عَلَى ٱلۡمُؤۡمِنِينَ كِتَٰبٗا مَّوۡقُوتٗا ١٠٣﴾ (النساء: ٤/ ١٠٣)

”بے شک نماز کا مومنوں پر اوقات (مقررہ) میں ادا کرنا فرض ہے۔“

اور نبی ﷺ نے ان اوقات کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

«وَقْتُ الظُّهْرِ إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ»(صحيح البخاري، المواقيت، باب وقت الظهر عند الزوال، ح:٥٤١ وصحيح مسلم، المساجد، باب أوقات الصلوات الخمس، ح:٦١٢(١٧٣) واللفظ له)

”ظہر کا وقت‘ جب سورج زائل ہو جائے......“

لہٰذا جس نے وقت سے پہلے نماز ادا کرلی اس کا فرض ادا نہ ہوگا‘ البتہ یہ نماز نفل ہو جائے گی یعنی اسے نفل کا ثواب مل جائے گا۔ وقت ہونے کے بعد اسے نماز دوبارہ پڑھنا ہوگی۔ واللہ اعلم۔

قضا شدہ نمازوں کی ترتیب

سوال کیا نسیان یا جہالت کے سبب قضا ہونے والی نمازوں میں ترتیب ساقط ہو جائے گی؟

جواب اس مسئلہ میں اختلاف ہے‘ صحیح بات یہ ہے کہ ترتیب ساقط ہو جائے گی اور اس کی دلیل حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ کا عموم ہے:

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَآ إِن نَّسِينَآ أَوۡ أَخۡطَأۡنَاۚ﴾ (البقرة: ٢/ ٢٨٦)

”اے پروردگار اگر ہم سے بھول چوک ہوگئی ہو تو ہم سے مؤاخذہ نہ کیجیے۔“

اور نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّ اللهَ تَجَاوَزَ لِي عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأَ وَالنِّسْيَانَ وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ»(سنن ابن ماجه، الطلاق، باب طلاق المكره والناسي، ح:٢٠٤٣)

”بے شک اللہ تعالیٰ نے میرے لیے میری امت کے خطا ونسیان اور جس پر انھیں مجبور کر دیا گیا ہو‘ سے درگزر فرمایا ہے۔“

سوال ایک شخص نماز عشا کے لیے مسجد میں داخل ہوا تو اسے یاد آیا کہ اس نے تو مغرب کی نماز بھی نہیں پڑھی‘ وہ کیا کرے؟

جواب جب آپ مسجد میں داخل ہوں اور عشا کی نماز کھڑی ہوگئی ہو اور آپ کو یاد آئے کہ آپ نے تو نماز مغرب بھی ادا نہیں کی تو

آپ نماز مغرب کی نیت کے ساتھ جماعت میں شامل ہو جائیں اور جب امام چوتھی رکعت کے لیے کھڑا ہو تو آپ تین رکعتیں پڑھ کر بیٹھے رہیں، امام کا انتظار کریں اور پھر اس کے ساتھ سلام پھیر دیں۔ آپ کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ آپ اپنی نماز مکمل کر کے سلام پھیر دیں اور پھر دوبارہ امام کے ساتھ جماعت میں شامل ہو جائیں۔ اہل علم کے صحیح قول کے مطابق امام اور مقتدی کی نیت کے مختلف ہونے میں کوئی حرج نہیں اور اگر آپ اکیلے نماز مغرب پڑھ لیں اور نماز عشا کا جتنا حصہ پا سکیں وہ جماعت کے ساتھ پڑھ لیں تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔

سوال جب نیند یا نسیان کی وجہ سے ایک یا ایک سے زیادہ فرض نمازیں نہ پڑھی جا سکیں تو فوت شدہ نمازوں کی قضا کس طرح دوں؟ کیا پہلے انھیں اور پھر موجودہ نماز کو پڑھوں یا اس کے برعکس؟

جواب پہلے فوت شدہ نمازوں کو اور پھر موجودہ نماز کو پڑھیں اور انہیں مزید مؤخر کرنا جائز نہیں۔ لوگوں میں جو یہ بات مشہور ہے کہ جس کی فرض نماز فوت ہو جائے تو وہ دوسرے دن کی اسی فرض نماز کے ساتھ پڑھے مثلاً: اگر کسی دن اس نے نماز فجر نہیں پڑھی تو وہ اگلے دن کی نماز فجر کے ساتھ اسے پڑھے، تو یہ بات غلط اور نبی ﷺ کی قولی اور فعلی سنت کے خلاف ہے۔ قولی سنت تو آپ کا یہ ارشاد ہے:

«مَنْ نَسِيَ صَلَاةً أَوْ نَامَ عَنْهَا فَكَفَّارَتُهَا أَنْ يُصَلِّيَهَا إِذَا ذَكَرَهَا»(صحيح البخاري، المواقيت، باب من نسي صلاة فليصل إذا ذكر ...، ح:٥٩٧ وصحيح مسلم، المساجد، باب قضاء الصلاة الفائتة ... ح:٦٨٤(٣١٥) واللفظ له)

''جو شخص کسی نماز کو بھول جائے یا سویا رہے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے اسی وقت پڑھ لے جب اسے یاد آئے۔''

اس حدیث میں آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ اس نماز کو دوسرے دن اس وقت پڑھے جب اس کا وقت آئے بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اسی وقت پڑھ لے جب اسے یاد آئے۔

فعلی سنت یہ کہ ایام خندق میں سے ایک دن جب آپ کی نمازیں فوت ہو گئیں تو آپ نے انھیں موجودہ نماز سے پہلے ادا فرمایا۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ انسان پہلے فوت شدہ نماز کو پڑھے اور پھر موجودہ نماز کو لیکن اگر اس نے بھول کر موجودہ نماز کو فوت شدہ سے پہلے پڑھ لیا یا وہ جاہل تھا اور اسے اس مسئلے کا علم نہ تھا تو اس کی نماز نسیان یا لاعلمی کے عذر کی وجہ سے صحیح ہو گی۔

اس مسئلہ کی مناسبت سے میں یہاں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ قضا نمازوں کی درج ذیل تین قسمیں ہیں:

① آدمی اس وقت قضا دے جب عذر ختم ہو جائے یعنی وہ عذر جس کی وجہ سے اس نے نماز کو مؤخر کیا تھا۔ اس قسم میں پانچ فرض نمازیں آتی ہیں کہ جب تاخیر کا عذر ختم ہو جائے تو ان کی قضا واجب ہے۔

② جب نماز فوت ہو جائے تو اس کی قضا نہ دی جائے بلکہ اس کے بدل کی قضا دی جائے اس قسم کے تحت نماز جمعہ آتی ہے کہ جب انسان اس وقت آئے جب امام نے دوسری رکعت کے سجدہ سے سر اٹھایا ہو تو اس صورت میں وہ ظہر کی نماز پڑھے گا یعنی نماز ظہر کی نیت کے ساتھ امام کے ساتھ شامل ہو جائے۔ اسی طرح جو شخص امام کے سلام پھیرنے کے بعد آئے تو وہ بھی نماز ظہر پڑھے گا۔ جس نے دوسری رکعت میں رکوع کو پالیا تو وہ نماز جمعہ پڑھے گا یعنی امام کے سلام پھیرنے کے بعد وہ ایک رکعت پڑھے گا۔

بہت سے لوگ اس مسئلہ سے ناواقف ہیں' بعض لوگ جمعہ کے دن اس وقت آتے ہیں جب امام نے دوسری رکعت کے سجدہ سے سر اٹھایا ہو تو وہ اسے جمعہ سمجھتے ہوئے دو رکعتیں پڑھتے ہیں' حالانکہ یہ غلط ہے کیونکہ دوسری رکعت میں امام کے سجدہ سے سر اٹھانے کے بعد شامل ہونے والے نے جمعہ نہیں پایا' لہٰذا اسے نماز ظہر پڑھنی چاہیے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الصَّلَاةِ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلَاةَ»(صحيح البخاري، المواقيت، باب من أدرك من الصلاة ركعة، ح: ٥٨٠ وصحيح مسلم، المساجد، باب من أدرك ركعة من الصلاة فقد أدرك تلك الصلاة، ح: ٦٠٧)

''جس نے نماز کی ایک رکعت پالی' اس نے نماز کو پالیا۔''

اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے ایک رکعت سے کم پائی تو اس نے جمعہ نہیں پایا لہٰذا جمعہ کے بجائے اسے اب نماز ظہر کی قضا دینا ہوگی۔ اسی طرح گھروں میں عورتوں اور جمعہ کے لیے حاضر نہ ہوسکنے والے مریضوں پر واجب ہے کہ وہ نماز ظہر پڑھیں۔ جمعہ نہ پڑھیں' اگر اس حال میں انھوں نے جمعہ کی دو رکعتیں پڑھیں تو ان کی نماز باطل اور مردود ہوگی۔

④ وہ نماز جو فوت ہوجائے تو اس کی قضا اسی وقت اگلے دن میں دی جائے گی۔ اس سے مراد نماز عید ہے کہ جب اسے اس کے بارے میں زوال آفتاب کے بعد معلوم ہوا ہو تو اہل علم کہتے ہیں کہ وہ اسے اگلے دن اس کے وقت کے نظیر وقت میں پڑھے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قضا کی تین قسمیں ہیں:

○ جس کی قضا عذر زائل ہونے کے بعد دی جائے' اس سے مراد نماز پنجگانہ' نماز وتر اور ان کے مشابہ سنن مؤکدہ ہیں۔

○ جس کے بدل کی قضا دی جائے گی۔ اس سے مراد نماز جمعہ ہے کہ فوت ہونے کی صورت میں قضا کے طور پر نماز ظہر ادا کی جائے گی۔

○ جس کی اپنی قضا تو دی جائے گی لیکن اگلے دن اس کے وقت کے نظیر وقت میں' اس سے مراد نماز عید ہے کہ زوال کی وجہ سے اگر فوت ہوجائے تو اگلے دن اس کے وقت کے نظیر وقت میں ادا کی جائے گی۔ واللہ الموفق۔

بہت باریک کپڑوں میں نماز پڑھنے کے متعلق کیا حکم ہے؟

سوال بہت سے لوگ ایسے باریک کپڑوں میں نماز پڑھتے ہیں جن سے جسم نظر آتا ہے اور ایسے کپڑوں کے نیچے وہ چھوٹی نیکریں پہنتے ہیں' جو نصف ران تک ہوتی ہیں اور باقی نصف ران کپڑوں میں سے نظر آتی ہے تو ایسے لوگوں کی نماز کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب ایسے لوگوں کی نماز کے بارے میں وہی حکم ہوگا جو اس شخص کی نماز کے بارے میں ہوگا جو چھوٹی نیکر کے سوا بغیر کپڑوں کے نماز پڑھ لے کیونکہ ایسے باریک کپڑے جن سے جسم نظر آتا ہو جسم کو چھپانے والے نہیں ہیں' ان کا پہننا یا نہ پہننا برابر ہے' لہٰذا علماء کے صحیح قول کے مطابق ان کی نماز صحیح نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں امام احمد رحمہ اللہ کا مشہور مذہب بھی یہی ہے کیونکہ مرد نمازیوں کے لیے واجب ہے کہ وہ ناف سے لے کر گھٹنے تک جسم کے حصے کو چھپائیں اور حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ کی یہ کم سے کم تعمیل ہے:

﴿ ۞ يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ خُذُواْ زِينَتَكُمۡ عِندَ كُلِّ مَسۡجِدٖ ﴾ (الأعراف: ٧/ ٣١)

''اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنے تئیں مزین کیا کرو۔''

ایسے لوگوں کے لیے دو باتوں میں سے ایک واجب ہے کہ یا تو وہ ایسی نیکریں پہنیں جو ناف سے لے کر گھٹنے تک کے حصے کو ڈھانکیں اور یا پھر ان نیکروں کے اوپر وہ ایسا موٹا لباس پہنیں جس سے جسم نظر نہ آئے۔ یہ فعل جو سوال میں ذکر کیا گیا ہے، غلط اور خطرناک ہے ان لوگوں کو چاہیے کہ اس فعل سے اللہ تعالیٰ کے آگے توبہ کریں اور اس مکمل ستر پوشی کا اہتمام کریں جو نماز میں واجب ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اور اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے ہدایت، توفیق اور پسندیدہ اعمال کی دعا کرتے ہیں۔ إنه جوّاد کریم.

کیا عورت ایسے لباس میں نماز پڑھ سکتی ہے جو دائیں بائیں سے کھلا ہو؟

سوال عورت کے لیے ایسے لباس کے بارے میں کیا حکم ہے، جو آگے، دائیں بائیں اور پیچھے کی طرف سے کھلا ہوا ہو اور پنڈلی کا حصہ بھی ننگا ہو اور ایسے لباس میں دلیل یہ دی جائے کہ وہ تو عورتوں ہی کے درمیان ہیں اور وہاں انھیں دیکھنے والا کوئی مرد نہیں ہے؟

جواب میری رائے میں عورت کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ ایسا لباس زیب تن کرے جو اس کے سارے جسم کو ڈھانک لے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ہے کہ نبی ﷺ کے عہد مبارک میں عورتیں ایسی قمیصیں پہنتی تھیں، جو پاؤں کی طرف سے ٹخنوں تک اور ہاتھوں کی طرف سے ہتھیلیوں تک ہوتی تھیں، بے شک لباس کے یہ کھلے ہوئے حصے جن کی طرف سائل نے اشارہ کیا ہے پنڈلی کو اور بسا اوقات پنڈلی سے بھی اوپر کے حصے کو ننگا کر دیتے ہیں۔ عورت کے لیے واجب ہے کہ وہ کامل شرم وحیا کا مظاہرہ کرے اور ایسا لباس زیب تن کرے جو اس کے تن بدن کو ڈھانک لے تاکہ وہ نبی ﷺ کے اس فرمان میں داخل نہ ہو:

«صِنْفَانِ مِنْ أَهْلِ النَّارِ لَمْ أَرَهُمَا، قَوْمٌ مَعَهُمْ سِيَاطٌ كَأَذْنَابِ الْبَقَرِ يَضْرِبُونَ بِهَا النَّاسَ، وَنِسَاءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ، مُمِيلاَتٌ مَائِلاَتٌ، رُؤُوسُهُنَّ كَأَسْنِمَةِ الْبُخْتِ الْمَائِلَةِ لاَ يَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ، وَلاَ يَجِدْنَ رِيحَهَا، وَإِنَّ رِيحَهَا لَتُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ كَذَا وَكَذَا» (صحيح مسلم، اللباس والزينة، باب النساء الكاسيات العاريات ... ح: ٢١٢٨)

”جہنمیوں کی دو قسمیں ایسی ہیں، جن کو میں نے ابھی تک نہیں دیکھا: وہ لوگ جن کے پاس گائے کی دموں جیسے کوڑے ہوں گے جن کے ساتھ وہ لوگوں کو ماریں گے اور ایسی عورتیں جنھوں نے لباس پہنا ہوگا مگر ننگی ہوں گی، مائل کرنے والیاں اور مائل ہونے والیاں ان کے سر بختی اونٹوں کی کوہانوں جیسے ہوں گے۔ وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گی اور نہ اس کی خوشبو پا سکیں گی حالانکہ جنت کی خوشبو بہت دور دراز کی مسافت سے آتی ہوگی۔“

عورت کا نقاب اور دستانے پہن کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟

سوال کیا عورت نقاب اور دستانے کے ساتھ نماز پڑھ سکتی ہے؟

جواب جب عورت اپنے گھر میں یا کسی ایسی جگہ نماز پڑھ رہی ہو جہاں اسے محرموں کے سوا دیگر مرد نہ دیکھتے ہوں تو اسے چہرہ اور دونوں ہاتھ ننگے کر کے نماز پڑھنی چاہیے تاکہ وہ سجدہ کی جگہ پیشانی، ناک اور دونوں ہاتھ رکھ سکے۔ اور اگر وہ کسی ایسی جگہ نماز پڑھ رہی

ہو‘ جہاں غیر محرم مرد ہوں تو پھر چہرے کو ڈھانکنا ضروری ہے کیونکہ غیر محرم مردوں سے چہرے کو چھپانا واجب ہے اور ان کے سامنے اسے کھلا رکھنا حلال نہیں ہے جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کتاب‘ رسول اللہ ﷺ کی سنت اور قیاس صحیح سے ثابت ہے‘ جس سے مومن تو کجا کوئی عقل مند انسان بھی صرف نظر نہیں کر سکتا۔ ہاتھوں میں دستانوں کو پہننا شرعاً جائز ہے اور بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عورتیں دستانوں کو پہنا کرتی تھیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«لاَ تَنْتَقِبِ الْمُحْرِمَةُ، وَلاَ تَلْبَسِ الْقُفَّازَيْنِ»(صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب ما ينهى من الطِّيب للمحرم والمحرمة، ح:١٨٣٨)

”محرم عورت نہ نقاب اوڑھے اور نہ دستانے پہنے۔“

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ صحابیات کی عادت دستانے پہننے کی تھی‘ لہٰذا اس میں کوئی حرج نہیں کہ عورت نے نماز پڑھتے ہوئے دستانے پہن رکھے ہوں جب کہ وہاں اجنبی مرد ہوں۔ جہاں تک چہرے کو ڈھانکنے کا تعلق ہے تو جب وہ کھڑی یا بیٹھی ہوگی تو چہرے کو ڈھانکے گی اور جب سجدہ کرنے لگے گی تو چہرے کو ننگا کر لے گی تاکہ پیشانی سجدہ کی جگہ پر لگ جائے۔

لاعلمی کی وجہ سے ناپاک کپڑوں میں نماز پڑھ لی جائے تو؟

سوال اگر کوئی شخص لاعلمی کی وجہ سے ناپاک کپڑوں میں نماز پڑھ لے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جب انسان ناپاک کپڑوں میں نماز پڑھ لے اور اسے نماز پڑھنے کے بعد معلوم ہوا ہو کہ یہ کپڑے ناپاک تھے یا اسے علم تو تھا مگر نماز پڑھنے کے بعد اسے یاد آیا ہو تو اس کی نماز صحیح ہے‘ اسے دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس نے ایک ممنوع کام کا ارتکاب ناواقفیت یا نسیان کی وجہ سے کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَآ إِن نَّسِينَآ أَوۡ أَخۡطَأۡنَا﴾ (البقرة: ٢/ ٦٨٢)

”اے پروردگار اگر ہم سے بھول چوک ہوگئی ہو تو ہم سے مؤاخذہ نہ کیجیے۔“

اور بندہ جب یہ دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿قَدۡ فَعَلۡتُ﴾ ”میں نے ایسا ہی کیا۔“① رسول اللہ ﷺ نے ایک دن اپنے ناپاکی والے جوتوں سمیت نماز پڑھ لی تھی۔ نماز کے دوران میں جبریل علیہ السلام نے آپ کو اس کی خبر دی تو آپ نے نماز پڑھتے ہوئے جوتے اتار دیے اور نماز کو دوبارہ از سر نو شروع نہ فرمایا‘ لہٰذا یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے جسے نماز کے دوران میں ناپاکی کا علم ہو جائے تو وہ اسے زائل کر دے خواہ نماز کے دوران ہی میں اسے ایسا کرنا پڑے اور نماز کو جاری رکھے بشرطیکہ اس کے ازالہ کے بعد اس کی برہنگی کو چھپائے رکھنا ممکن ہو۔ اسی طرح جو شخص بھول جائے اور اسے دوران نماز میں یاد آئے تو وہ اس ناپاک کپڑے کو اتار دے بشرطیکہ اس صورت میں شرم وحیا کے مقام مستور ہوں اور اگر وہ نماز سے فارغ ہو جائے اور فراغت کے بعد اسے یاد آئے یا فراغت کے بعد اسے معلوم ہو تو نماز کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے‘ اس کی نماز صحیح ہوگی۔

---

① صحیح مسلم‘ الایمان‘ باب بیان أنه سبحانه لم یکلف إلا مایطاق‘ حدیث:126

اگر کوئی بھول کر بلا وضو نماز پڑھ رہا ہو‘ مثلاً: اس کا وضو ٹوٹ گیا تھا اور وہ وضو کرنا بھول گیا اور اس نے نماز پڑھ لی اور نماز سے فراغت کے بعد اسے یاد آیا کہ اس نے تو وضو نہیں کیا تھا تو اس کے لیے واجب ہے کہ وہ وضو کر کے دوبارہ نماز پڑھے۔ اسی طرح اگر وہ جنبی تھا لیکن اسے معلوم نہ تھا‘ مثلاً: رات کو اسے احتلام ہوا اور اسے پتہ نہ چل سکا اور صبح کی نماز اس نے بلا غسل پڑھ لی اور دن کو اسے اپنے کپڑے میں منی نظر آئی تو اس کے لیے واجب ہے کہ وہ غسل کر کے نماز دوبارہ پڑھے۔

پہلے مسئلہ میں اور اس مسئلہ میں فرق یہ ہے کہ نجاست ترک ممنوع کے باب سے ہے اور وضو و غسل فعل مامور کے باب سے۔ اور فعل مامور ایجادی امر ہے‘ ضروری ہے کہ انسان اسے بجالائے کیونکہ اس کے بغیر عبادت ادا نہیں ہوگی جب کہ ازالۂ نجاست ایک عدمی امر ہے‘ نماز اسے معدوم کر دینے کے بعد ہوگی‘ لہٰذا اگر نسیان یا ناواقفیت کی وجہ سے وہ اس کا ازالہ نہیں کر سکا تو یہ اس کے لیے نقصان نہ ہوگا کیونکہ اس سے کوئی ایسی چیز فوت نہیں ہوئی جس کا حصول نماز میں مطلوب تھا۔ واللہ اعلم۔

کپڑا ٹخنوں سے نیچے لٹکانے کی سزا

سوال اگر کوئی شخص تکبر کے ساتھ کپڑا ٹخنوں سے نیچے لٹکائے تو اس کی سزا کیا ہے؟ اگر مقصود تکبر نہ ہو تو پھر سزا کیا ہے؟ اور جو شخص اس سلسلہ میں حدیث حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے استدلال کرے تو اسے کیا جواب دیا جائے؟

جواب جو شخص از راہ تکبر کپڑا ٹخنوں سے نیچے لٹکائے تو اس کی سزا یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف دیکھے گا‘ نہ کلام کرے گا اور نہ اسے پاک کرے گا اور اس کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ اگر مقصود تکبر نہ ہو تو اس کی سزا یہ ہوگی کہ ٹخنوں سے نیچے کے حصے کو دوزخ میں آگ کا عذاب دیا جائے گا کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«ثَلاَثَةٌ لاَ يُكَلِّمُهُمُ اللهُ يَوْمَ الْقِيامَةِ، وَلاَ يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ وَلاَ يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ: اَلْمُسْبِلُ وَالْمَنَّانُ، وَالْمُنَفِّقُ سِلْعَتَهُ بِالْحَلْفِ الْكَاذِبِ»(صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان غلظ تحريم إسبال الإزار ... ح:١٠٦)

”تین شخص ایسے ہیں‘ جن سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نہ کلام فرمائے گا‘ نہ ان کی طرف دیکھے گا‘ نہ انھیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا: کپڑے کو نیچے لٹکانے والا‘ احسان جتلانے والا اور‘ اپنے سودے کو جھوٹی قسم کے ساتھ بیچنے والا۔“

اور نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے:

«مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ خُيَلاَءَ لَمْ يَنْظُرِ اللهُ إِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»(صحيح البخاري، اللباس، باب من جر إزار من غير خيلاء، ح:٥٧٨٤ وصحيح مسلم، اللباس، باب تحريم جر الثوب خيلاء، ح.٢٠٨٥(٤٤)

”جو شخص تکبر کے ساتھ کپڑے کو گھسیٹے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف دیکھے گا بھی نہیں۔“

یہ وعید اس شخص کے بارے میں ہے‘ جو اپنے کپڑے کو تکبر کے ساتھ گھسیٹے اور جس شخص کا مقصد تکبر نہ ہو تو صحیح بخاری

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«مَا أَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ مِنَ الإِزَارِ فِي النَّارِ»(صحيح البخاري، اللباس، باب ما أسفل من الكعبين فهو في النار، ح:٥٧٨٧)

’’تہبند کا جو حصہ ٹخنوں سے نیچے ہو، وہ جہنم میں ہوگا۔‘‘

نبی ﷺ نے اسے تکبر کے ساتھ مقید نہیں فرمایا اور نہ مذکورہ بالا حدیث کے پیش نظر اسے مقید کرنا صحیح ہے کیونکہ حضرت ابوسعید خدری ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِزْرَةُ الْمُسْلِمِ إِلٰى نِصْفِ السَّاقِ وَلاَ حَرَجَ - أَوْ لاَ جُنَاحَ - فِيمَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْكَعْبَيْنِ، مَا كَانَ أَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ فَهُوَ فِي النَّارِ، مَنْ جَرَّ إِزَارَهُ بَطَرًا لَمْ يَنْظُرِ اللّٰهُ إِلَيْهِ»(سنن أبي داود، اللباس، باب في قدر موضع الإزار، ح:٤٠٩٣ وسنن ابن ماجه، اللباس، باب موضع الإزار أين هو، ح:٣٥٧٣ ومسند أحمد: ٣/ ٥)

’’مسلمان کا تہبند نصف پنڈلی تک ہے، نصف پنڈلی اور ٹخنوں کے درمیان جو ہو اس میں کوئی حرج یا گناہ نہیں اور جو ٹخنوں سے نیچے ہو، وہ آگ میں ہوگا اور جس نے تکبر کے ساتھ اپنے تہبند کو گھسیٹا تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف دیکھے گا بھی نہیں۔‘‘

دونوں عمل مختلف ہیں، اس لیے ان کی سزائیں بھی مختلف ہیں اور جب حکم اور سبب مختلف ہوں تو مطلق کو مقید پر محمول کرنا ممنوع ہوتا ہے کیونکہ اس سے تناقض لازم آتا ہے۔ جو شخص حدیث حضرت ابوبکر ؓ کو ہمارے خلاف بطور دلیل پیش کرے تو ہم کہیں گے کہ یہ حدیث تمھارے لیے دلیل نہیں بن سکتی اور اس کی درج ذیل وجوہ ہیں: ① حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے کہا تھا:

«إِنَّ أَحَدَ شِقَّيْ إِزَارِي يَسْتَرْخِي إِلاَّ أَنْ أَتَعَاهَدَ ذٰلِكَ مِنْهُ»(صحيح البخاري، اللباس، باب من جر إزاره من غير خيلاء، ح:٥٧٨٤)

’’میرے تہبند کی ایک جانب ڈھیلی ہو جاتی ہے لیکن میں اس کا خیال رکھتا ہوں۔‘‘

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت صدیق اکبر ؓ اپنے اختیار سے کپڑے کو نیچے نہیں لٹکاتے تھے بلکہ وہ خود بخود ڈھیلا ہو جاتا تھا اور آپ اسے اوپر اٹھانے کی کوشش کرتے رہتے تھے لیکن جو لوگ کپڑوں کو خود قصد و ارادے سے لٹکاتے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ تکبر سے ایسا نہیں کرتے تو ہم ان سے کہیں گے کہ اگر تم اپنے کپڑوں کو خود ٹخنوں سے نیچے لٹکاؤ اور تمھارا مقصد فخر و غرور نہ ہو تو ٹخنے سے نیچے لٹکائے جانے والے کپڑے کی وجہ سے تمھیں آگ کا عذاب ہوگا اور اگر تم فخر و غرور کے ساتھ لٹکاؤ تو تمھیں اس سے زیادہ بڑا عذاب ہوگا اور وہ یہ کہ روز قیامت اللہ تعالیٰ تم سے کلام نہیں فرمائے گا، تمھاری طرف دیکھے گا بھی نہیں، تمھیں پاک نہیں کرے گا اور تمھارے لیے دردناک عذاب ہوگا۔

② نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر ؓ کا تزکیہ فرمادیا تھا اور خود آپ نے گواہی دی کہ وہ تکبر کی وجہ سے ایسا نہیں کرتے تو کیا ان میں سے کسی نے بھی اس طرح کا تزکیہ اور شہادت حاصل کر رکھی ہے۔ بات یہ ہے کہ شیطان بعض لوگوں کے لیے کتاب و سنت کے متشابہ نصوص کے اتباع کا دروازہ کھول دیتا ہے تاکہ ان کے لیے ان کے عمل کا جواز فراہم کر سکے لیکن اللہ تعالیٰ جسے چاہے صراط مستقیم کی ہدایت عطا فرما دیتا ہے۔ ہم اپنے لیے اور ان کے لیے بھی اللہ تعالیٰ سے ہدایت و عافیت کی دعا کرتے ہیں۔ یہ

فتویٰ 1399/6/29ھ کو تحریر کیا گیا۔

واجب غسل کیے بغیر نماز پڑھنے والے کے متعلق حکم

سوال جس شخص نے نماز پڑھ لی اور نماز پڑھنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ اس پر غسل واجب تھا تو وہ کیا کرے؟

جواب ہر انسان جسے نماز پڑھنے کے بعد معلوم ہو کہ وہ بڑی یا چھوٹی ناپاکی میں مبتلا تھا' تو اس کے لیے واجب ہے کہ وہ اس ناپاکی سے طہارت حاصل کرلے اور پھر نماز دوبارہ پڑھے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«لاَ يَقْبَلُ اللهُ صَلاَةً بِغَيْرِ طُهُورٍ»(صحيح مسلم، الطهارة، باب وجوب الطهارة للصلاة، ح:٢٢٤ وسنن النسائي، الطهارة، باب فرض الوضوء، ح:١٣٩ واللفظ له)

''اللہ تعالیٰ طہارت کے بغیر کوئی نماز بھی قبول نہیں فرماتا۔''

اگر نماز میں نکسیر پھوٹ جائے تو کیا حکم ہے؟

سوال جس انسان کی نماز میں نکسیر پھوٹ جائے' اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا اس کا کپڑا ناپاک ہو جائے گا؟

جواب نکسیر پھوٹنے سے وضو نہیں ٹوٹتا' خواہ خون زیادہ ہو یا کم۔ اسی طرح سبیلین کے علاوہ جسم سے نکلنے والی باقی چیزوں سے بھی وضو نہیں ٹوٹتا' مثلاً: قے آنے سے اور زخموں سے نکلنے والے مادہ سے بھی وضو نہیں ٹوٹتا خواہ وہ کم ہو یا زیادہ کیونکہ یہ نبی ﷺ سے ثابت نہیں اور اصل بقائے طہارت ہے اور یہ طہارت دلیل شرعی سے ثابت ہوتی ہے۔ جو بمقتضائے دلیل شرعی ثابت ہو' وہ دلیل شرعی کے مقتضا کے ساتھ ہی ختم ہو سکتی ہے اور ایسی کوئی دلیل نہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ سبیلین کے علاوہ جسم کے کسی حصے سے خارج ہونے والی کوئی اور چیز بھی ناقض وضو ہے۔ لہٰذا نکسیر یا قے سے وضو نہیں ٹوٹے گا' خواہ وہ قلیل مقدار میں ہو یا کثیر مقدار میں' البتہ اگر آپ کو اس سے نماز میں پریشانی ہو اور خشوع کے ساتھ نماز پڑھنا ممکن نہ ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ آپ نماز توڑ دیں۔ اسی طرح اگر خون کی وجہ سے مسجد کے آلودہ ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر نماز توڑنا واجب ہے تاکہ نکسیر کے خون کے ساتھ مسجد آلودہ نہ ہو۔ نکسیر کا کپڑوں پر گرنے والا خون معمولی مقدار میں ہوتا ہے اس سے کپڑا ناپاک نہیں ہوتا۔

کیا قبر والی مسجد میں نماز ادا کرنا جائز ہے؟

سوال ایسی مسجد میں نماز کے بارے میں کیا حکم ہے جس میں قبر ہو؟

جواب ایسی مسجد کی دو قسمیں ہیں' جن میں قبر ہو: ① قبر مسجد سے پہلے ہو یعنی مسجد کو قبر پر بنایا گیا ہو' اس صورت میں اس مسجد کو چھوڑ دینا اور اس میں نماز نہ پڑھنا واجب ہے۔ مسجد بنانے والے کو چاہیے کہ اسے منہدم کردے اور اگر وہ از خود ایسا نہ کرے تو مسلمان حکمران کو چاہیے کہ اسے گرادے۔ ② مسجد قبر سے پہلے بنی ہو اور مسجد کے بننے کے بعد اس میں میت کو دفن کیا گیا ہو تو اس صورت میں واجب ہے کہ قبر کو اکھاڑ دیا جائے اور میت کو اس سے نکال کر مسلمانوں کے ساتھ قبرستان میں دفن کردیا جائے۔ ایسی مسجد میں نماز

جائز ہوگی' بشرطیکہ قبر نمازی کے سامنے نہ ہو کیونکہ نبی ﷺ نے قبروں کی طرف نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔

جہاں تک نبی ﷺ کی قبر کا تعلق ہے' جو مسجد نبوی میں شامل ہے' تو یہ سبھی جانتے ہیں کہ نبی ﷺ کی مسجد آپ کی وفات سے پہلے تعمیر کی گئی تھی یعنی مسجد نبوی قبر پر نہیں بنائی گئی اور یہ بھی معلوم ہے کہ نبی ﷺ کو مسجد میں دفن نہیں کیا گیا تھا بلکہ آپ کو تو اپنے گھر میں دفن کیا گیا تھا جو مسجد سے الگ تھا۔ ولید بن عبدالملک نے اپنے عہد میں امیر مدینہ عمر بن عبدالعزیز ؒ کو سن 88ھ میں خط لکھا کہ مسجد نبوی کو منہدم کر کے ازواج مطہرات کے حجروں کو اس میں شامل کر دو۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز ؒ نے سرکردہ لوگوں اور فقہاء کو جمع کیا اور انہیں امیر المؤمنین ولید کا خط پڑھ کر سنایا تو یہ ان پر بہت گراں گزرا اور انہوں نے کہا کہ انھیں ان کے حال پر چھوڑنا زیادہ موجب نصیحت ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت سعید بن مسیّب ؒ نے حضرت عائشہ ؓ کے حجرہ کو مسجد میں شامل کرنے کی مخالفت کی تھی گویا آپ اس بات سے ڈرے کہ قبر کو سجدہ گاہ بنالیا جائے گا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے یہ ولید کی طرف لکھ دیا مگر ولید نے جواب میں اپنے حکم کے مطابق عمل پر زور دیا' لہٰذا حضرت عمر بن عبدالعزیز ؒ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کی قبر کو مسجد میں نہیں بنایا گیا تھا اور نہ مسجد نبوی کو قبر پر بنایا گیا تھا تو مسجدوں میں دفن کرنے والوں یا قبروں پر مسجدیں بنانے والوں کے لیے یہ بات دلیل نہیں بن سکتی۔ اور حدیث سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا تھا:

«لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الْيَهُودِ وَالنَّصَارىٰ اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ»(صحيح البخاري، الصلاة، باب: ٥٥، ح: ٤٣٥ وصحيح مسلم، المساجد، باب النهي عن بناء المسجد على القبور، ح: ٥٣١)

"یہود و نصاریٰ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو کہ انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجدیں بنالیا تھا۔"

آپ نے یہ بات دنیا سے رخصت ہوتے وقت ارشاد فرمائی تھی' گویا آپ نے اپنی امت کو اس طرح کے کاموں سے منع فرمایا۔ اور جب حضرت ام سلمہ ؓ نے نبی ﷺ کے سامنے اس کنیسہ اور اس میں بنی ہوئی تصویروں کا ذکر کیا جسے انھوں نے ارض حبشہ میں دیکھا تھا' تو آپ نے فرمایا:

«أُولٰئِكَ إِذَا مَاتَ مِنْهُمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ بَنَوا عَلَى قَبْرِهِ مَسْجِدًا ثُمَّ صَوَّرُوا فِيهِ تِلْكَ الصُّورَةَ أُولٰئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللهِ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب بناء المسجد على القبر، ح: ١٣٤١ وصحيح مسلم، المساجد، باب النهي عن بناء المسجد على القبور، ح: ٥٢٨)

"یہ لوگ ایسے تھے کہ جب ان میں کوئی نیک شخص فوت ہو جاتا تو اس کی قبر پر مسجد بنا دیتے تھے اور پھر اس میں یہ تصویریں بنا دیتے تھے اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ لوگ مخلوق میں سب سے بدترین ہیں"

اور حضرت ابن مسعود ؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ مِنْ شِرَارِ النَّاسِ مَنْ تُدْرِكُهُ السَّاعَةُ وَهُمْ أَحْيَاءٌ، وَمَنْ يَتَّخِذُ الْقُبُورَ مَسَاجِدَ»(مسند أحمد: ١/ ٤٠٥، ٤٣٥)

"سب سے بدترین وہ لوگ ہوں گے جنہیں قیامت پائے گی اور وہ زندہ ہوں گے اور وہ جو قبروں کو مسجدیں بناتے ہوں گے۔"

مومن اس بات کو پسند نہیں کرسکتا کہ وہ یہود و نصاریٰ کے طریقے پر چلے یا اس کا بدترین مخلوق میں شمار ہو۔ یہ فتویٰ

1412/4/7ھ کو لکھا گیا۔

حمام اور بیت الخلا کی چھت پر نماز ادا کرنا کیسا ہے؟

سوال حمام اور بیت الخلا کی چھت پر نماز پڑھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب حماموں کی چھتوں پر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ آج کل ہمارے حماموں کی کوئی الگ سے عمارتیں نہیں بنی ہوتیں' ان کی چھت سارے گھر کی چھت میں شامل ہوتی ہے۔ اسی طرح لیٹرینوں کی چھتوں پر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ بھی نبی ﷺ کے درج ذیل فرمان کے عموم میں داخل ہیں:

«وَجُعِلَتْ لِيَ الأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُورًا»(صحيح البخاري، الصلاة، باب قول النبي ﷺ: "جعلت لي ....'، ح:٤٣٨)

''اور میرے لیے ساری زمین کو مسجد اور پاک بنا دیا گیا ہے''

مسجد حرام میں جوتوں سمیت نہیں چلنا چاہیے

سوال مسجد حرام کی زمین پر جوتوں سمیت چلنے والوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب مسجد حرام کی زمین پر جوتوں سمیت نہیں چلنا چاہیے کیونکہ اس سے ان عوام کے لیے دروازہ کھلتا ہے جو مسجد کا احترام نہیں کرتے اور پانی کے ساتھ گیلے جوتوں سمیت مسجد میں آجاتے ہیں' ممکن ہے کہ ان کے جوتے نجاستوں سے آلودہ ہوں اور وہ اپنے جوتوں سمیت مسجد میں داخل ہو کر اسے بھی آلودہ کر دیں۔ شریعت کا یہ اصول ہے کہ اگر ایک چیز کے ارتکاب سے خرابی کا کوئی پہلو نکلتا ہو تو واجب ہے کہ اس خرابی کی وجہ سے اسے ترک کر دیا جائے۔ اہل علم کے ہاں یہ قاعدہ معروف ہے: ''جب مصالح اور مفاسد میں اختلاف ہو اور دونوں کا پہلو برابر ہو یا مفاسد کا پہلو راجح ہو تو اس صورت میں مفسدہ کو دور کر دینا مصالح اختیار کرنے کی نسبت زیادہ بہتر ہوگا۔''

نبی ﷺ نے ارادہ فرمایا تھا کہ کعبہ شریف کی عمارت کو منہدم کر کے' حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر عمارت کو از سر نو تعمیر فرمائیں لیکن لوگ کفر کو چھوڑ کر نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے' لہٰذا فساد کے اندیشہ کے پیش نظر آپ نے اپنے اس ارادے کو ترک فرما دیا۔ آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

«لَوْلاَ أَنَّ قَوْمَكِ حَدِيثُ عَهْدٍ بِجَاهِلِيَّةٍ لأَمَرْتُ بِالْبَيْتِ فَهُدِمَ فَأَدْخَلْتُ فِيهِ مَا أُخْرِجَ مِنْهُ وَأَلْزَقْتُهُ بِالأَرْضِ وَجَعَلْتُ لَهُ بَابَيْنِ بَابًا شَرْقِيًّا وَبَابًا غَرْبِيًّا فَبَلَغْتُ بِهِ أَسَاسَ إِبْرَاهِيمَ»

(صحيح البخاري، الحج، باب فضل مكة وبنيانها، ح:١٥٨٦ وصحيح مسلم، الحج، باب نقض الكعبة وبنائها، ح:١٣٣٣)

''اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تمھاری قوم نے جاہلیت کو نیا نیا چھوڑا ہے تو میں حکم دیتا اور بیت اللہ کو منہدم کر دیا جاتا اور پھر میں اس میں اس حصے کو بھی داخل کر دیتا جس کو اس سے خارج کر دیا گیا تھا اور اسے زمین کے ساتھ لگا دیتا اور اس کے دو

دروازے بنا دیتا' ایک مشرقی دروازہ اور دوسرا مغربی دروازہ' اور اسے ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر استوار کر دیتا۔''

عین قبلہ سے تھوڑا ہٹ جانے سے نماز باطل نہیں ہوتی

سوال جب نمازی کو معلوم ہو کہ وہ قبلہ سے تھوڑا سا ہٹ گیا ہے تو کیا وہ نماز دوبارہ پڑھے؟

جواب قبلہ سے تھوڑا سا ہٹ جانا نقصان دہ نہیں ہے اور یہ حکم اس کے لیے ہے جو مسجد حرام میں نہ ہو کیونکہ مسجد حرام میں تو نمازی کا قبلہ یعنی عین کعبہ سامنے موجود ہوتا ہے۔ اسی لیے علماء نے فرمایا ہے کہ جس کے لیے کعبہ کا مشاہدہ ممکن ہو' اگر وہ عین کعبہ کے سامنے نہیں ہے تو اسے نماز دوبارہ پڑھنی ہوگی کیونکہ اس کی نماز صحیح نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ ٱلْمَسْجِدِ ٱلْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا۟ وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُۥ ﴾ (البقرة: ٢/ ١٤٤)

''تو اپنا چہرہ مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ) کی طرف پھیر لے اور تم لوگ جہاں ہوا کرو (نماز پڑھنے کے وقت) اسی کی طرف چہرہ کر لیا کرو۔''

اگر انسان کعبہ سے دور ہو اور اس کے لیے کعبہ کا مشاہدہ ممکن نہ ہو' خواہ وہ مکہ ہی میں ہو تو اس کے لیے قبلہ کی جہت چہرہ کرنا واجب ہے اور تھوڑا سا قبلہ سے ہٹ جانا اس کے لیے نقصان دہ نہیں ہے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ سے فرمایا تھا:

«مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ»(جامع الترمذي، الصلاة، باب ماجاء: أن ما بين المشرق والمغرب قبلة، ح: ٣٤٢ وسنن ابن ماجه، الصلاة، باب القبلة، ح: ١٠١١)

''مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔''

اس لیے کہ اہل مدینہ جنوب کی طرف منہ کرتے ہیں' تو مشرق و مغرب کے درمیان کا سارا علاقہ ان کے حق میں قبلہ ہے (یعنی رُخ تھوڑا سا مشرق یا مغرب کی طرف ہٹ جائے تو فرق نہیں پڑتا' اس لیے کہ مقصود جہتِ قبلہ ہے نہ کہ عین قبلہ) اسی طرح جو لوگ مغرب (یا مشرق) کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں' ان کے لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جنوب و شمال کے مابین قبلہ ہے۔

غیر قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم

سوال جب جماعت غیر قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لے' تو اس نماز کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اس مسئلہ کی دو حالتیں ہو سکتی ہیں: ① وہ ایسی جگہ ہوں' جہاں انھیں قبلہ کا علم ہی نہ ہو سکا ہو' مثلاً وہ سفر میں ہوں' آسمان ابر آلود ہو' انھیں جہت قبلہ معلوم نہ ہو سکی ہو اور انھوں نے مقدور بھر کوشش سے قبلہ کے رخ کا تعین کر کے نماز پڑھ لی ہو اور پھر انھیں معلوم ہوا ہو کہ انھوں نے غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھی ہے تو اس صورت میں ان کے ذمہ کچھ واجب نہ ہوگا کیونکہ وہ مقدور بھر اللہ تعالیٰ سے ڈر گئے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ مَا ٱسْتَطَعْتُمْ ﴾ (التغابن: ٦٤/ ١٦)

''سو جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو۔''

اور نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«وَإِذَا أَمَرْتُكُم بِشَيْءٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ»(صحيح البخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ، ح:٧٢٨٨ وصحيح مسلم، الحج، باب فرض الحج مرة في العمر، ح:١٣٣٧(٤١٢))

’’اور جب میں تمھیں کسی چیز کا حکم دوں تو تم مقدور بھر اس کی اطاعت بجالاؤ۔‘‘

خاص اسی مسئلہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿١١٥﴾﴾ (النساء: ٢/ ١١٥)

’’اور مشرق اور مغرب اللہ ہی کے ہیں سو جدھر تم رخ کرو ادھر اللہ کی ذات ہے۔ بے شک اللہ صاحب وسعت اور باخبر ہے۔‘‘

② وہ ایسی جگہ ہوں جہاں ان کے لیے قبلہ کے بارے میں سوال کرنا ممکن ہو مگر وہ کوتاہی وسستی کی وجہ سے کسی سے نہ پوچھیں تو اس حالت میں ان کیلئے اس نماز کی قضا لازم ہوگی' جسے انھوں نے غیر قبلہ رخ ادا کیا ہے' خواہ انھیں اپنی غلطی کا علم نماز ختم کرنے سے پہلے ہو یا بعد میں کیونکہ اس حال میں یہ خطا کار ہیں۔ قبلہ کے بارے میں ان سے خطا ہوئی۔ گو انھوں نے جان بوجھ کر قبلہ سے انحراف نہیں کیا لیکن انھوں نے قبلہ کے بارے میں پوچھنے میں سستی وکوتاہی کا مظاہرہ کیا ہے' تاہم اگر قبلہ کی جہت سے معمولی سا انحراف ہو جائے تو وہ نقصان دہ نہیں ہے مثلاً یہ کہ وہ تھوڑا سا دائیں یا بائیں طرف جھک جائیں۔ نبی ﷺ نے اہل مدینہ سے فرمایا تھا:

«مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ»(جامع الترمذي، الصلاة، باب ماجاء: أن ما بين المشرق والمغرب قبلة، ح:٣٤٢ وسنن ابن ماجه، الصلاة، باب القبلة، ح:١٠١١)

’’مشرق ومغرب کے درمیان قبلہ ہے۔‘‘

جو لوگ کعبہ سے شمال کی طرف ہوں گے' ان سے ہم یہ کہیں گے کہ مشرق ومغرب کے درمیان قبلہ ہے اور جو جنوب کی طرف ہوں گے' ان کے لیے بھی یہی حکم ہے لیکن جو مشرق یا مغرب کی طرف ہوں گے' ان سے ہم یہ کہیں گے کہ شمال وجنوب کے درمیان قبلہ ہے' لہٰذا معمولی سے انحراف سے کوئی اثر اور نقصان نہیں ہوتا۔

یہاں ایک مسئلہ کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ جو شخص مسجد حرام میں ہو تو اس کے لیے عین کعبہ کی طرف منہ کرنا واجب ہے' محض جہت کعبہ کی طرف نہیں کیونکہ جب وہ عین کعبہ سے منحرف ہو جائے گا تو وہ قبلہ رخ نہ ہوگا۔ میں نے مسجد حرام میں بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ عین کعبہ کی طرف منہ نہیں کرتے' مثلاً: آپ دیکھیں گے کہ جب صف مستطیل اور طویل ہو تو آپ کو یقینی طور پر معلوم ہو جائے گا کہ ان میں سے بہت سے لوگوں کا عین کعبہ کی طرف رخ نہیں ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے' مسلمانوں کے لیے اس سے بچنا اور اس کی تلافی کرنا واجب ہے کیونکہ اس حالت میں جب وہ نماز پڑھیں گے تو غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھیں گے۔

نیت دل کے ارادے کا نام ہے' زبان کا اس سے کوئی تعلق نہیں

سوال زبان سے نیت کے الفاظ ادا کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِيءٍ مَا نَوٰى»(صحيح البخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدأ الوحي إلى رسول الله ﷺ، ح:١ وصحيح مسلم، الإمارة، باب إنما الاعمال بالنية، ح:١٩٠٧)

''تمام اعمال کا انحصار نیتوں پر ہے، ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہے، جو اس نے نیت کی۔''

لیکن نیت کا مقام دل ہے، یہ اس بات کی محتاج نہیں کہ اسے زبان سے ادا کیا جائے، مثلاً: آپ جب اٹھ کر وضو کرنے لگیں تو یہ نیت ہے۔ عقل مند اور ایسا انسان جسے کسی کام پر مجبور نہ کر دیا گیا ہو وہ جو کام بھی کرے گا وہ نیت ہی سے کرے گا، اس لیے بعض اہل علم نے کہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم پر کسی کام کو بلا نیت کرنے کی ذمہ داری عائد فرما دیتا تو یہ تکلیف مالا یطاق ہوتی۔

رسول اللہ ﷺ اور حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ ثابت نہیں کہ وہ نیت الفاظ سے ادا کرتے ہوں۔ جو لوگ الفاظ کے ساتھ نیت ادا کرتے ہیں وہ از روئے جہالت یا ان اہل علم کی تقلید کے طور پر ایسا کرتے ہیں جنھوں نے یہ کہا ہے کہ الفاظ کے ساتھ بھی نیت کی جائے تاکہ دل اور زبان میں ہم آہنگی ہو جائے۔ لیکن ہم کہیں گے کہ ان کی یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر یہ حکم شریعت ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اپنے قول یا فعل سے اسے امت کے سامنے بیان فرما دیتے۔ واللہ الموفق!

نفل پڑھنے والے امام کے پیچھے فرض نماز پڑھنا جائز ہے

سوال نفل پڑھنے والے امام کے پیچھے فرض نماز پڑھنے کے بارے میں کیا حکم ہے، مثلاً: نماز تراویح پڑھنے والوں کے ساتھ عشا کی نماز پڑھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب نماز تراویح پڑھنے والوں کے پیچھے عشا کی نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ نے صراحت بیان کی ہے کہ اگر کوئی مسافر ہو اور نماز کی ابتدا ہی میں وہ امام کے ساتھ شامل ہو جائے تو وہ امام کے ساتھ ہی سلام پھیرے، ورنہ نماز کا جو حصہ رہ گیا ہو، اسے امام کے سلام پھیرنے کے بعد مکمل کرے۔ ①

مسافر کا مقیم کے پیچھے نماز پڑھنا، نیز دوڑ کر جماعت میں شامل ہونا

سوال اگر مسافر مقیم امام کے ساتھ آخری دو رکعتیں پالے تو کیا قصر کی نیت کی وجہ سے، وہ امام کے ساتھ ہی سلام پھیر دے؟

---

① زیادہ مناسب یہ تھا کہ یہاں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی اس حدیث کا حوالہ دیا جاتا کہ [اَنَّ مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ كَانَ يُصَلِّى مَعَ النَّبِيِّ ﷺ ثُمَّ يَرْجِعُ فَيَؤُمُّ قَوْمَهُ] (صحیح البخاری، الأذان، باب اذا طوّل الامام ...... حدیث: 700 نیز ملاحظہ فرمائیں، حدیث: 6106,711,705,701) ''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے ساتھ نماز ادا کرتے اور پھر واپس جا کر اپنی قوم کی امامت کرواتے تھے۔'' اور ظاہر ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی وہ نماز فرض ہوتی تھی، جو آپ نبی ﷺ کی اقتدا میں ادا کرتے اور جب وہ اپنی قوم کی امامت فرماتے تو ان کی وہ نماز نفل اور ان کی قوم کی فرض ہوتی تھی، لہٰذا معلوم ہوا کہ نفل نماز ادا کرنے والے کے پیچھے فرض نماز ادا ہو سکتی ہے۔ (مترجم)

جواب مسافر کے لیے مقیم امام کی اقتدا میں نماز قصر کرنا جائز نہیں کیونکہ نبی ﷺ کے درج ذیل فرمان کے عموم کا یہی تقاضا ہے:

«فَمَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوا وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوا»(صحيح البخاري، الأذان، باب لا يسعى إلى الصلاة ... الخ، ح:٦٣٦ وصحيح مسلم، المساجد، باب استحباب إتيان الصلاة بوقار، ح:٦٠٢)

"لہٰذا نماز کا جو حصہ پالو اسے پڑھ لو اور جو فوت ہو جائے اسے مکمل کر لو۔"

لہٰذا مسافر جب مقیم امام کے ساتھ آخری دو رکعتیں پائے تو اس کے لیے واجب ہے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد دو رکعتیں اور پڑھے، اور یہ جائز نہیں کہ دو رکعتوں پر اکتفا کر کے وہ امام کے ساتھ سلام پھیر دے۔

سوال نماز کے لیے تیز تیز چل کر جانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب انسان کے لیے اس بات کی ممانعت ہے کہ وہ نماز کے لیے تیز تیز چل کر جائے کیونکہ نبی ﷺ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم نماز کے لیے سکون و وقار کے ساتھ چل کر جائیں اور تیز چل کر جانے سے منع فرمایا ہے البتہ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ ایسی تیز رفتاری میں کوئی حرج نہیں جو معیوب نہ سمجھی جاتی ہو اور پہلی رکعت کے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو، مثلاً: جب وہ مسجد میں داخل ہو اور امام حالت رکوع میں ہو اور وہ ایسی تیز رفتاری سے چلے جو بری نہ ہو۔ (لیکن) جیسا کہ بعض لوگ تیز دوڑتے بھاگتے ہوئے آتے ہیں تو یہ ممنوع ہے جب کہ سکون و وقار کے ساتھ آنا اور جلد بازی نہ کرنا افضل ہے خواہ اس کی رکعت فوت ہی کیوں نہ ہو جائے۔ حدیث کے عموم کا یہی تقاضا ہے۔

سوال کیا نماز با جماعت میں امام کے ساتھ رکعت پالینے کے لیے تیز چل کر آنا جائز ہے، فتویٰ سے نوازیں، اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت و نگہداشت فرمائے؟

جواب آپ جب مسجد میں آئیں اور امام رکوع کی حالت میں ہو تو جلدی نہ کریں اور صف تک پہنچنے سے پہلے نماز شروع نہ کریں کیونکہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے جب ایسا کیا تو نبی ﷺ نے ان سے فرمایا تھا:

«زَادَكَ اللّٰهُ حِرْصًا وَلاَ تَعُدْ»(صحيح البخاري، الأذان، باب: إذا ركع دون الصف، ح:٧٨٣)

"اللہ تعالیٰ تمھارے شوق میں اضافہ فرمائے، دوبارہ ایسا نہ کرنا۔"

مسجد میں بآواز بلند تلاوت جبکہ وہ نمازیوں کے لیے باعثِ تشویش ہو

سوال مسجد میں ایسی بلند آواز سے قرآن مجید پڑھنے کے بارے میں کیا حکم ہے۔ جو نمازیوں کے لیے تشویش کا سبب بنے؟

جواب آدمی کا مسجد میں ایسی حالت میں قرآن مجید پڑھنا جو نمازیوں یا پڑھنے والوں یا قاری قرآن کے لیے تشویش کا سبب بنے، حرام ہے، نبی ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا میں بیاضی (فروہ بن عمرو) سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ مسجد میں تشریف لائے جب کہ لوگ اس طرح نماز پڑھ رہے تھے کہ قراءت میں ان کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں تو آپ نے فرمایا:

«إِنَّ الْمُصَلِّي يُنَاجِي رَبَّهُ عَزَّوَجَلَّ فَلْيَنْظُرْ أَحَدُكُمْ بِمَا يُنَاجِي رَبَّهُ وَلاَ يَجْهَرْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ بِالْقِرَاءَةِ»(سنن أبي داود، الصلاة، باب رفع الصوت بالقراءة في صلاة الليل، ح:١٣٣٢

ومسند أحمد: ٢/ ٦٧ واللفظ له)

”بے شک نمازی اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے' لہٰذا تم میں سے ہر ایک کو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ اپنے رب سے کیا سرگوشی کر رہا ہے اور کوئی کسی سے بڑھ کر بلند آواز میں قراءت نہ کرے۔“

تحیۃ المسجد کا حکم

سوال بعض لوگ جب اقامت کے وقت کے قریب مسجد میں آتے ہیں تو وہ امام کی آمد کے انتظار میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور تحیۃ المسجد ترک کر دیتے ہیں' ان کے اس عمل کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اگر مدت اتنی تھوڑی ہو کہ تحیۃ المسجد کو ادا نہ کیا جا سکتا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں اور اگر معلوم نہ ہو کہ امام کب آئے گا تو افضل یہ ہے کہ وہ تحیۃ المسجد پڑھیں۔ پھر اگر امام آ جائے اور نماز کے لیے اقامت کہہ دی جائے اور آپ ابھی پہلی رکعت میں ہوں تو اسے توڑ دیں اور اگر دوسری رکعت میں ہو تو ہلکی سی یہ رکعت پڑھ لیں۔

مسجد حرام میں مردوں اور عورتوں کی صفوں کی ترتیب اور بچوں کی صف کا بیان

سوال بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ مسجد حرام میں' فرض نماز میں عورتوں کی صفوں کے پیچھے صف بنا لیتے ہیں' کیا اس صورت میں ان کی نماز قبول ہو جاتی ہے؟ کیا ان کے پاس اپنے اس عمل کی کوئی توجیہ ہے؟

جواب جب مرد عورتوں کے پیچھے نماز پڑھیں' تو اہل علم نے کہا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں لیکن یہ خلاف سنت ہے کیونکہ سنت یہ ہے کہ عورتیں مردوں کے پیچھے ہوں۔ مسجد حرام میں بہت بھیڑ ہوتی ہے' عورتیں آتی ہیں اور صف بنا لیتی ہیں' ان کے بعد آنے والے مرد ان کے پیچھے صف بنا لیتے ہیں لیکن نمازیوں کو چاہیے کہ وہ حتی المقدور اس سے احتراز کریں تاکہ مرد کسی فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ انسان کو عورتوں کے پیچھے نماز سے اجتناب ہی کرنا چاہیے گو فقہاء نے اسے جائز قرار دیا ہے لیکن انسان کو اس سے مقدور بھر اجتناب کرنا چاہیے۔ اسی طرح عورتوں کو بھی چاہیے کہ وہ ایسی جگہ نماز نہ پڑھیں جو مردوں کے قریب ہو۔

سوال کیا بچے کو صف میں اس کی جگہ سے دور ہٹا دینا جائز ہے؟

جواب صحیح بات یہ ہے کہ بچے کو صف میں اس کی جگہ سے دور ہٹا دینا جائز نہیں کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«لاَ يُقِيمُ الرَّجُلُ الرَّجُلَ مِنْ مَقْعَدِهِ ثُمَّ يَجْلِسُ فِيهِ»(صحيح البخاري، الاستئذان، باب لا يقيم الرجل الرجل من مجلسه، ح: ٦٢٦٩ وصحيح مسلم، السلام، باب تحريم إقامة الإنسان من موضعه المباح الذي سبق إليه، ح: ٢١٧٧(٢٨) واللفظ له)

”کوئی آدمی کسی کو اس کی جگہ سے اٹھا کر خود وہاں نہ بیٹھے۔“

اور دوسری بات یہ کہ اس میں بچے کی حق تلفی ہے' اس کی دل شکستگی ہے' اسے نماز سے متنفر کرنا اور اس کے دل میں بغض وحسد

پیدا کرنا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ بچوں کو آخری صف میں پیچھے ہٹا دیا جائے تو اس طرح سارے بچے ایک صف میں اکٹھے ہو جائیں گے اور وہ نماز میں کھیل تماشا شروع کر دیں گے لہٰذا جب کھیل تماشا کا اندیشہ ہو تو پھر انھیں ایک دوسرے سے الگ کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔

عورتوں کی بہترین صف اور دو ستونوں کے درمیان نماز کا بیان

سوال ستونوں کے درمیان نماز کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جگہ تنگ ہو تو ستونوں کے درمیان نماز جائز ہے لیکن کشادگی کی صورت میں ستونوں کے درمیان نماز نہ پڑھی جائے کیونکہ اس سے صفیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ یہ فتویٰ 1419/1/29ھ کو تحریر کیا گیا۔

سوال عورتوں کی صفوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا علی الاطلاق ان کی پہلی صف بری اور آخری اچھی ہے یا یہ اس صورت میں ہے جب مردوں اور عورتوں کے درمیان پردہ نہ ہو؟

جواب جب مرد عورتوں کے ساتھ ایک ہی جگہ میں نماز ادا کر رہے ہوں تو پھر عورتوں کی آخری صف ان کی پہلی صف سے افضل ہے جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«وَخَيْرُ صُفُوفِ النِّسَاءِ آخِرُهَا، وَشَرُّهَا أَوَّلُهَا»(صحيح مسلم، الصلاة، باب تسوية الصفوف . . . ح: ٤٤٠)

”اور عورتوں کی بہترین صف آخری اور بدترین پہلی ہے۔“

یہ اس لیے کہ ان کی آخری صف مردوں سے زیادہ دور اور پہلی صف مردوں سے زیادہ قریب ہوگی۔ اگر عورتوں کے لیے نماز کی مخصوص جگہ ہو جیسا کہ آج کل اکثر مساجد میں ہے تو اس صورت میں مردوں کی طرح ان کی پہلی صف ہی بہتر ہوگی۔

پاؤں سے پاؤں ملانے اور مسجد سے متصل راستوں میں نماز پڑھنے کے احکام

سوال جو شخص مسجد سے باہر، مسجد سے متصل راستوں میں نماز پڑھے، اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اگر مسجد میں سارے نمازی نہ آسکیں تو مسجد کے ساتھ متصل راستوں پر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ ضرورت کی وجہ سے ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ان کے لیے امام کی متابعت ممکن ہو، یہ فتویٰ 1413/6/6ھ میں تحریر کیا گیا۔

سوال اقامت صفوف کے بارے میں معیار کیا ہے؟ کیا نمازی کے لیے حکم شریعت یہ ہے کہ وہ ساتھ کھڑے ہوئے انسان کے ٹخنے کے ساتھ اپنے ٹخنے کو لگائے؟ فتویٰ دیں، اللہ تعالیٰ آپ کو اجر و ثواب عطا فرمائے۔

جواب صحیح بات یہ ہے کہ صفوں کی برابری کے لیے معیار یہ ہے کہ دونوں ٹخنے ایک دوسرے کے برابر ہوں، انگلیوں کے کنارے نہیں، اس لیے کہ بدن ٹخنے سے مرکب ہے جب کہ پاؤں مختلف ہوتے ہیں، کسی کا پاؤں لمبا اور کسی کا چھوٹا ہوتا ہے، لہٰذا صفوں کی درستی اور برابری ٹخنوں ہی سے ہو سکتی ہے۔

ٹخنوں کے ایک دوسرے کے ساتھ ملانے کے بارے میں بھی بلا شک و شبہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ وارد ہے کہ وہ ایک دوسرے

کے ٹخنوں کے ساتھ ٹخنے کو لگا کر صفوں کو برابر کیا کرتے تھے ① لیکن ٹخنوں کا ایک دوسرے کے ساتھ لگانا مقصود لذاتہ نہیں ہے بلکہ مقصود لغیرہ ہے جیسا کہ اہل علم نے ذکر کیا ہے' لہٰذا جب صفیں پوری ہوجائیں اور لوگ کھڑے ہوجائیں تو ہر ایک کو چاہیے کہ وہ اپنے ٹخنے کو اپنے ساتھی کے ٹخنے کے ساتھ لگا دے تاکہ صفیں سیدھی اور برابر ہوجائیں' اس کے یہ معنی نہیں کہ ساری ہی نماز میں ایک دوسرے کے ٹخنے آپس میں چمٹے رہیں۔

اس مسئلہ میں غلو کی وجہ سے بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے ساتھی کے ٹخنے کے ساتھ اپنے ٹخنے کو ملانے کے لیے اپنے پاؤں کو بہت زیادہ کھول لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے اور ان کے ساتھیوں کے کندھوں کے درمیان بہت فاصلہ پیدا ہوجاتا ہے جو خلاف سنت ہے جب کہ مقصود یہ ہے کہ کندھے اور ٹخنے برابر ہوں۔

نماز میں رفع الیدین

سوال کیا نماز میں چار مقامات کے علاوہ اور مقامات میں بھی رفع الیدین ثابت ہے؟ کیا نماز جنازہ اور عیدین میں بھی رفع الیدین کرنا چاہیے؟

جواب پہلے ان چار مقامات کو معلوم کرنا چاہیے' جن میں رفع الیدین کیا جاتا ہے' چار مقامات یہ ہیں: ✿ تکبیر تحریمہ ✿ رکوع کو جاتے وقت ✿ رکوع سے سر اٹھاتے وقت اور ✿ تشہد اول سے اٹھتے وقت۔ ان چار مقامات میں رفع الیدین صحیح حدیث سے ثابت ہے' حضرت عبداللہ بن عمر ؓ سے روایت ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ إِذَا افْتَتَحَ الصَّلَاةَ وَإِذَا كَبَّرَ لِلرُّكُوعِ وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ رَفَعَهُمَا كَذٰلِكَ أَيْضًا وَقَالَ سَمِعَ اللهُ لِمَنْ حَمِدَهُ، رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ، وَكَانَ لاَ يَفْعَلُ ذٰلِكَ فِي السُّجُودِ»(صحيح البخاري، الأذان، باب رفع اليدين في التكبيرة الأولى مع الافتتاح سواء، ح:٧٣٥ وصحيح مسلم، الصلاة، باب استحباب رفع اليدين ... الخ، ح:٣٩٠)

”بے شک رسول اللہ ﷺ اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے کندھوں کے برابر اٹھایا کرتے تھے جب نماز شروع فرماتے' جب رکوع کے لیے تکبیر کہتے' جب رکوع سے سر اٹھاتے تو اس وقت بھی اسی طرح آپ اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے اور فرماتے سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ۔ سجدوں میں آپ رفع الیدین نہیں کیا کرتے تھے۔“

حضرت ابن عمر ؓ رسول اللہ ﷺ کے فعل کے تتبع کے بہت حریص تھے' انھوں نے تتبع کرتے ہوئے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ تکبیر تحریمہ پڑھتے ہوئے رکوع کو جاتے ہوئے' رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے اور تشہد اول سے اٹھتے ہوئے رفع الیدین کیا کرتے تھے۔ اور سجدوں میں آپ رفع الیدین نہیں کیا کرتے تھے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مثبت اور نافی کے باب سے ہے کیونکہ حدیث حضرت ابن عمر

---

① یہ حضرت انس ؓ کے اس قول کی طرف اشارہ ہے کہ ہم میں سے ایک اپنے کندھے کو اپنے ساتھی کے کندھے اور اپنے پاؤں کو اس کے پاؤں کے ساتھ ملالیا کرتا تھا۔ (صحیح البخاری' الأذان، باب الزاق المنکب بالمنکب والقدم بالقدم فی الصف' حدیث: 725)

رضی اللہ عنہما میں جو ثبت ہے وہ نافی سے مقدم ہے کیونکہ حدیث ابن عمر صریح ہے اور جس نے یہ مشاہدہ کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے رکوع کو جاتے وقت رفع الیدین کیا‘ رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کیا اور پھر وہ یہ کہے کہ آپ نے سجدوں میں ایسا نہیں کیا تو کیا اس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ممکن ہے اس سے غفلت ہوگئی ہو اور وہ متنبہ نہ ہو سکے ہوں‘ یہ ممکن نہیں کیونکہ انھوں نے پورے وثوق سے یہ کہا ہے کہ آپ سجدوں میں ایسا نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح انھوں نے پورے وثوق کے ساتھ یہ بھی روایت کیا ہے کہ آپ رکوع کو جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کیا کرتے تھے۔

مقتدی جب امام کو رکوع کی حالت میں پائے تو کیا کرے؟

سوال جب مقتدی امام کو رکوع کی حالت میں پائے تو کیا وہ دو تکبیریں کہے؟

جواب جب انسان مسجد میں اس وقت داخل ہو جس وقت امام حالت رکوع میں ہو اور وہ تکبیر تحریمہ کہے تو اسے فوراً رکوع میں چلے جانا چاہیے‘ اس وقت رکوع کے لیے تکبیر کہنا سنت ہوگا واجب نہیں۔ اگر رکوع کے لیے تکبیر کہہ دے تو افضل ہے اور اگر نہ کہے تو کوئی حرج نہیں‘ اس کے بعد درج ذیل کئی حالتیں ہو سکتی ہیں:

- ○ اسے یقین ہو کہ امام کے سر اٹھانے سے پہلے وہ رکوع میں چلا گیا تھا‘ اس حالت میں وہ رکعت کو پا لے گا اور اس سے فاتحہ ساقط ہو جائے گی۔ ①
- ○ اسے یقین ہو کہ اس کے رکوع میں ملنے سے پہلے امام نے رکوع سے سر اٹھا لیا تھا‘ اس حالت میں اس کی یہ رکعت شمار نہیں ہوگی‘ لہٰذا اسے یہ رکعت پڑھنی پڑے گی۔
- ○ اسے تردد اور شک ہو کہ اس نے امام کو رکوع میں پایا ہے یا اس کے رکوع میں جانے سے پہلے امام نے رکوع سے سر اٹھا لیا تھا؟ اس حالت میں وہ ظن غالب پر اعتماد کرے۔ اگر اس کے نزدیک یہ بات راجح ہو کہ اس نے امام کو رکوع میں پا لیا تھا تو اس کی یہ رکعت ہو جائے گی اور اگر راجح بات یہ ہو کہ اس نے امام کو رکوع میں نہیں پایا تھا تو اس کی یہ رکعت شمار نہ ہوگی۔ اس حالت میں اس کی نماز کا کچھ حصہ اگر رہ گیا ہو تو وہ سلام کے بعد سجدہ سہو کر لے اور اگر کچھ حصہ نہ رہا ہو بلکہ مشکوک پہلی رکعت ہی ہو اور ظن غالب یہ ہو کہ اس نے اسے پا لیا ہے تو اس حال میں سجدہ سہو ساقط ہو جائے گا کیونکہ اس کی نماز امام کی نماز کے ساتھ مربوط ہے اور اگر نماز کا کچھ حصہ مقتدی سے فوت نہ ہوا ہو تو پھر مقتدی کی طرف سے‘ سجدہ سہو کا امام ہی متحمل ہے۔

---

① مدرک رکوع کی رکعت کے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں سلف ہی سے اختلاف چلا آ رہا ہے‘ لیکن دلائل کی رو سے راجح بات یہی ہے کہ ایسے شخص کی رکعت نہیں ہوگی۔ کچھ نہ کچھ سہارے تو ہر شخص کو مل ہی جاتے ہیں۔ لیکن مسائل شرعیہ میں واضح نص کی ضرورت ہوتی ہے جو مسئلہ زیر بحث میں نہیں ہے۔ اس لیے نمازی کے لیے حکم تو یہی ہے کہ وہ امام کو جس حالت میں بھی پائے‘ امام کے ساتھ شامل ہو جائے‘ لیکن رکعت وہی شمار ہوگی جب آنے والا امام کو حالت قیام میں ملے اور اسے سورۂ فاتحہ پڑھنے کا موقع بھی مل جائے‘ اس لیے کہ سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں۔ یہ مسئلہ واضح اور نہایت قوی نصوص سے ثابت ہے۔ (ص‘ ی)

حالت شک کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ انسان کسی بھی پہلو کو ترجیح نہ دے سکے تو اس صورت میں وہ یقین پر اعتماد کرے اور یقینی صورت یہ ہے کہ اس نے امام کو حالت رکوع میں نہیں پایا کیونکہ اصل یہی ہے' یہ رکعت گویا اس سے فوت ہوگئی ہے لہٰذا اسے (رکعت ادا کرنی چاہیے اور) سلام سے پہلے سجدہ سہو کرنا چاہیے۔

یہاں میں ایک اور مسئلہ کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہوں گا کہ بہت سے لوگ مسجد میں اس وقت داخل ہوتے ہیں جب امام رکوع میں ہو تو وہ زور سے مسلسل کھنکارنا شروع کر دیتے ہیں اور بعض لوگ زبان سے یہ الفاظ بھی کہہ دیتے ہیں: ﴿إِنَّ اللّٰـهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ﴾ ''بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' اور بعض لوگ زمین پر پاؤں مارنے لگتے ہیں۔ یہ ساری باتیں خلاف سنت ہیں۔ ان سے امام اور مقتدیوں کے تشویش میں مبتلا ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔ کچھ لوگ جب مسجد میں داخل ہوتے ہیں اور امام رکوع میں ہو تو وہ بہت نامناسب طریقے سے بھاگنا شروع کر دیتے ہیں' نبی ﷺ نے اس سے منع کرتے ہوئے فرمایا ہے:

«إِذَا سَمِعْتُمُ الإِقَامَةَ فَامْشُوا إِلَى الصَّلاَةِ وَعَلَيْكُمْ بِالسَّكِينَةِ وَالْوَقَارِ، وَلاَ تُسْرِعُوا، فَمَا أَدْرَكْتُم فَصَلُّوا، وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوا»(صحيح البخاري، الأذان، باب لا يسعى إلى الصلاة، ح:٦٣٦ وصحيح مسلم، المساجد، باب استحباب إتيان الصلاة بوقار، ح:٦٠٢،(١٥١)

''جب تم اقامت سنو تو نماز کی طرف چلو اور سکون و وقار کو اختیار کرو اور جلدی نہ کرو۔ نماز کا جتنا حصہ پاؤ پڑھ لو اور جو نہ پا سکو اسے پورا کر لو۔''

نماز میں ہاتھ کہاں باندھے جائیں؟

سوال دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھ کر کیا سینے پر رکھنا چاہیے یا دل پر؟ ہاتھوں کو زیر ناف رکھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا اس مسئلہ میں مرد و عورت میں کوئی فرق ہے؟

جواب نماز میں دائیں ہاتھ کو بائیں پر رکھنا سنت ہے۔ سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

«كَانَ النَّاسُ يُؤْمَرُونَ أَنْ يَضَعَ الرَّجُلُ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلٰى ذِرَاعِهِ الْيُسْرٰى فِي الصَّلاَةِ»(صحيح البخاري، الأذان، باب وضع اليمنى على اليسرى، ح:٧٤٠)

''لوگوں کو حکم دیا جاتا تھا کہ وہ نماز میں دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھیں۔''

لیکن سوال یہ ہے کہ ہاتھ کہاں رکھے جائیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں سب سے صحیح قول یہ ہے کہ ہاتھوں کو سینے پر رکھا جائے۔ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

«صَلَّيْتُ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَوَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلٰى يَدِهِ الْيُسْرٰى عَلٰى صَدْرِهِ»(صحيح ابن خزيمة، الصلاة، باب وضع اليمين على الشمال... ح:٤٧٩ والبيهقي:٢/ ٣٠)

''میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی تو آپ نے اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں پر رکھ کر (انہیں) اپنے سینے پر رکھا۔''

اس حدیث میں گو قدرے ضعف ہے لیکن اس مسئلہ سے متعلق دیگر احادیث کی نسبت زیادہ صحیح ہے۔

ہاتھوں کو سینے کے بائیں جانب دل پر رکھنا بدعت اور بے اصل ہے۔ ہاتھ زیر ناف رکھنے کے بارے میں ایک اثر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے لیکن وہ ضعیف ہے، حدیث حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ اس کی نسبت بہت زیادہ قوی ہے۔

اس مسئلہ میں مرد و عورت میں کوئی فرق نہیں کیونکہ اصل یہ ہے کہ احکام میں مردوں اور عورتوں میں اتفاق ہے الا یہ کہ دونوں میں تفریق یا فرق کی کوئی دلیل موجود ہو اور مجھے کسی ایسی صحیح دلیل کا علم نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ اس سنت میں مردوں اور عورتوں میں کوئی فرق ہے۔

نماز میں بسم اللہ جہری پڑھنے کا حکم

سوال بسم اللہ جہری پڑھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب راجح بات یہ ہے کہ بسم اللہ جہری نہیں پڑھنی چاہیے۔ سنت یہ ہے کہ اسے سرّاً پڑھا جائے کیونکہ یہ سورۃ الفاتحہ کی آیت نہیں ہے،① اگر کبھی کبھی اسے جہری پڑھ لیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ بعض اہل علم نے کہا ہے کبھی کبھی ضرور جہری پڑھنی چاہیے کیونکہ نبی ﷺ سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ اسے جہراً پڑھتے تھے۔ لیکن جو بات صحیح سند کے ساتھ آپ سے ثابت ہے وہ یہ کہ آپ اسے جہراً نہیں پڑھتے تھے، لہٰذا زیادہ بہتر یہی ہے کہ اسے جہراً نہ پڑھا جائے۔ اگر ان لوگوں کی تالیف قلب کے لیے جہراً پڑھ لے جن کا مذہب اسے جہراً پڑھنے کا ہے تو امید ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔

دعائے استفتاح سنت ہے فرض نہیں

سوال دعائے استفتاح کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب استفتاح فرض نماز میں ہو یا نفل میں، سنت ہے، واجب نہیں۔ انسان کو استفتاح کی وہ ساری دعائیں پڑھنی چاہییں جو نبی ﷺ سے ثابت ہیں، ان میں سے کبھی کوئی دعا پڑھ لی جائے اور کبھی کوئی تاکہ تمام مسنون طریقوں کے مطابق عمل ہو جائے اور اگر کسی کو ان میں سے صرف ایک دعا ہی یاد ہو اور وہ ہمیشہ اسی کو پڑھے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ استفتاح، تشہد اور سلام کے بعد ذکر میں مختلف انواع و اقسام کے کلمات پڑھا کرتے تھے اور اس میں دو فائدے ہیں:

پہلا فائدہ: انسان ہمیشہ ایک ہی طرح کے کلمات نہ پڑھتا رہے کیونکہ انسان جب ایک ہی طرح کے کلمات پڑھتا رہتا ہے تو وہ گویا اس کی عادت سی بن جاتے ہیں۔ اگر انسان غافل بھی ہو تو وہ الفاظ زبان سے جاری رہتے ہیں، خواہ وہ قصد و ارادہ کے ساتھ انھیں نہ بھی پڑھ رہا ہو کیونکہ وہ کلمات پڑھنا اس کی عادت بن جاتا ہے اور اگر اذکار کے کلمات مختلف ہوں اور ان میں سے انسان کبھی ایک کلمہ کو اور کبھی کسی دوسرے کلمہ کو پڑھ لے تو اس سے حضور قلب حاصل ہوتا اور انسان زبان سے کلمات سمجھ کر ادا کرنے لگتا ہے۔

---

① بسم اللہ، سورۃ الفاتحہ کی آیت ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ راجح بات اس کا سورۃ الفاتحہ کی آیت ہونا معلوم ہوتا ہے (دیکھیے، الصحیحۃ، حدیث: 1183) تاہم اس سے اس کا جہراً پڑھنا ضروری ثابت نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس کا تعلق نبی ﷺ کے عمل سے ہے کہ آپ نے اسے جہراً پڑھا ہے یا سرّاً؟ زیادہ روایات سرّی پڑھنے کی ہیں، اس لیے سرّاً پڑھنا ہی راجح ہوگا۔ (ص،ی)

دوسرا فائدہ: اس میں امت کے لیے آسانی ہے کہ انسان اپنے مناسب حال کبھی ایک قسم کے کلمات کو پڑھ لے اور کبھی دوسری قسم کے کلمات کو۔ ان دو فائدوں ہی کی وجہ سے بعض عبادات کو مختلف طریقوں سے ادا کیا جا سکتا ہے' مثلاً: دعائے استفتاح' تشہد کی دعاؤں اور نماز کے بعد ذکر کے مختلف کلمات میں سے کبھی ایک کو اور کبھی دوسرے کو پڑھا جا سکتا ہے۔

آمین کہنا سنت مؤکدہ ہے

سوال کیا آمین کہنا سنت ہے؟

جواب ہاں آمین کہنا سنت مؤکدہ ہے' خصوصاً جب امام آمین کہے تو اس وقت آمین ضرور کہنی چاہیے کیونکہ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذَا أَمَّنَ الإِمَامُ فَأَمِّنُوا، فَإِنَّهُ مَنْ وَّافَقَ تَأْمِينُهُ تَأْمِينَ الْمَلاَئِكَةِ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ» (صحيح البخاري، الأذان، باب جهر الإمام بالتأمين، ح:٧٨٠ وصحيح مسلم، الصلاة، باب التسميع والتحميد والتأمين: ٤١٠، ٧٧)

''جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو کیونکہ جس کی آمین فرشتوں کی آمین سے مل گئی' اس کے سابقہ تمام گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔''

امام اور مقتدی کو آمین ایک ہی وقت میں کہنی چاہیے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«إِذَا قَالَ الإِمَامُ: غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلاَ الضَّآلِّينَ، فَقُولُوا آمِينَ» (صحيح البخاري، الأذان، باب جهر المأموم بالتأمين، ح:٧٨٢ وصحيح مسلم، الصلاة، باب التسميع والتحميد والتأمين، ح:٤١٠(٨٦)

''جب امام ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّينَ﴾ کہے تو تم آمین کہو۔''

نماز میں سورۃ الفاتحہ پڑھنے اور بعض آیات کا جواب دینے کا حکم

سوال جب آیت کریمہ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ پڑھی جاتی ہے تو بعض مقتدی کہتے ہیں: اِسْتَعَنَّا بِاللّٰه ''ہم نے اللہ ہی سے مدد مانگی۔'' تو اسکے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب مقتدی کے لیے حکم شریعت یہ ہے کہ وہ خاموش ہو کر امام کی قراءت سنے۔ امام جب فاتحہ سے فارغ ہو جائے' آمین کہے اور مقتدی بھی آمین کہیں تو یہ آمین انسان کو امام کی قراءت فاتحہ کے درمیان میں ہر چیز کہنے سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

سوال نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بارے میں علماء کے حسب ذیل مختلف اقوال ہیں:

○ سورۂ فاتحہ پڑھنا' امام' مقتدی یا منفرد کسی کے لیے بھی واجب نہیں ہے' نماز خواہ سری ہو یا جہری' کیونکہ واجب یہ ہے کہ قرآن مجید

کا جو حصہ آسانی کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہو اسے پڑھ لیا جائے' اس لیے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْءَانِ﴾ (المزمل: ۷۳/ ۲۰)

''آسانی کے ساتھ جتنا قرآن تمھیں یاد ہو اس کی تلاوت کرو۔''

اور ارشاد نبوی ﷺ ہے:

«اِقْرَأْ مَا تَيَسَّرَ مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ»(صحيح البخاري، الأذان، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم، ح:۷۵۷ وصحيح مسلم، الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة، ح:۳۹۷)

''جتنا آسانی سے ہو سکے (اتنا) قرآن پڑھ لیا کرو۔''

○ سورۂ فاتحہ کا پڑھنا امام' مقتدی' منفرد' نماز کی ابتدا ہی سے جماعت میں شامل ہونے والے اور جس سے نماز با جماعت کا کچھ حصہ رہ گیا ہو' سب کے لیے رکن ہے۔

○ سورۂ فاتحہ کا پڑھنا امام اور منفرد کے حق میں تو رکن ہے لیکن مقتدی کے لیے یہ مطلقاً واجب نہیں ہے' نماز خواہ سری ہو یا جہری۔

○ امام اور منفرد کے حق میں سری اور جہری نمازوں میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا رکن ہے اور مقتدی کے حق میں سری نماز میں پڑھنا تو رکن ہے لیکن جہری نمازوں میں رکن نہیں ہے۔

میرے نزدیک راجح بات یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کا پڑھنا امام' مقتدی اور منفرد کے حق میں سری و جہری نماز میں رکن ہے' البتہ جو شخص امام کو حالت رکوع میں پائے تو اس سے اس حالت میں فاتحہ ساقط ہو جاتی ہے اور اس کی دلیل نبی ﷺ کے حسب ذیل فرمان کا عموم ہے:

«لاَ صَلاَةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ»(صحيح البخاري، الأذان، باب وجوب القراءة، ح:۷۵٦ وصحيح مسلم، الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة ... ح:۳۹٤)

''جو شخص سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں۔'' اور فرمایا:

«مَنْ صَلَّى صَلاَةً لَمْ يَقْرَأْ فِيهَا بِأُمِّ الْقُرْآنِ فَهِيَ خِدَاجٌ»(صحيح مسلم، الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة، ح:۳۹۵)

''جس نے نماز پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز ناقص ہے۔''

خداج کا لفظ فاسد کے معنی میں ہے اور یہ عام ہے اور اس کی دلیل حدیث حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بھی ہے کہ نبی ﷺ نماز صبح سے فارغ ہوئے' تو آپ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

«لَعَلَّكُمْ تَقْرَؤُونَ خَلْفَ إِمَامِكُمْ؟ قُلْنَا نَعَمْ هَذًّا يَارَسُولَ اللهِ، قَالَ: "لاَ تَفْعَلُوا إِلاَّ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ فَإِنَّهُ لاَ صَلاَةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِهَا"»(سنن أبي داود، الصلاة، باب من ترك القراءة في صلاته، ح:۸۲۳ وجامع الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في القراءة خلف الإمام، ح:۳۱۱ ومسند أحمد: ۵/۳۱٦)

’’شاید تم اپنے امام کے پیچھے پڑھتے ہو۔‘‘ ہم نے عرض کیا: ہاں یا رسول اللہ! جلدی جلدی پڑھتے ہیں‘ تو آپ نے فرمایا:

’’تم فاتحۃ الکتاب کے سوا اور کچھ نہ پڑھو کیونکہ جو اسے نہیں پڑھتا اس کی کوئی نماز نہیں۔‘‘

یہ حدیث نص ہے کہ جہری نماز میں بھی فاتحہ پڑھنا واجب ہے۔

مسبوق سے اس کے ساقط ہونے کی دلیل حدیث ابی بکرہ ؓ ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ کو حالت رکوع میں پایا تو صف میں داخل ہونے سے پہلے ہی جلدی سے رکوع میں چلے گئے اور حالت رکوع ہی میں صف میں داخل ہوئے‘ نبی ﷺ جب نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا: یہ کس نے کیا ہے۔ حضرت ابو بکرہ ؓ نے عرض کیا: میں نے یا رسول اللہ! تو نبی ﷺ نے فرمایا:

«زَادَكَ اللهُ حِرْصًا وَلاَ تَعُدْ»(صحیح البخاري، الأذان، باب إذا ركع دون الصف، ح: ۷۸۳)

’’اللہ تعالیٰ تمھاری حرص میں اضافہ فرمائے‘ آئندہ ایسا نہ کرنا۔‘‘

نبی ﷺ نے انھیں اس رکعت کے دوبارہ پڑھنے کا حکم نہیں دیا‘ جس میں وہ جلدی سے شامل ہوگئے تھے تاکہ وہ فوت نہ ہو‘ اگر اس حالت میں ان کے لیے سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب ہوتا تو نبی ﷺ اسے اس کا حکم دیتے جس طرح کہ آپ نے اس شخص کو دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم دیا تھا جس نے سکون واطمینان کے بغیر نماز پڑھ لی تھی۔ ① یہ تو ہے مسئلے کا پہلو نقلی اعتبار سے اور جہاں تک اس کا عقلی اعتبار سے تعلق ہے تو اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

مسبوق نے جب قیام کو نہ پایا‘ جو سورۂ فاتحہ پڑھنے کا مقام ہے تو اس سے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ساقط ہو گیا جیسا کہ وہ شخص جس کا ہاتھ کٹا ہوا ہو تو اس کے لیے ہاتھ کے بجائے بازو دھونا واجب نہیں ہے کیونکہ مقام کے فوت ہو جانے کے بعد اس سے فرض ساقط ہو جائے گا‘ اسی طرح جو شخص امام کو حالت رکوع میں پائے اس سے بھی فاتحہ پڑھنا ساقط ہو جائے گا کیونکہ اس نے قیام کو نہیں پایا جو فاتحہ پڑھنے کا مقام ہے اور اس سے یہاں قیام امام کی متابعت کی وجہ سے ساقط ہوا ہے۔

---

① فاضل مفتی ؒ کی یہ بات تو صحیح ہے کہ سورۂ فاتحہ کا پڑھنا امام‘ مقتدی اور منفرد کے حق میں سری وجہری نماز میں رکن ہے۔ لیکن پھر امام کو حالت رکوع میں پانے والے شخص سے اس کی رکنیت کو ساقط فرما رہے ہیں۔ حالانکہ جن احادیث کے عموم سے وہ سب کے لیے سورۂ فاتحہ کے رکن ہونے کا اثبات فرما رہے ہیں‘ اس کے عموم میں تو مدرک رکوع بھی شامل ہے‘ اس اعتبار سے اس کی یہ رکعت شمار نہیں ہونی چاہیے۔ رہی حضرت ابو بکرہ ؓ والی حدیث‘ جس سے موصوف ؒ نے مدرک رکوع سے سورۂ فاتحہ کی رکنیت ساقط ہونے پر استدلال کیا ہے‘ وہ کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے۔ اس لیے کہ نبی ﷺ نے جو الفاظ ارشاد فرمائے تھے۔ وہ تھے: [لا تَعُد] جس میں کئی احتمال ہیں۔ ایک تو وہی ہے جس کا تذکرہ فاضل مفتی ؒ نے فرمایا ہے کہ آئندہ اس طرح نہ کرنا۔ اور دوسرا احتمال ہے [لا تَعْدُ] ’’دوڑ کر نہ آنا‘‘ اور تیسرا احتمال ہے کہ یہ [لا تَعُدَّ] ہو یعنی ’’اس رکعت کو شمار نہ کرنا‘‘ اور چوتھا احتمال یہ ہے کہ [لا تُعِدْ] یعنی تو نماز نہ دہرا تیری نماز درست ہے۔ اور یہ اصول ہے کہ [إِذَا جَاءَ الإِحْتِمَالُ بَطَلَ الإِسْتِدْلَالُ] ’’جب ایک سے زیادہ احتمال ہوں‘ تو اس سے استدلال جائز نہیں رہتا۔‘‘ اس لیے مذکورہ الفاظ سے کسی ایک مفہوم پر استدلال کرنا صحیح نہیں۔ بنابریں مدرک رکوع کی رکعت کے صحیح ہونے کا فتوی دینا بھی غیر صحیح ہے۔ کیونکہ مدرک رکوع کے دو رکن فوت ہو گئے۔ ایک قیام اور دوسرا قراءت فاتحہ اور نماز کا ایک رکن بھی فوت ہو جائے‘ تو وہ رکعت نہیں ہوتی۔ تو پھر دو رکن فوت ہو جانے کے باوجود اس رکعت کا شمار کرنا کیوں کر صحیح ہوگا۔ (ص‘ ی)

میرے نزدیک یہ قول راجح ہے اور اگر حدیث حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ ہوتی جس کی طرف ابھی ابھی اشارہ کیا گیا ہے' تو یہ قول راجح ہوتا کہ جہری نماز میں مقتدی پر سورہ فاتحہ واجب نہیں ہے کیونکہ حصول اجر وثواب میں سننے والا' پڑھنے والے ہی کی طرح ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا تھا:

﴿ قَدْ أُجِيبَت دَّعْوَتُكُمَا ﴾ (یونس: ۱۰/ ۸۹)

''تمہاری (دونوں کی) دعا قبول کر لی گئی۔''

حالانکہ دعا تو صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کی تھی جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَقَالَ مُوسَىٰ رَبَّنَآ إِنَّكَ ءَاتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُۥ زِينَةً وَأَمْوَٰلًا فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا ۖ رَبَّنَا لِيُضِلُّوا۟ عَن سَبِيلِكَ ۖ رَبَّنَا ٱطْمِسْ عَلَىٰٓ أَمْوَٰلِهِمْ وَٱشْدُدْ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا۟ حَتَّىٰ يَرَوُا۟ ٱلْعَذَابَ ٱلْأَلِيمَ ﴿٨٨﴾ ﴾

(یونس: ۱۰/ ۸۸)

''اور موسیٰ نے کہا: اے ہمارے پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں (بہت سا) ساز و برگ اور مال و زر دے رکھا ہے' اے پروردگار! تاکہ وہ لوگوں کو تیرے رستے سے گمراہ کر دیں' اے پروردگار! ان کے مال کو برباد کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ ایمان نہ لائیں جب تک عذاب الیم نہ دیکھ لیں۔''

کیا اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے یہ ذکر فرمایا ہے کہ ہارون علیہ السلام نے بھی دعا کی تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ ﴿قَدْ أُجِيبَت دَّعْوَتُكُمَا﴾ ''تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی'' علماء فرماتے ہیں کہ واحد کے بعد تثنیہ کا صیغہ استعمال کرنے میں حکمت یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی اور ہارون علیہ السلام نے آمین کہی تھی۔

اور جہاں تک حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث:

«مَنْ كَانَ لَهُ إِمَامٌ فَقِرَاءَةُ الإِمَامِ لَهُ قِرَاءَةٌ»(مسند أحمد: ۳/ ۳۳۹ وسنن ابن ماجه، إقامة الصلاة، باب إذا قرأ فأنصتوا، ح: ۸۵۰)

''جس شخص کا امام ہو تو امام کی قراءت اس کی قراءت ہے۔''

کا تعلق ہے تو یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ مرسل ہے جیسا کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر کے مقدمے میں لکھا ہے' پھر اس حدیث کے اطلاق کو اس سے استدلال کرنے والے بھی تسلیم نہیں کرتے' ان میں سے بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ مقتدی پر سری نمازوں میں قرآن واجب ہے' گویا انھوں نے اس کے اطلاق کو تسلیم نہیں کیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ اگر امام سکوت ہی نہ کرے' تو مقتدی سورۂ فاتحہ کب پڑھے؟ اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ امام جب پڑھ رہا ہو اس وقت مقتدی بھی اس کے ساتھ ساتھ پڑھ لے کیونکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ فاتحہ کی قراءت فرماتے تو حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی آپ کے ساتھ ساتھ پڑھ لیتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«لاَ تَفْعَلُوا إِلاَّ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ فَإِنَّهُ لاَ صَلاَةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِهَا»(سنن أبي داود، الصلاة، باب من ترك القراءة في صلاته، ح: ۸۲۳ وجامع الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في القراءة خلف الإمام،

ح: ٣١١ مسند أحمد: ٥/ ٣١٦)

’’فاتحہ الکتاب کے سوا اور کچھ نہ پڑھو کیونکہ جو اسے نہیں پڑھتا اس کی نماز نہیں۔‘‘

مقتدی امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کس وقت پڑھے؟

سوال مقتدی نماز میں سورۂ فاتحہ کس وقت پڑھے‘ جس وقت امام فاتحہ پڑھ رہا ہو اس وقت یا جب وہ دوسری سورت پڑھنا شروع کر دے؟

جواب افضل یہ ہے کہ مقتدی فاتحہ کو اس وقت پڑھے جب امام اس کی قراءت کر چکا ہوتا کہ وہ اس قراءت کو سن سکے جو فرض اور نماز کا رکن ہے کیونکہ اگر اس نے فاتحہ کو اس وقت پڑھا جب امام پڑھ رہا تھا تو یہ رکن کے لیے خاموش نہ رہا بلکہ اس نے خاموشی فاتحہ کے بعد والی قراءت کے لیے اختیار کی جو نفل ہے لہٰذا افضل یہ ہے کہ فاتحہ کی قراءت کے وقت خاموشی اختیار کی جائے کیونکہ رکن قراءت کو سننا سنت قراءت کے سننے سے افضل ہے۔ یہ تو ہے اس مسئلے کا ایک پہلو اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ امام جب ’’وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہے اور آپ امام کی متابعت میں آمین نہ کہیں تو آپ جماعت سے خارج ہو جائیں گے لہٰذا افضل یہ ہے کہ امام کے قراءت فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد آپ فاتحہ پڑھیں۔

قراءت قرآن کے وقت خشوع کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟

سوال نماز میں یا اس کے علاوہ قرآن مجید کی قراءت کے وقت خشوع کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟

جواب خشوع نماز کا مغز اور گودا ہے اور اس کے معنی حضور قلب کے ہیں لہٰذا نمازی کے دل کو دائیں بائیں نہیں بھٹکنا چاہیے اور انسان جب کوئی ایسی چیز محسوس کرے جو اسے خشوع سے دور ہٹا رہی ہو تو ﴿أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ﴾ پڑھ لے جیسا کہ نبی ﷺ نے اس کا حکم فرمایا ہے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ شیطان انسان کی تمام عبادات‘ خصوصاً نماز جو ’’شهادتين‘‘ کے بعد سب سے افضل عبادت ہے‘ کو خراب کرنے کا شدید خواہش مند رہتا ہے‘ اسی لیے وہ نمازی کے پاس آ کر کہتا ہے کہ فلاں بات یاد کرو‘ فلاں بات یاد کرو‘ وہ انسان کو ایسے خیالات میں مبتلا کر دیتا ہے جن کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور جو اس کے ذہن سے صرف اسی وقت نکلتے ہیں جب وہ نماز سے فارغ ہوتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ عزوجل کی طرف متوجہ ہونے کی حد درجہ کوشش کرے اور اگر کوئی خیال یا وسوسہ محسوس کرے تو تَعَوُّذ پڑھ لے‘ خواہ رکوع میں ہو یا تشہد میں‘ قعدہ میں ہو یا نماز کے کسی اور حصے میں۔ خشوع کے لیے ممد و معاون ثابت ہونے والے اسباب میں سب سے بہتر سبب یہ ہے کہ انسان اس بات کو یاد کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا اور اس ذات پاک سے سرگوشیاں کر رہا ہے۔

فاتحہ کے بعد دوسری سورت شروع کرنے سے پہلے سکوت کا کیا حکم ہے؟

سوال کیا نبی ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ فاتحہ اور اس کے بعد پڑھی جانے والی سورت کے درمیان سکوت فرمایا کرتے تھے؟

جواب فاتحہ اور اس کے بعد پڑھی جانے والی سورت کے درمیان اس طرح سکتہ نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے‘ جیسا کہ فقہاء نے کہا

ہے کہ امام اس قدر سکتہ کرے جس میں مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھ سکے۔ آپ بہت تھوڑا سا سکوت فرمایا کرتے تھے، جس سے ایک طرف سانس لینا مقصود ہوتا اور دوسری طرف مقتدی کو موقع فراہم کیا جاتا تا کہ وہ قراءت جاری رکھتے ہوئے مکمل کر لے خواہ امام قراءت کرتا رہے۔ الغرض یہ ایک بہت چھوٹا سا سکتہ ہوتا، طویل نہیں ہوتا تھا۔

نماز فجر کی اگر ایک رکعت رہ جائے تو اسے جہراً مکمل کرنا چاہیے یا سراً؟

سوال ایک شخص سے نماز فجر کی ایک رکعت فوت ہوگئی، کیا وہ اسے جہراً مکمل کرے یا سراً؟

جواب اسے اختیار ہے لیکن افضل یہ ہے کہ وہ اسے سراً مکمل کرے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہاں کوئی دوسرا شخص بھی نماز پڑھ رہا ہو جو اس کے جہراً پڑھنے سے تشویش محسوس کرے۔

رکوع کے بعد سینے پر ہاتھ باندھنے کے متعلق کیا حکم ہے؟

سوال میں نے نبی ﷺ کی نماز کی کیفیت کے متعلق ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ رکوع کے بعد سینے پر ہاتھ باندھنا بدعت و ضلالت ہے؟ اس بارے میں صحیح بات کیا ہے۔ جزاکم اللہ عنی وعن المسلمین خیرًا۔

جواب میں اس بات میں حرج محسوس کرتا ہوں کہ کسی ایسی وجہ سے سنت کی مخالفت کرنے والے کو، جس میں اجتہاد کی گنجائش ہو، بدعتی قرار دیا جائے پس جو لوگ رکوع کے بعد اپنے ہاتھوں کو اپنے سینوں پر رکھتے ہیں ان کے قول کی بنیاد سنت ہے لہٰذا انھیں اس وجہ سے بدعتی قرار دینا کہ انھوں نے ہمارے اجتہاد کی مخالفت کی ہے، یہ انسان کے لیے ایک بہت ثقیل بات ہے۔ اس طرح کے امور میں انسان کو بدعت کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ایسے اجتہادی مسائل میں بھی بعض لوگ دوسروں کو بدعتی قرار دیں جن میں اس بات کا احتمال ہوتا ہے کہ حق ایک قول ہو یا دوسرا۔ ایسے اجتہادی مسائل میں بدعتی قرار دینے سے ایسا اختلاف وانتشار پیدا ہوتا ہے جس کی تباہ کاریوں کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ رکوع کے بعد سینے پر ہاتھ باندھنے والے کو بدعتی اور اس کے اس عمل کو بدعت قرار دینا انسان کے لیے بہت ثقیل ہے، اپنے بھائیوں پر یہ الزام نہیں لگانا چاہیے۔ درست بات یہ ہے کہ رکوع کے بعد دائیں ہاتھ کو بائیں پر رکھ لینا سنت ہے اور اس کی دلیل حضرت سہل بن سعد ؓ سے مروی صحیح بخاری کی یہ حدیث ہے، جس میں انھوں نے کہا ہے:

«كَانَ النَّاسُ يُؤْمَرُونَ أَنْ يَضَعَ الرَّجُلُ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلٰى ذِرَاعِهِ الْيُسْرٰى فِي الصَّلَاةِ»(صحيح البخاري، الأذان، باب وضع اليمنى على اليسرى، ح: ٧٤٠)

”لوگوں کو حکم دیا جاتا تھا کہ آدمی نماز میں اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ پر رکھ لے۔“

اس حدیث سے استدلال استقراء اور تتبع کی بنیاد پر ہے اور وہ اس طرح کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ حالت سجدہ میں ہاتھ کہاں رکھے جائیں؟ اس کا جواب ہے کہ زمین پر! ہم کہتے ہیں کہ حالت رکوع میں ہاتھ کہاں رکھے جائیں؟ جواب ہے کہ دونوں گھٹنوں پر۔ ہم کہتے ہیں کہ جلسہ کی حالت میں ہاتھ کہاں رکھے جائیں؟ تو اس کا جواب ہے کہ دونوں رانوں پر۔

اب رہ گئی یہ حالت کہ قیام میں رکوع سے پہلے اور بعد میں ہاتھ کہاں رکھے جائیں؟ تو اس کا جواب حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کے اس قول میں موجود ہے کہ لوگوں کو حکم دیا جاتا تھا کہ آدمی نماز میں اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ پر رکھ لے۔ تو یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حالت قیام میں خواہ وہ رکوع سے قبل ہو یا بعد دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھنا ہے۔ اس مسئلہ میں یہی بات حق ہے اور اس پر نبی ﷺ کی سنت دلالت کرتی ہے۔ اس سوال کا جواب گویا حسب ذیل دو فقروں پر مشتمل ہے:

① تساہل کی وجہ سے کسی ایسے عمل کو بدعت قرار نہیں دینا چاہیے جس میں اجتہاد کی گنجائش ہو۔

② صحیح بات یہ ہے کہ رکوع کے بعد دائیں ہاتھ کو بائیں پر رکھنا سنت ہے، بدعت نہیں اور اس کی دلیل حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی وہ حدیث ہے جسے ہم نے بیان کیا ہے۔ وہ حدیث عام ہے اور اس سے رکوع، سجدہ اور قعدہ کی حالتیں مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان حالتوں میں ہاتھوں کے رکھنے کی خاص صورتیں سنت سے ثابت ہیں۔

"ربنا ولك الحمد" کے بعد "والشکر" کا اضافہ کیسا ہے؟

سوال بعض لوگ "ربنا ولك الحمد" کے بعد "والشکر" کا لفظ بھی بڑھا دیتے ہیں؟ اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب اس میں کوئی شک نہیں کہ سنت میں وارد اذکار پر اکتفا کرنا ہی افضل ہے لہٰذا انسان جب رکوع سے سر اٹھائے، تو وہ یہ کہے "ربنا ولك الحمد" اور "والشکر" کے لفظ کا اضافہ نہ کرے کیونکہ یہ لفظ حدیث میں نہیں آیا۔ حدیث میں چار طرح سے الفاظ آئے ہیں:

رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ ۔ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ ۔ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ ۔ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ

اس کلمہ کو مذکورہ بالا چار صورتوں میں سے کسی ایک کے مطابق ہی کہہ لیں لیکن چاروں صورتوں کو یکجا نہیں کیا جا سکتا، کبھی ایک صورت کے مطابق کہہ لیں اور کبھی کسی دوسری صورت کے مطابق اور اس مقام پر "والشکر" کا لفظ حدیث میں نہیں آیا، لہٰذا افضل یہ ہے کہ اس جگہ یہ کلمہ نہ کہیں۔

سجدہ کو جاتے وقت کی کیفیت کیا ہونی چاہیے؟

سوال سجدہ کو جاتے وقت کیا کیفیت ہونی چاہیے؟

جواب سجدہ پہلے گھٹنوں پر اور پھر دونوں ہاتھوں پر ہونا چاہیے کیونکہ نبی ﷺ نے آدمی کو پہلے اپنے دونوں ہاتھوں پر سجدہ کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا ہے:

«إِذَا سَجَدَ أَحَدُكُمْ فَلاَ يَبْرُكْ كَمَا يَبْرُكُ الْبَعِيرُ، وَلْيَضَعْ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ»(سنن أبي داود، الصلاة، باب كيف يضع ركبتيه قبل يديه، ح: ٨٤٠ وسنن النسائي، الصلاة، باب أول ما يصل إلى الأرض من الإنسان في سجوده، ح: ١٠٩٢ ومسند أحمد: ٢/ ٣٨١)

''جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو وہ اونٹ کی طرح نہ بیٹھے بلکہ اپنے دونوں ہاتھوں کو دونوں گھٹنوں سے پہلے رکھے۔''

یہ حدیث کے الفاظ ہیں، اب ہم ان کی وضاحت کریں گے۔ ان میں سے پہلے جملے: (اس طرح نہ بیٹھے جیسے اونٹ بیٹھتا ہے) میں

سجدہ کی کیفیت کی ممانعت ہے کیونکہ یہاں کاف حرف تشبیہ استعمال ہوا ہے' لہٰذا یہاں اس عضو کی ممانعت نہیں ہے جس پر سجدہ کرنا ہے کیونکہ اگر عضو کی ممانعت ہوتی تو پھر الفاظ یہ ہوتے "فَلا يَبْرُكُ عَلٰى مَا يَبْرُكُ عَلَيْهِ الْبَعِيْرُ" تو تب ہم کہتے کہ سجدہ کو جاتے وقت اپنے دونوں گھٹنوں پر نہ بیٹھو کیونکہ اونٹ اپنے دونوں گھٹنوں پر بیٹھتا ہے لیکن نبی ﷺ نے یہ نہیں فرمایا: "لَا يَبْرُكُ عَلٰى مَا يَبْرُكُ عَلَيْهِ" بلکہ آپ نے یہ فرمایا ہے: "لَا يَبْرُكْ كَمَا يَبْرُكُ" یعنی ممانعت کیفیت وصفت کی ہے' اس عضو کی نہیں ہے جس پر سجدہ کیا جاتا ہے۔

اسی وجہ سے امام ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں پورے وثوق سے لکھا ہے کہ حدیث کے آخری الفاظ راوی سے تبدیل ہو گئے ہیں۔ حدیث کے آخری الفاظ یہ ہیں: "وَلْيَضَعْ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ" جب کہ یہ الفاظ صحیح اس طرح ہیں: "وَلْيَضَعْ رُكْبَتَيْهِ قَبْلَ يَدَيْهِ" اس لیے کہ اگر وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے دونوں گھٹنوں سے پہلے زمین پر رکھ دے تو وہ اونٹ ہی کی طرح بیٹھا کیونکہ اونٹ جب بیٹھتا ہے تو اپنے دونوں ہاتھوں (اگلے پاؤں) کو زمین پر پہلے رکھتا ہے۔ جس نے اونٹ کو بیٹھتے دیکھا ہے اس سے یہ بات مخفی نہیں ہے۔ اگر ہم یہ چاہیں کہ حدیث کے ابتدائی اور آخری الفاظ میں مطابقت ہو تو پھر الفاظ اس طرح ہونے چاہییں: "وَلْيَضَعْ رُكْبَتَيْهِ قَبْلَ يَدَيْهِ" کیونکہ اگر اس نے ہاتھوں کو گھٹنوں سے پہلے زمین پر رکھ دیا تو وہ اونٹ ہی کی طرح بیٹھا اور اس طرح حدیث کے ابتدائی اور آخری حصے میں آپس میں تناقض بھی ہوا۔ ایک بھائی نے اس مسئلہ کے بارے میں "فتح المعبود فی وضع الرکبتین قبل الیدین فی السجود" کے نام سے ایک اچھا اور مفید رسالہ بھی لکھا ہے۔ گویا سنت یہ ہے' جس کا رسول اللہ ﷺ نے سجدہ کو جاتے وقت حکم دیا ہے کہ انسان اپنے دونوں گھٹنوں کو زمین پر دونوں ہاتھوں سے پہلے رکھے۔ ①

کیا حالت سجدہ میں بہت زیادہ پھیل جانا جائز ہے؟

سوال حالت سجدہ میں بہت زیادہ پھیل جانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب حالت سجدہ میں بہت زیادہ پھیل جانا خلاف سنت ہے۔ نبی ﷺ کی نماز کی کیفیت بیان کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک نے بھی یہ بیان نہیں کیا کہ آپ سجدہ میں اپنی پشت کو لمبی کرتے تھے جیسا کہ انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ آپ حالت رکوع میں اپنی پشت کو لمبی رکھتے تھے۔ حالت سجدہ میں حکم یہ ہے کہ انسان اپنے پیٹ کو اپنے دونوں رانوں سے اوپر اٹھا لے اور یہ حکم نہیں ہے کہ اسے پھیلا دے جیسا کہ بعض لوگ کرتے ہیں۔

کیا پیشانی کی محراب نیک لوگوں کی نشانی ہے؟

سوال کیا یہ حدیث میں آیا ہے کہ سجدے کی وجہ سے پیشانی پر پڑ جانے والا نشان صالح لوگوں کی علامات میں سے ہے؟

---

① فاضل مفتی رحمہ اللہ نے امام ابن القیم رحمہ اللہ والا موقف اختیار کیا ہے جو حدیث مذکور میں راوی کی طرف سے الفاظ کے بدلنے کے قائل ہیں۔ لیکن جمہور علماء کے نزدیک یہ موقف صحیح نہیں ہے۔ وہ حدیث کے الفاظ کو "مقلوب" (بدلے ہوئے) نہیں' بلکہ محفوظ ہی مانتے ہیں اور اس کی رو سے یہی بات راجح قرار پاتی ہے کہ سجدے میں جاتے وقت زمین پر پہلے ہاتھ رکھے جائیں اور گھٹنے بعد میں رکھے جائیں۔ (ص ی)

جواب یہ صالحین کی علامات میں سے نہیں ہے بلکہ صالحین کی علامات تو چہرے کا نور، انشراح صدر اور حسن خلق وغیرہ ہیں۔ سجدے کی وجہ سے نشان تو ان لوگوں کی پیشانیوں پر بھی ہوسکتا ہے، جو صرف فرائض ہی پڑھتے ہیں کیونکہ جلد کے نرم ہونے کی وجہ سے یہ نشان جلد پڑسکتا ہے اور بسا اوقات ان لوگوں کی پیشانیوں پر نمودار نہیں ہوتا، جو کثرت سے نمازیں پڑھتے اور لمبے لمبے سجدے کرتے ہیں۔

دو سجدوں کے درمیان شہادت کی انگلی کو حرکت دینے کا حکم

سوال کیا نماز کے دو سجدوں کے درمیان انگشت شہادت کو حرکت دینے کے بارے میں کوئی صحیح حدیث موجود ہے؟

جواب ہاں صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہے کہ نبی ﷺ جب نماز میں بیٹھتے تو انگلی کے ساتھ اشارہ فرماتے تھے ① اور ایک روایت میں ہے کہ ''جب آپ تشہد میں بیٹھتے۔'' پہلے الفاظ عام اور دوسرے خاص ہیں اور قاعدہ یہ ہے کہ ایسے حکم کے ساتھ خاص کا ذکر جو عام کے موافق ہو، تخصیص کا تقاضا نہیں کرتا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے سے کہے کہ علم کے طلبہ کی عزت کرو اور وہ اس سے کہے کہ زید کی عزت کرو اور زید بھی طلبہ میں سے ہے تو یہ اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ وہ باقی طلبہ کی عزت نہ کرے۔ علمائے اصول نے اس قاعدے کو بیان فرمایا ہے اور علامہ شنقیطی رحمہ اللہ نے اسے أضواء البیان میں بھی ذکر فرمایا ہے۔

لیکن اگر وہ یہ کہے کہ طلبہ کی عزت کرو مگر اس کی عزت نہ کرو، جو سبق میں سو رہا ہو تو یہ اسلوب کلام تخصیص کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ اس میں اس نے ایک ایسا حکم ذکر کیا ہے، جو حکم عام کے مخالف ہے۔ پھر اس کے بارے میں ایک خاص حدیث بھی ہے جسے امام احمد رحمہ اللہ نے مسند میں ایسی سند کے ساتھ روایت کیا ہے جسے صاحب الفتح الربانی نے حسن قرار دیا ہے، اور زاد المعاد کے بعض حاشیہ نگاروں نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ حدیث نبوی ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ إِذَا جَلَسَ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ قَبَضَ أَصَابِعَهُ وَأَشَارَ بِالسَّبَّابَةِ»(مسند أحمد: ٤/ ٣١٨ بمعناه وتمام المنة: ٢١٤)

''رسول اللہ ﷺ جب دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھتے تو انگلیوں کو بند کر لیتے اور انگشت شہادت کے ساتھ اشارہ فرماتے۔''

جو شخص یہ کہے کہ وہ حرکت نہ دے تو ہم اس سے کہیں گے کہ وہ دائیں ہاتھ کے ساتھ کیا کرے؟ اگر آپ یہ کہیں کہ وہ اسے ران پر پھیلا دے تو ہم اس کی دلیل طلب کریں گے اور حدیث سے یہ ثابت نہیں کہ نبی ﷺ اپنے دائیں ہاتھ کو اپنی ران پر پھیلا لیتے تھے اور اگر آپ کا یہ عمل ہوتا تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اسے ضرور بیان کرتے جیسا کہ انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ آپ اپنے بائیں ہاتھ کو بائیں ران پر پھیلا لیا کرتے تھے۔ اس مسئلہ کے متعلق یہ تین دلائل ہیں، جو ہم نے بیان کر دیے ہیں۔

جلسۂ استراحت کے متعلق کیا حکم ہے؟

سوال جلسۂ استراحت کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جلسۂ استراحت کے بارے میں علماء کے حسب ذیل تین اقوال ہیں: ① مطلقاً مستحب ہے۔ ② مطلقاً مستحب نہیں ہے۔

---

① صحيح مسلم، المساجد، باب صفة الجلوس في الصلاة، حديث:580(115)

④ جس کے لیے سیدھا کھڑا ہونا مشکل ہو، وہ بیٹھ جائے اور جس کے لیے مشکل نہ ہو، وہ نہ بیٹھے۔

المغنی: 529/1 مطبوعہ دار المنار میں، اس آخری قول کے بارے میں لکھا ہے کہ اس سے تمام احادیث میں تطبیق ہو جاتی ہے اور یہ ایک معتدل قول ہے، اور اس کے بعد اگلے صفحہ میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بیان کی ہے کہ فرض نماز میں یہ سنت ہے کہ جب آدمی پہلی دو رکعتوں سے اٹھے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو زمین پر نہ لگائے الا یہ کہ بہت بوڑھا ہو جسے ہاتھوں کے سہارے کے بغیر کھڑا ہونے کی استطاعت نہ ہوا سے" أثرم نے روایت کیا ہے۔① پھر انھوں نے لکھا ہے کہ حدیث حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ جس میں یہ ہے کہ نبی ﷺ نے جب اپنے سر کو دوسرے سجدے سے اٹھایا تو سیدھے بیٹھ گئے اور پھر زمین پر ہاتھوں کو رکھا،② تو یہ اس وقت پر محمول ہوگا، جب ضعف اور کبرسنی کی وجہ سے نبی ﷺ سیدھا کھڑا ہونے میں مشقت محسوس فرماتے تھے کیونکہ آپ نے فرمایا تھا:

«لاَ تُبَادِرُونِي بِالرُّكُوعِ وَلاَ بِالسُّجُودِ . . . إِنِّي قَدْ بَدَّنْتُ»(سنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب النهى أن يسبق الإمام، ح: ٩٦٣ الإرواء، ح: ٥٠٩)

"رکوع وسجود میں مجھ سے جلدی نہ کرو .... بے شک میں بڑی عمر کا ہو گیا ہوں۔"

میرا میلان بھی اسی قول کی طرف ہے کیونکہ حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئے جب آپ غزوۂ تبوک کی تیاری فرما رہے تھے، اور اس وقت واقعی نبی ﷺ بڑی عمر کے تھے اور ضعف شروع ہو گیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«لَمَّا بَدَّنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَثَقُلَ كَانَ أَكْثَرُ صَلاَتِهِ جَالِسًا»(صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب جواز النافلة قائمًا وقاعدًا، ح: ٧٣٢(١١٧))

"جب رسول اللہ ﷺ کی عمر بڑی اور وزن زیادہ ہو گیا تو آپ زیادہ تر بیٹھ کر نماز ادا فرماتے تھے۔"

عبداللہ بن شقیق نے ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا تھا: کیا نبی ﷺ بیٹھ کر نماز ادا فرما لیا کرتے تھے؟ تو انہوں نے جواب دیا:

«نَعَمْ بَعْدَ مَا حَطَمَهُ النَّاسُ»(صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب جواز النافلة قائمًا وقاعدًا، ح: ٧٣٢(١١٥)

"ہاں لوگوں کے آپ پر بھیڑ کرنے کے بعد (یعنی بڑی عمر ہونے کے بعد آپ بیٹھ کر نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔")

اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«مَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ صَلَّى فِي سُبْحَتِهِ قَاعِدًا حَتَّى كَانَ قَبْلَ وَفَاتِهِ بِعَامٍ فَكَانَ يُصَلِّي فِي سُبْحَتِهِ قَاعِدًا»(صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب جواز النافلة قائمًا وقاعدًا . . . ح: ٧٣٣)

"میں نے رسول اللہ ﷺ کو نفل نماز بیٹھ کر پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن وفات سے ایک سال پہلے میں نے آپ کو نفل

---

① السنن الکبری للبیهقی: 136/2

② صحیح البخاری، الأذان، باب کیف یعتمد علی الأرض إذا قام...... 824

نماز بیٹھ کر پڑھتے دیکھا۔''

ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں: وفات سے ایک سال یا دو سال پہلے دیکھا۔

یہ تمام روایات صحیح مسلم میں ہیں اور اس مؤقف کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ زمین پر سہارا لینے کا ذکر حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے اور کسی چیز کا سہارا بوقت ضرورت ہی لیا جاتا ہے۔ اس کی تائید حضرت عبداللہ بن بحینہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے جو بخاری اور دیگر کتب میں ہے کہ

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّىٰ بِهِمُ الظُّهْرَ فَقَامَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الأُولَيَيْنِ لَمْ يَجْلِسْ»(صحيح البخاري، الأذان، باب من لم ير التشهد الأول واجبًا ... الخ، ح:٨٢٩ وصحيح مسلم، المساجد، باب السهو في الصلاة ... الخ، ح:٥٧٠)

''بے شک نبی ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی تو آپ پہلی دو رکعتوں میں کھڑے ہو گئے اور بیٹھے نہیں۔''

[ولم يجلس] ''اور بیٹھے نہیں'' کے الفاظ عام ہیں۔ جلسۂ استراحت کو انھوں نے مستثنیٰ نہیں کیا اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس بیٹھنے کی نفی کی گئی ہے' اس سے تشہد میں بیٹھنا مراد ہے' مطلق بیٹھنا مراد نہیں ہے۔① واللہ اعلم.

تشہد میں شروع سے آخر تک شہادت کی انگلی کو حرکت دینا کیسا ہے؟

سوال اول سے لے کر آخر تک سارے تشہد میں انگشت شہادت کو حرکت دینے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب انگشت شہادت کو دعا کے وقت حرکت دینی چاہیے' سارے تشہد میں نہیں جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

«يُحَرِّكُهَا يَدْعُو بِهَا»(الفتح الرباني: ٣/ ١٤٧ وسنن النسائي، الافتتاح، باب موضع اليمين من الشمال في الصلاة، ح: ٨٩٠)

''آپ اسے حرکت دیتے (اور) اس کے ساتھ دعا فرماتے تھے۔''

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دعا کرنے والا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے دعا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی آسمان میں ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ءَأَمِنتُم مَّن فِي ٱلسَّمَآءِ أَن يَخۡسِفَ بِكُمُ ٱلۡأَرۡضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ ﴿١٦﴾ أَمۡ أَمِنتُم مَّن فِي ٱلسَّمَآءِ أَن يُرۡسِلَ عَلَيۡكُمۡ حَاصِبٗاۖ فَسَتَعۡلَمُونَ كَيۡفَ نَذِيرِ ﴿١٧﴾ ﴾ (الملك: ٦٧/ ١٦-١٧)

---

① جلسۂ استراحت کے بارے میں یہ کہنا کہ نبی ﷺ کا یہ عمل ضعف اور سن رسیدگی کی وجہ سے تھا کیونکہ اس کے راوی حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ ہیں جو 9 ہجری میں رسول اللہ ﷺ سے ملے تھے۔ لیکن یہ استدلال قوی نہیں' اس لیے کہ حدیث مسیئ الصلوۃ میں بھی جلسۂ استراحت کی تاکید موجود ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ دیکھیے: (صحیح بخاری: الاستئذان' باب من ردّ فقال علیك السلام' حدیث: 6251) بنابریں جلسۂ استراحت کو غیر ضروری قرار دینا صحیح نہیں۔ مسنون طریقۂ نماز میں جلسۂ استراحت بھی شامل ہے جس کا اہتمام ہر نمازی کو بلا تفریق کرنا چاہیے۔ (ص ی)

"کیا تم اس سے جو آسمان میں ہے، بے خوف ہو کہ تم کو زمین میں دھنسا دے اور وہ اس وقت حرکت کرنے لگے، کیا تم اس سے جو آسمان میں ہے، نڈر ہو کہ تم پر پتھراؤ کرنے والی آندھی چھوڑ دے؟ سو تم عنقریب جان لو گے کہ میرا ڈرانا کیسا ہے۔"

اور نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«أَلاَ تَأْمَنُونِي وَأَنَا أَمِينُ مَنْ فِي السَّمَاءِ»(صحيح البخاري، المغازي، باب بعث علي بن أبي طالب وخالد بن الوليد رضي الله عنهما إلى اليمن ... ح:٤٣٥١ وصحيح مسلم، الزكاة، باب ذكر الخوارج وصفاتهم، ح:١٠٦٤(١٤٤))

"کیا تم مجھے امین نہیں سمجھتے، حالانکہ میں تو اس کا امین ہوں جو آسمان میں ہے۔"

پس اللہ تعالیٰ آسمانوں میں ہے، ہر چیز سے اوپر ہے، پس آپ جب اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں تو اوپر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ نبی ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے حجۃ الوداع میں جب لوگوں کے سامنے خطبہ دیا تو فرمایا:

«أَلاَ هَلْ بَلَّغْتُ؟»(صحيح مسلم، القسامة، باب تغليظ تحريم الدماء والأعراض والأموال، ح:١٦٧٩)

"کیا میں نے پہنچا دیا ہے؟"

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ہاں تو آپ نے انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور پھر اسے لوگوں کی طرف گھماتے ہوئے فرمایا:

«اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ، اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ، ثَلاَثَ مَرَّاتٍ»(صحيح مسلم، الحج، باب حجة النبي ﷺ: ١٢١٨(١٤٧))

"اے اللہ! تو گواہ رہنا، اے اللہ! تو گواہ رہنا، آپ نے یہ تین بار فرمایا۔"

یہ حدیث بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اوپر ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جو فطرت، عقل، سمع اور اجماع ہر اعتبار سے واضح اور معلوم ہے، لہٰذا آپ جب بھی دعا کریں، انگشت شہادت کو حرکت دیں اور اس کے ساتھ آسمان کی طرف اشارہ کریں اور دیگر مواقع پر اسے ساکن رکھیں۔ اب آیئے یہ دیکھیں کہ تشہد میں دعا کے مقامات کون کون سے ہیں۔ وہ مقامات یہ ہیں:

«اَلسَّلاَمُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ، اَلسَّلاَمُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللهِ الصَّالِحِينَ، اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ، وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ، اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ، أَعُوذُ بِاللهِ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ، وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ»

یہ آٹھ مقامات ہیں جن میں انسان اپنی انگلی کو آسمان کی طرف حرکت دے گا۔ اگر وہ تشہد میں ان کے علاوہ اور کوئی دعا مانگے تو اس میں بھی انگلی کو اٹھائے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ ہر دعا کے وقت وہ اپنی انگلی کو اٹھائے۔

کیا پہلے تشہد میں درود پڑھنا جائز ہے؟

سوال کیا تشہد اول میں نمازی صرف تشہد ہی پر اکتفا کرے یا درود شریف بھی پڑھ لے؟

جواب تین یا چار رکعتوں والی نماز کے تشہد اول میں صرف ان کلمات پر اکتفا کیا جائے:

«اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِينَ، أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ»(صحيح البخاري، الأذان، باب التشهد في الآخرة، ح:٨٣١ وصحيح مسلم، الصلاة، باب التشهد في الصلاة، ح:٤٠٢)

''تمام قولی عبادتیں اللہ کے لیے ہیں اور تمام فعلی عبادتیں اور مالی عبادتیں بھی اللہ ہی کے لیے ہیں' سلام ہو آپ پر اے اللہ کے نبی! (ﷺ) اور اللہ کی رحمتیں اور برکتیں بھی آپ پر ہوں اور سلام ہو ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔''

افضل یہی ہے کہ انہی کلمات پر اکتفا کیا جائے اور اگر یہاں یہ درود شریف پڑھ لیا جائے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں:

«اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ، وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ، اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ»(صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب، ح:٣٣٧٠ وصحيح مسلم، الصلاة، باب الصلاة على النبي ﷺ بعد التشهد، ح:٤٠٥)

''اے اللہ! تو محمد ﷺ اور آلِ محمد پر رحمت نازل فرما' جس طرح تو نے ابراہیم علیہ السلام اور آل ابراہیم پر رحمت نازل فرمائی ہے۔ بے شک تو ہی لائقِ حمد و ثنا' بڑائی اور بزرگی کا مالک ہے۔ اے اللہ! تو محمد ﷺ اور آل محمد پر برکتیں نازل فرما جیسے تو نے ابراہیم علیہ السلام اور آل ابراہیم پر برکتیں نازل فرمائی ہیں۔ بے شک تو ہی تعریف کے لائق' بڑائی اور بزرگی کا مالک ہے۔''

کچھ علماء نے اس تشہد میں بھی درود شریف پڑھنے کو مستحب قرار دیا ہے لیکن میرے نزدیک زیادہ درست بات یہ ہے کہ صرف التحیات......ہی پر اکتفا کیا جائے اور اگر درود شریف پڑھ بھی لے تو کوئی حرج نہیں' بالخصوص جب امام تشہد میں زیادہ دیر بیٹھے تو پھر درود شریف کو بھی پڑھ لے۔

نماز میں تورّک کے متعلق کیا حکم ہے؟

سوال نماز میں تورّک (سرین پر سہارا لینے) کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا یہ حکم مردوں اور عورتوں سب کے لیے ہے؟ رہنمائی فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیراً۔

جواب ہر وہ نماز جس میں دو تشہد ہوں مثلاً: نماز مغرب' عشاء' ظہر اور عصر اس کے آخری تشہد میں تورّک (سرین پر سہارا لینا) سنت ہے اور وہ نماز جس میں ایک تشہد ہے' اس میں تورک نہیں ہے۔ عورتوں اور مردوں سب کے لیے تورّک ہے اور اصل یہ ہے کہ احکام شرعیہ میں مردوں اور عورتوں میں مساوات ہے الا یہ کہ کسی حکم کے بارے میں شرعی دلیل سے یہ ثابت ہو جائے کہ اس میں مساوات نہیں ہے اور ایسی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ مردوں اور عورتوں کے لیے نماز کی کیفیت مختلف ہے بلکہ اس مسئلہ میں مردوں اور عورتوں کے لیے ایک ہی حکم ہے۔

کیا ایک سلام پر اکتفا جائز ہے؟

سوال ایک امام صاحب دائیں طرف صرف ایک ہی سلام پھیرتے ہیں، تو کیا ایک ہی سلام پر اکتفا کرنا جائز ہے؟ فتویٰ عطا فرمائیں۔

جواب بعض علماء ایک ہی سلام پر اکتفا کو جائز قرار دیتے ہیں اور بعض کی رائے ہے کہ دو سلام ضروری ہیں اور ایک تیسری رائے یہ ہے کہ نفل نماز میں ایک سلام کافی ہے لیکن فرض نماز میں دو سلام ہی ضروری ہیں۔ احتیاط اسی میں ہے کہ انسان دو سلام پھیرے کیونکہ نبی ﷺ سے اکثر یہی وارد ہے، اس میں احتیاط بھی ہے اور زیادہ ذکر بھی۔ اگر امام ایک طرف سلام پھیرے اور مقتدی کی رائے میں صرف ایک سلام پر اکتفا صحیح نہ ہو تو وہ دونوں طرف سلام پھیر دے، اس میں کوئی حرج نہیں اور اگر امام دو طرف سلام پھیرے اور مقتدی کی رائے میں ایک سلام ہی کافی ہو تو اسے چاہیے کہ امام کی اقتدا کی وجہ سے وہ دونوں طرف سلام پھیرے۔

سلام پھیرنے کے بعد امام کو فوراً رخ نہیں بدلنا چاہیے

سوال کیا امام کے لیے یہ زیادہ بہتر ہے کہ وہ سلام کے فوراً بعد مقتدیوں کی طرف منہ کرے یا اسے تھوڑا سا انتظار کرنا چاہیے؟

جواب امام کے لیے زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ قبلہ رخ بیٹھا رہے اور پھر تین بار ”أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ“ اور ایک بار:

«اَللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ، وَمِنْكَ السَّلَامُ، تَبَارَكْتَ ذَاالْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ»(صحيح مسلم، المساجد، باب استحباب الذكر بعد الصلاة ... ح:٥٩١)

”اے اللہ تو سلام ہے، تیری ہی طرف سے سلامتی ہے۔ بڑا برکت والا ہے تو اے عظمت وجلال اور اکرام واحسان کے مالک۔“ پھر مقتدیوں کی طرف منہ کرے۔

اگر امام کے اٹھنے سے مقتدیوں کی گردنوں کو پھلانگنا لازم آتا ہو، تو افضل یہ ہے کہ وہ اپنی جگہ پر بیٹھا رہے حتی کہ اسے گزرنے کے لیے جگہ مل جائے اور اگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر وہ اٹھ سکتا ہے۔ مقتدیوں کو چاہیے کہ وہ امام سے پہلے نہ اٹھیں کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي إِمَامُكُمْ فَلَا تَسْبِقُونِي بِالرُّكُوعِ وَلَا بِالسُّجُودِ وَلَا بِالْقِيَامِ وَلَا بِالِانْصِرَافِ» (صحيح مسلم، الصلاة، باب تحريم سبق الإمام ... ح:٤٢٦)

”لوگو! میں تمھارا امام ہوں۔ رکوع، سجود، قیام اور انصراف میں مجھ سے سبقت نہ کیا کرو۔“

اگر امام سنت سے زیادہ دیر قبلہ رخ بیٹھا رہے تو پھر مقتدی امام سے پہلے اٹھ سکتا ہے۔

نماز کے فوراً بعد مصافحہ کیسا ہے؟

سوال نماز کے فوراً بعد مصافحہ کرنے اور ”تَقَبَّلَ اللّٰهُ“ کہنے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب نماز کے فوراً بعد مصافحہ کرنے اور ”تَقَبَّلَ اللّٰهُ“ کہنے کی کوئی اصل نہیں کیونکہ یہ نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے اور نہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے۔ یہ فتویٰ 1409/2/25ھ کو لکھا گیا۔

نماز کے بعد اذکار مسنونہ اور تسبیح کا استعمال

سوال ذکر کے لیے تسبیح کے استعمال کرنے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب تسبیح استعمال کرنا جائز ہے لیکن افضل یہ ہے کہ انگلیوں اور ان کے پوروں پر ذکر کیا جائے کیونکہ نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«وَاعْقِدْنَ بِالأَنَامِلِ فَإِنَّهُنَّ مَسْئُولاَتٌ مُسْتَنْطَقَاتٌ»(مسند أحمد: ٦/ ٣٧١ وسنن أبي داود، الصلاة، باب التسبيح بالحصى، ح: ١٥٠١ وجامع الترمذي، الدعوات، باب في فضل التسبيح، ح: ٣٥٨٣)

''اور انگلیوں کے پوروں کے ساتھ گرہ لگاؤ (گنو) کیونکہ قیامت کے دن ان سے سوال کیا جائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا۔''

ہاتھ میں تسبیح پکڑنے کی صورت میں ریاکاری کا بھی اندیشہ ہے اور پھر تسبیح استعمال کرنے والا اکثر و بیشتر حضور قلب سے کام نہیں لیتا کیونکہ ایک طرف وہ تسبیح پھیر رہا ہوتا ہے اور دوسری طرف دائیں بائیں دیکھ رہا ہوتا ہے' لہذا افضل اور اولیٰ یہ ہے کہ انگلیوں پر اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے۔

سوال نماز سے سلام پھیرنے کے بعد مسنون اذکار کون سے ہیں؟

جواب نمازوں کے بعد ذکر کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ فَإِذَا قَضَيْتُمُ ٱلصَّلَوٰةَ فَٱذْكُرُوا۟ ٱللَّهَ قِيَـٰمًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ ۚ﴾ (النساء: ٤/ ١٠٣)

''پھر جب تم نماز ادا کر چکو تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (ہر حالت میں) اللہ کو یاد کرو۔''

یہ ذکر جس کا اللہ نے اجمالاً حکم دیا' نبی ﷺ نے اس کی تفصیل بیان فرما دی ہے اور وہ یہ کہ سلام پھیرنے کے بعد آپ تین بار یہ کہیں:

«اَسْتَغْفِرُ اللهَ»(صحيح مسلم، المساجد، باب استحباب الذكر بعد الصلوة، ح: ٥٩١)

''میں اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگتا ہوں۔''

اور پھر یہ پڑھیں:

«اَللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلاَمُ، وَمِنْكَ السَّلاَمُ، تَبَارَكْتَ ذَاالْجَلاَلِ وَالإِكْرَامِ»(صحيح مسلم، المساجد، باب اسحباب الذكر بعد الصلاة، ح: ٥٩١)

''اے اللہ! تو سلام ہے' تیری ہی طرف سے سلامتی ہے۔ بڑا برکت والا ہے تو اے عظمت وجلال اور اکرام واحسان کے مالک!''

«لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ وَحْدَهُ لاَ شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ. وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيءٍ قَدِيرٌ، اَللّٰهُمَّ لاَ مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلاَ مُعْطِيَ لِما مَنَعْتَ، وَلاَ يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ»(صحيح البخاري، الأذان، باب الذكر بعد الصلاة، ح: ٨٤٤ وصحيح مسلم، المساجد، باب استحباب الذكر بعد الصلاة، ح: ٥٩٣)

''اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ وہ اکیلا ہے کوئی اس کا شریک نہیں۔ اسی کا سارا ملک ہے اور اسی کی ساری تعریف ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے۔ اے اللہ! جو عطا فرمائے' اس کو کوئی منع کرنے والا نہیں اور جو تو نہ دے' اسے کوئی دینے والا نہیں

اور کسی دولت مند کو اس کی دولت (تیری گرفت سے) نہیں بچا سکتی۔"

«لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ وَحْدَهُ لاَ شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، لاَ حَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ إِلاَّ بِاللهِ، لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ، وَلاَ نَعْبُدُ إِلاَّ إِيَّاهُ، لَهُ النِّعْمَةُ وَلَهُ الْفَضْلُ، وَلَهُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ، لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ»(صحيح مسلم، المساجد، باب استحباب الذكر بعد الصلاة، ح: ٥٩٤)

"اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا سارا ملک ہے اور اسی کی ساری تعریف ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے (کسی بھی کام کی) طاقت وقوت اللہ (کی مدد) کے بغیر ممکن نہیں۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، ہم اس کے سوا کسی کی بھی عبادت نہیں کرتے۔ اسی کی عطا کردہ سب نعمتیں ہیں اور اسی کا (ہم پر) فضل واحسان ہے، اسی کی سب اچھی تعریفیں ہیں، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، ہم تو پورے اخلاص کے ساتھ صرف اسی کے دین کے ماننے والے ہیں، خواہ کافروں کو یہ برا لگے۔"

اسی طرح نبی ﷺ کا یہ معمول تھا کہ آپ تینتیس بار سبحان اللہ تینتیس بار الحمدللہ اور تینتیس بار اللہ اکبر پڑھتے اور درج ذیل کلمات پڑھ کر اس تعداد کو پورا سو کر دیتے:

«لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ وَحْدَهُ لاَ شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ»

(صحيح مسلم، المساجد، باب استحباب الذكر، ح: ٥٩٧)

"اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ سارا ملک اس کا ہے، ساری تعریفیں بھی اسی کے لیے ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

آپ [سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَاللّٰهُ اَكْبَرُ] کو مجموعی طور پر بھی تینتیس بار پڑھ سکتے ہیں اور تسبیح وتحمید وتکبیر کے کلمات کو الگ الگ تینتیس بار پڑھ کر آخر میں ایک بار [لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ، وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ] بھی پڑھ سکتے ہیں۔

اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ تینتیس بار کے بجائے تسبیح، تحمید اور تکبیر کے کلمات دس دس بار پڑھ لیے جائیں، اس طرح یہ کلمات تینتیس بار ہو جائیں گے اور یہ بھی سنت سے ثابت ہے۔①

اس سلسلہ میں سنت سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ [سُبْحَانَ اللّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ اَكْبَرُ] کے ان چار کلمات کو پچیس پچیس بار پڑھ لیں اور اس طرح ان کلمات کی تعداد ایک سو ہو جائے گی۔②

ذکر کی ان مختلف صورتوں میں سے جس کو بھی اختیار کر لیا جائے، جائز ہے کیونکہ شرعی قاعدہ یہ ہے کہ جن عبادات کو مختلف طریقوں

---

① سنن أبي داود، الأدب، باب في التسبيح عند النوم، حديث:5065

② جامع الترمذي، الدعوات، باب منه، حديث:3413

سے ادا کرنا ثابت ہے‘ ان کے بارے میں یہ تمام طریقے مسنون ہیں‘ لہٰذا ان میں سے کبھی کسی طریقے کو اختیار کر لیا جائے اور کبھی کسی طریقے کو تاکہ انسان سنت سے ثابت تمام طریقوں کے مطابق عمل کر سکے۔ یہ اذکار عام ہیں اور انہیں‘ فجر‘ ظہر‘ عصر‘ مغرب اور عشا تمام نمازوں کے بعد پڑھنا چاہیے‘ مغرب اور فجر کی نمازوں کے بعد دس بار تہلیل کے کلمات بھی پڑھنے چاہییں‘ اسی طرح مغرب و فجر کی نمازوں کے بعد سات بار یہ کلمہ پڑھنا چاہیے:

«اَللّٰهُمَّ أَجِرْنِي مِنَ النَّارِ»(سنن أبي داود، الأدب، باب ما يقول إذا أصبح، ح:٥٠٧٩)

’’اے اللہ! مجھے (جہنم کی) آگ سے بچا۔‘‘

نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا کیسا ہے؟

سوال نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب یہ حکم شریعت نہیں ہے کہ نماز سے فراغت کے بعد انسان ہاتھ اٹھا کر دعا کرے‘ اگر دعا کا ارادہ ہو تو نماز سے فراغت کے بعد کی نسبت نماز کے اندر دعا کرنا افضل ہے جیسا کہ حدیث حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں نبی ﷺ نے تشہد کا ذکر کرتے ہوئے‘ اس کی طرف راہنمائی فرمائی کہ:

«ثُمَّ لِيَتَخَيَّرْ مِنَ الدُّعَاءِ أَعْجَبَهُ إِلَيْهِ»(صحيح البخاري، الأذان، باب ما يتخير من الدعاء بعد التشهد، ح:٨٣٥)

’’پھر اس دعا کو اختیار کر لے جو اسے زیادہ پسند ہو۔‘‘

اور بعض عوام جو یہ کرتے ہیں کہ جب بھی وہ نفل نماز ادا کریں تو فراغت کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں اور بعض اس قدر جلد دعا کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کوئی دعا کی ہی نہیں کیونکہ اکثر و بیشتر یہ دیکھا گیا ہے کہ نماز کے لیے اقامت کہی جا رہی ہے‘ نفل پڑھنے والا تشہد میں ہے اور وہ سلام پھیرنے کے فوراً بعد ہاتھ اٹھا لیتا ہے اور کوئی دعا بھی نہیں کرتا بلکہ معلوم یوں ہوتا ہے‘ واللہ اعلم‘ کہ اس نے محض ہاتھ اٹھا کر منہ پر پھیر لیے ہیں اور یہ صرف اس لیے تاکہ وہ دعا کی اس رسم کو پورا کر لے جسے وہ حکم شریعت سمجھتا ہے‘ حالانکہ یہ حکم شریعت نہیں بلکہ اس حد تک اس کے اہتمام سے یہ فعل بدعت شمار ہوتا ہے۔

فرض نماز کے بعد بلند آواز سے اجتماعی ذکر

سوال بعض ممالک میں فرض نمازوں کے بعد سورۂ فاتحہ‘ ذکر اور آیت الکرسی کو اجتماعی طور پر بلند آواز سے پڑھا جاتا ہے‘ اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب نماز کے بعد سورۂ فاتحہ‘ آیت الکرسی اور ذکر اجتماعی طور پر بلند آواز سے پڑھنا بدعت ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ اور آپ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہ بات معروف ہے کہ وہ نماز کے بعد بلند آواز سے ذکر تو کیا کرتے تھے لیکن ان میں سے ہر شخص انفرادی طور پر اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرتا تھا‘ وہ اجتماعی طور پر ذکر نہیں کیا کرتے تھے۔ فرض نماز کے بعد بلند آواز سے ذکر کرنا سنت ہے

جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«أَنَّ رَفْعَ الصَّوْتِ بِالذِّكْرِ حِينَ يَنْصَرِفُ النَّاسُ مِنَ الْمَكْتُوبَةِ كَانَ عَلٰى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ»(صحيح البخاري، الأذان، باب الذكر بعد الصلاة، ح: ٨٤١)

’’نبی اکرم ﷺ کے عہد میں جب لوگ فرض نماز سے فارغ ہوتے تو بلند آواز سے ذکر ہوتا تھا۔‘‘

نماز سے فراغت کے بعد سری یا جہری طور پر سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بارے میں مجھے نبی ﷺ کی کوئی حدیث معلوم نہیں۔ حدیث میں تو صرف ’’آیت الکرسی‘ سورت اخلاص اور معوذتین‘ پڑھنے کا ذکر ہے۔

قضائے حاجت کی وجہ سے نماز باجماعت کو چھوڑا جا سکتا ہے

سوال جب انسان کو یہ اندیشہ ہو کہ قضائے حاجت کی وجہ سے نماز باجماعت ادا نہیں کی جا سکے گی تو کیا وہ حاجت کو روک کر نماز باجماعت ادا کر لے یا پہلے قضائے حاجت کرے‘ خواہ جماعت فوت ہی ہو جائے؟

جواب اسے چاہیے کہ پہلے قضائے حاجت کرے‘ پھر وضو کر کے نماز ادا کرے خواہ جماعت فوت ہو جائے کیونکہ یہ نماز باجماعت ادا نہ کرنے کے لیے ایک شرعی عذر ہے اور نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«لاَ صَلاَةَ بِحَضْرَةِ الطَّعَامِ، وَلاَ هُوَ يُدَافِعُهُ الأَخْبَثَانِ»(صحيح مسلم، المساجد، باب كراهة الصلاة بحضرة الطعام، ح: ٥٦٠)

’’کھانے کی موجودگی میں نماز نہیں اور نہ اس وقت جب کہ بول و براز اس سے مزاحمت کر رہے ہوں (اسے قضائے حاجت کا معاملہ درپیش ہو۔‘‘)

نماز میں آنکھیں بند کر لینا

سوال نماز میں آنکھیں بند کر لینے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب نماز میں آنکھوں کو بند کرنا مکروہ ہے کیونکہ یہ نبی ﷺ کے معمول کے خلاف ہے‘ البتہ اگر کوئی سبب ہو تو آنکھوں کو بند کیا جا سکتا ہے مثلاً: اس کے آگے کوئی منقش دیوار ہو یا جائے نماز منقش ہو یا اس کے آگے تیز روشنی ہو جو اس کی آنکھوں کو تکلیف دیتی ہو۔ الغرض اگر کسی سبب کی وجہ سے آنکھوں کو بند کیا ہو تو کوئی حرج نہیں ورنہ مکروہ ہے۔ مزید تفصیل کے لیے امام ابن قیم رحمہ اللہ کی کتاب ’’زاد المعاد‘ ملاحظہ فرمائیں۔

کیا دورانِ نماز میں انگلیاں چٹخانا جائز ہے؟

سوال کیا دوران نماز میں غلطی سے انگلیاں چٹخانے سے نماز باطل ہو جاتی ہے؟

جواب انگلیاں چٹخانے سے نماز باطل تو نہیں ہوتی لیکن انگلیاں چٹخانا ایک بے فائدہ کام ہے اور اگر انسان نماز باجماعت ادا کرتے ہوئے ایسا کام کرے تو سننے والوں کو تشویش میں مبتلا کر دیتا ہے اور اس طرح تنہائی میں ایسا کرنے کی نسبت‘ اس کے نقصان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس مناسبت سے میں یہاں یہ بات کہنا بھی پسند کروں گا کہ نماز میں حرکت کی پانچ اقسام ہیں:

① حرکت واجب۔ ② حرکت مسنون۔ ③ حرکت مکروہ۔ ④ حرکت حرام۔ ⑤ حرکت جائز۔

- حرکت واجب وہ ہے جس پر نماز کا کوئی فعل واجب موقوف ہو مثلاً: یہ کہ انسان نماز ادا کرنا شروع کر دے اور پھر اسے یاد آئے کہ اس کے رومال پر نجاست لگی ہوئی ہے تو اس صورت میں اس کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ اپنے رومال کو اتار دے۔ یہ حرکت واجب ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ نماز ادا فرما رہے تھے کہ آپ کے پاس جبریل آئے اور انھوں نے یہ بتایا کہ آپ کے جوتوں کو نجاست لگی ہوئی ہے تو نبیٔ اکرم ﷺ نے انھیں دوران نماز ہی میں اتار دیا اور نماز کو جاری رکھا' پس یہ حرکت واجب ہے اور اس کے لیے ضابطہ یہ ہے کہ اس پر کسی واجب کو ادا کرنا یا کسی کو ترک کرنا موقوف ہو۔
- حرکت مسنون وہ ہے جس پر نماز کا کمال موقوف ہو مثلاً: صف میں خلا آ جانے کی صورت میں اس خلا کو پر کرنے کے لیے صف کے قریب ہونا' مثلاً: انسان نماز ادا کر رہا ہو اور اس کے اور اس کے ساتھی کے درمیان خلا ہو تو اس خلا کو پر کرنے کے لیے اپنے ساتھی کے قریب ہونا حرکت مسنون ہوگی کیونکہ جماعت کی صورت میں خلا کو پر کرنا مسنون ہے۔
- حرکت مکروہ وہ ہے جس کی نماز میں کوئی ضرورت نہ ہو اور نہ تکمیل نماز کے ساتھ ہی اس کا کوئی تعلق ہو۔
- حرکت حرام وہ ہے جو بہت زیادہ اور مسلسل ہو مثلاً: یہ کہ انسان نماز میں حالت قیام میں ہو اور وہ کوئی بے فائدہ حرکت شروع کر دے' رکوع کی حالت میں ہو اور وہ یہی حرکت کر رہا ہو اور پھر سجدہ اور جلسہ میں بھی اسی حرکت کو جاری رکھے حتی کہ نماز کی صورت ہی ختم ہو جائے تو یہ حرکت حرام ہے کیونکہ اس سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔
- حرکت مباح وہ ہے' جو مذکورہ بالا صورتوں کے علاوہ ہو مثلاً: یہ کہ ضرورت پیش آنے پر کھجلی کر لے یا اس کا رومال اس کی آنکھوں پر گر جائے اور وہ اسے آنکھوں سے اوپر اٹھا لے تو یہ حرکت مباح ہے۔ یا یہ کہ کوئی انسان اس سے اجازت طلب کرے اور وہ ہاتھ اٹھا کر اسے اجازت دے دے تو یہ حرکت بھی جائز ہے۔

نماز میں سترے کا بیان

سوال سترے کے بارے میں کیا حکم ہے اور اس کی مقدار کتنی ہے؟

جواب نماز میں سترہ سنت مؤکدہ ہے' البتہ امام کے سترہ پر اکتفا کی وجہ سے مقتدی کے لیے سترہ اختیار کرنا مسنون نہیں ہے۔

اس کی مقدار کے بارے میں نبیٔ اکرم ﷺ سے سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

«مِثْلَ مُؤْخِرَةِ الرَّحْلِ»(صحيح مسلم، الصلاة، باب سترة المصلي . . . ح:٤٩٩)

''کجاوے کے پچھلے حصے کی طرح ہو۔''

لیکن یہ اس کی زیادہ سے زیادہ مقدار ہے جب کہ اس سے کم تر مقدار بھی جائز ہے کیونکہ دوسری حدیث میں آیا ہے:

«إِذا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلْيَسْتَتِرْ لِصَلَاتِهِ وَلَوْ بِسَهْمٍ»(مسند أحمد، ح:٣/ ٤٠٤ وصحيح ابن خزيمة، سترة المصلي، ح:٨١١)

''جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو سترہ اختیار کرے خواہ وہ تیر کے بقدر ہو۔''

ایک اور حدیث میں ہے جسے امام ابو داود رحمہ اللہ نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے:

«فَإِنْ لَمْ يَجِدْ فَلْيَخُطَّ خَطًّا»(سنن أبي داود، الصلاة، باب الخط إذا لم يجد عصا، ح:٦٨٩ وسنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب مايستر المصلي، ح:٩٤٣ واللفظ له وصحيح ابن خزيمة، سترة المصلي: ٢/ ١٢، ٨١١)

''اگر اسے کوئی چیز نہ ملے تو لکیر کھینچ لے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''بلوغ المرام'' میں لکھا ہے کہ جس نے اس حدیث کو مضطرب قرار دیا ہے' اس کی بات درست نہیں ہے کیونکہ اس حدیث میں کوئی ایسی علت نہیں جس کی وجہ سے اسے رد کر دیا جائے' لہٰذا ہم یہ کہتے ہیں کہ سترہ کی کم سے کم مقدار لکیر اور زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ وہ کجاوے کے پچھلے حصے کے برابر ہو۔ (لیکن شیخ البانی رحمہ اللہ اور دیگر کئی محدثین نے اسے ضعیف ہی قرار دیا ہے۔)

سوال جب کوئی شخص مسجد حرام میں نماز ادا کر رہا ہو' نماز فرض ہو یا نفل اور نماز ادا کرنے والا مقتدی ہو یا منفرد' اس کے آگے سے گزرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب مسجد حرام یا کسی بھی دوسری مسجد میں مقتدی کے آگے سے گزرنے میں کوئی حرج نہیں (کیونکہ امام ان کے لیے سترہ ہے) کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ منیٰ میں لوگوں کو کسی دیوار کی اوٹ کے بغیر نماز پڑھا رہے تھے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما گدھے پر سوار صف کے آگے سے گزر گئے اور کسی نے انہیں منع نہ کیا۔ ①

نمازی اگر امام یا منفرد ہو تو اس کے آگے سے گزرنا جائز نہیں' نہ مسجد حرام میں اور نہ کسی دوسری جگہ کیونکہ دلائل کے عموم کا یہی تقاضا ہے اور ایسی کوئی دلیل نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ مکہ یا مسجد حرام میں نمازی کے آگے سے گزرنے میں کوئی نقصان نہیں یا اس سے گزرنے والا گناہ گار نہیں ہوتا۔

نماز پڑھتے وقت بجلی کا ہیٹر وغیرہ سامنے ہو تو کوئی حرج نہیں

سوال نماز ادا کرنے والے نمازیوں کے آگے بجلی کا ہیٹر رکھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا اس میں کوئی شرعی ممانعت ہے؟ اللہ تعالیٰ آپ کو ثواب عطا فرمائے اور آپ کے علم کے ساتھ مسلمانوں کو نفع پہنچائے!

جواب مسجد میں قبلہ کی طرف نمازیوں کے آگے ہیٹر رکھنے میں کوئی حرج نہیں' مجھے اس کے بارے میں کسی شرعی ممانعت کا علم نہیں ہے۔

کیا نمازی قراءت میں جنت اور جہنم کے ذکر پر دعا اور پناہ طلب کر سکتا ہے؟

سوال کیا نمازی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ قراءت میں جنت کے ذکر کے موقع پر اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرے اور جہنم کے ذکر کے وقت اللہ تعالیٰ سے آتش دوزخ سے پناہ مانگے؟ کیا اس بارے میں مقتدی اور منفرد میں کوئی فرق ہے؟

---

① صحیح البخاری' العلم' باب متی یصح سماع الصغیر' حدیث:76

جواب ہاں یہ جائز ہے اور اس بارے میں امام، منفرد اور مقتدی میں کوئی فرق نہیں، البتہ مقتدی کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ اس قدر مشغول نہ ہو کہ وہ اس خاموشی کو اختیار نہ کر سکے جس کے اختیار کرنے کا قراءت کے موقع پر حکم دیا گیا ہے۔

سجدہ سہو کے اسباب کا بیان

سوال سجدہ سہو کن اسباب کی وجہ سے کیا جاتا ہے؟

جواب نماز میں سجدہ سہو کے عموماً درج ذیل تین اسباب ہیں: ① نماز میں اضافہ ہو جانا ② کمی ہو جانا ③ شک میں مبتلا ہو جانا۔ اضافے کی مثال یہ ہے کہ انسان نماز میں رکوع یا سجدہ یا قیام یا قعدہ کا اضافہ کر دے۔ اور کمی کی مثال یہ ہے کہ نماز کے کسی رکن کو کم کر دے یا واجبات میں کسی واجب کو کم کر دے۔ اور شک کی مثال یہ ہے کہ اسے یہ شک ہو کہ اس نے تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار؟ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر نماز میں رکوع یا سجدہ یا قیام یا قعدہ کا اضافہ کر دے تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی کیونکہ اس نے نماز کو اس طرح ادا نہیں کیا جس طرح اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے اسے ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح البخاري معلقًا، البيوع، باب النجش ... قبل، ح:٢١٤٢ وصحيح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة ورد محدثاب الأمور، ح:١٧١٨(١٨)

’’جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس کے بارے میں ہمارا امر (حکم) نہ ہو تو وہ مردود ہے۔‘‘

اگر بھول کر اضافہ ہو جائے تو اس سے نماز باطل نہیں ہوگی، البتہ سلام کے بعد سجدہ سہو کرنا ہوگا اور اس کی دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے جب ظہر یا عصر کی نماز میں ایک بار دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیر دیا تھا اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے باقی ماندہ نماز پڑھائی، پھر سلام پھیر دیا اور سلام پھیرنے کے بعد دو سجدے کیے۔ ① اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ ایک بار نبیٔ اکرم ﷺ نے ظہر کی پانچ رکعتیں پڑھا دیں اور جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو عرض کیا گیا: کیا نماز میں اضافہ کر دیا گیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ’’وہ کیسے؟‘‘ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ آپ نے پانچ رکعتیں پڑھائی ہیں، آپ نے اپنے دونوں پاؤں کو موڑا، قبلہ کی طرف رخ کیا اور دو سجدے کیے۔ ②

اگر کمی کا تعلق نماز کے ارکان میں سے کسی رکن سے ہو تو اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: ① اسے یہ بات دوسری رکعت میں اس مقام پر پہنچنے سے پہلے یاد آئے تو اس صورت میں لازم ہوگا کہ وہ اس رکن کو ادا کرنے کے بعد باقی نماز کو ادا کرے۔ ② اگر اسے یہ بات دوسری رکعت میں اس مقام پر پہنچنے کے وقت یاد آئے تو یہ رکعت اس رکعت کے قائم مقام ہو گی جس میں اس نے رکن کو ترک کر دیا تھا اور اس دوسری رکعت کے بدلے میں اور رکعت پڑھنی چاہیے اور ان دونوں حالتوں میں اسے سلام کے بعد سجدہ سہو کرنا چاہیے۔ پہلی صورت اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص پہلی رکعت میں پہلے سجدہ کے بعد ہی اٹھ کھڑا ہوا اور نہ بیٹھا ہوا اور نہ اس نے دوسرا سجدہ کیا

---

① صحيح البخاری، الصلاة، باب تشبيك الأصابع فی المسجد وغيره، حديث:482

② صحيح البخاری، الصلاة، باب ماجاء فی القبلة و من لم يرالإعادة......حديث:404

ہو اور جب اس نے قراءت شروع کی تو اسے یاد آیا کہ اس نے سجدہ نہیں کیا اور نہ وہ دو سجدوں کے درمیان بیٹھا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ لوٹ کر دو سجدوں کے درمیان بیٹھے، پھر سجدہ کرے اور پھر کھڑے ہو کر باقی نماز ادا کرے اور سلام کے بعد سجدۂ سہو کرے۔

دوسری صورت کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص پہلی رکعت میں پہلا سجدہ کرنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے دوسرا سجدہ نہ کیا ہو اور نہ وہ دونوں سجدوں کے درمیان میں بیٹھا ہو اور پھر اسے یہ بات یاد بھی اس وقت آئی ہو۔ جب وہ دوسری رکعت میں دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھا ہو، اس حال میں اس کی یہ دوسری رکعت پہلی رکعت ہوگی اور اسے ایک رکعت اور پڑھنا ہوگی اور پھر سلام کے بعد سجدہ سہو کرنا ہوگا۔

جب کسی واجب میں کمی رہ جائے اور وہ اس کی جگہ دوسری جگہ منتقل ہو جائے مثلاً: وہ سجدہ میں "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى" پڑھنا بھول گیا اور سجدے سے سر اٹھانے کے بعد اسے یاد آیا کہ اس نے اسے نہیں پڑھا۔ اس نے بھول کر واجبات نماز میں سے ایک واجب کو ترک کر دیا ہے، تو اسے نماز کو جاری رکھنا چاہیے اور سلام سے قبل سجدہ سہو کر لینا چاہیے، کیونکہ نبی ﷺ جب تشہد اول کو بھول گئے تھے تو آپ نے نماز کو جاری رکھا تھا، واپس نہیں آئے تھے اور آپ نے سلام سے پہلے سجدہ سہو کر لیا تھا۔

شک کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی کو کمی اور بیشی میں تردد ہوتا ہے مثلاً: یہ کہ اسے تردد ہو کہ اس نے تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار، تو اس کی دو حالتیں ہو سکتی ہیں: ① کمی یا بیشی میں سے کوئی ایک صورت اس کے نزدیک راجح ہو تو جو صورت راجح ہو اسے اختیار کر کے نماز پوری کر لے اور سلام کے بعد سجدہ سہو کر لے۔ اور اگر کوئی ایک صورت راجح نہ ہو تو پھر یقین پر انحصار کرے اور وہ کم تعداد ہے، اس کے بعد باقی نماز کو پورا کرنے کے بعد سلام سے پہلے سجدہ سہو کر لے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص ظہر کی نماز پڑھ رہا تھا کہ وہ اس شک میں مبتلا ہو گیا کہ وہ تیسری رکعت پڑھ رہا ہے یا چوتھی؟ اسے یہ بات راجح معلوم ہوئی کہ یہ اس کی تیسری رکعت ہے، اس صورت میں وہ ایک رکعت اور پڑھ کر سلام پھیر دے اور پھر سجدہ سہو کر لے۔

دونوں صورتوں میں برابری کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص کو نماز ظہر ادا کرتے ہوئے یہ شک ہوا کہ یہ اس کی تیسری رکعت ہے یا چوتھی اور اس کے نزدیک یہ بات راجح نہ تھی کہ یہ تیسری رکعت ہے اور نہ ہی یہ بات راجح تھی کہ یہ چوتھی رکعت ہے تو اس صورت میں اسے یقین پر انحصار کرنا ہوگا اور ظاہر ہے کہ وہ کم تعداد ہے، لہٰذا وہ اسے تیسری رکعت قرار دے، پھر ایک رکعت اور پڑھے اور سلام سے پہلے سجدہ سہو کرے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ سجدہ سہو قبل از سلام اس وقت ہوگا، جب نمازی واجبات نماز میں سے کسی واجب کو ترک کر دے یا نماز کی رکعات کی تعداد میں اسے شک ہو اور کوئی ایک پہلو اس کے نزدیک راجح نہ ہو۔ اور جب نماز میں اضافہ ہو جائے یا شک کی صورت میں کوئی ایک پہلو اس کے نزدیک راجح ہو تو پھر سجدہ سہو بعد از سلام ہوگا۔

نماز میں کمی بیشی کے احکام

سوال امام نے ایک رکعت زیادہ پڑھ لی تھی اور میں جماعت کے ساتھ بعد میں شامل ہوا تھا، لہٰذا میں نے اس رکعت کو شمار کر لیا تو

کیا اس صورت میں میری نماز صحیح ہوگی؟ اگر میں اسے شمار نہ کروں اور ایک رکعت اور پڑھ لوں تو پھر کیا حکم ہوگا؟

جواب صحیح قول یہ ہے کہ اس صورت میں آپ کی نماز صحیح ہے کیونکہ آپ نے پوری نماز پڑھی ہے، امام بھول کر ایک رکعت زیادہ پڑھنے میں معذور ہے، لہٰذا اگر آپ کھڑے ہو کر ایک رکعت اور پڑھیں گے تو آپ بلا عذر ایک رکعت کا اضافہ کریں گے۔ جس سے آپ کی نماز باطل ہو جائے گی۔ یہ فتویٰ 1407/7/25ھ کو لکھا گیا۔

سوال ایک شخص رات کو نماز ادا کر رہا تھا اور رات کی نماز دو دو رکعت ہے لیکن وہ بھول کر تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہو گیا تو اس صورت میں وہ کیا کرے؟

جواب جب اسے یاد آئے تو وہ پیچھے لوٹ آئے اور اگر نہیں لوٹے گا تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی کیونکہ اس نے جان بوجھ کر ایک رکعت کا اضافہ کیا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے نص موجود ہے کہ جو شخص رات کی نماز میں تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے تو اس کی مثال اس طرح ہے جیسے کوئی نماز فجر میں تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے یعنی اگر وہ نہ لوٹے تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی، البتہ نماز وتر اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ نماز وتر کی دو رکعتوں میں اضافہ کرنا بھی جائز ہے یعنی اگر کوئی انسان نماز وتر اس نیت سے شروع کرے کہ وہ دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیر دے گا اور پھر تیسری رکعت الگ سے پڑھے گا لیکن وہ بھول جانے کی وجہ سے سلام پھیرے بغیر تیسری رکعت کیلئے کھڑا ہو گیا تو ہم اسے کہیں گے کہ تیسری رکعت پوری کر لو کیونکہ نماز وتر کی دو رکعتوں میں اضافہ کرنا جائز ہے۔

سوال ایک نمازی تشہد اول میں بیٹھنے کے بجائے کھڑا ہو گیا اور اس نے جب قراءت شروع کی تو اسے یاد آیا تو کیا وہ قراءت چھوڑ کر تشہد میں واپس آ جائے اور اس صورت میں وہ سجدہ سہو قبل از سلام کرے یا بعد از سلام؟

جواب اس صورت میں وہ واپس نہ آئے کیونکہ وہ تشہد سے مکمل طور پر جدا ہو کر اس کے ساتھ والے رکن میں پہنچ گیا ہے، لہٰذا اس کے لیے واپسی مکروہ ہے اور اگر وہ واپس آ جائے تو اس کی نماز باطل نہیں ہوگی کیونکہ اس نے کسی فعلِ حرام کا ارتکاب نہیں کیا، البتہ اسے قبل از سلام سجدہ سہو کرنا ہوگا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس صورت میں وہ نماز کو جاری رکھے، نہ لوٹے اور واجب میں کمی کو پورا کرنے کے لیے قبل از سلام سجدہ سہو کر لے۔

کیا نماز وتر غیر رمضان میں بھی واجب ہے؟

سوال وتر کے بارے میں کیا حکم ہے، کیا یہ نماز رمضان المبارک کے ساتھ خاص ہے؟

جواب وتر رمضان و غیر رمضان میں سنت مؤکدہ ہے حتیٰ کہ امام احمد رحمہ اللہ اور کئی دیگر ائمہ نے فرمایا ہے کہ جو وتر ترک کر دے وہ برا آدمی ہے، اس کی شہادت قبول نہیں کرنی چاہیے۔ وتر سنت مؤکدہ ہے، مسلمان کو چاہیے کہ وہ اسے رمضان و غیر رمضان میں کسی وقت بھی ترک نہ کرے۔ وتر کا مفہوم یہ ہے کہ رات کی نماز کو ایک رکعت پڑھ کر ختم کر دیا جائے، وتر سے مراد قنوت نہیں ہے جیسا کہ بعض عوام سمجھتے ہیں کیونکہ قنوت ایک الگ چیز ہے اور وتر الگ چیز۔ وتر یہ ہے کہ رات کی نماز کو ایک رکعت پڑھ کر ختم کیا جائے یا تین رکعات اکٹھی پڑھ لی جائیں۔ بہرحال وتر رمضان و غیر رمضان میں سنت مؤکدہ ہے، مسلمان کو اسے چھوڑنا نہیں چاہیے۔

قنوتِ وتر اور قنوتِ نازلہ کے احکام

سوال امید ہے آپ راہنمائی فرمائیں گے کہ مسنون دعائے قنوت کیا ہے؟ کیا اس کی مخصوص دعائیں ہیں؟ کیا یہ حکمِ شریعت ہے کہ نماز وتر میں طویل دعا کی جائے؟

جواب نبی ﷺ نے حضرت حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما کو درج ذیل دعا سکھائی تھی:

«اَللّٰھُمَّ اھْدِنِي فِیمَنْ ھَدَیْتَ، وَعَافِنِي فِیمَنْ عَافَیْتَ . . . »(جامع الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في القنوت في الوتر، ح:٤٦٤)

"اے اللہ! تو ہدایت دے مجھے ان میں (داخل کر کے) جن کو تو نے ہدایت دی اور عافیت دے مجھے ان میں (شامل کر کے) جن کو تو نے عافیت دی......"

امام کو چاہیے کہ وہ جمع کے صیغے استعمال کرے مثلاً یہ کہے: [اَللّٰھُمَّ اھْدِنَا......] کیونکہ وہ اپنے اور اپنے مقتدیوں کے لیے دعا کرتا ہے اور اگر مناسب حال کوئی دوسری دعا بھی شامل کر لے تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن دعا اس قدر بہت زیادہ طویل نہیں ہونی چاہیے جو مقتدیوں پر گراں گزرے یا جس سے وہ اکتا جائیں کیونکہ نبی ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے اس وقت ناراض ہوتے ہوئے فرمایا تھا' جب وہ اپنی قوم کو بہت طویل نماز پڑھانے لگے تھے:

«یَامُعَاذُ، أَفَتَّانٌ أَنْتَ؟»(صحیح البخاري، الأذان، باب من شکا إمامه إذا طول، ح:٧٠٥)

"اے معاذ! کیا تم لوگوں کو فتنے میں مبتلا کرنے لگے ہو؟"

سوال کیا دعائے قنوت میں رفع الیدین سنت ہے؟ اگر سنت ہے تو اس کی دلیل کیا ہے؟

جواب ہاں یہ سنت ہے کہ انسان دعائے قنوت میں اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ فرض نمازوں میں قنوت نازلہ کے وقت رفع الیدین فرمایا کرتے تھے' اسی طرح حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے قنوت وتر میں بھی رفع الیدین ثابت ہے اور وہ ان خلفائے راشدین میں سے ایک ہیں جن کے اتباع کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ رفع الیدین قنوت وتر میں سنت ہے خواہ کوئی امام ہو یا مقتدی یا منفرد' لہٰذا آپ جب بھی قنوت (دعا) کریں تو رفع الیدین کریں۔

سوال فرائض میں قنوت کے بارے میں کیا حکم ہے؟ جب مسلمانوں پر کوئی مصیبت نازل ہو تو اس وقت کیا حکم ہے؟

جواب فرائض میں قنوت ثابت نہیں ہے' لہٰذا فرائض میں اسے نہیں کرنا چاہیے لیکن اگر امام قنوت کرے تو اس کا اتباع کریں کیونکہ اختلاف بری بات ہے اور اگر مسلمانوں پر کوئی مصیبت نازل ہو تو پھر اللہ تعالیٰ سے' اس مصیبت کے دور کر دینے کے لیے دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

نماز تراویح کے احکام اور رکعات کی تعداد کا بیان

سوال نماز تراویح کے بارے میں کیا حکم ہے اور اس کی رکعات کتنی ہیں؟

جواب نماز تراویح سنت ہے اور یہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے

ایک رات مسجد میں نماز پڑھی۔ لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھی، پھر آپ نے دوسری رات نماز پڑھی اور لوگوں کی بھی کثیر تعداد نے آپ کے ساتھ نماز ادا کی، پھر لوگ اسی طرح تیسری یا چوتھی رات میں بھی جمع ہوئے لیکن رسول اللہ ﷺ تشریف نہ لائے اور جب صبح ہوئی تو آپ نے فرمایا:

«قَدْ رَأَيْتُ الَّذِي صَنَعْتُمْ فَلَمْ يَمْنَعْنِي مِنَ الْخُرُوجِ إِلَيْكُمْ إِلاَّ أَنِّي خَشِيتُ أَنْ تُفْرَضَ عَلَيْكُمْ»(صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الترغيب في قيام رمضان . . . ح:٧٦١)

”تم نے جو کیا میں نے اسے دیکھا ہے اور گھر سے میں اس لیے نہیں نکلا کہ مجھے یہ خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں اس نماز کو تم پر فرض قرار نہ دے دیا جائے۔“

اس واقعہ کا تعلق رمضان سے ہے۔ نماز تراویح کی رکعات کی تعداد گیارہ ہے کیونکہ صحیحین میں حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ جب ان سے سوال کیا گیا کہ رمضان میں نبی ﷺ کی نماز کیسے تھی؟ انھوں نے جواب دیا:

«مَا كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَزِيدُ فِي رَمَضَانَ وَلاَ فِي غَيْرِهِ عَلٰى إِحْدٰى عَشْرَةَ رَكْعَةً»(صحيح البخاري، التهجد، باب قيام النبي ﷺ بالليل، ح:١١٤٧ وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الليل . . . ح:٧٣٨)

”رسول اللہ ﷺ رمضان وغیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔“

اگر کوئی تیرہ رکعت پڑھ لے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے:

«كَانَتْ صَلاَةُ النَّبِيِّ ﷺ ثَلاَثَ عَشْرَةَ رَكْعَةً»(صحيح البخاري، التهجد، باب كيف صلاة النبي ﷺ . . . ح:١١٣٨ وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة النبي ﷺ ودعائه . . . ح:٧٦٤)

”نبی ﷺ کی نماز تیرہ رکعت تھی۔“

یعنی رات کی نماز کی رکعات کی تعداد تیرہ تھی۔ حضرت عمر بن خطاب ؓ سے بھی نماز تراویح کی تعداد گیارہ ہی ثابت ہے جیسا کہ موطأ میں اس سند کے ساتھ ثابت ہے، جو تمام سندوں میں سب سے زیادہ صحیح ہے۔ اور اگر اس سے زیادہ رکعات پڑھ لی جائیں تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ نبی ﷺ سے جب رات کی نماز کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ دو دو رکعت ہے۔ ① اور پھر آپ نے تعداد کی کوئی حد مقرر نہ فرمائی۔ سلف سے اس بارے میں مختلف معمولات ثابت ہیں کیونکہ اس مسئلہ میں کافی گنجائش ہے، البتہ افضل یہ ہے کہ اس تعداد کو اختیار کیا جائے جو نبی ﷺ سے ثابت ہے اور وہ ہے گیارہ یا تیرہ۔

نبی اکرم ﷺ یا خلفائے راشدین میں کسی سے یہ ثابت نہیں کہ وہ تئیس رکعات پڑھتے ہوں بلکہ حضرت عمر فاروق ؓ سے گیارہ رکعات ہی ثابت ہیں۔ انھوں نے حضرت ابی بن کعب اور حضرت تمیم الداری ؓ کو حکم دیا تھا کہ وہ لوگوں کو گیارہ رکعات پڑھایا کریں② اور حضرت عمر فاروق ؓ کے یہی بات شایان شان ہے کہ ان کا عمل رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق ہو۔

---

① صحیح البخاری، الوتر، باب ماجاء فی الوتر، حدیث:990

② الموطأ لإمام مالك، الصلاۃ، باب ماجاء فی قیام رمضان، حدیث:280

ہمیں نہیں معلوم کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے تیرہ رکعات سے زیادہ پڑھی ہوں بلکہ بظاہر اس کے خلاف معلوم ہوتا ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت کو قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان و غیر رمضان میں گیارہ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے، اور بلاشبہ! حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع بھی حجت ہے کیونکہ اس میں وہ خلفائے راشدین بھی ہیں جن کے اتباع کا ہمیں حکم دیا گیا ہے اور پھر وہ اس امت کے خیر القرون بھی ہیں۔

یاد رہے کہ نماز تراویح کی رکعات کی تعداد میں اجتہاد کی گنجائش ہے، لہٰذا اس مسئلہ کو امت کے انتشار و خلفشار کا سبب نہیں ہونا چاہیے خصوصاً جب سلف سے اس کے بارے میں مختلف معمولات منقول ہیں اور ایسی کوئی دلیل نہیں جو اس مسئلہ میں اجتہاد سے مانع ہو۔ کسی اہل علم نے اس کے اجتہاد کی مخالفت کرنے والے سے کیا خوب کہا کہ آپ نے میری مخالفت کر کے درحقیقت میری تائید کی ہے کیونکہ ہم دونوں کی رائے یہ ہے کہ اجتہادی مسائل میں انسان جس بات کو حق سمجھے اس کے لیے اس کا اتباع کرنا واجب ہے۔

ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی پسند اور رضا کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے!

تراویح میں ختم قرآن کے وقت دعا

سوال ماہ رمضان کے قیام اللیل میں دعائے ختم قرآن کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب ماہ رمضان کے قیام اللیل میں ختم قرآن کے موقع پر دعا کے بارے میں نبی ﷺ یا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مجھے کوئی سنت معلوم نہیں ہے اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہے، وہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا یہ عمل ہے کہ وہ جب قرآن مجید ختم کرتے تو اپنے اہل خانہ کو جمع کر کے دعا فرماتے تھے لیکن یہ دعا نماز میں نہیں ہوتی تھی۔

سنت سے اس کا ثبوت نہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں خرابی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب کسی معین مسجد میں ایسا پروگرام ہوتا ہے تو اس میں لوگ خصوصاً خواتین بھی بہت کثرت سے شرکت کرتی ہیں اور پھر مسجد سے باہر نکلتے وقت مردوں اور عورتوں میں اختلاط ہوتا ہے، جیسا کہ ہر دیکھنے والے کو یہ معلوم ہے۔

بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ ختم قرآن کے موقع پر دعا مستحب ہے۔ امام اگر رات کے آخری حصہ میں قیام میں قرآن مجید کو ختم کر لے اور وتر میں دعائے قنوت کی جگہ دعا کرے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ قنوت تو مشروع ہے۔

کیا لیلۃ القدر ہر سال ایک ہی رات میں آتی ہے؟

سوال کیا یہ ثابت ہے کہ لیلۃ القدر ہر سال کسی ایک مخصوص رات میں ہوتی ہے یا یہ ایک رات سے دوسری رات میں منتقل ہوتی رہتی ہے؟

جواب اس میں تو کچھ شک نہیں کہ لیلۃ القدر رمضان ہی کی ایک رات ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّآ أَنزَلۡنَٰهُ فِي لَيۡلَةِ ٱلۡقَدۡرِ ١﴾ (القدر: ۹۷/ ۱)

''بے شک ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل (کرنا شروع) کیا۔''

اور دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ اس نے قرآن مجید کو رمضان میں نازل فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ ٱلَّذِىٓ أُنزِلَ فِيهِ ٱلْقُرْءَانُ﴾ (البقرة: ٢/ ١٨٥)

’’رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔‘‘

نبی ﷺ لیلۃ القدر کی تلاش کے لیے رمضان کے عشرہ اول کا اعتکاف کیا کرتے تھے، پھر آپ نے درمیانی عشرے کا اعتکاف فرمایا اور پھر آپ نے اسے رمضان کے آخری عشرے میں دیکھا۔ پھر حضرات صحابۂ کرام ؓ نے مسلسل یہ خواب دیکھے کہ یہ رمضان کی آخری سات راتوں میں سے ایک رات ہے تو آپ نے فرمایا:

«أَرٰى رُؤْيَاكُمْ قَدْ تَوَاطَأَتْ فِي السَّبْعِ الأَوَاخِرِ فَمَنْ كَانَ مُتَحَرِّيهَا فَلْيَتَحَرَّهَا فِي السَّبْعِ الأَوَاخِرِ»(صحيح البخاري، فضل ليلة القدر، باب التماس ليلة القدر، ح:٢٠١٥ وصحيح مسلم، الصيام، باب فضل ليلة القدر، ح:١١٦٥)

’’میں دیکھتا ہوں کہ آخری سات راتوں کے بارے میں تم لوگوں کو مسلسل خواب آئے ہیں، لہٰذا جو اسے تلاش کرنا چاہے، وہ آخری سات راتوں میں تلاش کرے۔‘‘

یہ وہ کم سے کم مدت ہے، جو لیلۃ القدر کے کسی معین زمانے میں حصر کے بارے میں کہی گئی ہے۔

جب لیلۃ القدر کے بارے میں وارد دلائل پر ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک رات سے دوسری رات میں منتقل ہوتی رہتی ہے اور یہ ہر سال کسی ایک معین رات ہی میں نہیں ہوتی۔ نبی ﷺ کو خواب میں لیلۃ القدر دکھائی گئی کہ آپ اس کی صبح پانی اور مٹی میں سجدہ کریں گے اور یہ اکیسویں رات تھی۔ اور نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«تَحَرَّوا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْوِتْرِ مِنَ الْعَشْرِ الأَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ»(صحيح البخاري، فضل ليلة القدر، باب تحري ليلة القدر في الوتر من العشر الأواخر، ح:٢٠١٧)

’’لیلۃ القدر کو رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔‘‘

یہ حدیث بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کسی ایک رات میں منحصر نہیں ہے۔ اسی سے تمام دلائل میں تطبیق بھی ہو سکتی ہے اور آخری عشرے کی ہر رات انسان یہ امید کر سکتا ہے کہ شاید یہ لیلۃ القدر ہو۔ جو شخص بھی ایمان اور حصول ثواب کی نیت سے لیلۃ القدر میں قیام کرے گا، اسے اجر و ثواب ضرور مل جائے گا خواہ اسے اس رات کے بارے میں معلوم ہو یا نہ ہو کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ»(صحيح البخاري، الصوم، باب من صام رمضان إيمانا واحتسابا ...، ح:١٩٠١، وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الترغيب في قيام رمضان ... ح: ٧٦٠)

’’جو شخص ایمان اور حصول ثواب کی نیت سے لیلۃ القدر کا قیام کرے تو اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔‘‘

آپ نے اس حدیث میں یہ نہیں فرمایا کہ جب اسے یہ معلوم ہو کہ اس نے لیلۃ القدر کو پا لیا ہے۔ گویا لیلۃ القدر کے حصول ثواب کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ عامل کو اس بات کا علم بھی ہو کہ یہ لیلۃ القدر ہے، البتہ اگر کوئی شخص رمضان کے سارے آخری عشرے کا ایمان اور حصول ثواب کی نیت سے قیام کرے تو ہم یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس نے لیلۃ القدر کو پا لیا خواہ

یہ رات اس عشرہ کے ابتدائی حصے میں ہو یا درمیانی حصے میں ہو یا آخری حصے میں، واللہ الموفق!

تراویح میں امام کے پیچھے پڑھنے کی غرض سے قرآن اٹھانا جائز نہیں

سوال جو مقتدی رمضان میں نماز تراویح پڑھتے ہوئے قرآن مجید اٹھا لیتے ہیں تا کہ امام کے ساتھ ساتھ پڑھتے جائیں، ان کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اس غرض سے قرآن مجید اٹھائیں تو کئی طرح سنت سے اس کی ممانعت لازم آتی ہے، مثلاً:

① اس سے انسان حالت قیام میں دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کے اوپر نہیں رکھ سکتا۔

② اس سے بلا ضرورت کثرت سے حرکت کرنی پڑتی ہے مثلاً: قرآن مجید کو کھولنا، بند کرنا اور پھر بغل یا جیب وغیرہ میں رکھنا۔

③ یہ عمل اپنی ان حرکات کی وجہ سے نمازی کو حقیقت میں نماز سے غافل کر دیتا ہے۔

④ اس کی وجہ سے نمازی سجدہ کی جگہ کی طرف نہیں دیکھ سکتا جب کہ سجدہ کی جگہ کی طرف دیکھنا سنت اور افضل ہے۔

⑤ ایسا کرنے والے کا دل اگر حاضر نہ ہو تو بسا اوقات وہ بھول جاتا ہے کہ وہ نماز میں ہے، جب کہ خشوع خضوع کے ساتھ دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھ کر، سجدہ کی جگہ کی طرف سر کو جھکا کر نماز پڑھنے کی صورت میں ایسی غفلت نہیں ہوتی کیونکہ اس سے اس طرف زیادہ توجہ ہوتی ہے کہ وہ نماز پڑھ رہا ہے اور امام کی اقتدا میں ہے۔

قرآن مجید کو کس حد تک خوبصورت آواز بنا کر پڑھا جا سکتا ہے؟

سوال بعض ائمہ مساجد نماز تراویح کے اندر آواز کے لہجے کو تبدیل کر کے لوگوں کے دلوں کو نرم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، میں نے بعض لوگوں کو اس کی مخالفت کرتے ہوئے سنا ہے۔ اس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب میری رائے میں اگر یہ عمل کسی غلو کے بغیر شرعی حدود کے اندر ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا تھا:

«لَوْ عَلِمْتُ لَحَبَّرْتُهُ لَكَ تَحْبِيرًا»(سنن البيهقي، الشهادات، باب تحسين الصوت بالقرآن: ١٠/ ٢٣١ ومسند أبي يعلى: ١٣/ ٢٦٦، ٧٢٧٩)

”اگر مجھے معلوم ہوتا (کہ آپ میری قراءت سن رہے ہیں) تو میں آپ کے لیے خوب عمدہ طریقے سے پڑھتا۔“

اگر بعض لوگ اچھی آواز سے قرآن مجید پڑھنے کی کوشش کریں یا ایسے طریقے سے پڑھیں جس سے دل نرم ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں البتہ اگر اس میں غلو ہو جیسا کہ سوال سے مترشح ہوتا ہے تو غلو نہیں ہونا چاہیے۔ والعلم عند اللہ۔

فرض نماز سے پہلے والی سنن مؤکدہ کا وقت

سوال بعض علماء کہتے ہیں کہ پہلے اور بعد کی سنن مؤکدہ کا وقت فرض نماز کے وقت سے شروع ہوتا اور اس کے وقت کے ختم ہو جانے سے

ختم ہو جاتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ فرض نماز پڑھ لینے کی صورت میں پہلی سنتوں کا وقت ختم ہو جاتا ہے' اس مسئلہ میں راجح بات کیا ہے؟

جواب راجح بات یہ ہے کہ پہلی سنتوں کا وقت نماز کا وقت شروع ہونے سے لے کر نماز ادا کرنے کے درمیان تک ہے مثلاً: ظہر کی پہلی سنتوں کا وقت اذان ظہر یعنی زوال آفتاب سے شروع ہو کر نماز ظہر پڑھنے تک ہوگا۔ بعد کی سنتوں کا وقت فرض ختم ہو جانے سے لے کر وقت کے ختم ہو جانے تک ہوگا۔ اگر کسی کوتاہی کے بغیر پہلی سنتوں کا وقت ختم ہو جائے تو فرض نماز کے بعد ان کی قضا دے لی جائے اور اگر کوئی بلا عذر پہلی سنتوں کو مؤخر کرتا ہے تو اسے بعد میں ان کی قضا دے لینے کے باوجود کوئی فائدہ نہ ہوگا کیونکہ صحیح قول یہ ہے کہ ہر وہ عبادت جس کا وقت باقاعدہ متعین ہے' اگر بلا عذر وقت ضائع کر دیا جائے تو وہ عبادت صحیح اور مقبول نہیں ہے۔

فجر کی سنتیں اگر رہ جائیں تو فرض نماز کے بعد ادا کی جا سکتی ہیں

سوال جو شخص نماز فجر سے پہلے فجر کی سنتوں کو نہ پڑھ سکا ہو' اس کے نماز فجر کے بعد سنتوں کے پڑھنے کے بارے میں کا کیا حکم ہے؟ کیا یہ نماز فجر کے بعد نماز پڑھنے کی ممانعت سے متعارض تو نہیں ہے؟

جواب راجح قول کے مطابق فرضوں کے بعد صبح کی سنتوں کی قضا دینے میں کوئی حرج نہیں اور یہ نماز فجر کے بعد نماز کی ممانعت سے متعارض بھی نہیں ہے کیونکہ ممانعت اس نماز کی ہے' جس کا کوئی سبب نہ ہو' البتہ اگر کوئی شخص ان کی قضا کو چاشت کے وقت تک مؤخر کر دے اور بھول جانے یا دیگر کاموں میں مشغولیت کی وجہ سے غافل ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو تو یہ افضل ہے کہ انھیں چاشت کے وقت پڑھ لے۔

کیا تحیۃ المسجد پڑھنے کے بعد نوافل پڑھے جا سکتے ہیں؟

سوال جب کوئی انسان مسجد میں داخل ہو' تحیۃ المسجد پڑھ لے اور پھر مؤذن اذان دے' تو کیا اس صورت میں وہ نوافل پڑھ سکتا ہے؟

جواب اگر یہ اذان نماز فجر یا ظہر کے لیے ہو تو مؤذن کے اذان مکمل کر لینے کے بعد اسے نماز فجر سے پہلے دو اور نماز ظہر سے پہلے چار رکعتیں پڑھنی چاہییں۔ اور اگر اذان ان کے علاوہ کسی اور نماز کی ہو تو پھر بھی اس کے لیے نوافل پڑھنا مسنون ہے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«بَيْنَ كُلِّ أَذَانَيْنِ صَلَاةٌ»(صحيح البخاري، الأذان، باب بين كل أذانين صلاة ... ح:٦٢٧)

"ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے۔"

سنن مؤکدہ کی قضا اور فرض نماز کے بعد جگہ بدلنے کا حکم

سوال جب وقت ختم ہو جائے تو تب بھی سنن مؤکدہ کی قضا ادا کی جائے گی؟

جواب ہاں' اگر بھول جانے یا سو جانے کی صورت میں سنن مؤکدہ نہ پڑھی جا سکی ہوں تو ان کی قضا ادا کی جائے گی کیونکہ نبی اکرم ﷺ کے حسب ذیل ارشاد گرامی کا یہی تقاضا ہے:

«مَنْ نَسِيَ صَلَاةً أَوْ نَامَ عَنْهَا فَكَفَّارَتُهَا أَنْ يُصَلِّيَهَا إِذَا ذَكَرَهَا»(صحيح البخاري، مواقيت

الصلاة، باب من نسي صلاة فليصل إذا ذكر ... ح: ٥٩٧ وصحيح مسلم، المساجد، باب قضاء الصلاة ... ح: ٦٨٤(٣١٥) واللفظ له)

’’جو شخص کسی نماز کو بھول جائے یا نماز کے وقت سویا رہے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے جب یاد آئے' اسی وقت پڑھ لے۔‘‘

اور حدیث حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک بار مشغولیت کی وجہ سے ظہر کے بعد والی سنتیں ادا نہیں فرما سکے تھے تو آپ نے نماز عصر کے بعد ان کی قضا دی تھی۔ ①

اگر کوئی شخص ان کو جان بوجھ کر ترک کر دے حتی کہ ان کا وقت ختم ہو جائے تو وہ قضا نہ دے کیونکہ سنن مؤکدہ ایسی عبادات ہیں جن کے اوقات متعین ہیں اور وہ عبادات جن کے اوقات متعین ہیں' اگر ان کے اوقات کو جان بوجھ کر ضائع کر دیا جائے تو وہ قبول نہیں ہوتیں۔

سوال کیا اس بات کی کوئی دلیل موجود ہے کہ فرض نماز ادا کرنے کے بعد سنتیں ادا کرنے کے لیے جگہ بدل لی جائے؟

جواب ہاں حدیث حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میں ہے' انھوں نے کہا:

«فَإِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَمَرَنَا بِذَلِكَ أَنْ لاَ نُوصِلَ صَلاَةً بِصَلاَةٍ حَتَّى نَتَكَلَّمَ، أَوْ نَخْرُجَ»

(صحيح مسلم، الجمعة، باب الصلاة بعد الجمعة، ح: ٨٨٣)

’’بے شک رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم ایک نماز کو دوسری نماز کے ساتھ اس وقت تک نہ ملائیں جب تک کہ بات نہ کر لیں یا دوسری جگہ منتقل نہ ہو جائیں۔‘‘

اہل علم نے اس حدیث سے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ فرض اور سنتوں میں کلام یا نقل مکانی کی صورت میں فاصلہ ہونا چاہیے۔

سوال جب چاشت کا وقت ختم ہو جائے تو کیا اس کی قضا ادا کی جائے گی یا نہیں؟

جواب چاشت کی نماز اگرچہ وقت کے ساتھ مقید ہے لیکن سنن مؤکدہ فرض نمازوں کے تابع ہیں' لہٰذا ان کی اور اسی طرح وتر کی بھی قضا ادا کی جائے گی کیونکہ سنت سے ثابت ہے:

«وَكَانَ إِذَا غَلَبَهُ نَوْمٌ أَوْ وَجَعٌ عَنْ قِيَامِ اللَّيْلِ صَلَّى مِنَ النَّهَارِ ثِنْتَى عَشْرَةَ رَكْعَةً»(صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب جامع صلاة الليل ... ح: ٧٤٦)

’’اور جب نبی ﷺ غلبۂ نیند یا کسی تکلیف کی وجہ سے رات کو قیام نہ کر سکتے تو آپ دن کو بارہ رکعات ادا فرما لیتے تھے۔‘‘

اسی طرح وتر کی بھی قضا دینا ضروری ہے۔

کیا سجدہ تلاوت کے لیے طہارت شرط ہے؟

سوال کیا سجدہ تلاوت کے لیے طہارت شرط ہے؟ سجدہ تلاوت کی صحیح دعا کیا ہے؟

جواب سجدہ تلاوت سے مراد وہ سجدہ ہے جو انسان آیت سجدہ کی تلاوت کے وقت کرتا ہے اور قرآن مجید میں سجدہ کی آیات معروف ہیں۔ جب کوئی انسان سجدہ تلاوت کرنا چاہے تو وہ اللہ اکبر کہہ کر سجدہ میں چلا جائے اور درج ذیل ادعیہ میں سے کوئی دعا پڑھے:

---

① صحيح البخاري' السهو' باب إذا كُلِّم وهو يصلي فاشار بيده واستمع:1233

«سُبْحَانَ رَبِّيَ الأَعْلٰى»(سنن أبي داود، الصلاة، باب ما يقول الرجل في ركوعه وسجوده، ح:٨٧١)

"پاک ہے میرا رب جو سب سے بلند و برتر ہے۔"

«سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي»(صحيح البخاري، الأذان، باب الدعاء في الركوع، ح:٧٩٤)

"اے اللہ! اے ہمارے پروردگار ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اور تیری ہی تعریف ہے' اے اللہ! تو مجھے معاف فرمادے۔"

«اَللّٰهُمَّ لَكَ سَجَدْتُ، وَبِكَ آمَنْتُ، وَلَكَ أَسْلَمْتُ، سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِي خَلَقَهُ وَصَوَّرَهُ، وَشَقَّ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ تَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ»(صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة النبي ﷺ ودعائه بالليل، ح:٧٧١)

"اے اللہ! میں نے تیرے لیے سجدہ کیا اور تیرے ساتھ ایمان لایا اور میں تیرا فرماں بردار ہوں۔ میرا چہرہ اس ذات پاک کے آگے سجدہ ریز ہوا جس نے اسے پیدا فرمایا اور اس کے کان اور آنکھیں بنائے بڑا بابرکت ہے اللہ جو بہترین خالق ہے۔"

«اَللّٰهُمَّ اكْتُبْ لِي بِهَا عِنْدَكَ أَجْرًا، وَضَعْ عَنِّي بِهَا وِزْرًا، وَاجْعَلْهَا لِي عِنْدَكَ ذُخْرًا، وَتَقَبَّلْهَا مِنِّي كَمَا تَقَبَّلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاوُدَ»(جامع الترمذي، الجمعة، باب ماجاء ما يقول في سجود القرآن، ح:٥٧٩)

"اے اللہ! میرے اس سجدے کی وجہ سے اپنے ہاں اجر و ثواب لکھ لے اور اس کی وجہ سے مجھ سے (میرے گناہوں کا) بوجھ اتار دے اور اسے میرے لیے اپنے ہاں ذخیرہ بنادے اور اس سجدے کو میری طرف سے اس طرح قبول فرما جس طرح تو نے اپنے بندے داود علیہ السلام کے سجدے کو شرف قبولیت سے نوازا تھا۔"

پھر سجدے سے سر اٹھائے' تکبیر اور سلام کی ضرورت نہیں۔ اگر امام نماز پڑھاتے ہوئے آیت سجدہ کی تلاوت کرے تو اس کے لیے واجب ہے کہ سجدہ کو جاتے اور سجدہ سے سر اٹھاتے وقت اللہ اکبر کہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ کی نماز کی کیفیت کو بیان کرنے والوں نے ذکر کیا ہے کہ آپ جب بھی سر جھکاتے اور اٹھاتے تو اللہ اکبر کہا کرتے تھے۔① نماز کے سجدہ اور سجدہ تلاوت سب کی کیفیت اسی طرح ہوتی تھی۔

بعض لوگ نماز میں سجدہ کو جاتے وقت تو تکبیر کہتے ہیں مگر سجدہ سے اٹھتے وقت تکبیر نہیں کہتے' لیکن سنت یا اہل علم کے اقوال سے مجھے اس کی کوئی دلیل معلوم نہیں ہے۔

سائل نے جو یہ کہا ہے کہ کیا سجدۂ تلاوت کے لیے طہارت شرط ہے تو اس کے بارے میں اہل علم میں اختلاف ہے۔ بعض نے طہارت کو ضروری قرار دیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ شرط نہیں ہے جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بغیر طہارت کے سجدہ تلاوت کرلیا کرتے تھے لیکن میری رائے میں زیادہ احتیاط اسی میں ہے کہ سجدہ باوضو کیا جائے۔

---

① صحیح البخاری' الأذان' باب التکبیر فی الرکوع، حدیث:785

سجدۂ شکر کب کریں اور اس کی کیفیت کیا ہونی چاہیے؟

سوال اللہ تعالیٰ کے لیے سجدۂ شکر کب کیا جائے؟ اس کی کیفیت کیا ہوگی؟ کیا اس کے لیے وضو شرط ہے؟

جواب سجدۂ شکر اس وقت ہوتا ہے جب کوئی مصیبت دور ہو جائے یا انسان کو کوئی نعمت حاصل ہو۔ یہ سجدہ اسی طرح ہے جس طرح نماز سے باہر کا سجدہ تلاوت ہوتا ہے۔ بعض علماء کی رائے ہے کہ سجدہ شکر بھی باوضو ہونا چاہیے اور اس کے لیے بھی اللہ اکبر کہا جائے۔ بعض کی رائے ہے کہ صرف سجدہ کو جاتے وقت اللہ اکبر کہا جائے، پھر سجدہ میں گر جائے اور "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى" پڑھنے کے بعد دعا کرے۔

کیا تحیۃ المسجد یا سنتوں میں بھی دعائے استخارہ پڑھی جا سکتی ہے؟

سوال نماز استخارہ کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا تحیۃ المسجد یا سنتوں میں بھی دعائے استخارہ پڑھی جا سکتی ہے؟

جواب استخارہ سنت اس وقت ہے جب کوئی انسان کسی کام کا ارادہ کرے اور اس کے لیے یہ واضح نہ ہو کہ اس کام کا کرنا اس کے لیے بہتر ہے یا نہ کرنا۔ اور جب یہ بات بالکل واضح ہو کہ اس کام کا کرنا بہتر ہے یا نہ کرنا بہتر ہے تو پھر استخارہ کی ضرورت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ بہت سے کام سر انجام دیتے اور انہیں باضابطہ پروگرام کے مطابق انجام دیتے تھے لیکن یہ ثابت نہیں کہ آپ ان کے لیے استخارہ فرماتے ہوں، مثلاً: اگر انسان نماز یا زکوٰۃ ادا کرنے کا ارادہ کرے یا حرام امور کو ترک کرنے کا ارادہ کرے یا کھانے پینے اور سونے کا ارادہ کرے تو اس طرح کے تمام امور کے لیے استخارہ کی ضرورت نہیں ہے۔

تحیۃ المسجد میں دعائے استخارہ نہیں پڑھی جا سکتی۔ اسی طرح پہلے سے نیت کیے بغیر سنت رواتبہ میں بھی دعائے استخارہ نہیں پڑھی جا سکتی کیونکہ حدیث میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ استخارہ کی نیت سے دو رکعت نماز پڑھی جائے اور اگر نیت کے بغیر دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں تو اس سے فرمان نبوی کی تعمیل نہیں ہوگی۔ اگر کوئی شخص تحیۃ المسجد یا سنن مؤکدہ کے ادا کرنے سے پہلے استخارہ کی نیت کر لے اور پھر دعائے استخارہ پڑھ لے تو حدیث کے ان ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ استخارہ صحیح ہوگا۔ ارشاد نبوی ہے:

«فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ مِنْ غَيْرِ الْفَرِيضَةِ»(صحيح البخاري، الدعوات، باب الدعاء عند الاستخارة، ح: ٦٣٨٢، التهجد، باب ماجاء في التطوع مثنى مثنى، ح: ١١٦٢)

"وہ فرض نماز کے علاوہ دو رکعتیں پڑھے۔"

اس میں فرض کے سوا آپ ﷺ نے اور کسی نماز کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس طرح استخارہ صحیح نہ ہو کیونکہ حدیث کے الفاظ "جب ارادہ کرے تو (دو رکعت) نماز پڑھے" سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دو رکعتوں کا استخارہ کے سوا اور کوئی سبب نہیں، لہٰذا میرے نزدیک افضل یہی ہے کہ استخارہ کے لیے دو مستقل رکعتیں پڑھی جائیں کیونکہ یہ احتمال بھی ہے جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ اور فرض نماز کے بطور خاص استثنا سے یہ مراد ہو سکتی ہے کہ وہ نفل نماز پڑھے گویا آپ نے فرمایا ہی یہ ہے کہ وہ دو رکعت نفل نماز پڑھے۔ واللہ اعلم.

کیا تسبیح نماز پڑھنا ثابت ہے؟

سوال نماز تسبیح کیا ہے؟

جواب نماز تسبیح نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ اس سے متعلق حدیث کے بارے میں امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحیح نہیں ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت جھوٹی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے نماز تسبیح کو مکروہ قرار دیا ہے، جب کہ کسی بھی امام نے اسے مستحب قرار نہیں دیا، امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ نے تو اس نماز کے بارے میں بالکل کچھ سنا ہی نہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے، وہ بالکل حق ہے۔ اگر یہ نماز صحیح اور نبی ﷺ سے ثابت ہوتی، تو امت تک ایسے طریق سے پہنچتی جس میں کوئی شک نہ ہوتا، حالانکہ یہ جنس نماز بلکہ جنس عبادات ہی سے خارج ہے کیونکہ کسی بھی عبادت میں یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ اسے روزانہ کرو یا ہفتہ میں ایک بار کرو یا مہینے میں ایک بار یا سال میں ایک بار یا عمر میں ایک بار کرو کیونکہ جو نماز دیگر نمازوں سے مختلف ہوتی ہے لوگ اسے بہت اہتمام کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور اسے انوکھی عبادت ہونے کی وجہ سے بہت مشہور ہونا چاہیے تھا لیکن اس نماز کا معاملہ ایسا نہیں ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ اس کے بارے میں کوئی حکم شریعت نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ائمہ کرام میں سے کسی ایک امام نے بھی اسے مستحب قرار نہیں دیا۔ ①

سہاگ رات دو رکعت نماز پڑھنے کا حکم

سوال سہاگ رات بیوی کے پاس جاتے وقت دو رکعت نماز پڑھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سہاگ رات بیوی کے پاس جاتے وقت دو رکعتیں پڑھی ہیں ② لیکن اس بارے میں مجھے رسول اللہ ﷺ سے کوئی صحیح سنت معلوم نہیں ہے، البتہ یہ مشروع ہے کہ بیوی کی پیشانی پکڑ کر یہ دعا پڑھے:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ خَيْرَهَا وَخَيْرَ مَا جَبَلْتَهَا عَلَيْهِ وَأَعُوذُبِكَ مِنْ شَرِّهَا وَمِنْ شَرِّ مَا جَبَلْتَهَا عَلَيْهِ» (سنن أبي داود، النكاح، باب في جامع النكاح، ح: ٢١٦٠)

”اے اللہ میں اس کی خیر اور بھلائی اور جس پر تو نے اسے پیدا فرمایا ہے، اس کی خیر و بھلائی کا تجھ سے سوال کرتا ہوں اور اس کی برائی اور جس چیز پر تو نے اسے پیدا فرمایا ہے، اس کی برائی سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔“

اور اگر اسے یہ خدشہ ہو کہ اس حال میں عورت اس سے نفرت کرے گی تو اس کی پیشانی کو پکڑ لے گویا وہ اس سے قریب ہونا چاہتا ہے اور مذکورہ دعا آہستہ سے پڑھ لے کہ اسے سنائی نہ دے کیونکہ جب وہ یہ کہے کہ میں اس کے شر اور جس پر اسے پیدا کیا گیا ہے،

---

① فاضل مفتی رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ کسی بھی امام نے اسے مستحب قرار نہیں دیا ہے، صحیح نہیں ہے۔ محدثین کا ایک گروہ کثرت طرق کی وجہ سے نمازِ تسبیح کی حدیث کی اصلیت کا اور اس کی بنیاد پر اس کے استحباب کا قائل ہے۔

② ”المصنف“ لعبدالرزاق: 191/6

اس کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں' تو یہ سن کر بعض عورتوں کو یہ خیال آسکتا ہے کہ کیا مجھ میں شر ہے؟

ممنوع اوقات جن میں نماز پڑھنا جائز نہیں

سوال وہ کون سے اوقات ہیں جن میں نماز پڑھنی ممنوع ہے؟ نماز مغرب کے وقت تحیۃ المسجد اذان سے پہلے پڑھی جائے یا بعد میں؟ فتویٰ عطا فرمائیں۔ جزاكم الله خيراً۔

جواب ممنوع اوقات حسب ذیل ہیں: ① نماز فجر کے بعد سے لے کر سورج کے ایک نیزے کے بقدر بلند ہونے تک یعنی طلوع آفتاب کے پندرہ بیس منٹ بعد تک۔ ② زوال سے قریباً دس منٹ پہلے یعنی ظہر کا وقت شروع ہونے سے دس منٹ پہلے کا وقت۔ ③ نماز عصر کے بعد سے لے کر سورج کے مکمل غروب ہونے تک' یہ تمام ممنوع اوقات ہیں۔ تحیۃ المسجد کو ہر وقت ادا کیا جا سکتا ہے۔ آپ جب بھی مسجد میں داخل ہوں تو دو رکعت پڑھے بغیر نہ بیٹھیں' خواہ ممنوع وقت ہی کیوں نہ ہو۔ معلوم ہونا چاہیے کہ اہل علم کے اقوال میں سے راجح قول یہ ہے کہ وہ تمام نوافل جن کے اسباب ہوں' انھیں ممنوع اوقات میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے مثلاً: اگر آپ نماز فجر کے بعد مسجد میں جائیں تو تحیۃ المسجد پڑھ سکتے ہیں' اسی طرح نماز عصر کے بعد تحیۃ المسجد پڑھ سکتے ہیں' زوال سے پہلے بھی دو رکعتیں پڑھ سکتے ہیں الغرض آپ دن یا رات کو جس وقت بھی مسجد میں داخل ہوں تو دو رکعت پڑھے بغیر نہ بیٹھیں۔

نماز باجماعت کے احکام

سوال نماز باجماعت کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نماز باجماعت' اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی اطاعت ہے' جو بہت عظیم الشان ہے' جس کی بے حد تاکید آئی ہے اور جو نہایت افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ذکر کرتے ہوئے حالت خوف میں بھی اس کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ ٱلصَّلَوٰةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوٓاْ أَسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُواْ فَلْيَكُونُواْ مِن وَرَآئِكُمْ وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّواْ فَلْيُصَلُّواْ مَعَكَ وَلْيَأْخُذُواْ حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَٰحِدَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّن مَّطَرٍ أَوْ كُنتُم مَّرْضَىٰٓ أَن تَضَعُوٓاْ أَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُواْ حِذْرَكُمْ إِنَّ ٱللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَٰفِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿١٠٢﴾ ﴾ (النساء: ٤/ ١٠٢)

''اور (اے پیغمبر) جب تم ان (مجاہدین کے لشکر) میں ہو اور ان کو نماز پڑھانے لگو تو چاہیے کہ ان کی ایک جماعت تمھارے ساتھ مسلح ہو کر کھڑی رہے۔ جب وہ سجدہ کر چکیں تو پرے ہو جائیں' پھر دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی (ان کی جگہ) آئے اور ہوشیار اور مسلح ہو کر تمھارے ساتھ نماز ادا کر لے۔ کافر اس گھات میں ہیں کہ تم ذرا اپنے ہتھیاروں اور سامان سے غافل ہو جاؤ کہ تم پر یکبارگی حملہ کر دیں۔ اگر تم بارش کے سبب تکلیف میں ہو یا بیمار ہو تو تم پر کچھ گناہ نہیں کہ ہتھیار اتار رکھو مگر ہوشیار ضرور رہنا' بلاشبہ اللہ نے کافروں کے لیے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کی بہت سی احادیث مبارکہ سے بھی ثابت ہے کہ نماز باجماعت ادا کرنا واجب ہے‘ مثلاً آپ نے فرمایا:

«وَلَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ آمُرَ بِالصَّلَاةِ فَتُقَامَ، ثُمَّ آمُرَ رَجُلًا فَيُصَلِّيَ بِالنَّاسِ، ثُمَّ أَنْطَلِقَ مَعِي بِرِجَالٍ مَعَهُمْ حُزَمٌ مِنْ حَطَبٍ إِلٰى قَوْمٍ لَا يَشْهَدُونَ الصَّلَاةَ فَأُحَرِّقَ عَلَيْهِمْ بُيُوتَهُمْ بِالنَّارِ» (صحيح البخاري، الأذان، باب وجوب صلاة الجماعة، ح:٦٤٤ وصحيح مسلم، المساجد، باب فضل صلاة الجماعة ... ح:٦٥١(٢٥٢) واللفظ له)

’’میرا ارادہ ہے کہ میں نماز کا حکم دوں اور اقامت کہہ دی جائے‘ پھر میں کسی شخص کو حکم دے دوں کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے اور پھر میں کچھ ایسے آدمیوں کو لے کر جن کے پاس ایندھن کا گٹھا ہو‘ ایسے لوگوں کے پاس چلا جاؤں جو نماز میں حاضر نہیں ہوتے اور ان کے گھروں کو آگ سے جلا ڈالوں۔‘‘

اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ فَلَمْ يَأْتِهِ فَلَا صَلَاةَ لَهُ إِلَّا مِنْ عُذْرٍ»(سنن ابن ماجه، المساجد، باب التغليظ في التخلف عن الجماعة، ح:٧٩٣)

’’جو شخص اذان سنے اور مسجد میں نہ آئے تو اس کی نماز نہیں ہوتی الا یہ کہ کوئی عذر ہو۔‘‘

اسی طرح آپ ﷺ نے اس نابینا شخص سے فرمایا تھا: جس نے آپ سے گھر میں نماز ادا کرنے کے لیے رخصت طلب کی تھی:

«هَلْ تَسْمَعُ النِّدَاءَ بِالصَّلَاةِ؟»

’’کیا تم نماز کے لیے اذان کی آواز سنتے ہو؟‘‘

اس نے عرض کیا: جی ہاں‘ تو آپ نے فرمایا:

«فَأَجِبْ»(صحيح مسلم، المساجد، باب يجب إتيان المسجد على من سمع النداء، ح:٦٥٣)

’’پس تم جواب دو۔‘‘

یعنی نماز باجماعت ادا کرو۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«لَقَدْ رَأَيْتُنَا وَمَا يَتَخَلَّفُ عَنِ الصَّلَاةِ إِلَّا مُنَافِقٌ قَدْ عُلِمَ نِفَاقُهُ، أَوْ مَرِيضٌ - وفي رواية - وَلَقَدْ كَانَ الرَّجُلُ يُؤْتٰى بِهِ يُهَادٰى بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ حَتّٰى يُقَامَ فِي الصَّفِّ»(صحيح مسلم، المساجد، باب صلاة الجماعة من سنن الهدي، ح:٦٥٤(٢٥٦، ٢٥٧)

’’میں نے (حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ باجماعت نماز ادا کرتے) دیکھا‘ نماز باجماعت ادا کرنے سے صرف وہی شخص پیچھے رہتا تھا جو معلوم منافق یا مریض ہوتا‘‘ اور ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں: ’’مریض آدمی کو دو آدمیوں کے درمیان گھسیٹ کر لایا جاتا اور صف میں کھڑا کر دیا جاتا۔‘‘

عقل کا بھی تقاضا ہے کہ نماز باجماعت واجب ہو کیونکہ امت اسلامیہ ایک ہی امت ہے اور کمال وحدت کے لیے ضروری ہے کہ یہ اپنی عبادت اجتماعی طور پر ادا کرے اور سب سے عظیم الشان‘ سب سے افضل اور سب سے زیادہ اہم عبادت نماز ہے‘ لہٰذا امت

اسلامیہ کے لیے واجب ہے کہ وہ نماز باجماعت ادا کرے۔ اس بات پر تو علماء کا اتفاق ہے کہ نماز سب سے اہم اور عظیم الشان عبادت ہے لیکن اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ کیا اسے باجماعت ادا کرنا صحت نماز کے لیے شرط ہے؟ یا اس کے بغیر بھی نماز ہو جاتی ہے' البتہ جماعت کے بغیر ادا کرنے والا گناہ گار ہوگا؟ اس طرح اس مسئلہ میں کچھ اور اختلافات بھی ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ نماز باجماعت ادا کرنا واجب تو ہے مگر یہ صحت نماز کے لیے شرط نہیں ہے البتہ تارک جماعت گناہ گار ضرور ہوگا الا یہ کہ اس کے پاس کوئی شرعی عذر ہو۔ جماعت کے صحت نماز کے لیے شرط نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ نے نماز باجماعت کو انفرادی نماز سے افضل قرار دیا ہے' اور نماز باجماعت کو افضل قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ انفرادی طور پر نماز ادا کرنا بھی صحیح ہے۔ بہر حال ہر عاقل اور بالغ مرد مسلمان پر واجب ہے کہ سفر میں ہو یا حضر میں نماز باجماعت کا اہتمام کرے۔

سوال کچھ لوگ ایک مکان میں رہتے ہیں' کیا ان کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اسی مکان میں نماز باجماعت ادا کر لیں یا ان کے لیے مسجد میں نماز ادا کرنا لازم ہے؟

جواب ان لوگوں کے لیے جو ایک مکان میں رہتے ہیں' واجب ہے کہ وہ مسجد میں نماز ادا کریں۔ ہر وہ شخص جس کے قرب و جوار میں مسجد موجود ہو' اس کے لیے واجب ہے کہ وہ مسجد میں نماز ادا کرے۔ جب مسجد قریب ہو تو پھر کسی کے لیے' خواہ وہ ایک ہو یا زیادہ لوگ ہوں گھر میں نماز ادا کرنا جائز نہیں ہے اور اگر مسجد دور ہو اور وہ اذان کی آواز نہ سنتے ہوں تو پھر گھر میں باجماعت نماز ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس مسئلہ میں بعض لوگوں کی سستی بعض علماء کے اس قول پر مبنی ہے کہ نماز باجماعت سے مقصود یہ ہے کہ لوگ اجتماعی طور پر نماز ادا کریں خواہ وہ مسجد کے علاوہ کسی اور جگہ پر ہی کیوں نہ ہو' لہٰذا جب لوگ گھروں میں باجماعت نماز ادا کریں تو انھوں نے اپنے واجب کو ادا کر دیا۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ ضروری ہے کہ نماز باجماعت کا اہتمام مسجدوں میں ہو کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ آمُرَ بِالصَّلَاةِ فَتُقَامَ، ثُمَّ آمُرَ رَجُلًا فَيُصَلِّيَ بِالنَّاسِ، ثُمَّ أَنْطَلِقَ مَعِي بِرِجَالٍ مَعَهُمْ حُزَمٌ مِنْ حَطَبٍ إِلٰى قَوْمٍ لَا يَشْهَدُونَ الصَّلَاةَ فَأُحَرِّقَ عَلَيْهِمْ بُيُوتَهُمْ بِالنَّارِ»
(صحيح البخاري، الأذان، باب وجوب صلاة الجماعة، ح:٦٤٤ وصحيح مسلم، المساجد، باب فضل صلاة الجماعة، ح:٦٥١(٢٥٢) واللفظ له)

''میرا ارادہ ہے کہ میں نماز کے بارے میں حکم دوں اور اقامت کہہ دی جائے' پھر میں کسی شخص کو حکم دوں کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے اور میں کچھ ایسے لوگوں کو جن کے پاس ایندھن کا گٹھا ہو' لے کر ایسے لوگوں کے پاس جاؤں جو نماز کے لیے نہیں آئے اور ان کے گھروں کو آگ سے جلا دوں۔''

حالانکہ ممکن ہے ان لوگوں نے اپنی اپنی جگہ نماز ادا کر لی ہو' لہٰذا ان لوگوں کے لیے واجب ہے کہ وہ مسجد میں نماز باجماعت ادا کریں الا یہ کہ مسجد بہت دور ہو اور وہاں جانا مشکل ہو۔

ملازم حقوق اللہ اور حقوق العباد کو کیسے نبھائے؟

سوال کیا ملازم کے حق میں افضل یہ ہے کہ وہ اذان سنتے ہی فوراً مسجد میں چلا جائے یا اپنے بعض معاملات نپٹانے کے لیے انتظار

کرے؟ نماز کے بعد سنن مؤکدہ کے علاوہ دیگر نوافل پڑھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب تمام مسلمانوں کیلئے واجب ہے کہ وہ اذان سنتے ہی فوراً نماز کیلئے مسجد میں آ جائیں کیونکہ مؤذن کہتا ہے: [حيّ علی الصلاہ] ''نماز کی طرف آؤ۔'' اور اس میں سستی کرنے سے نماز کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ ملازم کیلئے فرض نماز کے بعد سنن مؤکدہ کے علاوہ نوافل پڑھنا جائز نہیں ہے کیونکہ عقد اجارہ یا ملازمت کی وجہ سے اس کے وقت کا مستحق دوسرا انسان ہے' البتہ سنن مؤکدہ ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ عرف و عادت کے مطابق ذمہ دار اصحاب اس بارے میں چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔ واللہ الموفق.

کیا پہلی ایک یا دو رکعتیں جماعت سے رہ جانے پر فاتحہ کے ساتھ اور سورت بھی ملائی جائے؟

سوال جس شخص کی پہلی ایک رکعت یا دو رکعتیں جماعت سے رہ جائیں تو کیا وہ اسے پورا کرتے ہوئے فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورت بھی پڑھے یا صرف سورۃ الفاتحہ پر اکتفا کرے؟

جواب صحیح بات یہ ہے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد مقتدی جس نماز کو پڑھتا ہے وہ اس کی نماز کا آخری حصہ ہے' لہٰذا جب اس کی چار رکعتوں والی نماز میں سے دو رکعتیں یا ایک رکعت رہ گئی ہو یا نماز مغرب کی ایک رکعت رہ گئی ہو تو ان صورتوں میں اسے صرف سورۂ فاتحہ ہی پڑھنی چاہیے' البتہ نماز فجر کی اگر کوئی ایک رکعت رہ گئی ہو تو اس میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی دوسری سورت بھی پڑھنی چاہیے کیونکہ نماز فجر کی دونوں رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورہ بھی پڑھی جاتی ہے۔

جب امام آخری تشہد میں ہو اور دوسری جماعت کی امید ہو تو انتظار جائز ہے

سوال ایک نمازی مسجد میں اس وقت داخل ہوا جب امام آخری تشہد میں تھا' کیا وہ جماعت میں شامل ہو جائے یا دوسری جماعت کا انتظار کرے؟ فتویٰ عطا فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیراً.

جواب جب انسان مسجد میں اس وقت داخل ہو جب امام آخری تشہد میں ہو تو اگر اسے دوسری جماعت کی امید ہو تو پھر اس کے ساتھ شامل نہ ہو اور اگر دوسری جماعت کی امید نہ ہو تو پھر اسی کے ساتھ شامل ہو جائے کیونکہ راجح قول کے مطابق نماز با جماعت کے لیے کم از کم ایک رکعت کا پالینا ضروری ہے جیسا کہ نبی ﷺ کے حسب ذیل فرمان کے عموم سے معلوم ہوتا ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الصَّلاَةِ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلاَةَ»(صحيح البخاري، مواقيت الصلاة، باب من أدرك من الصلاة ركعة، ح: ٥٨٠ وصحيح مسلم، المساجد، باب من أدرك ركعة من الصلاة فقد أدرك تلك الصلاة، ح: ٦٠٧)

''جس نے نماز کی ایک رکعت پالی' اس نے نماز کو پالیا۔''

جس طرح ایک رکعت کو پائے بغیر جمعہ کو نہیں پایا جا سکتا' اسی طرح ایک رکعت کے بغیر جماعت کو بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی امام کو آخری تشہد میں پائے تو اس نے جماعت کو نہیں پایا' لہٰذا اسے انتظار کرنا چاہیے تاکہ وہ دوسری متوقع جماعت کے ساتھ نماز ادا کر سکے اور اگر اسے دوسری جماعت کی امید نہ ہو تو اس کا جماعت کے ساتھ شامل ہو جانا تاکہ باقی تشہد کو پالے' امام سے الگ

ہو جانے سے بہتر ہے۔

کیا فرض نماز کی اقامت کے بعد نوافل جائز ہیں؟

سوال جب نمازی نے نفل نماز شروع کر رکھی ہو اور فرض نماز کی اقامت ہو جائے تو کیا کیا جائے؟

جواب جب فرض نماز کی اقامت ہو جائے اور آپ نے نفل نماز شروع کر رکھی ہو تو بعض اہل علم کا قول ہے کہ آپ پر واجب ہے کہ آپ فوراً نماز کو توڑ دیں' خواہ آخری تشہد ہی میں کیوں نہ ہوں۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ آپ نماز نہ توڑیں الا یہ کہ یہ اندیشہ ہو کہ امام آپ کے تکبیر تحریمہ کہنے سے پہلے سلام پھیر دے گا۔ یہ دونوں قول متعارض ہیں' یعنی ایک قول یہ ہے کہ جب اقامت ہو جائے تو آپ نفل نماز فوراً توڑ دیں اور دوسرا قول یہ ہے کہ نماز کو جاری رکھیں اور اسے نہ توڑیں الا یہ کہ خدشہ ہو کہ آپ کے تکبیر تحریمہ کہنے سے پہلے امام سلام پھیر دے گا۔ میرے نزدیک اس سلسلہ میں معتدل قول یہ ہے کہ جب اقامت ہو جائے اور آپ دوسری رکعت میں ہوں تو اس رکعت کو خفیف سے انداز میں مکمل کریں اور اگر آپ ابھی پہلی رکعت میں ہوں' تو نماز توڑ دیں کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الصَّلاَةِ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلاَةَ»(صحيح البخاري، مواقيت الصلاة، باب من أدرك من الصلاة ركعة، ح:٥٨٠ وصحيح مسلم، المساجد، باب من أدرك ركعة من الصلاة فقد أدرك تلك الصلاة، ح:٦٠٧)

''جس نے نماز کی ایک رکعت پالی' اس نے نماز کو پالیا۔''

اور اگر آپ نے اقامت سے پہلے ایک رکعت پڑھ لی ہے تو آپ نے اسے ممانعت سے قبل پڑھا ہے' لہٰذا آپ نے نماز کو پالیا اور ساری نماز غیر ممنوع ہوگئی یعنی ممانعت کی ذیل میں نہیں آتی' لہٰذا آپ اسے مکمل کریں لیکن خفیف طور پر کیونکہ فرض نماز کے ایک جز کو پالینا نفل کے ایک جز کے پالینے سے بہتر ہے ① اور اگر آپ پہلی رکعت میں ہوں تو آپ نے اتنا وقت نہیں پایا' جس میں آپ نماز کو پالیتے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الصَّلاَةِ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلاَةَ»(صحيح البخاري، مواقيت الصلاة، باب من أدرك من الصلاة ركعة، ح:٥٨٠ وصحيح مسلم، المساجد، باب من أدرك ركعة من الصلاة فقد أدرك الصلاة، ح:٦٠٧)

''جس نے نماز کی ایک رکعت پالی' اس نے نماز با جماعت کو پالیا۔''

---

① جب یہ تسلیم ہے کہ فرض نماز کا ایک جز' نفل کے ایک جز سے بہتر ہے' تو پھر یہ کہنا کیوں کر صحیح ہوگا کہ ایک رکعت مکمل پڑھ لینے کی صورت میں اپنی نفل نماز اقامت کے بعد بھی پوری کرے؟ بلکہ اس اصول کا تقاضا تو یہ ہے کہ اقامت ہو جانے کے بعد فرض نماز ہی کو سب سے زیادہ اہمیت دی جائے اور اگر نفلی نماز پوری کرنے کی صورت میں جماعت کی ایک رکعت بھی فوت ہونے کا اندیشہ ہو' تو اس کے لیے نفلی نماز کا جاری رکھنا جائز نہیں ہوگا' بلکہ اس کو توڑ کر جماعت میں شامل ہونا ضروری ہوگا۔ البتہ آخری تشہد یا سجدے میں اقامت ہو جائے' تو پھر جماعت کے فوت ہونے کا اندیشہ نہیں ہوتا' اس لیے اس صورت میں زیادہ سے زیادہ اس کے لیے نفلی نماز پوری کرنے کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ واللہ اعلم. (ص ی)

لٰہذا آپ اپنی نماز کو توڑ دیں گے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلاَةُ فَلاَ صَلاَةَ إِلاَّ الْمَكْتُوبَةُ»(صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب كراهة الشروع في نافلة بعد شروع المؤذن . . . ح: ٧١٠)

’’جب فرض نماز کے لیے اقامت کہہ دی جائے تو پھر فرض نماز کے سوا اور کوئی نماز نہیں ہوتی۔‘‘

امام اگر مقتدی کے فاتحہ مکمل کرنے سے پہلے رکوع میں چلا جائے تو مقتدی کو کیا کرنا چاہیے؟

سوال ایک مقتدی نماز میں اس وقت شامل ہوا جب امام تکبیر تحریمہ اور سورۂ فاتحہ سے فارغ ہو چکا تھا، اس نے سورۂ فاتحہ ابھی شروع ہی کی تھی کہ امام رکوع میں چلا گیا تو کیا یہ مقتدی امام کے ساتھ رکوع میں چلا جائے یا سورۂ فاتحہ کی قراءت مکمل کر لے؟

جواب جب مقتدی اس وقت جماعت میں شامل ہو جب امام رکوع کا ارادہ کر رہا ہو اور مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ پڑھنا ممکن نہ ہو، اس صورت میں اگر اس کی ایک دو آیتیں باقی ہوں کہ اس کے لیے انھیں پڑھ کر امام کے ساتھ رکوع میں شامل ہو جانا ممکن ہو تو یہ بہت بہتر ہے اور اگر سورت کا زیادہ حصہ باقی ہو کہ اسے پڑھنے کی صورت میں وہ امام کو رکوع میں نہیں پا سکے گا تو اس صورت میں وہ امام کے ساتھ رکوع کر لے، خواہ سورۂ فاتحہ مکمل نہ ہوئی ہو۔

مقتدی امام کو جس حالت میں پائے ساتھ شامل ہو جائے

سوال جب مقتدی امام کو سجدہ کی حالت میں پائے تو کیا وہ اس کے سجدہ سے اٹھنے کا انتظار کرے یا اسی حالت میں اس کے ساتھ شامل ہو جائے؟

جواب افضل یہ ہے کہ مقتدی امام کو جس حالت میں بھی پائے، اس کے ساتھ شامل ہو جائے اور انتظار نہ کرے کیونکہ نبی اکرم ﷺ کے حسب ذیل فرمان کے عموم کا یہی تقاضا ہے:

«فَمَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوا»(صحيح البخاري، الأذان، باب لا يسعى إلى الصلاة . . .، ح: ٦٣٦ وصحيح مسلم، المساجد، باب استحباب إتيان الصلاة بوقار . . . ح: ٦٠٢)

’’پس جتنا حصہ پالو اسے پڑھ لو۔‘‘

سری نمازوں میں فاتحہ کے بعد جتنی سورتیں چاہیں پڑھ لیں

سوال جب سری نماز میں نمازی سورۂ فاتحہ اور کسی دوسری سورت کے پڑھنے سے فارغ ہو جائے اور امام نے ابھی رکوع نہ کیا ہو تو کیا وہ خاموش رہے؟

جواب مقتدی جب سورۂ فاتحہ اور کسی دوسری سورت کے پڑھنے سے فارغ ہو گیا ہو تو وہ خاموش نہ رہے بلکہ امام کے رکوع میں جانے تک پڑھتا رہے، خواہ تشہد اول کے بعد والی دو رکعتیں ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ حالت نماز میں سکوت تو صرف اسی صورت میں ہے

جب مقتدی امام کی قراءت سن رہا ہو۔

امام سے سبقت کرنا حرام ہے

سوال امام سے سبقت کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب امام سے سبقت کرنا حرام ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

«أَمَا يَخْشَى أَحَدُكُمْ أَوْ لاَ يَخْشَى أَحَدُكُمْ إِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ قَبْلَ الإِمَامِ أَنْ يَجْعَلَ اللهُ رَأْسَهُ رَأْسَ حِمَارٍ أَوْ يَجْعَلَ اللهُ صُورَتَهُ صُورَةَ حِمَارٍ»(صحيح البخاري، الأذان، باب إثم من رفع رأسه قبل الإمام، ح: ٦٩١ وصحيح مسلم، الصلاة، باب تحريم سبق الإمام . . . ح: ٤٢٧)

’’کیا امام سے پہلے اپنا سر اٹھانے والا اس بات سے ڈرتا نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے سر کو گدھے کا سر بنا دے یا اللہ تعالیٰ اس کی صورت کو گدھے کی صورت بنا دے۔‘‘

امام سے سبقت کرنے والے کیلئے یہ سخت وعید ہے اور وعید کسی حرام فعل یا ترک واجب ہی پر ہوتی ہے۔ نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے:

«إِنَّمَا جُعِلَ الإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ، فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا، وَلاَ تُكَبِّرُوا حَتَّى يُكَبِّرَ، وَإِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوا، وَلاَ تَرْكَعُوا حَتَّى يَرْكَعَ»(صحيح البخاري، تقصير الصلاة، باب صلاة القاعد، ح: ١١١٤، وسنن أبي داود، الصلاة، باب الإمام يصلي من قعود، ح: ٦٠٣ واللفظ له)

’’امام کو اس لیے مقرر کیا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتدا کی جائے۔ جب وہ اللہ اکبر کہے تو تم بھی اللہ اکبر کہو اور جب تک وہ تکبیر نہ کہے تم بھی تکبیر نہ کہو اور جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو اور تم اس وقت تک رکوع نہ کرو جب تک وہ رکوع نہ کرے۔‘‘

اس مناسبت سے اس طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ مقتدی کی امام کے ساتھ درج ذیل چار حالتیں ہوسکتی ہیں:

- مسابقت: اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے امام سے پہلے کسی چیز کو شروع کر لے تو یہ حرام ہے اور اگر وہ امام سے پہلے تکبیر تحریمہ کہہ لے تو اس کی نماز بالکل نہیں ہوگی‘ اس کے لیے نماز کو از سر نو پڑھنا واجب ہوگا۔
- موافقت: اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ امام کے ساتھ ساتھ چلے‘ جب امام رکوع کرے تو رکوع کرے‘ جب امام سجدہ کرے تو یہ بھی سجدہ کرے اور جب امام سجدہ سے سر اٹھائے‘ تو عین اسی وقت یہ بھی سر اٹھائے‘ دلائل سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی حرام ہے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم رکوع نہ کرو جب تک وہ رکوع نہ کرے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ موافقت مکروہ ہے‘ حرام نہیں الا یہ کہ تکبیر تحریمہ میں ہو‘ تکبیر تحریمہ میں موافقت کی صورت میں نماز نہیں ہوگی‘ لہٰذا اسے دوبارہ پڑھنا واجب ہوگا۔
- متابعت: اس کے معنی یہ ہیں کہ تاخیر کے بغیر نماز کے تمام افعال کو امام کے بعد سر انجام دے‘ حکم شریعت بھی یہی ہے۔
- تخلف: اس کے معنی یہ ہیں کہ امام سے اس قدر پیچھے رہ جائے کہ اقتدا سے خارج ہو جائے‘ یہ خلاف شریعت ہے۔

کیا گناہ گار کے پیچھے اور فرض پڑھنے والے کی نفل ادا کرنے والے کے پیچھے نماز جائز ہے؟

سوال کیا گناہ گار کے پیچھے نماز ادا کرنا صحیح ہے؟

جواب راجح قول کے مطابق مسلمان کے پیچھے نماز جائز اور صحیح ہے، خواہ اس نے بعض معاصی کا ارتکاب کیا ہو، البتہ نیک شخص کی اقتدا میں نماز بلاشک افضل ہے اور اگر کوئی شخص ایسے کفریہ افعال کا ارتکاب کرتا ہے جو ملت اسلامیہ سے خارج کر دینے والے ہوں تو اس کے پیچھے نماز جائز نہ ہوگی کیونکہ ایسے شخص کی تو اپنی نماز صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ جو مسلمان نہیں، اس کی نماز صحیح نہیں اور جب امام کی نماز صحیح نہ ہو تو اس کی اقتدا بھی نہیں کی جا سکتی، کیونکہ اس صورت میں آپ کسی شخص کے امام نہ ہوتے ہوئے اس کی اقتدا کر رہے ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ آپ امام کے بغیر امامت کی نیت کر رہے ہیں۔

سوال کیا فرض ادا کرنے والے کی نفل پڑھنے والے کے پیچھے اور نفل ادا کرنے والے کی فرض پڑھنے والے کے پیچھے نماز جائز ہے؟

جواب یہ جائز ہے، جس طرح عصر پڑھنے والے کے پیچھے ظہر اور ظہر پڑھنے والے کے پیچھے عصر کی نماز پڑھنا جائز ہے کیونکہ ہر شخص کی اپنی نیت کا اعتبار ہے، اس لیے امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جب آپ مسجد میں آئیں اور امام نماز تراویح پڑھ رہا ہو تو اگر آپ نے ابھی تک عشا کی نماز نہ پڑھی ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھ لیں، آپ کی نماز فرض ہوگی اور امام کی نفل۔

مکمل صف سے آدمی پیچھے کھینچنے کا کیا حکم ہے؟

سوال کچھ نمازیوں میں اس مسئلہ میں اختلاف پیدا ہو گیا کہ جب کوئی شخص مسجد میں اس وقت آئے جب جماعت کھڑی ہو چکی ہو، صف مکمل ہو اور اس کے لیے صف میں کوئی جگہ نہ ہو تو کیا اس کے لیے اس مکمل صف سے ایک شخص کو پیچھے کھینچنا جائز ہے؟ یا وہ صف کے پیچھے اکیلا ہی نماز پڑھے؟ یا وہ کیا کرے؟

جواب جب انسان مسجد میں آئے اور وہ یہ دیکھے کہ صف پوری ہو گئی ہے تو اس کی درج ذیل تین صورتیں ہیں: ○ وہ صف کے پیچھے اکیلا نماز پڑھے گا۔ ○ یا صف میں سے کسی ایک شخص کو کھینچ کر اس کے ساتھ نماز پڑھے گا۔ ○ یا خود آگے بڑھ کر امام کے دائیں طرف کھڑا ہو کر نماز پڑھ لے گا۔ یہ تین صورتیں اس وقت ہوں گی جب وہ نماز میں شامل ہو اور چوتھی صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ جماعت میں شامل ہی نہ ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ ان چار صورتوں میں سے کون سی صورت بہتر ہے؟

ہمارے نزدیک ان چاروں میں سے پسندیدہ صورت یہ ہے کہ وہ صف کے پیچھے اکیلا ہی صف بنا کر امام کے ساتھ نماز پڑھے کیونکہ نماز باجماعت ادا کرنا اور صف میں شامل ہو کر ادا کرنا دونوں واجب ہیں۔ جب دونوں میں سے ایک یعنی صف میں کھڑے ہونے پر عمل مشکل ہو جائے تو دوسرا واجب یعنی نماز باجماعت ادا کرنا تو بہر حال واجب ہوگا، اس لیے ایسے شخص سے ہم یہ کہیں گے کہ آپ صف کے پیچھے باجماعت نماز ادا کریں تا کہ جماعت کے ثواب کو حاصل کر سکیں، اس صورت میں عجز کی وجہ سے صف میں شامل ہونا واجب نہیں ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ (التغابن: ٦٤/١٦)

''سو جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو۔''

اور اس کا شاہد یہ ہے کہ جب اور عورتیں نہ ہوں تو ایک عورت صف کے پیچھے اکیلی کھڑی ہوتی ہے کیونکہ اس کے لیے شرعاً

مردوں کی صف میں جگہ نہیں ہے اور جب اس کے لیے شرعاً مردوں کی صف میں جگہ نہیں ہے تو وہ اکیلی صف بنا کر نماز پڑھتی ہے۔ اسی طرح یہ شخص جب مسجد میں آیا تو صف مکمل ہو چکی تھی جس کی وجہ سے اس کے لیے صف میں کوئی جگہ نہ تھی، لہٰذا اس سے صف بندی ساقط ہو گئی، البتہ نماز باجماعت واجب رہی، لہٰذا وہ صف کے پیچھے اکیلا نماز پڑھ لے۔ اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ اگلی صف میں سے کسی کو پیچھے کھینچ لے کیونکہ اس میں درج ذیل خرابیاں ہیں:

① صف میں خلا پیدا ہو جائے گا اور نبی ﷺ نے صفوں کو مکمل کرنے اور ان میں خلا نہ چھوڑنے کا جو حکم دیا ہے، یہ اس کے خلاف ہے۔

② اس کھینچے جانے والے شخص کو فاضل سے مفضول جگہ کی طرف کھینچا جا رہا ہے اور یہ اس پر زیادتی ہے۔

③ اس کی نماز میں خلل پیدا ہوگا کیونکہ اس نمازی کو جب پیچھے کھینچا جائے گا تو اس سے اس کے دل میں حرکت پیدا ہوگی اور یہ بھی ایک طرح سے اس پر زیادتی ہے۔

تیسری صورت کہ وہ امام کے ساتھ جا کھڑا ہو، بھی درست نہیں کیونکہ امام کی جگہ مقتدیوں سے الگ ہونی ضروری ہے۔ جس طرح اقوال وافعال کے اعتبار سے اسے مقتدیوں پر سبقت حاصل ہوتی ہے کہ وہ تکبیر، رکوع اور سجدہ ان سے پہلے کرتا ہے، اسی طرح جگہ کے اعتبار سے بھی امام کو مقتدیوں سے بے نیاز ہونا چاہیے۔ نبی اکرم ﷺ کی سنت مطہرہ بھی یہی ہے کہ امام مقتدیوں سے آگے ہو، لہٰذا اگر کوئی مقتدی جا کر امام کے ساتھ کھڑا ہو جائے تو اس کا امتیاز واختصاص ختم ہو جائے گا۔

چوتھی صورت کہ وہ جماعت ترک کر دے اور اکیلا پڑھ لے، یہ بھی درست نہیں کیونکہ نماز باجماعت ادا کرنا اور اسے صف میں ادا کرنا واجب ہے۔ اگر کوئی شخص ایک واجب کے ادا کرنے سے عاجز ہو، تو دوسرا واجب اس سے ساقط نہیں ہوگا۔

دو منزلہ مسجد میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال ایک مسجد کی دو منزلیں ہیں، جو لوگ بالائی منزل میں نماز پڑھتے ہیں، وہ نیچے کے لوگوں کو نہیں دیکھ سکتے، تو کیا ان کی نماز صحیح ہے یا نہیں؟ راہنمائی فرمائیں!

جواب جب مسجد ایک ہو اور سب نمازی امام کی تکبیر سنتے ہوں تو ان کی نماز صحیح ہے، ایک دوسرے کو دیکھنا شرط نہیں ہے۔

اس جواب کو محمد صالح العثیمین نے 1410/8/25ھ کو لکھا۔

ٹیلی وژن یا ریڈیو سے نشر کی جانے والی نماز کے ساتھ مل کر نماز ادا کرنا کیسا ہے؟

سوال کیا کسی مسلمان خصوصاً عورتوں کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ ٹیلی وژن یا ریڈیو سے نشر کی جانے والی نماز کے ساتھ مل کر نماز ادا کریں جب کہ امام نظر نہ آ رہا ہو؟

جواب انسان کے لیے ریڈیو یا ٹیلی وژن کے واسطہ سے امام کی اقتدا جائز نہیں کیونکہ نماز باجماعت سے مقصود اجتماعیت ہے، لہٰذا امام اور مقتدیوں کو ایک جگہ ہونا چاہیے یا تمام صفیں آپس میں ملی ہونی چاہییں، لہٰذا ریڈیو اور ٹیلی وژن کے واسطہ سے نماز جائز نہیں کیونکہ اس سے مقصود حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر اسے جائز قرار دے دیا جائے تو ہر شخص اپنے گھر میں نماز پنجگانہ اور جمعہ ادا کرنے لگ جائے گا اور یہ بات

جمعہ و جماعت سے متعلق حکم شریعت کے منافی ہے' لہٰذا عورتوں یا کسی کیلئے ریڈیو اور ٹیلی وژن کے ساتھ نماز ادا کرنا جائز نہیں۔ واللہ الموفق!

مریض کی نماز کا طریقہ کیا ہے؟

سوال مریض نماز کس طرح پڑھے؟

جواب مریض درج ذیل طریقوں میں سے جس طریقے کی طاقت رکھتا ہے اس طریقے سے نماز پڑھ لے:

- مریض پر واجب ہے کہ وہ کھڑا ہو کر نماز پڑھے خواہ ٹیڑھا کھڑا ہو یا دیوار کے سہارے یا بوقت ضرورت عصا کا سہارا لے کر کھڑا ہو۔
- اگر کھڑا ہونے کی اسے طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھ لے اور افضل یہ ہے کہ قیام اور رکوع کی جگہ چوکڑی مار کر بیٹھے۔
- اگر بیٹھ کر نماز پڑھنے کی بھی اسے طاقت نہ ہو تو قبلہ رخ لیٹ کر نماز پڑھ لے اور افضل یہ ہے کہ دائیں پہلو پر لیٹے۔ اگر قبلہ رخ ہونا ممکن نہ ہو تو جس طرف اس کا منہ ہو اسی طرف نماز پڑھ لے' اس کی نماز صحیح ہوگی اور اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔
- اگر پہلو کے بل لیٹ کر نماز پڑھنا اس کے لیے ممکن نہ ہو تو قبلہ کی طرف پاؤں کر کے چت لیٹ کر پڑھ لے اور افضل یہ ہے کہ اپنے سر کو تھوڑا سا اوپر اٹھا لے تاکہ قبلہ رخ ہو سکے اور اگر قبلہ رخ پاؤں کرنے کی استطاعت نہ ہو تو اس کے پاؤں جس طرف بھی ہوں' نماز پڑھ لے' اس نماز کے دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔
- مریض کے لیے نماز میں رکوع و سجود واجب ہیں' اگر اس کی طاقت نہ ہو تو اپنے سر کے ساتھ اشارہ کر لے اور رکوع کی نسبت سجدے میں زیادہ جھکے۔ اگر اسے سجدہ کی استطاعت تو نہ ہو مگر وہ رکوع کر سکتا ہو تو حالت رکوع میں رکوع کر لے اور سجدہ اشارے سے کر لے اور اگر رکوع کی طاقت تو نہ ہو مگر وہ سجدہ کر سکتا ہو تو سجدہ کی حالت میں سجدہ کر لے اور رکوع اشارے کے ساتھ کر لے۔
- اگر رکوع و سجود میں اس کے لیے سر کے ساتھ اشارہ کرنا ممکن نہ ہو تو اپنی آنکھوں کے ساتھ اشارہ کر لے' رکوع کے لیے آنکھ کو تھوڑا سا بند کر لے اور سجدہ کے لیے اس سے زیادہ بند کر لے۔ انگلی کے ساتھ اشارہ' جیسا کہ بعض مریض کرتے ہیں' صحیح نہیں ہے کیونکہ کتاب و سنت اور اقوال اہل علم میں اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔
- اگر وہ سر یا آنکھ کے ساتھ اشارہ نہ کر سکتا ہو تو دل کے ساتھ نماز پڑھ لے' دل میں تکبیر کہہ لے' دل میں قراءت کرے' رکوع' سجود' قیام اور قعود کی دل ہی میں نیت کر لے' جیسا کہ ارشاد نبوی ہے:

«وَلِكُلِّ امْرِيءٍ مَا نَوٰى»(صحيح البخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله ﷺ، ح:١)

''اور ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی۔''

- مریض کے لیے واجب ہے کہ ہر نماز کو اس کے وقت پر ادا کرے اور اس سے متعلق ہر واجب جس کو ادا کرنے کی اسے طاقت ہے' ادا کرے پھر اگر ہر نماز بروقت ادا کرنے میں دشواری ہو تو ظہر و عصر اور مغرب و عشا کو جمع کر کے ادا کر سکتا ہے' چاہے جمع تقدیم کی صورت اختیار کر لے یعنی نماز عصر کو بھی ظہر کے وقت میں اور نماز عشا کو مغرب کے وقت میں ادا کر لے اور اگر چاہے تو

جمع تاخیر کی صورت اختیار کر لے یعنی نماز ظہر کو عصر کے وقت میں اور نماز مغرب کو عشا کے وقت میں جمع کر کے ادا کر لے۔ جس طرح اس کے لیے زیادہ آسانی ہو اسی طرح کرے لیکن نماز فجر کو اپنے وقت ہی پر ادا کرنا ہوگا اسے پہلی یا بعد والی کسی نماز کے ساتھ جمع نہیں کیا جا سکتا۔

- مریض اگر مسافر ہو اور کسی دوسرے علاقے میں علاج کروا رہا ہو تو وہ قصر کرتے ہوئے ظہر‘ عصر اور عشا کی نمازوں کی دو دو رکعتیں ادا کرے گا حتی کہ اپنے گھر لوٹ آئے‘ خواہ یہ مدت زیادہ ہو یا کم۔ واللہ الموفق.

ہوائی جہاز میں نماز ادا کرنے کا طریقہ

سوال ہوائی جہاز میں نماز کب واجب ہوتی ہے؟ ہوائی جہاز میں فرض نماز کس طرح ادا کی جائے گی؟ ہوائی جہاز میں نفل نماز کے ادا کرنے کا کیا طریقہ ہوگا؟

جواب جب وقت ہو جائے تو ہوائی جہاز میں بھی نماز واجب ہے۔ اگر ہوائی جہاز میں اس طرح نماز ادا کرنا ممکن نہ ہو‘ جس طرح زمین پر ادا کی جاتی ہے‘ تو وہ ہوائی جہاز میں فرض نماز ادا نہ کرے بشرطیکہ نماز کا وقت یا دو نمازوں کو جمع کرنے کی صورت میں وقت ختم ہونے سے پہلے ہوائی جہاز کا زمین پر اترنا ممکن ہو۔ مثلاً ہوائی جہاز نے اگر غروب آفتاب سے تھوڑی دیر پہلے جدہ سے پرواز شروع کی ہو اور ہوائی جہاز ابھی فضا میں ہو کہ سورج غروب ہو جائے تو وہ ہوائی جہاز کے ایئرپورٹ پر اترنے سے پہلے جہاز میں نماز مغرب نہ پڑھے‘ اگر وقت ختم ہو جانے کا اندیشہ ہو تو وہ عشا کی نماز کے ساتھ جمع کر کے ادا کرنے کی نیت کر لے۔ اگر طیارے کی پرواز جاری ہو حتی کہ عشا کے وقت کے ختم ہو جانے کا بھی اندیشہ ہو، اور یاد رہے نماز عشا کا وقت آدھی رات تک ہے‘ تو وہ وقت ختم ہونے سے پہلے ان دونوں نمازوں کو طیارے میں پڑھ لے۔

طیارے میں فرض نماز پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ قبلہ رخ کھڑا ہو کر تکبیر تحریمہ کہے‘ فاتحہ پڑھے اور اس سے پہلے مسنون دعائے استفتاح اور بعد میں قرآن مجید کا کچھ حصہ پڑھے‘ پھر رکوع کرے‘ پھر رکوع سے سر اٹھائے‘ پھر سجدہ کرے‘ اگر سجدہ کرنا ممکن نہ ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھ کر اشارے کے ساتھ سجدہ کرے۔ اسی طرح باقی ساری نماز قبلہ رخ ادا کرے۔ طیارے میں نفل نماز پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر پڑھ لے‘ رکوع وسجدہ اشارے کے ساتھ کر لے اور سجدہ کے لیے رکوع کی نسبت زیادہ جھک جائے‘ واللہ الموفق۔ یہ فتویٰ 1409/4/23ھ کو تحریر کیا گیا۔

کتنی مسافت پر نماز قصر کی جا سکتی ہے؟

سوال سفر کی کتنی مسافت ہو تو مسافر نماز قصر ادا کر سکتا ہے؟ کیا یہ جائز ہے کہ نماز کو جمع تو کر لیا جائے مگر قصر نہ کی جائے؟

جواب بعض علماء نے قصر کے لیے مسافت کی حد تراسی کلومیٹر بیان کی ہے اور بعض علماء نے کہا ہے کہ قصر کے لیے مسافت وہ ہے‘ جسے عرف عام میں سفر قرار دیا جائے‘ خواہ وہ اسی کلومیٹر سے بھی کم ہو اور جسے لوگ کہیں کہ یہ سفر نہیں تو وہ سفر نہیں ہے‘ خواہ وہ ایک سو کلو میٹر ہی کیوں نہ ہو۔

اسی آخری بات کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جواز قصر کے لیے کسی معین مسافت کو بیان نہیں فرمایا۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے بھی کسی مخصوص مسافت کا تعین نہیں فرمایا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا خَرَجَ مَسِيرَةَ ثَلَاثَةِ أَمْيَالٍ أَوْ ثَلَاثَةِ فَرَاسِخَ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ» (صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة المسافرين، ح: ٦٩١)

”رسول اللہ ﷺ جب تین میل یا تین فرسخ کی مسافت کے لیے سفر فرماتے تو دو رکعتیں پڑھتے تھے۔“

اختلاف عرف کی صورت میں مسافت کے تعین کے متعلق قول پر عمل کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ بھی بعض ائمہ اور علماء مجتہدین کا قول ہے، لہٰذا اس میں بھی ان شاء اللہ کوئی حرج نہیں، اور اگر عرف و عادت باقاعدہ طے ہو تو پھر عرف کی طرف رجوع کرنا ہی درست ہے۔ ①

اب رہا سوال کہ جب قصر جائز ہو تو کیا جمع کرنا بھی جائز ہے؟ ہم عرض کریں گے کہ جمع قصر کے ساتھ مشروط نہیں ہے، جمع کا تعلق ضرورت و حاجت سے ہے۔ انسان کو سفر و حضر میں جب جمع کی ضرورت ہو تو وہ جمع کر لے۔ یہی وجہ ہے کہ بارش کی وجہ سے جب مسجد میں جانے میں مشقت ہو تو لوگ نمازوں کو جمع کر کے ادا کر لیتے ہیں، اسی طرح جب موسم سرما میں شدید ٹھنڈی ہوا چل رہی ہو اور مسجد میں جانے میں مشقت ہو تو نمازوں کو جمع کر کے ادا کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح جب مال کے ضائع ہونے یا اسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو انسان نماز کو جمع کر کے ادا کر سکتا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا:

«جَمَعَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بَيْنَ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ، وَالْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ بِالْمَدِينَةِ فِي غَيْرِ خَوْفٍ وَلَا مَطَرٍ» (صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الجمع بين الصلاتين في الحضر، ح: ٧٠٥)

”رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں ظہر و عصر اور مغرب و عشا کی نمازوں کو کسی خوف یا بارش کے بغیر جمع کیا۔“

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جواب دیا کہ آپ چاہتے تھے کہ ترک جمع کی وجہ سے امت کسی حرج میں مبتلا نہ ہو۔ ضابطہ یہی ہے کہ ترک جمع کی وجہ سے جب انسان کسی حرج میں مبتلا ہو تو جمع کرنا جائز ہے اور اگر حرج نہ ہو تو پھر جمع کرنا جائز نہیں، سفر میں ترک جمع کی وجہ سے حرج کا اندیشہ ہوتا ہے، لہٰذا مسافر کے لیے جمع کرنا جائز ہے، خواہ اس نے سفر کو جاری رکھا ہو یا اس نے اقامت اختیار کر لی ہو لہٰذا مسافر کیلئے جمع اور مقیم کے لیے ترک جمع افضل ہے۔ اس سے یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ انسان جب کسی ایسے شہر میں مقیم ہو جس میں جماعت کا اہتمام ہو تو پھر نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنا واجب ہے، لہٰذا اس صورت میں نہ جمع کرے اور نہ قصر۔ اگر جماعت نہ مل سکی ہو تو پھر قصر کر لے اور جمع نہ کرے الا یہ کہ اسے جمع کرنے کی ضرورت ہو۔

---

① جب تین فرسخ (پرانے تقریباً 15 میل) کی تحدید حدیث سے ثابت ہے، تو پھر عرف و عادت کی طرف رجوع کرنے کو زیادہ درست قرار دینا کیوں کر صحیح ہے؟ اس لیے فاضل مفتی رحمہ اللہ کی یہ رائے مرجوح ہے۔ راجح بات یہی ہے کہ سفر کی مسافت حدیث سے ثابت ہے اور وہ تین فرسخ ہے جو حافظ عبدالمنان صاحب نور پوری حفظہ اللہ کی تحقیق کے مطابق 23 کلومیٹر بنتی ہے۔ یہ مسافت اپنے شہر کی حدود سے نکلنے کے بعد شمار ہوگی۔ (ص، ی)

سوال ایک شخص تعلیم کے لیے جمعہ کی شام کو ریاض کا سفر اختیار کرتا ہے اور سوموار کو عصر کے وقت لوٹ آتا ہے تو کیا نمازوں وغیرہ میں مسافر کے احکام کے مطابق عمل کرے گا؟

جواب بلاشک یہ شخص مسافر ہے کیونکہ اس نے تعلیم کے شہر کو وطن نہیں بنایا اور نہ اس نے مستقل اقامت کی نیت کی ہے بلکہ اس کی اقامت تو تعلیم کی غرض سے ہے، البتہ اگر اس کی اقامت ایسے شہر میں ہے جہاں نماز باجماعت ادا کی جاتی ہے تو اس کے لیے بھی نماز باجماعت ادا کرنا واجب ہے۔ بعض عوام میں جو یہ بات مشہور ہے کہ مسافر کے لیے جمعہ و جماعت نہیں ہے، تو یہ بے اصل ہے کیونکہ مسافر کے لیے بھی نماز ادا کرنا واجب ہے، خواہ وہ قتال ہی میں مصروف کیوں نہ ہو جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ ٱلصَّلَوٰةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ ﴾ (النساء: ٤/ ١٠٢)

''اور (اے پیغمبر) جب تم ان (مجاہدین کے لشکر) میں ہو اور ان کو نماز پڑھانے لگو تو چاہیے کہ ان کی ایک جماعت تمھارے ساتھ کھڑی رہے۔''

اور جمعہ بھی ہر اس شخص پر واجب ہے، جو اذان سنے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا نُودِىَ لِلصَّلَوٰةِ مِن يَوْمِ ٱلْجُمُعَةِ فَٱسْعَوْاْ إِلَىٰ ذِكْرِ ٱللَّهِ ﴾ (الجمعة: ٦٢/ ٩)

''مومنو! جب جمعے کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کی یاد (یعنی نماز) کے لیے جلدی کرو۔''

البتہ اگر نماز کا وقت ختم ہو گیا ہو یا تم مسجد سے کسی بہت دور جگہ میں ہو تو پھر چار رکعتوں والی نماز کی دو رکعتیں پڑھ لو۔

نماز عصر کو جمعہ کے ساتھ جمع کرنے کا مسئلہ

سوال نماز عصر کو نماز جمعہ کے ساتھ جمع کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ جو شخص شہر سے باہر ہو تو کیا اس کیلئے بھی جمع کرنا جائز ہے؟

جواب نماز عصر کو نماز جمعہ کے ساتھ جمع نہ کیا جائے کیونکہ یہ سنت سے ثابت نہیں ہے اور اسے ظہر پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ جمعہ اور ظہر میں بہت فرق ہے اور اصل یہ ہے کہ ہر نماز کو اس کے وقت پر ادا کرنا واجب ہے الّا یہ کہ کسی دلیل سے اسے دوسری نماز کے ساتھ جمع کر کے ادا کرنا جائز ہو۔ جو لوگ دو یا تین دن کی اقامت کے لیے شہر سے باہر مقیم ہوں، ان کے لیے جمع کرنا جائز ہے کیونکہ وہ مسافر ہیں اور اگر وہ شہر کے ایسے قریبی علاقوں میں مقیم ہوں، جہاں وہ مسافر شمار نہ ہوتے ہوں تو ان کے لیے جمع کرنا جائز نہیں ہوگا۔ اس بات کا تعلق ظہر و عصر اور مغرب و عشا کی نمازوں کو جمع کرنے سے ہے، جمعہ و عصر کے جمع کرنے سے نہیں کیونکہ وہ تو کسی طرح بھی جائز نہیں۔ ①

---

① جمعہ اور عصر کو جمع کرنے سے مسافر کو اس لیے روکنا کہ حدیث سے ثابت نہیں ہے، صحیح بات نہیں ہے۔ کیونکہ اگر جمع کرنا ثابت نہیں ہے، تو اس کی ممانعت بھی کہاں ثابت ہے؟ اس لیے حدیث سے جب جمع کا جواز ثابت ہے۔ تو اس عموم میں نماز جمعہ اور نماز عصر کا جمع کرنا بھی شامل ہوگا اور اس عموم کی بنا پر ایسا کرنا جائز ہوگا۔ الّا یہ کہ اس کی ممانعت کے لیے خصوصی نہی وارد ہو، اور ہمارے علم کی حد تک وہ نہیں ہے۔ واللہ اعلم. (ص، ی)

دو نمازوں کو جمع کرنے کی کہاں تک رخصت ہے؟

سوال ہم نے گزشتہ دنوں دیکھا کہ نمازیں بہت کثرت سے جمع کر کے ادا کی گئیں اور اس مسئلہ میں لوگوں نے بہت تساہل سے کام لیا ہے، آپ کی رائے میں کیا اس طرح کی سردی نمازوں کے جمع کرنے کا جواز بن سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر وثواب سے نوازے۔

جواب لوگوں کے لیے یہ حلال نہیں کہ وہ تساہل سے کام لے کر نمازیں جمع کر کے ادا کریں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ ٱلصَّلَوٰةَ كَانَتْ عَلَى ٱلْمُؤْمِنِينَ كِتَٰبًا مَّوْقُوتًا ﴾ (النساء: ٤/ ١٠٣)

''بے شک نماز کا مومنوں پر اوقات (مقررہ) میں ادا کرنا فرض ہے۔''

اور فرمایا:

﴿ أَقِمِ ٱلصَّلَوٰةَ لِدُلُوكِ ٱلشَّمْسِ إِلَىٰ غَسَقِ ٱلَّيْلِ وَقُرْءَانَ ٱلْفَجْرِ ۖ إِنَّ قُرْءَانَ ٱلْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا ﴾ (الإسراء: ١٧/ ٧٨)

''(اے نبی) سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک (ظہر، عصر، مغرب، عشا کی) نمازیں قائم کرو اور صبح کو قرآن پڑھا کرو کیونکہ صبح کے وقت قرآن کا پڑھنا موجب حضوری (ملائکہ) ہے۔''

جب فرض نماز کا وقت مقرر ہے تو اسے اس کے مقرر وقت میں ادا کرنا واجب ہے، جیسے آیت کریمہ: ﴿أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ﴾ میں اجمال کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور جس کی نبی اکرم ﷺ نے تفصیل اس طرح بیان فرمائی ہے:

«وَقْتُ الظُّهْرِ إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ وَكَانَ ظِلُّ الرَّجُلِ كَطُولِهِ، مَا لَمْ تَحْضُرِ الْعَصْرُ، وَوَقْتُ الْعَصْرِ مَالَمْ تَصفَرَّ الشَّمْسُ، وَوَقْتُ صَلَاةِ الْمَغْرِب مَالَمْ يَغِبِ الشَّفَقُ، وَوَقْتُ صَلَاةِ الْعِشَاءِ إِلَى نِصْفِ اللَّيْلِ الأَوْسَطِ وَوَقْتُ صَلَاةِ الصُّبْحِ مِنْ طُلُوعِ الْفَجْرِ مَا لَمْ تَطْلُعِ الشَّمْسُ»(صحيح مسلم، المساجد، أوقات الصلوات الخمس، ح: ٦١٢(١٧٣)

''ظہر کا وقت وہ ہے جب سورج کا زوال ہو جائے اور آدمی کا سایہ اس کے اپنے طول کے برابر ہو جائے اور یہ عصر کے وقت تک ہے اور عصر کا وقت، وہ ہے جب تک سورج زرد نہ ہو، اور نماز مغرب کا وقت وہ ہے جب تک شفق غائب نہ ہو، اور نماز عشا کا وقت آدھی رات تک ہے۔ اور صبح کی نماز کا وقت طلوع فجر سے لے کر طلوع شمس تک ہے۔''

جب نبی اکرم ﷺ نے تفصیل کے ساتھ اوقات نماز کی تحدید بیان فرما دی ہے تو اوقات مقررہ کے علاوہ اوقات میں نماز ادا کرنا حدود اللہ سے تجاوز ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ ٱللَّهِ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ﴾ (البقرة: ٢/ ٢٢٩)

''اور جو لوگ اللہ کی حدوں سے باہر نکل جائیں، تو وہی ظالم ہیں۔''

جو شخص جانتے بوجھتے ہوئے قصد وارادے کے ساتھ قبل از وقت نماز پڑھ لے، وہ گناہ گار ہے، اسے نماز دوبارہ پڑھنا ہوگی اور اگر کسی نے جان بوجھ کر قصد وارادے سے قبل از وقت نماز نہیں پڑھی بلکہ غلطی کی وجہ سے پڑھی ہے، تو وہ گناہ گار تو نہیں ہوگا، البتہ

اسے نماز دوبارہ پڑھنا ہوگی۔

حاصل کلام یہ کہ جو شخص کسی شرعی سبب کے بغیر نماز قبل از وقت جمع کر لے تو اس کی نماز صحیح نہیں ہوگی' اسے یہ نماز دوبارہ پڑھنی ہوگی۔ اسی طرح جو شخص جان بوجھ کر قصد وارادے کے ساتھ بلا عذر نماز کو وقت سے مؤخر کر دے تو راجح قول کے مطابق وہ گناہ گار ہوگا اور اس کی نماز قبول نہیں ہوگی' لہٰذا کسی شرعی سبب کے بغیر نماز کو تاخیر کر کے کسی دوسری نماز کے ساتھ جمع کر کے پڑھا جائے تو راجح قول کے مطابق وہ نماز قبول نہیں ہوتی۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور نماز جیسے عظیم الشان معاملے میں تساہل سے کام نہ لے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث ہے:

«جَمَعَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بَيْنَ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ، وَالْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ بِالْمَدِينَةِ فِي غَيْرِ خَوْفٍ وَلاَ مَطَرٍ»(صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الجمع بين الصلاتين في الحضر، ح:٧٠٥(٥٤))

''رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں ظہر وعصر اور مغرب وعشا کو خوف اور بارش کے بغیر جمع کیا۔''

نماز میں تساہل کی دلیل نہیں ہے کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ پوچھا گیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کیوں کیا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ نے ایسا اس لیے کیا تا کہ امت کو حرج میں مبتلا نہ کر دیں۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ہر نماز کو وقت پر ادا کرنے میں حرج ہونا جمع کے جواز کا سبب ہے' لہٰذا جب ہر نماز کے وقت پر ادا کرنے میں حرج ہو تو پھر نماز کو جمع کر کے ادا کرنا جائز یا مسنون ہے اور اگر کوئی حرج نہ ہو تو پھر ہر نماز کو وقت پر ادا کرنا واجب ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ محض سردی کی وجہ سے نماز کو جمع کرنا جائز نہیں الا یہ کہ سردی کی شدت کے ساتھ ایسی تیز ہوا بھی ہو جس کی وجہ سے لوگوں کو مسجد جانے سے تکلیف ہوتی ہو یا ژالہ باری ہو جس سے لوگوں کو ایذا پہنچتی ہو تو پھر جمع کرنا جائز ہے۔

میری تمام مسلمان بھائیوں خصوصاً ائمہ مساجد کو نصیحت یہ ہے کہ وہ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈریں اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر فریضۂ نماز کے ادا کرنے میں اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کریں۔

اس فتویٰ کو محمد صالح العثیمین نے 1413/7/8ھ کو لکھا۔

سفر کی رخصتیں کیا کیا ہیں؟

سوال سفر میں کون کون سی رخصتیں دی گئی ہیں؟

جواب سفر کی رخصتیں چار ہیں: ① چار رکعات والی نماز کی دو رکعتیں پڑھنا۔ ② رمضان میں روزے نہ رکھنا اور دوسرے دنوں میں ان کی تعداد کے مطابق قضا ادا کر دینا۔ ③ موزوں پر تین دن رات مسح کرنا اور اس مدت کا پہلے مسح کے وقت سے شمار کرنا۔ ④ ظہر' مغرب اور عشا کی سنن مؤکدہ کا ساقط ہو جانا' البتہ فجر کی سنتیں اور باقی نوافل بدستور مشروع اور مستحب ہیں۔

مسافر رات کی نماز' فجر کی سنتیں' ضحیٰ کی دو رکعتیں' وضو کی سنتیں' مسجد میں داخل ہونے کی دو رکعتیں اور سفر سے واپسی کی دو رکعتیں پڑھ سکتا ہے۔ سنت یہ ہے کہ انسان جب سفر سے واپس آئے تو اپنے گھر میں داخل ہونے سے پہلے مسجد میں داخل ہو کر دو رکعتیں

پڑھے۔ اسی طرح مسافر باقی نفل نمازیں بھی پڑھ سکتا ہے' ماسوا ان کے جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے یعنی ظہر' مغرب اور عشا کی سنتیں کہ نبی ﷺ سفر میں انھیں ادا نہیں فرمایا کرتے تھے۔

جمعہ کی پہلی گھڑی کب شروع ہوتی ہے؟

سوال جمعہ کے دن کی پہلی گھڑی کا آغاز کب ہوتا ہے؟

جواب رسول اللہ ﷺ نے جن گھڑیوں کا ذکر فرمایا ہے' وہ پانچ ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے:

«مَنِ اغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ غُسْلَ الْجَنَابَةِ، ثُمَّ رَاحَ فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ بَدَنَةً، وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الثَّانِيَةِ فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ بَقَرَةً، وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الثَّالِثَةِ فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ كَبْشًا أَقْرَنَ، وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الرَّابِعَةِ فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ دَجَاجَةً، وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الْخَامِسَةِ فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ بَيْضَةً» (صحيح البخاري، الجمعة، باب فضل الجمعة، ح:٨٨١، وصحيح مسلم، الجمعة، باب الطيب والسواك يوم الجمعة، ح:٨٥٠)

”جو شخص جمعہ کے دن غسل جنابت کی طرح غسل کرے اور پھر وہ (مسجد میں) چلا آئے تو اس نے گویا اونٹ کی قربانی دی اور جو دوسری گھڑی میں آئے اس نے گویا گائے کی قربانی دی اور جو تیسری گھڑی میں آئے' اس نے گویا سینگوں والے مینڈھے کی قربانی دی اور جو چوتھی گھڑی میں آئے' اس نے گویا مرغی کی قربانی دی اور جو پانچویں گھڑی میں آئے' اس نے گویا انڈے کی قربانی دی۔“

آپ نے طلوع آفتاب سے امام کی آمد تک کے وقت کو پانچ حصوں میں تقسیم فرما دیا ہے' لہٰذا ہر حصہ معروف گھڑی کے مطابق ہو گا جو ایک گھنٹے سے کم یا زیادہ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ وقت بدلتا رہتا ہے۔ طلوع آفتاب سے امام کی آمد تک پانچ گھڑیاں ہیں' پہلی گھڑی طلوع آفتاب سے شروع ہوتی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ طلوع فجر سے شروع ہوتی ہے لیکن ان میں سے پہلی بات زیادہ راجح ہے کیونکہ طلوع آفتاب سے پہلے کا وقت نماز فجر کا وقت ہے۔

کیا امام کی آواز سنائی دینے کی صورت میں نماز گھر پر ادا کرنا جائز ہے؟

سوال اگر امام کی آواز سنائی دیتی ہو تو کیا مسلمان کے لیے اپنے گھر میں نماز جمعہ ادا کرنا جائز ہے؟

جواب نماز جمعہ مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو کر مسجد ہی میں ادا کرنا جائز ہے۔ اگر مسجد بھر جائے اور صفیں سڑکوں پر بھی بنالی جائیں تو ضرورت کی وجہ سے ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن گھر یا اپنی دُکان میں نماز جمعہ ادا کرنا ہرگز جائز اور حلال نہیں ہے کیونکہ جمعہ و جماعت سے مقصود مسلمانوں کی آپس میں باہمی ملاقات بھی ہے تاکہ وہ سب ایک امت بن جائیں' ان میں الفت و محبت پیدا ہو' جاہل عالم سے سیکھے' لہٰذا اگر ہم ہر شخص کے لیے دروازہ کھول دیں اور کہیں کہ تم ریڈیو سے سن کر نماز پڑھو اور تم سپیکر کی آواز سن کر اپنے گھر میں پڑھ لو' تو پھر مسجدوں کے بنانے اور ان میں نمازیوں کے حاضر ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس دروازے کو اگر کھول دیا

جائے‘ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ جمعہ و جماعت کو ترک کر دیں گے۔

عورت جمعہ کی کتنی رکعتیں ادا کرے؟

سوال عورت نماز جمعہ کی کتنی رکعات پڑھے؟

جواب عورت اگر نماز جمعہ مسجد میں امام کے ساتھ ادا کرے‘ تو وہ بھی اتنی ہی رکعات پڑھے‘ جتنی امام پڑھتا ہے اور اگر وہ گھر میں پڑھے‘ تو پھر ظہر کی چار رکعات پڑھے۔

جمعہ پڑھ لیں تو پھر فرض نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں

سوال جس نے جمعہ پڑھا ہو‘ کیا وہ نماز ظہر بھی پڑھے؟

جواب جب انسان جمعہ پڑھ لے تو اس وقت اس پر جمعہ ہی فرض ہے‘ لہٰذا وہ ظہر نہ پڑھے۔ نماز جمعہ کے بعد ظہر کی نماز پڑھنا بدعت ہے کیونکہ یہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے‘ لہٰذا اس سے منع کرنا واجب ہے حتیٰ کہ اگر کئی جمعے ہونے لگیں‘ تو پھر بھی نماز جمعہ کے بعد نماز ظہر پڑھنا مشروع نہیں ہے بلکہ یہ بدعت اور ایک منکر کام ہے کیونکہ ایک وقت میں اللہ تعالیٰ نے انسان پر ایک ہی نماز کو واجب قرار دیا ہے اور یہ جمعہ ہے اور جمعہ اس نے ادا کر لیا ہے۔ اور جس نے اس کا سبب یہ قرار دیا ہے کہ ایک شہر یا بستی میں کئی جمعے جائز نہیں ہیں اور جب کئی جمعے ہوں تو جمعہ اس مسجد میں ادا کیا جائے جو سب سے پہلی مسجد ہو اور اگر یہ معلوم نہیں کہ سب سے پہلی مسجد کون سی ہے‘ لہٰذا سارے جمعے باطل ہوں گے اور ان کے بعد نماز ظہر کو پڑھنا ضروری ہوگا۔ ہم ان لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ یہ دلیل یا یہ تعلیل تم نے کہاں سے اخذ کی ہے۔ کیا اس کی بنیاد سنت پر ہے یا کسی صحیح عقلی دلیل پر؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے‘ لہٰذا ہم یہ کہیں گے کہ اگر جمعے حاجت و ضرورت کی وجہ سے متعدد ہیں تو سارے صحیح ہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن: ٦٤/ ١٦)
’’سو جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو۔‘‘

جب کوئی شہر بہت دور دور تک پھیل گیا ہو یا مسجدیں تنگ ہوں اور حاجت و ضرورت کی وجہ سے مختلف جمعے ہوں تو اس شہر کے لوگ اللہ سے مقدور بھر ڈر گئے اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے مقدور بھر ڈر جائے تو اس نے اپنے واجب کو ادا کر دیا‘ لہٰذا یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس کا عمل فاسد ہے اور اسے نماز جمعہ کے بجائے ظہر کی نماز بھی ادا کرنی چاہیے۔ اگر کسی حاجت و ضرورت کے بغیر متعدد مقامات پر جمعے ادا کیے جائیں تو بلاشبہ یہ خلاف سنت ہے‘ نبی اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عمل کے خلاف ہے‘ لہٰذا اکثر اہل علم کے نزدیک یہ حرام ہے لیکن اس کے باوجود ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جمعہ کی صورت میں ادا کی گئی عبادت صحیح نہیں ہے کیونکہ یہاں ذمہ داری عوام کی نہیں بلکہ ان حکمرانوں کی ہے جنھوں نے حاجت و ضرورت کے بغیر متعدد جمعوں کی اجازت دے رکھی ہے‘ لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ مساجد کے انتظام و انصرام سے متعلق حکمرانوں کا فرض ہے کہ وہ ضرورت و حاجت کے بغیر متعدد جمعوں کی اجازت نہ دیں کیونکہ شارع کی نظر میں اس بات کی بے حد اہمیت ہے کہ لوگ تمام عبادات کو اجتماعی طور پر ادا کریں تا کہ آپس میں الفت و محبت پیدا

ہواور جو دین کے احکام و مسائل سے آگاہ نہیں ہے' وہ واقفیت حاصل کر لے۔ علاوہ ازیں ان میں اور بھی بڑی بڑی اور بہت سی مصلحتیں ہیں۔ شرعی اجتماعات ہفتہ وار ہیں یا سالانہ یا یومیہ جیسا کہ معروف ہے۔ یومیہ اجتماعات ہر محلے کی مساجد میں ہوتے ہیں کیونکہ شارع اگر لوگوں پر اس بات کو واجب قرار دے دیتا کہ وہ روزانہ ایک ہی جگہ پر پانچ مرتبہ جمع ہوں تو اس میں بہت مشقت ہوتی' لہٰذا اس معاملے میں تخفیف کر دی گئی اور ہر محلے کی مسجد میں یومیہ اجتماعات کی اجازت دے دی گئی۔

ہفتہ وار اجتماع جمعہ کے دن ہوتا ہے' جس میں ہفتہ میں ایک بار سب لوگ جمع ہوتے ہیں' لہٰذا سنت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ اجتماع ایک ہی جگہ ہو' متعدد جگہ پر نہیں کیونکہ ہفتہ وار اجتماع میں ایک جگہ جمع ہونے میں کوئی دشواری نہیں جب کہ اس میں بہت بڑی مصلحت بھی ہے۔ لوگ ایک امام و خطیب کے ہاں جمع ہوتے ہیں جو سب کی ایک جیسی راہنمائی کرتا ہے' لہٰذا جب وہ جمعہ ادا کرنے کے بعد واپس جاتے ہیں تو ان سب نے ایک جیسی نصیحت حاصل کی ہوتی اور ایک ہی نماز ادا کی ہوتی ہے۔ سالانہ اجتماع عید کے موقع پر ہوتا ہے اور یہ سالانہ اجتماع سارے شہر کے لیے ہوتا ہے' لہٰذا جمعہ کی مسجدوں کی طرح یہ جائز نہیں کہ عیدوں کے لیے بھی مختلف مسجدیں ہوں اِلَّا یہ کہ حاجت و ضرورت کا تقاضا ہو۔

مسافر کے لیے نماز جمعہ کا حکم

سوال ہم سمندر میں کسی کام میں مشغول تھے کہ نماز جمعہ کا وقت ہو گیا۔ ہم سمندر سے اذان ظہر کے وقت سے نصف گھنٹہ بعد باہر نکلے کیا ہمارے لیے صحیح ہے کہ اذان دے کر ہم نماز جمعہ ادا کریں؟

جواب شہر ہوں یا دیہات' نماز جمعہ مسجدوں ہی میں ادا کرنا صحیح ہے۔ بحر و بر میں مشغول لوگوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ نماز جمعہ مسجدوں کے بغیر پڑھیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی سنت سے یہ ثابت ہے کہ نماز جمعہ شہر اور دیہات ہی میں ادا کی جائے۔ نبی ﷺ بسا اوقات کئی کئی دن کا سفر جاری رکھتے مگر آپ سفر میں نماز جمعہ قائم نہیں فرمایا کرتے تھے۔ تم لوگ اب سمندر میں ہو اور کسی ایک جگہ قرار اختیار کیے ہوئے نہیں ہو بلکہ تمہیں دائیں بائیں منتقل ہونا اور ملکوں اور شہروں میں آنا جانا پڑتا ہے' لہٰذا تم پر نماز جمعہ نہیں بلکہ نماز ظہر واجب ہے اور حالت سفر میں تم لوگ نماز قصر کر سکتے ہو یعنی چار رکعتوں والی نماز کی دو رکعتیں پڑھ سکتے ہو۔

اگر ایک رکعت امام کے ساتھ پالیں تو پھر جمعہ ہی شمار ہو گا

سوال جمعہ کے دن مقتدی کیا کرے جب وہ نماز کے لیے اس وقت آئے جب امام آخری تشہد میں ہو یعنی اس وقت وہ چار رکعتیں پڑھے یا دو رکعتیں؟

جواب جب انسان جمعہ کے دن اس وقت آئے جب امام تشہد میں ہو تو اس کا جمعہ فوت ہو گیا' امام کے ساتھ تشہد میں شامل ہو جائے اور ظہر کی چار رکعات پڑھے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الصَّلَاةِ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلَاةَ»(صحيح البخاري، مواقيت الصلاة، باب من أدرك من الصلاة ركعة، ح: ٥٨٠ وصحيح مسلم، المساجد، باب من أدرك ركعة من الصلاة فقد أدرك تلك

الصلاة، ح:٦٠٧)

’’جس نے نماز کی ایک رکعت پالی اس نے نماز پالی۔‘‘

اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے ایک رکعت سے کم پایا تو اس نے نماز کو نہیں پایا۔ اور نبی اکرم ﷺ سے یہ بھی منقول ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ مِنْ صَلَاةِ الْجُمُعَةِ رَكْعَةً فَقَدْ أَدْرَكَ» (سنن النسائي، الجمعة، باب من أدرك ركعة من صلاة الجمعة، ح:١٤٢٦)

’’جس نے نماز جمعہ کی ایک رکعت پالی‘ اس نے جمعہ پالیا۔‘‘

یعنی جب وہ کھڑا ہو کر دوسری رکعت بھی پڑھ لے تو اس نے نماز جمعہ کو پالیا۔

دوران خطبہ میں امام کی دعا پر آمین کہنے کا حکم

سوال نماز جمعہ کے خطبہ کے بعد امام جب دعا کرے تو کیا آمین کہنا بدعت ہے؟

جواب یہ بدعت نہیں ہے۔ خطیب جب مسلمانوں کے لیے خطبہ میں دعا کرے تو اس کی دعا پر آمین کہنا مستحب ہے لیکن آمین اجتماعی اور بلند آواز کے ساتھ نہیں ہونی چاہیے بلکہ ہر ایک اپنے طور پر آہستہ سے آمین کہے تاکہ بلند آوازوں کی وجہ سے تشویش پیدا نہ ہو‘ لہٰذا ہر شخص کو اپنے طور پر آہستہ سے آمین کہنی چاہیے۔

غیر عربی زبان میں خطبہ اور خطیب کا خطبۂ جمعہ دیتے ہوئے دونوں ہاتھ بلند کرنا

سوال جمعہ کے دن خطبہ دیتے وقت امام کے دونوں ہاتھوں کے اٹھانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جمعہ کے دن خطبہ دیتے وقت امام کے لیے دونوں ہاتھوں کو اٹھانا مشروع نہیں ہے۔ بشر بن مروان نے خطبۂ جمعہ میں جب دونوں ہاتھوں کو اٹھایا‘ تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کی مخالفت کی تھی۔ البتہ استسقا اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ نبی ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے خطبۂ جمعہ میں بارش کے لیے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی تھی اور آپ کے ساتھ لوگوں نے بھی ہاتھ اٹھا لیے تھے۔ اس کے علاوہ خطبہ جمعہ میں کسی اور دعا کے لیے دونوں ہاتھ نہیں اٹھانے چاہییں۔

سوال عربی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں خطبہ دینے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اس مسئلہ میں صحیح بات یہ ہے کہ خطیب کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ خطبہ کسی ایسی زبان میں دے جسے اس کے سوا دیگر حاضرین سمجھتے ہی نہ ہوں مثلاً: اگر حاضرین عرب نہیں ہیں اور وہ عربی زبان نہیں سمجھتے تو وہ ان کی زبان میں خطبہ دے کیونکہ زبان ان کے لیے وسیلۂ بیان ہے اور خطبہ سے مقصود یہ ہے کہ بندگان الٰہی کے سامنے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حدود کو بیان کیا جائے اور انہیں وعظ و نصیحت کی جائے‘ البتہ واجب ہے کہ آیات قرآنی کو عربی زبان ہی میں پڑھا جائے اور پھر ان لوگوں کی زبان میں ان کی تفسیر بیان کی جائے‘ اس بات کی دلیل کہ قوم کی زبان اور لغت کے مطابق خطبہ دیا جائے‘ یہ آیت کریمہ ہے:

﴿ وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِۦ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ﴾ (ابراهيم: ١٤/ ٤)

’’اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اپنی قوم کی زبان بولتا تھا تاکہ انہیں (اللہ کے احکام) کھول کھول کر بتادے۔‘‘

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ وسیلۂ بیان وہ زبان ہونی چاہیے جسے مخاطب سمجھتے ہوں۔

کیا جمعہ کے دن غسل کا حکم صرف مردوں کے ساتھ خاص ہے؟

سوال کیا جمعہ کے دن غسل کرنے اور زیب و زینت اختیار کرنے کا حکم مردوں اور عورتوں سب کے لیے ہے؟ جمعہ سے ایک یا دو دن پہلے غسل کر لینے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب یہ احکام مرد کے لیے خاص ہیں کیونکہ جمعہ میں اُسے حاضر ہونا ہے اور اسی سے جمعہ کے دن زیب و زینت کا مطالبہ ہے' یہ احکام عورتوں کے لیے نہیں ہیں لیکن ہر انسان کے لیے واجب ہے کہ وہ جب اپنے بدن پر میل کچیل دیکھے' تو اسے صاف کرے۔ صفائی و ستھرائی کا اختیار کرنا ان مستحسن امور میں سے ہے جنہیں کبھی بھی ترک نہیں کرنا چاہیے۔ جمعہ کے دن سے ایک دن یا دو دن پہلے غسل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اس سلسلہ میں وارد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ غسل جمعہ کے دن کرنا چاہیے اور اس سے مراد طلوع فجر سے لے کر نماز جمعہ تک کا وقت ہے' لہٰذا اسی وقت میں غسل کرنا مطلوب ہے۔ ایک یا دو دن پہلے کیا ہوا غسل جمعہ کے لیے غسل شمار نہ ہوگا۔

خطبہ جمعہ سننا واجب اور اذان کا جواب دینا سنت ہے

سوال انسان جمعہ کے دن مسجد میں اس وقت داخل ہو جب مؤذن دوسری اذان دے رہا ہو تو کیا وہ تحیۃ المسجد پڑھے یا مؤذن کا جواب دے؟

جواب اہل علم نے ذکر کیا ہے کہ جب انسان مسجد میں جمعہ کے دن اس وقت داخل ہو جب مؤذن دوسری اذان دے رہا ہو' تو وہ تحیۃ المسجد پڑھے اور مؤذن کا جواب دینے میں مشغول نہ ہو تاکہ وہ خطبہ سننے کے لیے فارغ ہو جائے کیونکہ خطبہ کا سننا واجب ہے اور مؤذن کی اذان کا جواب دینا سنت ہے اور سنت واجب کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

جمعہ کے دن صفوں کو پھلانگنا جائز نہیں

سوال جو شخص جمعہ کے دن صفوں کو پھلانگے' اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب واجب ہے کہ خطبہ کے دوران میں صفوں سے گزرنے والوں کو بٹھا دیا جائے' البتہ بات نہ کی جائے بلکہ کپڑا کھینچ کر یا اشارے کے ساتھ انہیں بٹھایا جائے اور افضل یہ ہے کہ یہ کام خود خطیب کرے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ جب آپ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے' تو آپ نے دیکھا کہ ایک شخص لوگوں کی گردنوں کو پھلانگ رہا تھا تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا:

«اِجْلِسْ فَقَدْ آذَیْتَ وَآنَیْتَ»(سنن ابن ماجه، إقامة الصلاة، باب ماجاء في النهي عن تخطي الناس يوم الجمعة، ح: ١١١٥، مسند أحمد: ١٨٨/٤)

’’بیٹھ جاؤ تم ایذا پہنچا رہے ہو اور دیر سے آئے ہو۔‘‘

جب امام خطبہ دے رہا ہو تو سلام کہنے اور جواب دینے کا کیا حکم ہے؟

سوال جب امام خطبہ دے رہا ہو تو سلام کہنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور سلام کا جواب دینے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب انسان جب آئے اور امام خطبہ دے رہا ہو تو وہ ہلکی پھلکی دو رکعتیں پڑھ کر بیٹھ جائے اور کسی کو سلام نہ کہے۔ اس حال میں لوگوں کو سلام کہنا حرام ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِكَ أَنْصِتْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَالإِمَامُ يَخْطُبُ فَقَدْ لَغَوْتَ»(صحيح البخاري، الجمعة، باب الإنصات يوم الجمعة والإمام يخطب، ح:٩٣٤، وصحيح مسلم، الجمعة، باب في الإنصات يوم الجمعة في الخطبة، ح:٨٥١(١١) واللفظ لمسلم)

"جب جمعہ کے دن دوران خطبہ میں تم اپنے ساتھی سے یہ کہو کہ خاموش ہو جاؤ تو بھی تم نے لغو کام کیا۔"

اسی طرح آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

«وَمَنْ مَسَّ الْحَصٰى فَقَدْ لَغَا»(سنن أبي داود، الصلاة، باب فضل الجمعة، ح:١٠٥٠، وجامع الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في الوضوء يوم الجمعة، ح:٤٩٨)

"جس نے کنکری کو چھوا' اس نے لغو کام کیا۔"

اس لغو کام سے جمعے کا ثواب ختم بھی ہو سکتا ہے' اسی لیے حدیث میں آیا ہے:

«وَمَنْ لَغَا فَلَيْسَ لَهُ فِي جُمُعَتِهِ تِلْكَ شَيْءٌ»(سنن أبي داود، الصلاة، باب فضل الجمعة، ح:١٠٥١)

"جس نے لغو کام کیا' اسے اس جمعہ سے کچھ نہیں ملے گا۔"

اگر کوئی تمھیں سلام کہے تو تم الفاظ کے ساتھ اس کا جواب نہ دو یعنی اسے وعلیک السلام نہ کہو' خواہ اس نے تمھیں السلام علیک کے الفاظ کہے ہوں' البتہ مصافحہ کرنے میں کوئی حرج نہیں اگرچہ زیادہ بہتر ہے کہ مصافحہ بھی نہ کیا جائے۔ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ وہ سلام کا جواب دے سکتا ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اسے سلام کا جواب نہیں دینا چاہیے کیونکہ خطبہ سننے کا وجوب سلام کا جواب دینے کے وجوب سے مقدم ہے' پھر کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس حالت میں سلام کہے کیونکہ یہ لوگوں کو خطبہ سننے سے دوسری طرف مشغول کر دے گا اور خطبہ سننا واجب ہے' لہٰذا صحیح بات یہ ہے کہ جب امام خطبہ دے رہا ہو تو نہ سلام کہنا چاہیے اور نہ سلام کا جواب دینا چاہیے۔①

---

① حضرت الشیخ رحمہ اللہ کی اس رائے سے اتفاق ممکن نہیں' اس لیے کہ دل میں سلام کا جواب دینے سے خطبے کے سماع میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ البتہ بالجہر جواب دینا سماع میں خلل کا باعث ہے' اس لیے بالجہر تو یقیناً ناجائز ہوگا' لیکن آہستگی سے جواب دینے میں ممانعت کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ واللہ اعلم. (ص ی)

نماز عید اور اس کے مسائل

سوال عید کے دن مبارک باد دینے کے بارے میں کیا حکم ہے، کیا مبارک باد دینے کے لیے کوئی مخصوص الفاظ ہیں؟

جواب عید کی مبارک باد دینا جائز ہے لیکن اس کے لیے کوئی مخصوص الفاظ نہیں ہیں۔ لوگوں کا جو بھی معمول ہو وہ جائز ہے بشرطیکہ گناہ نہ ہو۔

سوال نماز عید کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب میری رائے میں نماز عید فرض عین ہے، لہٰذا مردوں کو نماز عید قطعاً نہیں چھوڑنی چاہیے بلکہ ضرور ادا کرنی چاہیے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے بلکہ آپ نے پردہ نشین عورتوں کو بھی نماز عید کے لیے باہر نکلنے کا حکم دیا ہے بلکہ آپ نے حائضہ عورتوں کو بھی (عید کی دعا میں شرکت کے لیے) نکلنے کا حکم دیا ہے، البتہ وہ عید گاہ سے الگ تھلک رہیں گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز عید کی بہت زیادہ تاکید ہے۔ میں نے جو یہ کہا ہے کہ نماز عید فرض عین ہے تو یہی قول راجح ہے اور اسی کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اختیار فرمایا ہے۔ لیکن یہ نماز جمعہ کی طرح ہے، جب فوت ہو جائے، تو اس کی قضا ادا نہیں کی جائے گی کیونکہ وجوب قضا کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس کے بدلے کوئی نماز نہ پڑھی جائے، البتہ نماز جمعہ جب فوت ہو جائے تو اس کے بدلے میں نماز ظہر ادا کرنا واجب ہے کیونکہ وہ نماز ظہر کا وقت ہوتا ہے لیکن نماز عید کے فوت ہو جانے کی صورت میں اس کی قضا نہیں ہے۔

میری مسلمان بھائیوں کو نصیحت یہ ہے کہ وہ اللہ عزوجل سے ڈریں اور اس نماز کو قائم کریں جو خیر اور دعا پر مشتمل ہے اور اس نماز کے موقع پر لوگوں سے ملنے اور الفت و محبت سے پیش آنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ اگر لوگوں کو لہو و لعب پر مبنی کسی اجتماع کی طرف دعوت دی جائے، تو وہ اس میں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ شرکت کریں گے، جب کہ اس نماز میں شرکت کی دعوت تو خود رسول اکرم ﷺ نے دی ہے اور اس سے انھیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے وہ اجر و ثواب بھی ملتا ہے جس کا اس نے وعدہ فرمایا ہے۔ عورتوں کے لیے واجب ہے کہ وہ جب اس نماز کے لیے آئیں، تو مردوں کی جگہ سے دور رہیں، مردوں سے دور مسجد کے کسی کنارے میں چلی جائیں اور وہ زیب و زینت اور خوشبو کا استعمال نہ کریں اور اظہار حسن و جمال بھی نہ کریں۔ نبی ﷺ نے جب عورتوں کو عید کے لیے نکلنے کا حکم دیا تو انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! جب ہم میں سے کسی کے پاس اوڑھنی نہ ہو تو وہ کیا کرے! آپ نے فرمایا:

«لِتُلْبِسْهَا أُخْتُهَا مِنْ جِلْبَابِهَا»(صحيح البخاري، الحيض، باب شهود الحائض العيدين ودعوة المسلمين ... ح:٣٢٤ وصحيح مسلم، صلاة العيدين، باب ذكر إباحة خروج النساء في العيدين، ح:٨٩٠(١٢) واللفظ له)

’’اس کی بہن اسے اپنی اوڑھنی پہنا دے۔‘‘

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کو پردے کے اہتمام کے ساتھ عید گاہ میں جانا چاہیے کیونکہ جب رسول اللہ ﷺ سے یہ پوچھا گیا کہ جب کسی عورت کے پاس جلباب نہ ہو تو آپ نے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ وہ مقدور بھر پردے کے ساتھ نکلے بلکہ آپ نے یہ فرمایا: ’’اس کی بہن اسے اپنا جلباب پہنا دے۔‘‘

نماز عید پڑھانے والے امام کو چاہیے کہ مردوں کو خطبہ دینے کے بعد عورتوں کو بھی بطور خاص خطبہ دے، جب کہ انھوں نے

مردوں کا خطبہ نہ سنا ہو اور اگر انھوں نے مردوں کا خطبہ سن لیا ہو تو ان کے لیے بھی وہی خطبہ کافی ہے، البتہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس صورت میں خطبہ کے آخر میں عورتوں سے متعلق خاص احکام بیان کیے جائیں اور انہیں وعظ ونصیحت کی جائے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے عید کے موقع پر مردوں سے خطاب فرمانے کے بعد عورتوں کی طرف توجہ مبذول فرمائی تھی اور انہیں بھی وعظ ونصیحت فرمائی تھی۔

سوال ایک شہر میں نماز عید کے مختلف اجتماعات کے بارے میں کیا حکم ہے؟ فتویٰ عطا فرمائیں، اللہ تعالیٰ آپ کو اجر وثواب سے نوازے۔

جواب اگر ضرورت وحاجت کی وجہ سے ایسا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ بوقت ضرورت وحاجت جمعہ کے متعدد اجتماعات جائز ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَيۡكُمۡ فِي ٱلدِّينِ مِنۡ حَرَجٖۚ ﴾ (الحج: ۲۲/۷۸)

''اور اس (اللہ) نے تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی۔''

اگر مختلف اجتماعات کی اجازت نہ ہو تو بہت سے لوگ جمعہ وعید میں شرکت سے محروم رہ جائیں گے۔

نماز عید کیلئے حاجت کی مثال یہ ہے کہ شہر بہت بڑا ہو اور ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف جانے میں لوگوں کو بہت دشواری ہو تو اس صورت میں متعدد اجتماعات جائز ہیں اور اگر ایسی کوئی ضرورت وحاجت نہ ہو تو ایک ہی جگہ نماز عید ادا کرنی چاہیے۔

سوال نماز عیدین کے ادا کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

جواب نماز عیدین کے ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ امام آئے اور لوگوں کو دو رکعتیں پڑھائے۔ پہلی رکعت میں تکبیر تحریمہ کے بعد چھ تکبیریں اور کہے، پھر فاتحہ پڑھے اور سورت قٓ پڑھے اور دوسری رکعت میں تکبیر کہتے ہوئے کھڑا ہو اور کھڑا ہو کر پانچ تکبیریں پڑھے، پھر سورہ فاتحہ اور سورت قمر پڑھے۔ نبی ﷺ عیدین میں ان دونوں سورتوں کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ اگر چاہے تو پہلی رکعت میں سورت اعلیٰ، اور دوسری میں سورت غاشیہ پڑھ لے۔ جمعہ وعیدین دو سورتوں میں مشترک اور دو سورتوں میں مختلف ہیں، سورت اعلیٰ اور سورت غاشیہ میں مشترک اور سورت قٓ اور قمر میں مختلف ہیں۔ جمعہ میں آپ سورت جمعہ اور منافقون بھی پڑھا کرتے تھے۔ امام کو چاہیے کہ وہ ان سورتوں کی تلاوت کر کے سنت کو زندہ کرے تاکہ مسلمانوں کو اس سنت کا علم ہو جائے اور ان کی قراءت میں وہ اجنبیت محسوس نہ کریں۔ نماز کے بعد امام خطبہ دے، خطبہ کا کچھ حصہ عورتوں کے لیے خاص کر دے۔ انھیں وہ احکام بتائے جو انھیں بجالانے چاہییں اور ان کاموں سے منع کرے جن سے انھیں اجتناب کرنا چاہیے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کا معمول تھا۔

سوال عید کے دن بعض شہروں میں امام لاؤڈ سپیکر میں تکبیریں پڑھتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ نمازی بھی تکبیریں پڑھتے ہیں، تو اس عمل کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب تکبیریں پڑھنے کی یہ صورت جو سائل نے بیان کی ہے، نبی ﷺ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں ہے۔ سنت یہ ہے کہ ہر انسان اپنے طور پر تکبیریں پڑھے۔

سوال عید کے لیے تکبیریں کب شروع کی جائیں، نیز تکبیروں کے الفاظ کیا ہیں؟

جواب تکبیریں رمضان کے آخری دن کے غروب آفتاب کے وقت سے شروع کر کے امام کے نماز عید پڑھانے کے لیے آمد تک پڑھی جائیں۔ تکبیر کے الفاظ یہ ہیں:

«اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللّٰهُ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ»(المصنف، لابن أبي شيبة: ١/ ٤٩٠، ح: ٥٦٥٢)

یا اس طرح کہہ لے:

«اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللّٰهُ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ»(المصنف، لابن أبي شيبة: ١/ ٤٨٨، ح: ٥٦٣٢ ونيل الأوطار: ٣/ ٣٥٨)

یعنی تکبیر کے الفاظ تین مرتبہ یا دو مرتبہ کہے، دونوں طرح جائز ہے۔ اس شعار کا نمایاں طور پر اظہار ہونا چاہیے اور مردوں کو چاہیے کہ وہ بازاروں، مسجدوں اور گھروں میں بلند آواز سے تکبیریں کہیں اور عورتوں کے حق میں افضل یہ ہے کہ وہ آہستہ تکبیریں کہیں۔

نمازِ کسوف وخسوف کے احکام کیا ہیں؟

سوال نماز کسوف وخسوف کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جمہور اہل علم کے نزدیک نماز کسوف وخسوف سنت مؤکدہ ہے، واجب نہیں ہے۔ بے شک نبی ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے۔ آپ نے گھبراہٹ و بے چینی کے ساتھ اس نماز کو ادا فرمایا اور دیگر نمازوں کے برعکس اس نماز کو بہت لمبا ادا فرمایا ہے۔ بعض اہل علم نے اسے واجب عین یا واجب کفایہ قرار دیا ہے اور انہوں نے استدلال یہ کیا ہے کہ نبی ﷺ نے اس نماز کا حکم دیا ہے اور امر وجوب کے لیے ہوتا ہے نیز ایسے قرائن وشواہد بھی ہیں جو اس نماز کی اہمیت کی دلیل ہیں اور اس لیے بھی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی ایسی سزا سے ڈرانا ہے جس کے اسباب موجود ہوتے ہیں، لہٰذا بندوں پر واجب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس سزا کی وجہ سے الحاح وزاری کریں جس کے اسباب موجود ہیں اور جس سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈرا رہا ہے۔

بلاشبہ نقلی اور عقلی دلیل کے اعتبار سے یہ قول قوی ہے، لہٰذا کم سے کم یہ نماز فرض کفایہ ضرور ہے، ہماری اس بارے میں یہی رائے ہے۔ جمہور کے پاس اس کے عدم وجوب کی کوئی دلیل نہیں ہے، سوائے اس کے کہ نبی ﷺ سے جب ایک شخص نے سوال کیا کہ کیا مجھ پر نماز پنجگانہ کے سوا اور بھی کوئی نماز فرض ہے؟ تو آپ نے فرمایا تھا کہ نہیں الا یہ کہ تم نفل نماز ادا کرو۔ ① لیکن یہ فرمان ان پانچ نمازوں کے سوا دیگر کے وجوب کی نفی نہیں کرتا، خصوصاً جب کہ اس کے وجوب کا کوئی سبب موجود ہو۔ آپ کے اس فرمان، کہ ان کے سوا اور کوئی نماز فرض نہیں، سے مراد یہ ہے کہ ان فرض نمازوں کے سوا جو دن رات میں پانچ بار پڑھی جاتی ہیں اور کوئی نماز فرض نہیں ہے، اس سے یہ مراد نہیں کہ جو نماز کسی سبب کے ساتھ معلق ہو وہ بھی فرض نہیں۔

خلاصہ یہ کہ ہماری رائے میں نماز کسوف واجب عین یا واجب کفایہ ہے۔

---

① صحيح البخاري، الإيمان، باب الزكاة من الإسلام، حديث: 46

اگر نمازِ خسوف کی ایک رکعت رہ جائے تو......؟

سوال جس شخص کی نماز خسوف کی ایک رکعت فوت ہوگئی ہو تو وہ اس کی قضا کس طرح ادا کرے؟

جواب جس شخص کی نماز خسوف کی ایک رکعت رہ گئی ہو تو اس کی قضا ادا کرنے کا طریقہ نبی ﷺ سے ثابت ہے۔ آپ نے فرمایا:

«إِذَا سَمِعْتُمُ الإِقَامَةَ فَامْشُوْا إِلَى الصَّلاَةِ وَعَلَيْكُمْ بِالسَّكِيْنَةِ وَالْوَقَارِ، وَلاَ تُسْرِعُوْا، فَمَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوا، وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوا»(صحيح البخاري، الاذان، باب لا يسعى إلى الصلاة ... ح:٦٣٦، وصحيح مسلم، المساجد، باب استحباب إتيان الصلاة بوقار وسكينة، ح:٦٠٢)

''جب تم اقامت سنو تو نماز کے لیے چلو' سکون و وقار اختیار کرو اور تیز تیز نہ چلو۔ نماز کا جتنا حصہ پالو پڑھ لو اور جتنا حصہ فوت ہو گیا ہو تو اسے پورا کرلو۔''

لہٰذا جس شخص کی نماز خسوف کی ایک رکعت رہ گئی ہو' وہ اسے اسی طرح پورا کرے' جس طرح امام نے اسے پڑھا تھا کیونکہ نبی ﷺ کے فرمان ''اسے پورا کرلو'' کے عموم کا یہی تقاضا ہے۔ یہاں ایک اور سوال بھی ہے جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو بہت اشکال پیش آتے ہیں اور وہ یہ کہ پہلا رکوع فوت ہوگیا ہو تو وہ کیا کرے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس کا رکوع اول فوت ہو گیا ہو تو اس کی رکعت فوت ہوگی' لہٰذا امام کے سلام پھیرنے کے بعد اسے یہ رکعت پڑھنا ہوگی کیونکہ نبی ﷺ کے فرمان ''اور جتنا حصہ فوت ہو گیا ہو تو اسے پورا کرلو'' کے عموم کا یہی تقاضا ہے۔

نمازِ استسقا اور اس میں چادر بدلنے کا حکم

سوال کیا نماز استسقا کے بعد دعا کے درمیان چادر کو اس وقت بدلنا ہے جب دعا کے لیے کھڑا ہونا ہے یا گھر سے نکلنے سے پہلے بدلنا ہے۔ نیز چادر کے بدلنے میں حکمت کیا ہے۔ راہنمائی فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمائے۔

جواب خطبہ کے دوران میں بارش کی دعا کے وقت چادر کو بدلنا ہے جیسا کہ اہل علم نے ذکر کیا ہے اور اس میں حکمت یہ ہے کہ اس سے تین فوائد کا حصول مقصود ہے: ① نبیٔ اکرم ﷺ کی اقتدا۔ ② اللہ عزوجل سے امید کہ وہ اسی طرح قحط کو بھی سرسبزی و شادابی سے بدل دے گا۔ ③ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ بندہ جو اپنے رب تعالیٰ سے دور ہو کر گناہوں میں مبتلا ہو گیا ہے' اب اپنی حالت کو تبدیل کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے گا' اور اس کی اطاعت و بندگی کو اختیار کرے گا' اس لیے کہ تقویٰ معنوی لباس ہے اور چادر حسی لباس ہے گویا وہ حسی لباس کو بدل کر معنوی لباس کی تبدیلی کو اختیار کر رہا ہے اور یہ ایک عمدہ مناسبت ہے۔

دعا سے بے اعتنائی نہیں کرنی چاہیے

سوال بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر تم بارش کی دعا نہ بھی کرو' تو بارش نازل ہو جائے گی' اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب میں یہ کہتا ہوں کہ اس بات کے کہنے والے کے بارے میں مجھے بہت زیادہ خطرہ محسوس ہوتا ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِىٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (الغافر: ٤٠/ ٦٠)

’’اور تمھارے پروردگار نے فرمایا ہے کہ تم مجھ سے دعا کرو' میں تمہاری (دعا) قبول کروں گا۔‘‘

اللہ سبحانہ وتعالیٰ حکیم ہے اور کبھی وہ اس حکمت ومصلحت کے پیش نظر بارش کو مؤخر کر دیتا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ وہ اس کے کس قدر شدید محتاج ہیں اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی ملجأ اور ماویٰ نہیں ہے۔ ان حالات میں وہ لوگوں کی دعا کو بارش کے نازل ہونے کا سبب بنا دیتا ہے اور اگر لوگوں کی دعا کے باوجود بارش نہ ہو تو اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی حکمت ومصلحت ہوتی ہے کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی زیادہ علم والا' زیادہ حکمت والا اور اپنے بندوں پر اس قدر رحم فرمانے والا ہے کہ وہ خود بھی اپنے اوپر اس طرح رحم نہیں کر سکتے۔ بسا اوقات انسان بہت دعا کرتا ہے مگر وہ قبول نہیں ہوتی' وہ پھر دعا کرتا ہے اور وہ قبول نہیں ہوتی اور وہ پھر دعا کرتا ہے اور وہ قبول نہیں ہوتی اور نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«يُسْتَجَابُ لأَحَدِكُمْ مَا لَمْ يَعْجَلْ، يَقُوْلُ: دَعَوْتُ فَلَمْ يُسْتَجَبْ لِي»(صحيح البخاري، الدعوات، باب يستجاب للعبد مالم يعجل، ح:٦٣٤٠، وصحيح مسلم، الذكر والدعاء، باب بيان أنه يستجاب للداعي ما لم يعجل . . . ح:٢٧٣٥)

’’تم میں سے ایک شخص کی دعا کو قبول کیا جاتا ہے' جب تک وہ جلدی نہ کرے (جلدی کا مفہوم یہ ہے) کہ وہ کہے کہ میں نے دعا تو کی تھی مگر میری دعا قبول نہیں ہوئی۔‘‘

اس صورت میں وہ اکتا کر دعا ہی کو ترک کر دیتا ہے۔ والعیاذ باللہ! حالانکہ انسان جب دعا کرتا ہے تو اسے ایک ایک لفظ کا اجر وثواب ملتا ہے کیونکہ دعا کرنا تو عبادت ہے' لہٰذا دعا کرنے والا ہر حال میں فائدے میں ہے بلکہ حدیث میں ہے' نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے دعا کی' اسے تین باتوں میں سے ایک ضرور حاصل ہو جائے گی: ① اس کی دعا قبول ہو جائے گی یا ② اس سے کوئی بہت بڑی مصیبت دور کر دی جائے گی یا ③ اسے قیامت کے دن کے لیے ذخیرہ کر لیا جائے گا۔① میں اپنے اس بھائی کو جس نے یہ الفاظ کہے ہیں کہ اگر تم بارش کی دعا نہ بھی کرو تو بارش نازل ہو جائے گی' یہ نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرے کیونکہ یہ بہت بڑا گناہ ہے (اور) اللہ تعالیٰ کے حکم توبہ کے صریح خلاف اور اس کی دشمنی ہے۔

کوئی شخص اپنے دفن ہونے کی جگہ کے متعلق وصیت کرے تو......؟

سوال جو شخص یہ وصیت کرے کہ اس کے فوت ہو جانے کے بعد اسے فلاں جگہ دفن کیا جائے تو کیا اس کی وصیت پر عمل کیا جائے؟

جواب پہلی بات یہ ہے کہ اس سے یہ ضرور پوچھا جائے کہ اس نے اس جگہ کا انتخاب کیوں کیا ہے' اس نے شاید اس جگہ کا اس لیے انتخاب کیا ہو کہ وہاں کوئی فرضی اور جھوٹی قبر ہو یا کوئی ایسی قبر ہو جس پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک ہوتا ہو یا اس کی وصیت کا اسی طرح کا کوئی اور حرام سبب ہو تو اس صورت میں ایسی وصیت کے مطابق عمل جائز نہیں ہے' لہٰذا اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا بشرطیکہ وہ خود بھی مسلمان ہو۔ اگر اس نے اس طرح کی غرض کے سوا کسی اور غرض سے وصیت کی ہے' مثلاً یہ کہ اسے اس شہر میں دفن

---

① جامع الترمذي' الدعوات' باب في انتظار الفَرَج وغير ذالك' حديث: 3573۔

کیا جائے جس میں اس نے زندگی بسر کی ہے تو اس صورت میں وصیت کے مطابق عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس میں مال کا ضیاع نہ ہو یعنی اگر ایسا کرنے میں بہت سا مال خرچ کرنا پڑتا ہو تو بھی اس کی وصیت کے مطابق عمل نہ کیا جائے کیونکہ اگر زمین مسلمانوں کی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی ساری ہی زمین ایک جیسی ہے۔

''لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه'' کی تلقین کب کی جائے؟

سوال تلقین کا وقت کون سا ہے؟

جواب تلقین موت کے وقت کی جائے یعنی جب انسان موت وحیات کی آخری کشمکش میں مبتلا ہو تو اسے ''لا الـه الا الـلـه'' کی تلقین کی جائے جیسا کہ نبی ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب کی موت کے وقت' اس کے پاس تشریف لا کر فرمایا تھا:

«يَاعَمِّ! قُلْ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ كَلِمَةً أَشْهَدُ لَكَ بِهَا عِنْدَ اللهِ »(صحيح البخاري، الجنائز، باب إذا قال المشرك عند الموت لا إله إلا الله، ح:١٣٦٠، وصحيح مسلم، الإيمان، باب الدليل على صحة إسلام من حضره الموت ... ح:٢٤)

''اے چچا! لا الٰہ الا اللہ کہہ دو' یہ ایک ایسا کلمہ ہے کہ اس کی وجہ سے میں اللہ کے ہاں تمھارے بارے میں گواہی دے سکوں گا۔''

لیکن آپ کے چچا ابو طالب نے' والعیاذ باللہ' یہ کلمہ نہ کہا اور وہ مشرک ہی فوت ہو گیا۔

دفن کے بعد تلقین بدعت ہے کیونکہ اس کے بارے میں نبی ﷺ سے حدیث ثابت نہیں ہے' لہٰذا اس کے بجائے وہ کام کرنے چاہییں جنھیں امام ابوداود نے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ جب کسی میت کے دفن کرنے سے فارغ ہوتے تو آپ اس کی قبر پر کھڑے ہو جاتے اور فرماتے:

«اِسْتَغْفِرُوا لِأَخِيكُمْ وَاسْأَلُوا لَهُ بِالتَّثْبِيتِ فَإِنَّهُ الآنَ يُسْأَلُ»(سنن أبي داود، الجنائز، باب الاستغفار عند القبر للميت في وقت الإنصراف، ح:٣٢٢١)

''اپنے بھائی کے لیے استغفار کرو اور اس کی ثابت قدمی کے لیے دعا کرو کہ اس سے اب سوال کیا جا رہا ہے۔''

رہا قبر کے پاس قرآن مجید پڑھنا یا میت کو قبر میں تلقین کرنا' تو وہ بدعت اور بے اصل ہے۔

کیا رشتہ داروں کے انتظار کی وجہ سے تدفین میں تاخیر جائز ہے؟

سوال دور دراز کے مقامات سے بعض رشتہ داروں کے آنے کی وجہ سے میت کے دفن میں تاخیر کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب حکم شریعت یہ ہے کہ میت کی تجہیز وتکفین اور تدفین میں جلدی کی جائے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«أَسْرِعُوا بِالْجَنَازَةِ، فَإِنْ تَكُ صَالِحَةً فَخَيْرٌ تُقَدِّمُونَهَا إِلَيْهِ، وَإِنْ تَكُ سِوَى ذٰلِكَ فَشَرٌّ تَضَعُونَهُ عَنْ رِقَابِكُمْ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب السرعة في الجنازة، ح:١٣١٥، وصحيح مسلم، الجنائز، باب السرعة في الجنازة، ح:٩٤٤)

’’جنازہ میں جلدی کرو۔ میت اگر نیک ہے تو تم اسے خیر کی طرف لے جا رہے ہو اور میت اگر اس کے سوا کچھ اور ہے تو تم شر کو اپنی گردنوں سے اتار رہے ہو۔‘‘

بعض اہل خانہ کی حاضری کی وجہ سے میت کی تدفین میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے البتہ چند گھنٹے انتظار کیا جا سکتا ہے ورنہ افضل یہی ہے کہ اس کی تدفین جلد عمل میں لائی جائے۔ اہل خانہ اگر تاخیر سے پہنچیں تو ان کے لیے جائز ہے کہ وہ اس کی قبر پر نماز جنازہ پڑھ لیں جیسا کہ نبی ﷺ نے مسجد میں جھاڑو دینے والے اس مرد یا عورت کی قبر پر نماز جنازہ پڑھی تھی‘ جسے دفن کر دیا گیا تھا اور نبی ﷺ کو اس کے بارے میں اطلاع نہیں دی گئی تو آپ نے فرمایا:

«دُلُّوْنِي عَلٰی قَبْرِهٖ»(صحیح البخاري، الجنائز، باب الصلاة علی القبر بعد ما یدفن، ح:١٣٣٧، وصحیح مسلم، الجنائز، باب الصلاة علی القبر، ح:٩٥٦ واللفظ له)

’’مجھے اس کی قبر بتاؤ۔‘‘

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کو بتایا تو آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔

نماز جنازہ میں شرکت کے لیے رشتہ داروں اور دوستوں کو اطلاع دینا جائز ہے

سوال رشتہ داروں اور دوستوں کو کسی شخص کی وفات کی خبر دینا تاکہ وہ اس کی نماز جنازہ میں شرکت کر سکیں‘ کیا یہ ممنوع ہے یا مباح؟

جواب یہ خبر دینا جائز ہے‘ اس لیے کہ نبی ﷺ نے نجاشی کی وفات کی اس دن خبر دی تھی جس دن وہ فوت ہوئے تھے۔① اور نبی ﷺ نے اس عورت کے بارے میں‘ جسے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے دفن کر دیا تھا اور آپ کو اس کے بارے میں خبر نہیں دی‘ فرمایا تھا:

«أَفَلَا كُنْتُمْ آذَنْتُمُوْنِي . . . »(صحیح مسلم، الجنائز، باب الصلاة علي القبر، ح:٩٥٦)

’’تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟‘‘

لہٰذا ایک شخص کی موت کی خبر دینے میں کوئی حرج نہیں تاکہ اس کی نماز جنازہ میں زیادہ لوگ شریک ہو سکیں کیونکہ ایسا سنت سے ثابت ہے۔ اسی طرح اہل خانہ اور رشتہ داروں کو اطلاع دینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

میت کو غسل دینے کا شرعی طریقہ

سوال حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے ثابت میت کے غسل کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب میت کے غسل کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ انسان میت کی شرم گاہ کو دھوئے اور پھر اسے غسل دینا شروع کرے۔ اعضائے وضو سے شروع کرے اور اسے وضو کرائے لیکن اس کے منہ اور ناک میں پانی داخل نہ کرے بلکہ کپڑے کے ایک ٹکڑے کو گیلا کر کے اس کے ساتھ اس کے ناک اور منہ کو صاف کرے‘ پھر اس کے باقی جسم کو غسل دے اور پانی میں بیری کے پتے شامل کر کے غسل دے۔ بیری کے پتے کوٹ کر پانی میں ڈال دے اور انہیں ہاتھ کے ساتھ ملے تاکہ جھاگ پیدا ہو جائے‘ اس جھاگ کے ساتھ اس کے سر اور

---

① صحیح البخاری‘ الجنائز‘ باب الرجل ینعی إلی أهل المیت‘ حدیث:1245

داڑھی کو دھویا جائے اور باقی پانی کے ساتھ باقی سارے جسم کو دھویا جائے کیونکہ اس طرح اس کا جسم بہت زیادہ صاف ہو جائے گا۔ غسل کے آخر میں کافور بھی استعمال کیا جائے۔ کافور مشہور خوشبو ہے' علماء نے لکھا ہے کہ اس کے فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ یہ جسم کو سخت کر دیتی ہے اور کیڑوں مکوڑوں کو دور بھگاتی ہے۔

میت کو اگر زیادہ میل کچیل لگا ہو تو اسے زیادہ بار بھی غسل دیا جا سکتا ہے کیونکہ نبی ﷺ نے ان خواتین سے فرمایا تھا جنھوں نے آپ کی بیٹی زینب رضی اللہ عنہا کو غسل دیا تھا:

«اِغْسِلْنَهَا ثَلَاثًا، أَوْ خَمْسًا، أَوْ أَكْثَرَ مِنْ ذَلِكَ إِنْ رَأَيْتُنَّ ذَلِكَ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب غسل الميت . . . ح:١٢٥٣)

''اسے تین بار یا پانچ بار غسل دو یا اگر ضرورت محسوس کرو تو اس سے بھی زیادہ بار غسل دو۔''

اس کے بعد میت کو صاف کر کے کفن پہنا دیا جائے۔

سوال کبھی کبھی گاڑیوں کے حادثات یا آگ سے جلنے کے واقعات یا اونچی جگہ سے گر کر مر جانے کی صورتوں میں انسان کے اجزا تلف یا گم ہو جاتے ہیں یا بعض اوقات صرف ہاتھ یا سر کے کچھ ٹکڑے مل جاتے ہیں' تو کیا ان اجزا پر بھی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ اور کیا انہیں بھی غسل دیا جائے گا؟

جواب جب ہاتھ یا پاؤں کے ٹکڑے ملیں اور جس کے جسم کے یہ ٹکڑے ہوں' اس کی پہلے نماز جنازہ پڑھی جا چکی ہو تو پھر ان ٹکڑوں کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی' مثلاً: اگر ہم نے ایک شخص کی نماز جنازہ پڑھی اور اسے دفن کر دیا لیکن پاؤں کے بغیر' اور بعد میں' ہمیں اس کا پاؤں بھی مل گیا تو اس پاؤں کو دفن کر دیا جائے گا اور اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی کیونکہ اس میت کا جنازہ تو پہلے پڑھا جا چکا ہے۔

اگر میت کا سارا جسم نہ ملے اور اس کے اعضا میں سے صرف اس کا سر یا پاؤں یا ہاتھ مل جائے اور باقی جسم نہ ملے تو اس موجود عضو یا اعضا ہی کو غسل دے کر کفن پہنا دیا جائے گا اور پھر نماز جنازہ پڑھ کر اسے دفن کر دیا جائے گا۔

چار ماہ بعد ساقط ہونے والے بچے کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی

سوال ایک عورت نے چھٹے مہینے اپنے حمل کو گرا دیا۔ یہ عورت بہت محنت اور مشقت والے کام کرتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ وہ رمضان کے روزے بھی رکھتی تھی' اس لیے وہ محسوس کرتی ہے کہ یہ حمل شائد ان محنت اور مشقت والے کاموں کی وجہ سے ساقط ہوا ہے' بہر حال اسے (بچے کو) دفن کیا گیا لیکن اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی تو اس کی نماز جنازہ کے ترک کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ حمل کے ساقط ہونے کی وجہ سے عورت اپنے دل میں پیدا ہونے والے ان شکوک و شبہات کے ازالے کے لیے کیا کرے؟ راہنمائی فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر و ثواب سے نوازے۔

جواب گرنے والا حمل اگر چار ماہ کا ہو تو واجب ہے کہ اسے غسل دیا جائے' کفن پہنایا جائے اور اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے

کیونکہ وہ جب چار ماہ کا ہو جاتا ہے تو اس میں روح پھونک دی جاتی ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ ہم سے رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا اور بلا شبہ آپ کی ذات گرامی صادق ومصدوق ہے:

«إِنَّ أَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا، ثُمَّ يَكُونُ عَلَقَةً مِّثْلَ ذَلِكَ، ثُمَّ يَكُونُ مُضْغَةً مِّثْلَ ذَلِكَ ثُمَّ يَبْعَثُ اللهُ مَلَكًا ۔ وفيه ۔ ثُمَّ يُنْفَخُ فِيهِ الرُّوحُ»(صحيح البخاري، بدء الخلق، باب ذكر الملائكة، ح:٣٢٠٨ وصحيح مسلم، القدر، باب كيفية خلق الآدمي ... ح:٢٦٤٣)

”تم میں سے ہر ایک کے تخلیقی اجزاء اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک نطفے کی صورت میں جمع رہتے ہیں' پھر وہ چالیس دن تک لوتھڑے کی صورت میں رہتا ہے اور پھر اسی طرح چالیس دن تک بوٹی کی صورت میں ہوتا ہے' پھر اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو بھیجتا ہے' پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔“

یہ کل ایک سو بیس دن یعنی چار ماہ بنتے ہیں' لہٰذا جب حمل اس مدت کے بعد گرے تو اسے غسل دیا جائے گا' کفن پہنایا جائے گا' اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور روز قیامت اسے بھی لوگوں کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

اگر حمل چار ماہ کی مدت سے پہلے ساقط ہو جائے تو پھر اسے نہ غسل دیا جائے گا' نہ کفن پہنایا جائے گا' نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور اسے کسی بھی جگہ دفن کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ گوشت کا ایک ٹکڑا ہے' انسان نہیں ہے۔

سوال میں مذکور حمل چھ ماہ کا تھا' لہٰذا اس کے لیے غسل' کفن اور جنازہ واجب تھا مگر سوال میں مذکور ہے کہ اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی' لہٰذا اگر اس کی قبر معلوم ہو تو قبر ہی پر نماز جنازہ پڑھ لی جائے' ورنہ اس کی نماز جنازہ غائبانہ پڑھ لی جائے اور اس کے لیے صرف ایک آدمی کا نماز جنازہ پڑھنا بھی کافی ہوگا۔

اس کی ماں کے دل میں جو یہ شکوک وشبہات پیدا ہو رہے ہیں کہ وہ اس کی وجہ سے ساقط ہوا ہے' تو ان کا کوئی اثر نہیں۔ اس قسم کے شکوک وشبہات کو دل میں جگہ نہیں دینی چاہیے کیونکہ بہت سے جنین اپنی ماؤں کے پیٹوں میں مر جاتے ہیں' اس کی وجہ سے ماں پر کچھ عائد نہیں ہوتا' لہٰذا اسے ان شکوک اور وساوس کو ترک کر دینا چاہیے جنھوں نے اس کی زندگی کو مکدر کر رکھا ہے۔ واللہ اعلم

نماز جنازہ کا طریقہ

سوال نماز جنازہ کا کیا طریقہ ہے؟

جواب میت اگر مرد ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ میت کو امام کے سامنے رکھا جائے' امام اس کے سر کے قریب کھڑا ہو' مرنے والا خواہ بڑی عمر کا ہو یا چھوٹی عمر کا' امام پہلے تکبیر اولی کہے اور سورۃ الفاتحہ پڑھے ① اور اگر اس کے ساتھ کوئی دوسری چھوٹی سورہ بھی پڑھ لے تو کوئی حرج نہیں بلکہ بعض اہل علم کا مذہب یہ ہے کہ یہ سنت ہے' پھر دوسری تکبیر کہے اور نبی ﷺ پر یہ درود پڑھے:

«اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ، وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ، وَعَلٰى آلِ

---

① صحيح البخاري' الجنائز' باب قرأة فاتحة الكتاب على الجنازة، حديث:1335۔

إِبْرَاهِيمَ، إِنَّكَ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ، اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ، وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ، وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيمَ، إِنَّكَ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ»(احكام الجنائز: ١٥٥)

’’اے اللہ! تو محمد ﷺ اور آل محمد ﷺ پر رحمت نازل فرما‘ جس طرح تو نے ابراہیم علیہ السلام اور آل ابراہیم علیہ السلام پر رحمت نازل فرمائی‘ بے شک تو ہی مستحق تعریف بزرگ ہے۔ اے اللہ! تو محمد ﷺ اور آل محمد ﷺ پر برکت نازل فرما‘ جس طرح تو نے ابراہیم علیہ السلام اور آل ابراہیم علیہ السلام پر برکت نازل فرمائی‘ بے شک تو ہی مستحق تعریف بزرگ ہے۔‘‘

پھر امام تیسری تکبیر کہے اور وہ دعائیں پڑھے‘ جو نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہیں مثلاً:

«اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا، وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِيرِنَا وَكَبِيرِنَا، وَذَكَرِنَا وَأُنْثَانَا، اَللّٰهُمَّ مَنْ أَحْيَيْتَهُ مِنَّا فَأَحْيِهِ عَلَى الْإِسْلَامِ، وَمَنْ تَوَفَّيْتَهُ مِنَّا فَتَوَفَّهُ عَلَى الْإِيمَانِ، اَللّٰهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا أَجْرَهُ وَلَا تُضِلَّنَا بَعْدَهُ»(سنن ابن ماجه، الجنائز، باب ماجاء في الدعاء في الصلاة على الجنازة، ح: ١٤٩٨)

’’اے اللہ! تو ہمارے زندہ اور مردہ کو‘ حاضر اور غائب کو‘ چھوٹے اور بڑے کو‘ مرد اور عورت کو بخش دے۔ اے اللہ! تو ہم میں سے جس کو زندہ رکھے‘ اسے اسلام پر زندہ رکھنا اور جس کو فوت کرنا اسے ایمان پر فوت کرنا‘ اے اللہ تو ہمیں اس (پر صبر کرنے) کے اجر سے محروم نہ کرنا اور اس (کی وفات) کے بعد ہمیں گمراہ نہ کرنا۔‘‘

پھر یہ دعا پڑھے:

«اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ، وَارْحَمْهُ، وَعَافِهِ، وَاعْفُ عَنْهُ، وَأَكْرِمْ نُزُلَهُ، وَوَسِّعْ مُدْخَلَهُ، وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ، وَنَقِّهِ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الْأَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ»(سنن النسائي، الجنائز، باب الدعاء، ح: ١٩٨٥)

’’اے اللہ! تو اسے معاف فرما دے‘ اس پر رحم فرما‘ اس کو عافیت دے‘ اس سے درگزر فرما اور اس کی اچھی مہمانی فرما اور اس کا ٹھکانا (قبر) کشادہ فرما دے اور اس کو خطاؤں (اور گناہوں) سے پانی‘ برف اور اولوں کے ساتھ ایسے دھو کر پاک صاف کر دے جیسے سفید کپڑے کو میل کچیل سے پاک صاف کر دیا جاتا ہے۔‘‘

علاوہ ازیں دوسری دعائیں بھی پڑھی جا سکتی ہیں جو نبی ﷺ سے ثابت ہیں‘ پھر امام چوتھی تکبیر کہہ دے اور بعض اہل علم نے کہا ہے کہ اس کے بعد یہ دعا پڑھے:

﴿رَبَّنَآ ءَاتِنَا فِي ٱلدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي ٱلْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ ٱلنَّارِ ٢٠١﴾(البقرة: ٢/ ٢٠١)

’’پروردگار ہم کو دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور آخرت میں بھی نعمت عطا فرما اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ فرما۔‘‘

اور اگر پانچویں تکبیر کہہ دے تو کوئی حرج نہیں بلکہ کبھی کبھی پانچویں تکبیر ضرور کہنی چاہیے کیونکہ نبی ﷺ سے یہ ثابت ہے۔ اور جو آپ سے ثابت ہو اسے اسی طرح کرنا چاہیے‘ جیسے آپ سے ثابت ہو‘ لہٰذا کبھی ایک کام کر لیا جائے اور کبھی دوسرا اگرچہ زیادہ تر تو

چار تکبیریں ہی ثابت ہیں۔ چوتھی تکبیر کے بعد دائیں طرف ایک سلام کہہ دے۔ میت اگر عورت ہو تو پھر امام کو اس کے (جنازے کے) درمیان کھڑا ہونا چاہیے اور اس کی نماز جنازہ کا طریقہ اسی طرح ہے جس طرح مرد کی نماز جنازہ کا طریقہ ہے۔

اگر بہت سے جنازے ہوں تو انھیں ترتیب کے ساتھ رکھا جائے اور وہ اس طرح کہ امام کے قریب بالغ مردوں کے جنازے ہوں، پھر لڑکوں کے، پھر بالغ عورتوں کے اور پھر چھوٹی لڑکیوں کے، الغرض انھیں اس طرح ترتیب کے ساتھ رکھا جائے اور ان کے سروں کے حساب سے ترتیب اس طرح رکھی جائے کہ مرد کا سر عورت کے (جنازے کے) درمیان ہو تاکہ امام شرعی طور پر صحیح جگہ کھڑا ہو سکے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ بہت سے عوام میں یہ بات مشہور ہے کہ افضل یہ ہے کہ جنازہ پیش کرنے والے لوگ امام کے ساتھ کھڑے ہوں بلکہ بعض کا تو یہ خیال ہے کہ یہ نہایت ضروری ہے کہ ایک یا دو آدمی امام کے ساتھ کھڑے ہوں حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے کیونکہ امام کے حق میں سنت یہ ہے کہ وہ اکیلا ہی کھڑا ہو، اگر جنازہ پیش کرنے والوں کے لیے پہلی صف میں جگہ نہ ہو تو وہ امام اور پہلی صف کے درمیان میں صف بنالیں۔ ①

تارک نماز کی نماز جنازہ درست نہیں

سوال جو میت تارک نماز ہو یا اس کی نماز ترک کرنے میں شک ہو یا اس کا حال مجہول ہو تو اس کی نماز جنازہ پڑھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا اس کے وارثوں کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اس کی نماز جنازہ کے لیے اہتمام کریں؟

جواب جس شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ بے نماز فوت ہوا ہے تو اس کی نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں ہے اور نہ اس کے اہل خانہ کے لیے یہ حلال ہے کہ وہ اسے مسلمانوں کے سامنے نماز جنازہ کے لیے پیش کریں کیونکہ وہ کافر اور اسلام سے مرتد ہے۔ واجب یہ ہے کہ قبرستان کے علاوہ کسی دوسری جگہ گڑھا کھود کر اسے اس میں پھینک دیا جائے اور اس کی نماز جنازہ نہ پڑھی جائے کیونکہ اس کی کوئی عزت نہیں ہے، عزت کا کیا سوال اسے تو روز قیامت فرعون، ہامان، قارون اور ابی بن خلف جیسے بڑے بڑے کافروں کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

جس مسلمان کا حال معلوم نہ ہو یا مشکوک ہو تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی کیونکہ اصل یہ ہے کہ وہ مسلمان ہے حتی کہ واضح ہو جائے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ اگر کسی میت کے بارے میں انسان کو شک و شبہ ہو تو پھر استثنائی انداز میں دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں مثلاً: وہ اس طرح دعا کرسکتا ہے کہ اے اللہ اگر یہ مومن تھا تو تو اسے معاف کر دے اور اس پر رحم فرما کیونکہ دعا میں استثنا ثابت

---

① امام اور پہلی صف کے درمیان، چند آدمیوں کا الگ صف بنالینا تو مستحسن امر معلوم نہیں ہوتا، علاوہ ازیں اس طرح صفیں بھی خراب ہونے کا اندیشہ ہے ہو سکتا ہے۔ پہلی صف والے بھی نئی صف میں شامل ہونے کی کوشش کریں اور یوں ساری صفیں ہی خراب ہو جائیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ جنازہ پیش کرنے والے پہلے بنی ہوئی پہلی صف میں شامل ہوں یا جس صف میں بھی ان کو جگہ مل جائے، نہ کہ وہ امام اور پہلی صف کے درمیان الگ صف بنائیں۔ (ص ی)

ہے مثلاً جو لوگ اپنی بیویوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں اور چار گواہ پیش نہ کر سکیں تو وہ لعان کرتے ہوئے پانچویں بار یہ کہیں گے:

﴿أَنَّ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَيْهِ إِن كَانَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ⑦﴾ (النور: ٢٤/ ٧)

"اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت۔"

اور عورت پانچویں بار یہ کہے:

﴿أَنَّ غَضَبَ اللَّهِ عَلَيْهَا إِن كَانَ مِنَ الصَّادِقِينَ ⑨﴾ (النور: ٢٤/ ٩)

"اگر یہ سچا ہو تو مجھ پر اللہ کا غضب (نازل ہو)۔"

کیا نماز جنازہ کی جگہ اور وقت کا تعین ضروری ہے؟

سوال کیا نماز جنازہ کے لیے کوئی وقت متعین ہے؟ کیا رات کو دفن کرنا جائز ہے؟ کیا نماز جنازہ کے لیے کوئی تعداد معین ہے؟ کیا قبرستانوں میں اور قبروں پر نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے؟

جواب نماز جنازہ کے لیے کوئی وقت متعین نہیں ہے کیونکہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے، انسان جب بھی فوت ہو، اسے غسل دیا جائے، کفن پہنایا جائے اور اس کی نماز جنازہ ادا کی جائے، خواہ دن یا رات کا کوئی بھی وقت ہو۔ دن رات کے کسی بھی وقت میں اسے دفن بھی کیا جا سکتا ہے، البتہ تین اوقات ایسے ہیں، جن میں دفن کرنا جائز نہیں اور وہ ہیں: ① طلوع آفتاب کے وقت حتی کہ وہ ایک نیزے کے بقدر بلند ہو جائے ② جب وہ نصف النہار پر ہو حتی کہ زوال پذیر ہو جائے یعنی زوال سے دس منٹ پہلے دفن کرنا جائز نہیں ③ غروب آفتاب کے وقت حتی کہ غروب ہو جائے یعنی جب سورج غروب ہونے کے لیے ایک نیزے کے بقدر باقی رہ جائے تو اس وقت دفن کرنا جائز نہیں۔ پس ان تین اوقات میں دفن کرنا حلال نہیں بلکہ حرام ہے کیونکہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

«ثَلَاثُ سَاعَاتٍ كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَنْهَانَا أَنْ نُصَلِّيَ فِيهِنَّ أَوْ أَنْ نَقْبُرَ فِيهِنَّ مَوْتَانَا»(صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الأوقات التي نهي عن الصلاة فيها، ح: ١/ ٥٦٨، ٨٣١)

"تین اوقات ایسے ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ ہمیں نماز پڑھنے سے یا ان اوقات میں مردوں کو دفن کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔"

نماز جنازہ کے لیے کوئی تعداد معین نہیں ہے حتی کہ اگر ایک شخص بھی جنازہ پڑھ لے تو جنازہ ہو جائے گا۔

قبرستان میں بھی نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل علم نے قبرستان میں نماز کی ممانعت سے نماز جنازہ کو مستثنیٰ قرار دیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ قبرستانوں میں بھی نماز جنازہ جائز ہے۔ اسی طرح قبر پر بھی نماز جنازہ جائز ہے، حدیث سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے اس عورت کی قبر پر نماز جنازہ پڑھی تھی جو مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی۔ وہ رات کو فوت ہو گئی تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے رات ہی کو دفن کر دیا۔ جب نبی ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا:

«دُلُّونِي عَلَى قَبْرِهِ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب الصلاة على القبر بعدما يدفن، ح: ١٣٣٧،

وصحيح مسلم، الجنائز، باب الصلاة على القبر، ح: ٩٥٦ واللفظ له)

’’مجھے اس کی قبر بتاؤ۔‘‘

جب صحابۂ کرام ﷺ نے بتایا تو آپ نے اس کی قبر پر اس کی نماز جنازہ پڑھی۔‘‘

غائبانہ نماز جنازہ کے بارے میں حکم

سوال کیا نماز جنازہ غائبانہ مطلقاً جائز ہے یا اس کے لیے مخصوص شرائط ہیں؟

جواب اہل علم کے اقوال میں سے راجح قول یہ ہے کہ نماز جنازہ غائبانہ مشروع نہیں ہے اِلَّا یہ کہ اس کی نماز جنازہ پڑھی ہی نہ گئی ہو' جیسے کوئی شخص کسی کافر ملک میں مرجائے اور اس کا کسی نے جنازہ نہ پڑھا ہو یا جیسے کوئی کسی سمندر یا دریا یا کسی وادی میں غرق ہو گیا ہو، اس کی لاش نہ ملی ہو تو اس کا جنازہ پڑھنا واجب ہے۔ اور جس کی نماز جنازہ پڑھی گئی ہو تو صحیح بات یہ ہے کہ اس کا غائبانہ جنازہ پڑھنا مشروع نہیں ہے کیونکہ نجاشی کے واقعے کے سوا سنت سے دوسرا کوئی واقعہ ثابت نہیں ہے اور نجاشی کا اس کے اپنے ملک میں جنازہ نہیں پڑھا گیا تھا' اس لیے نبی ﷺ نے مدینہ میں اس کا جنازہ پڑھایا تھا'① اس کے علاوہ آپ نے کسی اور کا جنازہ غائبانہ نہیں پڑھایا' حالانکہ آپ کے عہد میں بڑے بڑے لوگوں اور بہت عظیم شخصیتوں کا انتقال ہوا تھا۔ بعض اہل علم نے یہ کہا ہے کہ جس کے مال' عمل یا علم سے دین کو فائدہ پہنچا ہو تو اس کا جنازہ غائبانہ پڑھا جائے گا اور جو شخص ایسا نہ ہو تو اس کا جنازہ نہیں پڑھا جائے گا اور بعض اہل علم نے یہ کہا ہے کہ جنازہ غائبانہ مطلقاً جائز ہے لیکن یہ سب سے ضعیف قول ہے۔

میت کو دفن کرنے کا صحیح طریقہ

سوال بعض ملکوں میں میت کو پشت کے بل دفن کر دیتے اور اس کے ہاتھ کو اس کے پیٹ پر باندھ دیتے ہیں' لہٰذا سوال یہ ہے کہ میت کے دفن کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب صحیح طریقہ یہ ہے کہ میت کو اس کے دائیں پہلو پر قبلہ رخ دفن کیا جائے کیونکہ کعبہ ہی زندہ اور مردہ سب لوگوں کا قبلہ ہے جیسا کہ نبی ﷺ نے حکم دیا ہے کہ سونے والا اپنے دائیں پہلو پر سوئے۔ اسی طرح میت کو بھی اس کے دائیں پہلو پر لٹایا جائے کیونکہ نیند اور موت دونوں وفات ہونے کے اعتبار سے مشترک ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۴۲﴾ (الزمر: ٣٩/ ٤٢)

’’اللہ لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں (ان کی روحیں) سوتے میں (قبض کر لیتا ہے) پھر جن پر موت کا حکم کر چکا ہے ان کو روک رکھتا ہے اور باقی روحوں کو ایک وقت مقرر تک کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ جو لوگ فکر کرتے ہیں' ان کے لیے اس میں نشانیاں ہیں۔‘‘

---

① صحيح البخاري' مناقب الانصار' باب موت النجاشي، حديث: 3877۔

اور فرمایا:

﴿ وَهُوَ ٱلَّذِى يَتَوَفَّىٰكُم بِٱلَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِٱلنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰٓ أَجَلٌ مُّسَمًّى ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٦٠﴾ ﴾ (الأنعام: ٦/ ٦٠)

”اور وہی تو ہے جو رات کو (سونے کی حالت میں) تمھاری روح قبض کر لیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو' اس کی خبر رکھتا ہے' پھر تمھیں دن کو اٹھا دیتا ہے تاکہ (یہی سلسلہ جاری رکھ کر زندگی کی) مدت معین پوری کر دی جائے' پھر تم (سب) کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (اس روز) وہ تم کو تمھارے عمل جو تم کرتے رہتے ہو (ایک ایک کر کے) بتائے گا۔“

پس حکم شریعت یہ ہے کہ میت کو دائیں پہلو پر قبلہ رخ لٹایا جائے۔ سائل نے جو اپنا مشاہدہ ذکر کیا ہے شائد وہ کچھ لوگوں کی جہالت کا شاخسانہ ہو ورنہ مجھے نہیں معلوم کہ اہل علم میں سے کسی نے یہ کہا ہو کہ میت کو پشت کے بل لٹایا جائے اور اس کے دونوں ہاتھ اس کے پیٹ پر رکھ دیے جائیں۔

قبروں پر قرآن مجید پڑھنا اور دعا کرنا کیسا ہے؟

سوال قبروں پر قرآن مجید پڑھنے' قبر کے پاس میت کے لیے دعا کرنے اور قبر کے پاس انسان کے خود اپنے لیے دعا کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب قبروں پر قرآن مجید پڑھنا بدعت ہے کیونکہ نبی ﷺ اور حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں ہے۔ اور جب یہ نبی ﷺ اور حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں تو پھر ہمیں اپنی طرف سے اسے ایجاد نہیں کرنا چاہیے کیونکہ صحیح حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«وَكُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلاَلَةٌ وَكُلُّ ضَلاَلَةٍ فِي النَّارِ»(سنن النسائي، العيدين، باب كيفية الخطبة، ح:١٥٧٩)

”ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت ضلالت ہے اور ہر ضلالت (دوزخ کی) آگ میں لے جائے گی۔“

مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ سلف صالحین صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین کرام رحمہم اللہ کی اقتدا کریں تاکہ خیر اور ہدایت پر ہوں کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللهِ وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ»(صحيح مسلم، الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة، ح:٨٦٧)

”بے شک بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ محمد ﷺ کا طریقہ ہے۔“

قبر کے پاس میت کے لیے دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ انسان قبر کے پاس کھڑا ہو جائے اور صاحب قبر کے لیے جو آسانی سے ممکن ہو دعا کرے' مثلاً: اے اللہ! اسے بخش دے' اے اللہ! اس پر رحم فرما' اے اللہ! اسے جنت میں داخل فرما دے' اے اللہ! اس کی قبر کو کشادہ فرما دے' وغیرہ۔

اگر انسان قصد وارادہ کے ساتھ قبر کے پاس جا کر اپنے لیے دعا کرے تو یہ بدعت ہے کیونکہ دعا کے لیے کسی جگہ کی تخصیص نہیں کرنی چاہیے الاّ یہ کہ نص سے ثابت ہو۔ اور جب دعا کے لیے کسی جگہ کی تخصیص کرنا' خواہ وہ جگہ کوئی بھی ہو، نص یا سنت سے ثابت نہیں تو پھر یہ بدعت ہے۔

عورتوں کے لیے قبروں کی زیارت کرنا جائز ہے؟

سوال قبروں کی زیارت' ان کے پاس فاتحہ پڑھنے اور عورتوں کے لیے قبروں کے زیارت کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب قبروں کی زیارت سنت ہے۔ نبیٔ اکرم ﷺ نے پہلے اس کی ممانعت فرمادی تھی مگر بعد میں آپ نے اس کا حکم دیا ہے جیسا کہ درج ذیل حدیث میں ہے:

«كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ، فَزُورُوهَا»(صحيح مسلم، الجنائز، باب استئذان النبي ﷺ ربه عزوجل في زيارة قبر أمه، ح: ٩٧٧)

''میں نے تمھیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا' پس اب تم ان کی زیارت کیا کرو۔''

اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں:

«فَإِنَّهَا تُذَكِّرُكُمُ الْمَوْتَ»(صحيح مسلم، الجنائز، باب استئذان النبي ﷺ ربه عزوجل في زيارة قبر أمه، ح: ٩٧٦)

''بلاشبہ یہ تمھیں موت یاد دلاتی ہیں۔''

موت کو یاد کرنے اور عبرت حاصل کرنے کے لیے قبروں کی زیارت سنت ہے۔ انسان جب ان مردوں کی قبروں کی زیارت کرتا ہے جو کل تک زمین کی پشت پر اسی طرح کھاتے پیتے تھے جس طرح یہ کھاتا پیتا ہے' اور وہ بھی دنیا میں لطف اندوز ہوتے تھے اور اب وہ اپنے اعمال کے بدلے میں گروی ہیں۔ اگر انھوں نے اچھے اعمال کیے تو ان سے اچھا سلوک ہوگا اور اگر برے اعمال کیے تو برا معاملہ ہوگا تو ضروری ہے کہ انسان قبر کے پاس جا کر عبرت حاصل کرے' اس کا دل نرم ہو' وہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرے اور وہ اس طرح کہ اس کی نافرمانی کے کام ترک کر کے اس کی اطاعت وبندگی شروع کر دے۔ قبرستان میں جانے والے کو چاہیے کہ وہ دعا بھی پڑھے جو اس موقع پر نبی ﷺ پڑھا کرتے تھے اور جس کی آپ نے اپنی امت کو بھی تعلیم فرمائی ہے اور وہ دعا یہ ہے:

«اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِينَ، وَأَتَاكُمْ مَا تُوعَدُونَ غَدًا مُؤَجَّلُونَ وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُونَ»(صحيح مسلم، الجنائز، باب مايقال عند دخول القبور ... ح: ٩٧٤)

''اے مومنو کی بستی کے رہنے والو! تم پر سلام' تمھارے پاس وہ چیز آ چکی ہے جس کا تم سے کل (قیامت) کا وعدہ کیا گیا تھا' (البتہ مکمل جزا و سزا روز قیامت تک کے لیے) مؤخر کر دی گئی ہے۔ ہم بھی ان شاء اللہ عنقریب تم سے ملنے والے ہیں۔''

نبیٔ اکرم ﷺ سے زیارت قبور کے وقت سورۂ فاتحہ پڑھنا ثابت نہیں ہے' لہٰذا یہ غیر مشروع ہے۔

عورتوں کے لیے قبروں کی زیارت کرنا حرام ہے کیونکہ حدیث میں ہے:

«لَعَنَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ زَائِرَاتِ الْقُبُورِ، وَالْمُتَّخِذِينَ عَلَيْهَا الْمَسَاجِدَ وَالسُّرُجَ»(سنن أبي داود، الجنائز، باب في زيارة النساء القبور، ح:٣٢٣٦، وجامع الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في كراهية أن يتخذ على القبر مسجدا، ح:٣٢٠، وسنن النسائي، الجنائز، باب في اتخاذ السرج على القبور، ح:٢٠٤٥، وسنن ابن ماجه، الجنائز، باب ماجاء في النهي عن زيارة النساء القبور، ح:١٥٧٥)

”رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں اور قبروں پر مسجدیں بنانے اور چراغ جلانے والوں پر لعنت کی ہے۔“

عورت کے لیے قبرستان میں جانا حلال نہیں ہے بشرطیکہ وہ زیارت کے قصد سے گھر سے نکلے اور اگر وہ زیارت کے قصد کے بغیر قبرستان کے پاس سے گزر رہی ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ قبرستان کے پاس کھڑی ہو جائے اور اہل قبور کو اس طرح سلام کہے جس طرح نبی ﷺ نے اپنی امت کو سکھایا ہے۔ بہرحال قصد زیارت سے گھر سے نکلنے والی عورت اور بلا قصد وارادہ قبروں کے پاس سے گزرنے والی عورت میں فرق کیا جائے گا کہ جو قصد وارادہ سے گھر سے نکلے اس نے حرام فعل کا ارتکاب کیا اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی لعنت کا مستحق قرار دے لیا① اور دوسری جو اتفاق سے قبرستان کے پاس سے گزر رہی تھی‘ تو اس کے قبروں کے پاس سے گزرنے اور سلام کہنے میں کوئی حرج نہیں۔

میت کے گھر قرآن خوانی کرنا کیسا ہے؟

سوال بعض ملکوں میں رواج ہے کہ جب کوئی انسان فوت ہو جائے تو اس کے گھر میں بلند آواز سے قرآن خوانی کی جاتی ہے یا گھر میں ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے سے تلاوت کی کیسٹیں سنائی جاتی ہیں‘ اس عمل کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب یہ عمل بلاشک بدعت ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ کے عہد میں اور حضرات صحابۂ کرام ؓ کے عہد میں اس کا رواج نہ تھا۔ قرآن سے یقیناً غم وفکر دور ہوتے ہیں جب انسان خود پڑھے نہ کہ لاؤڈ سپیکروں سے بلند آواز سے پڑھا جائے جسے سب لوگ حتی کہ لہو ولعب میں مبتلا اور آلات موسیقی سے دل بہلانے والے بھی سنیں‘ وہ گویا قرآن بھی سن رہے ہوتے ہیں اور موسیقی بھی۔ اس طرح تو یہ لوگ گویا قرآن مجید کا مذاق اڑاتے ہیں اور پھر میت کے گھر میں تعزیت کے لیے آنے والوں کے لیے جمع ہونا بھی ان امور میں سے ہے جو نبی ﷺ کے عہد میں معروف نہ تھے حتی کہ بعض علماء نے لکھا ہے کہ یہ بدعت ہے۔ لہٰذا ہماری رائے میں اہل میت کو تعزیت کے لیے آنے والوں کے استقبال کے لیے جمع نہیں ہونا چاہیے بلکہ انھیں اپنے دروازے بند کر لینے چاہییں‘ البتہ اگر کوئی بازار میں ملے یا جاننے والوں میں سے کوئی اس ملاقات کے اہتمام کے بغیر آ جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن ہر آنے جانے والے

---

① حضرت مفتی صاحب ؒ نے جس روایت کی رو سے عورتوں کا بالقصد زیارت قبور کے لیے جانے کو حرام قرار دیا ہے‘ وہ سنداً ضعیف ہے۔ بشرط صحت علماء نے اس کا تعلق ابتدائے اسلام سے بتلایا ہے جب نبی ﷺ نے مردوں اور عورتوں سب کو مطلقاً زیارت قبور سے روک دیا تھا۔ لیکن پھر بعد میں اس کی اجازت مرحمت فرما دی تھی۔ اس اجازت میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں اور اس اجازت کے بعد دونوں کا زیارت قبور کے لیے جانا صحیح ہے۔ البتہ ایسی عورتوں کے لیے ممانعت ہوگی جو قبرستان جا کر جزع فزع اور بے صبری کا مظاہرہ کریں۔ واللہ اعلم. (ص ی)

کے استقبال کیلئے دروازوں کو کھول رکھنا درست نہیں کیونکہ یہ طریقہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں معروف نہیں تھا حتی کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اہل میت کے ہاں اجتماع اور کھانے کے اہتمام کو بھی نوحہ میں سے سمجھتے تھے۔ اور نوحہ جیسا کہ مشہور ہے کبیرہ گناہوں میں سے ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے نوحہ کرنے اور نوحہ سننے والی عورت پر لعنت فرمائی ہے نیز آپ نے فرمایا ہے:

«اَلنَّائِحَةُ إِذَا لَمْ تَتُبْ قَبْلَ مَوْتِهَا تُقَامُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَعَلَيْهَا سِرْبَالٌ مِنْ قَطِرَانٍ وَدِرْعٌ مِنْ جَرَبٍ»(صحيح مسلم، الجنائز، باب التشديد في النياحة، ح: ٩٣٤)

’’نوحہ کرنے والی عورت اگر اپنی موت سے پہلے توبہ نہ کرے تو اسے قیامت کے دن اس طرح کھڑا کیا جائے گا کہ اس کا گندھک کا کرتہ اور خارش کی اوڑھنی ہوگی۔‘‘

ہم اللہ تعالیٰ سے عافیت کی دعا کرتے ہیں۔

میری مسلمان بھائیوں کو یہ نصیحت ہے کہ وہ ان بدعات کو ترک کر دیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہی بہتر ہے۔ میت کے لیے بھی یہی بہتر ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ میت کو اس کے گھر والوں کے رونے اور نوحہ کرنے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے اور عذاب دیے جانے کے معنی یہ ہیں کہ اسے اس رونے اور نوحہ کرنے کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اسے اتنی سزا ملے گی جتنی نوحہ و بکا کرنے والے کو سزا ملتی ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ﴾ (الأنعام: ٦/ ١٦٤)

’’اور کوئی شخص کسی کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔‘‘

عذاب کے لفظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ سزا ہی کے معنی میں ہو۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«اَلسَّفَرُ قِطْعَةٌ مِنَ الْعَذَابِ»(صحيح البخاري، العمرة، السفر قطعة من العذاب، ح: ١٨٠٤، وصحيح مسلم، الإمارة، باب السفر قطعة من العذاب، ح: ١٩٢٧)

’’سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے۔‘‘

حالانکہ سفر سزا تو نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غم وفکر وغیرہ کو بھی عذاب کہا جا سکتا ہے۔ لوگ بھی عموماً اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے رہتے ہیں کہ میرے ضمیر نے مجھے عذاب دیا ہے اور اس طرح کے الفاظ اس وقت استعمال کیے جاتے ہیں جب دل پر شدید غم وفکر کا ہجوم ہو۔ خلاصۂ کلام یہ کہ میں اپنے بھائیوں کو یہ نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اس قسم کی عادتیں ترک کر دیں جو انھیں اللہ تعالیٰ سے دور کر دیتی ہیں اور ان کے فوت شدہ عزیزوں کے لیے بھی تکلیف اور پریشانی کا باعث ہیں۔

* * *

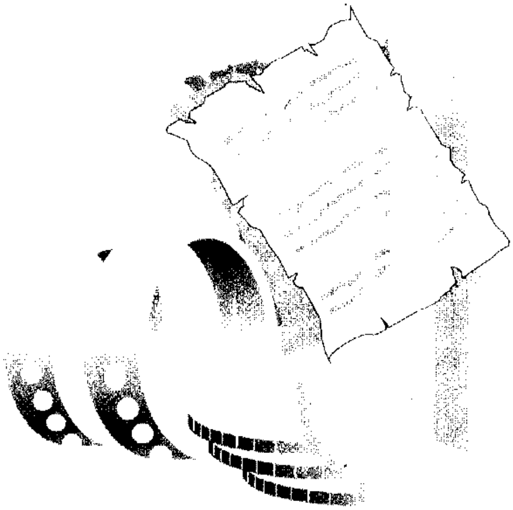

زکوۃ کے مسائل

وجوب زکوۃ کی شرطیں

سوال وجوب زکوۃ کی کیا شرطیں ہیں؟

جواب وجوب زکوۃ کی درج ذیل شرطیں ہیں: اسلام، آزادی، نصاب کی ملکیت اور اس کا مستقل ہونا اور سال کا گزرنا۔ مگر یہ آخری شرط زمین سے پیدا ہونے والی چیزوں کے لیے نہیں ہے۔

① **اسلام:** اسلام کی شرط اس لیے ہے کہ کافر پر زکوۃ واجب نہیں ہے اور اگر وہ زکوۃ کے نام سے ادا بھی کرے، تو اس سے قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا مَنَعَهُمْ أَن تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَـٰتُهُمْ إِلَّآ أَنَّهُمْ كَفَرُوا۟ بِٱللَّهِ وَبِرَسُولِهِۦ وَلَا يَأْتُونَ ٱلصَّلَوٰةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالَىٰ وَلَا يُنفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَـٰرِهُونَ ﴿٥٤﴾﴾ (التوبة: ٩/ ٥٤)

''اور ان کے خرچ (اموال) کے قبول ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ انھوں نے اللہ سے اور اس کے رسول سے کفر کیا اور وہ نماز کو آتے ہیں تو سست و کاہل ہو کر اور خرچ کرتے ہیں تو ناخوشی سے۔''

ہم نے جو یہ کہا کہ کافر پر زکوۃ واجب نہیں اور اگر وہ ادا بھی کرے تو اس سے قبول نہیں کی جائے گی، اس کے یہ معنی نہیں کہ آخرت میں بھی اسے معاف ہے بلکہ آخرت میں اسے ضرور عذاب ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ﴿٣٨﴾ إِلَّآ أَصْحَـٰبَ ٱلْيَمِينِ ﴿٣٩﴾ فِى جَنَّـٰتٍ يَتَسَآءَلُونَ ﴿٤٠﴾ عَنِ ٱلْمُجْرِمِينَ ﴿٤١﴾ مَا سَلَكَكُمْ فِى سَقَرَ ﴿٤٢﴾ قَالُوا۟ لَمْ نَكُ مِنَ ٱلْمُصَلِّينَ ﴿٤٣﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ ٱلْمِسْكِينَ ﴿٤٤﴾ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ ٱلْخَآئِضِينَ ﴿٤٥﴾ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ ٱلدِّينِ ﴿٤٦﴾ حَتَّىٰٓ أَتَىٰنَا ٱلْيَقِينُ ﴿٤٧﴾﴾ (المدثر: ٧٤/ ٣٨-٤٧)

''ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے گروی ہے، مگر داہنی طرف والے (نیک لوگ) (کہ) وہ باغہائے بہشت میں (ہوں گے اور) پوچھتے ہوں گے (آگ میں جلنے والے) گناہ گاروں سے کہ تمھیں دوزخ میں کس چیز نے ڈالا ہے؟ وہ جواب دیں گے کہ ہم نماز پڑھتے تھے نہ فقیروں کو کھانا کھلاتے تھے اور اہل باطل کے ساتھ مل کر (حق کا) انکار کرتے تھے اور روز جزا کو جھٹلاتے تھے یہاں تک کہ ہمیں موت آگئی۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق عمل نہ کرنے کی وجہ سے انھیں عذاب ہوگا۔

② **آزادی:** حریت کی شرط اس لیے ہے کہ غلام کا تو کوئی مال ہی نہیں ہوتا، اس کا مال اس کے آقا کا ہوتا ہے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنِ ابْتَاعَ عَبْدًا وَلَهُ مَالٌ فَمَالُهُ لِلَّذِي بَاعَهُ إِلاَّ أَنْ يَشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ» (صحيح البخاري، المساقاة، باب الرجل يكون له ممر أو شرب في حائط أو نخل، ح:٢٣٧٩ وصحيح مسلم، البيوع، باب من باع نخلا عليها ثمر، ح:١٥٤٣(٨٠) واللفظ للبخاري)

’’جس نے کوئی غلام خریدا اور اس کا مال بھی ہو تو اس کا مال اس کے لیے ہے جس نے اسے بیچا اِلَّا یہ کہ خریدار اس کی شرط طے کر لے‘‘

غلام جب مال کا مالک ہی نہیں‘ تو اس پر زکوٰۃ بھی واجب نہیں اور اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ غلام مال کا مالک ہے تو آخر کار اس کی ملکیت اس کے آقا کے پاس لوٹ آتی ہے کیونکہ اس کے آقا کو یہ حق حاصل ہے کہ جو کچھ اس کے ہاتھ میں ہے وہ اس سے لے لے‘ لہٰذا اس کی ملکیت ناقص ہے‘ اس طرح مستقل نہیں ہے جس طرح آزاد لوگوں کے مال کی مستقل ملکیت ہوتی ہے۔

③ **ملکیت نصاب:** ملکیت نصاب کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے پاس اتنا مال ہو جو اس نصاب کو پہنچ جاتا ہو جسے شریعت نے مقرر کیا ہے اور مختلف اموال کا نصاب بھی مختلف ہے۔ اگر انسان کے پاس بقدر نصاب مال نہ ہو‘ تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے کیونکہ اس کا مال قلیل ہے جو ہمدردی و خیر خواہی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

مویشیوں کے نصاب کی مقدار میں ابتدا اور انتہا کا خیال رکھا گیا ہے‘ جب کہ دیگر چیزوں میں صرف ابتدا ہی کا خیال رکھا گیا ہے اور جو نصاب سے زیادہ ہو گا تو اس کی زکوٰۃ اس کے حساب سے ہو گی۔

④ **سال کا گزرنا:** سال گزرنے کی شرط اس لیے ہے کہ اگر سال سے کم عرصے میں زکوٰۃ کو واجب قرار دیا جائے‘ تو یہ مال داروں کے مال میں نقصان کو مستلزم ہو گا اور سال سے زیادہ مدت کے وجوب کی صورت میں زکوٰۃ کے مستحق لوگوں کا نقصان ہو گا‘ لہٰذا شریعت نے حکمت و مصلحت کے پیش نظر ایک مدت معین کر دی ہے‘ جس میں زکوٰۃ واجب ہے اور وہ ہے ایک سال اور ایک سال کے ساتھ اسے مربوط کرنے سے دولت مندوں اور مستحقین زکوٰۃ کے حق میں توازن پیدا کرنا مقصود ہے‘ لہٰذا اگر سال پورا ہونے سے پہلے انسان فوت ہو جائے یا اس کا مال تلف ہو جائے تو اس سے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی‘ البتہ تین چیزیں سال کی شرط سے مستثنیٰ ہیں: ○ تجارت کا نفع ○ مویشیوں کے پیدا ہونے والے بچے ○ زمین کی پیداوار۔

تجارت کے نفع کا سال اس کے اصل کا سال ہے‘ مویشیوں کے پیدا ہونے والے بچوں کا سال ان کی ماؤں کا سال ہے اور زمین کی پیداوار یعنی فصلیں اور پھل وغیرہ ان کا سال اس وقت ہے‘ جب یہ پیداوار حاصل ہو۔

ماہانہ تنخواہوں سے زکوٰۃ نکالنے کا طریقہ

سوال ماہانہ تنخواہوں سے زکوٰۃ نکالنے کا کیا طریقہ ہے؟

جواب اس سلسلے میں سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ اس نے سب سے پہلی تنخواہ جو وصول کی تھی‘ اس کو جب ایک سال ہو جائے‘ تو وہ اس سارے مال کی زکوٰۃ ادا کرے جو اس کے پاس موجود ہو۔ اس طرح جس مال پر سال پورا ہو گیا‘ اس کی زکوٰۃ تو اس نے سال پورا ہونے پر ادا کر دی اور جس مال پر ابھی سال پورا نہیں ہوا‘ اس کی اس نے پیشگی زکوٰۃ ادا کر دی اور پیشگی زکوٰۃ ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں‘ یہ صورت حال اس سے زیادہ آسان ہے کہ انسان ہر مہینے کا علیحدہ علیحدہ حساب رکھے۔ یاد رہے کہ اگر دوسرے مہینے کی تنخواہ ملنے سے پہلے‘ پہلے مہینے کی تنخواہ خرچ ہو جائے تو اس صورت میں زکوٰۃ نہیں ہے کیونکہ مال میں زکوٰۃ کے وجوب کی ایک شرط

یہ بھی ہے کہ اس پر ایک سال گزر جائے۔

کیا بچے اور مجنون کے مال پر زکوٰۃ واجب ہے؟

سوال کیا بچے اور مجنون کے مال پر بھی زکوٰۃ واجب ہے؟

جواب اس مسئلے کے متعلق علماء میں اختلاف ہے' بعض نے یہ کہا ہے کہ بچے اور مجنون کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے کیونکہ بچہ اور مجنون مکلف نہیں ہیں' لہٰذا ان کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ان کے مال میں بھی زکوٰۃ واجب ہے اور یہی قول صحیح ہے کیونکہ زکوٰۃ حقوق مال میں سے ہے' اس میں مالک کو نہیں دیکھا جائے گا کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿خُذۡ مِنۡ أَمۡوَٰلِهِمۡ صَدَقَةٗ﴾ (التوبة: ۹/ ۱۰۳)

''ان کے مال میں سے زکوٰۃ قبول کرلو۔''

اس میں وجوب کا محل مال قرار دیا گیا ہے۔ اور نبی ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے ہوئے فرمایا تھا:

«أَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِي أَمْوَالِهِمْ تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ»(صحيح البخاري، الزكاة، باب وجوب الزكاة، ح:۱۳۹۵ وصحيح مسلم، الإيمان، باب الدعاء إلى الشهادتين وشرائع الإسلام، ح:۱۹)

''ان کو معلوم کرا دو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں میں زکوٰۃ کو فرض قرار دیا ہے' جو ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے فقیروں میں تقسیم کر دی جائے گی۔''

لہٰذا بچے اور مجنون کے مال میں بھی زکوٰۃ واجب ہے' ان کی طرف سے ان کا ولی زکوٰۃ ادا کرے گا۔

قرض کی زکوٰۃ کا مسئلہ

سوال قرض کی زکوٰۃ کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جسے کسی شخص سے قرض لینا ہو' اس پر قرض وصول کرنے سے قبل زکوٰۃ واجب نہیں ہے کیونکہ وہ اس کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ قرض اگر کسی خوش حال شخص کے ذمہ ہو' تو اسے ہر سال اس کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ اگر وہ اپنے مال کے ساتھ اس کی بھی زکوٰۃ ادا کر دے تو وہ بری الذمہ ہو جائے گا اور اگر وہ اپنے مال کے ساتھ اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرے تو اس کے لیے واجب ہے کہ جب وہ اسے اپنے قبضے میں لے' تو سابقہ تمام سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے کیونکہ خوش حال انسان سے قرض کی واپسی کا مطالبہ ممکن ہے اور اگر اس سے مطالبہ نہیں کیا جاتا تو یہ صاحب قرض کی اپنی مرضی سے ہے اور اگر قرض تنگدست انسان پر ہو یا ایسے دولت مند پر' جس سے واپسی کا مطالبہ ممکن ہی نہیں تو اس صورت میں ہر سال کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی کیونکہ اس کے لیے قرض دی ہوئی رقم کا حصول ممکن نہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِن كَانَ ذُو عُسۡرَةٖ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيۡسَرَةٖۚ﴾ (البقرة: ۲/ ۲۸۰)

''اور اگر قرض لینے والا تنگ دست ہو تو (اسے) کشائش (کے حاصل ہونے) تک مہلت دو۔''

پس اس کے لیے اس مال کو اپنے قبضے میں لینا اور اس سے نفع اٹھانا ممکن نہیں، لہٰذا اس مال کی زکوٰۃ واجب نہیں لیکن جب وہ اسے اپنے قبضے میں لے لے تو بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ وہ از سرِ نو ایک سال انتظار کرے اور بعض نے کہا ہے کہ وہ ایک سال کی زکوٰۃ ادا کر دے اور جب اگلا سال شروع ہو جائے تو وہ احتیاطاً اس کی زکوٰۃ بھی ادا کر دے۔ واللہ اعلم.

کیا میت کا قرض زکوٰۃ سے ادا کیا جا سکتا ہے؟

سوال کیا اس میت کا قرض زکوٰۃ سے ادا کیا جا سکتا ہے جس نے کوئی مال نہ چھوڑا ہو؟

جواب ابن عبدالبر اور ابو عبید رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ زکوٰۃ سے میت کا قرض ادا نہ کیا جائے اور اس پر اجماع ہے لیکن امر واقع یہ ہے کہ اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ اکثر علماء نے یہی کہا ہے کہ زکوٰۃ سے میت کا قرض ادا نہ کیا جائے کیونکہ میت تو دار آخرت کی طرف منتقل ہو چکی ہے اور قرض کی وجہ سے اب اسے وہ ذلت اور رسوائی حاصل نہیں ہو گی جو زندوں کو حاصل ہوتی ہے اور پھر نبی ﷺ زکوٰۃ سے مُردوں کے قرض ادا نہیں فرمایا کرتے تھے بلکہ جب اللہ تعالیٰ نے فتوحات سے سرفراز فرمادیا تو نبی ﷺ اموالِ غنیمت سے قرض ادا فرمایا کرتے تھے، اس سے بھی معلوم ہوا کہ زکوٰۃ سے میت کا قرض ادا کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ میت نے جب لوگوں سے قرض لیا اور وہ اسے ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کی طرف سے ادا فرمادے گا اور اگر وہ اسے ضائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے، قرض اس کے ذمے باقی رہے گا جو قیامت کے دن اس سے وصول کر لیا جائے گا۔ میرے نزدیک یہ قول زیادہ صحیح ہے کہ زکوٰۃ سے میت کا قرض ادا کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فرق کیا جائے گا کہ اگر زندہ لوگ فقر یا جہاد یا تاوان وغیرہ کی وجہ سے ضرورت مند ہوں تو پھر زکوٰۃ سے میت کا قرض ادا نہیں کیا جائے گا اور اگر زندہ لوگ ضرورت مند نہ ہوں تو پھر کوئی حرج نہیں کہ ہم ایسے فوت شدگان کے زکوٰۃ سے قرض ادا کر دیں جنھوں نے اپنے پیچھے کوئی مال نہ چھوڑا ہو۔ دونوں اقوال میں سے یہ آخری قول شاید مبنی بر اعتدال ہے۔

کیا مقروض سے صدقہ ساقط ہو جاتا ہے؟

سوال کیا مقروض کا صدقہ کرنا صحیح ہے؟ مقروض سے کون کون سے شرعی حقوق ساقط ہو جاتے ہیں؟

جواب صدقہ کرنا ان امور میں سے ہے جن کا شرعاً حکم دیا گیا ہے اور یہ بندگانِ الٰہی کے ساتھ احسان ہے، جب کہ درست طریقے سے صدقہ کیا گیا ہو۔ صدقے سے انسان کو ثواب ملتا ہے اور قیامت والے دن ہر شخص اپنے صدقے کے سائے میں ہو گا اور یہ مقبول ہوتا ہے خواہ انسان پر قرض ہو یا نہ ہو بشرطیکہ قبولیت کی شرطوں کی مطابق ہو اور وہ یہ کہ صدقہ اللہ عزوجل کے لیے اخلاص کے ساتھ ہو، حلال کمائی سے ہو اور صحیح جگہ پر صدقہ کیا جائے۔ شرعی دلائل کے تقاضے کے مطابق انھی شرائط کے ساتھ صدقہ مقبول ہو گا۔ اس سلسلہ میں یہ شرط نہیں ہے کہ انسان پر قرض نہ ہو لیکن اگر قرض اس کے سارے مال کے بقدر ہو تو حکمت اور عقل کا یہ تقاضا نہیں کہ انسان صدقہ کرے، جو کہ مستحب ہے واجب نہیں، اور قرض کو ترک کر دے جو واجب ہے، لہٰذا پہلے واجب کو ادا کرنا چاہیے اور پھر صدقہ کرنا

چاہیے۔ اہلِ علم کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو صدقہ کرے اور اس پر اس کے سارے مال کے بقدر قرض ہو۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس کے لیے یہ جائز نہیں کیونکہ اس میں صاحب قرض کا نقصان ہے اور واجب قرض کی صورت میں اپنے ذمے کو باقی رکھنا ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ جائز ہے لیکن خلاف اَولیٰ ہے۔ بہر حال جس انسان کے ذمے اس کے اپنے سارے مال کے بقدر قرض ہو، اسے صدقہ نہیں کرنا چاہیے حتی کہ وہ اپنے قرض کو ادا کر دے کیونکہ واجب نفل سے مقدم ہے۔ جہاں تک ان حقوق شرعیہ کا تعلق ہے، جو مقروض کیلئے معاف ہیں، ان میں سے ایک توحج ہے۔ مقروض انسان پر حج واجب نہیں حتی کہ وہ اپنے قرض کو ادا کر دے۔

زکوٰۃ کے بارے میں اہلِ علم میں اختلاف ہے کہ یہ مقروض سے ساقط ہے یا نہیں؟

بعض اہل علم نے کہا ہے کہ قرض کے مقابل زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی خواہ مال ظاہر ہو یا ظاہر نہ ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ قرض کے مقابل زکوٰۃ ساقط نہیں ہوگی بلکہ اسے اپنے سارے مال کی زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی، خواہ اس پر قرض ہو، جو نصاب کو کم کرتا ہو۔ بعض نے اس میں فرق کیا ہے کہ اگر مال کا تعلق اموال باطنہ سے ہو جو نظر نہ آتے اور دیکھے نہ جا سکتے ہوں، مثلاً نقدی اور سامان تجارت وغیرہ تو قرض کے مقابل مال سے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی اور اگر مال کا تعلق اموال ظاہرہ مثلاً مویشیوں اور زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار سے ہو تو زکوٰۃ ساقط نہیں ہوگی۔

میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ زکوٰۃ ساقط نہیں ہوگی، خواہ مال ظاہر ہو یا غیر ظاہر۔ جس کے ہاتھ میں بھی اس قدر مال ہو جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اسے اپنے مال کی بہر صورت زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے خواہ اس کے ذمہ قرض ہو کیونکہ زکوٰۃ مال میں واجب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَٰلِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلَوٰتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۗ وَٱللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٠٣﴾﴾ (التوبة: ۹/ ۱۰۳)

''ان کے مال میں سے زکوٰۃ قبول کرلو کہ اس سے تم ان کو (ظاہر میں بھی) پاک اور (باطن میں بھی) پاکیزہ کرتے ہو اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو کہ تمھاری دعا ان کے لیے موجب تسکین ہے، اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔''

اور نبی ﷺ نے یمن کی طرف بھیجتے ہوئے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

«أَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِي أَمْوَالِهِمْ تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ علٰى فُقَرَائِهِمْ»(صحيح البخاري، الزكاة، باب وجوب الزكاة، ح: ١٣٩٥ وصحيح مسلم، الإيمان، باب الدعاء إلى الشهادتين وشرائع الإسلام، ح: ١٩)

''انہیں معلوم کرادو کہ اللہ نے ان کے مالوں میں زکوٰۃ کو فرض قرار دیا ہے۔ جسے ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے فقیروں میں تقسیم کیا جائے گا۔''

صحیح بخاری میں یہ حدیث انہی الفاظ کے ساتھ ہے۔ بہر حال کتاب وسنت کی دلیل سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ اور قرض میں تعارض نہیں کیونکہ قرض کسی آدمی کے ذمے واجب ہے اور زکوٰۃ مال میں واجب ہے یعنی ہر ایک کے وجوب کا اپنا اپنا مقام ہے، لہٰذا ان میں

تعارض اور تصادم نہیں ہے۔ قرض مقروض کے ذمے واجب ہے لیکن زکوٰۃ مال میں واجب ہے، جو اسے ہر حال میں ادا کرنی ہوگی۔

زکوٰۃ میں تاخیر کرنے والا گناہ گار ہے

سوال ایک شخص نے چار سال تک زکوٰۃ ادا نہیں کی، اس کے لیے کیا لازم ہے؟

جواب یہ شخص زکوٰۃ ادا کرنے میں تاخیر کی وجہ سے گناہ گار ہے کیونکہ آدمی پر واجب ہے کہ وہ وجوب زکوٰۃ کے بعد فوراً زکوٰۃ ادا کرے اور اس میں تاخیر نہ کرے کیونکہ واجبات کے بارے میں اصول یہ ہے کہ انھیں فوراً ادا کیا جائے۔ اس شخص کو اس نافرمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے آگے توبہ کرنی چاہیے اور گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ فوراً ادا کرنی چاہیے۔ اس سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوگی بلکہ اسے توبہ کرنی اور فوراً زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے تاکہ تاخیر کی وجہ سے وہ مزید گناہ گار نہ ہو۔

نصف سال چرنے والے جانوروں پر زکوٰۃ کا مسئلہ

سوال کیا ان مویشیوں میں بھی زکوٰۃ واجب ہے جو نصف سال تک گھاس چرتے ہوں؟

جواب وہ مویشی جو پورا نصف سال گھاس چرتے رہے ہوں، ان میں زکوٰۃ نہیں ہے کیونکہ مویشیوں میں زکوٰۃ اس وقت واجب ہوتی ہے جب وہ ایک سال مکمل یا سال سے زائد عرصے تک گھاس چرتے رہے ہوں اور جو سال کا کچھ حصہ یا نصف سال تک چرتے رہے ہوں تو ان میں زکوٰۃ نہیں ہے اِلاّ یہ کہ وہ تجارت کے لیے ہوں تو ان کے لیے سامان کی زکوٰۃ کا حکم ہوگا اور اگر وہ سامان تجارت ہیں، تو ہر سال ان کی قیمت کا اندازہ لگایا جائے گا اور پھر ان کی کل مالیت کی ڈھائی فی صد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

کیا گھر میں موجود پھل دار درختوں کے پھل پر بھی زکوٰۃ ہے؟

سوال میں نے تین سال پہلے ایک گھر خریدا تھا، جس میں بحمد اللہ دو قسم کی کھجور کے تین پھل دار درخت ہیں جن کو بہت زیادہ پھل لگتا ہے۔ کیا مجھ پر ان کی زکوٰۃ واجب ہے۔ اگر جواب اثبات میں ہو، اور لوگوں کو ان مسائل کا علم نہیں ہے، تو میں اس بارے میں کئی سوالات پوچھوں گا۔ سوال یہ ہے کہ مجھے یہ کیسے معلوم ہوگا کہ کھجوروں کا پھل نصاب کو پہنچ گیا ہے یا نہیں پہنچا؟ ثانیاً: زکوٰۃ کا اندازہ کس طرح لگایا جائے گا؟ کیا ہر قسم کی کھجوروں کی الگ الگ زکوٰۃ ادا کی جائے گی یا ان کو آپس میں ملا کر سب کی اکٹھی زکوٰۃ ادا کی جائے گی؟ کیا یہ جائز ہے کہ میں زکوٰۃ نقدی کی صورت میں ادا کروں؟ گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ کے بارے میں کیا کروں؟

جواب سائل نے جو ذکر کیا ہے کہ گھر میں کھجوروں کے ان درختوں کے بارے میں کیا حکم ہے جس کا بہت سے لوگوں کو علم نہیں، تو یہ صحیح ہے کہ بہت سے لوگوں کے گھروں میں سات یا دس یا دس سے کم وبیش کھجوروں کے درخت ہیں جن کا پھل نصاب کو پہنچ گیا ہوتا ہے مگر وہ نہیں جانتے کہ ان میں زکوٰۃ بھی فرض ہے کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ زکوٰۃ صرف کھجوروں کے باغات کی صورت میں ہے، حالانکہ زکوٰۃ تو کھجور کے درختوں کے پھل میں ہے، درخت خواہ باغ میں ہوں یا گھروں میں، لہٰذا کسی ایسے انسان کو لانا چاہیے جو پھلوں کے وزن کا اندازہ لگا سکتا ہوتا کہ وہ اندازہ لگا کر بتائے کہ یہ پھل نصاب کو پہنچا ہے یا نہیں؟ جب نصاب کے مطابق ہو تو پھر اس کی

زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے لیکن وہ زکوٰۃ کیسے ادا کرے گا جب کہ وہ ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے جیسا کہ سائل نے کہا ہے کہ میری رائے میں پھل کی قیمت کا اندازہ لگا کر فی صد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کر دی جائے کیونکہ اس میں مالک کے لیے سہولت اور محتاج کے لیے زیادہ نفع ہے یعنی محتاج کو درہم دے دینا اس کے لیے زیادہ مفید ہے' مالک کے لیے درہموں کی صورت میں قیمت کا اندازہ لگانا آسان ہے۔ پھلوں میں زکوٰۃ کی مقدار پانچ فی صد ہے حالانکہ مال کی زکوٰۃ اڑھائی فی صد ہوتی ہے لیکن اس صورت میں زکوٰۃ پانچ فی صد ہوگی کیونکہ یہ زکوٰۃ پھلوں کی زکوٰۃ ہے' سامان تجارت کی زکوٰۃ نہیں۔

گزشتہ سالوں کی اس نے عدم واقفیت کی وجہ سے جو زکوٰۃ ادا نہیں کی تو گزشتہ سالوں کے پھلوں کا وہ خود اندازہ لگا لے اور ان کی اب زکوٰۃ ادا کر دے۔ زکوٰۃ میں تاخیر کی وجہ سے اسے گناہ نہیں ہوگا کیونکہ اسے یہ مسئلہ معلوم نہیں تھا لیکن گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔

سونے' چاندی کا نصاب اور صاع کی مقدار

سوال سونے اور چاندی کا نصاب کیا ہے؟ نبی ﷺ کے صاع کی کلو کے حساب سے کتنی مقدار بنتی ہے؟

جواب سونے کا نصاب بیس مثقال ہے جو پچاسی گرام کے مساوی ہے اور چاندی کا نصاب ایک سو چالیس مثقال ہے جو سعودیہ کے چاندی کے دراہم کے حساب سے چھپن ریال کے برابر ہے۔ نبی ﷺ کے صاع کی مقدار کلو کے حساب سے دو کلو اور چالیس گرام بہترین گندم بنتی ہے۔

سوال ایک شخص کی بیٹیاں ہیں' اس نے انھیں زیور دیا' سب کا مجموعی زیور تو نصاب کو پہنچتا ہے لیکن ہر ایک کا الگ الگ زیور نصاب کو نہیں پہنچتا تو کیا وہ سب کے مجموعی زیور کے مطابق زکوٰۃ ادا کرے گا؟

جواب اگر اس نے ان کو یہ زیور عاریۃً دیا ہو تو یہ اس کی ملکیت ہے اور اس کے لیے واجب ہے کہ وہ سارے زیور کو جمع کرے اور اگر نصاب کو پہنچتا ہو تو اس کی زکوٰۃ ادا کرے اور اگر اس نے یہ زیور بچیوں کی ملکیت میں دے دیا ہو تو ان سب کے زیور کو جمع کرنا واجب نہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک انفرادی طور پر اپنے اپنے زیور کی مالک ہے اور اگر ہر ایک کا زیور نصاب کے مطابق ہو تو اس میں زکوٰۃ ہوگی ورنہ نہیں۔

اپنی ہی دی ہوئی زکوٰۃ بطور ہدیہ قبول کرنے کا حکم

سوال جب کوئی شخص اپنی زکوٰۃ کسی مستحق کو دے دے اور پھر وہ اسی کو بطور ہدیہ دے دے تو کیا وہ اسے قبول کر لے؟

جواب جب آدمی کسی مستحق کو زکوٰۃ دے' پھر وہ اسی کو بطور ہدیہ دے دے تو اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ دونوں کے درمیان اس سلسلے میں کوئی خفیہ منصوبہ بندی نہ ہو اور زیادہ احتیاط اس بات میں ہے کہ وہ اس کو قبول نہ کرے۔

کیا مال کی زکوٰۃ کپڑے وغیرہ سے دی جا سکتی ہے؟

سوال کیا انسان کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ مال کی زکوٰۃ کے بجائے کپڑے وغیرہ دے دے؟

جواب یہ جائز نہیں۔

سونے اور ہیرے کا مجموعی نصاب اور اس کی زکوٰۃ

سوال جب سونے کے ساتھ ہیرا وغیرہ بھی ہو تو پھر اس کی زکوٰۃ کا کس طرح اندازہ لگایا جائے؟

جواب اس کا اندازہ ماہرین لگا سکتے ہیں، آدمی اسے سونے کے تاجروں یا زرگروں کے پاس لے جائے تاکہ وہ دیکھیں کہ سونا نصاب کو پہنچتا ہے یا نہیں، اگر نصاب کو نہ پہنچتا ہو تو اس میں زکوٰۃ نہیں ہے اِلّا یہ کہ اس کے پاس اور بھی سونا ہو، جسے ملانے سے نصاب پورا ہو جاتا ہو تو اس سونے کی قیمت کا اندازہ لگایا جائے گا جس کے ساتھ ہیرا ہے اور پھر اس کی اڑھائی فی صد کے حساب سے زکوٰۃ نکالی جائے گی۔

مسجدیں بنانے میں زکوٰۃ کا مال خرچ کرنا

سوال مسجدیں بنانے میں زکوٰۃ صرف کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور فقیر کون ہے؟

جواب زکوٰۃ صرف انہی آٹھ مصارف ہی میں خرچ کی جائے گی، جن کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حصر کے طور پر ان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ إِنَّمَا ٱلصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَٱلْمَسَٰكِينِ وَٱلْعَٰمِلِينَ عَلَيْهَا وَٱلْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِى ٱلرِّقَابِ وَٱلْغَٰرِمِينَ وَفِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَٱبْنِ ٱلسَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ ٱللَّهِ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٦٠﴾ ﴾

(التوبة: ۹/ ٦٠)

''صدقات (یعنی زکوٰۃ و خیرات) تو مفلسوں اور محتاجوں اور کارکنان صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلوب مقصود ہے اور غلاموں کے آزاد کرانے میں اور قرض داروں کے قرض ادا کرنے میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں (کی مدد) میں (بھی یہ مال خرچ کرنا چاہیے) یہ حقوق اللہ کی طرف سے مقرر کر دیے گئے ہیں اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔''

لہٰذا مسجدوں کے بنانے اور علم کے سکھانے وغیرہ میں زکوٰۃ صرف کرنا جائز نہیں ہے اور مستحب صدقات ان امور (مساجد مدارس) میں صرف کرنا افضل ہے جو زیادہ منفعت بخش یعنی باعث ثواب ہیں۔ فقیر جو مستحق زکوٰۃ ہے، اس سے مراد وہ شخص ہے جس کے پاس حسب زمان و مکان ایک سال کی مدت کے لیے اپنے اور اپنے اہل خانہ کے لیے ضرورت کی اشیا نہ ہوں۔ ممکن ہے کسی زمانے میں اور کسی جگہ ایک ہزار ریال بھی تونگری میں شمار ہوتے ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مہنگائی کی وجہ سے کسی زمانے میں اور کسی جگہ ایک ہزار ریال دولت مندی میں شمار نہ ہوتے ہوں۔

گاڑیاں اور مکان کرائے پر دیے ہوں تو حاصل شدہ آمدنی پر زکوٰۃ

سوال کیا ان گاڑیوں میں جو ٹیکسی کے طور پر استعمال کی جاتی ہوں اور جو اپنے ذاتی استعمال کے لیے ہوں، زکوٰۃ واجب ہے؟

جواب وہ گاڑیاں جو انسان کرائے پر استعمال کرتا ہو یا جنھیں اپنی ذاتی ضرورت کے لیے استعمال کرتا ہو، ان میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

زکوٰۃ ان سے حاصل ہونے والے کرائے میں ہوگی بشرطیکہ وہ نصاب کو پہنچ جاتا ہو یا اس کے پاس جو دیگر سرمایہ ہو اس کے ساتھ مل کر نصاب کے مطابق ہو جاتا ہو اور اس پر سال کی مدت پوری ہو جائے۔ اسی طرح ان عمارتوں میں بھی زکوٰۃ نہیں، جو کرائے پر دی جاتی ہوں، بلکہ زکوٰۃ ان سے وصول ہونے والے کرائے پر ہوگی۔

سوال کرائے پر دیے ہوئے گھر کی زکوٰۃ کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب وہ گھر جو کرائے پر دینے کے لیے ہو، اس کی قیمت میں زکوٰۃ نہیں بلکہ زکوٰۃ اس سے حاصل ہونے والے کرائے میں ہے بشرطیکہ کرائے کے معاہدے پر ایک سال کا عرصہ گزر جائے اور اگر معاہدے پر ایک سال کا عرصہ نہ گزرے تو پھر بھی اس میں زکوٰۃ نہیں ہے، مثلاً ایک شخص نے دس ہزار کے کرائے پر کسی کو اپنا گھر دیا اور اس سے پانچ ہزار معاہدے کے وقت وصول کر لیے اور انہیں خرچ کر لیا اور پھر نصف سال گزرنے کے بعد باقی پانچ ہزار بھی وصول کر لیے اور سال مکمل ہونے سے پہلے انھیں خرچ کر لیا تو اس صورت میں اس پر زکوٰۃ نہیں ہوگی کیونکہ اس مال پر سال پورا نہیں ہوا۔ اگر اس نے گھر تجارت کے لیے رکھا ہو اور وہ اس سے نفع حاصل کرنے کا منتظر ہو اور وہ یہ کہے کہ جب تک یہ گھر فروخت نہیں ہوتا، میں اسے کرائے پر دے دیتا ہوں تو اس صورت میں گھر کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی نیز کرائے پر بھی بشرطیکہ ایک سال کی مدت گزر جائے جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا ہے۔ گھر کی قیمت پر زکوٰۃ اس لیے واجب ہوگی کہ اس گھر کو اس نے تجارت کے لیے رکھا ہے اور اس نے اسے اپنے پاس رکھنے اور اس کا کرایہ حاصل کرنے کے لیے نہیں رکھا اور ہر وہ چیز جس سے مقصود تجارت اور کمائی ہو، اس میں زکوٰۃ ہے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰى»(صحيح البخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله ﷺ وصحيح مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ: "إنما الأعمال بالنية"، ح:١٩٠٧)

”تمام اعمال کا انحصار نیتوں پر ہے اور ہر آدمی کے لیے صرف وہی ہے جو اس نے نیت کی۔“

جس شخص کے پاس اموال ہوں اور وہ ان کے ساتھ کمائی کرنا چاہتا ہو تو اس کی نیت ان کی قیمت کی ہے، ان کی ذات کی نہیں اور ان کی قیمت دراہم اور نقدی ہے اور دراہم اور نقدی میں زکوٰۃ واجب ہے، لہٰذا جس شخص کا مقصد تجارت اور کرایہ وصول کرنا ہو تو اس صورت میں گھر کی قیمت اور اس سے وصول ہونے والے کرائے دونوں میں زکوٰۃ واجب ہوگی بشرطیکہ معاہدے پر ایک سال کا عرصہ گزر جائے۔

پلاٹ پر اس وقت تک زکوٰۃ نہیں جب تک ذاتی رہائش کی نیت ہو

سوال ایک شخص نے ذاتی رہائش کے لیے ایک پلاٹ خریدا تھا مگر تین سال بعد اس نے اس کے بیچنے کی نیت کر لی تاکہ نفع حاصل کرے، تو کیا گزشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ہوگی؟

جواب گزشتہ سالوں کی اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی کیونکہ اس وقت اس کی نیت ذاتی رہائش کی تھی لیکن جب اس نے اسے بیچنے اور اس سے نفع حاصل کرنے کی نیت کر لی تو اس پر ایک سال گزرنے کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

صدقہ فطر کے مسائل

سوال رمضان کے پہلے عشرے ہی میں صدقۃ الفطر ادا کر دینے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب زکوٰۃ فطر کی اضافت فطر کی طرف ہے کیونکہ فطر ہی اس کا سبب ہے، جب فطر رمضان ہی اس کفارے کا سبب ہے تو یہ اسی کے ساتھ مقید ہے، لہٰذا اس سے پہلے ادا نہیں کیا جا سکتا، اس کا افضل وقت عید کے دن نماز عید سے پہلے کا وقت ہے لیکن اسے عید سے ایک یا دو دن پہلے بھی ادا کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں لینے اور دینے والے دونوں کے لیے سہولت ہے۔ اس سے زیادہ دن پہلے ادا کرنے کے بارے میں اہل علم کے اقوال میں سے راجح قول یہ ہے کہ یہ جائز نہیں۔ گویا اس کے لیے دو وقت ہیں: ① وقت جواز اور وہ عید سے ایک یا دو دن پہلے کا وقت ہے۔ ② وقت فضیلت اور وہ عید کے دن نماز سے پہلے کا وقت ہے۔ نماز عید کے بعد تک اُسے مؤخر کرنا حرام ہے، اس سے صدقۃ الفطر ادا نہ ہوگا کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں ہے:

«مَنْ أَدَّاهَا قَبْلَ الصَّلاَةِ فَهِيَ زَكَاةٌ مَقْبُولَةٌ وَمَنْ أَدَّاهَا بَعْدَ الصَّلاَةِ فَهِيَ صَدَقَةٌ مِنَ الصَّدَقَاتِ»(سنن أبي داود، الزكاة، باب زكاة الفطر، ح:١٦٠٩ وسنن ابن ماجه، الزكاة، باب صدقة الفطر، ح:١٨٢٧)

”جس نے اسے نماز سے پہلے ادا کر دیا تو یہ مقبول زکوٰۃ ہے اور جس نے اسے نماز کے بعد ادا کیا تو یہ صدقات میں سے ایک عام صدقہ ہوگا۔“

اگر آدمی کو عید کے دن کا علم نہ ہو، اس لیے کہ وہ جنگل میں رہتا ہو اور اس کا علم اسے تاخیر سے ہوا ہو یا اس طرح کی دیگر صورتوں میں نماز عید کے بعد بھی ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں، اس سے صدقۂ فطر ادا ہو جائے گا۔

سوال کیا صدقے کی نیت سے زکوٰۃ فطر مقررہ مقدار سے زیادہ دینا بھی جائز ہے؟

جواب ہاں یہ جائز ہے کہ انسان فطرانہ زیادہ دے دے اور زیادہ کے بارے میں صدقے کی نیت کر لے جیسا کہ آج کل بعض لوگ ایسا کرتے ہیں، مثلاً اگر کسی نے دس آدمیوں کی طرف سے صدقۂ فطر ادا کرنا ہے، تو وہ چاولوں کی ایک بوری خرید کر اپنے اور اپنے تمام اہل خانہ کی طرف سے صدقۂ فطر کے طور پر دے دیتا ہے تو یہ جائز ہے بشرطیکہ اسے یقین ہو کہ یہ بوری اس کے ذمے واجب صدقے کے مطابق ہے یا اس سے زیادہ ہے کیونکہ صدقے کا وزن اسی لیے واجب قرار دیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ یہ مقدار اس کے مطابق ہے۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہو کہ اس بوری میں یہ مقدار پوری ہے اور پھر ہم یہ بوری فقیر کو دے دیں، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

سوال بعض علماء کہتے ہیں اگر وہ اجناس موجود ہوں جن کا حدیث میں ذکر آیا ہے، تو چاول کو بطور صدقۂ فطر ادا کرنا جائز نہیں، آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

جواب بعض علماء کہتے ہیں کہ جب تک یہ پانچ اجناس گندم، کھجور، جو، کشمش اور پنیر موجود ہوں، تو دیگر اجناس سے صدقۂ فطر ادا کرنا جائز نہیں ہے لیکن یہ قول ان علماء کے قول کے بالکل خلاف ہے جو یہ کہتے ہیں کہ صدقۂ فطر ان اجناس کے علاوہ دیگر اجناس سے حتی کہ نقدی کی صورت میں بھی ادا کرنا جائز ہے، گویا اس مسئلہ میں دو قول ہیں۔ صحیح قول یہ ہے کہ صدقہ فطر ہر اس جنس سے ادا کرنا جائز

ہے جو آدمیوں کے کھانے کے کام آتی ہو جیسا کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كُنَّا نُخْرِجُ فِي عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ يَوْمَ الْفِطْرِ صَاعًا مِنْ طَعَامٍ وَقَالَ أَبُوسَعِيدٍ: وَكَانَ طَعَامَنَا الشَّعِيرُ وَالزَّبِيبُ وَالأَقِطُ وَالتَّمْرُ»(صحيح البخاري، الزكاة، باب الصدقة قبل العيد، ح: ١٥١٠)

''ہم رسول ﷺ کے عہد میں فطر کے دن کھانے کا ایک صاع ادا کیا کرتے تھے۔ ابوسعید کہتے ہیں کہ اس وقت ہمارا کھانا جو، کشمش، پنیر اور کھجور تھی۔''

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے تو گندم کا بھی ذکر نہیں کیا اور مجھے نہیں معلوم کہ کسی صحیح صریح حدیث میں صدقۂ فطر کے ضمن میں گندم کا بھی ذکر آیا ہو لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ صدقۂ فطر میں گندم دینا بھی جائز ہے، پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے:

«فَرَضَ رَسُولُ اللهِ ﷺ زَكَاةَ الْفِطْرِ طُهْرَةً لِلصَّائِمِ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ وَطُعْمَةً لِلْمَسَاكِينِ» (سنن ابن ماجه، الزكاة، باب صدقة الفطر، ح:١٨٣٧ وسنن أبي داود، الزكاة، باب زكاة الفطر، ح:١٦٠٩)

''رسول اللہ ﷺ نے صدقۂ فطر کو فرض قرار دیا جو روزہ دار کو بے ہودہ باتوں اور کاموں سے پاک کر دیتا ہے اور مسکینوں کے لیے کھانا ہے۔''

لہٰذا صحیح بات یہ ہے کہ جو بھی آدمیوں کا کھانا ہو، اسے بطور صدقۂ فطر ادا کرنا جائز ہے، خواہ وہ ان پانچ اجناس سے نہ بھی ہو، جن کو فقہاء نے بیان کیا ہے، کیونکہ یہ اجناس جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، ان میں سے صرف چار رسول ﷺ کے عہد میں لوگوں کے کھانے کے طور پر استعمال ہوتی تھیں، لہٰذا چاول کو بطور صدقۂ فطر ادا کرنا جائز ہے بلکہ میری رائے میں عہد حاضر میں چاول کو بطور صدقۂ فطر دینا افضل ہے کیونکہ یہ کم خرچ اور لوگوں کے ہاں زیادہ پسندیدہ ہے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ حالات مختلف ہو سکتے ہیں، کچھ بادیہ نشین لوگوں کے ہاں کھجور زیادہ پسندیدہ ہو سکتی ہے، لہٰذا انسان انھیں کھجور دے اور دوسری جگہ کچھ لوگوں کے ہاں کشمش زیادہ پسندیدہ ہو سکتی ہے، انھیں انسان کشمش دے، اسی طرح پنیر اور دیگر چیزوں کی بابت کیا جا سکتا ہے۔ پس ہر قوم کے نزدیک افضل وہ چیز ہو گی، جو ان کے لیے زیادہ منفعت بخش ہو۔

کیا فوت شدہ انسان کے مال پر زکوٰۃ ہے؟

سوال ایک شخص کے پاس ایک تہائی مال کسی فوت شدہ انسان کا ہے اور کچھ درہم یتیموں کے ہیں، تو کیا ان میں زکوٰۃ ہے؟

جواب وہ ایک تہائی حصہ جو کسی فوت شدہ کا ہے، اس میں زکوٰۃ نہیں ہے کیونکہ اس کا کوئی مالک نہیں بلکہ وہ تو نیکی کے کاموں کے لیے وقف ہے، البتہ جو یتیموں کے درہم ہیں، ان میں زکوٰۃ واجب ہے۔ یتیموں کا ولی ان کی طرف سے زکوٰۃ ادا کرے گا کیونکہ اہل علم کے مختلف اقوال میں سے صحیح قول یہ ہے کہ زکوٰۃ میں بلوغت اور عقل شرط نہیں ہے کیونکہ زکوٰۃ تو مال میں واجب ہوتی ہے۔

ذاتی استعمال کی گاڑیوں پر زکوٰۃ نہیں

سوال کیا ذاتی استعمال کی گاڑیوں پر زکوٰۃ ہے؟

جواب ان میں زکوٰۃ نہیں ہے اور ہر وہ چیز جسے انسان اپنے لیے استعمال کرے، اس میں زکوٰۃ نہیں ہے، خواہ وہ گاڑی ہو یا اونٹ یا ٹریکٹر البتہ سونے اور چاندی کے زیورات میں زکوٰۃ ہے، خواہ وہ اپنے استعمال کے لیے ہوں کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَيْسَ عَلَى الْمُسْلِمِ فِي عَبْدِهِ وَلاَ فِي فَرَسِهِ صَدَقَةٌ»(صحيح البخاري، الزكاة، باب ليس على المسلم في عبده صدقة، ح:١٤٦٤ وصحيح مسلم، الزكاة، باب لا زكاة على المسلم في عبده وفرسه، ح:٩٨٢)

''مسلمان کے لیے اس کے غلام اور گھوڑے پر زکوٰۃ نہیں ہے۔''

کیا زکوٰۃ دیتے وقت بتانا واجب ہے کہ یہ زکوٰۃ ہے؟

سوال انسان جب کسی مستحق کو زکوٰۃ دے تو کیا اسے یہ بتانا واجب ہے کہ یہ زکوٰۃ ہے؟

جواب جب انسان کسی مستحق کو زکوٰۃ دے اور وہ مستحق ایسا ہو جو زکوٰۃ کو رد کر دیتا اور قبول نہ کرتا ہو تو ایسے مستحق کو بتانا واجب ہے کہ یہ زکوٰۃ ہے تاکہ وہ علی وجہ البصیرت اسے رد یا قبول کرے اور اگر مستحق کی عادت یہ ہو کہ وہ زکوٰۃ لے لیتا ہو تو بہتر یہ ہے اسے نہ بتایا جائے کیونکہ اس میں ایک طرح سے احسان کا پہلو بھی ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تُبْطِلُوا۟ صَدَقَـٰتِكُم بِٱلْمَنِّ وَٱلْأَذَىٰ ﴾ (البقرة: ٢/ ٢٦٤)

''اے مومنو! اپنے صدقات (وخیرات) احسان رکھنے اور ایذا دینے سے برباد نہ کر دینا۔''

کیا زکوٰۃ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جا سکتی ہے؟

سوال ایک جگہ سے دوسری جگہ زکوٰۃ منتقل کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب مصلحت کے پیش نظر انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ زکوٰۃ منتقل کر سکتا ہے۔ اگر انسان کے مستحق رشتہ دار کسی دوسرے شہر میں رہتے ہوں، تو ان کی طرف زکوٰۃ بھیجنے میں کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح انسان کے اپنے شہر کے لوگوں کی مالی حالت بہت اچھی ہو اور وہ کسی دوسرے ایسے شہر میں زکوٰۃ بھیج دے جہاں کے باشندے زیادہ فقیر ہوں تو بھی اس میں کوئی حرج نہیں اور اگر ایک شہر سے دوسرے شہر میں زکوٰۃ بھیجنے میں ایسی کوئی مصلحت نہ ہو تو پھر نہ بھیجی جائے۔

دوسرے شہر میں رہنے والے اہل خانہ کے صدقۂ فطر کی ادائیگی

سوال ایک شخص مکہ میں ہو اور اس کے اہل خانہ ریاض میں، تو کیا وہ ان کی طرف سے مکہ میں صدقۂ فطر ادا کر سکتا ہے؟

جواب انسان کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے اہل خانہ کی طرف سے بھی صدقۂ فطر کسی ایسے شہر میں ادا کرے، جہاں وہ اس کے

ساتھ نہ ہوں، لہٰذا اگر وہ مکہ میں ہو اور اس کے اہل خانہ ریاض میں تو یہ جائز ہے کہ وہ ان کی طرف سے مکہ میں صدقۂ فطر ادا کردے لیکن افضل یہ ہے کہ انسان صدقہ اسی جگہ ادا کرے، جہاں وہ ادا کرنے کے وقت موجود ہے، لہٰذا انسان اگر صدقۂ فطر کے وقت مکہ میں ہو تو وہ مکہ میں ادا کرے اور اگر ریاض میں ہو تو ریاض میں ادا کرے اور اگر بعض افراد مکہ میں ہوں اور بعض ریاض میں تو جو ریاض میں ہوں وہ ریاض میں ادا کردیں اور جو مکہ میں ہو وہ مکہ میں ادا کردیں کیونکہ صدقۂ فطر بدن کے تابع ہے۔

کیا مقروض کو زکوٰۃ دینا افضل ہے یا اس کے قرض خواہ کو؟

سوال کیا یہ افضل ہے کہ انسان مقروض کو زکوٰۃ دے تاکہ وہ خود اپنا قرض ادا کرلے یا انسان خود صاحب قرض کے پاس جاکر اس کی طرف سے قرض ادا کردے؟

جواب حالات مختلف ہوسکتے ہیں۔ اگر مقروض اپنے قرض کو ادا کرنے اور بریٔ الذمہ ہونے کا خواہش مند ہو اور قرض ادا کرنے کے لیے جو دیا جائے، اس میں امین ہو تو ہم اسے دیں گے تاکہ وہ خود اپنا قرض ادا کرے کیونکہ اس میں اس کی ستر پوشی بھی ہے اور اسے قرض کے طلب گاروں کے سامنے شرمندگی سے بچانا بھی ہے۔

اگر مقروض فضول خرچ اور لوگوں کے مال ضائع کرنے والا ہو اور ہم اسے قرض ادا کرنے کے لیے مال دیں اور وہ اس سے غیر ضروری اشیا خرید لے تو ہم اسے نہیں دیں گے بلکہ اس کے صاحب قرض کے پاس جاکر اس سے پوچھیں گے کہ فلاں شخص سے آپ کو کتنا قرض لینا ہے؟ پھر ہم یہ سارا قرض یا اس کا جتنا حصہ ممکن ہوا اسے دے دیں گے۔

ہر ہاتھ پھیلانے والا شخص زکوٰۃ کا مستحق نہیں

سوال کیا ہر وہ شخص جو زکوٰۃ کے لیے ہاتھ پھیلائے، اس کا مستحق ہے؟

جواب ہر وہ شخص جو زکوٰۃ کے لیے ہاتھ پھیلائے وہ اس کا مستحق نہیں ہے کیونکہ بعض لوگ مال کے لیے ہاتھ پھیلا دیتے ہیں، حالانکہ وہ غنی ہوتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ جب قیامت کے دن آئیں گے، تو ان کے چہرے پر گوشت کی بوٹی تک نہ ہوگی۔ وہ قیامت کے دن، جب سب گواہ کھڑے ہوں گے، اس طرح آئے گا کہ اس کے چہرے کی ہڈیاں نظر آرہی ہوں گی۔ والعیاذ باللہ.

اور نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ سَأَلَ النَّاسَ أَمْوَالَهُمْ تَكَثُّرًا فَإِنَّمَا يَسْأَلُ جَمْرًا فَلْيَسْتَقِلَّ أَوْ لِيَسْتَكْثِرْ» (صحيح مسلم، الزكاة، باب كراهة المسألة للناس، ح:١٠٤١)

”جو اپنے مال میں اضافے کے لیے لوگوں سے ان کے اموال کا سوال کرے، تو وہ آگ کے انگارے کا سوال کرتا ہے، اب اس کی مرضی ہے کہ کم کرے یا زیادہ۔“

اس مناسبت سے میں ان لوگوں کو تنبیہ کرتا ہوں جو لوگوں سے چمٹ کر سوال کرتے ہیں، حالانکہ وہ دولت مند ہوتے ہیں بلکہ

میں ہر اس شخص کو تنبیہ کرتا ہوں‘ جو مستحق زکوٰۃ نہ ہو مگر زکوٰۃ قبول کر لے اور میں اس سے کہتا ہوں کہ تو نے زکوٰۃ لے لی‘ حالانکہ تو اس کا مستحق نہ تھا‘ لہٰذا تو حرام کھاتا ہے۔ والعیاذ باللہ. آدمی کو چاہیے کہ وہ اللہ سے ڈرے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«وَمَنْ يَسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللهُ وَمَنْ يَسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللهُ»(صحيح البخاري، الزكاة، باب لا صدقة إلا عن ظهر غنى، ح:١٤٢٧ وصحيح مسلم، الزكاة، باب فضل التعفف والصبر، ح:١٠٥٣ واللفظ له)

”جو شخص عفت اختیار کرے اللہ اسے عفت عطا فرما دے گا اور جو شخص بے نیازی اختیار کرے‘ اللہ اسے بے نیاز کر دے گا۔“

لیکن جب کوئی شخص آپ کی طرف ہاتھ پھیلائے اور آپ کا ظن غالب یہ ہو کہ یہ مستحق ہے اور آپ اسے زکوٰۃ دے دیں تو آپ کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی اور آپ بری الذمہ ہو جائیں گے اور اگر بعد میں معلوم ہو کہ یہ زکوٰۃ کا مستحق نہیں تھا‘ تو زکوٰۃ دوبارہ ادا نہیں کی جائے گی۔ اس کی دلیل اس شخص کا قصہ ہے جس نے مال صدقہ کرنا چاہا تو پہلے ایک زانی عورت کو دے دیا۔ صبح ہوئی تو لوگ باتیں کرنے لگے کہ آج رات ایک زانی عورت کو صدقہ دے دیا گیا ہے۔ اس نے کہا الحمد للہ‘ پھر اس نے دوسری رات صدقہ کیا تو صدقہ ایک چور کے ہاتھ پر رکھ دیا گیا۔ صبح ہوئی تو لوگ باتیں کرنے لگے کہ آج رات ایک چور کو صدقہ دے دیا گیا ہے‘ پھر اس نے تیسری رات ایک دولت مند آدمی کو صدقہ دے دیا۔ صبح ہوئی تو لوگ باتیں کرنے لگے کہ آج رات ایک دولت مند کو صدقہ دے دیا گیا ہے۔ اس نے زانی عورت‘ چور اور دولت مند کو صدقہ دیے جانے پر الحمد للہ کہا۔ تب اس سے کہا گیا کہ تیرا صدقہ قبول ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس مال کی وجہ سے جو تو نے زانی عورت کو دیا ہے‘ وہ زنا سے باز آ جائے‘ ہو سکتا ہے کہ چور اس مال کی وجہ سے چوری کو ترک کر دے اور ہو سکتا ہے کہ دولت مند شخص نصیحت حاصل کر کے خود بھی صدقہ کرنا شروع کر دے۔ ①

بھائی! دیکھو! اگر نیت صادق ہو تو اس کے کیسے ثمرات مرتب ہوتے ہیں‘ لہٰذا اگر آپ کسی ایسے شخص کو زکوٰۃ دے دیں جو آپ سے سوال کرے اور اسے دے دینے کے بعد معلوم ہو کہ وہ تو دولت مند تھا‘ جسے آپ نے فقیر سمجھا تھا تو اس صورت میں زکوٰۃ دوبارہ ادا کرنا لازم نہیں ہے۔

محض تقسیم کنندہ مستحق زکوٰۃ نہیں بن سکتا

سوال ایک دولت مند شخص نے اپنی زکوٰۃ ایک شخص کے پاس بھیجی اور اس سے کہا کہ تمھاری نظر میں جو مستحق ہوں‘ ان میں اسے تقسیم کر دو تو کیا یہ وکیل بھی عاملین زکوٰۃ میں شمار ہو کر زکوٰۃ کا مستحق ہوگا؟

جواب یہ وکیل عاملین اور مستحقین زکوٰۃ میں سے نہیں ہے کیونکہ یہ تو ایک خاص شخص کا خاص وکیل ہے اور قرآنی الفاظ ﴿والعاملین علیها﴾ میں شاید یہی راز ہے۔ واللہ اعلم. کیونکہ حرف علٰی ایک طرح سے ولایت کی ایک قسم کا فائدہ دیتا ہے گویا عاملین‘ قائمین کے معنی میں ہیں‘ لہٰذا جو شخص کسی معین انسان کی طرف سے زکوٰۃ تقسیم کرنے میں نیابت کے فرائض انجام دیتا ہے‘ وہ عاملین زکوٰۃ میں شمار نہیں ہو سکتا۔

---

① صحیح البخاری‘ الزکاۃ‘ باب إذا تصدّق علی غَنِیٍّ وھو لا یعلم‘ حدیث : 1421

تالیف قلب کے لیے زکوٰۃ دینا کیسا ہے؟

سوال کیا کسی کمزور ایمان والے شخص کے ایمان کو تقویت پہنچانے کے لیے زکوٰۃ دی جا سکتی ہے، خواہ وہ اپنی قوم کا سردار نہ بھی ہو؟

جواب اس مسئلے میں علماء میں اختلاف ہے لیکن میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ ایسے شخص کو اسلام سے الفت اور ایمان کی تقویت کیلئے زکوٰۃ دی جا سکتی ہے، خواہ اسے ذاتی حیثیت سے دی جا رہی ہو اور وہ اپنی قوم کا سردار نہ بھی ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مصارف زکوٰۃ کے ضمن میں ''مؤلفۃ القلوب'' کا بھی ذکر فرمایا ہے اور پھر اگر ہم فقیر کو اس کی بدنی وجسمانی حاجت کیلئے زکوٰۃ دیتے ہیں، تو ضعیف الایمان شخص کو ایمان کی تقویت کے لیے زکوٰۃ دینا جائز ہوگا کیونکہ انسان کے لیے جسمانی غذا کی نسبت ایمان کی تقویت کہیں زیادہ اہم ہے۔

کیا طالب علم کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے؟

سوال طالب علم کو زکوٰۃ دینے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب وہ طالب علم جس نے اپنے آپ کو شرعی علم کے حصول کے لیے مصروف کر رکھا ہو، اسے زکوٰۃ دی جا سکتی ہے، خواہ وہ کمانے پر قادر بھی ہو کیونکہ شرعی علم کا حاصل کرنا جہاد فی سبیل اللہ کی ایک قسم ہے اور جہاد فی سبیل اللہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے مصارف زکوٰۃ میں سے قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ۞ إِنَّمَا ٱلصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَٱلْمَسَٰكِينِ وَٱلْعَٰمِلِينَ عَلَيْهَا وَٱلْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِى ٱلرِّقَابِ وَٱلْغَٰرِمِينَ وَفِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَٱبْنِ ٱلسَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ ٱللَّهِ ۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٦٠﴾ ﴾

(التوبة: ٩/ ٦٠)

''صدقات (یعنی زکوٰۃ وخیرات) تو مفلسوں اور محتاجوں اور کارکنان صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلبی منظور ہے اور غلاموں کے آزاد کرانے میں اور قرض داروں کے قرض ادا کرنے میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں (کی مدد) میں (بھی یہ مال خرچ کرنا چاہیے) یہ حقوق اللہ کی طرف سے مقرر کر دیے گئے ہیں اور اللہ جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔''

اگر کوئی طالب علم دنیوی علم کے حصول میں مشغول ہو تو اسے زکوٰۃ نہ دی جائے، اس سے ہم کہیں گے کہ اب تم دنیا کے لیے کام کر رہے ہو اور اس سے تم دنیا کمانے کے لیے ملازمت بھی حاصل کر لو گے، لہٰذا ہم تمھیں زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ اگر ہم کوئی ایسا شخص دیکھیں جو کھانے پینے اور رہائش کے اخراجات کے لیے تو کمائی کر سکتا ہے اور اسے شادی کی ضرورت ہو اور شادی کے اخراجات کے لیے اس کے پاس رقم نہیں تو سوال یہ ہے کہ کیا شادی کے لیے اسے زکوٰۃ دینا جائز ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں اسے شادی کے لیے زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ زکوٰۃ سے مہر کے لیے ساری رقم اسے دی جا سکتی ہے۔ اگر کہا جائے کہ فقیر کو شادی کے لیے رقم دینا اور بہت زیادہ رقم دینا کس طرح جائز ہے؟

ہم کہیں گے اس لیے کہ بسا اوقات انسان کو شادی کی ضرورت بھی کھانے پینے کی ضرورت کی طرح بہت شدید ہوتی ہے۔ اسی لیے اہل علم نے کہا ہے کہ جس پر کسی شخص کا نفقہ لازم ہو تو اسے اس کی شادی کے اخراجات بھی برداشت کرنے چاہییں بشرطیکہ مالی

طور پر وہ استطاعت رکھتا ہو، مثلاً باپ کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی کا بندوبست کرے، جب بیٹے کو شادی کی ضرورت ہو لیکن اس کے پاس شادی کے لیے اخراجات نہ ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ بعض باپ جو جوانی کے دور کی اپنی حالت کو بھول گئے ہیں، ان کا بیٹا جب ان سے شادی کے لیے کہتا ہے تو وہ اسے جواب دیتے ہیں کہ اپنی پیشانی کا پسینہ بہاؤ یعنی خوب محنت کر کے کماؤ اور شادی کر لو۔ یہ جائز نہیں بلکہ اگر اسے اس کی شادی کے اخراجات برداشت کرنے کی قدرت ہو تو پھر اس کا یہ طرز عمل حرام ہے۔ اگر مالی استطاعت کے باوجود وہ اپنے بیٹے کی شادی پر خرچ نہیں کرتا، تو اس کا بیٹا روز قیامت اس سے جھگڑا کرے گا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص کے چند بیٹے ہوں، ان میں سے بعض شادی کی عمر کو پہنچ گئے ہوں اور ان کی اس نے شادی کر دی ہو اور کچھ بیٹے چھوٹے ہوں تو کیا اس شخص کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے چھوٹے بیٹوں کی شادی کے مہر کے لیے کچھ مال کی وصیت کرے کیونکہ اس نے اپنے بڑے بیٹوں کی شادی پر مال خرچ کیا تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جب آدمی اپنے بڑے بیٹوں کی شادی پر خرچ کرے تو اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے چھوٹے بچوں کے لیے وصیت کرے، البتہ یہ واجب ہے کہ جب ان میں سے کوئی شادی کی عمر کو پہنچ جائے، تو اس کی شادی پر بھی اسی طرح خرچ کرے جس طرح اس نے پہلے بیٹے کی شادی پر خرچ کیا تھا۔ اپنی موت کے بعد اس کے لیے وصیت کرنا حرام ہے اور اس کی دلیل نبی ﷺ کا یہ فرمان ہے۔

«إِنَّ اللهَ قَدْ أَعْطٰى كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ»(سنن أبي داود، الوصايا، باب ماجاء في الوصية للوارث، ح: ٢٨٧٠ وجامع الترمذي، الوصايا، باب ماجاء لا وصية لوارث، ح: ٢١٢٠)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق عطا فرما دیا ہے، لہٰذا وارث کے لیے وصیت نہیں ہے۔''

مجاہدین کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے

سوال کیا مجاہدین کو زکوٰۃ دینا جائز ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے اہل زکوٰۃ کی اصناف میں سے مجاہدین فی سبیل اللہ کو بھی قرار دیا ہے، لہٰذا یہ جائز ہے کہ ہم مجاہدین فی سبیل اللہ کو زکوٰۃ دیں لیکن سوال یہ ہے کہ مجاہد فی سبیل اللہ کون ہے؟ مجاہد فی سبیل اللہ کی وضاحت نبی ﷺ نے اس وقت بیان فرما دی تھی جب آپ سے یہ پوچھا گیا کہ ایک شخص شجاعت کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص حمیّت کی خاطر لڑتا ہے اور ایک شخص ناموری کے لیے لڑتا ہے، تو ان میں سے کون فی سبیل اللہ ہے؟ نبی ﷺ نے ہمیں ایک سیدھا اور مبنی بر عدل و انصاف معیار عطا فرما دیا، آپ نے فرمایا:

«مَنْ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللهِ»(صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا، ح: ٢٨١٠)

''جو شخص اس لیے قتال کرے تا کہ اللہ کے کلمے کو سربلندی حاصل ہو تو وہ فی سبیل اللہ ہے۔''

جو شخص بھی اس لیے قتال کرے تا کہ اللہ تعالیٰ کے کلمے کو سربلندی حاصل ہو، اللہ تعالیٰ کی شریعت کو نافذ کیا جائے اور کافر ممالک میں بھی اللہ تعالیٰ کے دین کو پھیلا دیا جائے، تو وہ مجاہد فی سبیل اللہ ہے، اسے زکوٰۃ دی جا سکتی ہے، اسے جہاد میں اعانت کے لیے رقوم

بھی دی جا سکتی ہیں اور جنگ کا ساز و سامان بھی خرید کر دیا جا سکتا ہے۔

مسجدوں کی تعمیر ''فی سبیل اللہ'' میں داخل نہیں

سوال کیا مسجدوں کی تعمیر میں زکوۃ صرف کرنا بھی ﴿وَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ﴾ کی مد میں داخل ہو سکتا ہے؟

جواب مسجدوں کو بنانا ﴿وَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ﴾ کے تحت نہیں آتا کیونکہ مفسرین نے فی سبیل اللہ کی تفسیر جہاد سے کی ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ فی سبیل اللہ سے مراد نیکی کے تمام کام ہیں، تو ﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ﴾ میں حصر کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور جیسا کہ معلوم ہے حصر کے معنی مذکور میں حکم کے اثبات اور اس کے ماسوا کی نفی ہوتی ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ ﴿وَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ﴾ سے نیکی کے تمام کام مراد ہیں، تو آیت کو ﴿اِنَّمَا﴾ کلمہ حصر سے شروع کرنے کا کوئی فائدہ باقی نہیں رہتا۔ مسجدوں کے بنانے اور نیکی کے دیگر کاموں میں زکوۃ صرف کرنے کے جواز سے لوگوں کو نیکی کے کاموں سے روکنا لازم آتا ہے کیونکہ اکثر لوگوں پر بخل کا غلبہ ہوتا ہے اور اگر وہ یہ دیکھیں کہ مسجدوں کے بنانے اور دیگر کاموں میں زکوۃ صرف کرنا جائز ہے، تو وہ زکوۃ کو ان کاموں کی طرف منتقل کر دیں گے اور فقرا و مساکین ہمیشہ کے لیے محتاج رہیں گے۔

قریبی رشتہ داروں کو زکوۃ دینا کیسا ہے؟

سوال قریبی رشتہ داروں کو زکوۃ دینے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اس بارے میں قاعدہ یہ ہے کہ ہر وہ قریبی رشتہ دار، جس کا نفقہ زکوۃ دینے والے پر واجب ہے، اسے زکوۃ نہیں دی جا سکتی جو اس سے رفع نفقہ کا سبب بنے اور اگر قریبی رشتہ دار ایسا ہو، جس کا نفقہ زکوۃ دینے والے پر واجب نہ ہو، مثلاً بھائی جب کہ زکوۃ دینے والے کے اپنے بیٹے موجود ہوں، کیونکہ بھائی کے جب اپنے بیٹے موجود ہوں تو پھر بھائی کا نفقہ اس پر واجب نہیں ہے جیسا کہ بیٹوں کی موجودگی میں بھائی وارث نہیں بن سکتا تو اس صورت میں بھائی اگر مستحق ہو تو اسے زکوۃ دینا جائز ہے۔ اس طرح انسان کے اگر ایسے قریبی رشتہ دار ہوں، جو نفقے کے لیے تو زکوۃ کے محتاج نہ ہوں مگر ان کے ذمہ قرض ہوں، تو ان کے قرضوں کو ادا کرنے کے لیے زکوۃ دینا جائز ہے خواہ قریبی رشتہ دار باپ ہو یا بیٹا یا بیٹی یا ماں بشرطیکہ ان قرضوں کا سبب نفقے میں کوتاہی نہ ہو۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص کے بیٹے سے ایکسیڈنٹ ہو گیا اور جس گاڑی کو اس نے نقصان پہنچایا، اس کا اس پر تاوان آ پڑا، اب اس کے پاس تاوان ادا کرنے کے لیے مال نہیں ہے تو اس تاوان کو ادا کرنے کے لیے باپ زکوۃ کو استعمال کر سکتا ہے کیونکہ اس تاوان کا سبب نفقہ نہیں بلکہ یہ ایک ایسے معاملے کی وجہ سے واجب ہوا ہے جس کا نفقے سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح ہر وہ شخص جس نے کسی ایسے قریبی رشتہ دار کو زکوۃ دے دی جسے دینا اس کے لیے واجب نہ تھا تو اس صورت میں اسے زکوۃ دینا جائز ہے۔

صدقات و زکوۃ رمضان ہی کے ساتھ خاص نہیں

سوال کیا صدقات و زکوۃ رمضان ہی کے ساتھ مخصوص ہیں؟

جواب صدقات ماہ رمضان ہی کے ساتھ خاص نہیں ہیں بلکہ یہ ہر وقت مستحب اور مشروع ہیں اور زکوٰۃ انسان پر اس وقت واجب ہے جب اس کے مال پر ایک سال مکمل ہو گیا ہو، اسے فوراً زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے اور رمضان کا انتظار نہیں کرنا چاہیے اِلَّا یہ کہ رمضان قریب ہو، مثلاً شعبان میں سال پورا ہو گیا ہو تو اس صورت میں رمضان کا انتظار کرنے میں کوئی حرج نہیں اور اگر زکوٰۃ کا سال محرم میں پورا ہو جاتا ہو تو پھر رمضان تک تاخیر کرنا جائز نہیں، البتہ یہ جائز ہے کہ محرم آنے سے پہلے رمضان میں پیشگی زکوٰۃ ادا کر دے لیکن وجوب کے وقت سے تاخیر کرنا جائز نہیں کیونکہ وہ واجبات جو سبب کے ساتھ مقید ہوں، انھیں اس سبب کے وجود کے وقت ادا کرنا ضروری ہے اور اس سے مؤخر کرنا جائز نہیں، پھر آدمی کے پاس اس بات کی بھی تو کوئی ضمانت نہیں کہ جس وقت کے لیے اس نے زکوٰۃ کو مؤخر کیا ہے، اس وقت تک وہ زندہ بھی رہے گا یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ آخرت کو سدھار جائے اور زکوٰۃ اس کے ذمہ باقی رہے اور وارث بھی اسے ادا نہ کریں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وارثوں کو اس کا علم ہی نہ ہو۔ اس طرح زکوٰۃ نکالنے میں سستی کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ مزید کئی اسباب پیدا ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے وہ بعد میں زکوٰۃ ادا ہی نہ کر سکے۔

جہاں تک صدقات کا تعلق ہے، تو صدقے کے لیے کوئی وقت معین نہیں ہے۔ سال کے سارے دنوں میں صدقہ کیا جا سکتا ہے البتہ لوگ اس بات کو ضرور پسند کرتے ہیں کہ وہ صدقہ و زکوٰۃ رمضان میں ادا کریں کیونکہ یہ افضل وقت ہے، جود و سخا کا وقت ہے اور نبی اکرم ﷺ یوں تو جود و سخا میں سب لوگوں سے بڑھے ہوئے تھے مگر رمضان میں جب جبریل قرآن مجید کا دور کرنے کے لیے آپ کے پاس آتے، اس وقت آپ کی جود و سخا کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا تھا، البتہ یہ جاننا واجب ہے کہ رمضان میں زکوٰۃ یا صدقے کی فضیلت کا تعلق وقت کے ساتھ ہے۔ اگر کوئی دوسری فضیلت ایسی نہ ہو جو اس سے بڑھ کر ہو تو پھر دیگر اوقات کی نسبت اس وقت صدقہ و زکوٰۃ دینا افضل ہے اور اگر کوئی دوسری ایسی فضیلت موجود ہو، جو وقت کی فضیلت سے بڑھ کر ہو، مثلاً فقرا کی ضرورت و حاجت شدید ہو تو پھر اسے رمضان تک مؤخر کرنا جائز نہیں۔ اس صورت میں اس وقت کو ترجیح دینی چاہیے جو فقیروں کے لیے زیادہ مفید ہو اور اکثر و بیشتر صورتوں میں فقرا رمضان کے علاوہ دیگر اوقات میں زیادہ ضرورت مند ہوتے ہیں کیونکہ رمضان میں تو صدقہ و زکوٰۃ کی کثرت ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ رمضان میں خود کفیل اور بے نیاز ہو جاتے ہیں جب کہ سال کے باقی دنوں میں انھیں شدید ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا یہ مسئلہ پیش نظر رہنا چاہیے اور وقت کی فضیلت کو دیگر تمام فضیلتوں سے مقدم قرار نہیں دینا چاہیے۔

صدقہ جاریہ وہ ہے جسے انسان خود اپنی طرف سے دے

سوال کیا صدقہ جاریہ وہ ہے جسے انسان نے خود اپنی زندگی میں کیا ہو، یا صدقہ جاریہ وہ ہے، جو اس کی وفات کے بعد اس کی طرف سے اس کے وارث کریں؟

جواب نبی ﷺ کے فرمان:

«إِلاَّ مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ»(صحيح مسلم، الوصية، باب ما يلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته، ح:٤٢٢٣، ١٦٣١(١٤))

''سوائے صدقہ جاریہ کے۔''

سے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ جاریہ وہ ہے جسے انسان خود اپنی طرف سے کرے اور وہ صدقہ جاریہ نہیں ہے' جو اس کے بعد اس کی طرف سے اس کی اولاد کرے کیونکہ اولاد کے حوالے سے تو نبی ﷺ نے فرمایا:

«وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ»(صحيح مسلم، الوصية، باب ما يلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته، ح: ٤٢٢٢، ١٦٣١(١٤)

''نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔''

میت نے اگر کوئی وصیت کی ہو تو وہ صدقہ جاریہ ہو سکتی ہے یا اس نے کوئی چیز وقف کر دی ہو اور اس کی موت کے بعد اس سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہو تو وہ صدقہ جاریہ ہے۔ اسی طرح علم بھی اس کی کمائی ہے' لہٰذا علم نافع بھی صدقہ جاریہ ہے۔ اسی طرح جب اس کی اولاد اس کے لیے دعا کرے' تو اس کا بھی اسے فائدہ ہوتا ہے۔ اگر ہم سے پوچھا جائے کہ اگر میں اپنے والد کی طرف سے دو رکعت نماز پڑھوں تو یہ افضل ہے یا اپنی طرف سے دو رکعت نماز پڑھ کر اپنے والد کے لیے دعا کروں تو یہ افضل ہے؟ تو ہم کہیں گے کہ افضل یہ ہے کہ اپنی طرف سے دو رکعت نماز پڑھو اور اپنے والد کے لیے دعا کرو کیونکہ نبی ﷺ نے اس کی راہنمائی کرتے ہوئے فرمایا:

«أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ»(صحيح مسلم، الوصية، باب ما يلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته، ح: ٤٢٢٣، ١٦٣١(١٤)

''یا نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔''

آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ یا نیک اولاد جو اس کی طرف سے نماز پڑھے یا کوئی دوسرا نیک کام کرے۔

عورت کا اپنے شوہر کے مال سے بلا اجازت صدقہ کرنا جائز نہیں

سوال کیا عورت کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے شوہر کے مال میں سے اپنی طرف سے یا اپنے کسی فوت شدہ عزیز کی طرف سے صدقہ کرے؟

جواب یہ حقیقت معلوم ہے کہ شوہر کا مال' شوہر ہی کا مال ہے' لہٰذا کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں سے صدقہ کرے۔ اگر شوہر نے اسے اجازت دے دی ہو کہ وہ اس کے مال میں سے اپنی طرف سے یا اپنے کسی فوت شدہ عزیز کی طرف سے صدقہ کر سکتی ہے' تو پھر کوئی حرج نہیں اور اگر اس نے اجازت نہ دے رکھی ہو تو پھر اس کے مال میں سے کسی قسم کا صدقہ کرنا بھی حلال نہیں کیونکہ وہ اس کا مال ہے اور کسی مسلمان کا مال اس وقت تک حلال نہیں جب تک وہ خود بطیبِ خاطر اجازت نہ دے دے۔

فقیر آدمی کا تقسیم کے لیے زکوٰۃ لے کر اپنے پاس رکھ لینا کیسا ہے؟

سوال ایک فقیر آدمی اپنے کسی مالدار دوست سے' تقسیم کرنے کے لیے زکوٰۃ وصول کرتا ہے' لیکن پھر اسے اپنے پاس ہی رکھ لیتا ہے' تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب یہ حرام اور خلاف امانت ہے کیونکہ اس کا دوست تو اسے زکوٰۃ اس لیے دیتا ہے کہ یہ اس کی طرف سے وکیل بن کر دوسروں کو زکوٰۃ دے دے لیکن وہ زکوٰۃ خود اپنے پاس ہی رکھ رہا ہے اور اہل علم نے ذکر کیا ہے کہ وکیل کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اس مال کو اپنے لیے استعمال کرے جس میں اسے وکیل بنایا گیا ہو' اس لیے اس شخص کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ اپنے دوست کو بتا دے کہ وہ اس کے دیے ہوئے مال کو خود استعمال کرتا رہا ہے۔ اگر وہ اس کی اجازت دے دے تو بہتر اور اگر وہ اس کی اجازت نہ دے تو اسے یہ مال جسے اس نے اپنے لیے استعمال کیا تھا' اپنے دوست کی طرف سے بطور زکوٰۃ ادا کرنا ہوگا۔

اس مناسبت سے میں اس بات کی طرف بھی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا جسے بعض جاہل لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص فقیر ہونے کی وجہ سے لوگوں سے زکوٰۃ لیتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ اسے غنی کر دیتا ہے اور لوگ اسے فقیر سمجھ کر بدستور زکوٰۃ دیتے رہتے ہیں اور وہ حسب معمول اسے وصول کرتا اور کھاتا رہتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے لوگوں سے نہیں مانگا بلکہ اللہ تعالیٰ نے میری طرف یہ رزق بھیجا ہے تو یہ حرام ہے کیونکہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے غنی کر دیا ہو' اس کے لیے زکوٰۃ لینا حرام ہے۔

کچھ لوگ زکوٰۃ وصول کر کے کسی دوسرے شخص کو دے دیتے ہیں' حالانکہ صاحب زکوٰۃ نے اسے وکیل نہیں بنایا تھا تو یہ بھی حرام ہے اور اس طرح کا تصرف کرنا اس کے لیے حلال نہیں ہے' گو یہ پہلی صورت کی نسبت کم تر گناہ ہے لیکن ہے یہ بھی حرام۔ اگر صاحب زکوٰۃ اس کی اجازت نہ دے اور اس کے تصرف کو جائز قرار نہ دے' تو اس کے لیے واجب ہے کہ یہ رقم اسے واپس کرے۔

* * *

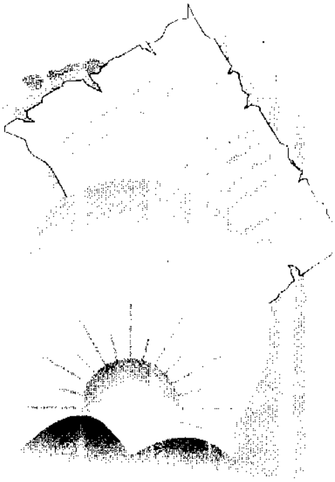

روزہ کے مسائل

روزے کو واجب قرار دینے کی حکمت

سوال روزے کو واجب قرار دینے میں کیا حکمت ہے؟

جواب جب ہم درج ذیل ارشاد باری تعالیٰ پڑھتے ہیں:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ ٱلصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُونَ ١٨٣ ﴾ (البقرة: ۲/ ۱۸۳)

''اے مومنو! تم پر روزے رکھنے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم پرہیز گار بنو۔''

تو اس سے ہمیں روزے کے وجوب کی حکمت معلوم ہو جاتی ہے اور وہ ہے تقویٰ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت۔ تقویٰ ان چیزوں کے ترک کرنے کا نام ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اور یہ ان چیزوں کے سرانجام دینے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جن کا حکم دیا گیا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ وَالْعَمَلَ بِهِ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ» (صحيح البخاري، الصيام، باب من لم يدع قول الزور والعمل به في الصوم، ح: ١٩٠٣)

''جو شخص جھوٹی بات اور اس پر عمل کرنے کو ترک نہ کرے تو اللہ کو اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔''

لہٰذا روزہ دار کو چاہیے کہ وہ نہایت پابندی کے ساتھ واجبات کو ادا کرے' حرام اقوال وافعال سے اجتناب کرے' لوگوں کی غیبت نہ کرے' جھوٹ نہ بولے' چغل خوری نہ کرے' حرام چیز کی بیع نہ کرے۔ الغرض تمام حرام امور سے اجتناب کرے۔ اگر انسان پورا ایک مہینہ اس طرح گزارے گا' تو امید ہے باقی سارا سال بھی اس کا نفس راہ راست پر رہے گا۔

افسوس کہ بہت سے روزہ دار اس میں کوئی فرق نہیں کرتے کہ انہوں نے روزہ رکھا ہے یا نہیں رکھا۔ ترک واجبات اور فعل محرمات کے اعتبار سے ان کے مشاغل حسب عادت جاری رہتے ہیں جس کی وجہ سے آپ کو اس پر روزے کا وقار نظر نہیں آئے گا۔ ان افعال سے گو روزہ باطل نہیں ہوتا لیکن اس کا اجر وثواب یقیناً کم ہو جاتا ہے اور اگر تقابل کیا جائے تو بسا اوقات یہ افعال روزے کے اجر وثواب سے زیادہ ہوتے ہیں' لہٰذا اس کا اجر وثواب ضائع ہو جاتا ہے۔

تمام دنیا کے مطالع کو مکہ کے مطالع سے مربوط کرنا صحیح نہیں

سوال کچھ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ تمام دنیا کے مطالع کو مکہ کے مطالع کے ساتھ مربوط کر دیا جائے تاکہ رمضان المبارک اور دیگر مہینوں کے بیک وقت شروع ہونے سے وحدت امت کا مظاہرہ کیا جا سکے' آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

جواب یہ بات فلکیات کے اعتبار سے محال ہے' جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ہلال کے مطالع مختلف ہیں اور اس بات پر علم فلکیات کے ماہرین کا اتفاق ہے اور جب مطالع مختلف ہیں تو پھر نقلی اور عقلی دلیل کا تقاضا یہ ہے کہ ہر علاقے کا اپنا لحاظ ہو۔

نقلی دلیل حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ ٱلشَّهۡرَ فَلۡيَصُمۡهُ ﴾ (البقرة: ٢/ ١٨٥)

''تو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو اسے چاہیے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے۔''

اگر زمین کے کسی دور دراز کے ملک کے باشندوں نے ہلال نہ دیکھا ہو اور اہل مکہ نے دیکھ لیا ہو تو آیت کے مخاطب وہ لوگ کیسے ہو سکتے ہیں جنہوں نے ابھی ہلال نہ دیکھا ہو۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ وَأَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ»(صحيح البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ: "إذا رأيتم الهلال ..."، ح:١٩٠٩ وصحيح مسلم، الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال، ح:١٠٨١(١٨)

''چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور اسے دیکھ کر ہی روزہ رکھنا ترک کرو۔''

اگر اہل مکہ نے چاند دیکھ لیا ہو تو ہم اہل پاکستان اور ان کے پیچھے دونوں مشرقی جانب کے ملکوں کے باشندوں کے لیے روزے کو کیسے لازم قرار دے سکتے ہیں جب کہ ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ ان کے افق پر ہلال طلوع نہیں ہوا اور نبی ﷺ نے روزے کو رویت ہلال کے ساتھ مشروط قرار دیا ہے۔

جہاں تک عقلی دلیل کا تعلق ہے تو وہ قیاس صحیح ہے، جس کا معارضہ ممکن ہی نہیں اور وہ یہ کہ ہمیں خوب معلوم ہے کہ زمین کی مشرقی جہت میں فجر مغربی جہت سے پہلے طلوع ہوتی ہے، تو مشرقی جہت میں جب طلوع فجر ہو جائے، تو کیا مغربی جہت میں رہنے والے ہم لوگوں کے لیے بھی یہ لازم ہوگا کہ ہم کھانے پینے سے رک جائیں جب کہ ہمارے ہاں تو ابھی رات ہوگی؟ اس کا جواب یقیناً یہ ہوگا کہ نہیں ہمارے لیے یہ لازم نہیں ہوگا اسی طرح جب مشرقی جہت میں سورج غروب ہو جائے اور ہمارے ہاں ابھی تک دن ہو تو کیا ہمارے لیے روزہ افطار کرنا جائز ہوگا؟ ہمارا جواب یقیناً یہ ہوگا کہ نہیں ہلال بھی مکمل طور پر سورج ہی کی طرح ہے۔ ہلال کا دورانیہ ماہانہ ہے جب کہ سورج کا دورانیہ یومیہ ہے اور جس ذات پاک کا یہ ارشاد ہے:

﴿ أُحِلَّ لَكُمۡ لَيۡلَةَ ٱلصِّيَامِ ٱلرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمۡۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمۡ وَأَنتُمۡ لِبَاسٌ لَّهُنَّۗ عَلِمَ ٱللَّهُ أَنَّكُمۡ كُنتُمۡ تَخۡتَانُونَ أَنفُسَكُمۡ فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ وَعَفَا عَنكُمۡۖ فَٱلۡـَٔـٰنَ بَٰشِرُوهُنَّ وَٱبۡتَغُواْ مَا كَتَبَ ٱللَّهُ لَكُمۡۚ وَكُلُواْ وَٱشۡرَبُواْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ ٱلۡخَيۡطُ ٱلۡأَبۡيَضُ مِنَ ٱلۡخَيۡطِ ٱلۡأَسۡوَدِ مِنَ ٱلۡفَجۡرِۖ ثُمَّ أَتِمُّواْ ٱلصِّيَامَ إِلَى ٱلَّيۡلِۚ وَلَا تُبَٰشِرُوهُنَّ وَأَنتُمۡ عَٰكِفُونَ فِي ٱلۡمَسَٰجِدِۗ تِلۡكَ حُدُودُ ٱللَّهِ فَلَا تَقۡرَبُوهَاۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ ءَايَٰتِهِۦ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَّقُونَ ١٨٧ ﴾ (البقرة: ٢/ ١٨٧)

''روزوں کی راتوں میں تمہارے لیے عورتوں کے پاس جانا جائز کر دیا گیا ہے، وہ تمھارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم (ان کے پاس جانے سے) اپنے حق میں خیانت کرتے تھے، سو اس نے تم پر مہربانی کی اور تمھاری حرکات سے درگزر فرمایا اب (تم کو اختیار ہے کہ) ان سے مباشرت کرو اور اللہ نے جو چیز تمہارے لیے لکھ رکھی ہے (یعنی اولاد) اس کو (اللہ سے) طلب کرو اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے، پھر روزہ رکھ کر اسے رات تک پورا کرو اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو تو ان سے مباشرت نہ کرو۔ یہ اللہ کی حدیں

ہیں ان کے پاس نہ جانا۔ اسی طرح اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے (سمجھانے کے) لیے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ وہ پرہیزگار بنیں۔" اسی نے یہ بھی فرمایا ہے:

﴿ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ ٱلشَّهۡرَ فَلۡيَصُمۡهُۖ ﴾ (البقرۃ: ۲/ ۱۸۵)

"تو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو اسے چاہیے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے۔"

لہٰذا نقلی و عقلی دلیل کا تقاضا یہ ہے کہ روزہ رکھنے اور نہ رکھنے کے اعتبار سے ہم ہر علاقے کے لیے وہ حکم لگائیں جو اس کے ساتھ خاص ہے اور اسے اس جیسی علامت کے ساتھ مشروط قرار دیا جائے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور اس کے نبی حضرت محمد ﷺ نے اپنی سنت میں بیان فرمایا ہے اور وہ ہے چاند، سورج یا فجر کی موجودگی!

انسان جس علاقے میں ہو اُسی کی رؤیت کے مطابق روزہ افطار کرے

سوال جب روزہ دار ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں منتقل ہو جائے اور پہلے علاقے میں ہلال شوال کی رویت کا اعلان کر دیا گیا ہو تو کیا وہ ان کی متابعت میں روزہ چھوڑ دے گا جب کہ دوسرے علاقے میں ابھی ہلال شوال نظر نہ آیا ہو؟

جواب جب انسان ایک اسلامی ملک سے دوسرے ملک میں جائے اور وہاں ابھی چاند نظر نہ آیا ہو تو وہ ان کے ساتھ روزے کی حالت میں رہے گا حتی کہ وہاں بھی چاند نظر آ جائے کیونکہ روزہ وہ ہے جس دن لوگ روزہ رکھیں اور فطر وہ ہے جس دن لوگ عید الفطر منائیں اور اضحیٰ وہ ہے جس دن لوگ قربانی کریں۔ ملک کی پابندی کرنا ہو گی خواہ اس صورت میں ایک یا ایک سے زیادہ دنوں کا اضافہ ہو جائے، یہ ایسے ہی ہے جیسے وہ کسی ایسے ملک کی طرف سفر کرے جہاں غروب آفتاب متاخر ہو تو ہو سکتا ہے کہ اس طرح معمول کے دن سے دو یا تین یا اس بھی زیادہ گھنٹے تک اس کے دن میں اضافہ ہو جائے اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ جب وہ دوسرے ملک منتقل ہوا تو وہاں تو ابھی ہلال نظر نہیں آیا تھا اور نبی ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم چاند دیکھ کر روزہ رکھیں۔ اسی طرح آپ نے فرمایا ہے:

«أَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ»(صحيح البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ: "إذا رأيتم الهلال"، ح:۱۹۰۹ وصحيح مسلم، الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال، ح:۱۰۸۱(۱۸)

"چاند دیکھ کر ہی روزے رکھنا بند کرو۔"

اور اس کے برعکس صورت یہ ہے کہ مثلاً وہ ایسے ملک سے منتقل ہو جس میں مہینے کا آغاز متاخر ہوا تھا اور ایسے ملک میں جائے جہاں مہینے کا آغاز پہلے ہو گیا تھا تو وہ انہی کے ساتھ روزے رکھنا چھوڑ دے گا اور رمضان کے جتنے دن وہ روزے نہ رکھ سکا وہ بعد میں ان کی قضا ادا کرے گا۔ اگر ایک روزہ نہیں رکھ سکا تو ایک اور اگر دو روزے نہیں رکھ سکا تو دو کی قضا ادا کرے گا۔ دوسری صورت میں قضا کا ہم نے اس لیے کہا ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ مہینہ انتیس دن سے کم یا تیس دن سے زیادہ ہو، ہم اس سے کہیں گے کہ تم بھی روزے رکھنا بند کر دو خواہ تمہارے انتیس دن پورے نہ بھی ہوئے ہوں کیونکہ چاند نظر آ گیا ہے۔ جب شوال کا چاند نظر آ گیا ہے، تو ضروری ہے کہ روزے رکھنے بند کر دیے جائیں اور اگر آپ کے روزے انتیس سے کم ہیں تو آپ کے لیے لازم ہے کہ اپنے انتیس روزے

پورے کریں کیونکہ مہینہ انتیس دن سے کم کا نہیں ہو سکتا بخلاف پہلے مسئلے کے کہ آپ روزے رکھنا بند نہیں کریں گے حتیٰ کہ چاند نظر آجائے‘ اگر نظر نہ آئے تو آپ ابھی تک ماہ رمضان ہی میں ہوں گے‘ لہٰذا روزہ چھوڑ نہیں سکتے۔ روزہ رکھنا آپ کے لیے لازم ہے‘ خواہ مہینے کے دن زیادہ ہی کیوں نہ ہوں‘ یہ ایسے ہے جیسے دن میں گھنٹوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

پُر مشقت کام کی وجہ سے روزہ ترک کرنا جائز نہیں

سوال جس شخص کا کام بہت محنت مشقت کا ہو اور روزہ رکھنا اس کے لیے دشوار ہو تو کیا اس کے لیے روزے نہ رکھنے کی اجازت ہے‘ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

جواب میری اس مسئلے میں رائے یہ ہے کہ کام کی وجہ سے روزہ نہ رکھنا حرام ہے‘ جائز نہیں۔ اگر کام کے ساتھ روزہ رکھنا ممکن نہ ہو تو وہ رمضان میں چھٹی لے لے تاکہ رمضان میں روزے رکھ سکے کیونکہ رمضان کا روزہ ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن ہے‘ اس میں کوتاہی جائز نہیں۔

ایام حیض کے روزوں کی قضا ادا کرنا ضروری ہے

سوال ایک چھوٹی لڑکی کے ایام شروع ہو گئے اور وہ جہالت کی وجہ سے ایام حیض میں بھی روزے رکھتی رہی‘ اب اس پر کیا واجب ہے؟

جواب اس پر واجب ہے کہ وہ ان دنوں کی قضا ادا کرے‘ جتنے دن ایام حیض میں اس نے روزے رکھے کیونکہ ایام حیض میں روزہ قابل قبول اور صحیح نہیں ہے‘ خواہ وہ جاہل ہی ہو اور ادائے قضا کے لیے وقت کی کوئی حد نہیں ہے۔ مسئلے کی ایک صورت اس کے برعکس بھی ہے اور وہ یہ کہ چھوٹی لڑکی کے ایام شروع ہو گئے اور اس نے حیا کی وجہ سے گھر والوں کو نہ بتایا اور روزے بھی نہ رکھے تو اس پر اس مہینے کے روزوں کی قضا واجب ہے‘ جو اس نے نہیں رکھے تھے کیونکہ عورت کو جب حیض آنا شروع ہو جائے‘ تو اس کے لیے احکام شریعت کی پابندی واجب ہو جاتی ہے کیونکہ حیض بلوغت کی علامات میں سے ہے۔

کمائی کرنے کی وجہ سے روزے نہ رکھنے والے کے متعلق حکم

سوال ایک آدمی نے اپنے اور اپنے بچوں کے لیے کمائی کرنے کی وجہ سے رمضان کے روزے ترک کر دیے‘ تو اس کیلئے کیا حکم ہے؟

جواب یہ شخص جس نے ماہ رمضان کے روزے اس لیے نہ رکھے کہ وہ اپنے اور اپنے بچوں کے لیے کمائی کر رہا تھا‘ اگر اس نے یہ کام تاویل سے کام لے کر یہ گمان کرتے ہوئے کیا کہ جیسے مریض کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ روزے نہ رکھے‘ اسی طرح اس شخص کے لیے بھی جائز ہے‘ جو روزہ ترک کیے بغیر کام نہ کر سکتا ہو کہ روزے کو چھوڑ دے تو یہ شخص اگر زندہ ہے تو اسے رمضان کے ان روزوں کی قضا ادا کرنا ہوگی اور اگر فوت ہو گیا ہے‘ تو اس کی طرف سے روزے رکھے جائیں گے۔ اگر اس کا وارث اس کی طرف سے روزے نہ رکھے تو وہ اس کی طرف سے ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ اگر اس نے تاویل کے بغیر روزے ترک کیے‘ تو پھر اہل علم کے اقوال میں سے راجح قول یہ ہے کہ ہر وہ عبادت جس کا وقت مقرر ہے‘ جب انسان اسے بلا عذر وقت مقرر پر ادا نہ کرے تو وہ قبول نہیں ہوتی لہٰذا اسے کثرت کے ساتھ اعمال صالحہ نوافل اور استغفار کرنا چاہیے۔ اس کی دلیل نبی ﷺ کا یہ فرمان ہے‘ جو صحیح حدیث میں ہے:

«مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح البخاري، البيوع، باب النجش معلقًا قبل، ح:٢١٤٢ وصحيح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة ورد محدثات الأمور، ح:١٧١٨(١٨)

’’جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس پر ہمارا امر نہیں ہے‘ تو وہ مردود ہے۔‘‘

جس طرح وقت مقررہ کی عبادت کو قبل از وقت سرانجام نہیں دیا جاسکتا‘ اسی طرح اسے بعد از وقت بھی سرانجام نہیں دیا جاسکتا الا یہ کہ جہالت اور نسیان جیسا کوئی عذر ہو۔ نسیان کے بارے میں نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ نَسِيَ صَلاَةً أَوْ نَامَ عَنْهَا فَكَفَّارَتُهَاأَنْ يُصَلِّيَهَا إِذَا ذَكَرَهَا - وفي رواية - لاَ كَفَّارَةَ لَهَا إِلاَّ ذٰلِكَ»(صحيح مسلم، المساجد، باب قضاء الصلاة الفائتة، ح:٦٨٤، ٣١٤، ٣١٥)

’’جو شخص نماز کو بھول جائے یا نماز کے وقت سو جائے‘ تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے اسی وقت پڑھ لے جب اسے یاد آئے۔‘‘

اور ایک روایت میں ہے: ’’اس کا کفارہ بس یہی ہے۔‘‘

البتہ جہالت کا مسئلہ بھی تفصیل طلب ہے لیکن یہ تفصیل کا موقع نہیں۔

کس عذر کی وجہ سے روزہ چھوڑنا جائز ہے؟

سوال وہ کون سے عذر ہیں جن کی وجہ سے روزہ چھوڑنا جائز ہے؟

جواب وہ عذر جن کی وجہ سے روزہ چھوڑنا جائز ہے‘ مرض اور سفر ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اسی طرح ایک عذر یہ بھی ہے کہ عورت حاملہ ہو اور روزہ رکھنے کی صورت میں اسے اپنے یا اپنے بچے کے بارے میں خطرہ ہو۔ اسی طرح وہ عورت بھی معذور ہے جو بچے کو دودھ پلاتی ہو اور روزے کی صورت میں اسے اپنے یا اپنے بچے کے بارے میں خطرہ ہو۔ اسی طرح یہ عذر بھی قابل قبول ہے کہ کوئی انسان کسی معصوم کو تباہی سے بچانے کے لیے روزہ چھوڑنے پر مجبور ہو‘ مثلاً وہ دیکھے کہ ایک شخص دریا میں ڈوب رہا ہے یا ایک شخص ایسی عمارت میں پھنسا ہوا ہے جس کو آگ لگ گئی ہے اور وہ اسے بچانے کے لیے روزہ چھوڑنے پر مجبور ہو تو اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اس کی جان بچانے کے لیے روزہ چھوڑ دے اسی طرح جہاد فی سبیل اللہ کے لیے طاقت وقوت کی خاطر روزہ چھوڑنا بھی جائز ہے کیونکہ نبی ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا تھا:

«إِنَّكُمْ قَدْ دَنَوْتُمْ مِنْ عَدُوِّكُمْ وَالْفِطْرُ أَقْوٰى لَكُمْ»(صحيح مسلم، الصيام، باب أجر المفطر في السفر إذا تولى العمل، ح:١١٢٠)

’’تم اپنے دشمن کے قریب پہنچ چکے ہو اور روزہ نہ رکھنا تمہارے لیے موجب قوت ہے۔‘‘

لہٰذا جب کوئی ایسا سبب موجود ہو جس کی وجہ سے روزہ چھوڑنا جائز ہو اور انسان اس عذر کی وجہ سے روزہ چھوڑ دے‘ تو دن کے باقی حصے میں اس کے لیے کھانے پینے وغیرہ سے رکنا لازم نہ ہوگا‘ مثلاً اگر ایک شخص نے کسی معصوم کو ہلاکت سے بچانے کے لیے روزہ چھوڑا تو وہ اسے بچانے کے بعد بھی روزے کو چھوڑے رکھے گا کیونکہ روزہ اس نے ایک جائز سبب سے چھوڑا تھا‘ تو باقی دن کھانے پینے سے رکنا اس کے لیے لازم نہیں ہوگا کیونکہ روزہ چھوڑنے کے جائز سبب کی وجہ سے اس کے لیے اس دن کی حرمت

زائل ہوگئی' لٰہذا اس مسئلہ میں راجح قول کی بنیاد پر ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی مریض دن کے وقت صحت یاب ہوجائے اور اس نے روزہ چھوڑا ہوا ہو تو اس کے لیے کھانے پینے سے رکنا لازم نہ ہوگا اور اگر حائضہ دن کو پاک ہوجائے تو اس کے لیے بھی دن کے باقی حصے میں کھانے پینے سے رکنا لازم نہیں ہے کیونکہ ان سب لوگوں نے جائز سبب کی وجہ سے روزہ چھوڑا تھا۔ ان کے حق میں اس دن روزے کی حرمت نہیں ہوگی کیونکہ شریعت نے ان کے لیے روزہ چھوڑ دینے کو جائز قرار دیا ہے' لٰہذا ان کے لیے کھانا پینا ترک کرنا لازم نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر دن کے وقت ماہ رمضان کے آغاز کا علم ہوجائے تو پھر باقی سارا دن کھانا پینا چھوڑ دینا لازم ہے اور ان دونوں صورتوں میں فرق لازم ہے کیونکہ دن کے وقت جب دلیل کے ساتھ رمضان کا آغاز ثابت ہوگیا' تو اس دن ان کے لیے کھانے پینے سے رکنا واجب ہے اور دلیل قائم ہونے سے قبل جہالت کی وجہ سے وہ معذور تھے۔ اس لیے اگر انھیں یہ معلوم ہوجائے کہ آج رمضان ہے' تو ان کے لیے کھانے پینے سے رکنا لازم ہوگا لیکن دوسرے لوگ جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے' ان کے لیے علم کے باوجود روزہ چھوڑنا جائز ہے اور دونوں صورتوں میں فرق ظاہر ہے۔

جسے طلوع فجر کے بعد معلوم ہو کہ آج روزہ ہے' وہ کچھ نہ کھائے پیے

سوال ایک شخص مہینہ ثابت ہونے سے قبل رمضان کی پہلی رات سو گیا اور اس نے رات کو روزے کی نیت نہ کی اور طلوع فجر کے بعد اسے معلوم ہوا کہ آج رمضان ہے تو اس حالت میں وہ کیا کرے؟ کیا اس دن کے روزے کی قضا ادا کرے گا؟

جواب یہ شخص جو مہینہ ثابت ہونے سے پہلے رمضان کی پہلی رات کو سو گیا تھا اور رات کو اس نے روزے کی نیت نہیں کی' پھر وہ بیدار ہوا تو طلوع فجر کے بعد اسے معلوم ہوا کہ آج رمضان ہے تو جب اسے یہ معلوم ہو تو اس کے لیے کھانے پینے سے رک جانا واجب ہے اور جمہور اہل علم کے نزدیک اس پر اس دن کی قضا واجب ہے۔ میرے علم کے مطابق شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے علاوہ اور کسی نے اس مسئلے میں مخالفت نہیں کی۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ نیت علم کے تابع ہے اور اسے تو مہینے کے آغاز کا علم ہی نہیں تھا' لٰہذا وہ معذور ہے' اس نے علم کے بعد رات کی نیت کو ترک نہیں کیا کیونکہ وہ تو جاہل اور معذور ہے' لٰہذا علم ہو جانے کے بعد جب وہ کھانا پینا ترک کرے تو اس کا روزہ رکھنا صحیح ہوگا اور اس قول کے مطابق اس کے ذمے قضا لازم نہ ہوگی۔

جمہور علماء کے نزدیک اس کے لیے کھانے پینے سے رکنا لازم ہوگا اور اس کی قضا بھی لازم ہوگی اور انہوں نے اس کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ اس نے دن کا ایک حصہ نیت کے بغیر گزارا ہے۔ میری رائے میں اس شخص کے حق میں احتیاط اس بات میں ہے کہ وہ اس دن کی قضا ادا کرے۔

روزہ نہ رکھنے کا عذر ختم ہونے پر کھانا پینا کیسا ہے؟

سوال جب کوئی انسان عذر کی وجہ سے روزہ چھوڑ دے اور پھر دن کو کسی وقت عذر ختم ہوجائے تو کیا دن کے باقی حصے میں وہ کھانے پینے سے رک جائے؟

جواب اس کے لیے کھانے پینے سے رکنا لازم نہیں ہے کیونکہ اس شخص نے شریعت کی دلیل کی بنیاد پر روزہ چھوڑا تھا۔ شریعت نے

اس شخص کے لیے دوائی کے استعمال کو جائز قرار دیا ہے جو دوائی کھانے کے لیے مجبور ہو، لہٰذا جب وہ دوائی کھائے گا تو اس کا روزہ جاتا رہے گا، نیز اس شخص کے حق میں اس دن کی حرمت ثابت نہیں ہے کیونکہ اسے روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی گئی ہے' البتہ اس کے لیے قضا لازم ہوگی۔ اسے پابند کرنا کہ وہ کھانے پینے سے باز رہے شرعاً درست نہیں ہے۔ اس کی مثال اس طرح ہے جیسے کوئی یہ دیکھے کہ ایک شخص پانی میں غرق ہو رہا ہے اور وہ کہے کہ اگر میں پانی پی لوں تو اسے غرق ہونے سے بچا سکتا ہوں اور اگر پانی نہ پیوں تو میرے لیے اسے بچانا ممکن نہیں تو وہ پانی پی لے اور اسے بچا لے اور باقی سارا دن بھی کھا پی لے کیونکہ اس شخص کے حق میں آج کی حرمت نہیں ہے' اس لیے کہ اس نے بمقتضائے شریعت آج روزہ چھوڑا تھا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص مریض ہو تو کیا ہم اس مریض سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ تجھے جب بھوک لگے تو کھانا نہ کھا اور پیاس لگے تو پانی نہ پی؟ یہ ہم اس سے نہیں کہہ سکتے کیونکہ مریض کے لیے روزہ چھوڑ دینا جائز قرار دیا گیا ہے' تو ہر وہ شخص جو دلیل شرعی کے ساتھ رمضان کا روزہ چھوڑے' اس کے لیے کھانے پینے سے باز رہنا لازم نہیں۔ اور اگر صورت حال اس کے برعکس ہو تو اس کا حکم بھی برعکس ہوگا یعنی جو شخص بغیر عذر کے روزہ چھوڑ دے' تو اس کے لیے کھانے پینے سے باز رہنا لازم ہے کیونکہ اس کے لیے روزہ چھوڑنا حلال نہیں تھا۔ اس نے شریعت کی اجازت کے بغیر آج کے دن کی بے حرمتی کی ہے' لہٰذا اس کے لیے لازم ہے کہ دن کے باقی حصے میں نہ کھائے پیے اور اس کے لیے ادائے قضا بھی لازم ہوگی۔ واللہ اعلم

دائمی مریض روزے کے بجائے ہر دن کے عوض مسکین کو کھانا کھلا دے

سوال ایک عورت جلطہ (مرگی وغیرہ) کے مرض میں مبتلا ہے اور اطبا نے اسے روزے رکھنے سے منع کیا ہے' تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ شَهۡرُ رَمَضَانَ ٱلَّذِیٓ أُنزِلَ فِیهِ ٱلۡقُرۡءَانُ هُدٗى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنَٰتٖ مِّنَ ٱلۡهُدَىٰ وَٱلۡفُرۡقَانِۚ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ ٱلشَّهۡرَ فَلۡیَصُمۡهُۖ وَمَن كَانَ مَرِیضًا أَوۡ عَلَىٰ سَفَرٖ فَعِدَّةٞ مِّنۡ أَیَّامٍ أُخَرَۗ یُرِیدُ ٱللَّهُ بِكُمُ ٱلۡیُسۡرَ وَلَا یُرِیدُ بِكُمُ ٱلۡعُسۡرَ ﴾ (البقرۃ: ۲/ ۱۸۵)

''رمضان کا مہینہ (وہ ہے) جس میں قرآن نازل ہوا' جو لوگوں کا رہنما ہے اور (جس میں) ہدایت کی نشانیاں ہیں اور (جو حق و باطل کو) الگ الگ کرنے والا ہے تو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو اسے چاہیے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں (رکھ کر) ان کا شمار پورا کر لے۔ اللہ تمھارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا۔''

اور اگر مریض ایسا ہو جس کے صحت یاب ہونے کی امید نہ ہو تو وہ ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلا دے اور کھانا کھلانے کی کیفیت یہ ہے کہ ان میں چاول کی صورت میں کھانا تقسیم کر دے اور زیادہ بہتر ہے کہ سالن وغیرہ کے لیے چاولوں کے ساتھ گوشت بھی دے دے' یا مسکینوں کو بلا کر دو پہر یا رات کا کھانا کھلا دے۔ یہ حکم ہے اس مریض کے بارے میں جس کے صحت یاب ہونے کی

امید نہ ہو اور وہ مریض عورت جس کا سائل نے ذکر کیا ہے' اسی قسم کی ہے' لہٰذا اس کے لیے واجب ہے کہ ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔

مسافر کے نماز روزے کا حکم

سوال مسافر کا نماز روزہ کب اور کیسے ہو گا؟

جواب مسافر کی نماز شہر سے نکلنے سے لے کر واپس آنے تک دو رکعتیں ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے:

«اَلصَّلاَةُ أَوَّلُ مَا فُرِضَتْ رَكْعَتَيْنِ فَأُقِرَّتْ صَلاَةُ السَّفَرِ وَأُتِمَّتْ صَلاَةُ الْحَضَرِ - وفي رواية - وَزِيْدَ فِي صَلاَةِ الْحَضَرِ»(صحيح البخاري، تقصير الصلاة، باب يقصر إذا خرج من موضعه، ح: ١٠٩٠ وصحيح مسلم، صلاة المسافرين وقصرها، باب صلاة المسافرين وقصرها، ح: ٦٨٥)

''نماز پہلے پہل دو رکعتیں فرض قرار دی گئی تھیں، پھر سفر کی نماز کو تو برقرار رکھا گیا اور حضر کی نماز کو پورا کر دیا گیا۔''

اور ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں: ''حضر کی نماز میں اضافہ کر دیا گیا۔''

اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ مِنَ الْمَدِينَةِ إِلٰى مَكَّةَ فَكَانَ يُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ حَتّٰى رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ»(صحيح البخاري، تقصير الصلاة، باب ماجاء في التقصير، ح: ١٠٨١ وصحيح مسلم، صلاة المسافرين وقصرها، باب صلاة المسافرين وقصرها، ح: ٦٩٣)

''ہم نبی ﷺ کے ساتھ مدینے سے مکے کی طرف نکلے' تو آپ دو دو رکعت نماز پڑھتے رہے حتی کہ ہم مدینے لوٹ آئے۔''

مسافر اگر مقیم امام کے ساتھ نماز پڑھے تو چار رکعتیں پڑھے' خواہ وہ شروع سے نماز میں شامل ہو یا اس کا کچھ حصہ فوت ہو گیا ہو۔ نبی ﷺ کے حسب ذیل فرمان کے عموم کا یہی تقاضا ہے:

«إِذَا سَمِعْتُمُ الإِقَامَةَ فَامْشُوا إِلَى الصَّلاَةِ وَعَلَيْكُمْ بِالسَّكِينَةِ وَالْوَقَارِ وَلاَ تُسْرِعُوا فَمَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوا وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوا»(صحيح البخاري، الأذان، باب لا يسعى إلى الصلاة وليأت بالسكينة والوقار، ح: ٦٣٦)

''جب تم اقامت کو سن لو تو نماز کی طرف چلو اور سکون و وقار کے ساتھ چلو اور تیز نہ چلو۔ جو حصہ پا لو اسے پڑھ لو اور جو فوت ہو جائے اسے پورا کر لو۔''

آپ کا یہ فرمان کہ جو حصہ پالو اسے پڑھ لو اور جو فوت ہو جائے اسے پورا کر لو ان مسافروں کے لیے بھی ہے جو چار رکعت پڑھنے والے امام کے پیچھے پڑھیں اور دیگر لوگوں کے لیے بھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا: کیا وجہ ہے کہ مسافر انفرادی طور پر نماز پڑھے تو دو رکعتیں پڑھتا ہے اور جب مقیم امام کی اقتدا میں پڑھے تو چار رکعتیں پڑھتا ہے تو انہوں نے جواب دیا: سنت طریقہ یہی ہے۔ مسافر سے بھی نماز باجماعت ساقط نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا تو حالت جنگ میں بھی حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَوٰةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوٓا۟ أَسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوا۟ فَلْيَكُونُوا۟ مِن وَرَآئِكُمْ وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا۟ فَلْيُصَلُّوا۟ مَعَكَ﴾

(النساء: ٤/ ١٠٢)

’’اور (اے پیغمبر) جب تم ان (مجاہدین کے لشکر) میں ہو اور ان کو نماز پڑھانے لگو تو چاہیے کہ ان کی ایک جماعت تمھارے ساتھ مسلح ہو کر کھڑی رہے، پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو پیچھے ہو جائیں، پھر دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی (ان کی جگہ) آئے اور تمھارے ساتھ نماز ادا کرے۔‘‘

مسافر جب اپنے شہر کے علاوہ دوسرے شہر میں ہو تو واجب ہے کہ جب اذان سنے تو نماز یا جماعت ادا کرنے کے لیے مسجد میں آئے اِلّا یہ کہ وہ مسجد سے دور ہو یا ساتھیوں کے گم ہونے کا اندیشہ ہو۔ اذان و اقامت سننے والے پر وجوب نماز باجماعت کے دلائل کے عموم کا یہی تقاضا ہے۔ مسافر ظہر، مغرب اور عشا کی سنن مؤکدہ کے علاوہ دیگر تمام نوافل ادا کر سکتا ہے۔ وہ نماز وتر، تہجد، ضحیٰ، صبح کی سنتیں اور دیگر غیر مؤکدہ نوافل پڑھ سکتا ہے۔ اگر مسافر چل رہا ہو تو اس کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ ظہر و عصر اور مغرب و عشا کو جمع کر کے پڑھے جس طرح اس کے لیے آسانی ہو، جمع تقدیم و تاخیر کر سکتا ہے، جس کام میں زیادہ آسانی ہو، وہ افضل ہے۔ اگر مسافر کسی جگہ مقیم ہو گیا ہو تو افضل یہ ہے کہ جمع نہ کرے، اگر جمع کر بھی لے تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ دونوں باتیں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں۔ جہاں تک رمضان میں مسافر کے روزے کا تعلق ہے، تو روزہ رکھنا افضل ہے اور اگر نہ رکھے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور جتنے دن روزے نہ رکھے، بعد میں ان کی قضا ادا کر لے۔ اگر روزہ نہ رکھنے میں زیادہ آسانی ہو تو افضل یہ ہے کہ روزہ نہ رکھے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ ان کی عطا کردہ رخصتوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔ والحمد للہ رب العالمین.

اگر سفر میں مشقت زیادہ ہو تو روزہ نہ رکھنا واجب ہے

سوال مشقت کے ساتھ مسافر کے روزے رکھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب ایسی مشقت جو قابل برداشت ہو، اس کے ساتھ روزہ رکھنا مکروہ ہے کیونکہ نبی ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا تھا، جس پر سایہ کیا گیا تھا اور جس کے گرد لوگوں کا ہجوم تھا۔ آپ نے فرمایا یہ کیا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ ایک روزہ دار ہے، تو آپ نے فرمایا:

«لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصَّوْمُ فِي السَّفَرِ»(صحيح البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ لمن ظلل عليه واشتد الحر: "ليس من البر الصيام في السفر"، ح:١٩٤٦ وصحيح مسلم، الصيام، باب جواز الصوم والفطر في شهر رمضان للمسافرين من غير معصية، ح:١١١٥)

’’سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے۔‘‘

اور اگر روزہ رکھنے میں شدید مشقت ہو تو پھر واجب یہ ہے کہ روزہ نہ رکھا جائے کیونکہ ایک سفر میں جب لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ روزہ ان کے لیے بہت مشکل ہو گیا ہے، تو آپ نے روزہ افطار کر دیا، پھر آپ کو بتایا گیا کہ بعض لوگوں نے ابھی تک روزہ رکھا ہوا ہے، تو آپ نے فرمایا:

«أُولٰئِكَ الْعُصَاةُ أُولٰئِكَ الْعُصَاةُ»(صحيح مسلم، الصيام، باب جواز الصوم والفطر في شهر رمضان للمسافر من غير معصية، ح:١١١٤)

”یہ لوگ نافرمان ہیں‘ یہ لوگ نافرمان ہیں۔“

جن لوگوں کے لیے روزہ رکھنا مشکل نہ ہو‘ ان کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی اقتدا میں روزہ رکھیں کیونکہ آپ روزہ رکھا کرتے تھے جیسا کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ فِي شَهْرِ رَمَضَانَ فِي حَرٍّ شَدِيدٍ - إِلٰى أَنْ قَالَ - وَمَا فِينَا صَائِمٌ إِلاَّ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَعَبْدُاللهِ بْنُ رَوَاحَةَ»(صحيح البخاري، الصوم، باب بعد باب: إذا صام اياما من رمضان ثم سافر، ح:١٩٤٥ وصحيح مسلم، الصيام، باب التخيير في الصوم والفطر في السفر، ح:١١٢٢ واللفظ له)

”ہم رسول ﷺ کے ساتھ ماہ رمضان میں سخت گرمی کے موسم میں نکلے“ وہ بیان کرتے ہیں کہ ”ہم میں رسول اللہ ﷺ اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے سوا اور کوئی روزہ دار نہ تھا۔“

اگر سفر میں آسانی اور سہولت ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے

سوال مسافر کے روزے کے بارے میں کیا حکم ہے جب کہ عصر حاضر میں جدید ذرائع آمدورفت کے باعث روزہ مسافر کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔

جواب مسافر روزہ رکھ سکتا ہے اور چھوڑ بھی سکتا ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴾ (البقرة: ٢/ ١٨٥)

”اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں (روزہ رکھ کر) ان کا شمار پورا کرلے۔“

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب نبی ﷺ کے ساتھ سفر کرتے تو ان میں سے بعض روزہ رکھ لیتے اور بعض روزہ نہ رکھتے لیکن ان میں سے کوئی کسی پر عیب نہ لگاتا تھا۔ نبی ﷺ سفر میں روزہ رکھ لیا کرتے تھے۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے:

«خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ فِي شَهْرِ رَمَضَانَ فِي حَرٍّ شَدِيدٍ - إِلٰى أَنْ قَالَ - وَمَا فِينَا صَائِمٌ إِلاَّ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَعَبْدُاللهِ بْنُ رَوَاحَةَ»(صحيح البخاري، الصوم، باب بعد باب: إذا صام اياما من رمضان ثم سافر، ح:١٩٤٥ وصحيح مسلم، الصيام، باب التخيير في الصوم والفطر في السفر، ح:١١٢٢ واللفظ له)

”ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ماہ رمضان میں سخت گرمی کے موسم میں نکلے“ وہ بیان کرتے ہیں کہ ”ہم میں رسول اللہ ﷺ اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے سوا اور کوئی روزہ دار نہ تھا۔“

مسافر کے بارے میں قاعدہ یہ ہے کہ اسے روزہ رکھنے اور نہ رکھنے کے بارے میں اختیار ہے‘ اگر روزہ رکھنے میں مشقت نہ ہو تو

پھر روزہ رکھنا افضل ہے کیونکہ اس میں درج ذیل تین فوائد ہیں: ① اس میں رسول اللہ ﷺ کی اقتدا ہے۔ ② اس میں سہولت ہے کیونکہ انسان جب دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر روزہ رکھے تو اس میں آسانی ہوتی ہے۔ ③ اس سے انسان جلد بریٔ الذمہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر روزہ رکھنے میں دشواری ہو تو نہ رکھے کیونکہ اس حالت میں سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے۔ نبیٔ کریم ﷺ نے جب ایک شخص کو دیکھا کہ اس پر سایہ کیا گیا ہے اور لوگوں کا اس پر ہجوم ہے' تو آپ نے پوچھا: ''یہ کیا ہے؟'' صحابہ نے بتایا کہ ایک روزہ دار ہے تو آپ نے فرمایا:

«لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصَّومُ فِي السَّفَرِ»(صحيح البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ لمن ظلل عليه واشتد الحر: "ليس من البر الصيام في السفر"، ح:١٩٤٦ وصحيح مسلم، الصيام، باب جواز الصوم والفطر في شهر رمضان للمسافرين من غير معصية، ح:١١١٥)

''سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے۔''

اس عموم کو ایسے شخص پر محمول کیا جائے گا جسے روزہ رکھنا بہت گراں محسوس ہوتا ہو' اس لیے ہم کہتے ہیں کہ عصر حاضر میں سفر آسان ہے جیسا کہ سائل نے کہا اور اکثر و بیشتر صورتوں میں روزہ گراں محسوس نہیں ہوتا' لہٰذا افضل یہ ہے کہ روزہ رکھ لیا جائے۔

مسافر مکہ پہنچنے پر روزہ چھوڑ دے تا کہ آسانی سے عمرہ کر سکے

سوال مسافر جب روزے کی حالت میں مکہ میں پہنچ جائے تو کیا وہ روزہ چھوڑ دے تا کہ وہ آسانی کے ساتھ عمرہ ادا کر سکے؟

جواب نبی ﷺ فتح کے سال مکہ میں بیس رمضان کو داخل ہوئے تھے اور اس وقت آپ نے روزہ نہیں رکھا ہوا تھا' مکہ میں آپ نماز بھی دو رکعت پڑھتے اور اہل مکہ سے فرماتے تھے:

«يَا أَهْلَ مَكَّةَ أَتِمُّوا فَإِنَّا قَوْمٌ سَفْرٌ»(موطأ إمام مالك، الحج، ح:٢٠٢، ٢٠٣ وكتاب السفر(١٩)

''اے اہل! مکہ تم اپنی نماز پوری کر لو' ہم مسافر لوگ ہیں۔''

اور صحیح بخاری سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے مہینے کے باقی ایام میں بھی مکے میں روزے نہیں رکھے کیونکہ آپ مسافر تھے۔ مکہ پہنچ کر عمرہ کرنے والے کا سفر ختم نہیں ہوتا اور اگر مکہ میں آتے وقت اس نے روزہ نہ رکھا ہو تو اس کے لیے یہ لازم نہیں کہ کھانے پینے سے رکا رہے۔ بعض لوگ سفر میں بھی روزے رکھتے رہتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ وقت میں روزے رکھنے میں کوئی دشواری نہیں ہے' لہٰذا روزے کی حالت میں جب مکہ مکرمہ میں پہنچتے ہیں' تو وہ بہت تھکے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کیا روزے کو جاری رکھوں اور عمرہ کو روزہ افطار کرنے کے بعد ادا کروں یا روزہ چھوڑ دوں اور مکہ پہنچنے کے فوراً بعد عمرہ ادا کر لوں؟ اس صورت میں ہم اس کے لیے کہیں گے کہ افضل یہ ہے کہ تم روزہ چھوڑ دو تا کہ مکہ مکرمہ میں پہنچنے کے فوراً بعد ہشاش بشاش ہو کر عمرہ ادا کر سکو کیونکہ عمرے کے لیے آنے والے کے لیے سنت یہ ہے کہ وہ مکہ مکرمہ میں پہنچنے کے فوراً بعد عمرہ ادا کرے۔ نبی ﷺ جب عمرے کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لاتے تو آپ فوراً عمرہ ادا فرماتے حتی کہ اپنی سواری کو بھی مسجد حرام کے پاس بٹھاتے اور عمرہ ادا کرنے کے لیے مسجد میں تشریف لے جاتے' لہٰذا اے عمرہ ادا کرنے والے! تمھارا روزہ چھوڑ دینا تا کہ دن کے وقت چاق چوبند ہو کر عمرہ کر سکو اس سے افضل ہے کہ دن

حالت روزہ میں گزارو اور پھر روزہ افطار کرنے کے بعد رات کو عمرہ ادا کرو۔ نبیٔ اکرم ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ غزوہ فتح کے سفر میں آپ روزے کی حالت میں تھے، لوگوں نے آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! لوگوں کو روزے کی وجہ سے بہت مشکل پیش آ رہی ہے اور وہ اس انتظار میں ہیں کہ آپ کیا طرز عمل اختیار فرماتے ہیں۔''

یہ عصر کے بعد کا وقت تھا، نبیٔ اکرم ﷺ نے پانی طلب فرمایا اور اسے نوش جان فرما لیا۔ لوگ دیکھ رہے تھے کہ آپ نے اثنائے سفر روزہ افطار کر دیا اور افطار بھی دن کے آخری حصے میں کیا① اور یہ سب اس لیے تھا کہ آپ امت کے لیے اس بات کو بیان فرما دیں کہ یہ جائز ہے۔ بعض لوگوں کا تکلف اور مشقت کے ساتھ سفر میں حالت روزہ میں رہنا بلاشک خلاف سنت ہے اور ایسے لوگوں پر نبیٔ اکرم ﷺ کا یہ فرمان صادق آتا ہے:

«لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصَّوْمُ فِي السَّفَرِ»(صحيح البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ لمن ظلل عليه واشتد الحر: "ليس من البر الصيام في السفر"، ح:١٩٤٦ وصحيح مسلم، الصيام، باب جواز الصوم والفطر في شهر رمضان للمسافرين من غير معصية، ح:١١١٥)

''سفر میں روزہ نیکی نہیں ہے۔''

دودھ پلانے والی عورت روزہ ترک کرنے پر قضا ادا کرے گی

سوال کیا دودھ پلانے والی عورت کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ روزہ چھوڑ دے؟ چھوڑے ہوئے روزوں کی قضا کب ادا کرے؟ کیا وہ قضا کے بجائے مسکینوں کو کھانا بھی کھلا سکتی ہے؟

جواب دودھ پلانے والی عورت کو روزے کی حالت میں دودھ کم ہو جانے کی وجہ سے بچے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو وہ روزے چھوڑ سکتی ہے اور اسے بعد میں ان روزوں کی قضا ادا کرنا ہو گی کیونکہ یہ مریض کے مشابہ ہو گی جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:

﴿ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ يُرِيدُ ٱللَّهُ بِكُمُ ٱلْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ ٱلْعُسْرَ ﴾ (البقرة: ٢/ ١٨٥)

''اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں (روزے رکھ کر) ان کا شمار پورا کر لے۔ اللہ تمھارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا۔''

جب رکاوٹ دور ہو جائے تو اسے روزوں کی قضا ادا کرنا ہو گی۔ قضا یا تو سردیوں کے موسم کے چھوٹے اور ٹھنڈے دنوں میں ادا کر لے یا اگلے سال لیکن اس کے لیے مسکینوں کو کھانا کھلانا جائز نہیں کیونکہ روزے کے بجائے کھانا اس عذر یا مرض کی صورت میں کھلایا جا سکتا ہے جس کے زائل ہونے کی امید ہی نہ ہو۔

---

① صحیح مسلم، الصیام، باب جواز الصوم و الفطر فی شهر رمضان للمسافر من غیر معصیة، حدیث: 1114

آرام وسکون حاصل کرنے سے روزے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا

سوال اگر روزہ دار بھوک اور پیاس کی شدت کی وجہ سے دن کا اکثر حصہ لیٹ کر گزارے تو کیا اس سے روزے کی صحت پر کوئی اثر پڑے گا؟

جواب اس سے روزے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا بلکہ اس میں اجروثواب زیادہ ملے گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا:

«وَلٰكِنَّهَا عَلٰى قَدْرِ نَفَقَتِكِ أَوْ نَصَبِكِ»(صحيح البخاري، العمرة، باب أجر العمرة على قدر النصب، ح:١٧٨٧ وصحيح مسلم، الحج، باب إحرام النفساء ...، ح:١٢١١(١٢٦))

''اس کا ثواب تمھارے خرچ یا تکلیف برداشت کرنے کے بقدر ہوگا۔''

اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی میں انسان کو جس قدر زیادہ تھکاوٹ ہو' اسی قدر اسے زیادہ اجروثواب ملے گا۔ اس کے ساتھ وہ ایسا کام بھی کرسکتا ہے جس سے روزے کی شدت میں کمی آجائے' مثلاً وہ پانی سے ٹھنڈک حاصل کرسکتا ہے یا ٹھنڈی جگہ بیٹھ سکتا ہے۔

رمضان کے روزے کے لیے ایک ہی بار نیت کافی ہے

سوال کیا رمضان کے روزے کے لیے ہر دن نیت کرنی چاہیے یا سارے مہینے کی ایک بار نیت ہی کافی ہے؟

جواب رمضان کے آغاز میں پورے مہینے کے لیے ایک ہی نیت کافی ہے کیونکہ روزہ دار اگر ہر رات ہر روزے کی نیت نہ بھی کرے' تو اس نے مہینے کے شروع سے اس کی نیت کررکھی ہے۔ اگر اس نے مہینے کے درمیان سفر یا مرض وغیرہ کی وجہ سے کچھ روزے چھوڑے' تو پھر اسے دوبارہ نیت کرنی چاہیے کیونکہ اس نے سفر و مرض وغیرہ کی وجہ سے روزے چھوڑ کر نیت کو توڑ دیا تھا۔

کیا بغیر کھائے پیے صرف توڑنے کی نیت سے روزہ باطل ہو جائے گا؟

سوال کھانے یا پینے کے بغیر روزہ توڑنے کی نیت کرنے سے کیا روزہ دار کا روزہ ٹوٹ جائے گا؟

جواب معلوم بات ہے کہ روزہ نیت اور کچھ چیزوں کے ترک کرنے کے مجموعہ کا نام ہے۔ انسان روزے کے منافی چیزوں کے ترک کرنے کے ساتھ تقرب الٰہی کے حصول کے لیے روزے کی نیت کرتا ہے اور اگر وہ یہ ارادہ کرلے کہ اس نے بالفعل روزے کو ترک کردیا ہے' تو اس سے روزہ باطل ہوجائے گا لیکن روزہ اگر رمضان کا ہو تو غروب آفتاب تک اسے کھانے پینے سے باز رہنا ہوگا کیونکہ جو شخص کسی عذر کے بغیر رمضان کا روزہ چھوڑے' اس کے لیے کھانے پینے سے رکنا اور اس روزے کی قضا ادا کرنا لازم ہے۔

اگر وہ پختہ عزم نہ کرے اور تردد سے کام لے تو اس مسئلے میں علماء میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا روزہ باطل ہوجائے گا کیونکہ تردّد عزم کے منافی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ روزہ باطل نہیں ہوگا کیونکہ اصل بقائے نیت ہے حتی کہ وہ اسے توڑنے کا پختہ عزم کرلے۔ قوی ہونے کی وجہ سے میرے نزدیک بھی یہی قول راجح ہے۔ واللہ اعلم.

بھول کر کھانے پینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا

سوال روزہ دار اگر بھول کر کھالے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور جو اسے دیکھ رہا ہو' اس کے لیے کیا واجب ہے؟

جواب جو شخص روزے کی حالت میں بھول کر کھا پی لے تو اس کا روزہ صحیح ہے لیکن جب اسے یاد آجائے' تو اس کے لیے رک جانا واجب ہے حتی کہ اگر لقمہ یا پانی کا گھونٹ اس کے منہ میں ہو تو اسے پھینک دینا واجب ہے۔ اس کے روزے کے صحیح ہونے کی دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی' نبی ﷺ کی یہ حدیث ہے:

«مَنْ نَسِيَ وَهُوَ صَائِمٌ فَأَكَلَ أَوْ شَرِبَ فَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ فَإِنَّمَا أَطْعَمَهُ اللّٰهُ وَسَقَاهُ»(صحيح البخاري، الصوم، باب إذا أكل أو شرب ناسيًا، ح:١٩٣٣ وصحيح مسلم، الصيام، باب أكل الناسي وشربه وجماعه لا يفطر، ح:١١٥٥ واللفظ له)

"جو روزہ دار بھول کر کھا یا پی لے تو اسے اپنا روزہ پورا کرنا چاہیے' کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ نے کھلایا پلایا ہے۔"

چنانچہ بھول کر ممنوع فعل کے ارتکاب پر انسان سے مؤاخذہ نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ إِن نَّسِينَآ أَوْ أَخْطَأْنَا﴾ (البقرة: ٢/ ٢٨٦)

"اے ہمارے پروردگار! اگر ہم سے بھول یا چوک ہوگئی ہو تو ہم سے مؤاخذہ نہ کیجیے۔"

اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے ایسا ہی کیا۔ جو شخص اسے دیکھے' اس کے لیے واجب ہے کہ اسے یاد دلا دے کیونکہ یہ برائی سے روکنا ہے اور نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ»(صحيح مسلم، الإيمان، باب كون النهي عن المنكر من الإيمان، ح:٤٩)

"تم میں سے جو شخص برائی دیکھے تو اسے ہاتھ سے مٹا دے' اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے سمجھا دے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے برا جانے۔"

لاریب! روزہ دار کا حالت روزہ میں کھانا پینا برائی ہے اور حالت نسیان میں مؤاخذہ نہ ہونے کی وجہ سے قابل معافی ہے لیکن دیکھنے والے کے لیے کوئی عذر نہیں ہے' لہٰذا وہ اسے یاد دلائے اور اس سے منع کرے۔

روزہ دار سرمہ استعمال کرسکتا ہے

سوال روزہ دار کے لیے سرمہ استعمال کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب روزہ دار کے لیے سرمہ استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح آنکھ اور کان میں دوائی کا قطرہ ڈالنے میں بھی کوئی حرج نہیں' خواہ وہ اس کا ذائقہ حلق میں محسوس کرے۔ اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا کیونکہ یہ نہ تو کھانا پینا ہے اور نہ کھانے پینے کے معنی میں ہے اور ممانعت کھانے پینے کی ہے' لہٰذا جو چیزیں کھانے پینے کے معنی میں نہیں ہیں' انھیں ان کے ساتھ نہیں ملایا جاسکتا۔ شیخ الاسلام ابن

تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے اور درست بھی یہی ہے۔ اگر کسی نے ناک میں دوائی کا قطرہ ڈالا اور وہ اس کے پیٹ میں چلا گیا تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«بَالِغْ فِي الاِسْتِنْشَاقِ إِلاَّ أَنْ تَكُونَ صَائِمًا»(سنن أبي داود، الطهارة، باب في الاستنثار، ح:١٤٢ وسنن النسائي، الطهارة، باب المبالغة في الاستنشاق، ح:٨٧)

”ناک میں پانی چڑھانے میں خوب مبالغے سے کام لو اِلَّا یہ کہ تم روزہ دار ہو۔“

روزہ دار کے لیے مسواک اور خوشبو استعمال کرنا جائز ہے

سوال روزہ دار کے لیے مسواک اور خوشبو استعمال کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب صحیح بات یہ ہے کہ دن کے ابتدائی اور آخری حصے میں بھی مسواک کرنا روزہ دار کے لیے سنت ہے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«اَلسِّوَاكُ مَطْهَرَةٌ لِلْفَمِ مَرْضَاةٌ لِلرَّبِّ»(صحيح البخاري معلقًا، الصوم، باب السواك الرطب واليابس للصائم وسنن النسائي، الطهارة، باب الترغيب في السواك، ح:٥)

”مسواک کرنے سے منہ صاف ہو جاتا ہے اور رب راضی ہو جاتا ہے۔“

اور نبی ﷺ نے فرمایا:

«لَوْلاَ أَنْ أَشُقَّ عَلٰى أُمَّتِي لأَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ مَعَ كُلِّ صَلاَةٍ»(صحيح البخاري، الجمعة، باب السواك يوم الجمعة، ح:٨٨٧ وصحيح مسلم، الطهارة، باب السواك، ح:٢٥٢)

”اگر مجھے امت کے مشقت میں پڑ جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں انھیں ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنے کا حکم دیتا۔“

اسی طرح روزہ دار کے لیے خوشبو بھی دن کے ابتدائی حصے سے لے کر آخری حصے تک ہر وقت جائز ہے خواہ خوشبو بخور کی شکل میں ہو یا تیل وغیرہ کی صورت میں مگر بخور کو ناک کے ساتھ سونگھنا جائز نہیں کیونکہ بخور کے محسوس ہونے اور نظر آنے والے اجزا ہوتے ہیں جو بخور سونگھنے کی صورت میں ناک کے اندر داخل ہو کر معدے تک پہنچ جاتے ہیں۔ جیسا کہ نبی ﷺ نے حضرت لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا

«بَالِغْ فِي الاِسْتِنْشَاقِ إِلاَّ أَنْ تَكُونَ صَائِمًا»(سنن أبي داود، الطهارة، باب في الاستنثار، ح:١٤٢ وسنن النسائي، الطهارة، باب المبالغة في الاستنشاق، ح:٨٧)

”ناک میں پانی چڑھانے میں خوب مبالغے سے کام لو اِلَّا یہ کہ تم روزہ دار ہو۔“

روزہ توڑنے والی چیزیں

سوال روزے کو فاسد کر دینے والی چیزیں کون کون سی ہیں؟

جواب روزے کو فاسد کر دینے یعنی توڑ دینے والی چیزیں حسب ذیل ہیں: ① جماع۔ ② کھانا۔ ③ پینا۔ ④ شہوت کے ساتھ منی کا نکلنا۔ ⑤ جو چیز کھانے پینے کے معنی میں ہو۔ ⑥ جان بوجھ کر قے کرنا۔ ⑦ سینگی لگوانے سے خون کا نکلنا۔ ⑧ حیض و نفاس کے خون کا

جاری ہونا۔ کھانے پینے اور جماع سے روزے کے ٹوٹ جانے کی دلیل حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَٱلۡـَٔـٰنَ بَـٰشِرُوهُنَّ وَٱبۡتَغُواْ مَا كَتَبَ ٱللَّهُ لَكُمۡۚ وَكُلُواْ وَٱشۡرَبُواْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ ٱلۡخَيۡطُ ٱلۡأَبۡيَضُ مِنَ ٱلۡخَيۡطِ ٱلۡأَسۡوَدِ مِنَ ٱلۡفَجۡرِۖ ثُمَّ أَتِمُّواْ ٱلصِّيَامَ إِلَى ٱلَّيۡلِۚ ﴾ (البقرة: ٢/ ١٨٧)

”اب تم کو اختیار ہے کہ ان سے مباشرت کرو اور اللہ نے جو چیز تمھارے لیے لکھ رکھی ہے (یعنی اولاد) اس کو (اللہ سے) طلب کرو اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے، پھر روزے کو رات تک پورا کرو۔“

شہوت کے ساتھ منی کے انزال سے روزہ ٹوٹ جانے کی دلیل روزے کے بارے میں یہ حدیث قدسی ہے:

«يَتْرُكُ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ وَشَهْوَتَهُ مِنْ أَجْلِي»(صحيح البخاري، الصوم، باب فضل الصوم، ح: ١٨٩٤)

”وہ میری وجہ سے اپنے کھانے پینے اور شہوت کو چھوڑتا ہے۔“

اور انزال شہوت ہے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«فِي بُضْعِ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ قَالُوا يَارَسُولَ اللهِ أَيَأْتِي أَحَدُنَا شَهْوَتَهُ وَيَكُونُ لَهُ فِيهَا أَجْرٌ؟ قَالَ: أَرَأَيْتُمْ لَوْ وَضَعَهَا فِي حَرَامٍ - أَكَانَ عَلَيْهِ فِيهَا وِزْرٌ؟ - فَكَذٰلِكَ إِذَا وَضَعَهَا فِي الْحَلَالِ كَانَ لَهُ أَجْرٌ»(صحيح مسلم، الزكاة، باب بيان اسم الصدقة يقع على كل نوع من المعروف، ح: ١٠٠٦)

”تم میں سے کسی ایک کے اپنی شرم گاہ استعمال کرنے میں بھی صدقہ ہے“، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا ہم میں سے جب کوئی اپنی شہوت کو پورا کرتا ہے، تو اس میں بھی اس کے لیے اجر ہے؟ آپ نے فرمایا: ”یہ بتاؤ اگر وہ حرام میں اسے رکھتا تو کیا اسے گناہ نہ ہوتا؟ پھر اسی طرح جب وہ اسے حلال میں رکھتا ہے، تو اسے اس کا اجر وثواب ملتا ہے۔“

جس چیز کو رکھا جاتا ہے، وہ اچھلتی ہوئی منی ہے۔ اسی وجہ سے راجح قول یہ ہے کہ مذی سے روزہ فاسد نہیں ہوتا خواہ وہ شہوت اور جسم سے جسم لگانے کی صورت میں خارج ہوئی ہو بشرطیکہ جماع نہ ہو۔ پانچویں چیز جس سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے، وہ ہے جو کھانے پینے کے معنی میں ہو، مثلاً وہ انجکشن جو غذائیت کا کام دے اور جس کے ساتھ انسان کھانے پینے سے بے نیاز ہو جائے۔ یہ اگرچہ کھانا پینا تو نہیں لیکن یہ کھانے پینے کے معنی میں ہے، کیونکہ اس سے انسان کھانے پینے سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اور جو کسی چیز کے معنی میں ہو، اس کے لیے وہی حکم ہوتا ہے جو اس اصل چیز کا ہو۔ وہ انجکشن جو غذائی ضرورت کو پورا کرے نہ وہ کھانے پینے کے معنی میں ہو تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، خواہ ٹیکہ رگ میں لگایا جائے یا پٹھوں میں یا جسم میں کسی دوسری جگہ۔ چھٹی چیز جس سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے وہ جان بوجھ کر قے کرنا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ ذَرَعَهُ الْقَيْءُ فَلَيْسَ عَلَيْهِ قَضَاءٌ وَمَنِ اسْتَقَاءَ عَمْدًا فَلْيَقْضِ»(سنن أبي داود، الصوم، باب الصائم يستقيء عمدا، ح: ٢٣٨٠ وجامع الترمذي، الصوم، باب ماجاء فيما استقاء عمدا، ح: ٧٢٠)

”جسے خود بخود قے آجائے‘ اس پر قضا لازم نہیں ہے لیکن جو خود جان بوجھ کر قے کرے‘ اسے قضا دینی چاہیے۔“

اس میں حکمت یہ ہے کہ جب انسان قے کرے گا‘ تو وہ اپنے پیٹ کو کھانے سے خالی کردے گا اور جسم اس چیز کی ضرورت محسوس کرے گا‘ جو اس خلا کو پر کرے‘ لہٰذا ہم یہ کہتے ہیں کہ فرض روزے میں انسان کے لیے قے کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ قے کر کے وہ اپنے واجب روزے کو فاسد کرلے گا۔ ساتویں چیز جس سے روزہ فاسد ہوجاتا ہے‘ وہ سینگی کے ذریعے سے خون کا نکلوانا ہے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«أَفْطَرَ الْحَاجِمُ وَالْمَحْجُومُ»(صحيح البخاري معلقا، الصوم، باب الحجامة والقيء للصائم وجامع الترمذي، الصوم، باب كراهية الحجامة للصائم، ح: ٧٧٤)

”سینگی لگانے اور لگوانے والے کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔“

آٹھویں چیز جس سے روزہ فاسد ہوجاتا ہے‘ وہ حیض ونفاس کے خون کا نکلنا ہے کیونکہ نبی ﷺ نے عورت کے بارے میں فرمایا ہے:

«أَلَيْسَ إِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ»(صحيح البخاري، الحيض، باب ترك الحائض الصوم، ح: ٣٠٤ وصحيح مسلم، الإيمان، باب بيان نقصان الإيمان بنقص الطاعات ح: ٧٩)

”جب عورت حائضہ ہوتی ہے تو کیا وہ نماز اور روزہ نہیں چھوڑتی؟“

اہل علم کا اجماع ہے کہ حیض ونفاس والی عورت کا روزہ رکھنا صحیح نہیں ہے۔ ان مذکورہ بالا تمام چیزوں کے ساتھ روزہ فاسد ہوجاتا ہے بشرطیکہ: ○ اسے علم ہو۔ ○ اسے یاد ہو۔ ○ اس کا قصد وارادہ ہو۔ ان شرائط کی تفصیل حسب ذیل ہے:

○ اسے حکم شرعی اور وقت کے بارے میں علم ہو۔ اگر کوئی شخص جاہل ہے اور اسے حکم شرعی معلوم نہیں یا اسے وقت کا علم نہیں تو اس کا روزہ صحیح ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ إِن نَّسِينَآ أَوْ أَخْطَأْنَا﴾ (البقرة: ٢/ ٢٨٦)

”اے ہمارے پروردگار! اگر ہم سے بھول یا چوک ہوگئی ہو تو ہم سے مؤاخذہ نہ کیجیے۔“

اور اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

«قَدْ فَعَلْتُ»(صحيح مسلم، الايمان، باب بيان تجاوز الله تعالى عن حديث النفس والخواطر بالقلب إذا لم تستقر وبيان أنه سبحانه وتعالى لم يكلف إلا ما يطاق ... ح:١٢٦ وجامع الترمذي، تفسير القرآن، باب سورة البقرة، ح: ٢٩٩٢)

”میں نے ایسا ہی کیا۔“

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ أَخْطَأْتُم بِهِۦ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ﴾ (الأحزاب: ٣٣/ ٥)

”اور جو بات تم سے غلطی کے ساتھ ہوگئی ہو اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں لیکن جو قصد دل سے کرو (اس پر مؤاخذہ ہے۔“)

یہ دو دلیلیں عام ہیں جب کہ روزے کے بارے میں خاص دلائل بھی سنت سے ثابت ہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت عدی بن

حاتم رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ انہوں نے روزہ رکھا اور اپنے تکیے کے نیچے اونٹ کا گھٹنا باندھنے والی دو رسیاں رکھ لیں جن میں سے ایک سیاہ اور دوسری سفید تھی اور انہوں نے کھانا پینا شروع کر دیا حتی کہ سفید رسی جب سیاہ سے واضح ہوگئی تو وہ کھانے سے رکے۔ جب صبح ہوئی تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ سارا ماجرا بیان کیا تو نبی ﷺ نے انھیں سمجھایا کہ سفید اور سیاہ سے مراد معروف دھاگے نہیں ہیں بلکہ سفید دھاگے سے مراد دن کی سفیدی اور سیاہ دھاگے سے مراد رات کی سیاہی ہے مگر نبی ﷺ نے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کو اس روزے کی قضا کا حکم نہیں دیا تھا کیونکہ انھیں حکم کا علم نہیں تھا اور انہوں نے آیت کریمہ کے یہی معنی سمجھے۔

جہاں تک وقت کے بارے میں جہالت کا تعلق ہے' تو صحیح بخاری میں حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«أَفْطَرْنَا عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ غَيْمٍ ثُمَّ طَلَعَتِ الشَّمْسُ»(صحيح البخاري، الصوم، باب إذا أفطر في رمضان ثم طلعت الشمس، ح:١٩٥٩)

''ہم نے نبی ﷺ کے عہد میں ایک ابر آلود دن میں روزہ افطار کیا تو پھر سورج نکل آیا۔''

نبی ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو قضا ادا کرنے کا حکم نہیں دیا۔ اس صورت میں اگر قضا ادا کرنا واجب ہوتی تو آپ انھیں ضرور اس کا حکم دیتے اور اگر آپ نے انھیں حکم دیا ہوتا تو یہ بات امت تک ضرور پہنچی ہوتی کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا ٱلذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُۥ لَحَـٰفِظُونَ ۝٩﴾ (الحجر: ١٥/٩)

''بے شک یہ (کتاب) نصیحت ہمی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔''

جب یہ بات اسباب کی فراوانی کے باوجود امت تک نہیں پہنچی' تو معلوم ہوا کہ آپ نے اس کا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم نہیں دیا اور جب آپ نے انھیں قضا ادا کرنے کا حکم نہیں دیا تو معلوم ہوا کہ یہ واجب نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی سویا ہوا انسان بیدار ہوا اور وہ یہ سمجھ کر کھانا پینا شروع کر دے کہ ابھی رات ہے اور بعد میں معلوم ہو کہ فجر تو طلوع ہو چکی تھی' تو اس پر ادائے قضا نہیں ہوگی کیونکہ اسے وقت کے بارے میں معلوم نہ تھا۔

○ دوسری شرط یہ ہے کہ اسے یاد ہو۔ یاد نسیان کی ضد ہے' لہٰذا اگر کوئی بھول کر کھا پی لے تو اس کا روزہ صحیح ہے' اس پر ادائے قضا لازم نہ ہوگی' کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ إِن نَّسِينَآ أَوْ أَخْطَأْنَا﴾ (البقرة: ٢/ ٢٨٧)

''اے ہمارے پروردگار! اگر ہم سے بھول یا چوک ہوگئی ہو تو ہم سے مؤاخذہ نہ کیجیے۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ نَسِيَ وَهُوَ صَائِمٌ فَأَكَلَ أَوْ شَرِبَ فَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ فَإِنَّمَا أَطْعَمَهُ اللهُ وَسَقَاهُ»(صحيح البخاري، الصوم، باب إذا أكل أو شرب ناسيًا، ح:١٩٣٣ وصحيح مسلم، الصيام، باب أكل الناسي وشربه وجماعه لا يفطر، ح:١١٥٥ واللفظ له)

''جو روزہ دار بھول کر کھا یا پی لے تو وہ اپنا روزہ پورا کرے کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ ہی نے کھلایا پلایا ہے۔''

○ تیسری شرط قصد و ارادہ ہے، یعنی انسان نے اپنے اختیار سے اس فعل کو سرانجام دیا ہو اور اگر وہ غیر مختار تھا تو اس کا روزہ صحیح ہے'

خواہ اسے مجبور کر دیا گیا ہو یا مجبور نہ کیا گیا ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جسے کفر پر مجبور کر دیا گیا ہو' اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ مَن كَفَرَ بِٱللَّهِ مِنۢ بَعۡدِ إِيمَٰنِهِۦٓ إِلَّا مَنۡ أُكۡرِهَ وَقَلۡبُهُۥ مُطۡمَئِنُّۢ بِٱلۡإِيمَٰنِ وَلَٰكِن مَّن شَرَحَ بِٱلۡكُفۡرِ صَدۡرٗا فَعَلَيۡهِمۡ غَضَبٞ مِّنَ ٱللَّهِ وَلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيمٞ ﴿١٠٦﴾ ﴾ (النحل: ١٦/ ١٠٦)

''جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے' ماسوا اس کے جسے (کفر پر زبردستی) مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو' بلکہ وہ جو دل سے کفر کرے' تو ایسوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کو بڑا سخت عذاب ہوگا۔''

اگر کفر جبر واکراہ کی صورت میں معاف ہو سکتا ہے' تو اس سے کم تر چیزیں بالاولیٰ معاف ہو سکتی ہیں اور حدیث میں ہے' نبی ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ اللهَ وَضَعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأَ، وَالنِّسْيَانَ، وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ»(سنن ابن ماجه، الطلاق، باب طلاق المكره والناسي، ح: ٢٠٤٥)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کے خطا، نسیان اور جس پر انھیں مجبور کر دیا گیا ہو اس کو معاف فرما دیا ہے۔''

اسی طرح اگر غبار اڑ کر روزہ دار کی ناک میں پہنچ جائے اور وہ اپنے حلق میں اس کا ذائقہ محسوس کرے اور وہ اس کے معدے تک پہنچ جائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا کیونکہ اس نے قصد وارادے سے اسے استعمال نہیں کیا۔ اسی طرح اگر اسے روزہ توڑنے پر زبردستی مجبور کر دیا گیا ہو اور اس نے توڑ لیا ہو تو اس کا روزہ صحیح ہوگا کیونکہ وہ غیر مختار ہے۔ اسی طرح اگر اسے احتلام میں انزال ہو گیا ہو تو اس کا روزہ صحیح ہوگا کیونکہ سوئے ہوئے شخص کا کوئی قصد وارادہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر کسی مرد نے اپنی عورت کو مجبور کر کے اس سے جماع کر لیا تو عورت کا روزہ صحیح ہوگا کیونکہ وہ غیر مختار ہے۔

یہاں ایک مسئلہ سمجھنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی شخص رمضان میں دن کے وقت اپنی بیوی سے جماع کرے جب کہ روزہ اس پر واجب ہو تو اس جماع کی وجہ سے پانچ امور لازم آتے ہیں: ○ گناہ۔ ○ باقی دن روزے کے ساتھ گزارنا۔ ○ روزے کا فاسد ہو جانا۔ ○ اس کی ادائے قضا کا لازم ہونا۔ ○ اس پر کفارہ واجب ہونا۔

اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں کہ اس جماع کے نتیجے میں لازم آنے والے امور کے بارے میں اسے علم ہو یا نہ ہو یعنی آدمی جب رمضان کے روزے میں جماع کر لے اور روزہ اس پر واجب ہو لیکن اسے یہ معلوم نہ ہو کہ کفارہ اس پر واجب ہے تو اس پر جماع کے سابقہ احکام مرتب ہوں گے کیونکہ اس نے روزے کو فاسد کرنے والے کام کا ارتکاب قصد وارادہ سے کیا ہے اور روزے کو فاسد کرنے والے کام کے ارتکاب سے اس سے متعلق احکام مرتب ہوں گے بلکہ حدیث حضرت ابو ہریرہ ؓ میں ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں تو ہلاک ہو گیا ہوں۔ آپ نے فرمایا:

«مَا أَهْلَكَكَ؟»(صحيح البخاري، الصوم، باب إذا جامع في رمضان ... الخ، ح: ٢١٩٣ وصحيح مسلم، الصيام، باب تغليظ الجماع في نهار رمضان على الصائم: ١١١١)

''تجھے کس چیز نے ہلاک کیا ہے؟''

اس نے جواب دیا کہ میں نے رمضان میں روزے کی حالت میں اپنی بیوی سے جماع کرلیا ہے تو نبی ﷺ نے اسے کفارے کا حکم دیا، حالانکہ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس پر کفارہ ہے یا نہیں۔ اور ہم نے جو یہ کہا کہ "روزہ اس پر واجب ہو" تو یہ ہم نے مسافر کے لیے غیر واجب حالتوں سے احتراز کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر مسافر رمضان میں حالت روزہ میں جماع کرلے تو اس پر کفارہ لازم نہیں ہوگا، مثلاً اگر ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ رمضان میں سفر کر رہا ہو، وہ دونوں روزہ دار ہوں اور جماع کرلیں تو اس صورت میں ان پر کفارہ نہیں ہوگا کیونکہ مسافر اگر روزہ رکھ لے تو اس کے لیے لازم نہیں ہے کہ اسے پورا کرے۔ وہ اگر چاہے تو روزہ پورا کرے اور اگر چاہے تو روزہ چھوڑ دے اور بعد میں اس کی قضا ادا کرلے۔

دمے کے مریض کے لیے "ان ہیلر" کا استعمال جائز ہے

سوال ضیق النفس (دمہ) کے مریض کے لیے روزے کی حالت میں ان ہیلر استعمال کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے، کیا اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا؟

جواب ان ہیلر استعمال کرنے سے کوئی چیز معدے تک نہیں پہنچتی، لہٰذا ہم یہ کہتے ہیں کہ روزے کی حالت میں ان ہیلر استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ اس کے استعمال سے دوائی کے اجزا معدہ تک نہیں پہنچتے کیونکہ یہ ایک ایسی چیز ہے، جو اڑ جاتی، دھواں بنتی اور ختم ہو جاتی ہے اور اس کا کوئی جز معدے تک نہیں پہنچتا، لہٰذا حالت روزہ میں اسے استعمال کرنا جائز ہے، اس سے روزہ باطل نہیں ہوتا۔

قے سے روزہ ٹوٹنے کے بارے میں حکم

سوال کیا قے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب اگر انسان جان بوجھ کر قے کرے، تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا اور اگر قصد و ارادے کے بغیر خود بخود قے آجائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اس کی دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ ذَرَعَهُ الْقَيْءُ فَلَيْسَ عَلَيْهِ قَضَاءٌ وَمَنِ اسْتَقَاءَ عَمدًا فَلْيَقْضِ»(سنن أبي داود، الصوم، باب الصائم يستقيء عمدًا، ح: ٢٣٨٠ وجامع الترمذي، الصوم، باب ماجاء فيما استقاء عمدًا، ح: ٧٢٠)

"جسے خود بخود قے آجائے، اس پر قضا نہیں ہے اور جو شخص جان بوجھ کر قے کرے، وہ قضا ادا کرے۔"

اگر قے کا غلبہ ہو جائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ اگر انسان یہ محسوس کرے کہ اس کے معدے میں ہلچل برپا ہے اور اس میں جو کچھ ہے، وہ خارج ہو جائے گا، تو اس صورت میں ہم اس سے یہ کہیں گے کہ اسے خارج ہونے سے روکو نہ اسے جذب کرنے کی کوشش کرو۔ معمول کے مطابق کھڑے رہو اور ارادتاً قے کرو نہ اسے روکو کیونکہ اگر تم نے ارادتاً قے کی تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا اور اگر تم نے اسے روکنے کی کوشش کی تو اس سے تکلیف ہوگی، لہٰذا اسے اپنے حال پر چھوڑ دو۔ اگر تمھارے ارادی فعل کے بغیر قے آگئی تو اس سے تمھیں کوئی نقصان ہوگا نہ اس سے تمھارا روزہ ٹوٹے گا۔

دانتوں سے نکلنے والا خون روزے پر اثر انداز نہیں ہوتا

سوال کیا روزہ دار کے مسوڑھے سے خون نکلنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب دانتوں سے نکلنے والا خون روزے پر اثر انداز نہیں ہوتا لیکن مقدور بھر حد تک کوشش کر کے اسے نگلنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ اسی طرح اگر نکسیر پھوٹ گئی اور اسے نگلنے سے احتراز کیا تو یہ بھی روزے پر اثر انداز ہوگی نہ اس سے ادائے قضا لازم آئے گی۔

سوال روزہ دار کے لیے داڑھ نکلوانے کے بارے میں کیا حکم ہے' کیا اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا؟

جواب داڑھ وغیرہ نکالنے سے نکلنے والے خون سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ اس کا وہ اثر نہیں ہوتا' جو سینگی لگوانے سے نکلنے والے خون کا ہوتا ہے' لہٰذا اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

جسے طلوع فجر سے پہلے طہر کا یقین ہو جائے وہ روزہ رکھے اگرچہ غسل بعد میں کرے

سوال اگر حائضہ عورت قبل از فجر پاک ہو جائے مگر وہ غسل طلوع فجر کے بعد کرے' تو اس کے روزے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اس کا روزہ صحیح ہے بشرطیکہ طلوع فجر سے قبل اسے طہر کا یقین ہو جائے کیونکہ یہ بات بہت اہم ہے کہ اسے طہر کا یقین ہو کیونکہ بعض عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ وہ طاہر ہوگئی ہیں' حالانکہ وہ طاہر نہیں ہوتیں' اسی لیے عورتیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس روئی بھیجتیں اور انہیں طاہر ہونے کی علامت دکھاتیں' تو آپ ان سے فرماتیں کہ جلدی نہ کرو حتی کہ سفید پانی دیکھ لو، لہٰذا عورت کو اچھی طرح یقین کر لینا چاہیے کہ وہ طاہر ہوگئی ہے۔ جب وہ طاہر ہو جائے تو وہ روزے کی نیت کر لے' غسل خواہ طلوع فجر کے بعد کرے لیکن اسے غسل بھی جلدی کر لینا چاہیے تا کہ نماز فجر بروقت ادا کر سکے۔

ہمیں معلوم ہوا کہ بعض عورتیں بعد از طلوع فجر یا قبل از طلوع فجر پاک ہو جاتی ہیں مگر غسل طلوع آفتاب کے بعد تک مؤخر کر دیتی ہیں اور کہتی ہیں کہ وہ دن کی روشنی میں ایسا غسل کرنا چاہتی ہیں' جو زیادہ کامل' زیادہ صاف اور زیادہ طاہر ہو لیکن یہ بات غلط ہے خواہ رمضان ہو یا غیر رمضان کیونکہ اس کے لیے واجب ہے کہ جلد غسل کرے تا کہ نماز فجر وقت پر ادا کر سکے۔ نماز ادا کرنے کے لیے وہ غسل واجب پر اکتفا کرے اور اگر طلوع آفتاب کے بعد مزید طہارت و نظافت کیلئے دوبارہ غسل کرنا چاہے' تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ حائضہ عورت کی طرح اگر جنبی عورت بھی طلوع فجر کے بعد غسل کرے' تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس کا روزہ صحیح ہوگا۔ اسی طرح مرد بھی اگر غسل جنابت طلوع فجر کے بعد کرے اور وہ روزہ دار ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ نبی ﷺ سے بھی ثابت ہے کہ آپ بیوی کے ساتھ مقاربت کی وجہ سے حالت جنابت میں ہوتے تو روزہ رکھ لیتے اور غسل طلوع فجر کے بعد فرماتے۔ واللہ اعلم.

خون ٹیسٹ کروانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا

سوال روزہ دار کے خون کے ٹیسٹ کے بارے میں کیا حکم ہے' کیا اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب ٹیسٹ کے لیے خون نکالنے سے روزہ دار کا روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ طبیب کو بسا اوقات بیماری کی تشخیص کے لیے مریض سے

خون لینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا کیونکہ یہ خون کی بہت تھوڑی سی مقدار ہوتی ہے جو جسم پر سینگی لگوانے کی طرح اثر انداز نہیں ہوتی، لہٰذا اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ روزہ باقی رہتا ہے، کسی دلیل شرعی کے بغیر ہم اس کو فاسد قرار نہیں دے سکتے اور ایسی کوئی دلیل نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ خون کی اس طرح کی معمولی مقدار سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے البتہ کسی دوسرے ضرورت مند شخص کو لگانے کے لیے روزہ دار کے جسم سے زیادہ مقدار میں خون لینے سے روزہ ٹوٹ جائے گا، یعنی اگر کثیر مقدار میں خون لیا جائے جو جسم پر سینگی کی طرح اثر انداز ہو تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا، لہٰذا واجب روزے کی صورت میں کسی کو کثیر مقدار میں خون کا عطیہ نہیں دینا چاہیے اِلَّا یہ کہ جس کو خون کا عطیہ دینا مقصود ہو، وہ خطرناک حالت میں ہو اور اس کے لیے غروب آفتاب کے بعد تک انتظار کرنا ممکن نہ ہو اور اطبا کی رائے میں خون اس کے لیے مفید اور اس کے مرض کے ازالے کے لیے ضروری ہو تو اس حال میں خون کا عطیہ دینے میں کوئی حرج نہیں۔ خون دینے سے روزہ ٹوٹ جائے گا، لہٰذا اسے کھانا پینا چاہیے تاکہ اس کی قوت واپس لوٹ آئے اور اس دن کے روزے کی قضا ادا کرنی اس کے لیے لازم ہوگی۔ واللہ اعلم.

مشت زنی سے اگر انزال ہو جائے تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے

سوال کیا روزہ دار کے مشت زنی کرنے سے روزہ ٹوٹ جائے گا اور اس پر کیا کفارہ واجب ہوگا؟

جواب اگر روزہ دار مشت زنی کرے اور اس سے انزال ہو جائے تو روزہ ٹوٹ جائے گا اور اس پر اس دن کے روزے کی ادائے قضا واجب ہوگی لیکن کفارہ واجب نہیں ہوگا کیونکہ کفارہ صرف جماع کی صورت میں واجب ہوتا ہے۔ اسے اپنے اس فعل کی وجہ سے توبہ کرنی چاہیے۔

محض خوشبو سونگھنے اور ناک میں دوائی ڈالنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا

سوال روزہ دار کے خوشبو سونگھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب روزہ دار کے لیے خوشبو سونگھنے میں کوئی حرج نہیں، خوشبو خواہ تیل کی صورت میں ہو یا بخور کی صورت میں۔ اگر بخور کی صورت میں ہو تو اس کے دھوئیں کو نہ سونگھیں کیونکہ دھوئیں میں ذرات ہوتے ہیں، جو پیٹ تک پہنچ جاتے ہیں، جس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے جیسا کہ پانی اور اس کے مشابہ دیگر چیزوں کے پیٹ میں پہنچ جانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ناک میں کھینچے بغیر محض خوشبو کے سونگھنے میں کوئی حرج نہیں۔

سوال خوشبو کا دھواں سونگھنے اور ناک میں دوائی کا قطرہ ڈالنے میں یہ فرق کیوں ہے کہ پہلی صورت میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور دوسری صورت میں روزہ نہیں ٹوٹتا؟

جواب دونوں میں فرق یہ ہے کہ خوشبو کے دھوئیں کو ناک سے کھینچا ہے، وہ گویا اسے قصد و ارادے سے اپنے پیٹ میں داخل کر رہا ہے لیکن جو دوائی کا قطرہ ناک میں ڈالتا ہے اس سے اس کا قصد اسے پیٹ تک پہچانا نہیں، اس کا مقصد صرف ناک کے نتھنے میں دوائی کا قطرہ ڈالنا ہے۔

سوال روزہ دار کے لیے ناک، آنکھ اور کان میں دوائی کا قطرہ ڈالنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب ناک میں ڈالے جانے والا قطرہ اگر معدہ تک پہنچ جائے، تو اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ حدیثِ حضرت لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا:

«بَالِغْ فِي الِاسْتِنْشَاقِ إِلاَّ أَنْ تَكُونَ صَائِمًا»(سنن أبي داود، الطهارة، باب في الاستنثار، ح:١٤٢ وسنن النسائي، الطهارة، باب المبالغة في الاستنشاق، ح:٨٧)

”ناک میں پانی چڑھانے میں خوب مبالغہ کرو اِلاَّ یہ کہ تم روزے کی حالت میں ہو۔“

لہٰذا روزہ دار کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ناک میں ایسا قطرہ ڈالے جو اس کے معدے تک پہنچ جائے اور ناک میں ڈالے جانے والا دوائی کا جو قطرہ معدے تک نہ پہنچے، اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ آنکھ میں ڈالنے والے قطرے، سرمہ لگانے اور کان میں ڈالے جانے والے قطرے سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ اس کے بارے میں کوئی نص نہیں ہے اور نہ یہ منصوص علیہ کے معنی میں ہے۔ آنکھ کھانے پینے کا راستہ نہیں ہے، اسی طرح کان بھی جسم کے دیگر مساموں کی طرح ہے۔ اہل علم نے ذکر کیا ہے کہ اگر کوئی شخص پاؤں کی اندرونی جانب کوئی چیز لگائے اور وہ اپنے گلے میں اس کا ذائقہ محسوس کرے، تو اس سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ یہ بھی کھانے پینے کا راستہ نہیں ہے، لہٰذا جو آنکھ میں سرمہ ڈال لے یا آنکھ میں دوائی کا قطرہ ڈال لے یا کان میں قطرہ ڈال لے تو اس سے اس کا روزہ نہیں ٹوٹے گا خواہ وہ اس کا ذائقہ حلق میں محسوس کرے۔ اسی طرح اگر کوئی انسان علاج کے لیے یا بغیر علاج کے تیل استعمال کرے، تو اس کے روزے کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اسی طرح اگر کوئی دمہ کا بیمار ہو اور وہ سانس میں آسانی کے لیے ان ہیلر استعمال کرلے، تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا کیونکہ اس سے دوائی کے اجزا معدے تک نہیں پہنچتے، لہٰذا وہ اسے کھانے یا پینے والا نہیں ہوگا۔

احتلام ہو جانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا

سوال جس شخص کو روزے کی حالت میں احتلام ہو جائے تو کیا اس کا روزہ صحیح ہے؟

جواب ہاں! اس کا روزہ صحیح ہے، احتلام سے روزہ باطل نہیں ہوتا کیونکہ وہ انسان کے اختیار میں نہیں اور حالت نیند میں انسان مرفوع القلم ہے۔ یہاں اس امر کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری ہے جو آج کل بہت سے لوگ کرتے ہیں اور وہ یہ کہ رمضان کی راتوں میں وہ بیدار رہتے ہیں اور بیدار بھی ایسے کام کی وجہ سے رہتے ہیں، جس کا کوئی نفع ونقصان نہیں ہوتا اور پھر سارا دن گہری نیند سوئے رہتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں کرنا چاہیے بلکہ روزے کو اطاعت، ذکر، قراءت قرآن اور دیگر ایسے امور کا ذریعہ بنانا چاہیے، جن سے اللہ تبارک وتعالیٰ کا تقرب حاصل ہو۔

روزہ دار ٹھنڈک حاصل کر سکتا ہے، غیر ارادی طور پر پانی حلق میں جانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا

سوال روزہ دار کے لیے ٹھنڈک حاصل کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب روزہ دار کے لیے ٹھنڈک حاصل کرنا جائز ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔ رسول اللہ ﷺ حالت روزہ میں گرمی یا پیاس کی وجہ سے اپنے سر مبارک پر پانی ڈال لیا کرتے تھے ① حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روزے کی حالت میں شدت حرارت یا پیاس کو کم کرنے کے لیے اپنے کپڑے کو گیلا کر لیا کرتے تھے۔ رطوبت اثر انداز نہیں ہوتی کیونکہ یہ پانی نہیں، جو معدے تک پہنچ جائے گا۔

سوال روزہ دار کے کلی کرنے یا ناک میں پانی داخل کرنے سے، پانی اگر پیٹ میں چلا جائے، تو کیا اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا؟

جواب جب روزہ دار کلی کرے یا ناک میں پانی ڈالے اور پانی اس کے پیٹ میں چلا جائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا کیونکہ اس نے قصد و ارادے کے ساتھ ایسا نہیں کیا اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ أَخْطَأْتُم بِهِۦ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ ﴾ (الأحزاب: ۳۳/ ۵)

"اور جو بات تم سے غلطی سے ہو گئی ہو اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں لیکن جو دل کے ارادے سے کرو تو اس پر مؤاخذہ ہے۔"

روزہ دار کو بخور کے استعمال سے گریز کرنا چاہیے

سوال روزہ دار کے لیے خوشبوؤں کے استعمال کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب رمضان میں دن کے وقت خوشبو استعمال کرنے اور سونگھنے میں کوئی حرج نہیں، البتہ بخور کو نہیں سونگھنا چاہیے کیونکہ اس کے دھوئیں میں ایسے اجزا ہوتے ہیں، جو معدہ میں پہنچ جاتے ہیں۔

احتیاط کے نام پر روزہ تاخیر سے افطار کرنا بدعت ہے اور نکسیر سے روزہ نہیں ٹوٹتا

سوال کیا نکسیر سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب نکسیر سے روزہ نہیں ٹوٹتا خواہ خون کی مقدار زیادہ ہو کیونکہ یہ خون انسان کے اپنے اختیار کے بغیر نکلتا ہے۔

سوال ماہ رمضان سے متعلق بعض کیلنڈروں میں ایک خانہ احتیاط کا رکھا جاتا ہے جس کے مطابق فجر سے دس پندرہ منٹ قبل از راہ احتیاط کھانا پینا بند کر دیا جاتا ہے۔ کیا اس قسم کی احتیاط کی سنت سے کوئی اصل ہے یا یہ بدعت ہے؟ فتویٰ عطا کریں، اللہ تعالیٰ آپ کو اجر و ثواب سے سرفراز فرمائے۔

جواب یہ بدعت ہے، سنت سے اس کی کوئی اصل نہیں بلکہ سنت تو اس کے خلاف ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَكُلُوا۟ وَٱشْرَبُوا۟ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ ٱلْخَيْطُ ٱلْأَبْيَضُ مِنَ ٱلْخَيْطِ ٱلْأَسْوَدِ مِنَ ٱلْفَجْرِ ﴾ (البقرة: ۲/ ۱۸۷)

"اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری رات کی سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے۔"

اور نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّ بِلاَلاً يُؤَذِّنُ بِلَيْلٍ، فَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى تَسْمَعُوا أَذَانَ ابْنِ أُمِّ مَكْتُومٍ - وَفِي رِوَايَةٍ - فَإِنَّهُ لاَ يُؤَذِّنُ حَتَّى يَطْلُعَ الْفَجْرُ» (صحيح البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ: 'لا يمنعكم من

---

① سنن أبي داود، الصيام، باب الصائم يصب عليه الماء من العطش، حديث: 2365

سحوركم اذان بلال"، ح:١٩١٨ وصحيح مسلم، الصيام، باب بيان أن الدخول الصوم يحصل بطلوع الفجر، ح:١٠٩٢)

''بے شک بلال رات کو اذان دیتے ہیں' پس تم کھاتے پیتے رہو حتی کہ ابن ام مکتوم کی اذان سن لو۔'' اور ایک روایت میں ہے: ''جب تک فجر طلوع نہ ہو جاتی وہ اذان نہیں دیتے تھے۔''

یہ احتیاط جسے بعض لوگ اختیار کرتے ہیں' یہ اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ فرض پر اپنی طرف سے اضافہ ہے' لہٰذا یہ باطل اور اللہ تعالیٰ کے دین میں تشدد ہے اور نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُونَ، هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُونَ، هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُونَ»(صحيح مسلم، العلم، باب هلك المتنطعون، ح: ٢٦٧٠))

''(دین میں) تشدد کرنے والے ہلاک ہو گئے' تشدد کرنے والے ہلاک ہوئے' تشدد کرنے والے ہلاک ہو گئے۔''

سحری وافطاری زمین کے لحاظ سے ہوگی' فضا کا اعتبار نہیں ہوگا

سوال جب سورج غروب ہو جائے' مؤذن اذان دے اور آدمی ائیر پورٹ پر روزہ افطار کر لے اور پھر ہوائی جہاز کے پرواز کرنے کے بعد وہ سورج کو دیکھ لے تو کیا کھانے پینے سے رک جائے؟

جواب ہمارا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں اس کے لیے کھانے پینے سے رکنا لازم نہیں ہے کیونکہ افطار کے وقت وہ زمین پر تھے' غروب آفتاب کے وقت وہ ایسی جگہ تھے جہاں سورج غروب ہو گیا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِذَا رَأَيْتُمُ اللَّيْلَ أَقْبَلَ مِنْ هَاهُنَا فَقَدْ أَفْطَرَ الصَّائِمُ»(صحيح البخاري، الصوم، باب الصوم في السفر والإفطار، ح:١٩٤١)

''جب تم دیکھو کہ رات ادھر سے آگئی ہے' تو روزہ دار روزہ افطار کر لے۔''

لہٰذا اس حال میں اس کے لیے کھانے پینے سے رکنا لازم نہیں کیونکہ اس نے شرعی دلیل کے مطابق روزہ افطار کیا تھا اور اب شرعی دلیل کے ساتھ ہی اسے کھانے پینے سے رکنا لازم ہوگا۔

کیا بلغم یا تھوک نگلنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

سوال روزہ دار کے بلغم یا کھنکار کو نگلنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب بلغم یا کھنکار اگر منہ تک نہ پہنچے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا اور اس کے بارے میں مذہب میں یہ ایک ہی قول ہے۔ اور اگر منہ تک پہنچنے کے بعد اسے نگل لیا جائے' تو اس کے بارے میں اہل علم کے دو قول ہیں:

بعض نے کہا ہے کہ اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا' انہوں نے اسے کھانے پینے کے ساتھ ملایا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا' انہوں نے اسے لعاب دہن کے ساتھ ملایا ہے۔ تو لعاب دہن سے روزہ باطل نہیں ہوتا حتی کہ اگر کوئی منہ میں

لعاب دہن جمع کر کے بھی اسے نگل لے تو اس کا روزہ فاسد نہیں ہوگا۔

علماء کے اختلاف کی صورت میں کتاب وسنت کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور جب ہمیں کسی امر کے بارے میں شک ہو کہ اس سے عبادت فاسد ہوتی ہے یا نہیں؟ تو اصل یہ ہے کہ فاسد نہیں ہوتی' لہٰذا بلغم نگلنے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ انسان کو چاہیے کہ وہ کھنکار کو چھوڑ دے' وہ حلق کے نیچے سے اسے منہ کی طرف نہ کھینچے اور اگر وہ منہ کی طرف نکل آئے' تو اسے نکال دینا چاہیے خواہ کوئی روزہ دار ہو یا نہ ہو۔ جہاں تک روزہ ٹوٹنے کا سوال ہے' تو اس کے لیے دلیل کی ضرورت ہے جو روزہ فاسد ہونے کے بارے میں انسان کے لیے اللہ عزوجل کے سامنے حجت ہو۔

محض کھانے کا ذائقہ چکھنے سے روزہ باطل نہیں ہوتا

سوال کیا کھانے کا ذائقہ چکھنے سے روزہ باطل ہو جاتا ہے؟

جواب کھانا چکھنے سے روزہ باطل نہیں ہوتا بشرطیکہ اسے نہ نگلے لیکن شدید ضرورت کے بغیر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ایسی صورت میں اگر قصد وارادے کے بغیر کوئی چیز پیٹ میں چلی گئی' تو اس سے روزہ باطل نہیں ہوگا۔

کیا جھوٹی گواہی اور حرام گفتگو سے روزہ باطل ہو جاتا ہے؟

سوال کیا رمضان میں دن کے وقت حرام گفتگو کرنے سے روزہ فاسد ہو جائے گا؟

جواب جب ہم حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ پڑھتے ہیں:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝١٨٣ ﴾ (البقرة: ۲/ ۱۸۳)

''اے مومنو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم پرہیز گار بنو۔''

تو اس سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ روزے کو واجب قرار دینے میں حکمت تقویٰ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کا ذوق پیدا کرنا ہے۔ تقویٰ کے معنی حرام کردہ امور کو ترک کرنا ہے اور عندالاطلاق یہ اس فعل کے کرنے پر مشتمل ہے جس کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے ترک کرنے پر بھی مشتمل ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ، وَالْعَمَلَ بِهِ، فَلَيْسَ لله حَاجَةٌ فِي أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ»

(صحيح البخاري، الصوم، باب من لم يدع قول الزور والعمل به، ح:۱۹۰۳)

''جو شخص جھوٹی بات اور اس پر عمل کو ترک نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا ترک کرے۔''

اور ایک روایت میں جہالت کے ترک کرنے کا تذکرہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ روزہ دار کے لیے حرام اقوال وافعال سے بچنے کی کس قدر تاکید ہے' لہٰذا اسے چاہیے کہ لوگوں کی غیبت نہ کرے' جھوٹ نہ بولے' چغلی نہ کھائے' حرام بیع نہ کرے اور دیگر تمام حرام امور سے بھی اجتناب کرے۔ اگر انسان ایک ماہ تک

ان احکام کو بجالائے جن کا حکم دیا گیا ہے اوران کو ترک کر دے جن سے منع کیا گیا ہے' تو امید ہے کہ باقی سارا سال بھی راہ راست پر رہے گا۔ افسوس کہ بہت سے روزہ دار' روزے اور غیر روزے کے دن میں فرق نہیں کرتے اور وہ اپنی عادت کے مطابق جھوٹ' دھوکے اور حرام باتوں کا شغل جاری رکھتے ہیں اوران کے افعال سے روزے کا وقار اور احترام محسوس نہیں ہوتا۔ یاد رہے ان افعال سے روزہ باطل تو نہیں ہوتا لیکن اس کا اجروثواب ضرور کم ہو جاتا ہے اور بعض صورتوں میں روزے کا اجروثواب ضائع بھی ہو سکتا ہے۔

سوال جھوٹی گواہی سے کیا مراد ہے' کیا اس سے روزہ باطل ہو جاتا ہے؟

جواب جھوٹی گواہی کبیرہ گناہوں میں سے ایک بہت بڑا گناہ ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان ایسی چیز کے بارے میں گواہی دے جسے وہ جانتا ہی نہیں یا جسے جانتا ہے' اس کے خلاف گواہی دے۔ اس سے روزہ باطل تو نہیں ہوتا لیکن اس کا اجروثواب ضرور کم ہو جاتا ہے۔

روزے کے آداب

سوال روزے کے آداب کیا ہیں؟

جواب روزے کے آداب میں سے ایک اہم ادب یہ ہے کہ احکام بجالا کر اور ممنوع احکامات سے اجتناب کر کے اللہ عزوجل کے تقویٰ کو لازم اختیار کیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ ٱلصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُونَ ۝١٨٣ ﴾ (البقرة: ٢/ ١٨٣)

''اے مومنو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں' جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم پرہیزگار بنو۔''

اور نبی ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ، وَالْعَمَلَ بِهِ، فَلَيْسَ للهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ»

(صحيح البخاري، الصوم، باب من لم يدع قول الزور والعمل به، ح:١٩٠٣)

''جو شخص جھوٹی بات کو اور اس پر عمل کرنے کو ترک نہ کرے تو اللہ کو اس بات کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا ترک کرے۔''

ایک روایت میں جھوٹی بات ترک کرنے کے ساتھ جہالت کی باتیں ترک کرنے کا ذکر بھی ہے۔

- روزے کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ کثرت کے ساتھ صدقہ' نیکی اور لوگوں کے ساتھ احسان کیا جائے خصوصاً رمضان میں۔ یوں تو رسول اللہ ﷺ سب لوگوں سے زیادہ سخی تھے لیکن رمضان میں جب جبریل آپ کے ساتھ قرآن مجید کے دور کے لیے آتے تو آپ مجسم جودوسخا ہوتے تھے۔
- روزے کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ جھوٹ' گالی گلوچ' دغا وخیانت' حرام نظر اور چیزوں کے ساتھ دل بہلانے سے اجتناب کیا جائے اوران تمام محرمات کو بھی ترک کر دیا جائے جن سے اجتناب روزہ دار کے لیے واجب ہے۔
- روزے کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ سحری کھائی جائے اور تاخیر کے ساتھ کھائی جائے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«تَسَحَّرُوا فَإِنَّ فِي السَّحُورِ بَرَكَةً»(صحيح البخاري، الصوم، باب بركة السحور، ح:١٩٢٣ وصحيح

مسلم، الصيام، باب فضل السحور، ح:١٠٩٥)
’’سحری کھاؤ کیونکہ سحری کھانے میں برکت ہے۔‘‘

❁ روزے کے آداب میں سے ایک ادب یہ بھی ہے کہ تر کھجور کے ساتھ روزہ افطار کیا جائے۔ تر کھجور میسر نہ ہو تو خشک کھجور کے ساتھ اور اگر خشک کھجور بھی موجود نہ ہو تو پھر پانی کے ساتھ افطار کر لیا جائے۔ سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی یا جب ظن غالب ہو کہ سورج غروب ہو گیا ہے' تو فوراً روزہ افطار کر لینا چاہیے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَا يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا عَجَّلُوا الْفِطْرَ»(صحيح البخاري، الصوم، باب تعجيل الإفطار، ح:١٩٥٧ وصحيح مسلم، الصيام، باب فضل السحور، ح:١٠٩٨)
’’لوگ ہمیشہ خیریت کے ساتھ رہیں گے جب تک جلد افطار کرتے رہیں گے۔‘‘

افطار کے وقت مسنون دعا

سوال کیا افطار کے وقت کی کوئی مسنون دعا ہے' نیز روزہ دار مؤذن کا جواب دے یا روزہ افطار کرنے میں مصروف رہے؟

جواب وقت افطار قبولیت دعا کا وقت ہے کیونکہ یہ اس عبادت (روزے) کا آخری وقت ہے اور بوقت افطار انسان اکثر و بیشتر شدید کمزور بھی ہوتا ہے اور انسان جس قدر شدید کمزور اور نرم دل ہو گا' اسی قدر توجہ اور انابت الی اللہ کے زیادہ قریب ہو گا۔ افطار کے وقت مسنون دعا یہ ہے۔

«اَللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ وَعَلٰى رِزْقِكَ أَفْطَرْتُ»(سنن أبي داود، الصيام، باب القول عند الإفطار، ح:٢٣٥٨)
’’اے اللہ! میں نے تیرے لیے روزہ رکھا اور تیرے ہی رزق پر افطار کیا۔‘‘

افطار کے وقت نبی ﷺ یہ دعا بھی پڑھا کرتے تھے:
«ذَهَبَ الظَّمَأُ، وَابْتَلَّتِ الْعُرُوقُ وَثَبَتَ الْأَجْرُ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ»(سنن أبي داود، الصيام، باب القول عند الإفطار، ح:٢٣٥٧)
’’پیاس ختم ہو گئی اور رگیں تر ہو گئیں اور اجر ان شاء اللہ ثابت ہو گیا۔‘‘

ان دونوں حدیثوں میں اگرچہ ضعف ہے لیکن بعض اہل علم نے انھیں حسن قرار دیا ہے۔ بہر حال آپ یہ دعائیں کریں یا حسب منشا دیگر دعائیں' افطار کا وقت قبولیت دعا کا وقت ہے۔ افطار کے وقت بھی انسان کو مؤذن کا جواب دینا چاہیے کیونکہ نبی ﷺ کا یہ فرمان:
«إِذَا سَمِعْتُمُ الْمُؤَذِّنَ فَقُولُوا مِثْلَ مَا يَقُولُ»(صحيح البخاري، الأذان، باب مايقول إذا سمع المنادي، ح:٦١١ وصحيح مسلم، الصلاة، باب استحباب القول مثل قول المؤذن، ح:٣٨٤ واللفظ له)
’’جب مؤذن کو سنو تو اسی طرح کہو جس طرح وہ کہتا ہے۔‘‘
ہر حال کو شامل ہے اِلَّا یہ کہ دلیل سے کوئی حالت مستثنیٰ قرار پائے۔

جس کے ذمے روزوں کی قضا ہو کیا وہ شوال کے چھ روزے رکھ سکتا ہے؟

سوال جس شخص کے ذمے قضا کے روزے ہوں، اس کے لیے شوال کے چھ روزے رکھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ صَامَ رَمَضَانَ، ثُمَّ أَتْبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ»(صحيح مسلم، الصيام، باب استحباب صوم ستة أيام من شوال، ح: ١١٦٤)

''جو شخص رمضان کے روزے رکھے اور پھر اس کے بعد شوال کے چھ روزے رکھ لے تو اس نے گویا زمانے بھر کے روزے رکھ لیے۔''

اگر انسان کے ذمے رمضان کے روزے باقی ہوں اور وہ شوال کے بھی چھ روزے رکھنا چاہے، تو کیا پہلے رمضان کے روزوں کی قضا ادا کرے یا پہلے شوال کے روزے رکھ لے؟ مثلاً اگر کسی شخص نے رمضان کے چوبیس روزے رکھے ہوں اور اس کے ذمے چھ روزے باقی ہوں اور وہ ان کی ادائے قضا سے قبل شوال کے چھ روزے رکھ لے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے رمضان کے روزے رکھنے کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے ہیں۔ ایسا تو اس صورت میں کہا جاسکتا ہے جب اس نے رمضان کے سارے روزے رکھ لیے ہوں، لہٰذا جس کے ذمے رمضان کے روزوں کی قضا ہو، اسے شوال کے چھ روزوں کا ثواب نہیں ملے گا۔

اس مسئلے کا تعلق علماء کے اس اختلاف سے نہیں ہے کہ جس کے ذمے قضا کے روزے ہوں کیا اس کے لیے نفل روزے رکھنا جائز ہے یا نہیں کیونکہ اس اختلاف کا تعلق چھ دنوں کے علاوہ دیگر دنوں سے ہے کیونکہ جہاں تک ان چھ دنوں کا تعلق ہے، تو یہ رمضان کے بعد ہیں اور ان کا ثواب اسی صورت میں ممکن ہے کہ رمضان کے روزے پورے کر لیے گئے ہوں۔

جس مریض کو قضا ادا کرنے کی مہلت نہ ملے اس کے بارے میں حکم

سوال ایک مریض نے رمضان کے روزے نہیں رکھے اور رمضان شروع ہونے کے چار دن بعد وہ فوت ہو گیا تو کیا اس کی طرف سے روزوں کی قضا ادا کی جائے گی؟

جواب اس مریض کو لاحق ہونے والا مرض اگر اتفاقی طور پر پیش آنے والے امراض میں سے تھا اور مرض جاری رہا حتی کہ مریض فوت ہو گیا تو اس صورت میں اس کی طرف سے قضا ادا نہیں کی جائے گی کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴾ (البقرة: ٢/ ١٨٥)

''اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں (روزے رکھ کر) ان کا شمار پورا کرے۔''

ایسے مریض کے لیے واجب ہے کہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر شمار پورا کر لے اور اگر اسے اس کی مہلت نہ ملی اور وہ فوت ہو گیا تو اس سے قضا کی ادائیگی ساقط ہو جائے گی کیونکہ اسے وہ وقت ہی نہیں ملا جس میں اس پر روزہ واجب تھا۔ وہ ایسے ہے جیسے شعبان میں فوت ہو گیا ہو تو اس کے لیے آنے والے رمضان کے روزے واجب نہیں ہیں۔ اگر اس کا مرض دائمی ہو جس سے

صحت یاب ہونے کی امید نہ ہوتو اس پر واجب ہے کہ ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔

سوال ایک شخص کے ذمے رمضان کے روزے تھے' اس نے قضا ادا نہ کی حتی کہ دوسرا رمضان شروع ہوگیا' تو وہ کیا کرے؟

جواب ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ ٱلشَّهۡرَ فَلۡيَصُمۡهُۖ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوۡ عَلَىٰ سَفَرٖ فَعِدَّةٞ مِّنۡ أَيَّامٍ أُخَرَۗ ﴾

(البقرة: ٢/ ١٨٥)

''تو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو اسے چاہیے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں (روزے رکھ کر) ان کا شمار پورا کر لے۔''

تو یہ شخص جس نے کسی شرعی عذر کی وجہ سے روزے چھوڑے تھے' اس کے لیے واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں قضا ادا کرے اور واجب ہے کہ اسی سال قضا ادا کرے اور دوسرے رمضان تک اسے مؤخر نہ کرے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمان ہے:

«كَانَ يَكُونُ عَلَيَّ الصَّوْمُ مِنْ رَمَضَانَ فَمَا أَسْتَطِيعُ أَنْ أَقْضِيَهُ إِلاَّ فِي شَعْبَانَ»(صحيح البخاري، الصوم، باب متى يقضي قضاء الصوم، ح: ١٩٥٠)

''رمضان کے روزے میرے ذمے ہوتے تھے تو میں ان کی قضا ادا کرنے کی شعبان کے علاوہ دوسرے کسی مہینے میں استطاعت نہیں رکھتی تھی۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مصروف ہونے کی وجہ سے جلد روزے نہیں رکھ سکتی تھیں اور انہوں نے جو یہ فرمایا: میں شعبان ہی میں ان کی قضا ادا کرنے کی استطاعت رکھتی تھی' اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ دوسرا رمضان شروع ہونے سے پہلے قضا کے روزے رکھ لینا ضروری ہے۔ اگر وہ انھیں دوسرے رمضان کے بعد تک مؤخر کر دے تو اللہ تعالیٰ کے آگے توبہ و استغفار کرے' اپنے فعل پر ندامت کا اظہار کرے اور قضا ادا کرے کیونکہ تاخیر کی صورت میں قضا کی ادائیگی ساقط نہیں ہوتی، لہٰذا اسے چھوڑے ہوئے روزوں کی قضا ادا کرنا ہوگی خواہ دوسرے رمضان کے بعد ہی ادا کرے۔ والله الموفق.

شوال کے روزے رکھنے کی افضل صورت

سوال شوال کے چھ روزوں کے بارے میں افضل صورت کیا ہے؟

جواب افضل یہ ہے کہ شوال کے چھ روزے عید کے فوراً بعد شروع کر دیے جائیں اور مسلسل رکھے جائیں جیسا کہ اہل علم نے فرمایا ہے کیونکہ اتباع پر عمل کی بہترین صورت یہی ہے جس کا حدیث میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

«ثُمَّ أَتْبَعَهُ سِتًّا»(صحيح مسلم، الصيام، باب استحباب صوم ستة أيام من شوال، ح: ١١٦٤)

''پھر اس کے بعد اس نے چھ روزے رکھے۔''

اور پھر نیکی کی طرف سبقت کی صورت بھی یہی ہے جس کی نصوص شریعت میں ترغیب دی گئی ہے اور جس کے سرانجام دینے والے کی ستائش کی گئی ہے۔ حزم و احتیاط کا بھی یہی تقاضا ہے' جو کمال عبدیت ہے۔ انسان کو فرصت کے لمحات میسر آئیں تو انھیں

ضائع نہیں کرنا چاہیے کیونکہ معلوم نہیں کہ اس انسان کو کس طرح کے حالات پیش آئیں، لہٰذا فرصت کو غنیمت جانتے ہوئے فوراً نیکی کے کام کرنے چاہئیں اور تمام امور ومعاملات میں انسان کو یہی طرز عمل اختیار کرنا چاہیے بشرطیکہ وہ نیک اور صالح امور ہوں۔

سوال کیا انسان کے لیے جائز ہے کہ شوال کے روزے جن دنوں میں چاہے رکھ لے یا یہ ایام متعین ہیں؟ اگر کوئی مسلمان ان دنوں میں روزے رکھ لے تو پھر کیا ہر سال اس کے لیے یہ روزے رکھنے فرض ہیں؟

جواب رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

«مَنْ صَامَ رَمَضَانَ، ثُمَّ أَتْبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ»(صحيح مسلم، الصيام، باب استحباب صوم ستة أيام من شوال، ح: ١١٦٤)

"جو شخص رمضان کے روزے رکھے اور پھر اس کے بعد شوال کے چھ روزے رکھ لے تو اس نے گویا زمانے بھر کے روزے رکھ لیے۔"

ان چھ روزوں کے لیے ایام محدود اور معین نہیں ہیں بلکہ مومن کو اختیار ہے کہ وہ سارے مہینے میں جس وقت چاہے روزے رکھ لے مہینے کے ابتدائی یا درمیانی یا آخری جس حصے میں چاہے روزے رکھ لے۔ اگر چاہے تو مہینے کے مختلف دنوں میں بھی یہ روزے رکھ سکتا ہے کیونکہ بحمد اللہ اس معاملے میں بہت گنجائش ہے اور اگر جلدی سے مہینے کی ابتدا میں مسلسل روزے رکھ لے تو یہ افضل اور نیکی کے کاموں میں سبقت کے باب سے ہوگا۔ پھر اگر بعض سالوں میں یہ روزے رکھے اور بعض سالوں میں نہ رکھے تو بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ روزے نفلی ہیں، واجب نہیں ہیں۔

یوم عاشورہ کے روزے کا حکم

سوال یوم عاشورہ کے روزے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب نبی ﷺ جب مدینہ تشریف لائے، تو آپ نے دیکھا کہ یہودی دس محرم کا روزہ رکھتے ہیں، تو نبی ﷺ نے فرمایا:

«أَنَا أَحَقُّ بِمُوسٰى مِنْكُمْ فَصَامَهُ وَأَمَرَ بِصِيَامِهِ»(صحيح البخاري، الصوم، باب صوم يوم عاشوراء، ح: ٢٠٠٤ وصحيح مسلم، الصيام، باب صوم يوم عاشوراء، ح: ١١٣٠ واللفظ للبخاري)

"تمہاری نسبت میں موسیٰ علیہ السلام کا زیادہ حق دار ہوں۔" پس آپ نے خود بھی اس دن کا روزہ رکھا اور اس دن روزہ رکھنے کا حکم بھی دیا۔

حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما میں ہے کہ نبی ﷺ نے یوم عاشورہ کا روزہ رکھا اور اس کے روزے کا حکم بھی دیا۔ اس دن کے روزے کی فضیلت کے بارے میں نبی ﷺ سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

«أَحْتَسِبُ عَلَى اللهِ أَنْ يُكَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِي قَبْلَهُ»(صحيح مسلم، الصيام، باب استحباب صيام ثلاثة أيام من كل شهر وصوم يوم عرفة، ح: ١١٦٢)

"مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ سابقہ ایک سال کے گناہ معاف فرما دے گا۔"

اس کے بعد آپ نے یہودیوں کی مخالفت میں حکم دیا کہ اس سے پہلے یعنی نو محرم یا اس کے بعد یعنی گیارہ محرم کا بھی روزہ رکھ

لیا جائے، لہٰذا افضل یہ ہے کہ دس محرم کے ساتھ اس سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد کا روزہ بھی رکھ لیا جائے' البتہ نو محرم کا روزہ گیارہ محرم کے روزے سے افضل ہے۔

اے مسلمان بھائی! آپ کو چاہیے کہ آپ یوم عاشورہ اور اس کے ساتھ نو محرم کا روزہ رکھا کریں۔

شعبان کے روزوں کے متعلق کیا حکم ہے؟

سوال ماہ شعبان کے روزے رکھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب ماہ شعبان میں روزے رکھنا اور کثرت سے رکھنا سنت ہے حتی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

«مَا رَأَيْتُهُ أَكْثَرَ صِيَامًا مِنْهُ فِي شَعْبَانَ»(صحيح البخاري، الصوم، باب صوم شعبان، ح:١٩٦٩)

''میں نے آپ کو شعبان سے زیادہ اور کسی مہینے میں روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

اس حدیث کی وجہ سے ماہ شعبان میں روزے کثرت سے رکھنے چاہئیں۔ اہل علم نے لکھا ہے کہ شعبان کے روزے اس طرح ہیں جیسے فرض نمازوں کے ساتھ سنن مؤکدہ۔ گویہ ماہ رمضان کا مقدمہ ہیں یعنی ماہ رمضان کی سنن مؤکدہ ہیں اور شوال کے چھ روزے ایسے ہیں جیسے فرض نمازوں کے بعد کی سنن مؤکدہ' شعبان کے روزوں کا ایک فائدہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اس طرح نفس رمضان کے روزوں کے لیے تیار ہو جاتا اور اس کے لیے رمضان کے روزے رکھنے آسان ہو جاتے ہیں۔

ایک دن روزہ رکھنے اور ایک دن افطار کرنے والا جمعہ کا روزہ بھی رکھ سکتا ہے

سوال جب انسان ایک دن روزہ رکھے اور ایک دن افطار کر لے اور اس کے روزے کا دن جمعہ کو آ جائے تو کیا اس کے لیے روزہ رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب جب انسان کا ایک دن روزہ رکھنے اور ایک دن افطار کرنے کا معمول ہو تو اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ صرف جمعہ یا ہفتہ یا اتوار کے دن کا روزہ رکھے بشرطیکہ وہ کوئی ایسا دن نہ ہو جس کا روزہ رکھنا حرام ہو اور اگر ایسا دن ہو تو روزہ ترک کرنا واجب ہے۔ اگر ایک شخص ایک دن روزہ رکھتا اور ایک دن افطار کرتا ہو' افطار کا دن جمعرات کو اور روزہ رکھنے کا دن جمعہ آ جائے تو اس صورت میں جمعہ کے دن کا روزہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس نے جمعہ کا روزہ محض اس لیے نہیں رکھا کہ وہ جمعہ کا دن ہے بلکہ اس لیے رکھا ہے کہ اس کے معمول کے مطابق روزہ رکھنے کا دن آ گیا ہے۔ اگر یہ دن عید الاضحیٰ یا ایام تشریق میں سے کسی دن آ جائے تو پھر روزہ نہ رکھنا واجب ہے۔ اسی طرح اگر عورت کا روزے کے بارے میں یہ معمول ہو اور روزہ رکھنے کا دن حیض یا نفاس کے دن آ جائے تو اسے روزہ نہیں رکھنا چاہیے۔

روزے میں وصال سے کیا مراد ہے؟

سوال وصال کے روزے سے کیا مراد ہے؟ کیا شرعاً یہ جائز ہے؟

جواب وصال کے روزے سے مراد یہ ہے کہ انسان دو دن افطار نہ کرے اور دو دن متواتر روزے کی حالت میں رہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

اس سے منع کرتے ہوئے فرمایا ہے:

«أَيُّكُمْ أَرَادَ أَنْ يُوَاصِلَ فَلْيُوَاصِلْ حَتَّى السَّحَرِ»(صحيح البخاري، الصوم، باب الوصال إلى السحر، ح:١٩٦٧)

’’جو شخص وصال کرنا چاہے‘ وہ سحری تک وصال کرے۔‘‘

سحری تک وصال جائز ہے‘ حکم شریعت نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے روزہ جلد افطار کرنے کی ترغیب دی ہے۔ آپ نے فرمایا:

«لاَ يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا عَجَّلُوا الْفِطْرَ»(صحيح البخاري، الصوم، باب تعجيل الإفطار، ح:١٩٥٧، وصحيح مسلم، الصيام، باب فضل السحور، ح:١٠٩٨)

’’لوگ اس وقت تک خیر کے ساتھ رہیں گے‘ جب تک جلد افطار کرتے رہیں گے۔‘‘

رسول اللہ ﷺ نے سحری تک وصال کو صرف جائز قرار دیا ہے اور جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ تو وصال فرماتے ہیں‘ تو آپ نے فرمایا:

«إِنِّي لَسْتُ كَهَيْئَتِكُمْ»(صحيح البخاري، الصوم، باب بركة السحور في غير إيجاب، ح:١٩٢٢، وصحيح مسلم، الصوم، باب النهي عن الوصال، ح:١١٠٢)

’’یقیناً میں تمھاری طرح نہیں ہوں۔‘‘

جمعہ کے دن روزے کی ممانعت کا سبب

سوال خاص جمعہ کے دن کے روزے کی ممانعت کا کیا سبب ہے؟ کیا یہ حکم عام ہے اور قضا کے روزے کو بھی شامل ہے؟

جواب نبیٔ اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

«لاَ تَخْتَصُّوا لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ بِقِيَامٍ مِنْ بَيْنِ اللَّيَالِي وَلاَ تَخُصُّوا يَوْمَ الْجُمُعَةِ بِصِيَامٍ مِنْ بَيْنِ الْأَيَّامِ»(صحيح مسلم، الصيام، باب كراهة صوم الجمعة منفردا، ح:١١٤٤)

’’راتوں میں سے جمعہ کی رات کو قیام کے لیے اور دنوں میں سے جمعہ کے دن کو روزے کے لیے مخصوص نہ کرو۔‘‘

جمعہ کے دن کی تخصیص کی ممانعت میں حکمت یہ ہے کہ جمعہ کا دن ہفتہ وار عید کا دن ہے اور یہ تین شرعی عیدوں میں سے ایک عید ہے۔ اسلام میں صرف تین عیدیں ہیں۔ (1) عید الفطر۔ (2) عید الاضحیٰ اور (3) ہفتہ وار عید جمعہ۔ اسی وجہ سے صرف اس دن کا خاص روزہ رکھنے سے منع کر دیا گیا ہے اور اس لیے بھی کہ جمعہ کے دن مردوں کو نماز کے لیے جلدی جانا چاہیے‘ دعا اور ذکر و اذکار میں مشغول ہونا چاہیے‘ جمعہ کا دن گویا عرفہ کے دن کے مشابہ ہے اور عرفہ کے دن حاجی کے لیے روزہ رکھنے کا حکم نہیں ہے کیونکہ اس دن وہ دعا اور ذکر میں مشغول ہوتا ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ جب مختلف عبادات جمع ہو جائیں تو ان میں سے جس کو مؤخر کرنا ممکن نہ ہو‘ اسے ادا کر لیا جائے اور جسے مؤخر کرنا ممکن ہو اسے مؤخر کر دیا جائے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ اگر اس کا سبب ہفتہ وار عید کا دن ہونا ہے‘ اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ جمعہ کے دن‘ عیدین کے دن کی طرح روزہ رکھنا حرام ہو۔ صرف جمعہ کا اکیلا روزہ رکھنے کی ممانعت نہ ہو تو ہم کہیں گے کہ جمعہ کا دن عیدین کے دن سے مختلف ہے کیونکہ یہ تو ہر ماہ

چار دفعہ آتا ہے، لہٰذا اس کے بارے میں حکم ممانعت حرمت کا نہیں ہے۔ علاوہ ازیں عیدین کی کئی اور خصوصیات بھی ہیں، جو جمعہ کے دن کی نہیں ہیں۔ اگر اس سے پہلے یا بعد میں ایک دن کا روزہ رکھ لے، تو اس سے معلوم ہوگا کہ غرض خاص جمعہ کے دن کا روزہ رکھنا نہیں ہے کیونکہ اس نے جمعہ سے ایک دن پہلے جمعرات یا اس کے ایک دن بعد یعنی ہفتے کے دن کا بھی روزہ رکھا ہے۔

سائل نے جو یہ پوچھا ہے کہ یہ حکم خاص نفلی روزے ہی کے لیے ہے یا عام ہے اور قضا کے روزے کو بھی شامل ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دلائل سے بظاہر عموم ہی معلوم ہوتا ہے یعنی خاص جمعہ کے دن کا روزہ رکھنا مکروہ ہے، خواہ روزہ فرض ہو یا نفل اِلَّا یہ کہ کوئی انسان کام کاج میں مشغول ہو اور اس کے لیے جمعہ ہی کے دن روزہ رکھنا ممکن ہو تو پھر اس کے لیے جمعہ کے دن روزہ رکھنا مکروہ نہیں ہوگا کیونکہ اسے روزہ رکھنے کی ضرورت ہے۔

نفلی روزہ بوقت ضرورت توڑنا جائز ہے

سوال اگر کوئی انسان کسی طرح اپنے نفلی روزے کو توڑ دے، تو کیا وہ گناہ گار ہوگا؟ اگر وہ جماع کے ساتھ روزہ توڑے، تو کیا اس پر کفارہ واجب ہوگا؟

جواب اگر انسان نفلی روزہ رکھے، پھر اسے کھانے، پینے یا جماع کے ساتھ توڑ دے، تو اسے گناہ نہیں ہوگا کیونکہ حج وعمرہ کے سوا دیگر کسی بھی عبادت کو شروع کرنے کے بعد مکمل کرنا لازم نہیں ہے، البتہ افضل یہ ہے کہ اسے پورا کرے، لہٰذا نفلی روزے کی حالت میں جماع کر لینے کی صورت میں کفارہ واجب نہیں ہے کیونکہ اس روزے کو پورا کرنا لازم نہیں ہے۔

فرض روزے کی حالت میں بیوی کے ساتھ جماع کرنا جائز نہیں کیونکہ فرض روزے کو کسی اضطراری حالت کے بغیر توڑنا جائز نہیں ہے اور کفارہ اسی صورت میں واجب ہوگا جب ماہ رمضان میں دن کے وقت وہ شخص جماع کر لے جس پر روزہ واجب ہو۔ ہمارے ان الفاظ پر غور کیجیے کہ ''جس پر روزہ واجب ہو'' یہ اس لیے کہ فرض کریں اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ سفر کرے اور سفر میں دونوں نے روزہ رکھا ہو اور پھر وہ جماع کر لیں تو انھیں گناہ ہوگا نہ ان پر کفارہ لازم ہوگا، اس صورت میں اسے اور اس کی بیوی کو اس دن کے روزے کی قضا ادا کرنی ہوگی۔

اعتکاف اور معتکف کے احکام

سوال اعتکاف کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا معتکف کے لیے قضائے حاجت، کھانے پینے اور علاج معالجے کے لیے مسجد سے باہر نکلنا جائز ہے؟ اعتکاف کی سنتیں کیا ہیں؟ اور نبی ﷺ سے اعتکاف کی صحیح صورت کس طرح مروی ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ کی اطاعت وبندگی کے لیے خلوت نشین ہونے کے لیے مسجدوں میں جم کر بیٹھ جانا اعتکاف ہے اور وہ لیلۃ القدر کی تلاش کے لیے مسنون ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں اس طرح اشارہ فرمایا ہے:

﴿ وَلَا تُبَٰشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَٰكِفُونَ فِى ٱلْمَسَٰجِدِ ﴾ (البقرۃ: ۲/ ۱۸۷)

''اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہوئے ہو تو ان سے مباشرت نہ کرو۔''

صحیحین اور دیگر کتب حدیث سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے اور آپ کے صحابہ نے اعتکاف فرمایا تھا اور بعد میں

بھی اعتکاف کا حکم باقی رہا اور منسوخ نہیں ہوا۔ ① صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَعْتَكِفُ الْعَشْرَ الأَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ حَتَّى تَوَفَّاهُ اللّٰهُ تَعَالَى ثُمَّ اعْتَكَفَ أَزْوَاجُهُ مِنْ بَعْدِهِ»(صحيح البخاري، الاعتكاف، باب الاعتكاف في العشر الاواخر، ح:٢٠٢٦، صحيح مسلم، الاعتكاف، باب اعتكاف العشر الأواخر من رمضان، ح:١١٧٢)

”نبی ﷺ رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف فرمایا کرتے تھے حتی کہ اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے' پھر آپ کے بعد آپ کی ازواج مطہرات نے اعتکاف فرمایا۔“

صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے رمضان کے پہلے عشرے کا اعتکاف فرمایا' پھر درمیانی عشرے کا اعتکاف فرمایا' پھر فرمایا:

«إِنِّي اعْتَكَفْتُ الْعَشْرَ الأَوَّلَ أَلْتَمِسُ هٰذِهِ اللَّيْلَةَ (يَعْنِي لَيْلَةَ الْقَدْرِ) ثُمَّ اعْتَكَفْتُ الْعَشْرَ الأَوْسَطَ، ثُمَّ أَتَيْتُ فَقِيْلَ لِي :إِنَّهَا فِي الْعَشْرِ الأَوَاخِرِ، فَمَنْ أَحَبَّ مِنْكُمْ أَنْ يَعْتَكِفَ فَلْيَعْتَكِفْ»(صحيح البخاري، الاعتكاف، باب الاعتكاف في العشر الأواخر، ح:٢٠٢٧، وصحيح مسلم، الصيام، باب فضل ليلة القدر والحث على طلبها، ح:١١٦٧، واللفظ له)

”میں نے اس رات (یعنی لیلۃ القدر) کی تلاش میں پہلے عشرے کا اعتکاف کیا' پھر درمیانی عشرے کا اعتکاف کیا' پھر میں اعتکاف کے لیے جب آیا تو مجھ سے کہا گیا کہ یہ رات تو آخری عشرے میں ہے' لہٰذا تم میں سے جو شخص اعتکاف کرنا چاہے وہ اعتکاف کر لے۔“

پس لوگوں نے آپ کے ساتھ اعتکاف کیا۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے نہیں معلوم کہ علماء میں سے کسی نے اعتکاف کے مسنون ہونے کے بارے میں اختلاف کیا ہو گویا اعتکاف نص اور اجماع کی روشنی میں مسنون ہے۔ اعتکاف ایسی مساجد میں ہونا چاہیے جن میں نماز باجماعت ادا کی جاتی ہو' خواہ ان کا تعلق کسی بھی علاقے سے ہو کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿و أنتم عٰكفون فى المسٰجد﴾ (البقرة : ٢/ ١٨٧) ”اس حال میں تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو“ کے عموم کا یہی تقاضا ہے' البتہ افضل یہ ہے کہ ایسی مسجد میں اعتکاف کیا جائے جس میں جمعہ کی نماز بھی ادا کی جاتی ہو تاکہ اسے نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے مسجد سے نکلنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ اگر اس نے کسی ایسی مسجد میں اعتکاف کر لیا جس میں جمعہ کا اہتمام نہیں' تو پھر اس کے لیے دوسری مسجد میں نماز جمعہ کے لیے جانے میں کوئی حرج نہیں۔

معتکف کو چاہیے کہ وہ اللہ عزوجل کی اطاعت و بندگی' نماز' تلاوت قرآن اور ذکر الٰہی میں مشغول رہے کیونکہ اعتکاف سے یہی مقصود ہے۔ ساتھیوں سے تھوڑی سی بات چیت کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں' خصوصاً جب کہ اس میں کوئی فائدہ بھی ہو۔ معتکف کے لیے جماع اور اس کے مقدمات حرام ہیں اور مسجد سے نکلنے کی فقہاء نے حسب ذیل تین اقسام بیان کی ہیں:

---

① صحیح البخاری، الاعتکاف، باب الاعتکاف، حدیث:2036

① کسی ایسے امر کے لیے باہر نکلنا جائز ہے، جس کے بغیر شرعاً یا طبعاً چارۂ کار نہ ہو، مثلاً نماز جمعہ اور کھانے پینے کے لیے نکلنا جبکہ کوئی اور لانے والا نہ ہو، نیز وضوو غسل اور بول و براز کی حاجت کے لیے نکلنا۔

② کسی ایسے نیک کام کے لیے نکلنا جو اس کے لیے واجب نہ ہو، مثلاً بیمار کی بیمار پرسی اور نماز جنازہ کے لیے نکلنا۔ یہ اس صورت میں جائز ہے جب اس نے اعتکاف کی ابتدا میں اس کی شرط عائد کر لی ہو اور اگر اس نے ایسی شرط عائد نہ کی ہو تو پھر ایسے کاموں کے لیے مسجد سے باہر نکلنا جائز نہیں۔

③ کسی ایسے کام کے لیے نکلنا جو اعتکاف کے منافی ہو، مثلاً گھر جانے کے لیے، خرید و فروخت کے لیے اور بیوی سے جماع کے لیے نکلنا جائز نہیں ہے، خواہ اس نے اس کی شرط عائد کی ہو یا شرط عائد نہ کی ہو۔ واللہ الموفق.

* * *

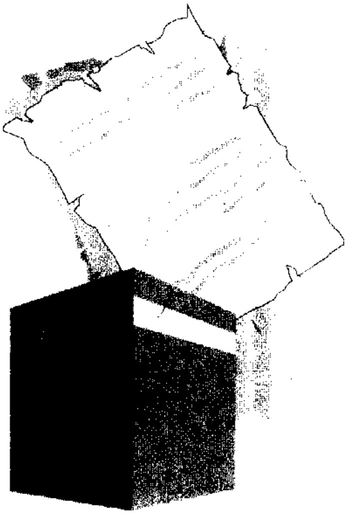

حج کے مسائل

بے نماز کے حج کے بارے میں حکم

سوال جب ایسا شخص حج کرے، جو نماز پڑھتا ہو نہ روزے رکھتا ہو تو اس حال میں اس کے حج کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور توبہ کر لینے کی صورت میں کیا اسے ترک کی ہوئی عبادات کی قضا ادا کرنا ہوگی؟

جواب ترک نماز کفر ہے، اس سے انسان ملت اسلامیہ سے خارج ہو کر ابدی جہنمی ہو جاتا ہے جیسا کہ کتاب وسنت اور اقوال سلف رحمہم اللہ سے یہ ثابت ہے، لہٰذا یہ شخص جو نماز نہیں پڑھتا، اس کے لیے مکہ مکرمہ میں داخل ہونا حلال نہیں ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِنَّمَا ٱلْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُواْ ٱلْمَسْجِدَ ٱلْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَـٰذَا ۚ﴾ (التوبة: ۹/ ۲۸)

”مومنو! بے شک مشرک پلید ہیں، لہٰذا اس برس کے بعد وہ خانہ کعبہ کے پاس نہ جانے پائیں۔“

بے نماز کا حج نا قابل قبول ہے کیونکہ وہ ایک کافر کا حج ہے اور کافر کی عبادات قبول نہیں ہوتیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا مَنَعَهُمْ أَن تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَـٰتُهُمْ إِلَّآ أَنَّهُمْ كَفَرُواْ بِٱللَّهِ وَبِرَسُولِهِۦ وَلَا يَأْتُونَ ٱلصَّلَوٰةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالَىٰ وَلَا يُنفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَـٰرِهُونَ ﴿٥٤﴾ ﴾ (التوبة: ۹/ ۵۴)

”اور ان کے خرچ (اموال) کے قبول ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ انھوں نے اللہ سے اور اس کے رسول سے کفر کیا اور وہ نماز کو آتے ہیں تو سست وکاہل ہو کر اور خرچ کرتے ہیں تو ناخوشی سے۔“

رہا ترک کیے ہوئے سابقہ اعمال کا معاملہ تو ان کی قضا کی ادائیگی اس پر واجب نہ ہوگی کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُل لِّلَّذِينَ كَفَرُوٓاْ إِن يَنتَهُواْ يُغْفَرْ لَهُم مَّا قَدْ سَلَفَ ﴾ (الأنفال: ۸/ ۳۸)

”اے پیغمبر! کفار سے کہہ دو کہ اگر وہ اپنے افعال سے باز آ جائیں تو جو ہو چکا وہ انھیں معاف کر دیا جائے گا۔“

جس شخص نے اعمال ترک کیے ہوں، اسے اللہ تعالیٰ کے آگے سچے دل سے توبہ کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت وبندگی کے کام بجا لانے چاہئیں اور اعمال صالحہ اور توبہ واستغفار کی کثرت کے ساتھ اللہ عزوجل کے تقرب کے حصول کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ۞ قُلْ يَـٰعِبَادِىَ ٱلَّذِينَ أَسْرَفُواْ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُواْ مِن رَّحْمَةِ ٱللَّهِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ يَغْفِرُ ٱلذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلْغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ ﴿٥٣﴾ ﴾ (الزمر: ۳۹/ ۵۳)

”(اے پیغمبر! میری طرف سے لوگوں سے) کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا۔ بے شک اللہ تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے (اور) وہ تو بخشنے والا مہربان ہے۔“

یہ آیت کریمہ توبہ کرنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ہر وہ گناہ جس سے بندہ توبہ کر لے‘ خواہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک ہو‘ تو اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دیتا ہے۔ واللہ الهادی الی سواء الصراط.

وسائل کے بعد فریضۂ حج ادا کرنے میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے

سوال ہم بعض مسلمانوں خصوصاً نوجوانوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ فریضۂ حج ادا کرنے میں سستی سے کام لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسے ہم عنقریب ادا کر لیں گے اور پھر وہ بعض مشاغل کی وجہ سے معذور ہو جاتے ہیں‘ ایسے لوگوں کے بارے میں آپ کیا نصیحت فرمائیں گے؟ بعض والدین اپنے بیٹوں کو فریضۂ حج ادا کرنے سے روکتے ہیں کیونکہ وہ ڈرتے ہیں کہ انھیں سفر میں کوئی گزند نہ پہنچ جائے یا کہتے ہیں کہ وہ ابھی چھوٹے ہیں‘ حالانکہ ان پر حج کی ساری شرطیں لاگو ہوتی ہیں‘ تو ایسے والدین کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اس بارے میں بیٹوں کی اپنے والدین کی اطاعت کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ جزاکم اللہ خیرا‘ ووفقکم لما فیہ خیر الدنیا والآخرۃ۔

جواب یہ امر معلوم ہے کہ حج اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن اور اس کی عظیم بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے‘ لہٰذا حج کے بغیر کسی شخص کا اسلام مکمل نہیں ہو سکتا بشرطیکہ اس کے حق میں وجوب کی شرطیں موجود ہوں اور جس کے حق میں وجوب کی شرطیں موجود ہوں اسے حج مؤخر نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام فوراً بجا لانے چاہئیں‘ نیز کسی انسان کو معلوم نہیں کہ اسے کل کیا حالات پیش آئیں‘ ہو سکتا ہے کل وہ فقیر یا بیمار ہو جائے یا فوت ہو جائے۔ والدین کے لیے بھی یہ حلال نہیں کہ وہ اپنے بیٹوں کو حج پر جانے سے منع کریں‘ جبکہ ان کے حق میں وجوب کی شرطیں پوری ہوں اور دین واخلاق کے اعتبار سے انھیں قابل اعتماد رفقا کی معیت حاصل ہو۔ بیٹوں کے لیے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ ترک حج میں اپنے والدین کی اطاعت کریں‘ جبکہ حج واجب ہو کیونکہ خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں اِلاّ یہ کہ والدین کوئی شرعی عذر پیش کریں‘ تو اس صورت میں اس عذر کے زائل ہونے تک حج کو مؤخر کرنا جائز ہوگا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ سب کو خیر وخوبی کی توفیق عطا فرمائے۔

مقروض کے لیے حج واجب نہیں

سوال کیا مقروض کے لیے حج لازم ہے؟

جواب جب انسان پر اس قدر قرض ہو‘ جو اس کے سارے مال کے برابر ہو تو اس پر حج واجب نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حج اس آدمی پر فرض کیا ہے‘ جو استطاعت رکھتا ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلِلَّهِ عَلَى ٱلنَّاسِ حِجُّ ٱلْبَيْتِ مَنِ ٱسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ (آل عمران: ۳/ ۹۷)

”اور لوگوں پر اللہ کا حق (یعنی فرض) ہے کہ جو اس گھر تک جانے کی استطاعت رکھے وہ اس کا حج کرے۔“

اور جس شخص پر اس قدر قرض ہو کہ اسے ادا کرنے کے بعد اس کے پاس کچھ بھی نہ بچے تو اسے حج کی استطاعت نہیں ہے۔ وہ پہلے اپنا قرض ادا کرے اور بعد میں جب اس کے لیے آسانی ہو تو حج کر لے۔ اگر قرض اس کے مال سے کم ہو‘ یعنی قرض ادا کرنے کے بعد بھی اس کے پاس مال بچ جائے تو قرض ادا کرنے کے بعد حج کر لے‘ حج خواہ فرض ہو یا نفل۔ اگر حج فرض ہو تو اس کے لیے واجب

ہے کہ وہ اسے جلد ادا کرے اور اگر حج فرض نہ ہو تو اسے اختیار ہے کہ اگر چاہے تو ادا کر لے اور اگر نہ چاہے تو اسے کوئی گناہ نہیں۔

امانت دار اور احکام حج سے واقف شخص ہی کو وکیل بنایا جا سکتا ہے

سوال ایک شخص نے کسی کو وکیل مقرر کیا تا کہ وہ اس کی ماں کی طرف سے حج کر لے اور بعد میں اسے معلوم ہوا کہ یہ اور بھی کئی لوگوں کی طرف سے وکیل بنا ہے، تو اس صورت میں کیا حکم ہے؟ فتویٰ دیجیے۔ غفر اللہ لکم۔

جواب انسان کو اپنے تصرف میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے اور وہ معاملے کو کسی ایسے شخص کے سپرد کرے جس کے دین کے بارے میں اسے پورا پورا اطمینان ہو کہ وہ امانت دار ہے اور جس کام کے لیے اسے وکیل بنایا گیا ہے، اسے خوب جانتا ہے، مثلاً جب آپ کسی شخص کو اس لیے مال دینے کا ارادہ کریں کہ وہ آپ کے مرحوم باپ یا ماں کی طرف سے حج کرے، تو آپ ایسے شخص کو منتخب کریں، جس کے علم اور دین کے بارے میں آپ کو اعتماد ہو کیونکہ بہت سے لوگ تو احکام حج کے بارے میں عظیم جہالت میں مبتلا ہیں۔ وہ حج کو صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتے، خواہ فی نفسہ امانت دار ہوں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان پر واجب ہے اور وہ بہت سی غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ احکام حج کے بارے میں علم کی کمی کی وجہ سے ایسے لوگوں کو نائب نہیں بنانا چاہیے۔ کچھ لوگوں کو احکام حج کا علم تو ہوتا ہے لیکن ان میں امانت و دیانت کا فقدان ہوتا ہے اور انہیں اس بات کا پاس نہیں ہوتا کہ مناسک حج میں وہ کیا کہہ رہے یا کر رہے ہیں۔ اسے بھی حج کے سلسلے میں اپنا وکیل نہیں بنانا چاہیے بلکہ حج کے لیے ایسے شخص کو امین بنانا چاہیے جو علم اور امانت کے اعتبار سے افضل ہو تا کہ وہ اس فرض کو اکمل طریقے سے ادا کر سکے جس کے ادا کرنے کا اس سے مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

یہ شخص جس کے بارے میں سائل نے ذکر کیا ہے کہ اس نے مال دیا تا کہ وہ اس کی والدہ کی طرف سے حج کرے لیکن بعد میں اس نے سنا کہ اس نے کئی اور لوگوں کے لیے بھی حج بدل ادا کرنے کے لیے رقوم لی ہیں، تو دیکھنا چاہیے شاید اس کے پاس اور لوگ بھی ہوں جن کو اس نے حج بدل ادا کرنے کیلئے تیار کر رکھا ہو اور وہ خود اس کی طرف سے بھی حج کر رہا ہو جس کی طرف سے اسے نیابت سپرد کی گئی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح کا کام کرنا کسی انسان کیلئے جائز ہے؟ یعنی کسی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ حج یا عمرے میں متعدد اشخاص کی طرف سے وکیل بنے اور پھر خود براہ راست ان کی طرف سے حج یا عمرہ ادا نہ کرے بلکہ اسے دوسرے لوگوں کے سپرد کر دے۔

ہم اس کے جواب میں عرض کریں گے کہ یہ بالکل جائز اور حلال نہیں ہے بلکہ یہ مال کو باطل طریقے سے کھانا ہے۔ بعض لوگوں نے تو اسے کاروبار بنا لیا ہے کہ وہ مختلف لوگوں سے حج اور عمرے ادا کرنے کے لیے مال لے لیتے ہیں کہ ان کی طرف سے وہ خود حج یا عمرہ کریں گے لیکن پھر کم خرچ پر وہ یہ کام دوسرے لوگوں کے سپرد کر دیتے ہیں اور اس طرح باطل طریقے سے مال کھاتے ہیں کیونکہ وہ اپنی طرف سے ایسے لوگوں کو حج وعمرہ پر بھیج دیتے ہیں، جن کو اصحاب مال شاید پسند نہ کریں۔ ایسے لوگوں کو اپنے اور اپنے بھائیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے کیونکہ اس طرح مال کھانا ناحق طریقے سے مال کھانا ہے۔ اگر اسے بعض بھائیوں کی طرف سے حج یا عمرے کے سلسلے میں امین سمجھا گیا ہے، تو اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ از خود یہ کام کسی کے سپرد کر دے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ حج یا عمرے کے لیے اسے پسند نہ کرتے ہوں۔

حج یا عمرے کی ادائیگی سے قاصر شخص کیا کرے؟

سوال ایک بہت معمر شخص نے عمرے کا احرام باندھا اور جب وہ بیت اللہ میں پہنچا تو عمرہ ادا کرنے سے عاجز و قاصر ہو گیا تو وہ کیا کرے؟

جواب وہ حالت احرام ہی میں رہے حتی کہ اس کے لیے عمرہ ادا کرنا ممکن ہو جائے اِلاَّ کہ اس نے بوقت احرام یہ شرط عائد کی ہو کہ اگر کسی روکنے والے نے مجھے روک دیا تو میں وہاں حلال ہو جاؤں گا' جہاں تو مجھے روکے گا۔ تو اس صورت میں وہ احرام کھول کر حلال ہو جائے' اس پر عمرہ یا طواف وداع وغیرہ کوئی چیز بھی واجب نہ ہو گی اور اگر اس نے ایسی شرط عائد نہ کی ہو اور اس کمزوری و ناتوانی کے ازالے کی بھی امید نہ ہو تو وہ احرام کھول کر حلال ہو جائے اور اگر استطاعت ہو تو ایک جانور بطور فدیہ ذبح کر دے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ۚ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۖ وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ ۚ ﴾

(البقرة: ٢/ ١٩٦)

''اور اللہ (کی خوشنودی) کے لیے حج اور عمرے کو پورا کرو اور اگر (رستے میں) روک لیے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو (کر دو) اور جب تک قربانی اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے سر نہ منڈواؤ۔''

نبی ﷺ کو جب عمرہ ادا کرنے سے حدیبیہ کے مقام پر روک دیا گیا تھا تو آپ نے قربانی کے جانور کو ذبح فرمایا اور احرام کھول کر حلال ہو گئے۔

حج بدل اگر طے شدہ رقم سے کم خرچ پر ہو تو......؟

سوال جب کوئی انسان اجرت لے کر کسی دوسرے کی طرف سے حج کرے اور اس میں سے کچھ رقم باقی بچ جائے تو کیا مالک اس سے واپس لے لے؟

جواب اگر کوئی آدمی کسی سے کچھ رقم لے تاکہ وہ اس کے ساتھ حج کرے اور یہ رقم حج کے خرچ سے زیادہ ہو' تو اس کے لیے لازم نہیں ہے کہ بچ جانے والی رقم دینے والے کو واپس کرے اِلاَّ یہ کہ دینے والے نے کہا ہو کہ اس میں سے حج کر لو اور یہ نہ کہا ہو کہ ان کے ساتھ حج کر لو۔ اگر اس نے یہ کہا ہو کہ اس میں سے حج کرلو' تو اس صورت میں حج کے خرچ سے بچ جانے والی رقم اسے واپس کرنا لازم ہو گی۔ اب مالک کی مرضی کہ وہ چاہے تو نہ لے اور اگر چاہے تو واپس لے لے۔ اگر اس نے یہ الفاظ کہے ہوں کہ اس کے ساتھ حج کر لو تو اس صورت میں بچ جانے والی رقم واپس کرنا ضروری نہیں اِلاَّ یہ کہ دینے والے کو امور حج کے بارے میں علم نہ ہو اور وہ یہ سمجھتا ہو کہ حج پر بہت اخراجات آتے ہیں اور اس نے ناواقفیت کی وجہ سے بہت سی رقم دے دی ہو تو اس صورت میں اس پر حقیقت حال کو واضح کرنا واجب ہے یعنی اسے چاہیے کہ وہ اسے یہ بتادے کہ حج پر اتنی رقم خرچ ہوئی ہے۔ آپ نے مجھے استحقاق سے زیادہ رقم دے دی تھی۔ اگر وہ بچ جانے والی رقم بھی اسے دے دے اور اس سے واپس نہ لے تو پھر اس کے لیے اسے اپنے پاس رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔

کسی کی طرف سے عمرہ ادا کرتے ہوئے اپنے لیے دعا کرنا

سوال جب بیٹا اپنے باپ کی طرف سے عمرہ ادا کر رہا ہو تو کیا اس کے لیے اپنے لیے دعا کرنا جائز ہے؟

جواب اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اس عمرے میں اپنے لیے' اپنے باپ کے لیے اور جن مسلمانوں کے لیے چاہے' دعا کر سکتا ہے کیونکہ مقصود تو یہ ہے کہ وہ اسی آدمی کی طرف سے اعمال عمرہ ادا کرے جس کا اس نے ارادہ کیا ہے۔ دعا کرنا عمرے کا رکن یا شرط نہیں ہے' لہٰذا اس کیلئے جائز ہے کہ وہ اپنے لیے' جس کی طرف سے عمرہ ادا کر رہا ہو اس کے لیے اور دیگر تمام مسلمانوں کے لیے دعا کرے۔

حج یا عمرے میں کسی کو نائب بنانے کے متعلق حکم

سوال حج یا عمرے میں کسی کو نائب بنانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب حج کے لیے کسی کو وکیل بنانے کی درج ذیل دو صورتیں ہو سکتی ہیں: ① فرض کے لیے وکیل بنایا گیا ہو۔ ② نفل کے لیے وکیل بنایا گیا ہو۔ فرض حج یا عمرے میں کسی کو اپنا وکیل بنانا جائز نہیں ہے اِلاَّ یہ کہ خود بنفس نفیس بیت اللہ تک پہنچنا ممکن نہ ہو' خواہ اس کا سبب ایسا دائمی مرض ہو' جس کے ازالے کی امید نہ ہو یا اس کا سبب بڑھاپا وغیرہ ہو۔ اگر مرض کے زائل ہو جانے کی امید ہو تو اسے انتظار کرنا چاہیے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ عافیت عطا فرما دے اور وہ خود بنفسہ حج ادا کر سکے۔ اگر کوئی امر حج سے مانع نہ ہو اور انسان خود حج کر سکتا ہو تو اس صورت میں حج ادا کرنے کے لیے کسی کو اپنا وکیل مقرر کرنا حلال نہیں ہے کیونکہ شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنا حج خود ادا کرے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلِلَّهِ عَلَى ٱلنَّاسِ حِجُّ ٱلْبَيْتِ مَنِ ٱسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ﴾ (آل عمران: ۳/ ۹۷)

''اور لوگوں پر اللہ کا حق (یعنی فرض) ہے کہ جو اس گھر تک جانے کی استطاعت رکھے وہ اس کا حج کرے۔''

عبادات میں مقصود یہ ہے کہ انسان انھیں بذات خود ادا کرے تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے عجز و انکسار کا اظہار کر سکے اور جو شخص کسی دوسرے کو وکیل مقرر کرتا ہے تو وہ اس عظیم مقصد کو حاصل نہیں کر سکتا جس کے لیے عبادات کو مقرر کیا گیا ہے۔

جس موکل نے فرض حج و عمرہ ادا کر لیا ہو اور اب وہ حج یا عمرے کے لیے کسی کو اپنا وکیل مقرر کرنا چاہے' تو اس کے بارے میں اہل علم میں اختلاف ہے۔ بعض نے اسے جائز قرار دیا ہے اور بعض نے ناجائز۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ ایسا کرنا ناجائز ہے۔ کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ حج یا عمرے کے لیے کسی کو اپنا وکیل مقرر کرے جبکہ حج و عمرہ نفل ہو کیونکہ عبادات میں اصل یہ ہے کہ انسان انھیں خود ادا کرے جیسے کوئی انسان کسی کو وکیل مقرر نہیں کر سکتا کہ وہ اس کی طرف سے روزہ رکھے' البتہ اگر وہ فوت ہو جائے اور اس کے ذمے فرض روزے ہوں تو ان فرض روزوں کو اس کی طرف سے اس کا ولی رکھے گا۔ اسی طرح حج بھی ایک بدنی عبادت ہے جسے انسان کو بذات خود ادا کرنا ہوتا ہے۔ یہ محض مالی عبادت نہیں ہے کہ اس سے مقصود دوسرے کو نفع پہنچانا ہو۔ اگر کوئی بدنی عبادت ہو جسے آدمی اپنے بدن کے ساتھ سرانجام دیتا ہو تو کسی دوسرے کی طرف سے وہ عبادت کرنا صحیح نہیں اِلاَّ یہ کہ جس کے بارے میں سنت سے ثابت ہو اور حج نفل کے بارے میں سنت سے یہ ثابت نہیں کہ اسے کسی دوسرے انسان کی طرف سے ادا کیا جا سکتا ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت یہی ہے کہ انسان کے لیے یہ صحیح نہیں کہ وہ نفل حج یا عمرے میں کسی اور کو اپنا وکیل مقرر کرے' خواہ وہ خود قادر ہو یا نہ ہو۔ اس قول کو اختیار کرنے کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ دولت مند اور خود حج ادا کر سکنے والے لوگ اپنے حج خود ادا کریں گے۔

کئی لوگ صاحب استطاعت ہونے کے باوجود سالہاسال تک مکہ مکرمہ نہیں جاتے اور وہ ہر سال کسی کو اپنا وکیل بنا کر بھیج دیتے ہیں۔ اس طرح وہ اس عظیم مقصد سے محروم رہتے ہیں جس کی خاطر حج کو مقرر کیا گیا ہے۔

سوال کیا میت کی طرف سے عمرہ کرنا جائز ہے؟

جواب میت کی طرف سے عمرہ کرنا اسی طرح جائز ہے' جس طرح حج کرنا جائز ہے۔ اسی طرح میت کی طرف سے طواف اور دیگر تمام اعمال صالحہ بھی جائز ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہر نیکی جس کا ثواب کسی بھی زندہ یا مردہ مسلمان کو بخش دیا جائے' اسے اس سے فائدہ ہوتا ہے ① لیکن میت کے لیے ایصال ثواب کی نسبت دعا کرنا افضل ہے اور اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے:

«إِذَا مَاتَ الإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلاَّ مِنْ ثَلاَثَةٍ، إِلاَّ مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ»(صحيح مسلم، الوصية، باب ما يلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته، ح: ١٦٣١)

”جب انسان فوت ہو جائے تو تین صورتوں کے سوا اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے: صدقہ جاریہ' علم جس سے نفع اٹھایا جائے اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔“

اس حدیث سے استدلال یہ ہے کہ نبی ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ نیک اولاد جو اس کے لیے عبادت کرے یا اس کے لیے قرآن مجید پڑھے یا نماز پڑھے یا عمرہ کرے یا روزہ رکھے یا اس طرح کے دیگر اعمال بجالائے حالانکہ حدیث سیاق عمل میں ہے یعنی وہ اس عمل کو بیان کر رہی ہے جو موت کے ساتھ منقطع ہو جاتا ہے۔ اگر انسان سے یہ مطلوب ہوتا کہ وہ اپنے باپ اور ماں کے لیے عمل کرے تو نبی ﷺ یہ فرماتے: ”اور نیک اولاد جو اس کے لیے عمل کرے۔“② البتہ اگر انسان نیک عمل کرے اور اس کا ثواب کسی مسلمان کو ہدیہ کر دے' تو یہ جائز ہے۔③

عورت کا محرم کے بغیر حج کرنا

سوال جب عورت کسی محرم کے بغیر حج کرے' تو کیا اس کا حج صحیح ہے؟ کیا باشعور بچہ محرم ہو سکتا ہے؟ محرم کے لیے کیا شرط ہے؟

جواب اس کا حج تو صحیح ہے لیکن محرم کے بغیر اس کا یہ فعل اور سفر حرام ہے اور نبی ﷺ کی نافرمانی ہے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

---

① فاضل مفتی صاحب رحمہ اللہ کا یہ جواب نظر ثانی کا متقاضی ہے' کیونکہ میت کے لیے ایصال ثواب کی صرف وہی صورتیں مشروع ہوں گی جن کا ثبوت احادیث سے ملتا ہے۔ ہر عمل صالح کے ذریعے سے ایصال ثواب صحیح نہیں ہے۔ عمرہ بھی ایسا عمل ہے جس کا اثبات کسی حدیث سے نہیں ہوتا۔ صرف غلام کا آزاد کرنا' صدقہ کرنا' حج کرنا اور دعا کرنا' ایسے اعمال ہیں جن کا فائدہ' حدیث کی رو سے' میت کو ہوتا ہے۔ (ص' ی)

② فاضل مفتی صاحب کا یہ استدلال بالکل صحیح ہے اور اس سے وہی بات ثابت ہوتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ (ص' ی)

③ یہ بات صحیح نہیں اور حدیث مذکور سے استدلال کے بھی خلاف ہے جس کی وضاحت خود فاضل مفتی صاحب نے فرمائی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ آخری رائے' اس رائے کے منافی ہے جو اس سے پہلے عبارت میں ظاہر کی گئی ہے' جس کی رو سے ہر عمل صالح کے ذریعے سے ایصال ثواب نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہی رائے راجح اور صواب ہے۔ والعلم عند اللہ. (ص' ی)

«لَا تُسَافِرِ الْمَرْأَةُ إِلاَّ مَعَ ذِيْ مَحْرَمٍ»(صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب حج النساء، ح:١٨٦٢، وصحيح مسلم، الحج، باب سفر المرأة مع محرم إلى الحج وغيره، ح:١٣٤١)

''عورت کسی محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔''

چھوٹا نابالغ بچہ محرم نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ تو خود سرپرستی اور نگہداشت کے لیے محتاج ہے' لہٰذا ایسا نابالغ بچہ کسی دوسرے کا محافظ اور ولی کیسے ہو سکتا ہے۔ محرم کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان' مرد' بالغ اور عاقل ہو۔ جس میں یہ شرائط نہ ہوں' وہ محرم نہیں ہو سکتا۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ بعض عورتیں محرم کے بغیر ہوائی جہاز کے ذریعے سے سفر میں بہت سستی کا مظاہرہ کرتی ہیں اور وہ اس کا سبب یہ بیان کرتی ہیں کہ ان کے محرم نے انھیں ائیر پورٹ سے رخصت کیا ہے اور دوسرا محرم ائیر پورٹ سے انھیں لے لے گا اور ہوائی جہاز میں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔

امر واقع یہ ہے کہ یہ دلیل مجروح ہے کیونکہ رخصت کرنے والا محرم ہوائی جہاز کے اندر داخل ہو کر رخصت نہیں کرتا بلکہ وہ تو اسے لاؤنج ہی سے رخصت کر دیتا ہے۔ طیارے کی پرواز میں بسا اوقات تاخیر ہو جاتی ہے اور اس طرح اس عورت کے گم ہونے کا خطرہ ہو سکتا ہے یا بسا اوقات کسی سبب سے طیارہ اگلے ائیر پورٹ پر اتر ہی نہیں سکتا اور اسے کسی دوسرے ائیر پورٹ پر اترنا پڑتا ہے اور اس میں بھی عورت کے گم ہونے کا اندیشہ ہے۔

کئی دفعہ یہ ہوتا ہے کہ طیارہ اپنے ائیر پورٹ پر اترتا ہے لیکن استقبال کے لیے آنے والا محرم بیماری' نیند یا گاڑی کے ایکسیڈنٹ یا اس طرح کے کسی اور سبب کی وجہ سے پہنچ نہیں سکتا اور اگر ان رکاوٹوں میں سے کوئی رکاوٹ بھی نہ ہو' ہوائی جہاز بھی بروقت پہنچ جائے اور استقبال کے لیے آنے والا محرم بھی آ جائے تو ہو سکتا ہے کہ طیارے کے اندر اس عورت کے ساتھ بیٹھنے والا شخص ایسا ہو' جو اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرتا ہو' بندگان الٰہی پر رحم نہ کرتا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسے فریب میں مبتلا کر دے اور یہ اس شخص پر فریفتہ ہو جائے اور اس کے نتیجہ میں وہ فتنہ اور خرابی رونما ہو جائے جو اس طرح کے واقعات میں رونما ہوا کرتی ہے۔

عورت کے لیے واجب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے' محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔ عورتوں کے وارثوں کو بھی چاہیے جنھیں اللہ تعالیٰ نے ان کے نگہبان بنایا ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ سے ڈریں اور اپنی محرمات کے بارے میں کوتاہی کریں نہ بے عزتی اور بے دینی کا مظاہرہ کریں۔ انسان سے اس کے گھر والوں کے متعلق پوچھا جائے گا کیونکہ انھیں اللہ تعالیٰ نے اس کے پاس امانت کے طور پر رکھا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ قُوٓاْ أَنفُسَكُمۡ وَأَهۡلِيكُمۡ نَارٗا وَقُودُهَا ٱلنَّاسُ وَٱلۡحِجَارَةُ عَلَيۡهَا مَلَٰٓئِكَةٌ غِلَاظٞ شِدَادٞ لَّا يَعۡصُونَ ٱللَّهَ مَآ أَمَرَهُمۡ وَيَفۡعَلُونَ مَا يُؤۡمَرُونَ ۝٦﴾ (التحريم: ٦٦/٦)

''اے مومنو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آتش (جہنم) سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں اور جس پر تند خو اور سخت مزاج فرشتے (مقرر) ہیں' اللہ جو حکم ان کو فرماتا ہے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم ان کو ملتا ہے اسے بجا لاتے ہیں۔''

سوال ایک عورت نے یہ سوال پوچھا ہے کہ میری نیت ہے کہ میں رمضان میں عمرہ ادا کروں لیکن میرے ساتھ میری بہن' اس کا

شوہر اور میری والدہ ہوں گے، تو کیا میرے لیے ان کے ساتھ عمرے کے لیے جانا جائز ہے؟

جواب تمہارے لیے ان کے ساتھ عمرے کے لیے جانا جائز نہیں ہے کیونکہ تمھاری بہن کا شوہر تمھارا محرم نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا:

«لاَ يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلاَّ وَمَعَهَا ذُوْ مَحْرَمٍ، وَلاَ تُسَافِرِ الْمَرْأَةُ إِلاَّ مَعَ ذِيْ مَحْرَمٍ»

(صحيح مسلم، الحج، باب سفر المرأة مع محرم إلى الحج وغيره، ح:١٣٤١)

”کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ اس کے محرم کے بغیر خلوت اختیار نہ کرے اور نہ کوئی عورت محرم کے بغیر سفر کرے۔“

یہ سن کر ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہ! میری بیوی حج کے لیے چلی ہے اور میرا نام فلاں فلاں غزوے کے لیے لکھا جا چکا ہے، تو نبی ﷺ نے فرمایا:

«اِنْطَلِقْ فَحُجَّ مَعَ امْرَأَتِكَ» (صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب حج النساء، ح:١٨٦٢، وصحيح مسلم، الحج، باب سفر المرأة مع ذي محرم إلى الحج وغيره، ح:١٣٤١)

”جاؤ جا کر اپنی بیوی کے ساتھ حج کرو۔“

نبی ﷺ نے اس موقع پر یہ وضاحت طلب نہیں فرمائی کہ اس عورت کے ساتھ خواتین ہیں؟ کیا یہ عورت جوان ہے یا بوڑھی؟ کیا رستے میں امن ہے یا نہیں؟ یہ عورت اگر اس وجہ سے عمرہ ادا نہ کر سکے کہ اس کے لیے کوئی محرم نہ تھا، تو اسے کوئی گناہ نہیں ہوگا، خواہ اس نے پہلے کبھی عمرہ نہ بھی کیا ہو کیونکہ حج و عمرے کے وجوب کے لیے یہ شرط ہے کہ عورت کے ساتھ اس کا کوئی محرم بھی ہو۔

زمانے کے اعتبار سے حج کے اوقات

سوال زمانے کے اعتبار سے حج کے اوقات کیا ہیں؟

جواب زمانے کے اعتبار سے حج کے اوقات کا آغاز ماہ شوال کی ابتدا سے اور اختتام دس ذوالحجہ یعنی یوم عید یا ذوالحجہ کے آخری دن کو ہوتا ہے اور راجح قول یہی (آخری) ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ٱلْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَٰتٌ﴾ (البقرة:٢/ ١٩٧)

”حج کے مہینے (معین ہیں جو) معلوم ہیں۔“

”أشهر“ (مہینے) جمع کا صیغہ ہے اور جمع میں اصل یہ ہے کہ اس سے اس کی حقیقت مراد لی جائے۔ اس لحاظ سے اس کے معنی یہ ہوئے کہ حج ان تین مہینوں کے اندر ہی ادا کیا جا سکتا ہے اور یہ کسی ایک دن نہیں ہوتا۔ حج کے ایام معین اور معلوم ہیں اور اس قول کی بنیاد پر کہ ذوالحجہ کا سارا مہینہ ہی حج کا مہینہ ہے، طواف افاضہ اور حج کی سعی کو ذوالحجہ کے آخری دن تک مؤخر کیا جا سکتا ہے اور کسی شرعی عذر کے بغیر اس کے بعد تک مؤخر کرنا جائز نہیں ہے، مثلاً یہ کہ طواف افاضہ سے قبل اگر عورت کے مخصوص ایام شروع ہو جائیں اور یہ دن باقی رہیں اور ذوالحجہ کا مہینہ ختم ہو جائے، تو اس صورت میں طواف افاضہ کو مؤخر کرنے کے لیے وہ معذور ہے۔ یہی حج کے زمانی اوقات ہیں۔

عمرے کے لیے کوئی زمانی اوقات مقرر نہیں ہیں، یہ سال کے کسی دن بھی ادا کیا جا سکتا ہے، البتہ رمضان میں عمرے کا ثواب حج کے برابر ہے۔ نبی ﷺ نے سارے عمرے حج کے مہینوں میں ادا فرمائے تھے۔ عمرۂ حدیبیہ ذوالقعدہ میں تھا، عمرۃ القضا بھی ذوالقعدہ میں، عمرۂ جعرانہ بھی ذوالقعدہ میں اور عمرۃ الحج بھی حج کے ساتھ ماہ ذوالقعدہ ہی میں تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ ادا کرنے کی خاص فضیلت ہے کیونکہ نبی ﷺ نے عمرہ ادا کرنے کے لیے انہی مہینوں کا انتخاب فرمایا تھا۔

اوقات حج سے پہلے احرام باندھنے کے بارے میں حکم

سوال ان زمانی اوقات کے شروع ہونے سے پہلے حج کا احرام باندھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب علماء کا حج کے مہینے شروع ہونے سے پہلے حج کا احرام باندھنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ حج کے مہینے شروع ہونے سے پہلے حج کا احرام باندھنا صحیح نہیں ہے۔ اگر احرام باندھا گیا، تو یہ عمرے کا احرام ہو جائے گا کیونکہ عمرہ جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«دَخَلَتْ فِي الْحَجِّ»(صحيح مسلم، الحج، باب جواز العمرة في أشهر الحج، ح:١٢٤١)

’’حج میں داخل ہو گیا ہے۔‘‘

اور نبی ﷺ نے عمرے کا نام حج اصغر رکھا ہے جیسا کہ حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کی مرسل اور مشہور روایت میں ہے ① جسے لوگوں نے قبولیت سے نوازا ہے۔

جگہ کے اعتبار سے مواقیت حج

سوال جگہ کے اعتبار سے حج کے مواقیت کون سے ہیں؟

جواب جگہ کے اعتبار سے مواقیت حج پانچ ہیں: ذُو الْحُلَيْفه، جُحفه، يلملم، قرن المنازل اور ذات عِرق۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

١- **ذُو الْحُلَيْفه:** وہ جگہ ہے جسے آج کل ابیار علی کہا جاتا ہے۔ یہ مدینہ کے قریب ہے اور مکہ سے قریباً دس مراحل دور ہے۔ یہ مکہ سے سب سے دور والا میقات ہے۔ یہ میقات اہل مدینہ اور اس کے راستے سے گزرنے والے دوسرے لوگوں کے لیے ہے۔

٢- **جُحفه:** یہ شام سے مکہ کے راستے پر واقع ایک قدیم گاؤں ہے، اس کے اور مکہ کے مابین قریبا تین مراحل کا فاصلہ ہے۔ یہ گاؤں اب بے آباد ہو چکا ہے، اس لیے لوگ اس کے بجائے اب رابغ سے احرام باندھتے ہیں۔

٣- **يلملم:** یمن سے مکہ کے راستے پر ایک پہاڑ یا جگہ کا نام ہے۔ آج کل اسے سعدیہ کہا جاتا ہے، اس کے اور مکہ کے درمیان قریباً دو مرحلوں کا فاصلہ ہے۔

٤- **قرن المنازل:** نجد سے مکہ کے راستے پر ایک پہاڑ کا نام ہے، اسے آج کل ’’السیل الکبیر‘‘ کہا جاتا ہے۔ اس کے اور مکہ کے

---

① سنن الدارقطنی: 285/2

درمیان قریباً دو مرحلوں کا فاصلہ ہے۔

۵- ذات عِرق: عراق سے مکہ کے راستے پر ایک جگہ کا نام ہے، اس کے اور مکہ کے درمیان بھی قریباً دو مرحلوں کی مسافت ہے۔

ان میں سے پہلے چار یعنی ذو الحلیفہ، جحفہ، یلملم اور قرن المنازل کا تعین تو نبی ﷺ نے فرمایا تھا، جیسا کہ اہل سنن نے اسے بروایت حضرت عائشہ ؓ بیان کیا ہے، ذات عرق کو حضرت عمر ؓ نے اہل کوفہ و بصرہ کے لیے اس وقت میقات قرار دیا جب انھوں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ عرض کیا: ''امیر المؤمنین! نبی ﷺ نے اہل نجد کے لیے قرن کو میقات مقرر فرمایا ہے اور یہ ہمارے راستے سے بہت دور ہے۔'' تو حضرت عمر ؓ نے فرمایا: ''تم یہ دیکھو کہ اس کے بالمقابل تمھارے راستے میں کون سا مقام ہے۔''

بہرحال اگر اس کا تعین بھی نبی ﷺ سے ثابت ہو تو معاملہ بالکل واضح ہے۔ اور اگر آپ سے یہ ثابت نہ ہو تو پھر یہ حضرت عمر بن خطاب ؓ کی سنت سے تو ثابت ہے ہی اور آپ ان خلفائے راشدین مہدیین سے ہیں، جن کے اتباع کا ہمیں حکم دیا گیا ہے اور جن کی رائے کے مطابق اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہ حکم نازل فرمایا تھا۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس کا تعین بھی نبی ﷺ ہی نے فرمایا تھا، تو پھر بھی حضرت عمر ؓ کی یہ رائے فرمان نبوی کے مطابق ہے اور قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے۔ انسان جب کسی میقات کے پاس سے گزرے، تو وہاں سے احرام باندھنا لازم ہے اور جب اس کے بالمقابل کسی دوسری جگہ سے گزر رہا ہو تو وہ ایسے ہے جیسے اسی مقام کے پاس سے گزر رہا ہو۔ حضرت عمر ؓ کے اس اثر کا ہمارے آج کے دور میں بہت فائدہ ہے کیونکہ اگر کوئی انسان حج یا عمرے کے ارادہ سے بذریعہ ہوائی جہاز مکہ مکرمہ میں آ رہا ہو تو اس کے لیے لازم ہے کہ جب میقات کے اوپر سے گزرے تو وہاں سے احرام باندھ لے، اس کے لیے یہ حلال نہیں کہ احرام کو جدہ پہنچنے تک مؤخر کرے جیسا کہ بہت سے لوگ کرتے ہیں کیونکہ اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں کہ آپ میقات کے بالمقابل خشکی میں ہوں یا ہوا میں یا سمندر میں۔ یہی وجہ ہے کہ بحری جہازوں سے آنے والے لوگ جب یلملم یا رابغ کے بالمقابل آتے ہیں، تو وہ احرام باندھ لیتے ہیں۔

بغیر احرام کے میقات سے گزرنے والے کے متعلق حکم

سوال جو شخص احرام کے بغیر میقات سے گزرے، اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب احرام کے بغیر میقات سے گزرنے والے کی دو حالتیں ہو سکتی ہیں: ① اگر اس کا حج یا عمرہ کا ارادہ ہے، تو اس کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ واپس میقات پر جائے اور وہاں سے حج یا عمرے کا احرام باندھ کر آئے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا، تو واجبات حج میں سے ایک واجب کو ترک کرے گا، لہٰذا اہل علم کے نزدیک اس صورت میں اس پر ایک جانور کا فدیہ لازم ہے جسے وہ مکہ میں ذبح کر کے وہاں کے فقرا میں تقسیم کرے گا۔ ② اور اگر اس کا ارادہ حج یا عمرے کا نہیں ہے، تو اس پر کوئی فدیہ وغیرہ لازم نہیں ہے، خواہ مکہ سے غیر حاضر رہنے کی اس کی مدت طویل ہو یا قلیل کیونکہ اگر ہم اس صورت میں بھی اس کے لیے میقات سے گزرنے پر احرام کو لازم قرار دیں، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے اس پر عمر میں ایک سے زیادہ دفعہ حج یا عمرے کو واجب قرار دے دیا، حالانکہ ایک بار

سے زیادہ حج یا عمرہ واجب نہیں بلکہ نفل ہے۔ احرام کے بغیر میقات سے گزرنے والے کے بارے میں اہل علم کے مختلف اقوال میں سے یہی قول راجح ہے کہ اگر اس کا حج یا عمرے کا ارادہ نہیں ہے' تو اس پر کوئی فدیہ لازم نہیں کیونکہ اس کے لیے میقات سے احرام باندھنا لازم نہیں تھا۔

حج یا عمرے کا تلبیہ کہتے وقت نیت کے الفاظ زبان سے کہنا غلط ہے

سوال کیا حج یا عمرہ شروع کرتے وقت تلبیہ میں نیت کے الفاظ زبان سے ادا کرنا ضروری ہے؟

جواب تنبیہ یہ ہے کہ اگر آپ کی نیت عمرہ کی ہے تو "لَبَّيْكَ عُمْرَةً" کہیں اور اگر حج کی نیت ہے تو "لَبَّيْكَ حَجًّا" کہیں۔ نیت کے الفاظ زبان سے ادا کرنا جائز نہیں ہیں مثلاً یہ نہیں کہنا چاہیے: ''اے اللہ میں عمرے کا ارادہ کرتا ہوں'' یا یہ کہے: ''میں حج کا ارادہ کرتا ہوں'' کیونکہ یہ نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔

حج و عمرہ کرنے والا بغیر احرام کے میقات سے نہ گزرے

سوال جس شخص کا عمرے کا ارادہ ہو اور وہ احرام کے بغیر میقات سے گزر جائے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جس شخص کا حج یا عمرے کا ارادہ ہو تو اس کے لیے واجب ہے کہ وہ احرام کے بغیر میقات سے نہ گزرے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«يُهِلُّ أَهْلُ الْمَدِينَةِ مِنْ ذِي الْحُلَيْفَةِ...»(صحيح البخاري، الحج، باب ميقات أهل المدينة، ح: ١٥٢٥)

''اہل مدینہ ذوالحلیفہ سے احرام باندھیں۔''

لہٰذا حج و عمرہ کا ارادہ کرنے والے کے لیے واجب ہے کہ وہ میقات سے احرام باندھے اور احرام کے بغیر میقات سے نہ گزرے۔ اگر کوئی شخص احرام کے بغیر میقات سے گزر گیا تو اسے واپس آ کر میقات سے احرام باندھ لینا چاہیے۔ اس صورت میں اس پر فدیہ لازم نہیں ہوگا۔ اگر اس نے اپنی جگہ ہی سے احرام باندھا اور میقات کے پاس واپس نہ آیا تو اہل علم کے نزدیک اس پر فدیہ واجب ہے اور وہ یہ کہ ایک جانور ذبح کر کے مکہ کے فقرا میں تقسیم کر دے۔

سوال ہوائی جہاز سے مکہ آنے والے کو کس طرح احرام باندھنا چاہیے؟

جواب ہوائی جہاز کے ذریعے سے مکہ آنے والے کے لیے واجب ہے کہ وہ جب میقات کے بالمقابل آئے' تو احرام باندھ لے۔ اس کی تیاری پہلے سے شروع کر لے' گھر میں غسل کرے' میقات تک پہنچنے سے پہلے احرام باندھ لے اور جب میقات پر پہنچے تو حج یا عمرہ کے شروع کرنے کی نیت کر لے اور میقات سے مؤخر نہ ہو کیونکہ ہوائی جہاز جلدی سے گزر جاتا ہے۔ وہ تو ایک منٹ میں بہت سی مسافت طے کر لیتا ہے لیکن اس بات سے بہت سے لوگ غافل رہتے ہیں اور وہ پہلے سے تیاری نہیں کرتے۔ ہوائی جہاز کا عملہ جب اعلان کرتا ہے کہ وہ میقات پر پہنچنے لگے ہیں' تو وہ یہ اعلان سن کر کپڑے اتارنے اور احرام پہننا شروع کرتے ہیں' حالانکہ یہ بہت بڑی کوتاہی

ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ہوائی جہاز کا عملہ میقات پہنچنے سے پندرہ منٹ پہلے لوگوں کو مطلع کرنا شروع کر دیتا ہے اور یہ بات قابل ستائش ہے کیونکہ اس طرح لوگوں کو کپڑے تبدیل کرنے اور تیاری کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ احرام کا ارادہ کرنے والے کیلئے واجب ہے کہ وہ وقت کے بارے میں خبردار رہے اور جونہی ہوائی جہاز کا عملہ اعلان کرے کہ ہم پندرہ منٹ بعد میقات پہنچ جائیں گے تو اسے اپنی گھڑی کو دیکھتے رہنا چاہیے اور پندرہ منٹ بعد یا اس سے بھی دو یا تین منٹ پہلے اپنے حج یا عمرہ کے ارادے کے مطابق لبیک کہنا چاہیے۔

ہوائی جہاز میں نماز پڑھنے اور احرام باندھنے کا طریقہ

سوال انسان ہوائی جہاز میں نماز کس طرح پڑھے اور احرام کس طرح باندھے؟

جواب ہوائی جہاز میں نماز پڑھنے کی درج ذیل صورتیں ہیں: ❁ انسان ہوائی جہاز میں نفل نماز اپنی سیٹ پر بیٹھ کر پڑھ لے، خواہ ہوائی جہاز کا رخ کسی بھی طرف ہو۔ رکوع وسجدہ اشارے کے ساتھ کرے اور سجدے میں رکوع کی نسبت زیادہ جھکے۔

❁ فرض نماز ہوائی جہاز میں نہ پڑھے اِلَّا یہ کہ ساری نماز قبلہ رخ ہو کر ادا کرنا ممکن ہو اور رکوع، سجود، قیام اور قعود ممکن ہو۔

❁ اگر یہ ممکن نہ ہو تو نماز مؤخر کر دے اور ہوائی جہاز کے اترنے کے بعد زمین پر نماز ادا کرے اور اگر ہوائی جہاز کے اترنے سے پہلے نماز کے وقت کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اسے دوسری نماز کے ساتھ جمع کر کے ادا کرے، مثلاً ظہر کی نماز کا وقت ختم ہونے کا اندیشہ ہو تو وقت ختم ہونے سے پہلے دونوں نمازیں ہوائی جہاز میں پڑھ لے اور نماز کی شرائط، ارکان اور واجبات جس قدر ادا کر سکتا ہو ادا کرے، مثلاً اگر ہوائی جہاز غروب آفتاب سے تھوڑی دیر پہلے پرواز شروع کرے اور فضا ہی میں ہو اور سورج غروب ہو جائے تو وہ نماز مغرب ادا نہ کرے حتی کہ ہوائی جہاز ائیر پورٹ پر اتر جائے تو یہ زمین پر اتر کر نماز پڑھے اور اگر مغرب کا وقت ختم ہونے کا اندیشہ ہو تو جہاز سے اترنے کے بعد مغرب کی نماز عشا کے ساتھ جمع کر کے پڑھ لے اور اگر عشا کی نماز کا وقت ختم ہونے کا بھی اندیشہ ہو تو دونوں وقت ختم ہونے سے پہلے پہلے ہوائی جہاز میں ادا کر لے۔ (یاد رہے کہ) عشا کی نماز کا وقت آدھی رات تک ہے۔

❁ ہوائی جہاز میں فرض نماز پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ قبلہ رخ کھڑا ہو جائے، اللہ اکبر کہے، سورۂ فاتحہ، اس سے پہلے مسنون دعائے استفتاح اور بعد میں قرآن مجید کا جو حصہ چاہے پڑھے۔ رکوع کرے، پھر رکوع سے سر اٹھائے تو اطمینان کے ساتھ کھڑا ہو جائے، پھر سجدہ کرے۔ سجدے سے سر اٹھائے تو اطمینان کے ساتھ بیٹھ جائے۔ پھر دوسرا سجدہ کرے اور اسی طرح باقی نماز ادا کرے۔ اگر سجدہ کرنا ممکن نہ ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھے ہوئے اشارے کے ساتھ سجدہ کرے اور اگر اسے قبلہ کے رخ کا علم نہ ہو اور نہ کوئی قابل اعتماد آدمی بتائے، تو کوشش کر کے قبلے کا رخ معلوم کرے اور اس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کر لے۔

❁ ہوائی جہاز میں مسافر کی نماز قصر ہو گی یعنی چار رکعات والی نماز کی صرف دو رکعتیں پڑھے گا جیسا کہ دیگر مسافر نماز قصر کر کے ادا کرتے ہیں۔

جہاں تک احرام باندھنے کا تعلق ہے تو اس کی درج ذیل چار صورتیں ہیں:

① گھر میں غسل کر کے اپنے معمول کے کپڑے پہنے رکھے اور اگر چاہے تو وہ گھر ہی سے احرام بھی پہن سکتا ہے۔

② اگر گھر میں احرام نہ باندھا ہو تو ہوائی جہاز میں اس وقت باندھ لے جب وہ میقات کے بالمقابل آئے۔

③ جب ہوائی جہاز میقات کے بالمقابل پہنچے تو حج وعمرہ کو شروع کرنے کی نیت کرے اور نیت کے مطابق لبیک کہے۔

④ اگر کوئی شخص غفلت یا نسیان کے اندیشے کے باعث ازراہ احتیاط میقات پر آنے سے پہلے احرام باندھ لے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔

اگر کوئی میقات سے گزر کر عمرے کا ارادہ کرے تو احرام کہاں سے باندھے؟

سوال جو شخص اپنے ملک سے جدہ تک سفر کرے اور پھر جدہ میں پہنچنے کے بعد عمرے کا ارادہ کر لے تو کیا وہ جدہ ہی سے احرام باندھ لے؟

جواب اس کی حسب ذیل دو صورتیں ہو سکتی ہیں: ① انسان نے عمرے کی نیت کے بغیر جدہ تک سفر کیا ہو اور جدہ میں اس کا عمرے کا پروگرام بن گیا ہو تو وہ جدہ ہی سے عمرے کا احرام باندھ لے اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مواقیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

«وَمَنْ كَانَ دُوْنَ ذٰلِكَ فَمِنْ حَيْثُ أَنْشَأَ، حَتّٰى أَهْلُ مَكَّةَ مِنْ مَكَّةَ»(صحيح البخاري، الحج، باب مهل أهل مكة للحج والعمرة، ح:١٥٢٤)

”اور جو مواقیت کے اندر ہو تو وہ جہاں سے شروع ہو وہاں سے احرام باندھ لے حتی کہ اہل مکہ، مکہ ہی سے احرام باندھ لیں۔“

② اس نے اپنے شہر سے عمرے کی نیت اور عزم وارادے کے ساتھ سفر شروع کیا ہو تو اس حالت میں اس پر واجب ہے کہ وہ اپنے راستے کے میقات سے احرام باندھے۔ اس کے لیے جدہ سے احرام باندھنا جائز نہیں کیونکہ جدہ میقات کے اندر ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مواقیت کو مقرر کر کے فرمایا:

«هُنَّ لَهُنَّ وَلِمَنْ أَتٰى عَلَيْهِنَّ مِنْ غَيْرِ أَهْلِهِنَّ مِمَّنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ»(صحيح البخاري، الحج، باب مهل من كان دون المواقيت، ح:١٥٢٩)

”یہ مواقیت ان علاقوں کے لیے اور دوسرے علاقوں کے ہر اس شخص کے لیے ہیں جو ان کے پاس سے گزرے اور اس کا حج وعمرہ کا ارادہ ہو۔“

لہٰذا اس حالت میں اگر وہ جدہ سے احرام باندھ کر مکہ میں آ جائے، تو اہل علم کے نزدیک اس پر فدیہ لازم ہے اور وہ یہ کہ وہ مکہ میں ایک جانور ذبح کر کے اسے وہاں کے فقرا پر صدقہ کر دے۔ اس کا عمرہ صحیح ہوگا اور اگر جدہ میں پہنچنے کے بعد اس نے ابھی تک احرام نہ باندھا ہو اور جدہ میں پہنچنے سے پہلے ہی اس کی نیت عمرے کی ہو تو اس صورت میں اسے واپس جا کر میقات سے احرام باندھنا ہوگا اور اس پر کوئی فدیہ وغیرہ لازم نہ ہوگا۔

کیا محرم غسل کر سکتا ہے؟

سوال احرام باندھنے کے بعد محرم کے غسل کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب مُحرم کے غسل کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ نبی ﷺ سے ثابت ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں خواہ ایک بار غسل کرے یا دو بار البتہ' احتلام ہو جانے پر غسل جنابت واجب ہو گا جبکہ احرام کے لیے غسل کرنا سنت ہے۔

میت کی طرف سے حج بدل کیا جا سکتا ہے

سوال انسان کیلئے اپنے فوت شدہ دادا کی طرف سے حج کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے جب کہ یہ شخص اپنا فریضۂ حج ادا کر چکا ہو؟

جواب انسان کیلئے اپنے اس فوت شدہ دادا کی طرف سے حج کرنے میں کوئی حرج نہیں جس نے حج نہ کیا ہو کیونکہ حج بدل نبی اکرم ﷺ کی سنت سے ثابت ہے۔

احرام کی کوئی مخصوص نماز نہیں

سوال کیا احرام کی کوئی مخصوص نماز ہے؟

جواب احرام کی کوئی مخصوص نماز نہیں لیکن انسان جب میقات پر پہنچے اور کسی فرض نماز کا وقت قریب ہو تو اس کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ احرام کو مؤخر کر دے اور فرض نماز ادا کرنے کے بعد احرام باندھے۔ اگر وہ میقات کے پاس ایسے وقت میں پہنچے جو فرض نماز کا نہ ہو تو وہ غسل جنابت کی طرح غسل کرے' خوشبو لگائے اور احرام کے کپڑے پہن لے۔ اگر وہ چاشت کا وقت ہو تو نماز چاشت پڑھ لے۔ اگر چاشت کا وقت نہ ہو تو تحیۃ الوضو پڑھ لے اور اس کے بعد احرام باندھے تو یہ بہت مستحسن ہے لیکن احرام کی کوئی خاص نماز نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔

حج تمتع کا بیان

سوال جس شخص نے حج کے مہینوں میں عمرہ ادا کیا' پھر اس نے مدینہ کی طرف سفر کیا اور ابیار علی سے حج کا احرام باندھ لیا' تو کیا اس کا حج تمتع ہو گا؟

جواب اگر اس شخص نے حج کے مہینوں میں عمرہ ادا کرتے ہوئے اسی سال حج کرنے کا ارادہ کیا ہو تو پھر اس کا حج تمتع ہو گا کیونکہ عمرہ اور حج کے درمیان سفر سے اس کا تمتع باطل نہیں ہو گا اِلَّا یہ کہ عمرہ ادا کرنے کے بعد وہ اپنے شہر میں واپس چلا جائے اور پھر اپنے شہر سے حج کے لیے دوبارہ سفر شروع کرے تو اس صورت میں اس کا تمتع منقطع ہو جائے گا کیونکہ عمرہ و حج میں سے ہر ایک کے لیے اس نے الگ الگ سفر کیا ہے۔ یہ شخص جو عمرہ ادا کرنے کے بعد مدینہ چلا گیا اور پھر اس نے وہاں سے واپسی پر ابیار علی سے حج کا احرام باندھا' اس کے لیے تمتع کی قربانی لازم ہو گی کیونکہ حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ کے عموم کا یہی تقاضا ہے:

﴿ فَمَن تَمَتَّعَ بِٱلْعُمْرَةِ إِلَى ٱلْحَجِّ فَمَا ٱسْتَيْسَرَ مِنَ ٱلْهَدْيِ ﴾ (البقرۃ: ۲/ ۱۹۶)

''تو جو تم میں حج کے وقت تک عمرے سے فائدہ اٹھانا چاہے' وہ جیسی قربانی میسر ہو کرے۔''

سوال جو شخص شوال میں عمرے کا احرام باندھے اور عمرہ مکمل کر لے اور اس کا حج کرنے کا ارادہ نہ ہو' پھر وہ حج کا پروگرام بنا لے تو کیا اس کا حج تمتع ہو گا؟

جواب اس کا حج تمتع نہیں ہوگا اور نہ اس پر قربانی واجب ہوگی۔

تلبیہ کے مسنون الفاظ

سوال نبی ﷺ سے تلبیہ کے کون سے صحیح الفاظ ثابت ہیں؟ عمرہ و حج میں تلبیہ کب ختم کرنا چاہیے؟

جواب نبی ﷺ سے ثابت شدہ تلبیہ کے صحیح الفاظ یہ ہیں:

«لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ ، لَبَّيْكَ لاَ شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَالنُّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ، لاَ شَرِيْكَ لَكَ»(صحيح البخاري، الحج، باب التلبية، ح:١٥٤٩، وصحيح مسلم، الحج، باب التلبية وصفتها، ح:١١٨٤)

"میں حاضر ہوں۔ اے اللہ! میں حاضر ہوں۔ میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں۔ بے شک ساری تعریفیں اور نعمتیں تیری ہیں اور سارا ملک بھی تیرا ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔"

امام نسائی رحمہ اللہ نے یہ الفاظ زیادہ بیان فرمائے ہیں:

«لَبَّيْكَ إِلٰهَ الْحَقِّ»(سنن النسائي، المناسك، باب كيف التلبية، ح:٢٧٥٣)

"اے معبود حقیقی! میں حاضر ہوں۔"

اس روایت کی سند حسن ہے۔ عمرہ کرنے والا اس وقت تلبیہ بند کردے جب وہ طواف شروع کرے اور حج کرنے والا اس وقت تلبیہ بند کرے جب وہ عید کے دن جمرۂ عقبہ کو کنکریاں مارے کیونکہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس مرفوع حدیث کو روایت کیا ہے:

«أَنَّهُ كَانَ يُمْسِكُ عَنِ التَّلْبِيَةِ فِي الْعُمْرَةِ إِذَا اسْتَلَمَ الْحَجَرَ»(سنن أبي داود، المناسك، باب متى يقطع المعتمر التلبية، ح:١٨١٧، وجامع الترمذي، الحج، باب ماجاء متى تقطع التلبية في العمرة، ح:٩١٩)

"آپ ﷺ عمرے میں تلبیہ سے اس وقت رک جاتے تھے جب حجر اسود کو بوسہ دیتے۔"

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے لیکن اس کی سند میں ایک راوی محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ ہے جسے اکثر محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ عرفہ سے مزدلفہ تک حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے پیچھے آپ کی سواری پر سوار تھے اور پھر مزدلفہ سے منیٰ تک آپ نے حضرت فضل رضی اللہ عنہ کو اپنے پیچھے سوار کرلیا، ان دونوں نے روایت کیا ہے:

«لَمْ يَزَلِ النَّبِيُّ ﷺ يُلَبِّي حَتَّى رَمَى جَمْرَةَ الْعَقَبَةِ»(صحيح البخاري، الحج، باب الركوب والارتداف في الحج، ح:١٥٤٣)

"نبی ﷺ جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارنے تک تلبیہ کہتے رہے۔"

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک عمرہ میں تلبیہ حرم میں پہنچنے کے بعد بند کردینا چاہیے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بیت اللہ کے پاس پہنچ

کر یا بیت اللہ کو دیکھ کر تلبیہ بند کرنا چاہیے۔ لبیک کے معنی اطاعت بجالانا اور دعوت قبول کرنا ہیں یہ لفظ اگرچہ تثنیہ کا ہے لیکن کثرت کے معنی میں ہے۔

محرم کا اپنے بالوں میں کنگھی کرنا صحیح نہیں

سوال کیا محرم کے لیے اپنے بالوں میں کنگھی کرنا جائز ہے؟

جواب محرم کو اپنے بالوں میں کنگھی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس کو پراگندہ بال اور غبار آلود ہونا چاہیے۔ غسل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کنگھی کرنے میں بالوں کے گرنے کا اندیشہ ہے اور اگر قصد وارادے کے بغیر خارش وغیرہ کرنے کی وجہ سے بال گر جائیں تو کوئی حرج نہیں کیونکہ اس نے قصد وارادے سے بالوں کو نہیں گرایا۔ اسی طرح وہ تمام دیگر امور جو احرام میں ممنوع ہیں، اگر انسان ان کا جان بوجھ کر ارتکاب نہ کرے بلکہ غلطی یا نسیان کی وجہ سے ان کا ارتکاب ہو جائے، تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ أَخْطَأْتُم بِهِۦ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝٥ ﴾ (الأحزاب: ۳۳/ ۵)

''اور جو بات تم سے غلطی سے ہوگئی ہو اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں لیکن جو تم دل کے ارادے سے کرو (اس پر مؤاخذہ ہے) اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

اور فرمایا:

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ إِن نَّسِينَآ أَوْ أَخْطَأْنَا ۚ ﴾ (البقرۃ: ۲/ ۲۸۶)

''اے ہمارے پروردگار! اگر ہم سے بھول یا چوک ہوگئی ہو تو ہم سے مؤاخذہ نہ کیجیے۔''

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''میں نے ایسا ہی کیا۔'' شکار جو ممنوعات احرام میں سے ہے، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَقْتُلُوا۟ ٱلصَّيْدَ وَأَنتُمْ حُرُمٌ ۚ وَمَن قَتَلَهُۥ مِنكُم مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ ٱلنَّعَمِ يَحْكُمُ بِهِۦ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ ﴾ (المائدۃ: ۵/ ۹۵)

''اے مومنو! جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار نہ مارنا اور جو تم میں سے جان بوجھ کر اسے مارے تو (یا تو) اس کا بدلہ دے اور وہ یہ ہے کہ اسی طرح کا چوپایہ جسے تم میں سے دو معتبر شخص مقرر کر دیں (قربانی کرے۔'')

اس آیت کریمہ میں ﴿مُتَعَمِّدًا﴾ ''جان بوجھ کر'' کی قید اس بات کا فائدہ دیتی ہے کہ جو شخص قصد وارادے کے بغیر کسی شکار کو مارے، تو اس کے ذمے کوئی بدلہ نہیں ہے۔ یہ قید احترازی ہے کیونکہ یہ حکم کے لیے مناسب ہے اور جو جان بوجھ کر شکار کو مارے تو اس کے لیے مناسب یہ ہے کہ اس پر بدلہ واجب ہو اور جو جان بوجھ کر شکار نہ مارے، اس کے لیے مناسب یہ ہے کہ اس پر بدلہ واجب نہ ہو کیونکہ دین اسلام سہولت اور آسانی کا دین ہے، لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی استثنا کے بغیر وہ تمام امور جو محرم کے لیے ممنوع

ہیں اگر جہالت یا نسیان کی وجہ سے ان کا ارتکاب کیا جائے تو اس سے فدیہ واجب ہوتا ہے نہ عمرہ یا حج فاسد ہوتا ہے، جس طرح کہ جماع وغیرہ سے فاسد ہو جاتا ہے، مذکورہ بالا ادلہ شرعیہ کا یہی تقاضا ہے جن کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

جہالت کی بنا پر بال کٹوا کر حلال ہونے والے کا حکم

سوال ایک حاجی نے ازراہ جہالت اپنے سر کے کچھ بال کٹوا دیے اور پھر وہ حلال ہو گیا تو اس کے لیے کیا لازم ہے؟

جواب یہ حاجی جس نے ازراہ جہالت اپنے سر کے کچھ بال کٹوا دیے اور پھر وہ حلال ہو گیا تو اس صورت میں حلال ہونے کی وجہ سے اس پر کچھ لازم نہیں کیونکہ اس نے جہالت کی وجہ سے ایسا کیا ہے، البتہ اسے اپنے سر کے سارے بالوں کو کٹوانا ہوگا۔ اس موقع کی مناسبت سے میں اپنے بھائیوں کو یہ نصیحت بھی کرنا چاہتا ہوں کہ وہ جب کسی عبادت کو بجالانے کا ارادہ کریں تو اسے اس وقت تک شروع نہ کریں جب تک اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود کو نہ پہچان لیں تاکہ وہ کسی ایسے امر کا ارتکاب نہ کر بیٹھیں جس سے اس عبادت میں کوئی خلل آئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے:

﴿قُلْ هَٰذِهِۦ سَبِيلِىٓ أَدْعُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ ۚ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا۠ وَمَنِ ٱتَّبَعَنِى ۖ وَسُبْحَٰنَ ٱللَّهِ وَمَآ أَنَا۠ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ﴿١٠٨﴾﴾ (یوسف: ۱۲/۱۰۸)

”کہہ دو میرا رستہ تو یہ ہے کہ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں (از روئے یقین و برہان) سمجھ بوجھ کر۔ میں بھی (لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں) اور میرے پیروکار بھی اور اللہ پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“

اور فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِى ٱلَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَٱلَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُو۟لُوا۟ ٱلْأَلْبَٰبِ ﴿٩﴾﴾ (الزمر: ۳۹/۹)

”کہو بھلا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو نہیں رکھتے دونوں برابر ہو سکتے ہیں (اور) نصیحت تو وہی پکڑتے ہیں، جو عقل مند ہیں۔“

انسان اگر عبادت سے متعلق حدود و قیود کو جانتے ہوئے، اسے علی وجہ البصیرت ادا کرے، تو وہ اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت جہالت و نادانی کے ساتھ، کچھ علم رکھنے والوں یا نہ رکھنے والوں کی محض تقلید کے طور پر ادا کرے۔

سعودی حکومت کو دھوکہ میں رکھ کر حج کرنا

سوال جب باہر سے آنے والا کوئی شخص احرام کے بغیر مکہ میں داخل ہو اور اس حیلے سے اس کا مقصود حکام کو یہ باور کرانا ہو کہ اس کا ارادہ حج کا نہیں ہے اور پھر وہ مکہ ہی سے احرام باندھ لے تو کیا اس کا حج صحیح ہے؟ فتویٰ عطا فرمائیں۔ جزاکم اللّٰہ عنا و عن المسلمین خیراً۔

جواب حج صحیح ہے لیکن اس کا یہ فعل درج ذیل دو وجہ سے حرام ہے: ① اس نے میقات سے احرام نہ باندھ کر اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کیا ہے۔ ② اس نے ان حکام کے حکم کی مخالفت کی ہے جن کی اطاعت کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے بشرطیکہ اس کا تعلق کسی نافرمانی سے نہ ہو، لہٰذا اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے اس فعل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ و استغفار کرے، علاوہ

ازیں فدیے کے طور پر ایک جانور ذبح کر کے اس کے گوشت کو مکہ مکرمہ کے فقرا میں تقسیم کر دے کیونکہ اس نے میقات سے احرام نہیں باندھا تھا اور اہل علم نے کہا ہے کہ اس شخص پر فدیہ واجب ہے جو حج یا عمرے کے واجبات میں سے کسی واجب کو ترک کر دے۔

حج تمتع یا اِفراد؟

سوال جب حج تمتع کرنے والا آدمی اپنے ملک میں لوٹ آئے اور پھر اپنے ملک سے حج کا سفر دوبارہ شروع کرے، تو کیا اسے حج افراد کرنے والا شمار کیا جائے گا؟

جواب ہاں تمتع کرنے والا اگر اپنے ملک میں واپس آ جائے اور پھر اپنے ملک سے دوبارہ حج کا سفر شروع کرے تو وہ مفرد ہے کیونکہ اہل خانہ کے پاس واپس لوٹ آنے کی وجہ سے اس کے عمرے اور حج میں انقطاع پیدا ہو گیا اور اب دوبارہ سفر شروع کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس نے حج کے لیے نیا سفر شروع کیا ہے، لہٰذا اس صورت میں اس کا حج افراد ہو گا اور اس پر تمتع کی قربانی واجب نہ ہو گی۔ اگر وہ قربانی کے اسقاط کے لیے اسے بطور حیلہ اختیار کرتا ہے، تو اس صورت میں قربانی ساقط نہیں ہو گی کیونکہ کوئی حیلہ اختیار کرنے سے واجب ساقط نہیں ہوتا جیسا کہ کسی حرام کے لیے حیلہ اختیار کرنے سے وہ کام حلال نہیں ہوتا۔

مُحرم کے چھتری استعمال کرنے اور بیلٹ باندھنے میں کوئی حرج نہیں

سوال مُحرم کے لیے چھتری استعمال کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ نیز بیلٹ باندھنے کے بارے میں کیا حکم ہے جب کہ یہ معلوم ہے کہ اس کی سلائی کی گئی ہوتی ہے؟

جواب سورج کی گرمی سے بچنے کے لیے سر پر چھتری استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں اور یہ مرد کے لیے سر ڈھانپنے کی ممانعت میں داخل نہیں ہے کیونکہ اس سے مقصود سر کو ڈھانپنا نہیں ہوتا بلکہ اس سے مقصود دھوپ اور گرمی سے بچنے کے لیے سایہ کرنا ہوتا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ نبی ﷺ کے ساتھ حضرت اسامہ بن زید اور حضرت بلال رضی اللہ عنہم تھے، ان میں سے ایک نے نبیٔ اکرم ﷺ کی ناقہ کی مہار کو پکڑا ہوا تھا اور دوسرے نے گرمی سے بچانے کے لیے آپ کے اوپر کپڑا اٹھایا ہوا تھا حتی کہ آپ نے جمرہ عقبہ کو کنکریاں ماریں۔① ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ دوسرے نے دھوپ سے بچانے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے سر مبارک پر کپڑا اٹھایا ہوا تھا۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نبیٔ اکرم ﷺ نے احرام کھولنے سے قبل حالت احرام میں اس کپڑے کو سایہ حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا تھا۔

ازار پر بیلٹ باندھنے میں بھی کوئی حرج نہیں اور سائل نے جو یہ کہا ہے: ''جب کہ یہ معلوم ہے کہ اس کی سلائی کی گئی ہوتی ہے'' تو یہ بات بعض عوام کی اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ علماء نے جو یہ کہا ہے کہ مُحرم کیلئے سلا ہوا کپڑا حرام ہے، تو اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس میں سلائی کا عمل ہوا ہو، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ سلا ہوا کپڑا ہے جو عضو کے برابر تیار کیا گیا ہو اور اسے وہ معمول کے

---

① صحیح مسلم، الحج، باب استحباب رمی جمرة العقبة یوم النحر راکبا، حدیث:1298

انداز میں پہنے جیسے قمیص شلوار پہنی جاتی ہے۔ اہل علم کے اس قول سے مراد ہر وہ چیز نہیں ہے جس میں سلائی کا عمل ہوا ہو' لہٰذا اگر انسان احرام کے لیے پیوند لگی ہوئی چادریں استعمال کرے' تو اس میں کوئی حرج نہیں گو پیوند کاری کیلئے اس کی سلائی کی گئی ہوتی ہے۔

معذور شخص کے متعلق حکم جو احرام نہ باندھ سکتا ہو

سوال ایسا معذور شخص جو احرام کے کپڑے نہ پہن سکتا ہو' وہ کیا کرے؟

جواب جب انسان احرام کے کپڑے نہ پہن سکتا ہو تو وہ کوئی دوسرا ایسا لباس پہن لے جسے وہ پہن سکتا ہو اور اہل علم کے نزدیک اس کے لیے یہ واجب ہے کہ ایک بکری ذبح کر کے مکہ کے فقرا میں تقسیم کر دے' یا چھ مسکینوں کو نصف صاع فی کس کے حساب سے کھانا دے دے یا تین روزے رکھ لے۔ اس مسئلہ میں اہل علم کا یہی قول ہے اور یہ سر کے بال منڈانے کے مسئلہ پر قیاس کی بنیاد پر ہے کہ اس کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ بِهِۦٓ أَذًى مِّن رَّأْسِهِۦ فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ ﴾ (البقرة: ٢/ ١٩٦)

''اور اگر کوئی تم میں بیمار ہو یا اس کے سر میں کسی طرح کی تکلیف ہو' پھر اگر وہ سر منڈا لے تو اس کے بدلے روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔''

روزے اور صدقے کی نبی اکرم ﷺ نے وہی تفصیل بیان فرمائی ہے جو ہم نے قبل ازیں ذکر کی ہے۔

حالتِ احرام میں جماع کرنے والے کے متعلق کیا حکم ہے؟

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو حالت احرام میں جماع کرے جبکہ اسے اس حالت میں جماع کی حرمت کا علم نہ ہو؟

جواب معلوم ہے کہ جماع حالت احرام میں ممنوع ہے بلکہ احرام کے بڑے بڑے حرام امور میں سے ایک ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ٱلْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَٰتٌ ۚ فَمَن فَرَضَ فِيهِنَّ ٱلْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِى ٱلْحَجِّ ۗ ﴾

(البقرة: ٢/ ١٩٧)

''حج کے مہینے (معین ہیں جو) معلوم ہیں تو جو شخص ان مہینوں میں حج کی نیت کر لے' وہ حج (کے دنوں) میں نہ عورتوں سے اختلاط کرے' نہ کوئی برا کام کرے اور نہ کسی سے جھگڑے۔''

﴿رَفَثَ﴾ کے معنی جماع اور اس کے مقدمات کے ہیں۔ جماع احرام کے ممنوعات میں سے سب سے سنگین جرم ہے۔ انسان نے جب حج کا احرام باندھا ہو اور وہ جماع کرے' تو یہ جماع یا تو پہلی دفعہ حلال ہونے سے قبل ہوگا یا اس کے بعد اور اگر پہلی دفعہ حلال ہونے سے قبل ہو تو اس صورت میں جماع پر درج ذیل امور مرتب ہوں گے:

① حج فاسد ہو جائے گا اور اس طرح فرض یا نفل کوئی حج بھی ادا نہ ہوگا۔

② اس سے گناہ لازم آئے گا۔

③ فاسد ہونے کے باوجود حج کو جاری رکھ کر مکمل کرنا ہوگا اور اس فاسد حج کے تمام احکام اسی طرح مکمل کرنے ہوں گے جس طرح صحیح حج کے احکام پورے کیے جاتے ہیں۔

④ آئندہ سال اس حج کی قضا کی ادائیگی واجب ہوگی، حج خواہ فرض ہو یا نفل۔ فرض حج میں وجوب قضا تو ظاہر ہے کیونکہ جماع کرنے سے فریضۂ حج ادا نہ ہوگا اور حج نفل ہو تو اسے بھی جاری رکھنا واجب ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ﴾ (البقرة: ۲/ ۱۹۶)

''اور اللہ (کی خوشنودی) کے لیے حج اور عمرے کو پورا کرو۔''

حج کی مشغولیت کو اللہ تعالیٰ نے ''فرض'' کے نام سے موسوم کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَاتٌ فَمَن فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ﴾

(البقرة: ۲/ ۱۹۷)

''حج کے مہینے (معین ہیں جو) معلوم ہیں، تو جو شخص ان مہینوں میں حج کی نیت کرے تو حج (کے دنوں) میں عورتوں سے اختلاط کرے نہ کوئی برا کام کرے اور نہ کسی سے جھگڑے۔''

اس لیے ہم نے یہ کہا ہے کہ اس فاسد حج کی قضا واجب ہوگی، حج خواہ فرض ہو یا نفل۔

⑤ اپنے اس فعل کے کفارے کے طور پر ایک اونٹ ذبح کر کے مکہ کے فقرا میں تقسیم کرنا ہوگا۔ اونٹ کے بجائے اگر سات بکریاں ذبح کر دے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ یہ تمام احکام اس صورت میں ہیں جب جماع پہلی دفعہ حلال ہونے سے قبل کیا ہو۔

اگر جماع پہلی دفعہ حلال ہونے کے بعد ہو تو اس صورت میں گناہ لازم آئے گا اور احرام فاسد ہو جائے گا اور ایک بکری ذبح کر کے فقرا میں تقسیم کرنی ہوگی یا وہ چھ مسکینوں کو نصف صاع گندم وغیرہ فی کس دے دے یا تین روزے رکھ لے، اسے اختیار ہے کہ ان تینوں میں سے جو کام چاہے کر لے۔ علاوہ ازیں اسے قریب ترین مقام حل (میقات) سے احرام باندھنا ہوگا تا کہ وہ احرام میں طواف افاضہ کر سکے۔ ہمارے فقہا کا اس مسئلے میں یہی قول ہے۔

اگر سوال کیا جائے کہ تحلل اول (پہلی مرتبہ حلال ہونا) کب حاصل ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ تحلل اول اس وقت حاصل ہوگا جب عید کے دن جمرہ عقبہ کو کنکریاں ماری جائیں اور سر کے بال منڈوا یا کٹوا دیے جائیں تو اس سے تحلل اول حاصل ہو جاتا ہے اور احرام کی وجہ سے، عورتوں کے سوا، دیگر تمام ممنوع امور حلال ہو جاتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«كُنْتُ أُطَيِّبُ رَسُولَ اللهِ ﷺ لِإِحْرَامِهِ قَبْلَ أَنْ يُحْرِمَ وَلِحِلِّهِ قَبْلَ أَنْ يَطُوفَ بِالْبَيْتِ»

(صحيح البخاري، الحج، باب الطيب عند الإحرام، ح: ۱۵۳۹، وصحيح مسلم، الحج، باب الطيب للمحرم عند الإحرام، ح: ۱۱۸۹، ۳۳)

''میں رسول اللہ ﷺ کو احرام باندھنے سے قبل احرام کی تیاری کے لیے اور بیت اللہ کے طواف سے قبل حلال ہونے کے

لیے خوشبو لگایا کرتی تھی۔‘‘

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حلال ہونے کے معا بعد طواف کرنا چاہیے اور طواف سے پہلے حجامت بنوالی جائے کیونکہ جیسا کہ ہم نے قبل ازیں ذکر کیا ہے تحلل اول عید کے دن جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارنے اور سر کے بالوں کے منڈوانے یا کٹوانے سے حاصل ہوتا ہے۔ جماع اگر اس تحلل اول سے پہلے ہو تو اس کی وجہ سے وہ پانچ امور مرتب ہوں گے‘ جنھیں قبل ازیں ہم بیان کر چکے ہیں اور جو جماع تحلل اول کے بعد ہو تو اس کی وجہ سے گناہ لازم آئے گا‘ احرام فاسد ہو جائے گا‘ حج فاسد نہیں ہوگا اور فدیہ یا مسکینوں کو کھانا کھلانا یا روزے واجب ہوں گے‘ خواہ وہ مکہ میں رکھ لیے جائیں یا کسی دوسری جگہ‘ خواہ مسلسل رکھے جائیں یا الگ الگ‘ دونوں طرح جائز ہے۔ اگر یہ شخص جاہل ہو یعنی اسے یہ معلوم نہ ہو کہ یہ حرام ہے‘ تو پھر اس پر کوئی چیز واجب نہیں‘ خواہ اس نے تحلل اول سے قبل جماع کیا ہو یا بعد میں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ إِن نَّسِينَآ أَوْ أَخْطَأْنَا ﴾ (البقرة: ٢/ ٢٨٦)

’’اے پروردگار! اگر ہم سے بھول یا چوک ہوگئی ہو تو ہم سے مؤاخذہ نہ کیجیے۔‘‘

اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ’’میں نے ایسا ہی کیا۔‘‘ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ أَخْطَأْتُم بِهِۦ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝٥ ﴾ (الأحزاب: ٣٣/ ٥)

’’اور جو بات تم سے غلطی سے ہوگئی ہو اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں لیکن جو دلی ارادے سے کرو (اس پر مؤاخذہ ہے) اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔‘‘

اگر کہا جائے کہ جب اس شخص کو یہ علم ہو کہ حالت احرام میں جماع حرام ہے لیکن اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس پر یہ احکام مرتب ہوں گے تو کیا اس صورت میں وہ معذور ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عذر نہیں ہے کیونکہ عذر کی صورت یہ ہے کہ انسان جاہل ہو اور اسے یہ معلوم ہی نہ ہو کہ یہ چیز حرام ہے اور اس چیز پر مرتب ہونے والے امور سے جاہل ہونا عذر نہیں ہے۔ اگر کسی شادی شدہ شخص کو یہ علم ہو کہ زنا حرام ہے اور وہ بالغ و عاقل ہو اور اس کے حق میں احصان کی شرائط پوری ہوں‘ تو اسے رجم کرنا واجب ہوگا اور اگر وہ یہ کہے کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس حد کی صورت رجم ہے اور اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں کبھی بھی زنا نہ کرتا تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ عذر قبول نہیں ہے‘ لہٰذا تمھارے لیے رجم واجب ہے خواہ تمھیں زنا کی سزا معلوم نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس شخص نے نبی اکرم ﷺ سے فتویٰ طلب کیا‘ جس نے رمضان میں دن کے وقت جماع کر لیا تھا‘ تو نبی ﷺ نے اس پر کفارہ لازم قرار دیا‘ ① حالانکہ جماع کے وقت اسے یہ علم نہ تھا کہ اس کی پاداش میں اس پر کیا واجب ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب کوئی شخص معصیت کی جرأت کرے اور اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدوں کی بے حرمتی کرے‘ تو اس پر اس معصیت کے اثرات ونتائج مرتب ہوں گے‘ خواہ معصیت کے ارتکاب کے وقت اسے ان اثرات ونتائج کا علم نہ بھی ہو۔

---

① صحیح البخاری‘ الصوم‘ باب إذا جامع فی رمضان ولم یکن له شیئ ......‘ حدیث:1936

مُحرم عورت کیسے پردہ کرے؟

سوال مُحرم عورت کس طرح پردہ کرے اور کیا یہ شرط ہے کہ کپڑا اس کے چہرے کو نہ چھوئے؟

جواب مُحرم عورت جب مردوں کے پاس سے گزرے یا غیر مَحرم مرد اس کے پاس سے گزریں تو اس کے لیے اپنے چہرے کو ڈھانپ لینا واجب ہے جیسا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عورتیں کیا کرتی تھیں۔ اس حالت میں اس پر کوئی فدیہ لازم نہ ہوگا کیونکہ اس کا اسے حکم دیا گیا ہے اور جس چیز کا شرعاً حکم دیا گیا ہو وہ ممنوع میں تبدیل نہیں ہوتی۔ یہ کوئی شرط نہیں کہ کپڑا اس کے چہرے کو نہ لگے' لہٰذا اگر کپڑا چہرے کو لگ جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ جب تک وہ مردوں کے پاس ہو چہرے کو ڈھانپنا واجب ہے اور جب خیمے یا گھر میں داخل ہو تو اپنے چہرے کو ننگا کرلے کیونکہ حالت احرام میں عورت کے لیے حکم شریعت یہ ہے کہ وہ اپنے چہرے کو ننگا رکھے۔

طواف وداع سے پہلے حیض آنے پر عورت کیا کرے؟

سوال اگر طواف وداع سے قبل حیض شروع ہو جائے' تو پھر عورت کے لیے کیا حکم ہے؟

جواب اس عورت کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اگر اس نے طواف افاضہ کرلیا ہو اور اسے تمام مناسک حج پورے کرنے کے بعد حیض آیا ہو اور صرف طواف وداع باقی ہو تو اس حالت میں یہ طواف ساقط ہو جائے گا کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں ہے:

«أُمِرَ النَّاسُ أَنْ يَكُونَ آخِرُ عَهْدِهِمْ بِالْبَيْتِ، إِلاَّ أَنَّهُ خُفِّفَ عَنِ الْحَائِضِ»(صحيح البخاري، الحج، باب طواف الوداع، ح:١٧٥٥، وصحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع وسقوطه عن الحائض، ح:١٣٢٨)

”لوگوں کو حکم دیا گیا ہے کہ رخصت ہونے سے قبل ان کا آخری کام بیت اللہ کا طواف ہونا چاہیے' البتہ حائضہ عورت سے تخفیف کردی گئی ہے۔“

نبی ﷺ کی خدمت میں جب یہ عرض کیا گیا کہ حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا کے ایام شروع ہوگئے ہیں' مگر انھوں نے طواف افاضہ کرلیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«فَلاَ إِذًا»(صحيح البخاري، الحج، باب إذا حاضت المرأة بعد ما أفاضت، ح:١٧٥٧)

”پھر کوئی حرج نہیں۔“

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«فَانْفِرِيْ»(صحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع وسقوطه عن الحائض، ح:١٢١١)

”پس تم (صفیہ) کوچ کرو۔“

آپ نے ان سے طواف وداع کو ساقط کردیا تھا' البتہ طواف افاضہ حیض کی وجہ سے ساقط نہیں ہوسکتا' لہٰذا اس صورت میں یا تو

عورت کو مکہ میں رہنا ہوگا حتی کہ پاک ہو کر طواف افاضہ کر لے یا اپنے شہر میں چلی جائے اور جب پاک ہو جائے تو واپس آ کر طواف افاضہ کر لے۔ اس صورت میں بہتر یہ ہوگا کہ واپسی پر پہلے عمرہ ادا کرے، طواف وسعی کرے، بال کاٹے اور پھر طواف افاضہ کرے۔ اور اگر یہ کسی صورت میں بھی ممکن نہ ہو تو پھر وہ مقام حیض پر کوئی ایسی چیز رکھ لے جو نزول حیض اور مسجد کو خراب ہونے سے روکے اور پھر نظریہ ضرورت کے تحت اسی حالت میں طواف کر لے۔ اس مسئلے میں راجح قول یہی ہے۔

اگر حائضہ کو طہارت میں شک ہو تو دوبارہ عمرہ کرے

سوال ایک عورت نے اپنے خاوند کے ساتھ جب احرام باندھا تو وہ حالت حیض میں تھی اور جب وہ پاک ہوگئی تو اس نے مَحرم کے بغیر عمرہ کیا اور پھر اس نے دوبارہ خون دیکھا تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ فتویٰ عطا فرمائیں۔ جزاکم اللہ۔

جواب سوال سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ عورت اپنے مُحرم کے ساتھ مکہ میں آئی اور اس نے میقات سے جب احرام باندھا تو حالت حیض میں تھی۔ اس کا حالت حیض میں میقات سے احرام باندھنا صحیح ہے کیونکہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے نبی ﷺ کی خدمت میں عرض کیا جب آپ مقام ذوالحلیفہ میں تشریف فرما تھے: یارسول اللہ! میرے ایام شروع ہو گئے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا:

«اِغْتَسِلِي وَاسْتَثْفِرِي بِثَوْبٍ، وَأَحْرِمِي» (صحيح مسلم، الحج، باب حجة النبي ﷺ، ح:١٢١٨)

"غسل کر کے مضبوطی سے کپڑا باندھ لو اور احرام باندھ لو۔"

اور جب عورت مکہ میں آ کر پاک ہوگئی اور اس نے محرم کے بغیر عمرہ ادا کیا تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ شہر میں ہے، البتہ دوبارہ خون آنے سے اس کی طہارت مشکوک ہوگئی ہے۔ اس صورت میں اگر اس نے یقینی طور پر طہارت کو دیکھا تھا تو عمرہ صحیح ہوگا اور اگر اسے اس طہارت کے بارے میں شک تھا تو پھر عمرہ دوبارہ کرنا ہوگا۔ دوبارہ عمرہ کرنے کے لیے اسے میقات پہ جا کر دوبارہ احرام باندھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسے طواف وسعی دوبارہ کرنا ہوگی اور دوبارہ بال کٹوانے ہوں گے۔

اگر طواف افاضہ سے پہلے عورت کو حیض آ جائے تو وہ کیا کرے؟

سوال ایک عورت کے ایام حیض شروع ہو گئے جب کہ اس نے ابھی طواف افاضہ نہیں کیا تھا۔ یہ عورت سعودی عرب سے باہر کسی دوسرے ملک میں رہتی ہے اور اس کا مکہ مکرمہ سے روانگی کا وقت قریب آ گیا اور اس کے لیے یہ محال ہے کہ دوبارہ سعودی عرب واپس آ کر طواف افاضہ کرے، تو اس صورت میں یہ کیا کرے؟ فتویٰ دیں۔

جواب اگر معاملہ اسی طرح ہے جس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ اس عورت نے طواف افاضہ نہیں کیا تھا کہ حیض شروع ہو گیا اور اس کے لیے مکہ مکرمہ میں مزید ٹھہرنا مشکل ہے اور طواف سے پہلے سفر کر کے دوبارہ مکہ میں واپس آنا بھی مشکل ہے، تو اس حالت میں اس کے لیے جائز ہے کہ درج ذیل دو میں سے کوئی ایک بات اختیار کر لے:

① وہ ایسا ٹیکہ لگوائے جس سے خون بند ہو جائے اور اس طرح وہ طواف افاضہ کر لے بشرطیکہ ٹیکہ لگوانے میں کوئی نقصان نہ ہو۔

② وہ اس طرح مضبوطی کے ساتھ لنگوٹ باندھ لے کہ مسجد میں خون نہ گرے اور ضرورت کی وجہ سے اسی حالت میں طواف کر لے۔ اس مسئلہ میں یہی قول راجح ہے اور اسی کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ ؒ نے اختیار فرمایا ہے اور اس کے برخلاف درج ذیل دو میں سے ایک امر ہو سکتا ہے:

① وہ حالت احرام ہی میں رہے اور اس طرح اس کے شوہر کے لیے اس کے ساتھ مباشرت حلال نہ ہوگی اور اگر وہ غیر شادی شدہ ہے، تو اس کے لیے عقد نکاح حلال نہ ہوگا۔

② یا اسے محصر شمار کیا جائے، وہ قربانی ذبح کر دے اور اپنا احرام کھول دے لیکن اس صورت میں اس کا یہ حج شمار نہیں ہوگا۔

لیکن یہ دونوں باتیں یعنی حالت احرام میں باقی رہنا یا اسے حج ہی شمار نہ کرنا، بہت مشکل ہیں، لہٰذا راجح قول وہی ہے جسے شیخ الاسلام ابن تیمیہ ؒ نے اس صورت میں نظریہ ضرورت کے تحت اختیار کیا ہے اور ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (الحج: ۲۲/ ۷۸)

''اور (اللہ نے) تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی۔''

اور فرمایا:

﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقرۃ: ۲/ ۱۸۵)

''اللہ تمھارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا۔''

عورت کیلئے اگر یہ ممکن ہو کہ وہ سفر پر چلی جائے اور پھر پاک ہونے کے بعد دوبارہ واپس آ کر طواف کر لے تو اس میں کوئی حرج نہیں، البتہ اس مدت میں وہ اپنے شوہر کے لیے حلال نہیں ہوگی کیونکہ اسے ابھی تک تحلل ثانی (دوسری مرتبہ حلال ہونا) حاصل نہیں ہوا۔

حیض کی وجہ سے عمرہ کیے بغیر مکہ سے واپس جانے والی عورت کے متعلق حکم

سوال ایک عورت نے عمرے کا احرام باندھا تھا کہ اسکے ایام شروع ہو گئے اور وہ عمرہ کیے بغیر مکہ سے نکل گئی تو اس پر کیا واجب ہے؟

جواب جب عورت عمرے کا احرام باندھے اور اسے حیض آ جائے تو اس کا احرام باطل نہیں ہوتا بلکہ وہ باقی رہتا ہے۔ یہ عورت جس نے عمرے کا احرام باندھا تھا اور وہ عمرہ کیے بغیر مکہ سے واپس چلی گئی، یہ ابھی حالت عمرہ میں ہے، لہٰذا اسے مکہ واپس آ کر طواف وسعی اور بالوں کی تقصیر (کاٹنا) کرنی چاہیے تاکہ یہ اپنے احرام سے حلال ہو جائے۔ عمرہ ادا کرنے سے پہلے اسے احرام کے تمام ممنوعات سے اجتناب کرنا چاہیے، یعنی خوشبو استعمال نہیں کرنی چاہیے، بال یا ناخن نہیں کاٹنے چاہییں اور اگر شادی شدہ ہو تو عمرہ ادا کرنے سے پہلے اپنے شوہر کے قریب بھی نہیں جانا چاہیے، البتہ اگر حیض آنے کا اسے پہلے ہی خدشہ ہو اور بوقت احرام وہ یہ شرط لگا لے کہ جہاں اسے رکاوٹ پیش آئے گی تو وہ حلال ہو جائے گی، اس صورت میں اگر وہ احرام ختم کر دے تو اس پر کوئی چیز بھی واجب نہ ہوگی۔

عورت کے لیے احرام کا کوئی مخصوص لباس نہیں ہے

سوال کیا مُحرم عورت کے لیے اپنے ان کپڑوں کو تبدیل کرنا جائز ہے، جن میں اس نے احرام باندھا ہو؟ کیا احرام کے لیے کوئی

خاص کپڑے ہیں؟

جواب مُحرم عورت کے لیے کپڑے تبدیل کرنا جائز ہے‘ خواہ وہ ضرورت کی وجہ سے تبدیل کرے یا بلا ضرورت بشرطیکہ وہ کپڑے ایسے نہ ہوں‘ جن سے مردوں کے سامنے زیب وزینت کا اظہار ہوتا ہو‘ بہر حال جن کپڑوں میں احرام باندھا ہو‘ انھیں تبدیل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ عورت کے حوالے سے احرام کا کوئی مخصوص لباس نہیں ہے‘ وہ جو لباس چاہے پہن سکتی ہے البتہ حالت احرام میں نقاب اور دستانے نہیں پہن سکتی۔ نقاب سے مراد وہ کپڑا ہے‘ جو چہرے پر رکھا جاتا ہے اور اس میں آنکھ سے دیکھنے کے لیے سوراخ ہوتا ہے اور دستانے ہاتھوں میں پہنے جاتے ہیں۔ مرد کے احرام کے لیے خاص لباس ہے اور وہ ہے تہبند اور چادر۔ مرد قمیص‘ شلوار‘ عمامے‘ ٹوپیاں اور موزے وغیرہ نہیں پہن سکتا۔

مُحرم عورت کے لیے جرابیں اور دستانے پہننا کیسا ہے؟

سوال کیا محرم عورت کے لیے دستانے اور جرابیں پہننا جائز ہے؟

جواب عورت کے لیے جرابیں پہننے میں کوئی حرج نہیں لیکن دستانوں کے بارے میں نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«لاَ تَلْبَسِ الْقُفَّازَيْنِ»(صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب ما ينهى عن الطيب للمحرم والمحرمة، ح: ١٨٣٨)

”عورت دستانے نہ پہنے۔“

حائضہ پاک ہونے تک عمرے کو مؤخر کرے

سوال ایک عورت جب میقات کے پاس سے گزری تو وہ حالت حیض میں تھی۔ اس نے وہاں سے احرام باندھ لیا اور مکہ آگئی اور پاک ہونے تک اس نے عمرے کو مؤخر کر دیا‘ تو اس کے عمرے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب عمرہ صحیح ہے خواہ اس نے اسے ایک یا دو دن مؤخر کر کے ادا کیا ہو بشرطیکہ حیض سے پاک ہونے کے بعد ادا کیا ہو کیونکہ حائضہ عورت کے لیے بیت اللہ کا طواف حلال نہیں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب عمرے کا احرام باندھ کر مکہ میں تشریف لائیں تو ان کے ایام شروع ہو گئے تھے‘ نبی ﷺ نے ان سے فرمایا:

«فَافْعَلِي مَا يَفْعَلُ الْحَاجُّ غَيْرَ أَنْ لاَ تَطُوفِي بِالْبَيْتِ»(صحيح البخاري، الحيض، باب تقضي الحائض المناسك كلها إلا الطواف، ح: ٣٠٥)

”جو حاجی کرتے ہیں تم بھی وہی کام کرو لیکن بیت اللہ کا طواف نہ کرو۔“

اور جب حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ایام شروع ہو گئے تو نبی ﷺ نے فرمایا:

«أَحَابِسَتُنَا هِيَ؟»

”کیا یہ ہمیں روک دے گی؟“

آپ کا خیال تھا کہ شاید انھوں نے طواف افاضہ نہیں کیا اور جب آپ کو بتایا گیا کہ انھوں نے طواف افاضہ کرلیا ہے تو آپ نے فرمایا:

«فَانْفِرِي»(صحيح البخاري، الحج، باب إذا حاضت المرأة بعد ما أفاضت، ح:١٧٥٧، وصحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع وسقوطه عن الحائض، ح:١٢١١)

”(تب) تم کوچ کرو۔“

پس حائضہ عورت کے لیے بیت اللہ کا طواف حلال نہیں ہے، لہٰذا جب وہ مکہ آئے اور حالت حیض میں ہو تو اس کے لیے انتظار کرنا واجب ہے اور جب وہ پاک ہوجائے تو پھر طواف کرے۔ اگر حیض عمرہ کا طواف کرنے کے بعد اور سعی سے پہلے شروع ہوجائے تو اسے اپنا عمرہ مکمل کرنا چاہیے، اس پر کچھ لازم نہیں۔ اگر سعی کے بعد حیض شروع ہو تو اس صورت میں اس کے لیے طواف وداع واجب نہیں ہے کیونکہ طواف وداع حائضہ عورت سے ساقط ہوجاتا ہے۔

مُحرم عورت حیض کے بعد کپڑے تبدیل کرسکتی ہے

سوال ایک عورت نے میقات سے حالت حیض میں احرام باندھا اور پھر وہ مکہ میں پاک ہوگئی اور اس نے اپنے کپڑے تبدیل کرلیے، تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب عورت جب میقات سے احرام باندھے اور وہ حالت حیض میں ہو، پھر مکہ پہنچنے کے بعد وہ پاک ہوجائے، تو وہ اپنے کپڑے تبدیل کرسکتی ہے اور جو لباس چاہے پہن سکتی ہے بشرطیکہ اس لباس کا پہننا جائز ہو اسی طرح مرد کے لیے بھی احرام کے کپڑے تبدیل کرنا جائز ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

مُحرم عورت حج میں نقاب نہ پہنے

سوال حج میں نقاب کے ساتھ چہرے کو ڈھانپنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ میں نے ایک حدیث پڑھی تھی جس کا مفہوم یہ ہے کہ مُحرم عورت نقاب اور دستانے نہ پہنے ① اسی طرح میں نے حضرت عائشہ ؓ کا یہ قول بھی پڑھا ہے کہ سفر حج میں جب مرد ہمارے پاس سے گزرتے، تو ہم اپنے چہروں پر نقاب ڈال لیتیں اور جب ہم ان سے آگے نکل جاتیں، تو ہم اپنے چہروں کو ننگا کرلیتی تھیں۔ ② ان دونوں میں تطبیق کس طرح ہوگی؟

جواب اس مسئلے میں صحیح بات وہی ہے، جو حدیث میں مذکور ہے اور وہ یہ کہ نبی ﷺ نے مُحرم عورت کو نقاب پہننے سے منع فرمایا ہے، لہٰذا مُحرم عورت کے لیے نقاب مطلقاً ممنوع ہے، خواہ اجنبی مرد اس کے پاس سے گزریں یا نہ گزریں۔ مُحرم عورت کے لیے نقاب حرام ہے، خواہ اس نے حج کا احرام باندھا ہو یا عمرے کا۔ نقاب عورتوں کے ہاں معروف ہے اور وہ یہ کہ وہ ایک ایسے پردے کے ساتھ اپنے چہرے کو چھپائے، جس میں دیکھنے کے لیے دونوں آنکھوں کے سامنے دو سوراخ بنے ہوں۔ حدیث حضرت عائشہ ؓ نقاب سے

---

① صحیح البخاری، جزاء الصید، باب ماینهی من الطیب للمحرم والمحرمة، حدیث:1838

② سنن أبی داود، المناسك، باب فی المحرمة تغطی وجهها، حدیث:1833 وقال الألبانی ”ضعیف۔“

ممانعت کے حکم کے مخالف نہیں ہے کیونکہ اس میں یہ ذکر نہیں ہے کہ عورتیں نقاب پہن لیتی تھیں بلکہ یہ ذکر ہے کہ وہ نقاب کے بغیر اپنے چہرے کو چھپا لیتی تھیں، لہٰذا جب مرد عورتوں کے پاس سے گزریں تو یہ بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے چہروں کو پردہ کے ساتھ ڈھانپ لیں کیونکہ اجنبی مردوں سے چہرے کا پردہ واجب ہے، لہٰذا ہم یہ کہتے ہیں کہ نقاب مُحرم عورت کے لیے مطلقاً حرام نہیں ہے اور افضل یہ ہے کہ وہ اپنے چہرے کو کھلا رکھے، تاہم جب اس کے پاس سے مرد گزریں تو چہرہ چھپانا واجب ہے لیکن وہ نقاب کے بغیر پردہ کرے۔

بھول کر ممنوعات احرام کا ارتکاب کرنے والے کے متعلق حکم

سوال جو شخص بھول کر یا ناواقفیت کی وجہ سے کسی ایسے فعل کا ارتکاب کرے جو حالت احرام میں ممنوع ہو تو اسکے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جب وہ ممنوعات احرام میں سے کسی چیز کا اس وقت ارتکاب کرے، جب اس نے احرام تو پہن لیا ہو لیکن ابھی تک نیت نہ کی ہو تو اس پر کچھ لازم نہیں کیونکہ اعتبار نیت کا ہے، محض احرام کے پہننے کا نہیں اور جب وہ نیت کر لے اور حج یا عمرے میں داخل ہو جائے، پھر بھول کر یا عدم واقفیت کی وجہ سے ممنوعات احرام میں سے کسی چیز کا ارتکاب کرے تو اس پر کچھ لازم نہیں، البتہ اگر وہ بھول جانے کی وجہ سے کوئی ممنوع کام کر رہا ہو تو اسے یاد دلا دیا جائے اور اگر عدم واقفیت کی وجہ سے کر رہا ہو تو اسے معلوم کروا دیا جائے اور پھر اس کے لیے واجب ہے کہ وہ اس ممنوع کام کو ترک کر دے۔

اس کی مثال یہ ہے جیسے کوئی مُحرم بھول کر سلے ہوئے کپڑے پہن لے تو اس پر کوئی چیز واجب نہ ہوگی لیکن جب اسے یاد دلا دیا جائے تو اس کے لیے واجب ہوگا کہ وہ ان کپڑوں کو اتار دے۔ اسی طرح اگر بھول جانے کی وجہ سے اس نے ابھی تک شلوار پہنی ہو اور پھر اسے نیت کرنے اور لبیک کہنے کے بعد یاد آیا ہو تو واجب ہے کہ وہ شلوار کو فوراً اتار دے، اس صورت میں اس پر کوئی کفارہ وغیرہ لازم نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر وہ جاہل تھا اور اسے حکم شریعت کا علم ہی نہ تھا تو اس پر کچھ لازم نہ ہوگا مثلاً اگر وہ سویٹر پہن لے جس کی سلائی تو نہ ہوئی ہو، البتہ اسے بنا گیا ہو اور اس نے یہ خیال کیا ہو کہ ایسا کپڑا پہننے میں کوئی حرج نہیں جس میں سلائی نہ کی گئی ہو اور جب اس کے سامنے یہ بات واضح ہو جائے کہ اگرچہ سویٹر میں سلائی نہیں ہوتی لیکن حالت احرام میں اسے پہننا بھی ممنوع ہے، تو اس کے لیے واجب ہوگا کہ اسے فوراً اتار دے۔ اس سلسلے میں عام اصول یہ ہے کہ انسان جب ممنوعات احرام میں سے کسی فعل کو بھول جانے کی وجہ سے یا عدم واقفیت کی وجہ سے یا مجبور کر دیے جانے کی وجہ سے کرے تو اس پر کوئی کفارہ وغیرہ نہیں ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ إِن نَّسِينَآ أَوْ أَخْطَأْنَا ﴾ (البقرة: ٢/ ٢٨٦)

’’اے ہمارے پروردگار! اگر ہم سے بھول یا چوک ہوگئی ہو تو ہم سے مؤاخذہ نہ کیجیے۔‘‘

اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اسی طرح کیا اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ أَخْطَأْتُم بِهِۦ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝ ﴾ (الأحزاب: ٣٣/ ٥)

”اور جو بات تم سے غلطی سے ہوگئی ہو اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں لیکن جو دلی ارادے سے کرو (اس پر مؤاخذہ ہے) اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

اور اللہ تعالیٰ نے شکار کے بارے میں فرمایا ہے‘ جو ممنوعات احرام میں سے ہے:

﴿ وَمَن قَتَلَهُۥ مِنكُم مُّتَعَمِّدًا ﴾ (المائدۃ: ۵/ ۹۵)

”اور جو تم میں سے جان بوجھ کر اسے مارے (تو اس کا بدلہ دے۔“)

اور اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں کہ ممنوع امور کا تعلق لباس سے ہو یا خوشبو سے‘ شکار مارنے سے ہو یا سر کے بال منڈا دینے وغیرہ سے۔ اگرچہ بعض علماء نے فرق کیا ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ان میں کوئی فرق نہیں کیونکہ یہ وہ ممنوع امور ہیں جن میں انسان بھول جانے یا عدم واقفیت یا مجبور کر دیے جانے کی وجہ سے معذور ہے۔

حج کی غلطیوں کا کفارہ کہاں ادا کیا جائے؟

سوال حج ادا کرتے ہوئے ایک حاجی سے کچھ غلطیاں سرزد ہوگئیں لیکن اس کے پاس کفارہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں اور وہ اپنے ملک واپس چلا گیا۔ کیا اپنے ملک میں رہتے ہوئے بھی وہ کفارہ وغیرہ ادا کر سکتا ہے یا اس کے لیے مکہ میں ہونا لازم ہے؟ اور اگر مکہ میں ہونا لازم ہے‘ تو کیا وہ کسی کو اپنا وکیل بنا سکتا ہے؟

جواب جواب دینے سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اس سے کون سی غلطی سرزد ہوئی۔ اگر اس نے کسی واجب کو ترک کر دیا ہے‘ تو اس کے لیے واجب ہے کہ وہ فدیے کا جانور مکہ میں ذبح کرے‘ اس کا تعلق حج سے ہے‘ لہٰذا یہ مکہ کے علاوہ کسی دوسری جگہ ذبح نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس نے کسی ممنوع کام کا ارتکاب کیا ہے‘ تو اس کے لیے تین امور میں سے کوئی ایک امر کافی ہے: ① چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے اور یہ کھانا مکہ میں کھلائے‘ یا اس جگہ جہاں اس نے ممنوع فعل کا ارتکاب کیا ہے۔ ② تین روزے رکھے اور وہ یہ روزے مکہ میں بھی رکھ سکتا ہے اور کسی دوسری جگہ بھی اور ③ حج میں تحلل اول (پہلی مرتبہ حلال ہونے) سے پہلے جماع کر لینے کی صورت میں اس کے لیے ایک اونٹ ذبح کرنا واجب ہے‘ جسے وہاں ذبح کیا جائے‘ جہاں اس نے اس ممنوع فعل کا ارتکاب کیا ہے یا وہ مکہ میں ذبح کر کے اسے وہاں کے فقرا میں تقسیم کر دے‘ یا اگر اس نے شکار کا بدلہ دینا ہے‘ تو وہ اس شکار جیسا جانور ہوگا یا کھانا کھلانا ہوگا یا روزے رکھنے ہوں گے۔ روزے کسی بھی جگہ رکھے جا سکتے ہیں اور اگر کھانا کھلانا یا جانور ذبح کرنا ہے‘ تو اس کیلئے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ هَدْيًا بَٰلِغَ ٱلْكَعْبَةِ ﴾ (المائدۃ: ۵/ ۹۵)

”یہ قربانی کعبے پہنچائی جائے۔“

لہٰذا اس کا حرم کے اندر ہونا ضروری ہے۔ اس مسئلے میں وہ کسی کو اپنا وکیل بھی مقرر کر سکتا ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی قربانی کے باقی ماندہ اونٹ ذبح کرنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا وکیل مقرر فرمایا تھا۔ ①

---

① سنن أبی داود‘ المناسك‘ باب الهدی إذا عطب قبل أن یبلغ‘ حدیث: 1764 و قال الألبانی ”منکر“۔

طواف سے پہلے سعی کرنا کیسا ہے؟

سوال کیا طواف سے پہلے سعی کرنا جائز ہے؟

جواب جہاں تک حج کی سعی کا تعلق ہے تو اسے طواف افاضہ سے پہلے کرنا جائز ہے کیونکہ نبی ﷺ جب قربانی کے دن تشریف فرما تھے اور لوگ آپ سے سوالات پوچھ رہے تھے، تو ایک شخص نے عرض کیا کہ میں نے طواف سے پہلے سعی کر لی ہے تو آپ نے فرمایا:

«لاَ حَرَجَ»(صحيح البخاري، الحج، باب إذا رمى بعد ما أمسى، ح:١٧٣٤، وصحيح مسلم، الحج، باب جواز تقديم الذبح على الرمي، ح:١٣٠٦، وسنن أبي داود، المناسك، باب في من قدم شيئًا... ح:٢٠١٥، واللفظ له)

’’کوئی حرج نہیں۔‘‘

پس جو شخص حج تمتع کر رہا ہو اور وہ حج کی سعی کو طواف سے پہلے کر لے یا حج افراد یا قران کرنے والا ہو اور اس نے طواف قدوم کے ساتھ سعی نہ کی ہو اور پھر طواف سے پہلے سعی کرے تو نبی اکرم ﷺ کے فرمان کے پیش نظر اس میں کوئی حرج نہیں۔

ماہ رمضان میں بار بار عمرہ کرنا صحیح نہیں ہے

سوال رمضان میں بار بار عمرے کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا دو عمروں کے مابین کوئی مدت مقرر ہے؟

جواب ماہ رمضان میں بار بار عمرے کرنا بدعت ہے کیونکہ ایک ہی مہینے میں عمروں کی تکرار سلف کے عمل کے خلاف ہے حتیٰ کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فتاویٰ میں ذکر فرمایا ہے کہ باتفاق سلف عمروں کی تکرار اور کثرت مکروہ ہے، خصوصاً رمضان میں عمروں کا تکرار۔ اگر یہ پسندیدہ امر ہوتا تو ہماری نسبت سلف اس کے زیادہ خواہش مند ہوتے اور بار بار عمرے کرتے، خود نبی کریم ﷺ جو سب لوگوں سے زیادہ تقویٰ شعار تھے اور سب لوگوں سے زیادہ نیکی کے کاموں سے محبت فرمانے والے تھے، فتح مکہ کے سال انیس دن مکہ میں مقیم رہے اور نماز قصر ادا فرماتے رہے مگر آپ نے اس عرصے میں عمرہ نہیں کیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جب عمرے کے لیے نبی ﷺ سے اصرار کیا تو آپ نے ان کے بھائی حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ وہ ان کے ساتھ حرم سے نکل کر غیر حرم تک جائیں تا کہ وہ عمرے کا احرام باندھ لیں، نبی اکرم ﷺ نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو یہ حکم نہیں دیا تھا کہ وہ بھی عمرہ کریں۔ اگر یہ شریعت کا تقاضا ہوتا تو نبی اکرم ﷺ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کو بھی عمرے کا حکم دیتے اور اگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اسے تقاضائے شریعت سمجھتے تو حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما بھی ضرور عمرہ ادا کرتے کیونکہ حدود حرم سے نکل کر حلت والی جگہ (غیر حرم) تک تو وہ چلے ہی گئے تھے۔ دونوں عمروں کے درمیان معین مدت کے بارے میں امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسے انتظار کرنا چاہیے حتیٰ کہ سر کے بال اگ کر سیاہ نظر آنے لگیں۔

اگر دورانِ طواف میں جماعت کھڑی ہو جائے تو پہلے نماز پڑھے

سوال طواف کرتے ہوئے اگر جماعت کھڑی ہو جائے تو کیا حکم ہے؟ کیا طواف از سر نو شروع کرے؟ اور اگر از سر نو شروع نہ

کرے' تو پھر اسے مکمل کہاں سے کرے؟

جواب جب جماعت کھڑی ہو جائے اور انسان طواف کر رہا ہو تو طواف خواہ عمرے کا ہو یا حج کا ہو یا نفل ہو' وہ طواف چھوڑ کر نماز شروع کر دے۔ نماز سے فراغت کے بعد واپس آ کر باقی طواف مکمل کرے اور اسے ازسرنو شروع نہ کرے بلکہ جہاں اسے چھوڑا تھا' وہاں سے دوبارہ شروع کرے کیونکہ اس نے جس قدر طواف پہلے کیا' وہ صحیح بنیاد پر کیا تھا اور اذن شرعی کے تقاضے کے مطابق کیا تھا' لہٰذا کسی شرعی دلیل کے بغیر اسے باطل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

کیا سعی' طواف سے پہلے کی جا سکتی ہے؟

سوال جب عمرہ کرنے والا طواف سے پہلے سعی کر لے اور طواف بعد میں کرے' تو اس پر کیا لازم ہے؟

جواب جب عمرہ کرنے والا طواف سے پہلے سعی کرے اور پھر اس کے بعد طواف کرے' تو اسے صرف سعی ہی دوبارہ کرنا پڑے گی کیونکہ طواف وسعی میں ترتیب واجب ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے دونوں میں ترتیب کو قائم رکھا تھا اور آپ نے فرمایا تھا:

«لِتَأْخُذُوا مَنَاسِكَكُمْ»(صحيح البخاري، العلم، باب الفتيا وهو واقف على الدابة وغيرها، ح:٨٣، وصحيح مسلم، الحج، باب استحباب رمي جمرة العقبة يوم النحر، ح:١٢٩٧، واللفظ له)

''تمہیں مناسک حج سیکھ لینے چاہئیں۔''

اور جب ہم آپ ﷺ کے مناسک کے مطابق عمل کریں تو ہم پہلے طواف کریں گے اور پھر سعی کریں گے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ میں پہلے سعی سے تھک گیا ہوں تو ہم اس سے یہ کہیں گے کہ اسے تھکاوٹ کا اجروثواب تو ملے گا لیکن اسے غلطی پر برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ بعض تابعین اور بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ اگر عمرے میں کوئی شخص بھول جانے یا عدم واقفیت کی وجہ سے طواف سے پہلے سعی کر لے' تو اس پر کچھ لازم نہیں جیسا کہ اس صورت میں حج میں کچھ لازم نہیں ہے۔

اضطباع کسے کہتے ہیں؟

سوال اضطباع سے کیا مراد ہے اور یہ کب مشروع ہے؟

جواب اضطباع یہ ہے کہ انسان اپنے دائیں کندھے کو ننگا کر لے اور چادر کے کناروں کو بائیں کندھے پر ڈال لے۔ یہ طواف قدوم میں ہے' اس کے علاوہ دیگر کسی طواف میں اس کا حکم نہیں ہے۔

نفلی سعی جائز نہیں

سوال کیا نفلی سعی بھی جائز ہے؟

جواب نفلی سعی جائز نہیں ہے کیونکہ سعی حج یا عمرے ہی کے ساتھ مخصوص ہے' جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ۞ إِنَّ ٱلصَّفَا وَٱلْمَرْوَةَ مِن شَعَآئِرِ ٱللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ ٱلْبَيْتَ أَوِ ٱعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ

بِہِمَا ۚ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾ (البقرة: ٢/ ١٥٨)

”بے شک کوہ صفا اور کوہ مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں تو جو شخص خانہ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے اس پر کوئی گناہ نہیں کہ دونوں کا طواف کرے (بلکہ طواف ایک قسم کا نیک کام ہے) اور جو کوئی نیک کام کرے تو اللہ قدر شناس اور دانا ہے۔“

طوافِ افاضہ کے بغیر حج مکمل نہیں ہوتا

سوال جو شخص عدم واقفیت کی وجہ سے طواف افاضہ ترک کر دے‘ اس کے لیے کیا لازم ہے؟

جواب طواف افاضہ حج کا رکن ہے‘ اس کے بغیر حج مکمل نہیں ہوتا‘ لہٰذا جس نے طواف نہ کیا ہو‘ اس کے لیے ضروری ہے کہ واپس آ کر یہ طواف کرے‘ خواہ اسے اپنے ملک ہی سے کیوں نہ واپس آنا پڑے اور جب تک وہ طواف افاضہ نہ کرے‘ اس کے لیے اپنی بیوی سے مقاربت جائز نہیں کیونکہ اسے تحلل ثانی (دوسری مرتبہ حلال ہونا) حاصل نہیں ہوا۔ تحلل ثانی تو طواف افاضہ کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے‘ نیز سعی بھی ضروری ہے بشرطیکہ اس نے طواف قدوم کے ساتھ سعی نہ کی ہو‘ حج خواہ تمتع ہو یا قران یا افراد۔

دورانِ طواف میں حجر اسود کو بوسہ دینا ضروری نہیں

سوال میں نے بعض طواف کرنے والوں کو دیکھا ہے کہ وہ حجر اسود کو بوسہ دینے کے لیے اپنی خواتین کو آگے دھکیلتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ حجر اسود کو بوسہ دینا افضل ہے یا مردوں کی بھیڑ سے عورتوں کا دور رہنا؟

جواب سائل نے اگر یہ عجیب بات دیکھی ہے‘ تو میں نے اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز بات یہ دیکھی ہے کہ بعض لوگ فرض نماز میں سلام پھیرنے سے پہلے ہی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور حجر اسود کو بوسہ دینے کی کوشش میں دوڑ بھاگ کر جاتے ہیں اور اس طرح فرض نماز کو جو ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن ہے‘ ایک ایسے کام کی وجہ سے باطل کر لیتے ہیں‘ جو واجب نہیں ہے اور طواف کے بغیر مشروع نہیں ہے۔ یہ لوگوں کی جہالت مرکب ہے‘ جس پر جس قدر بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ حجر اسود کا بوسہ واستلام صرف طواف میں سنت ہے‘ طواف کے بغیر سنت نہیں ہے۔ اگر کسی کو معلوم ہے کہ طواف کے بغیر حجر اسود کا بوسہ واستلام سنت ہے‘ تو امید ہے کہ وہ ہمیں بھی اس کے بارے میں مطلع فرما دے گا‘ اللہ تعالیٰ اسے جزائے خیر سے نوازے۔

حجر اسود کو بوسہ دینا طواف میں مسنون ہے اور مسنون بھی اس صورت میں کہ اس سے طواف کرنے والے یا کسی دوسرے کو کوئی ایذا نہ پہنچے۔ اگر اس سے کسی دوسرے کو ایذا پہنچتی ہو تو پھر بوسے کے بجائے‘ دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے گا جسے رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لیے مشروع فرمایا ہے اور وہ یہ کہ انسان حجر اسود کو ہاتھ سے چھو لے اور ہاتھ کا بوسہ لے لے اور اگر اس میں بھی ایذا یا مشقت ہو تو پھر تیسرا طریقہ اختیار کیا جائے گا جس کی طرف رسول اللہ ﷺ نے ہماری رہنمائی فرمائی ہے اور وہ یہ کہ ہم حجر اسود کی طرف ایک ہاتھ سے‘ دونوں ہاتھوں سے نہیں‘ یعنی دائیں ہاتھ سے اس کی طرف اشارہ کریں اور اسے بوسہ نہ دیں۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت سے اسی طرح ثابت ہے۔ اگر اس طرح کی صورت حال درپیش ہو جیسی سائل نے ذکر کی ہے کہ انسان اپنی خواتین کو آگے دھکیلتا ہے تاکہ

وہ حجر اسود کو بوسہ دے سکیں تو ان خواتین میں کوئی حاملہ بھی ہو سکتی ہے، کوئی بڑھیا ہو سکتی ہے، کوئی ایسی دوشیزہ ہو سکتی ہے، جو دھکم پیل کو برداشت نہ سکتی ہو یا اس نے ہاتھ میں بچہ اٹھا رکھا ہو تو یہ تمام صورتیں بے حد معیوب ہیں کیونکہ اس طرح خواتین کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اور مردوں کے ساتھ مزاحمت ہے، نیز یہ تمام صورتیں حرام یا کم از کم مکروہ ہیں، لہٰذا کسی بھی آدمی کو اس طرح نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس کام میں کافی گنجائش ہے، آپ بھی اس گنجائش سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے آپ پر سختی نہ کریں کیونکہ اس طرح اللہ تعالیٰ بھی آپ پر سختی کرے گا۔

طواف مکمل کیے بغیر عمرہ صحیح نہیں

سوال ایک عورت نے اپنے شوہر کے ساتھ حج تمتع کیا، طواف عمرہ کے چھٹے چکر میں اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ یہ ساتواں چکر ہے اور پھر اس نے اپنی رائے پر اصرار بھی کیا تو کیا اس صورت میں اس عورت پر کچھ لازم ہوگا؟

جواب اگر اس عورت کو یقین تھا کہ یہ چھٹا چکر ہے اور پھر اس نے طواف مکمل نہ کیا تو اس کا عمرہ اب تک مکمل نہیں ہے کیونکہ طواف عمرے کا رکن ہے، اس کے بغیر عمرہ ممکن نہیں ہو سکتا اور اگر عمرے کے بعد یہ حج کا احرام باندھ لے تو اس کا حج قران ہوگا کیونکہ اس نے عمرے کی تکمیل سے قبل اس پر حج کو داخل کر دیا ہے۔ جب اس کا شوہر اصرار کر رہا تھا کہ یہ ساتواں چکر ہے تو اگر اس وقت اس عورت کو شک تھا تو پھر اس صورت میں اس پر کچھ لازم نہ ہوگا کیونکہ جب اسے شک ہو اور اس کے شوہر کو یقین ہو تو اس کے شوہر کا قول راجح ہوگا، لہٰذا عورت کو چاہیے کہ وہ اپنے شوہر کے قول کی طرف رجوع کرے۔ واللہ اعلم۔

مناسک حج وعمرہ ادا کرتے وقت زبانی دعائیں پڑھنا زیادہ بہتر ہے

سوال جب عمرہ یا حج کرنے والے کو بہت کم دعائیں یاد ہوں تو کیا وہ طواف وسعی اور دیگر مناسک کے موقع پر دعاؤں کی کتابوں سے دیکھ کر دعائیں پڑھ سکتا ہے؟

جواب حج یا عمرہ کرنے والے کے لیے وہ دعائیں ہی کافی ہیں، جو اسے یاد ہوں کیونکہ جب وہ ان دعاؤں کو پڑھے گا جو اسے یاد ہوں، تو وہ ان کے معنی بھی جانتا ہوگا، لہٰذا وہ حسب ضرورت دعائیں کرے گا اور اگر وہ کتاب سے ایسی دعائیں پڑھے یا مطوف (طواف کروانے والے) کے ساتھ ایسی دعائیں دوہرائے، جن کے معنی کو وہ نہ جانتا ہو تو ایسی دعاؤں سے اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ بہت سے لوگ مطوف کے ساتھ ساتھ دعائیں پڑھتے جاتے ہیں مگر انھیں ان دعاؤں کے معنی معلوم نہیں ہوتے جو مطوف پڑھتا ہے۔ اسی طرح بہت سے لوگ کتابوں سے دیکھ کر دعائیں پڑھتے ہیں اور انہیں ان کے معنی معلوم نہیں ہوتے، پھر ان کتابوں میں ہر چکر کی الگ الگ خاص دعائیں بھی لکھی ہوتی ہیں اور یہ سب دعائیں بدعت ہیں۔ مسلمانوں کے لیے انھیں استعمال کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ ساری دعائیں ضلالت ہیں۔ نبی ﷺ نے اپنی امت کے لیے طواف کے ہر چکر کی کوئی خاص دعا متعین نہیں فرمائی بلکہ آپ نے یہ فرمایا ہے:

«إِنَّمَا جُعِلَ الطَّوَافُ بِالْبَيْتِ، وَبِالصَّفَا وَالْمَرْوَةِ، وَرَمْيُ الْجِمَارِ لِإِقَامَةِ ذِكْرِ اللهِ»(سنن ابي

داود، المناسك، باب في الرمل، ح:١٨٨٨، وجامع الترمذي، الحج، باب ماجاء كيف ترمى الجمار، ح:٩٠٢، ومسند أحمد:٦/ ٦٤، واللفظ له)

"بیت اللہ کے طواف، صفا و مروہ کی سعی اور رمی جمرات کو اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔"

لہٰذا مومن کے لیے واجب ہے کہ وہ ان کتابوں سے پرہیز کرے، اپنی ضرورت و حاجت کے مطابق اللہ تعالیٰ سے دعا کرے اور استطاعت و علم کے مطابق اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے، تو یہ اس سے بہتر ہے کہ ان کتابچوں سے دیکھ کر ایسی دعائیں پڑھے جن کے معنی وہ جانتا ہی نہیں۔ معنی کو جاننا تو دور کی بات، شاید وہ ان کے الفاظ بھی نہیں پڑھ سکتا۔

مناسک حج کے لیے کوئی مخصوص دعائیں نہیں ہیں

سوال کیا طواف و سعی اور دیگر مناسک حج کے لیے کوئی مخصوص دعائیں بھی ہیں؟

جواب حج و عمرہ کی کوئی مخصوص دعا نہیں ہے بلکہ انسان جو چاہے دعا کر سکتا ہے، البتہ اگر نبی ﷺ سے ثابت دعاؤں کو پڑھے تو وہ زیادہ افضل و اکمل ہے، مثلاً رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان یہ دعا پڑھے:

«رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الآخِرَةِ حَسَنَةً، وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ»(سنن أبي داود، المناسك، باب الدعاء في الطواف، ح:١٨٩٣)

"اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور آخرت میں بھی نعمت بخش اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ فرما۔"

اسی طرح یوم عرفہ اور صفا و مروہ پر جو ذکر نبی ﷺ سے ثابت ہے، اسے اختیار کرنا افضل و اکمل ہے۔ پس سنت سے جو دعائیں اسے معلوم ہوں، انھیں اختیار کرے اور جو معلوم نہ ہوں تو اپنے ذہن کے مطابق جو دعائیں چاہے پڑھ لے لیکن ان دعاؤں کو پڑھنا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔ اس مناسبت سے میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ حج و عمرہ کرنے والوں کے ہاتھوں میں موجود کتابچوں میں طواف کے ہر چکر کی جو مخصوص دعائیں لکھی ہیں، یہ بدعت ہیں اور ان میں بہت سے مفاسد ہیں۔ انھیں پڑھنے والے سمجھتے ہیں کہ یہ نبی ﷺ سے مروی ہیں، لہٰذا وہ انہی معین الفاظ کے ساتھ طواف کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ انھیں پڑھتے تو ہیں مگر ان کے معنی نہیں جانتے اور ہر چکر کے لیے ایک دعا کو مخصوص کر لیتے ہیں۔ اور اگر چکر ختم ہونے سے پہلے دعا ختم ہو جائے، جیسا کہ مطاف میں ہجوم کے وقت ایسا ہوتا ہے، تو وہ چکر کے باقی حصے میں خاموش رہتے ہیں اور اگر دعا کے پورا ہونے سے پہلے چکر ختم ہو جائے تو باقی دعا ترک کر دیتے ہیں حتیٰ کہ اگر وہ (اللّٰھم) کے لفظ پر رکیں تو دعا کے باقی حصے کو نہیں پڑھتے۔ یہ سب نقصانات اس بدعت کی وجہ سے ہیں۔ اسی طرح ان کتابچوں میں مقام ابراہیم کی جو خاص دعا لکھی ہوتی ہے، وہ بھی نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ آپ جب مقام ابراہیم پر تشریف لائے تو آپ نے قرآن مجید کے یہ الفاظ پڑھے تھے:

﴿وَٱتَّخِذُوا۟ مِن مَّقَامِ إِبْرَٰهِـۧمَ مُصَلًّى﴾ (البقرة: ٢/ ١٢٥)

"جس مقام پر ابراہیم کھڑے ہوئے تھے اس کو نماز کی جگہ بنالو۔"

اور پھر آپ نے مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعتیں پڑھیں لیکن مقام ابراہیم ہی کی خاص دعا جو یہ لوگ پڑھتے اور نمازیوں کی نماز

میں خلل ڈالتے ہیں، دو وجہ سے منکر ہے: ① یہ دعا نبی ﷺ سے ثابت نہ ہونے کی وجہ سے بدعت ہے۔ ② یہ لوگ بلند آواز کے ساتھ اس دعا کو پڑھ کر مقام ابراہیم کے پیچھے نماز پڑھنے والوں کو ایذا پہنچاتے ہیں۔

ان کتابچوں میں حج وعمرہ کے جو طریقے لکھے ہوئے ہیں، ان میں سے اکثر وبیشتر باتیں کیفیت یا وقت یا جگہ کے تعین کے اعتبار سے بدعت ہیں، ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ سب کو ہدایت عطا فرمائے۔

نجاست لگے کپڑوں میں عمرہ کرنے کا حکم

سوال ایک شخص کو عمرے سے فراغت کے بعد معلوم ہوا کہ اس کے احرام کے کپڑوں کو نجاست لگی ہوئی ہے، تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جب انسان کو عمرے کا طواف اور سعی کرنے کے بعد معلوم ہو کہ اس کے احرام کے کپڑے کو نجاست لگی ہوئی ہے تو اس کا طواف وسعی اور عمرہ صحیح ہے کیونکہ جب انسان کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس کے کپڑے کو نجاست لگی ہوئی ہے یا معلوم تو ہو مگر وہ اسے دھونا بھول گیا ہو اور اس نے اسی کپڑے میں نماز پڑھ لی ہو تو اس کی نماز صحیح ہے۔ اسی طرح اس نے اگر اسی کپڑے میں طواف کر لیا ہو تو اس کا طواف بھی صحیح ہے اور اس کی دلیل حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ إِن نَّسِينَآ أَوْ أَخْطَأْنَا ﴾ (البقرة: ۲/ ۲۸۶)

”اے ہمارے پروردگار! اگر ہم سے بھول یا چوک ہو گئی ہو تو مؤاخذہ نہ کیجیے۔“

یہ دلیل عام قواعد شریعت میں سے ایک عظیم قاعدہ ہے اور اس مسئلے سے متعلق ایک دلیل خاص بھی ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو نماز پڑھائی اور آپ کا یہ طریقہ تھا کہ آپ اپنے جوتوں میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے، تو اس دن آپ نے نماز کے دوران میں اپنے جوتوں کو اتار دیا۔ آپ کو دیکھ کر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اپنے جوتوں کو اتار دیا۔ نماز مکمل کرنے کے بعد آپ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا:

«مَا شَأْنُكُمْ؟»

”تمھیں کیا ہوا؟“

انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم نے دیکھا کہ آپ نے جوتے اتار دیے ہیں تو ہم نے بھی اپنے جوتے اتار دیے۔ آپ نے فرمایا:

«إِنَّ جِبْرِيلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَتَانِي فَأَخْبَرَنِي أَنَّ فِيهِمَا قَذَرًا» (سنن أبي داود، الصلاة، باب الصلاة في النعال، ح: ٦٥٠)

”بے شک جبریل میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے جوتوں کو نجاست لگی ہوئی ہے۔“

اس موقع پر نبی ﷺ نے نماز کو از سر نو نہیں پڑھا تھا، حالانکہ آپ نے نماز کا ابتدائی حصہ انہی جوتوں کو پہنے ہوئے پڑھا تھا جن کو نجاست لگی ہوئی تھی۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص بھول جانے یا عدم واقفیت کی وجہ سے ناپاک کپڑے میں نماز پڑھ

لئے اس کی نماز صحیح ہے۔

یہاں ایک ضروری مسئلے کی طرف بھی توجہ دلائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اگر انسان اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد نماز پڑھنی شروع کردے اور وضو نہ کرے اور وہ یہ سمجھے کہ اس نے بکری کا گوشت کھایا ہے اور جب اسے یہ معلوم ہو کہ یہ گوشت بکری کا نہیں بلکہ اونٹ کا تھا‘ تو کیا وہ اپنی نماز دوہرائے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وضو کر کے نماز دوبارہ پڑھے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ جو شخص عدم واقفیت کی وجہ سے ناپاک کپڑے میں نماز پڑھ لے تو وہ نماز نہ دوہرائے اور جو عدم واقفیت کی وجہ سے اونٹ کا گوشت کھالے تو وہ نماز کو دوبارہ پڑھے؟ (ان دونوں میں کیا فرق ہے؟) ہم عرض کریں گے کہ یہ اس لیے ہے کہ ہمارے پاس ایک مفید اور اہم قاعدہ ہے اور وہ یہ کہ مامورات جہالت ونسیان کی وجہ سے ساقط نہیں ہوتے جب کہ منہیات جہالت ونسیان کی وجہ سے ساقط ہو جاتے ہیں۔ اس قاعدے کی دلیل نبی ﷺ کا یہ فرمان ہے:

«مَنْ نَسِيَ صَلاَةً أَوْ نَامَ عَنْهَا فَكَفَّارَتُهَا أَنْ يُصَلِّيَهَا إِذَا ذَكَرَهَا»(صحيح البخاري، المواقيت، باب من نسي صلاة فليصلها إذا ذكرها، ح:٥٩٧، وصحيح مسلم، المساجد، باب قضاء الصلاة الفائتة، ح:٦٨٤، ٣١٥، واللفظ له)

”جو شخص کسی نماز کو بھول جائے یا نماز پڑھنے کے وقت سو جائے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے جب یاد آئے‘ اسے پڑھ لے۔“

اسی طرح اگر کوئی ظہر یا عصر کی نماز میں دو رکعتوں کے بعد سلام پھیر دے اور باقی نماز بھول جائے‘ تو یاد آجانے پر اسے نماز مکمل کرنا ہوگی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مامورات نسیان کی وجہ سے ساقط نہیں ہوتے کیونکہ نبی ﷺ نے حکم دیا ہے کہ جو شخص نماز بھول جائے تو اس وقت پڑھ لے جب اسے یاد آئے‘ نسیان کی وجہ سے نماز ساقط نہ ہوگی۔ اسی طرح بھول کر کم پڑھنے کی صورت میں بھی باقی نماز ساقط نہ ہوگی بلکہ اسے پورا کرنا ہوگا۔ رہی اس بات کی دلیل کہ مامورات جہالت کی وجہ سے بھی ساقط نہیں ہوتے تو وہ یہ ہے کہ ایک شخص آیا اور اس نے جلدی جلدی نماز پڑھی اور پھر اس نے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا تو آپ نے اس سے فرمایا:

«اِرْجِعْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ»(صحيح البخاري، الأذان، باب وجوب القراءة، ح:٧٥٧، وصحيح مسلم، الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة، ح:٣٩٧)

”واپس جاؤ اور نماز پڑھو‘ تم نے نماز نہیں پڑھی۔“

اس طرح آپ نے اسے تین بار لوٹایا۔ وہ نماز پڑھنے کے بعد جب بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا‘ تو آپ اس سے یہی فرماتے:

«اِرْجِعْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ»(صحيح البخاري، الأذان، باب وجوب القراءة، ح:٧٥٧، وصحيح مسلم، الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة، ح:٣٩٧)

”واپس جاؤ اور نماز پڑھو‘ تم نے نماز نہیں پڑھی۔“

حتی کہ نبی ﷺ نے اسے نماز سکھائی اور پھر اس نے صحیح نماز ادا کی۔ اس شخص نے جہالت کی وجہ سے نماز کے ایک واجب کو ترک کیا تھا کیونکہ اس شخص نے عرض کیا تھا: ”اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ معبوث فرمایا ہے‘ میں اس سے زیادہ اچھے

طریقے سے نماز نہیں پڑھ سکتا، لہٰذا آپ مجھے نماز سکھا دیجیے۔'' اگر جہالت کی وجہ سے واجب ساقط ہوتا، تو نبی ﷺ اسے معذور سمجھتے۔ طالب علم کے لیے یہ ایک اہم اور مفید قاعدہ ہے۔

کیا مقام ابراہیم پر قدموں کا نشان صحیح ہے؟

سوال کیا مقام ابراہیم کا نشان، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کا نشان ہے یا نہیں؟

جواب بے شک مقام ابراہیم ثابت ہے اور جس جگہ پر شیشہ لگایا گیا ہے یہی مقام ابراہیم ہے لیکن اب قدموں کا نشان ظاہر نہیں ہے کیونکہ تاریخی اعتبار سے یہ بات معروف ہے کہ قدموں کا نشان عرصہ دراز سے مٹ گیا ہے اور اب اس جگہ کو صرف علامت کے طور پر باقی رکھا گیا ہے اور وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہی گڑھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کی جگہ ہے۔ اس مناسبت سے میں یہاں ایک مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ عمرہ و حج کرنے والے بعض لوگ مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر ایسی دعا پڑھتے ہیں، جو نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے اور بسا اوقات وہ یہ دعا پڑھتے بھی بہت بلند آواز سے ہیں جس سے مقام ابراہیم کے پیچھے طواف کی دو رکعتیں پڑھنے والوں کی نماز میں خلل پیدا ہوتا ہے، لہٰذا یاد رہے کہ مقام ابراہیم پر پڑھنے کی کوئی خاص دعا نہیں ہے۔ سنت یہ ہے کہ یہاں صرف دو ہلکی پھلکی رکعتیں پڑھ لی جائیں اور سلام پھیرنے کے بعد فوراً اٹھ جانا چاہیے تاکہ یہاں طواف کی دو رکعتیں پڑھنے والے دوسرے لوگوں کے لیے جگہ خالی کر دی جائے۔

غلافِ کعبہ کو تبرک کے لیے چھونا کیسا ہے؟

سوال کیا غلاف کعبہ کو چھونا جائز ہے؟

جواب غلاف کعبہ کو تبرک کے لیے چھونا بدعت ہے کیونکہ یہ نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما نے جب کعبہ کا طواف کیا تو انھوں نے بیت اللہ کے تمام ارکان کو چھونا شروع کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی مخالفت کی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بیت اللہ کی کوئی چیز بھی متروک نہیں ہے۔'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جواب دیا: ''رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی اسوہ حسنہ ہے۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ صرف دونوں یمانی رکنوں یعنی حجر اسود اور رکن یمانی ہی کو چھوا کرتے تھے۔'' یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کعبہ اور ارکان کعبہ کو چھونے کے بارے میں ہم صرف اسی پر عمل کریں جو سنت سے ثابت ہے اور سنت کے مطابق عمل ہی اسوہ حسنہ کے مطابق عمل ہے۔ حجر اسود اور دروازے کے درمیان والی جگہ ملتزم کے بارے میں بھی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے کہ انھوں نے یہاں کھڑے ہو کر اور ملتزم سے چمٹ کر دعا کی تھی۔ واللہ اعلم۔

عمرے میں بال کٹوانا افضل ہے یا منڈوانا؟

سوال عمرے میں بالوں کے منڈانے اور کٹوانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ ان میں سے کون سا عمل افضل ہے؟

جواب عمرے میں بالوں کو منڈوانا یا کٹوانا واجب ہے کیونکہ نبی ﷺ جب حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ تشریف لائے اور طواف وسعی

فرمالیا تو آپ نے ہر اس شخص کو حکم دیا جو قربانی کا جانور اپنے ساتھ نہیں لایا تھا کہ وہ بال کٹوا کر حلال ہو جائے۔ جب آپ نے انھیں بال کٹوانے کا حکم دیا اور اصول یہ ہے کہ امر وجوب کے لیے ہوتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بال ضرور کٹوانے چاہئیں۔ اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ غزوۂ حدیبیہ کے موقع جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو مکہ میں جانے سے روک دیا گیا تو نبی ﷺ نے انھیں حکم دیا تھا کہ وہ اپنے بال منڈوا دیں حتی کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے اس مسئلہ میں سستی کی وجہ سے نبی ﷺ نے ناراضی کا اظہار بھی فرمایا تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ عمرے میں بال کٹوانا افضل ہے یا بال منڈوانا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بال منڈوانا افضل ہے، البتہ وہ متمتع جو دیر سے آیا ہو تو اس کے حق میں بال کٹوانا افضل ہے تاکہ حج میں بالوں کو منڈوایا جا سکے۔

حج تمتع کے متعلق مسائل

سوال ایک تمتع کرنے والے حاجی نے عمرے کا طواف و سعی کیا اور پھر بالوں کے کٹوانے یا منڈوانے کے بغیر ہی اپنے معمول کے کپڑے پہن لیے اور اس نے اس کے بارے میں حج کے بعد پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ اس نے غلطی کی ہے، تو وہ اب کیا کرے؟

جواب اس شخص نے واجبات عمرہ میں سے ایک واجب یعنی حلق یا تقصیر کو ترک کر دیا ہے، لہٰذا اہل علم کے نزدیک اس کے لیے واجب ہے کہ فدیے کا ایک جانور مکہ میں ذبح کر کے وہاں کے فقرا میں تقسیم کر دے۔ اس کا حج تمتع اور عمرہ صحیح ہے۔

سوال جس نے حج تمتع کے لیے احرام باندھا ہو اور عمرے کے لیے بالوں کو کٹوایا یا منڈوایا نہ ہو اور دیگر تمام مناسک حج پورے کر لیے ہوں، تو اس پر کیا واجب ہے؟

جواب اس حاجی نے عمرے میں بالوں کو نہیں کٹوایا، حالانکہ بالوں کو کٹوانا واجبات عمرہ میں سے ہے۔ اہل علم کے نزدیک ترک واجب کی صورت میں دم واجب ہے اور وہ یہ کہ انسان مکہ میں ایک جانور ذبح کر کے وہاں کے فقرا میں تقسیم کر دے، لہٰذا اس حاجی کے لیے ہم یہ کہیں گے کہ اہل علم کے اس قول کے مطابق آپ پر یہ واجب ہے کہ آپ فدیے کا ایک جانور مکہ میں ذبح کر کے وہاں کے فقرا میں تقسیم کر دیں، اس سے آپ کا عمرہ اور حج مکمل ہو جائے گا اور اگر وہ شخص مکہ سے باہر چلا گیا ہو تو کسی دوسرے شخص سے یہ کہہ دے کہ وہ اس کی طرف سے فدیے کا جانور مکہ میں ذبح کر دے۔ واللہ الموفق!

سوال حج تمتع کرنے والے ایک حاجی کو قربانی کی استطاعت نہ تھی تو اس نے ایام حج میں تو تین روزے رکھ لیے لیکن باقی سات روزے نہ رکھے اور اس پر تین سال گزر گئے ہیں، اب وہ کیا کرے؟

جواب اس کیلئے لازم ہے کہ دس میں سے باقی سات روزے بھی رکھے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے توفیق عطا فرمائے۔

سوال جس شخص نے حج تمتع کی نیت سے عمرے کا احرام باندھا اور پھر اس نے حج نہ کرنے کا ارادہ کر لیا تو کیا اس پر کچھ لازم ہے؟

جواب اس پر کچھ لازم نہیں کیونکہ تمتع کرنے والا جب عمرے کا احرام باندھ لے اور اسے مکمل کر لے اور پھر حج کا احرام باندھنے سے پہلے حج نہ کرنے کا ارادہ کر لے تو اس پر کچھ لازم نہیں اِلاّ یہ کہ وہ نذر مان لے۔ اگر وہ یہ نذر مانے کہ وہ اس سال حج کرے گا، تو اس کے لیے نذر کو پورا کرنا واجب ہوگا اور اگر اس نے نذر نہ مانی ہو تو عمرہ کرنے کے بعد حج نہ کرنے کی وجہ سے اس پر کچھ لازم نہ

ہوگا۔ واللہ الموفق.

سوال جس شخص نے حج تمتع کا احرام باندھا اور عمرہ ادا کر لیا مگر جہالت کی وجہ سے احرام نہ کھولا حتی کہ اس نے قربانی کو ذبح کر دیا تو اس پر کیا لازم ہے؟ کیا اس کا حج صحیح ہے؟

جواب انسان کے لیے اس بات کو جاننا واجب ہے کہ جب اس نے حج تمتع کا احرام باندھا ہو اور وہ طواف وسعی کر لے تو سارے سر کے بال کٹوا دے اور احرام کھول دے، اس پر اسی طرح کرنا واجب ہے۔ پھر اگر وہ حالت احرام ہی میں رہے اور اس نے طواف عمرہ شروع کرنے سے پہلے حج کی نیت کی ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس صورت میں اس کا حج قران ہوگا اور اس کی قربانی حج قران کی قربانی ہوگی۔ اگر وہ ابھی تک عمرے کی نیت پر تھا حتی کہ اس نے طواف وسعی کر لی تو بہت سے اہل علم یہ کہتے ہیں کہ اس کا حج کا احرام باندھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ عمرے کا طواف شروع کرنے کے بعد حج کو عمرے پر داخل کرنا صحیح نہیں ہے جبکہ بعض اہل علم کی رائے یہ ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ یہ شخص جاہل تھا اس لیے میری رائے بھی یہی ہے کہ اس پر کچھ لازم نہیں اور ان شاء اللہ تعالیٰ اس کا حج صحیح ہے۔ واللہ الموفق.

عمرہ کرنے والا کہاں بال کٹوائے؟

سوال ایک شخص عمرہ کرتا ہے اور بال اپنے شہر میں کٹواتا ہے تو اس کے عمرے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اہل علم کا قول ہے کہ سر منڈوانا کسی جگہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اگر مکہ میں بال منڈوا لیے جائیں یا غیر مکہ میں تو اس میں کوئی حرج نہیں، البتہ یاد رہے کہ عمرے سے حلال ہونا بال منڈوانے پر موقوف ہے اور پھر سر منڈوانے کے بعد طواف وداع بھی ہوتا ہے، یعنی عمرے کی ترتیب اس طرح ہے: احرام، طواف، سعی، حلق یا تقصیر اور طواف وداع بشرطیکہ عمرہ ادا کرنے کے بعد انسان مکہ میں مقیم رہے۔ اگر عمرہ کے تمام افعال سرانجام دینے کے بعد وہ سفر کا ارادہ کر لے، تو پھر اس پر طواف وداع نہیں ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ مکہ میں مقیم ہونا چاہتا ہے، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ سر کے بال منڈوائے یا کٹوائے کیونکہ اس کے بعد اسے طواف وداع کرنا ہوگا اور اگر وہ طواف وسعی کے فوراً بعد اپنے شہر کی طرف روانہ ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ اپنے شہر میں جا کر بال منڈوا یا کٹوا لے لیکن بال منڈوانے یا کٹوانے تک وہ حالت احرام ہی میں ہوگا۔

تاخیر کی وجہ سے اذان فجر کے وقت مزدلفہ آنے کے متعلق حکم

سوال کچھ لوگ مزدلفہ کا راستہ بھول گئے اور جب وہ مزدلفہ کے قریب پہنچے تو رک گئے اور انہوں نے رات کے ایک بجے مغرب اور عشا کی نمازیں پڑھیں اور پھر وہ اذان فجر کے وقت مزدلفہ میں داخل ہوئے، تو کیا ان پر کچھ لازم ہے؟ فتویٰ عطا فرمائیں۔

جواب ان لوگوں پر کچھ لازم نہیں کیونکہ وہ اذان فجر کے وقت مزدلفہ میں داخل ہوئے اور انہوں نے صبح کی نماز یہاں اندھیرے میں ادا کی اور نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ شَهِدَ صَلاَتَنَا هٰذِهِ، وَوَقَفَ مَعَنَا حَتَّى يَدْفَعَ، وَقَدْ وَقَفَ بِعَرَفَةَ قَبْلَ ذٰلِكَ لَيْلاً أَوْ

نَهَارًا فَقَدْ تَمَّ حَجُّهُ وَقَضٰى تَفَثَهُ»(سنن أبي داود، المناسك، باب من لم يدرك عرفة، ح:١٩٥٠، وجامع الترمذي، الحج، باب ماجاء في من أدرك الإمام بجمع فقد أدرك الحج، ح:٨٩١، واللفظ له)

’’جو ہماری اس نماز میں شریک ہو جائے اور ہمارے ساتھ وقوف کر کے لوٹے اور اس سے پہلے رات یا دن کو کسی وقت اس نے عرفہ میں وقوف کر لیا ہو تو اس نے اپنے حج کو مکمل کر لیا اور اپنے میل کچیل کو دور کر دیا۔‘‘

البتہ انھوں نے یہ غلطی کی کہ نماز کو آدھی رات سے مؤخر کر دیا جب کہ عشا کی نماز کا وقت آدھی رات تک ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نبی اکرم ﷺ کی حدیث ثابت ہے۔

رمی جمار کے متعلق مسائل

سوال ایک عورت رات کے آخری حصے میں مزدلفہ سے لوٹی اور اس نے رمی جمار کے لیے اپنے بیٹے کو اپنی طرف سے وکیل مقرر کر دیا‘ حالانکہ وہ خود بھی رمی کر سکتی ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ فتویٰ دیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر و ثواب عطا فرمائے۔

جواب جمرات کو کنکریاں مارنا مناسک حج میں سے ہے کیونکہ نبی ﷺ نے اس کا حکم دیا اور آپ نے خود بھی کنکریاں ماریں اور آپ نے فرمایا ہے:

«إِنَّمَا جُعِلَ الطَّوَافُ بِالْبَيْتِ وَبِالصَّفَا وَالْمَرْوَةِ، وَرَمْيُ الْجِمَارِ لإِقَامَةِ ذِكْرِ اللهِ»(سنن أبي داود، المناسك، باب في الرمل، ح:١٨٨٨، وجامع الترمذي، الحج، باب ماجاء كيف ترمى الجمار، ح:٩٠٢، ومسند أحمد:٦/ ٦٤ واللفظ له)

’’بیت اللہ اور صفا و مروہ کا طواف اور رمی جمار کو اللہ تعالیٰ کا ذکر قائم کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔‘‘

جمرات کو کنکریاں مارنا عبادت ہے جس سے انسان اپنے رب تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے۔ یہ عبادت ہے کہ انسان اس جگہ ان کنکریوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے ذکر کے لیے پھینکتا ہے۔ پس یہ محض اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت پر مبنی ہے‘ اس لیے انسان کو نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ جمرات کو کنکریاں مارنی چاہییں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اول وقت رمی جمرات افضل ہے یا آخر وقت میں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر آخر وقت میں اطمینان‘ خشوع اور حضور قلب کے ساتھ کنکریاں مارنا ممکن ہو تو پھر آخر وقت میں افضل ہے کیونکہ اس خوبی کا نفس عبادت سے تعلق ہے اور جس چیز کا نفس عبادت سے تعلق ہو‘ وہ عبادت کے زمان و مکان سے مقدم ہوتی ہے‘ اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

«لاَ صَلاَةَ بِحَضْرَةِ الطَّعَامِ وَلاَ هُوَ يُدَافِعُهُ الأَخْبَثَانِ»(صحيح مسلم، المساجد، باب كراهة الصلاة بحضرة الطعام، ح:٥٦٠)

’’کھانے کی موجودگی میں نماز جائز ہے نہ اس وقت جب انسان کو بول و براز کا تقاضا ہو۔‘‘

چنانچہ انسان قضائے حاجت کی وجہ سے نماز کو اول وقت سے مؤخر کر دے گا یا جب کھانے کی ضرورت ہو اور کھانا موجود ہو تو اس وقت بھی نماز کو موخر کر دے گا اور پہلے کھانا کھائے گا۔ اب صورت یہ ہے کہ یا تو وہ اول وقت کنکریاں مارے‘ مشقت کے ساتھ

شدید ہجوم میں، جب کہ جان بچانے کی بھی فکر ہو، یا پھر اسے آخر وقت حتی کہ رات تک مؤخر کر دے اور اطمینان وحضور قلب کے ساتھ کنکریاں مارے تو یہ تاخیر کرنا افضل ہے۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے اپنے اہل خانہ کے کمزور افراد کو رخصت عطا فرما دی تھی کہ وہ رات کے آخری حصے میں مزدلفہ سے چلے جائیں تاکہ انھیں اس ہجوم کی وجہ سے تکلیف نہ ہو جو طلوع فجر کے بعد سب لوگوں کے جمع ہونے کی وجہ سے ہوگا۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ رمی جمار میں کسی کو وکیل بنانا جائز نہیں، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ۚ﴾ (البقرۃ: ۲/ ۱۹۶)

’’اور اللہ کی خوشنودی کے لیے حج اور عمرے کو پورا کرو۔‘‘

اس مسئلے میں مردوں اور عورتوں میں کوئی فرق نہیں، لہٰذا جب یہ بات واضح ہوگئی کہ رمی جمرات عبادت ہے اور جس مرد یا عورت کو اس کی قدرت ہو اس کے لیے کسی کو اپنی طرف سے نائب بنانا جائز نہیں بلکہ اس کے لیے واجب ہے کہ وہ خود کنکریاں مارے، البتہ اگر کوئی مرد یا عورت بیمار ہو یا کوئی عورت حاملہ ہو اور اس کے حمل کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اس کی طرف سے کسی کو وکیل مقرر کیا جا سکتا ہے۔ یہ عورت جس نے قدرت کے باوجود خود رمی نہیں کی، میری رائے میں اس کے لیے احتیاط یہ ہے کہ اس ترک واجب کی وجہ سے فدیے کا ایک جانور ذبح کر کے مکہ کے فقرا میں تقسیم کر دے۔

سوال ایک حاجی نے تیرہ تاریخ کو مشرق کی جانب سے جمرہ عقبہ کو کنکریاں ماریں مگر پتھر حوض میں نہیں گرا، تو کیا اس کے لیے تمام رمی دوبارہ لازم ہے؟

جواب اس کے لیے ساری رمی دوبارہ لازم نہیں ہے بلکہ صرف وہی لازم ہے جس میں اس نے غلطی کی، لہٰذا اسے فقط جمرہ عقبہ کی رمی دوبارہ کر کے درست طریقے سے رمی کرنی ہوگی۔ مشرق کی جانب سے کی گئی وہ رمی درست نہ ہوگی، جس کی کنکری حوض میں نہیں گرتی جو کہ رمی کی جگہ ہے۔ اگر وہ مشرقی جانب سے پل کے اوپر سے رمی کرتا تو وہ درست ہوتی کیونکہ اس طرح کنکری حوض ہی میں گرتی ہے۔

سوال اگر ماری گئی سات کنکریوں میں سے ایک یا دو حوض میں نہ گریں اور ایک یا دو دن گزر جائیں تو کیا وہ اس جمرہ کو دوبارہ رمی کرے؟ اور اگر دوبارہ رمی کرنا لازم ہو تو کیا وہ اس کے بعد والی کنکریاں بھی دوبارہ مارے؟

جواب جب جمرات میں سے ایک یا دو جمروں کی رمی باقی ہو یا زیادہ واضح طور پر یوں کہیے کہ کسی ایک جمرے کی ایک یا دو کنکریاں باقی ہوں، تو فقہا کہتے ہیں کہ اگر جمرے کی آخری کنکریاں ہوں تو وہ صرف کمی کو پورا کر لے۔ پہلی کنکریوں کو دوبارہ مارنا لازم نہ ہوگا اور اگر یہ آخری کنکری نہیں ہے، تو وہ کمی کو پورا کرے، پھر بعد والی کنکریاں بھی مارے۔

میرے نزدیک درست بات یہ ہے کہ وہ صرف کمی کو پورا کرے، بعد والی کنکریوں کا اعادہ لازم نہیں ہے کیونکہ جہالت یا نسیان کی وجہ سے ترتیب ساقط ہو جاتی ہے۔ اس شخص نے دوسری کنکری پھینکی ہے اور اس کا خیال ہے کہ پہلی کوئی کنکری اس کے ذمہ نہیں ہے اور یہ از راہ جہالت یا نسیان ہے، لہٰذا ہم اسے کہیں گے کہ جو کنکریاں کم ہیں وہ مار لو، بعد والی کنکریاں مارنا واجب نہیں ہے۔

جواب ختم کرنے سے پہلے میں اس طرف توجہ مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ کنکریاں وہاں پھینکنی ہوتی ہیں جو کنکریوں کے جمع ہونے کی جگہ ہے۔ اس ستون کو کنکریاں مارنا مقصود نہیں ہے جو جگہ کی نشان دہی کے لیے کھڑا کیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص کنکریاں

حوض میں پھینک دے اور وہ ستون کو نہ لگیں، تو اس کی رمی صحیح ہے۔ واللہ اعلم.

سوال کہا جاتا ہے کہ جس کنکری کو کسی نے پہلے استعمال کیا ہو، اس کے ساتھ رمی کرنا جائز نہیں، کیا یہ بات صحیح ہے؟ اس کی دلیل کیا ہے؟ جزاکم اللہ عن المسلمین خیراً.

جواب یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ جن لوگوں نے یہ بات کہی ہے کہ کسی کی پھینکی ہوئی کنکری کے ساتھ رمی کرنا جائز نہیں، انھوں نے اس کے حسب ذیل تین اسباب بیان کیے ہیں:

① انہوں نے کہا ہے کہ استعمال شدہ کنکری اس پانی کی طرح ہے جسے طہارت واجبہ کے لیے استعمال کیا گیا ہو اور طہارت واجبہ میں مستعمل پانی طاہر (پاک) تو ہوتا ہے لیکن مطہر (پاک کرنے والا) نہیں۔

② اس کی مثال اس غلام کی طرح ہے جسے آزاد کر دیا گیا ہو تو آزاد شدہ غلام کو دوبارہ کفارے وغیرہ کے طور پر آزاد کرنا جائز نہیں۔

③ جواز کے قول کی صورت میں لازم آتا ہے کہ تمام حاجی صرف ایک ہی کنکری کے ساتھ رمی کر لیں، یعنی آپ ایک کنکری پکڑ لیں اور اسے رمی کر دیں، پھر اسی کو پکڑ کر دوبارہ رمی کر دیں حتی کہ اسی طرح سات بار کر لیں، پھر دوسرا حاجی آئے اور وہ بھی اسی طرح اس کنکری کے ساتھ سات بار رمی کر لے۔

عدم جواز کے یہ تین اسباب، غور کرنے سے بے حد کمزور معلوم ہوتے ہیں۔

- ان میں سے پہلے سبب کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ دراصل یہ بات ہی درست نہیں کہ طہارت واجبہ میں مستعمل پانی طاہر تو ہوتا ہے لیکن مطہر نہیں کیونکہ اس کی کوئی دلیل نہیں اور پانی کو اس کے وصف اصلی یعنی طہوریت سے کسی دلیل کے بغیر خارج نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا واجب طہارت میں مستعمل پانی طاہر بھی ہے اور مطہر بھی، پس جب مقیس علیہ (جس پر قیاس کیا گیا ہے) یعنی اصل کے حکم ہی کی نفی ہو گئی، تو فرع کی از خود نفی ہو گئی۔

- دوسرا سبب جس میں پھینکی جانے والی کنکری کو آزاد شدہ غلام پر قیاس کیا گیا ہے تو یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ غلام کو جب آزاد کر دیا جائے، تو وہ آزاد ہوتا ہے، غلام نہیں، لہٰذا اب وہ غلام نہ رہا، جب کہ پتھر پھینکے جانے کے بعد بھی پتھر ہی رہتا ہے اور اس سے اس صفت کی نفی نہیں ہوتی جس کی وجہ سے وہ پھینکے جانے کے قابل ہوتا ہے، لہٰذا یہ غلام جو آزاد کردہ ہے، اگر کسی شرعی سبب کی وجہ سے دوبارہ غلام بنا لیا جائے تو اسے دوبارہ آزاد کرنا جائز ہے۔

- تیسرا سبب جس سے یہ لازم آتا ہے کہ تمام حجاج کرام ایک ہی کنکری کے پھینکنے پر اکتفا کریں، تو اس کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ اگر ایسا کرنا ممکن ہے، تو پھر ایسا ہو جانا چاہیے، لیکن یہ ممکن ہی نہیں، جب کنکریاں بکثرت موجود ہیں، تو کوئی ایسا کیوں کرے گا؟

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اگر جمرات کے پاس آپ کے ہاتھ سے ایک یا زیادہ کنکریاں گر جائیں، تو ان کے بدلے میں زمین سے اور کنکریاں لے لیں اور انہیں پھینک دیں، خواہ ظن غالب یہ ہو کہ ان کے ساتھ کسی نے رمی کی ہے یا ظن غالب نہ ہو۔

سوال جمرہ عقبہ کی رمی کا وقت ادا کب اور وقت قضا کب ختم ہوتا ہے؟

جواب جمرہ عقبہ کی رمی کا وقت عید کا دن ہے، جو گیارہویں دن کے طلوع فجر کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے اور کمزوروں اور لوگوں کی بھیڑ

کا مقابلہ نہ کر سکنے والوں کے لیے قربانی کی رات کے نصف سے شروع ہوتا ہے۔ ایام تشریق میں اس کی رمی کا وقت وہی ہے جو اس کے ساتھ والے دونوں جمروں کی رمی کا وقت ہے کہ وہ زوال سے شروع ہو کر، ساتھ والی رات کے طلوع فجر کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے، البتہ اگر ایام تشریق میں سے آخری دن ہو تو رات کو رمی جائز نہیں کیونکہ ایام تشریق تیرہویں تاریخ کے غروب آفتاب کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔ یاد رہے رمی دن کے وقت افضل ہے البتہ آج کل حاجیوں کی کثرت اور ایک دوسرے کی پروا نہ کرنے کی وجہ سے اگر ہلاکت یا نقصان یا شدید مشقت کا اندیشہ ہو تو پھر رات کو رمی کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں، بلکہ اس طرح کے کسی اندیشے کے بغیر بھی رات کو رمی کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن افضل یہ ہے کہ احتیاط کے پیش نظر رات کو رمی نہ کی جائے اِلّا یہ کہ کسی حاجت وضرورت کی وجہ سے ایسا کیا جائے۔ جہاں تک اس کے وقت قضا کا تعلق ہے، تو جب دوسرے دن کی فجر طلوع ہو جائے، تو وہ اس کا وقت قضا ہو گا۔

سوال کیا حاجی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ حج کی سعی، طواف افاضہ سے پہلے کر لے؟

جواب اگر حاجی مفرد یا قارن ہو تو اس کے لیے حج کی سعی، طواف افاضہ سے پہلے جائز ہے اسے وہ طواف قدوم کے بعد کر سکتا ہے، جیسا کہ نبیٔ اکرم ﷺ اور ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے کیا تھا، جو قربانی کے جانور اپنے ساتھ لائے تھے۔ اگر حاجی متمتع ہو تو اس پر دو سعی لازم ہیں: پہلی سعی مکہ مکرمہ میں آمد کے وقت اور یہ عمرے کی سعی ہوتی ہے، چنانچہ عمرے کے لیے وہ طواف کرتا سعی، کرتا اور بال کٹواتا ہے اور دوسری سعی حج کے لیے ہوتی ہے اور افضل ہے کہ یہ سعی طواف افاضہ کے بعد ہو کیونکہ سعی طواف کے بعد ہوتی ہے، تاہم اگر وہ اسے طواف سے پہلے کرے، تو راجح قول کے مطابق پھر بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ نبی ﷺ سے جب یہ سوال کیا گیا کہ میں نے طواف سے پہلے سعی کر لی ہے، تو آپ نے فرمایا تھا:

«لاَ حَرَجَ»(صحيح البخاري، الحج، باب إذا رمى بعد ما أمسى، ح:١٧٣٤، وصحيح مسلم، الحج، باب جواز تقديم الذبح على الرمي، ح:١٣٠٦، وسنن أبي داود، المناسك، باب في من قدم شيئًا ... ح:٢٠١٥، واللفظ له)

"کوئی حرج نہیں۔"

حاجی کو عید کے دن ترتیب کے ساتھ یہ پانچ کام کرنے ہوتے ہیں: ① جمرہ عقبہ کی رمی ② قربانی ③ بالوں کو منڈوانا یا کٹوانا ④ بیت اللہ کا طواف ⑤ صفا ومروہ کی سعی۔ اگر کوئی حاجی قارن یا مفرد ہو اور اس نے طواف قدوم کے بعد سعی کر لی ہو تو پھر اس پر دوبارہ سعی واجب نہیں ہے۔ افضل یہ ہے کہ مذکورہ بالا پانچوں کام ترتیب کے ساتھ کیے جائیں اور اگر ان میں سے بعض کو خصوصاً بوقت ضرورت پہلے کر لیا جائے، تو کوئی حرج نہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے رحمت اور آسانی ہے۔ فللّٰہ الحمد رب العالمین.

سوال کیا طواف سے پہلے سعی کا جواز صرف یوم عید کے ساتھ خاص ہے؟

جواب صحیح بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں عید اور غیر عید کے دن میں کوئی فرق نہیں۔ عید کے دن کے بعد بھی سعی کو طواف سے پہلے کرنا جائز ہے کیونکہ نبیٔ اکرم ﷺ سے جب ایک شخص نے یہ پوچھا کہ میں نے طواف سے پہلے سعی کر لی ہے، تو آپ نے فرمایا:

«لاَ حَرَجَ»(صحيح البخاري، الحج، باب إذا رمى بعد ما أمسى، ح:١٧٣٤، وصحيح مسلم، الحج،

باب جواز تقديم الذبح على الرمي، ح :١٣٠٦، سنن أبي داود، المناسك، باب في من قدم شيئا، ح :٢٠١٥ واللفظ له)

"کوئی حرج نہیں۔"

اور جب یہ حدیث عام ہے' تو پھر یوم عید اور اس کے بعد والے دن میں کوئی فرق نہیں۔

سوال جس شخص پر سعی لازم ہو' وہ طواف کر کے مکہ سے نکل جائے اور سعی نہ کرے اور اس کے بعد اسے بتایا جائے کہ اس پر تو سعی لازم ہے' تو کیا وہ صرف سعی کرے یا اس کے لیے دوبارہ طواف کرنا بھی لازم ہے؟

جواب جب کوئی انسان اس خیال سے طواف کرے کہ اس پر سعی لازم نہیں ہے اور پھر اسے بتایا جائے کہ اس پر سعی لازم ہے' تو وہ صرف سعی کر لے۔ اسے دوبارہ طواف کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ طواف و سعی میں ترتیب شرط نہیں ہے حتی کہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر بھی سعی کو طواف سے مؤخر کر دے' تو کوئی حرج نہیں' البتہ افضل یہ ہے کہ سعی طواف کے فوراً بعد کی جائے۔

تقصیر میں سارے سر کے بال کٹوانا ضروری ہے

سوال جو شخص عمرے میں اپنے سر کے تھوڑے سے حصے کے بال کٹوا دیتا ہے' اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب میری رائے میں اس کا عمل تقصیر (بال کٹوانا) مکمل نہیں' لہٰذا اس پر واجب ہے کہ وہ اپنے معمول کے کپڑے اتار دے' احرام کے کپڑے پہن لے' پھر صحیح طریقے سے سارے سر کے بال کٹوائے اور پھر حلال ہو۔ اس مناسبت سے میں اس طرف توجہ مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر وہ مومن جو اللہ تعالیٰ کے لیے کسی عبادت کو سرانجام دینے کا ارادہ کرے' اس کے لیے واجب ہے کہ وہ اس عبادت کے بارے میں ان حدود کو پہچانے' جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر نازل فرمایا ہے تاکہ وہ علی وجہ البصیرت اللہ تعالیٰ کی عبادت کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد ﷺ سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے:

﴿قُلْ هَٰذِهِۦ سَبِيلِىٓ أَدْعُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ ۚ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا۠ وَمَنِ ٱتَّبَعَنِى﴾ (يوسف: ١٢/١٠٨)

"کہہ دو میرا رستہ تو یہ ہے کہ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں (از روئے یقین و برہان) سمجھ بوجھ کر۔ میں بھی (لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں) اور میرے پیروکار بھی۔"

اگر کوئی انسان مکہ سے مدینہ کی طرف سفر کرنا چاہے' تو وہ اس وقت تک سفر کے لیے نہ نکلے جب تک رستے کے بارے میں نہ پوچھ لے۔ جب حسی راستوں کے بارے میں معلوم کرنا ضروری ہے' تو ان معنوی راستوں کے بارے میں کیوں معلوم نہ کیا جائے جو اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والے ہیں؟ تقصیر کے معنی یہ ہیں کہ سارے سر کے بال کٹوائے جائیں۔ اس سلسلے میں افضل یہ ہے کہ مشین استعمال کی جائے کیونکہ اس سے سارے سر کے بال کٹ جاتے ہیں' گو قینچی کے ساتھ بال کاٹنا بھی جائز ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے ساتھ سارے سر کے بال کاٹے جائیں۔ جیسے وضو میں سارے سر کا مسح ضروری ہے' ایسے ہی تقصیر میں بھی سارے سر کے بالوں کو کٹوانا ضروری ہے۔ واللہ اعلم.

رمی جمار کا صحیح وقت

سوال رمی جمار کا وقت کیا ہے؟

جواب جمرہ عقبہ کی رمی کا وقت عید کا دن ہے۔ اہل قدرت ونشاط کے لیے یہ وقت عید کے دن کے طلوع آفتاب سے شروع ہوتا ہے جب کہ کمزوروں اور بھیڑ کا مقابلہ نہ کر سکنے والے بچوں اور عورتوں کے لیے یہ وقت عید کی رات کے آخری حصے سے شروع ہو جاتا ہے۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا عید کی رات چاند کے غروب ہونے کا انتظار کیا کرتی تھیں۔ جب چاند غروب ہو جاتا' تو وہ مزدلفہ سے منیٰ آ جاتیں اور جمرہ کو رمی کرتیں۔ اس کا آخری وقت عید کے دن غروب آفتاب تک ہے۔ اگر ہجوم بہت زیادہ ہو یا انسان جمرات سے دور ہو اور وہ رمی کو رات تک مؤخر کرنا چاہے تو کوئی حرج نہیں' البتہ وہ گیارہویں تاریخ کی طلوع فجر تک اسے مؤخر نہ کرے۔ ایام تشریق یعنی گیارہ' بارہ اور تیرہ تاریخ کو رمی جمار کا وقت زوال آفتاب یعنی ظہر کا وقت شروع ہونے سے لے کر نصف رات تک ہے۔ اگر مشقت یا ہجوم ہو تو پھر رات کو طلوع فجر تک رمی کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ گیارہ' بارہ اور تیرہ تاریخ کو زوال سے پہلے رمی کرنا جائز نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے زوال کے بعد رمی کی اور آپ نے لوگوں سے فرمایا تھا:

«لِتَأْخُذُوا مَنَاسِكَكُمْ»(صحيح البخاري، العلم، باب الفتيا وهو واقف على الدابة وغيرها، ح:٨٣، وصحيح مسلم، الحج، باب استحباب رمي جمرة العقبة يوم النحر...، ح:١٢٩٧)

''تم اپنے مناسک حج سیکھ لو۔''

رسول اللہ ﷺ کا زوال آفتاب تک رمی کو مؤخر کرنا حالانکہ وہ سخت گرمی کا وقت ہوتا ہے اور دن کے ابتدائی حصے میں رمی نہ کرنا حالانکہ اس وقت گرمی بھی نہیں ہوتی اور آسانی بھی ہوتی ہے' اس بات کی دلیل ہے کہ اس وقت سے پہلے رمی کرنا حلال نہیں اور اس کی دوسری دلیل یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ زوال کے وقت نماز ظہر پڑھنے سے پہلے رمی فرمایا کرتے تھے۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ زوال سے پہلے رمی کرنا حلال نہیں ہے ورنہ زوال سے پہلے رمی افضل ہوتی تاکہ نماز ظہر کو اول وقت میں ادا کیا جا سکے کیونکہ نماز اپنے اول وقت میں افضل ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ ایام تشریق میں زوال سے پہلے رمی کرنا جائز نہیں ہے۔

اس بیمار شخص کے متعلق کیا حکم ہے جو نہ رمی کر سکا نہ طواف؟

سوال ایک شخص عرفہ کے دن بیمار ہو گیا جس کی وجہ سے اس نے منیٰ میں رات گزاری۔ نہ وہ رمی جمار کر سکا اور نہ طواف کر سکا' تو اس پر کیا لازم ہے؟

جواب اگر یہ شخص عرفہ کے دن اس قدر شدید بیمار ہو گیا کہ اس کے لیے حج کو مکمل کرنا ممکن نہ رہا' حالانکہ اس نے احرام باندھتے وقت یہ شرط عائد کی تھی کہ اگر مجھے کوئی روکنے والا روک لے' تو میں وہاں حلال ہو جاؤں گا' جہاں تو مجھے روک دے گا' تو وہ حلال ہو جائے اور اس پر کوئی فدیہ وغیرہ لازم نہ ہوگا' البتہ اگر یہ حج فرض ہو تو اسے کسی دوسرے سال ادا کرنا ہوگا اور اگر اس نے بوقت احرام مذکورہ بالا شرط عائد نہیں کی تھی تو راجح قول کے مطابق اگر اس کے لیے حج مکمل کرنا ممکن نہ ہو تو وہ حلال ہو جائے لیکن اس پر ھدی

(قربانی) واجب ہوگی کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ۚ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ﴾ (البقرة: ۲/ ۱۹۶)

''اور اللہ (کی خوشنودی) کے لیے حج اور عمرے کو پورا کرو اور اگر تم (راستے میں) روک دیے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو (کردو۔)''

اس کے الفاظ کہ ''اگر روک دیے جاؤ'' کے بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ یہ دشمن کی وجہ سے روک دیے جانے یا کسی اور وجہ سے روک دیے جانے سب کو شامل ہیں کیونکہ احصار کے معنی یہ ہیں کہ کوئی بھی رکاوٹ انسان کو حج کرنے سے روک دے' لہٰذا یہ مریض حلال ہو جائے اور ایک قربانی کر دے۔ اس کے علاوہ اور کچھ اس پر لازم نہیں اِلاَّ یہ کہ اگر اس نے اب تک فرض حج نہیں کیا' تو اسے اگلے سال حج کرنا ہوگا۔ اگر یہ مریض حج کے دنوں میں چلتا رہا اور اس نے مزدلفہ میں وقوف کیا لیکن اس نے منیٰ میں رات گزاری نہ جمرات کوری کی تو اس حال میں اس کا حج صحیح ہے لیکن پھر اس واجب کو ترک کرنے کی وجہ سے اس پر دم (خون) لازم ہوگا یعنی اس پر دو دم لازم ہیں' ایک منیٰ میں رات بسر نہ کرنے کی وجہ سے اور دوسرا جمرات کو ری نہ کرنے کی وجہ سے۔ جب اللہ تعالیٰ اسے صحت وعافیت عطا فرما دے' تو وہ طواف افاضہ کر لے کیونکہ راجح قول کے مطابق طواف افاضہ ماہ ذوالحجہ کے آخر تک کیا جا سکتا ہے اور اگر کسی عذر کی وجہ سے نہ کیا جا سکا ہو تو پھر طواف افاضہ عذر کے ختم ہونے تک کیا جا سکتا ہے۔

مزدلفہ سے باہر رات گزارنے والے کے متعلق حکم

سوال جو شخص حدود مزدلفہ کے نہ جاننے کی وجہ سے مزدلفہ سے باہر رات بسر کر لے' اس پر کیا لازم ہے؟

جواب اہل علم کے نزدیک اس شخص پر فدیہ لازم ہے' وہ ایک بکری ذبح کر کے مکہ مکرمہ کے فقرا میں تقسیم کر دے کیونکہ اس نے حج کے واجبات میں سے ایک واجب کو ترک کیا ہے۔ اس مناسبت سے میں اپنے حاجی بھائیوں کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ وہ عرفہ اور مزدلفہ کے حدود کو پہچانیں۔ بہت سے لوگ حدود عرفہ سے باہر ڈیرے ڈال لیتے ہیں اور غروب آفتاب تک وہیں رہتے ہیں اور پھر حدود عرفہ میں داخل ہوئے بغیر واپس چلے جاتے ہیں' لہٰذا ہر انسان کے لیے حدود عرفہ کو پہچاننا اور عرفہ کے اندر داخل ہونا ضروری ہے۔ حدود عرفہ کو نشانات کے ذریعے سے واضح کر دیا گیا ہے' لہٰذا ان کے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں۔

حج اِفراد کرنے والے پر طواف افاضہ کے بعد سعی لازم نہیں

سوال جس شخص کا حج مفرد ہو اور اس نے طواف قدوم کے بعد سعی کی ہو تو کیا وہ طواف افاضہ کے بعد سعی کرے؟

جواب اس پر طواف افاضہ کے بعد سعی لازم نہیں ہے۔ مفرد جب طواف قدوم کر لے' پھر اس کے بعد سعی بھی کر لے' تو یہ سعی حج کے لیے ہوگی' لہٰذا طواف افاضہ کے بعد اسے دوبارہ سعی کرنے کی ضرورت نہیں۔

قارن کے لیے ایک ہی طواف وسعی کافی ہے

سوال کیا حج قران کرنے والے کے لیے ایک طواف اور ایک سعی کافی ہے؟

جواب جب انسان حج قران کرے تو اس کے لیے حج وعمرہ دونوں کا ایک طواف اور ایک سعی ہی کافی ہے، طواف قدوم سنت ہوگا۔ اگر چاہے تو طواف قدوم کے بعد سعی بھی کر لے جیسا کہ نبی ﷺ نے کیا تھا اور اگر چاہے تو سعی کو عید کے دن طواف افاضہ کے بعد تک مؤخر کر دے لیکن افضل یہ ہے کہ پہلے کر لے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے سعی پہلے کی تھی۔ اس صورت میں عید کے دن وہ صرف طواف افاضہ کرے اور سعی نہ کرے کیونکہ اس نے سعی پہلے کر لی ہے اور اس بات کی دلیل کہ عمرہ وحج دونوں کے لیے ایک ہی طواف وسعی کافی ہے، رسول اللہ ﷺ کا حضرت عائشہ ؓ سے یہ فرمانا ہے جبکہ حضرت عائشہ ؓ کا حج قران تھا:

«طَوَافُكِ بِالْبَيْتِ وَبَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ يَكْفِيكِ لِحَجَّتِكِ وَعُمْرَتِكِ»(سنن أبي داود، المناسك، باب طواف القارن، ح:۱۸۹۷)

"تمہارا بیت اللہ کا طواف اور صفا ومروہ کی سعی، تمہارے حج وعمرہ کے لیے کافی ہے۔"

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا ہے کہ قارن کا طواف وسعی، اس کے حج وعمرہ دونوں کے لیے کافی ہے۔

رات کا زیادہ حصہ منیٰ میں بسر کیا جائے

سوال جو شخص بارہ بجے تک رات منیٰ میں گزارے اور پھر طلوع فجر کے بعد مکہ میں داخل ہو تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اگر بارہ بجے منیٰ میں آدھی رات کا وقت ہو تو پھر اس کے بعد منیٰ سے باہر نکلنے میں کوئی حرج نہیں اگرچہ رات دن منیٰ میں رہنا افضل ہے اور اگر بارہ بجے کا وقت آدھی رات سے پہلے ہو تو پھر منیٰ سے باہر نہیں نکلنا چاہیے کیونکہ منیٰ میں رات بسر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ رات کا زیادہ حصہ منیٰ ہی میں بسر کیا جائے جیسا کہ ہمارے فقہا نے ذکر فرمایا ہے۔

حاجی بارہ ذوالحجہ کو غروب سے پہلے منیٰ سے نکل سکتا ہے

سوال جب حاجی بارہ تاریخ کو غروب آفتاب سے قبل جلدی کی نیت سے منیٰ سے نکل جائے اور پھر غروب آفتاب کے بعد کسی کام سے اسے دوبارہ منیٰ میں واپس آنا پڑے تو کیا اسے جلدی کرنے والا شمار کیا جائے گا؟

جواب ہاں اسے جلدی کرنے والا شمار کیا جائے گا کیونکہ اس نے حج کو ختم کر دیا ہے اور کسی کام کی وجہ سے منیٰ میں دوبارہ واپس آنے کی نیت جلدی سے مانع نہیں ہے کیونکہ اس نے حج کے لیے نہیں بلکہ کسی کام کے لیے واپس آنے کی نیت کی ہے۔

تیرہ ذوالحجہ کو زوال سے پہلے رمی کرنا جائز نہیں

سوال سعودیہ سے باہر کے ایک حاجی کی واپسی کا وقت 13 ذوالحجہ کو چار بجے عصر کے قریب طے ہے۔ وہ بارہ تاریخ کو رمی کے بعد منیٰ سے باہر نہیں نکلا اور تیرھویں رات اسے منیٰ ہی میں گزارنی پڑی تو کیا اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ صبح کو رمی کر کے روانہ ہو جائے کیونکہ اگر اسے زوال کے بعد تک تاخیر ہو گئی تو وہ سفر نہیں کر سکے گا اور اسے بہت مشکل پیش آئے گی؟ اگر جواب عدم جواز کا ہے، تو کیا کسی رائے کے مطابق زوال سے پہلے رمی کرنا جائز ہے؟ راہنمائی فرمائیں۔ جزاکم اللہ عنا وعن المسلمین خیراً۔

جواب زوال سے پہلے اس کے لیے رمی کرنا جائز نہیں، البتہ اس حالت میں ضرورت کی وجہ سے اس سے رمی ساقط ہو جائے گی اور اس کے لیے فدیے کا ایک جانور منیٰ یا مکہ میں ذبح کرنا ہوگا یا وہ کسی کو جانور ذبح کرنے کے لیے اپنا وکیل مقرر کر دے، اس جانور کا گوشت فقرا میں تقسیم کر دیا جائے اور وہ طواف وداع کر کے چلا جائے۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ کیا کسی رائے کے مطابق زوال سے قبل رمی کرنا جائز ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں ایک رائے کے مطابق قبل از زوال رمی جائز ہے لیکن یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ عید کے بعد کے دنوں میں قبل از زوال رمی کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«لِتَأْخُذُوا مَنَاسِكَكُمْ»(صحيح البخاري، العلم، باب الفتيا وهو واقف على الدابة وغيرها، ح:٨٣، وصحيح مسلم، الحج، باب استحباب رمي جمرة العقبة يوم النحر . . .، ح:١٢٩٧)

’’اپنے حج کے احکام کو سیکھ لو۔‘‘

نبی اکرم ﷺ نے ان دنوں میں زوال کے بعد ہی رمی فرمائی تھی۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نبی ﷺ کا زوال کے بعد رمی کرنا مجرد فعل ہے اور مجرد فعل وجوب پر دلالت نہیں کرتا تو ہم عرض کریں گے کہ یہ صحیح ہے کہ مجرد فعل ہے اور مجرد فعل وجوب پر دلالت نہیں کرتا۔ اس کا مجرد فعل ہونا اس لیے ہے کہ نبی ﷺ نے زوال کے بعد رمی کی تھی اور یہ حکم نہیں فرمایا تھا کہ رمی زوال کے بعد ہو، نیز زوال سے پہلے رمی سے آپ نے منع نہیں فرمایا تھا۔ مجرد فعل کا وجوب کی دلیل نہ ہونا اس لیے ہے کہ وجوب تو اس صورت میں ہوتا ہے کہ کسی فعل کا حکم دیا گیا ہو یا کسی فعل کے ترک سے منع کیا گیا ہو لیکن ہم یہ عرض کریں گے کہ یہاں قرینہ موجود ہے کہ یہ فعل وجوب کے لیے ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا زوال تک رمی کو مؤخر کرنا اس کے وجوب کی دلیل ہے۔ اگر رمی قبل از زوال بھی جائز ہوتی تو نبی اکرم ﷺ ضرور قبل از زوال رمی فرماتے کیونکہ اس میں لوگوں کے لیے آسانی اور سہولت تھی اور نبی کریم ﷺ کو جب دو کاموں میں اختیار دے دیا جاتا تو آپ ان میں سے آسان کام کو اختیار فرمایا کرتے تھے۔ یہاں آپ نے اگر آسان کام یعنی رمی قبل از زوال کو اختیار نہیں فرمایا تو معلوم ہوا کہ یہ گناہ ہے۔ اس فعل کے وجوب کے لیے دوسری دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ زوال کے فوراً بعد نماز ظہر سے پہلے رمی فرمایا کرتے تھے، گویا آپ شدت سے زوال کا انتظار فرماتے تاکہ جلدی سے رمی کر لیں، اسی وجہ سے نماز ظہر کو بھی مؤخر کر دیتے، حالانکہ اسے اول وقت پر ادا کرنا افضل ہے۔ یہ سب کچھ زوال کے بعد رمی کرنے کے لیے تھا۔

فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ کا صحیح مفہوم

سوال جو شخص بارہویں دن یہ سمجھتے ہوئے رمی ترک کر دے کہ (قرآن میں) یہی جلدی مراد ہے اور پھر مکہ کو چھوڑ دے اور طواف وداع نہ کرے، تو اس کے حج کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اس کا حج صحیح ہے کیونکہ اس نے ارکان حج میں سے کسی رکن کو ترک نہیں کیا، البتہ اگر اس نے بارہویں رات منیٰ میں نہیں گزاری، تو اس طرح تین واجبات ترک کر دیے، جو حسب ذیل ہیں: ① بارہویں رات منیٰ میں بسر کرنا ② بارہویں دن رمی جمار کرنا ③ طواف وداع۔ اس پر واجب ہے کہ ان میں سے ہر واجب کی طرف سے مکہ میں جانور ذبح کرے اور اسے فقرا میں تقسیم کر دے

کیونکہ حج کے بارے میں اہل علم کے نزدیک یہ واجب ہے کہ جب وہ حج کے کسی واجب کو ترک کر دے، تو اس کے فدیے کے طور پر مکہ میں ایک جانور ذبح کر کے اسے فقرا میں تقسیم کر دے۔ اس سائل نے جس غلطی کا ارتکاب کیا ہے اس کے حوالے سے میں اپنے حاجی بھائیوں کی اس طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ بہت سے حاجی یہ سمجھتے ہیں کہ:

﴿ فَمَن تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ ﴾ (البقرة: ۲/ ۲۰۳)

"پھر جس نے دو دنوں میں (منی سے مکہ کی طرف واپسی کے لیے) جلدی کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔"

کا مفہوم یہ ہے کہ وہ گیارہویں دن ہی منیٰ سے نکل جائے یعنی وہ دو دن سے عید کا دن اور گیارہویں تاریخ کا دن مراد لیتے ہیں حالانکہ یہ غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ ۞ وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ ﴾ (البقرة: ۲/ ۲۰۳)

"اور (قیام منیٰ کے) دنوں میں (جو) گنتی کے (دن ہیں) اللہ کو یاد کرو، پھر جس نے دو دنوں میں (منی سے مکہ کی طرف واپسی کے لیے) جلدی کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔"

﴿أیام معدودات﴾ "گنتی کے دنوں" سے مراد ایام تشریق ہیں، جن میں پہلا دن گیارہویں تاریخ ہے لہٰذا اس صورت میں اس آیت:

﴿ فَمَن تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ ﴾ (البقرة: ۲/ ۲۰۳)

"پھر جس نے دو دنوں میں (منی سے مکہ کی طرف واپسی کے لیے) جلدی کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔"

کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایام تشریق کے دو دنوں میں جلدی کر لے اور دوسرا دن بارہویں تاریخ کا دن ہے، لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لے تاکہ غلطی نہ کرے۔

رات کے وقت منیٰ میں جگہ نہ ملنے پر انسان کیا کرے؟

سوال جو شخص رات کے وقت منیٰ میں آئے اور جگہ نہ پائے اور نصف رات منیٰ میں گزارنے کے بعد حرم میں چلا جائے، تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اس کا حکم یہ ہے کہ اگرچہ یہ عمل جائز ہے لیکن اس طرح کرنا نہیں چاہیے کیونکہ حاجی کو ایام تشریق میں رات دن منیٰ میں رہنا چاہیے۔ اگر منیٰ میں جگہ نہ ملے تو آخری خیمہ کے ساتھ ڈیرہ ڈال لے، خواہ وہ جگہ منیٰ سے باہر ہو بشرطیکہ پوری طرح تلاش کرنے کے باوجود منیٰ میں جگہ نہ ملے۔ ہمارے زمانے کے بعض اہل علم نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اگر انسان کو منیٰ میں جگہ نہ ملے، تو اس سے منیٰ میں رات بسر کرنے کا حکم ساقط ہو جاتا ہے اور اس کے لیے جائز ہے کہ وہ مکہ میں یا کسی بھی دوسری جگہ رات بسر کر لے۔ انہوں نے اسے اعضائے وضو میں سے کسی ایک عضو کے مفقود ہونے پر قیاس کیا ہے کہ جس طرح اس کا دھونا ساقط ہو جاتا ہے، اسی طرح منیٰ میں رات بسر کرنا ساقط ہو جاتا ہے لیکن یہ موقف محل نظر ہے کیونکہ وہ عضو جس سے حکم طہارت متعلق ہے، وہ تو موجود ہی نہیں

جب کہ منیٰ میں رات بسر کرنے کے حکم سے مقصود یہ ہے کہ سب لوگ امت واحدہ بن کر اجتماعیت کا مظاہرہ کریں' لہٰذا انسان کو چاہیے کہ منیٰ میں جگہ نہ ملنے کی صورت میں وہ آخری خیمے کے پاس رات گزار لے تاکہ وہ حاجیوں کے ساتھ مل کر رہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ جب مسجد بھر جائے تو لوگ مسجد کے اردگرد نماز پڑھنا شروع کر دیں لیکن ضروری ہے کہ صفیں باہم ملی ہوں تاکہ نمازی ایک جماعت ہوں۔ یہ ہے منیٰ میں رات بسر کرنے کی نظیر جب کہ کٹا ہوا ہاتھ اس کی نظیر نہیں ہے۔

حج یا عمرہ کرنے والا کوچ سے پہلے آخری وقت بیت اللہ میں گزارے

سوال ایک شخص نے صبح طواف وداع کیا' پھر سو گیا اور اس نے عصر کے بعد سفر کا ارادہ کیا' تو کیا اس پر کچھ لازم ہے؟

جواب عمرے اور حج کی صورت میں دوبارہ طواف وداع کرنا اس کے لیے لازم ہے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«لاَ يَنْفِرَنَّ أَحَدٌ حَتَّى يَكُوْنَ آخِرُ عَهْدِهِ بِالْبَيْتِ»(صحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع وسقوطه عن الحائض، ح:١٣٢٧)

''کوئی شخص کوچ نہ کرے حتی کہ وہ آخری وقت بیت اللہ میں گزار لے۔''

آپ نے یہ بات حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمائی تھی' لہٰذا طواف وداع کے وجوب کی ابتدا اسی وقت سے ہے۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے پہلے عمرہ ادا فرمایا تھا مگر یہ ثابت نہیں کہ واپسی کے وقت آپ نے طواف وداع بھی فرمایا ہو کیونکہ طواف وداع تو حجۃ الوداع کے موقع پر واجب ہوا ہے اور نبیٔ اکرم ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے:

«اِصْنَعْ فِي عُمْرَتِكَ مَا أَنْتَ صَانِعٌ فِي حَجِّكَ»(صحيح البخاري، الحج، باب غسل الخلوق ثلاث مرات، ح:١٥٣٦، وصحيح مسلم، الحج، باب ما يباح للمحرم بحج أو عمرة، ح:٢٧٩٨، ١١٨٠، ٦)

''اپنے عمرے میں بھی تم اس طرح کرو جس طرح تم اپنے حج میں کرتے ہو۔''

یہ حکم عام ہے لیکن اس سے وقوف' منیٰ میں رات بسر کرنا اور رمی مستثنیٰ ہیں کیونکہ یہ احکام بالاتفاق حج کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر احکام عام ہیں کیونکہ نبی ﷺ نے عمرہ کو حج اصغر کے نام سے بھی موسوم فرمایا ہے جیسا کہ حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کی اس طویل اور مشہور حدیث میں ہے'① جسے علماء نے قبولیت سے نوازا ہے' گو یہ حدیث مرسل ہے لیکن علماء کے قبولیت سے نوازنے کی وجہ سے صحیح ہے' نیز اس لیے بھی کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ﴾ (البقرة:٢/١٩٦)

''اور حج اور عمرے کو اللہ (کی خوشنودی) کے لیے پورا کرو۔''

لہٰذا طواف وداع کا تعلق اگر اتمام حج سے ہے' تو اتمام عمرہ سے بھی ہے اور پھر اس لیے بھی کہ عمرہ کرنے والا یہ شخص مسجد الحرام میں طواف کے ساتھ داخل ہوا تھا' لہٰذا اسے یہاں سے جاتے وقت بھی طواف کرنا چاہیے۔ بہرحال حج کی طرح عمرے میں بھی طواف

---

① سنن الدارقطنی: 285/2

وداع واجب ہے اور ایک اور حدیث میں ہے:

«مَنْ حَجَّ هٰذَا الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلْيَكُنْ آخِرُ عَهْدِهِ بِالْبَيْتِ»(سنن أبي داود، المناسك، باب في الوداع، ح:٢٠٠٢، وجامع الترمذي، الحج، باب ماجاء من حج أو اعتمر فليكن آخر عهده بالبيت، ح:٩٤٦)

''جو شخص اس گھر کا حج یا عمرہ کرے' اسے آخری وقت بیت اللہ میں گزارنا چاہیے۔''

لیکن یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ یہ حجاج بن ارطاۃ کی روایت ہے۔ اگر یہ روایت ضعیف نہ ہوتی' تو اس مسئلے میں یہ نص قطعی ہوتی لیکن ضعیف ہونے کی وجہ سے یہ روایت نا قابل استدلال ہے' البتہ وہ اصول جو ہم نے ابھی ابھی بیان کیے ہیں' وہ اس بات کی دلیل ہیں کہ عمرے میں بھی طواف وداع واجب ہے اور احتیاط بھی اسی میں ہے کیونکہ عمرے میں جب آپ طواف وداع کریں گے' تو کوئی یہ نہیں کہے گا کہ آپ نے غلطی کی ہے لیکن اگر آپ طواف وداع نہیں کریں گے' تو جس کے نزدیک طواف وداع واجب ہے' وہ ضرور یہ کہے گا کہ آپ نے غلطی کی ہے' طواف وداع کرنے والا ہر حال میں صحیح ہے' جب کہ طواف نہ کرنے والا بعض اہل علم کے بقول خطا کار ہے۔

عمرہ کرنے والے کے لیے طواف وداع کا حکم

سوال عمرہ کرنے والے کے لیے طواف وداع کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اگر مکہ میں عمرے کے لیے آنے والے کی نیت یہ ہو کہ وہ طواف' سعی' حلق یا تقصیر کرے گا اور واپس چلا جائے گا' تو اس صورت میں اس پر طواف وداع نہیں ہے کیونکہ اس کے حق میں طواف قدوم ہی طواف وداع کے قائم مقام ہے اور اگر وہ مکہ میں رہے تو پھر راجح بات یہ ہے کہ واپسی پر اس کے لیے طواف وداع واجب ہوگا اور اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

① نبی کریم ﷺ کے حسب ذیل فرمان کے عموم کا یہی تقاضا ہے:

«لَا يَنْفِرَنَّ أَحَدٌ حَتّٰى يَكُونَ آخِرُ عَهْدِهِ بِالْبَيْتِ»(صحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع وسقوطه عن الحائض، ح:١٣٢٧)

''کوئی شخص اس وقت تک سفر نہ کرے جب تک آخری وقت بیت اللہ میں نہ گزارے۔''

اس حدیث میں [اَحَدٌ] کا لفظ نکرہ ہے اور نہی (ممانعت) کے سیاق میں ہے' لہٰذا یہ عام ہے اور مکہ سے جانے والے ہر شخص کیلئے ہے۔

② عمرہ حج کی طرح ہے بلکہ نبی ﷺ نے اس کا نام حج اصغر رکھا ہے جیسا کہ حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث میں ہے' جسے امت نے قبولیت سے نوازا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«وَالْعُمْرَةُ هِيَ الْحَجُّ الْأَصْغَرُ»(سنن الدارقطني: ٢/ ٢٨٥ رقم: ١٢٢)

''اور عمرہ حج اصغر ہے۔''

③ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّ الْعُمْرَةَ قَدْ دَخَلَتْ فِي الْحَجِّ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ»(صحيح مسلم، الحج، باب جواز العمرة في

أشهر الحج، ح: ۳۰۱٤، ۱۲٤۱، ۲۰۳)

”بے شک عمرہ قیامت کے دن تک حج میں داخل ہوگیا ہے۔“

④ نبی اکرم ﷺ نے حضرت یعلیٰ بن امیہ ؓ سے فرمایا تھا:

«اِصْنَعْ فِي عُمْرَتِكَ مَا أَنْتَ صَانِعٌ فِي حَجِّكَ»(صحيح البخاري، الحج، باب غسل الخلوق ثلاث مرات، ح: ۱۵۳٦، وصحيح مسلم، الحج، باب ما يباح للمحرم بحج أو عمرة، ح: ۲۷۹۸، ۱۱۸۰، ٦)

”اپنے عمرہ میں بھی اسی طرح کرو‘ جس طرح تم اپنے حج میں کرتے ہو۔“

اس سے صرف وہی امور خارج ہیں‘ جن کے خارج ہونے پر علماء کا اجماع ہے مثلاً عرفہ کا وقوف‘ مزدلفہ میں رات بسر کرنا‘ منیٰ میں رات بسر کرنا اور رمی جمار کہ یہ امور بالا جماع عمرہ میں نہیں ہیں۔ بہر حال انسان جب طواف کر لے تو وہ زیادہ بری الذمہ ہوگا اور زیادہ محتاط ہوگا۔ واللہ الموفق.

محصور کے بارے میں کیا حکم ہے؟

سوال ایک شخص نے میقات سے حج کا احرام باندھا لیکن جب وہ مکہ پہنچا تو انکوائری آفس نے اسے منع کر دیا کیونکہ اس کے پاس پروانۂ حج نہ تھا‘ تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جب اس کے لیے مکہ میں داخل ہونا مشکل ہے‘ تو اس حال میں اس کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ محصور ہے‘ وہ احصار کی جگہ پر قربانی کو ذبح کر دے اور احرام کھول کر حلال ہو جائے۔ اگر اس کا یہ حج فرض تھا‘ تو اسے بعد میں پہلے حکم کے تحت ہی ادا کرنا پڑے گا‘ قضا کے طور پر نہیں اور اگر اس کا یہ حج فرض نہیں تھا تو پھر راجح قول کے مطابق اس پر کچھ لازم نہیں ہے کیونکہ جو صحابۂ کرام ؓ غزوۂ حدیبیہ کے موقع پر مکہ میں داخل ہونے سے روک دیے گئے تھے‘ نبی اکرم ﷺ نے انھیں اس عمرہ کی قضا کا حکم نہیں دیا تھا۔ محصور کے لیے وجوب قضا کا حکم کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے‘ ثابت صرف یہ حکم ہے:

﴿فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ (البقرة: ۲/ ۱۹٦)

”اور اگر رستے میں روک لیے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو کر دو۔“

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اور کسی چیز کا ذکر نہیں فرمایا۔ یاد رہے اسے عمرۃ القضا کے نام سے موسوم اس لیے کیا گیا کہ اس میں نبی اکرم ﷺ نے قریش سے معاہدہ فرمایا تھا۔ قضا کا لفظ یہاں معاہدے کے معنی میں ہے‘ فوت ہو جانے والی چیز کے استدراک کے معنی میں نہیں ہے۔ واللہ اعلم.

حج کا قصد کر کے جانے والے شخص کے متعلق حکم

سوال جو شخص حج کا قصد کرے اور پھر اس سے رک جائے‘ تو اس کے لیے کیا لازم ہے؟

جواب اگر اس نے احرام نہ باندھا ہو تو اس حال میں اس کے لیے کچھ لازم نہ ہوگا کیونکہ انسان نے جب تک احرام نہ باندھا ہو‘ اس کی مرضی ہے چاہے تو سفر جاری رکھے اور چاہے تو اپنے گھر واپس آجائے‘ البتہ اگر حج فرض ہو تو واجب ہے کہ اسے جلد ادا کرے۔ اگر کوئی رکاوٹ ہو تو اس پر کچھ لازم نہیں۔ اگر رکاوٹ احرام کے بعد پیش آئے اور بوقت احرام اس نے یہ شرط عائد کی ہو کہ اگر مجھے کوئی رکاوٹ پیش آگئی تو میں وہاں حلال ہو جاؤں گا جہاں تو مجھے روک دے گا تو وہ احرام کھول کر حلال ہو جائے گا اور اس پر کچھ لازم نہیں ہوگا اور اگر اس نے ایسی کوئی شرط عائد نہیں کی اور رکاوٹ دور ہونے کی اسے جلد امید ہو تو وہ رکاوٹ دور ہو جانے کا انتظار کرے اور پھر اپنے حج کو پورا کرلے۔ اگر وقوف عرفہ سے قبل رکاوٹ دور ہو جائے تو وہ عرفہ میں وقوف کرلے‘ اس کا حج پورا ہو جائے گا اور اگر رکاوٹ وقوف عرفہ کے بعد دور ہو اور وہ عرفہ میں وقوف نہ کرسکا ہو تو اس کا حج فوت ہو گیا‘ وہ عمرہ کرے اور حلال ہو جائے۔ اگر حج فرض ہو تو آئندہ سال اس کی قضا ادا کرے۔ اگر اسے رکاوٹ کے جلد دور ہونے کی امید نہ ہو تو احرام کھول کر حلال ہو جائے اور قربانی کا جانور ذبح کردے کیونکہ حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ کے عموم کا یہی تقاضا ہے:

﴿ وَأَتِمُّوا۟ ٱلْحَجَّ وَٱلْعُمْرَةَ لِلَّهِ ۚ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا ٱسْتَيْسَرَ مِنَ ٱلْهَدْىِ ۖ ﴾ (البقرۃ: ۲/ ۱۹۶)

’’اور اللہ (کی خوشنودی) کیلئے حج اور عمرے کو پورا کرو اور اگر (راستے میں) روک لیے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو (کردو۔)‘‘

گناہوں سے حج کا اجروثواب کم ہو جاتا ہے

سوال کیا گناہوں سے حج کا اجروثواب کم ہو جاتا ہے؟

جواب گناہوں سے حج کا اجروثواب بالکل کم ہو جاتا ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَمَن فَرَضَ فِيهِنَّ ٱلْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِى ٱلْحَجِّ ۗ ﴾ (البقرۃ: ۲/ ۱۹۷)

’’تو جو شخص ان مہینوں میں حج کی نیت کرلے تو حج (کے دنوں) میں عورتوں سے اختلاط کرے نہ کوئی برا کام کرے اور نہ کسی سے جھگڑے۔‘‘

بلکہ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ گناہ سے حج فاسد ہو جاتا ہے کیونکہ حج میں گناہ سے منع کردیا گیا ہے لیکن جمہور اہل علم کے نزدیک معروف قاعدہ یہ ہے کہ اگر حرمت کا تعلق بطور خاص کسی عبادت سے نہ ہو تو اس سے وہ عبادت باطل نہیں ہوتی۔ گناہوں کی حرمت احرام ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ وہ تو احرام اور غیر احرام ہر حال میں حرام ہیں‘ لہٰذا درست بات یہی ہے کہ گناہوں سے حج باطل تو نہیں ہوتا‘ البتہ اس سے اجروثواب میں کمی ضرور واقع ہو جاتی ہے۔

جعلی پاسپورٹ پر حج کرنے والے کے متعلق کیا حکم ہے؟

سوال جو شخص سفر حج کے لیے جعلی پاسپورٹ استعمال کرے‘ اس کے حج کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اس کا حج صحیح ہے کیونکہ پاسپورٹ کا جعلی ہونا حج پر اثر انداز نہیں ہوتا' البتہ وہ اس سے گناہ گار ضرور ہوگا۔ اسے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرنی چاہیے اور پاسپورٹ پر اپنا صحیح نام استعمال کرنا چاہیے تاکہ ذمہ دار لوگوں کو کوئی پریشانی نہ ہو اور ناموں کے اختلاف کی وجہ سے اس کے حقوق ساقط نہ ہوں۔ اس طرح وہ باطل طریقے سے مال کھاتا اور نام بدلنے کی وجہ سے جھوٹ کا مرتکب بھی ہوتا ہے۔ اس مناسبت سے میں اپنے بھائیوں کو یہ نصیحت بھی کرنا چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کا یہ معاملہ کوئی چھوٹا نہیں ہے جو حکومت کی اعانت سے استفادہ کرنے کے لیے یا دیگر امور کے لیے جھوٹے اور جعلی نام استعمال کرتے ہیں کیونکہ یہ معاملات میں خرابی' جھوٹ' دھوکا اور ذمہ دار حکام کو مبتلائے فریب کرنا ہے۔ اس بات کو ہر وقت خوب یاد رکھنا چاہیے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈر جائے' اللہ تعالیٰ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا رستہ بنا دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے رزق عطا فرماتا ہے' جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کو اختیار کرلے' اللہ تعالیٰ اس کے کام کو آسان کر دیتا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈر جائے اور سیدھی اور سچی بات کہے' تو اللہ تعالیٰ اس کے عمل کو درست اور اس کے گناہ کو معاف فرما دیتا ہے۔

* * *

المکتبہ
99۔ جے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
نمبر.....17566.....

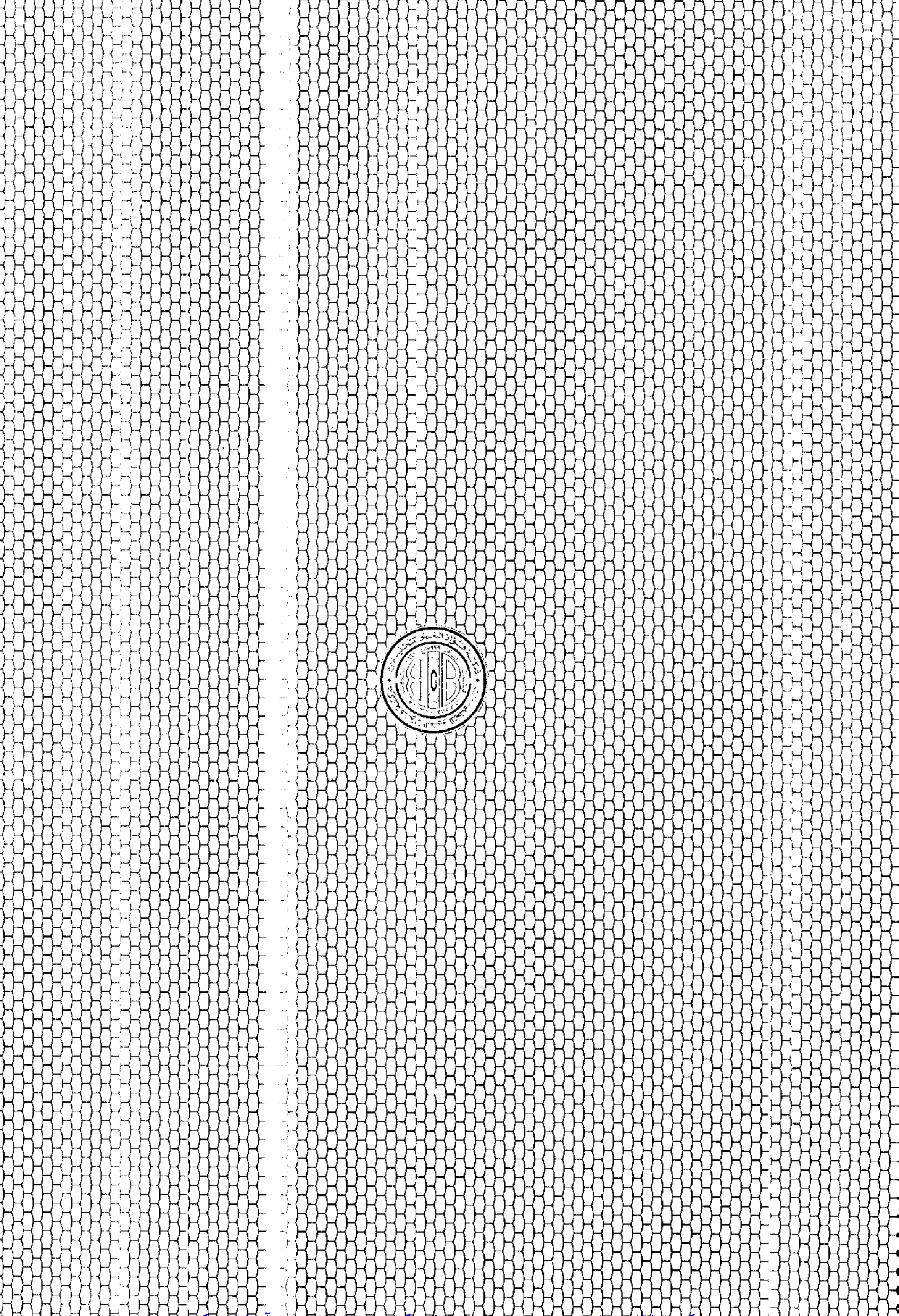

علوم وفنون اسلامیہ میں فتاویٰ کی نوعیت اور حیثیت ایک امتیازی درجہ رکھتی ہے۔ فتاویٰ کی اصطلاح ان مسائل ومشکلات کے ضمن میں استعمال کی جاتی ہے جہاں کسی بندہ مسلم کو زندگی اور کائنات کے کسی موضوع پر ایسی رہنمائی اور روشنی مطلوب ہو جس میں کتاب وسنت کا نقطۂ نظر نمایاں ہو کر سامنے آجائے۔ اس اعتبار سے خود قرآن مجید بھی احکام ونصوص کے تناظر میں فتاویٰ کی اولین کتاب ہے، جس کی تشریح وتوضیح کے ضمن میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث بھی اپنے مزاج اور ہیئت کے لحاظ سے فتاویٰ کا درجہ رکھتی ہیں۔ آپ کے فتاویٰ کو ہی یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ جامع احکام اور فصل خطاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پیش نظر فتاویٰ کی کتاب جو ”فتاویٰ ارکان اسلام“ کے عنوان سے شائع کی جارہی ہے، اس میں عقائد وعبادات کے بارے میں مخصوص سوالات اور مشکلات کے ایسے جواب فراہم کیے گئے ہیں، جن سے کتاب وسنت اور ادلۂ شرعیہ کا موقف نمایاں ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ کتاب کا اسلوب سوال وجواب کے مفید طریق کو پیش کرنا ہے۔ اس سے پڑھنے اور سمجھنے والا ایک خاص علمی اور تحقیقی ذوق محسوس کرے گا۔ عالم اسلام کے ممتاز محقق اور مفتی الشیخ علامہ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے علمی رسوخ اور زہد وتقویٰ کی خوبیوں سے نوازا تھا۔ انھوں نے فتاویٰ کی اس مختصر مگر جامع کتاب میں عقائد وعبادات پر عامۃ المسلمین کے اذہان میں پیدا ہونے والے تمام تر امکانی سوالوں کے ادلۂ شرعیہ کی روشنی میں ایسے محکم مدلل اور دلنشیں جوابات مرحمت فرمائے ہیں کہ جن سے قلب ونظر کو طمانیت اور ذوق عمل میں یقین کا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عقائد و عبادات کے ضمن میں اس کتاب کا مطالعہ ایک ایمانی حلاوت اور دینی شعور بیدا کرے گا۔

دارالسلام کے شعبۂ تحقیق کے خاص ارکان نے اس کتاب کی فنی ایڈیٹنگ میں جس طباعتی ذوق اور علمی ذمہ داری کا اظہار کیا ہے۔ اس نے اس کتاب میں معنوی اور صوری خوبیوں کا ایک جہان آباد کر دیا ہے۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر

ڈائریکٹر بیت الحکمت، لاہور

ISBN: 9960-732-84-3
9 789960 732848

دارالسلام
کتاب وسُنّت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
ریاض • جدہ • شارجہ • لاہور
کراچی • لندن • ہیوسٹن • نیویارک

DARUSSALAM